علیگڑھ

سرپرست

سیّد فتح علی　سیّد محمد حامد　ڈاکٹر سیّد افتخار علی

مدیرہ

ڈاکٹر رضیہ حامد

معاون مدیرہ

ڈاکٹر رفعت سلطان

مجلسِ ادارت

رفعت سروش۔ عشرت قادری۔ پروفیسر ظل الرحمن۔ رہبر جونپوری
یاسمین افتخار۔ ... لور۔ ڈاکٹر راحت بدر

	زرِ سالانہ	فی شمارہ	علیگڑھ نمبر
ہندوستان	۵۰ روپیہ	۱۵ روپیہ	۵۰۰ روپیہ
پاکستان	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۵۰۰ روپیہ
دیگر ممالک	۳۰ ڈالر	۵ ڈالر	۳۰ ڈالر

کتابت/کمپوزنگ : محمد حامد بستوی، محمد ساجد، جاوید رحمانی، عارفہ خانم۔
ٹائٹل سید محمد عاطف (آرٹی)
مطبع : بھارت آفسیٹ، دہلی-6

ڈاکٹر رضیہ حامد ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے آر-۴ ۲۸ رمیش پارک لکشمی نگر، دہلی سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ:
۶۔ کنارہ اپارٹمنٹ وی۔ آئی۔ پی روڈ، نزد کربلا بھوپال ۴۶۲۰۰۱۔ فون ۵۴۴۱۰۰ / ۵۴۱۷۲۷
وحید منزل ۴۴ مالی پورہ روڈ بھوپال ۴۶۲۰۰۷ فون ۵۴۲۴۲۲

انتساب

مردِ جلیل

خاتونِ عظیم

تہذیب وعلم، فلسفہ وحکمت، سائنسی نقطۂ نگاہ،

قومی یکجہتی، افکار کی آزادی کے نقیب، فکرِ جدید کے قائد،

یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی زندہ جاوید مثال

بانیٔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ

سر سیّد احمد خاں نوّر اللہ مرقدہٗ

اور

ان کی مساعی میں طبقۂ نسواں میں سبقت کرنے والی

دامے، درمے، قدمے اور سخنے معاون

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی پہلی چانسلر

نواب سلطان جہاں بیگم نوّر اللہ مرقدہا

کے نام

بصد عقیدت واحترام

جوش ملیح آبادی

اے علی گڑھ اے جواں قسمت دبستانِ کہن

اے کہ شمع فکر سے تابندہ تیری انجمن

تیرے پیمانوں میں لرزاں ہے شرابِ علم و فن

حشر کے دن تک پھلا پھولا رہے تیرا چمن

مشعلِ مینا سے روشن تیرا میخانہ رہے

رہتی دنیا تک ترا گردش میں پیمانہ رہے

~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~

اظہار تشکر

علی گڑھ نمبر جیسے ضخیم نمبر کے لیے مواد کی فراہمی، مضامین لکھنے کی درخواست اور پھر یاد دہانی اور وعدہ وفا کرنے والوں کے مسلسل اعذار ایسے جانکسل مراحل تھے جن سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہمت، قوت برداشت اور جہدِ مسلسل کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کسی علیگ نے حتی الوسع کوشش سے کبھی بھی انکار نہیں کیا۔ وعدہ کے ایفا میں تاخیر یقیناً مصروفیت یا خرابیٔ صحت کی وجوہ سے بھی ہوئی ہوگی۔ کسی فرد واحد نے بھی مخالفت کے لیے ایک لفظ نہیں کہا بلکہ ہر جگہ سے بھرپور تائید ہی ملی۔ بلا شبہ یہ علی گڑھ سے محبت کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

سرسید اور علی گڑھ کے متعلق اس کام کا خیال دراصل حامد صاحب کی علی گڑھ سے والہانہ محبت کا نتیجہ ہے۔ علیگ برادران کا اپنی مادر درسگاہ سے جو دلی تعلق ہوتا ہے اس کی نظیر کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی۔ یقیناً اس کا سرچشمہ بانیٔ علی گڑھ اور ان کے قابل قدر ساتھیوں کا اخلاص اور ایثار ہے۔

علی گڑھ نمبر کے لیے مادر علمی سے دور جناب ذاکر علی خاں، نجم حسین نجمی، عشرت حسین، سید طاہر حسین، ڈاکٹر سید حامد علی شاہ اور سید محمد احمد سبزواری (پاکستان) شاہین نظر (سعودی عرب) اور بے شمار علیگ برادران نے جس والہانہ جذبہ اور خلوص سے مضامین لکھے اور میری حوصلہ افزائی میں انتہائی فراخ دلی سے کام لیا۔ ان کا شکریہ ادا کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔

علی گڑھ نمبر کی تیاری میں جن محبان علیگ اور محبان اردو نے معاونت اور حوصلہ افزائی کی میں ان کی ممنون ہوں۔ پروفیسر ظل الرحمٰن، جناب مہر الٰہی، پروفیسر نجمہ محمود، ڈاکٹر راحت ابرار، جناب سید محمد احمد اور محترمہ شہناز کنول نے علی گڑھ کی روایات کو زندہ رکھا بڑی فکر و ذمہ داری سے میری معاونت کی۔

مضامین کی فراہمی کے لیے رسالہ تہذیب، العلم (پاکستان) تہذیب الاخلاق، فکر و نظر علی گڑھ میگزین، ہال میگزین (علی گڑھ) اور متعدد اخبارات، رسائل، کتب اور یونیورسٹی کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ سے جاری مواد سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ادارہ ان تمام ماخذ سے متعلق حضرات کا شکر گزار ہے۔

سید محمد عاطف نے اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود علی گڑھ نمبر کا ٹائٹل بنانا ضروری جانا۔ ادارہ ان کی ترقی و کامرانی کے لیے دعا گو ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان تمام اہل دل، اہل ثروت و اہل تجارت کے لیے سراپا سپاس ہوں کہ انھوں نے اس دشوار گزار راہ کو میرے لیے آسان کرنے کی سعی کی۔ کاتب محمد حامد بستوی، محمد ساجد، جاوید رحمانی اور عارفہ خانم نے بڑی ذمہ داری سے اس بڑے کام کو تکمیل تک پہنچایا جو ان کے تعاون کے بغیر مشکل تھا۔ میں ان کی شکر گزار ہوں۔

اپنے بچوں سید محمد عامر و شازیہ، ڈاکٹر سید محمد عاصم و صبا، سید محمد عاطف و صائمہ، صالح و محمد شفیع نے میرے لیے ہر آسانی مہیا کی اور کام کرنے کے لئے بے فکر کیا۔ خدا ان کو دونوں جہاں کے علم کی دولت دے اور بہترین انسان بنائے (آمین)۔ شرمندہ ہوں اپنی پیارے پوتیوں و پوتے، ہدیٰ، بشریٰ و سید محمد علی قاسم اور پیارے نواسی و نواسے سعدیہ، صفا اور محمد سعد سے کہ اس نمبر کی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے ان کی ناز برداری اور خاطر مدارات نہ کر سکی جس کے وہ لوگ مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو شاد آباد رکھے اور دین و دنیا کا علم نافع عطا فرمائے آمین۔

اپنے والدین محترم سید فتح علی و سیّدہ بیگم، شوہر ڈاکٹر سید محمد حامد اور عزیز بھائی ڈاکٹر سید افتخار علی کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو اتنا بڑا کام کسی طور بھی انجام نہ دے پاتی۔ خدا ان کو صحت و تندرستی کے ساتھ تادیر سلامت رکھے آمین۔

مجلس ادارت کے اراکین کے تعاون کا شکریہ ادا نہ کرنا ناسپاسی ہوگی میں ان تمام حضرات کی تہہ دل سے ممنون ہوں۔ یہ الفاظ ان کی مساعی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔

ترتیب

۸۔ علیگڑھ: شعبہ جات:

۹۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی:

۱۰۔ علیگڑھ: ادبی خدمات ناموران:

حرفِ آغاز

انیسویں صدی کے نصف آخر میں وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر بڑی بڑی تحریکیں وجود میں آئیں جن کا مقصد زندگی کے ہر شعبہ میں اصلاح و انقلاب لانا تھا۔

۱۸۵۷ء کی انقلابِ آزادی کی اوّلین کوشش میں مسلمان پیش پیش تھے جس کی پاداش میں انگریزوں نے ان کو بری طرح تہس نہس کیا۔ انگریز حکومت کی آمد سے مسلمانوں میں ایک احساسِ کمتری غیر شعوری طور پر پیدا ہو گیا تھا۔ دفاتر سے فارسی یک دم ختم کرکے انگریزی زبان رائج کردی گئی تھی۔ مسلمان نہایت درجہ مایوس اور مضطرب تھے۔ ہندوستان کے دانشمند طبقوں نے ہوا کا رُخ پہچان کر انگریزی زبان اور جدید علوم کی طرف سبقت شروع کردی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کو بحیثیت قوم سہارا دینے والوں میں سرسید احمد خان کا نام سرِفہرست ہے۔ اس مرحلہ پر انھوں نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ سرسیّد کو مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ان کے مخالفین کو ان کے جدید تعلیم کے منصوبہ سے اختلاف نہ تھا۔ یہ اختلاف ان کے بعض مذہبی عقائد، بعض سیاسی خیالات اور بعض تعلیمی تجاویز سے تھا۔ سرسید قوم کے لیے تعلیم کو ضروری خیال کرتے تھے۔ ہزاروں مخالفتوں کے باوجود انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ان کا کہنا تھا:

"جن قوموں میں سب مراتب کے تعلیم یافتہ مناسب تعداد میں موجود ہوں اس قوم کی کبھی ترقی نہیں ہو سکتی اور نہ دوسری قوموں کی نگاہ میں وہ قوم کچھ عزت حاصل کر سکتی ہے۔"

سر سید نے ایک چھوٹے سے مدرسہ سے اپنے منصوبہ کا آغاز کیا۔ وہ چھوٹا سا پودا ایک قد آور درخت بن گیا۔ علیگڑھ کی کہانی اس مالی کی کہانی ہے جس نے ایک حقیر بیج کو اپنے خون جگر سے سیراب کیا اور ایک مایوس قوم کو جو اپنے تمام وسائل سے محروم ہو چکی تھی باعزت زندگی گزارنے کا گر بتاتے ہوئے علم کی شاہراہ پر انگلی پکڑ کر گامزن کیا۔

کسی بھی یونیورسٹی کی شناخت اس کے طلبا کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی کے ذریعہ متعین ہوتی ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں سیکڑوں یونیورسٹیاں موجود ہیں، اور ہر ایک کسی نہ کسی مضمون میں اپنی انفرادیت قائم کیے ہوئے ہے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی انفرادیت صرف اس کا نصاب تعلیم ہی نہیں ہے بلکہ اقامتی زندگی بھی ہے۔ یہاں طلبا میں علمی و ادبی شوق پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اقامتی زندگی میں غیر نصابی تربیت اور برسہابرس سے چلی آرہی روایات کی روشنی میں کی گئی ٹریننگ کی کھراد، ان کو زندگی کے اتار چڑھاؤ سے نبرد آزما ہونے اور سرخرو زندگی گزارنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ بلاشبہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایشیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی قومی، علمی اور ثقافتی مرکز ہے۔

میراثِ پدر خواہی، علم پدر آموز

(ہم اپنے (روحانی) باپ کی وراثت کے حقدار ہیں کیونکہ ہم اس کے علم اور عمل کے وارث ہیں۔) کے مصداق علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں نے اس کی ابتدا سے ہی سرسید کی ہر ادا کو اپنایا۔ وہ سرسید کی شوخی و شرارت ہو یا مخالفتوں سے بغیر گھبرائے اپنا دفاع کرنا اور مخالفین کے ساتھ وسعت قلب اور اعلیٰ ظرفی کے ساتھ پیش آنا، قلم کی نوک سے زمانہ کی اصلاح کرنا اور نشتر دے کر فاسد مواد کو نکال دینا، اپنی زبان و ادب کی حفاظت کرنا اور

اس کے فروغ کے لیے ڈٹے رہنا بھی اس یونیورسٹی کے طالب علموں نے سرسید سے سیکھا۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں صرف شاعرے مباحثے کھیل کود ہی نہیں یہاں کے طالب علم کو خدا اور اس کے رسولؐ کی محبت اور اس سے دلی وابستگی بھی سرسید سے پہنچی ہے۔

اسٹریچی ہال کا سنگ بنیاد رکھے جانے کے وقت لارڈ ملٹن نے کہا تھا:

"مجھے امید ہے کہ یہ پودا کبھی درخت بن جائے گا جس کی شاخیں برگد کی طرح دور دور تک پھیلیں گی اور یہاں سے فارغ ہونے والے ملک کے طول و عرض میں آزاد تحقیق، رواداری اور اخلاق کا پیام پہنچائیں گے۔"

سرسید جب دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کو یہ یقین کامل تھا کہ ان کی قوم بہتر مستقبل کی طرف گامزن ہے۔ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں اب تک ہزاروں طلبار نے اکتساب فیض کیا ہے۔ ان میں سے بعض قومی آسمان پر چاند ستارے بن کر چمکے اور بعض کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔ بیرونِ ملک سے آئے طالب علموں میں سے بھی اپنے اپنے ملک میں کوئی سریرآرائے حکومت، چیف جسٹس اور وزارت میں اہم عہدوں پر فائز ہوا۔ سرسید کا مشن ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا اس کا سفر ہنوز جاری ہے۔ سرسید نے کہا تھا:

"ہر دور کا اپنا رنگ ڈھنگ اور اپنے تقاضے ہوتے ہیں اگر ہم بدلے ہوئے حالات کے ساتھ خود کو نہیں بدلیں گے تو ہم کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔"

سرسید کے اس قول کی روشنی میں اس سفر کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے ان کے بتائے راستے کا عرفان اب پہلے سے زیادہ عام ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی اہمیت پہلے کی بہ نسبت اب کہیں زیادہ ہے۔

میں نے سرسید کی اس تحریک کو فروغ دینے کی یہ ادنیٰ کوشش کی ہے اس میں جہاں میں نے پرانے مضامین ان کی افادیت کے پیشِ نظر شامل کیے ہیں وہیں ہمارے کرم فرماؤں کے تازہ مضامین بھی شامل ہیں۔ ان مضامین سے تاریخی معلومات کے علاوہ طبیعت میں کام کرنے کی لگن، ولولہ اور اُمنگ

ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

پیدا ہوتی ہے، جس کا فقدان ہوتا جارہا ہے۔ پرانے طالب علموں کی یادداشتوں سے دلچسپ اور سبق آموز باتوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ یہ مثالی لوگ ہمارے پیش رو تھے اور مسلم یونیورسٹی کو ان پر ناز ہے۔ میں نے علم و عمل، عزم و حوصلہ کے جذبہ کو مہمیز کرنے کی سعی کی ہے تاکہ علم کی کرنیں، آفتاب کی روشنی بن جائیں اور جہل کا اندھیرا ملک و قوم سے یکسر دُور ہو جائے۔

سر سید احمد خاں کی وفات بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی ہو گئی تھی لیکن یہ صدی ان کی صدی ہے اور سن دو ہزار اس صدی کا آخری سال ہے۔

جَمَالُکَ فِی عَیْنِیْ وَحُبُّکَ فِیْ قَلْبِیْ

ذِکْرُکَ فِیْ فَمِیْ فَـاَیْـنَ تَغِیْبُ

تیرا جمال میری آنکھوں میں سمایا ہے تیری محبت میرے قلب میں جاں گزیں اور تیرا ذکر میری زبان پر جاری ہے۔ اے مجموعۂ خوبی تو ہرگز ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔

ہمیں یقینِ کامل ہے کہ انشاء اللہ آئندہ صدی سر سید تحریک کو مزید سراہے گی اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی تعلیم کے افق کو چھو سکے گی۔

سر سید احمد خاں زندہ باد

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی پائندہ باد

۲۳ / دسمبر ۱۹۹۹ء

وکٹوریہ گیٹ

علامہ اقبال ہال

سوئمنگ پول

محمد حامد انصاری

جامع مسجد

مزار سرسیدؒ

جواہر لال نہرو میڈیکل کالج

نیا گیسٹ ہاؤس

شعبۂ جغرافیہ

جامع مسجد

اسٹریچی ہال

اجمل خاں طبیہ کالج

شعبۂ دینیات

سلیمان ہال

سرسید کی قیام گاہ - دورانِ قیامِ انگلستان

آرٹس فیکلٹی

محمد حبیب ہال

باب سید

۵۲ واں کانوکیشن

ایم۔ اے لائبریری

اسٹوڈنٹ یونین کی انسٹالیشن سیریمنی

۔ ادرئیں کالج آف انجیرنگ اینڈ ٹکنالوجی

کرکٹ پویلین

جامع مسجد

کمپیوٹر سینٹر

ایم - اے لائبریری

لڑکیوں کا نیا ہال

آفتاب ہاسٹل

مولانا آزاد لائبریری

محمد علی ہاسٹل

یونین ہال

کینیڈی ہال

ویمنز کالج

رفیع احمد قدوائی انسٹی ٹیوٹ آف اگریکلچر

ناموران علیگڑھ کی کہانی ٹکٹوں کی زبانی
ملاحظہ فرمائیے ص ۱۳۴

S.D.KITCHLEW
60

Re 1
PAKISTAN

PIONEERS OF FREEDOM
PAKISTAN

PIONEERS OF FREEDOM
PAKISTAN

Rs 7

PIONEERS OF FREEDOM
PAKISTAN

PIONEERS OF FREEDOM
Re 1
PAKISTAN

PIONEERS OF FREEDOM
Re 1
PAKISTAN
پاکستان

[illegible]

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین

سر راس مسعود

پروفیسر ہادی حسن

اسمٰعیل اللہ خاں

سر آغا خاں

ڈاکٹر ذاکر حسین

Col B H Zaidi

کرنل بشیر حسین زیدی

فکر و آگہی بھوپال نمبر کی رسمِ افتتاح میں باب العلم بھاگلپور کے علما کے ساتھ
آنجہانی ڈاکٹر شنکر دیال شرما

منٹو سرکل اسکول ۱۹۴۷ء

فکر و آگہی دہلی " بھوپال نمبر و نقوش نمبر" کی تقریب اجرا۔ اردو گھر، دہلی۔
رفعت سروش، پروفیسر گوپی چند نارنگ، سید حامد، ڈاکٹر رضیہ حامد، ڈاکٹر عصمت سلطان

(اوپر) بی۔ ایچ۔ ای۔ ایل بھوپال کے کلچرل ہال میں انجمن ترقی اردو ہند کی
جانب سے ڈاکٹر رضیہ حامد سپاس نامہ وصول کرتے ہوئے۔
(نیچے) جلسے کے کچھ مدعوئین۔

۱۷

سرسید احمد خاں

مناجات

الٰہی میں ہوں بندہ بس گنہ گار
کہ بھاگا در سے تیرے دن میں سو بار

الٰہی در بدر بھٹکا پھرا میں
نہ آسودہ ہوا ہرگز ذرا میں

الٰہی نفس و شیطاں نے ستایا
نہ جانا تھا جہاں رستہ چلایا

الٰہی ہر طرف سے پھر پھرا کر
پڑا ہوں تیرے دروازے پہ آکر

الٰہی تو شہنشاہ جہاں ہے
الٰہی دوسرا تجھ سا کہاں ہے

نہیں قادر الٰہی کوئی تجھ سا
نہیں عاجز الٰہی کوئی مجھ سا

الٰہی تو غنی میں بے نوا ہوں
الٰہی شاہ تو ہے میں گدا ہوں

الٰہی تو غفور اور میں گنہ گار
الٰہی تو کریم اور میں گرفتار

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

الٰہی تو قوی اور ناتواں میں
خداوندا کہاں تو اور کہاں

کیا میں نے تھا جو مجھ کو سزاوار
تو اب وہ کر جو ہے تجھ کو سزاوار

الٰہی بخش دے اپنے کرم سے
چھڑا دے دین اور دنیا کے غم سے

الٰہی آسرا رکھتا ہوں تیرا
تو کر دے خاتمہ باخیر میرا

الٰہی میں سبھی محتاج تیرے
الٰہی بخش دے ماں باپ میرے

الٰہی ترک دنیا کا کروں میں
تری ہی یاد میں آخر مروں میں

ـ رکھوں کچھ عرض شاہ و گدا سے
ـ کچھ چاہوں سو چاہوں تجھ حد سے

الٰہی سینۂ بریاں عطا کر
الٰہی دیدۂ گریاں عطا کر

الٰہی عشق میں احمد کے رکھ چور
ہے بیمارِ محبت اس کا مغفور

الٰہی درد عشق مصطفیٰ دے
پھر اس کے وصل کی مجھ کو دوا دے

الٰہی مجھ کو کر خاک مدینہ
[illegible] دے لمعات سے میرا سینہ

الٰہی [illegible] میں [illegible] عین
[illegible] المصطفیٰ مولیٰ الجمیع

وھب لی فی مدینۃ قرارا"
بایمان و دفن بالبقیع

سہ ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مناجات

ا پرورد گار ہے۔ اے خدا! اصلی بادشاہت اور حقیقی سلطنت تجھ ہی
ب الملک ! تو ہی ہے۔ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے ' جس کو چاہتا
ا سارے عالم اور تمام مخلوقات کی جانیں اور سب آدمیوں کے دل
رف تو چاہتا ہے ان کو پھیرتا ہے اور جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ تیرا
ے خالی نہیں۔ تیرے کام میں کسی کو چوں و چرا کی قدرت نہیں۔
ے سراسر تیرے گنہگار ہیں۔ اے خدا! ہماری شامت اعمال نے ہم
ڈبو دیا ہے۔ اے خدا! ہم تیرے ہر وقت تقصیر وار ہیں۔ جب تک
ے پاک نہیں رہ سکتے۔ اے خدا تیرے سوا کوئی ہمارے گناہ بخشنے والا
کمال انکسار سے اپنے گناہوں کی معافی حضرت محمد رسول ﷺ
تے ہیں۔ اے خدا! تیرے غضب سے تیری رحمت سبقت لے گئی
ارے گناہ معاف کر۔ اے خدا! جس طرح تیری حکمت سے میلا کپڑا
طرح ہم کو ہمارے گناہوں کی ناپاکی سے پاک کر۔ اے خدا! اپنی بے
و تمام برائیوں اور ناپاک چیزوں سے جو دل کو ناپاک کرتی ہیں ' صاف
ے گناہوں کو مٹا اور ہماری روح کو روح القدس کی تائید سے قوی
ا اور اصلی خدا اور کوئی نہیں ' آمین!

ے زیادہ ہو گئے تھے۔ الٰہی ہماری شامت اعمال کی کچھ انتہا نہ رہی
ہیں کہ ہر ایک کے اعمال کی سزا اور جزا کا ایک دن بیشک آنے والا
نبیوں کی کتابوں میں وعدہ کیا ہے ' اور اس دن تیری رحمت اور تیرے
نہیں ' کیونکہ تیرے آگے سب گنہگار ہیں۔ مگر ان پچھلے دو برسوں میں
ماجر بندوں کی طرف ہوئی ' وہ بیشک ہماری شامت اعمال کا ظاہری نتیجہ
ے توبہ کرتے ہیں۔ الٰہی! ہم اپنے گناہوں کی تجھ سے معافی چاہتے

دوبئی علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن

کی جانب سے

فکر و آگہی دہلی

علی گڑھ نمبر

کے لیے

نیک خواہشات

پیش ہیں

ہیں۔ الٰہی! تو ہمارے گناہ سب معاف کر۔ آمین!

الٰہی! پچھلا زمانہ تیری مخلوقات پر ایسا گزرا کہ انسان اور حیوان اور تمام چرند و پرند' بلکہ شجر و حجر کو بھی چین اور آرام نہ تھا۔ کوئی شخص بھی اپنی جان و مال اور آبرو پر مطمئن نہ تھا۔ ان پچھلے فسادوں نے زمین و آسمان کو گویا الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ الٰہی! تو نے اپنے فضل و کرم سے ان تمام فسادوں اور آفتوں کو دور کیا۔ الٰہی تو نے پھر اپنے عاجز بندوں پر رحم کیا اور جو امن و آسائش ان بدبخت برسوں سے پہلے تو نے اپنے بندوں کو دی تھی' پھر وہی امن و آسائش تو نے اپنے بندوں کو نصیب کی۔ الٰہی! تیرے اس رحم کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔ الٰہی! تو ہمارے اس شکرانے کو جو تیری درگاہ کے لائق نہیں ہے' اپنے فضل و کرم سے قبول کر' آمین!

(حیات جاوید)

یہ مناجات سرسید احمد خاں نے 28 جولائی 1859ء کو مراد آباد میں مسلمانوں کے ایک جلسے میں پڑھی۔ حالی کے الفاظ میں "اس مناجات کے الفاظ سرسید کے دل کی اصلی حالت کو نہایت واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں"

۲۱

سرسید احمد خاں

پُر درد اور عاجزانہ دُعا

اے خدا! اے خدا! بے شک خدا تو ہی ہے۔ تیرے سوا کوئی نہیں۔ اے خدا! اے خدا! بے شک تو ہی ازلی ہے اور تو ہی ابدی ہے۔ تیرے سوا کوئی نہیں۔ تو ہی ہمارا خالق ہے اور تو ہی ہمارا مالک۔ تو ہی ہمارا معبود ہے اور تو ہی ہمارا مسجود۔ تو ہی ہماری دعا ہے اور تو ہی ہمارا مدعا۔ تو ہی ہمارا مقصد ہے اور تو ہی ہمارا مقصود۔ الٰہی! ہم تجھی کو چاہتے ہیں اور تجھی سے چاہتے ہیں۔ الٰہی! ہم تجھی کو مانگتے ہیں اور تجھی سے مانگتے ہیں۔ اے میرے پیارے اللہ! ہمارا دل، ہماری جان، ہماری روح تیری ہی ہے اور تیرے ہی لئے ہے۔ اے قادر مطلق خدا! یہ تمام قویٰ جو ہم میں ہیں، تجھی سے ہیں اور تیرے ہی لئے ہیں۔ پس اپنی چیز کو اپنی ہی مرضی کے تابع رکھ۔

الٰہی! ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں۔ ہماری شامت اعمال نے ہم کو گناہوں کے کالے دریا میں ڈبو دیا ہے۔ الٰہی! ہم نے تیری تقصیر کی ہے اور تیری امانت میں خیانت کی ہے۔ جو چیزیں تو نے ہم کو جن کاموں کے لئے دی تھیں ان سے ہم نے وہ کام نہیں لیا۔ الٰہی! ہمارے نفسِ امارہ نے ہم کو بہکایا اور گناہ میں ڈالا۔ الٰہی! ہم نے تیری نافرمانی کی اور تجھ سے یکتا خدا کی حکم عدولی کی۔ ہم بال بال گنہگار ہیں۔ گناہوں کے عمیق دریا میں غرق ہیں، مگر تیرے ہی سہارے کی امید ہے۔ پس اے ہمارے غفور الرحیم خدا! ہماری دستگیری کر اور ہم کو گناہوں سے نکال اور آبِ رحمت سے ہمارے گناہوں کو دھو اور ہمارے دل کو برف سے زیادہ سفید اور اپنی ذات کے نور سے سورج سے بھی زیادہ چمکیلا کر۔

اے خدا! تو بے شک بے نیاز ہے۔ تیری بے نیازی ہم کو تسلیم ہے، مگر کیا تو ہم سے بھی بے نیاز ہے۔ گیرم کہ غمت نیست غم ما ہیمنست۔ نہیں نہیں حاشا وکلا تو ہمارے ماں باپ سے بھی زیادہ ہمارا غم خوار ہے۔ جیسے کہ ہم تجھ سے بے نیاز نہیں ہیں، ویسا ہی تو بھی ہم سے بے نیاز نہیں۔ اے خدا! اے خدا! ہمارا اور تیرا یہ رشتہ کہ تو ہمارا خدا ہے اور ہم تیرے بندے اور تو ہمارا خالق ہے اور ہم تیری مخلوق، کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اے ہمارے عظیم الشان خدا! اگر تجھ کو خدائے ذوالجلال، وحدہٗ لاشریک ہونے کی عزت حاصل ہے تو ہم کو بھی تیرے بندے ہونے پر

ست ہی کچھ فخر ہے۔ پس اپنے جلال کو دیکھ اور اپنے بندوں کی دستگیری کر۔

الہی ! ہمارا دل اور ہماری جاں محمد رسول ﷺ خاتم النبین و رحمۃ للعالمین پر فدا ہو جن کو تو نے ہماری ہدایت کے لئے بھیجا اور جن کی ہدایت سے ہم نے تجھ کو جانا پس تجھ سے ہم نے رسول اللہ کو پایا اور محمد رسول اللہ سے تجھ کو۔

محمد از تو میخواہم خدا را
خدایا از تو خواہم مصطفیٰ را

پس اے خدا تو ہمیشہ ہم کو اس کی راہ پر رکھ اور اس پر اور ان کی آل و اصحاب پر اپنی رحمت نازل کر۔ اللھم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انک حمید مجید۔

(یہ دعا سرسید احمد خاں نے 27 فروری 1872ء کو ایک جلسہ میں پڑھی)

تہذیب الاخلاق' 10 محرم 1289ھ

حدیث دل

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک می آرد ز درمانے کہ من دارم

دگر من چہ می خواہی' ز ایمانم چہ می پرسی
ہماں یک جرعۂ عشق ست ایمانے کہ من دارم

خدا دارم' دل بریاں ز عشق مصطفیٰ دارم
نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

ز جبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوق ست قرآنے کہ من دارم

فلک یک مطلع خورشید دارد باہمہ شوکت
ہزاراں مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم

ز رہبان نامہ ایماں سنگ ہا دارد رہ واعظ
نہ دارد ہیچ واعظ' ہم چو رہائے کہ من دارم

ماہنامہ فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مسلم یونیورسٹی کا امتیازی نشان

یہ ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ ۱۸۷۵ء میں تھا

یہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ۱۹۲۰ء میں تھا

اب ۱۹۴۷ء سے یہی مونوگرام ہے

میرا چمن
(نذرِ علی گڑھ)

اسرار الحق مجاز

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغرِ نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی ابلتی ہے

جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات ابلتی ہے

اسلام کے اس بت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی

یاں حسن کی برق چمکتی ہے یاں نور کی بارش ہوتی ہے
ہر آہ یہاں اک نغمہ ہے ہر اشک یہاں اک موتی ہے

ہر شام ہے شامِ مصر یہاں ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں

یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا یہ بزمِ وفا پروانوں کی
یہ شہرِ طرب رومانوں کا یہ خلدِ بریں ارمانوں کی

فطرت نے سکھائی ہے ہم کو افتاد یہاں پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں

اس فرش سے ہم نے اڑ اڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی پروین سے رشتے جوڑے ہیں

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں
اس بزم میں نیزے پھینکے ہیں اس بزم میں خنجر چومے ہیں
اس بزم میں گر کر تڑپے ہیں اس بزم میں پی کر جھومے ہیں
آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے
یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شبخوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اتارے ہیں
ہر آہ ہے خود تاثیر یہاں ہر خواب ہے خود تعبیر یہاں
تدبیر کے پائے سنگیں پر جھک جاتی ہے تقدیر یہاں
ذرات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے باطل کی شکست فاش یہاں
اس گل کدۂ پارینہ میں پھر آگ بھڑکنے والی ہے
پھر ابر گرجنے والے ہیں پھر برق کڑکنے والی ہے
جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا ہر کوہِ گراں پر برسے گا
ہر سرو و سمن پر برسے گا ہر دشت و دمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہر طرب پر گرجے گا ہر قصر طرب پر کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے یہ ابر ہمیشہ برسے گا

۲۶

محمد اقبال

سید کی لوحِ تربت پر

اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر اے کہ ترا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ
فکر رہتی ہے مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تربت ہے ترا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں ترکِ دنیا قوم کو اپنے نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جواب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم و رجا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

(۱۸۹۸ اور ۱۹۰۵ء کے درمیان لکھی گئی)

۱

حیاتِ سرسیّد

مثالِ عزم و عمل ہے حیاتِ سرسیّد
صفاتِ ہادی و رہبر صفاتِ سرسیّد

مولانا حالی

معمارِ قوم

پنہاں نہیں ہے یارو سب پر کھلا ہوا ہے — جو حال آج اپنا اور اپنی قوم کا ہے
ہے اک لکیر باقی جس کے فقیر ہیں ہم — خود سانپ ورنہ یاں سے کب کا نکل گیا ہے
اس پر بھی اے عزیزو ہے جائے فخر تم کو — دینوں میں دینِ بیضا حق نے تمھیں دیا ہے
قبلہ ہے وہ تمہارا جو گھر ہے سب سے پہلا — ہادی ہے وہ تمہارا جو ختمِ انبیا ہے
دی ہے وہ مصلحِ کل حق نے کتاب تم کو — جس نے شریعتوں کو شیر و شکر کیا ہے
بخشی تمھیں حکومت، حکمت تمھیں عطا کی — دوراں سدا موافق تم سے یونہی رہا ہے
اس دورِ آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم — اک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا کیا ہے
سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں — فتوؤں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے
وقت اپنا کام اپنا، جان اپنی مال اپنا — یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کردیا ہے
وار اس پہ قوم کے ہیں، وہ قوم کی سپر ہے — قوم اس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا ہے
درہم سے اور قلم سے، دم سے قدم سے اپنے — جو کچھ کیا ہے اس نے وہ کس سے ہو سکا ہے
ہمدردِ قوم ایسا ہم نے سنا نہ دیکھا — یہ درد اس کو جد کی میراث میں ملا ہے
تعلیم کی تمہاری بنیاد اس نے ڈالی — ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے
بعد از قرونِ اولیٰ کس نے کیا بتاؤ — سیّد نے کام آکر جو قوم میں کیا ہے

(۱۸۷۷ء میں لکھی گئی جب کہ مدرستہ العلوم کا بنیادی پتھر لارڈ لٹن اپنے ہاتھ سے رکھ چکے تھے اور سر سید کے کام تعجب کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے)

سید محمد احمد

حیاتِ سر سیّد

روز و شب کے آئینے میں

بر ۱۸۱۷ء۔ دہلی میں اپنے نانا دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین کی حویلی میں پیدا ہوئے۔ سیّد میر متقی اور عزیز النساء بیگم کی تین اولادوں میں سب سے چھوٹے تھے۔
میر متقی کے پیرِ طریقت شاہ غلام علی نے احمد نام رکھا۔

ی ۱۸۲۲ دہلی میں رائج الوقت رسم کے مطابق بسم اللہ کی تقریب ہوئی اس موقع پر اپنے دادا حضرت شاہ غلام کی گود میں بیٹھے۔ جنھوں نے رسم کے مطابق بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور اقرار کی آیات سید احمد سے تلاوت کرائیں۔
اس زمانے کی رائج درسی کتابوں کی تکمیل کے بعد انھوں نے اساتذہ فن سے مختلف فنون کی تکمیل کی۔ طب انھوں نے غلام حیدر خاں سے پڑھی جو حکیم شریف خاں کے ارشد تلامذہ میں تھے اور فن حدیث و تفسیر کی تکمیل مولوی مخصوص اللہ ابن شاہ رفیع الدین سے کی۔ شارح علیہ السلام سے قرآن اور حدیث کی سند متصل انھوں نے اپنی ایک کتاب کے حاشیہ پر تحریر کی ہے۔ تیراکی اور تیر اندازی کا فن اپنے والد سے سیکھا جو اس وقت دہلی میں ان فنون کے استاد تھے۔

۱۸۲۸ سید احمد کے نانا خواجہ فرید الدین کا انتقال۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۱۸۳۶ سید احمد کے بڑے بھائی احتشام الدولہ میر سید محمد نے سید الاخبار کا اجرا کیا۔ سید احمد اس اخبار کی اشاعت میں ان کے معاون تھے۔ اس اخبار کو سید احمد کی اخبار نویسی کا مکتب کہنا غلط نہ ہوگا۔

۱۸۳۶ سید احمد کی شادی بعمر ۱۹ سال، پارسا بیگم عرف مبارک سے ہوئی۔

۱۸۳۸ میر سید متقی کا انتقال۔ اپنے پیر و مرشد شاہ غلام کی پائنتی درگاہ شاہ ابوالخیر میں دفن ہوئے۔ یہیں ان کے شیخ طریقت کے مرشد مظہر جان جاناں کا مزار بھی ہے۔

۱۸۳۸ دہلی کی صدر امین عدالت میں اپنے خالو خلیل اللہ خاں کے تحت عدالتی کام سے واقفیت حاصل کی۔ اپنی ددھیالی روایت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے قلعہ معلیٰ سے منسلک ہونے کی بجائے انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی اور عارضی سررشتہ دار مقرر ہوئے۔

فروری ۱۸۳۹ کمشنر آگرہ کے دفتر میں نائب منشی مقرر ہوئے۔

۲۵ مئی ۱۸۳۹ فارسی میں ایک تاریخ بطرز جدول جامِ جم تحریر کی جس میں امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ۴۳ بادشاہوں کے مختصر مگر جامع حالات ہیں۔ یہ کتاب مئی ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی۔

۱۸۴۱ منصفی کا امتحان پاس کیا۔

۱۸۴۱ اپنے بھائی میر سید محمد کے اشتراک سے امتحان منصفی میں شرکت کرنے والے امیدواروں کے لیے ایک کتابچہ "انتخاب الاخوین" شائع کیا۔

۲۴ دسمبر ۱۸۴۱ مین پوری میں منصف مقرر ہوئے۔

۱۰ جنوری ۱۸۴۲ مین پوری سے تبدیل ہو کر فتح پور سیکری آگئے۔ یہاں انھوں نے اپنا پہلا مذہبی رسالہ "جلاء القلوب بذکر المحبوب" مکمل کر کے شائع کیا۔

۱۸۴۲ مغلیہ دربار سے ان کے دادا سید ہادی کو عطا کردہ خطاب جواد الدولہ پر عارف جنگ کا اضافہ کر کے عطا ہوا۔

۱۸۴۴ فارسی کے رسالے معیار العقول کو تسہیل فی جر الثقیل کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا۔ اس کتاب میں بھاری اشیاء کو اٹھانے، کئی چیزوں

کو چیرنے وغیرہ کے لیے مشین و آلات بنانے کے اصول اور ان کے استعمال کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔

۲۴ دسمبر ۱۸۴۵ سید احمد کے بڑے بھائی سید محمد کا عین عالم جوانی میں انتقال۔ وہ ہنگام ضلع فتحپور میں منصف تھے۔ دہلی آئے تھے وہیں انتقال کیا۔

۱۸۴۶ فوائد الافکار فی اعمال فرجار، فلکیات، آلات رصد اور پرکار متناسبہ کے اعمال پر خواجہ فرید الدین کے فارسی رسائل کا اردو ترجمہ کیا جو مطبع سید الاخبار سے شائع ہوا۔

۱۸ فروری ۱۸۴۶ والدہ کی تنہائی کے پیش نظر فتح پور سیکری سے دہلی تبدیلی کرالی۔

۱۸۴۷ دہلی کی عمارتوں کے حالات اور کتبے سید احمد نے بہت کاوش کے ساتھ تحریر کیے۔ اس لحاظ سے سید احمد اس فن میں وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے آثار قدیمہ اور کتبہ شناسی پر کام کیا۔ اس کتاب میں چوتھا باب دہلی کے علما، حکما، شعرا و ارباب کمال کے احوال پر تھا۔ اس کے ساتھ ہی غالب کی تحریر کردہ تقریظ بھی شامل تھی۔ ۱۸۵۴ء میں انھوں نے اس کتاب کا نظر ثانی شدہ دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق کلکتہ یونیورسٹی نے آثار الصنادید کو ۱۸۷۲ء میں ایک تاریخی اور اثری کتاب کی حیثیت سے بی اے کے نصاب میں شامل کیا تھا۔

۱۸۴۸ قول متین در ابطال حرکت زمین پر ۲۵ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ تحریر کیا جس میں قدیم نظریہ کے مطابق انھوں نے دلائل سے ثابت کیا تھا کہ زمین حرکت نہیں کرتی بلکہ ساکن ہے۔

۱۵ فروری ۱۸۴۹ بڑے بیٹے سید حامد کی پیدائش۔

۱۸۴۹ رسالہ کلمۃ الحق کی تکمیل ہوئی۔

۱۸۵۰ رہتک میں عارضی جگہ خالی ہونے پر قائم مقام صدر امین مقرر ہوئے ۱۸۵۴ء کے اوائل میں بھی کچھ عرصہ اسی جگہ کام کیا۔

۱۸۵۰ رسالہ در رد بدعت کی تکمیل۔

۲۴ مئی ۱۸۵۰ سید محمود کی پیدائش۔

۱۸۵۲ دہلی کے ۲۰۲ فرمانرواؤں کے حالات میں ایک کتاب سلسلۃ الملوک تحریر کی جس میں ابتدا سے ۱۸۵۲ تک ۵ ہزار برس کے دوران فرمانروائی کرنے والے بادشاہوں کے حالات درج ہیں۔

۱۸۵۴ نظر ثانی و اضافہ کے بعد آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔

۱۳ جنوری ۱۸۵۵ بجنور میں صدر امین مقرر ہوئے۔

۱۸۵۶ / ۱۲۷۲ھ آئین اکبری کی تصحیح و اشاعت۔ سید احمد کو اپنی اس کتاب پر بہت ناز تھا۔ اس کی ترتیب و تہذیب پر بہت محنت شاقہ اٹھائی۔ کتاب کے مشکل مقامات کی وضاحت، عربی، فارسی، ترکی و سنسکرت کی ناموس اصلاحات کی تشریح کے علاوہ بے شمار تصاویر کا اضافہ کیا۔ یہ ایڈیشن مطبع اسمٰعیلی دہلی سے شائع ہوا۔

مئی ۱۸۵۷ بجنور کے قیام کے دوران غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جو ملک گیر جدوجہد شروع ہوئی تھی اس کی لپیٹ میں بجنور بھی آیا اور جب انگریز افسران ضلع خالی کر کے چلے گئے تب ان کی عدم موجودگی میں اپنے ساتھیوں رحمت خاں، امداد خاں وغیرہ کے ساتھ ضلع کا انتظام کیا۔ مگر جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو انگریزوں کے ایما پر بجنور کا انتظام نواب محمود خاں کے سپرد کر کے دہلی روانہ ہو گئے۔ اور جب انقلابیوں کی آپس کی پھوٹ کے نتیجہ میں وہ ناکام اور انگریز کامیاب ہوئے تو پھر واپس بجنور آ گئے۔ سید احمد نے بجنور میں جس طرح کام کیا اس کی نسبت ڈپٹی نذیر احمد نے جن کا وطن خود بجنور تھا، تحریر کیا ہے: "غدر تسلط کے بعد اس ضلع کے تمام باشندوں کی جان سرسید کی مٹھی میں تھی۔ اگر ان کے سوا اختیارات کسی دوسرے کے ہوتے تو بجنور کے حصے میں قیامت آ گئی ہوتی۔ سید احمد کی بدولت بجنور ہی ایسا ضلع تھا جو عواقب بغاوت غدر سے محفوظ رہا۔"

۱۹ نومبر ۱۸۵۷ سید احمد کی والدہ عزیز النساء بیگم کا میرٹھ میں انتقال۔ دہلی کی خراب حالت کے پیش نظر سید احمد اپنی والدہ کو میرٹھ لے گئے تھے۔ ان

کے ماموں اور ماموں زاد بھائی دہلی کی فتح کے بعد تلنگوں (انگریزی فوج) کے ہاتھوں دہلی میں مارے جا چکے تھے۔

اپریل ۱۸۵۸ مراد آباد میں صدر الصدور مقرر ہوئے۔ مراد آباد کے دورانِ قیام اسی سال انھوں نے تاریخ سرکشی بجنور تحریر کی۔

۱۸۵۹ غیر ملکی حاکموں کے خلاف مسلح جدوجہد میں ناکامی کے بعد انتقامی کارروائیوں کے تحت بے شمار جائدادیں ضبط ہوئیں جن کے خلاف عذر داریاں ہوئیں۔ ان کی سماعت اور تحقیقات کے لیے حکومت نے ایک سہ نفری کمیشن مقرر کیا تھا۔ سید احمد اس کے ایک ممبر نامزد ہوئے۔ انھوں نے بہت عزم و ہمت کے ساتھ لوگوں کی وکالت کی اور تمام عذر داریوں کا غور و تحقیق اور انصاف سے فیصلہ کیا۔

اپریل ۱۸۵۹ ۱۸۵۷ کی بغاوت پر کتاب کی اشاعت۔ اس کتاب کے اثرات بہت دور رس ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے بانی مسٹر اے، او، ہیوم کے ذہن میں کانگریس کے قیام کا خیال اسی کتاب کے مطالعہ کے بعد آیا تھا۔ خود سر سید نے ۱۰ نومبر ۱۸۸۰ء کے پائنیر میں چھپے اپنے مراسلہ میں اس امر کا انکشاف کیا تھا کہ مسٹر ہیوم نے قیامِ کانگریس کے وقت مجھ سے استصواب کیا تھا۔"

۱۸۵۹ مراد آباد میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جو فارسی تعلیم کے لیے تھا اور اپنی مملوکہ دکانیں جن کا ماہانہ کرایہ تقریباً ۲۰ روپیہ تھا۔ مدرسہ کے لیے وقف کر دیں۔

۱۸۶۰ مراد آباد سے جہاں وہ صدر الصدور تھے انھوں نے ایک سہ ماہی دو لسانی رسالہ اردو میں "رسالہ خیر خواہانِ مسلمان" اور انگریزی میں "لائل محمڈنز آف انڈیا" نکالا۔ اس کے تین شمارے شائع ہوئے۔ مسلمانوں پر سے بغاوت کا الزام دور کرنے کی غرض سے سید احمد خاں نے ان مسلمانوں کے حالات شائع کیے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ اوّل شمارہ میں انھوں نے اپنے حالات شائع کیے۔

۱۸۶۰ صوبہ شمال مغرب میں آئی قحط سالی کی بنا پر مراد آباد میں اس کے انتظام کے مہتمم مقرر ہوئے اور بے لوث طریقہ پر متاثرین اور مستحقین کی ہر ممکنہ مدد اور خدمت کی۔

۱۸۶۱ آثار الصنادید کے فرانسیسی ترجمہ کی اشاعت۔

۱۸۶۱ سر سید احمد کی اہلیہ پارسا بیگم کا انتقال۔ انتقال کے وقت انھوں نے تین بچے سید حامد، سید محمود اور ایک بیٹی امینہ چھوڑی۔ تدفین مراد آباد کے شوکت باغ قبرستان میں ہوئی۔

۱۸۶۲ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سکریٹری کی درخواست پر تاریخ فیروز شاہی کی تدوین و تصحیح کی اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا۔

۱۸۶۲ غازی پور تبادلہ ہوا۔

۱۸۶۲ تبئین کلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملۃ الاسلام کی اشاعت۔

۱۶ اکتوبر ۱۸۶۳ کلکتہ کا پہلا سفر جہاں دورانِ قیام آپ نے ضرورتِ ترقی علم و تہذیب درمیانِ اہلِ ہند" کے موضوع پر نواب عبداللطیف کی قائم کردہ کلکتہ لٹریری سوسائٹی کے تحت مذاکرہ علمیہ میں فارسی میں تقریر کی۔ سید احمد کا سفر کلکتہ سائنٹفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کی ترویج و توسیع کے لیے تھا۔ غازی پور سے کلکتہ کے سفر کے دوران وہ جن جن شہروں میں بھی رکے وہاں تقاریر کے ذریعہ لوگوں کو سوسائٹی کی ضرورت اور مقاصد سے روشناس کرایا۔

۱۸۶۳ رسالہ "التماس بخدمت ساکنانِ ہند در باب ترقی تعلیم اہلِ ہند" شائع کیا۔

۱۸۶۳ تزک جہانگیری کی تصحیح و اشاعت۔

۹ جنوری ۱۸۶۴ ان علوم و فنون کو جو مغربی زبانوں میں ہونے کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دست رس سے باہر تھے۔ ایسی ہندوستانی زبان میں ترجمہ کرنے کی غرض سے جو عام ہندوستانیوں کے استعمال میں ہو، سائنٹفک سوسائٹی

قائم کی۔ کرنل گراہم کے مطابق اس کا نام اولاً ٹرانسلیشن سوسائٹی رکھا گیا۔ سید احمد اور کرنل گراہم دونوں سوسائٹی کے سکریٹری تھے۔

۱۸۶۴ غازی پور میں ایک مدرسہ کا قیام جس کا سنگ بنیاد راجہ دیونرائن سنگھ اور مولانا محمد فصیح اللہ نے رکھا۔ راجہ دیونرائن سنگھ اسکول کمیٹی کے پریسیڈنٹ تھے۔ یہ مدرسہ ترقی کرتے ہوئے ہائی اسکول بنا اور وکٹوریہ ہائی اسکول کے نام سے آج بھی موجود ہے۔

یکم اپریل ۱۸۶۴ علی گڑھ تبادلہ ہوا۔

۴ر جولائی ۱۸۶۴ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے اعزازی رکن منتخب ہوئے۔

۳۰ر نومبر ۱۸۶۴ سائنٹفک سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھے جانے کے موقع پر صوبہ شمال مغرب (موجودہ یوپی) کے لفٹننٹ گورنر مسٹر ڈرمینڈ کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایک نظم پڑھی۔ (یہ عمارت آج کل طبیہ کالج دواخانہ کا حصہ ہے)

۳۰ر دسمبر ۱۸۶۵ حکومت کو زراعت کے موضوع پر کتابوں کی اشاعت کے لیے امداد کی عرضداشت بھیجی۔

۱۴ فروری ۱۸۶۶ سائنٹفک سوسائٹی کی عمارت کا افتتاح کمشنر میرٹھ مسٹر ولیمس کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

۳۰ر مارچ ۱۸۶۶ اخبار سائنٹفک سوسائٹی کا اجراء عمل میں آیا۔ ۸ر ستمبر ۱۸۷۶ء کو اخبار پروگریس اس میں شامل ہوا۔ بعد میں یہ اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ ایک سیاسی نوعیت کا اخبار تھا اس نے پریس کی آزادی کو اپنا موٹو بنایا تھا۔ ان کے دور تک یہ حقیقی معنوں میں ایک قومی اخبار تھا اور اینگلو انڈین اخبارات کے ہندوستانیوں پر حملے کیے حملوں کا مسکت جواب دیا کرتا تھا۔

۱۰ر مئی ۱۸۶۶ برٹش انڈیا ایسوسی ایشن قائم کی تاکہ مرکزی اور صوبہ جاتی حکومتوں کو اس پر آمادہ کیا جاسکے کہ ہر ضلع میں غیر سرکاری اراکین پر مشتمل ایک اعلیٰ مجلسِ شوریٰ قائم ہو تاکہ تعلیمی اور دوسرے انتظامی معاملات سے متعلق امور میں مسودہ دے کر پبلک کا نقطۂ نظر واضح کیا جاسکے۔ کام اور مقاصد

کے حساب سے سیاسی نوعیت کا یہ ہندوستان میں تیسرا اور شمالی ہندوستان میں دوسرا ادارہ تھا۔ پہلا ادارہ اوّل ۱۸۵۱ء میں کلکتہ میں قائم ہوا جس کو بالائی اور بالائی متوسط بورژوائی طبقوں نے جنم دیا تھا جو نئے برطانوی سامراج میں پروان چڑھ رہا تھا۔ ٹیگور خاندان کے افراد اس میں پیش پیش تھے دوسری لکھنؤ کی انڈین ایسوسی ایشن تھی جو اودھ کے تعلقداروں پر مشتمل تھی۔

۲؍جولائی ۱۸۶۶ء برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کے سکریٹری کی حیثیت سے وائسرائے کی کونسل کو نئے نافذ العمل پوسٹل قواعد کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بتایا کہ پارسل کی نئی شرح دوگنا ہو جانے کی وجہ سے کتابوں اور رسائل کی ترسیل پر برا اثر پڑا ہے جس کی بنا پر تعلیم کی اشاعت اثر انداز ہوتی ہے اور عام رعایا اس سے متاثر ہوئی ہے جبکہ اخبارات پر سے پہلے کے مقابلہ میں یہ شرح نصف کر دی گئی ہے جس کا فائدہ صرف مالدار افراد اور بالخصوص یورپین طبقہ کو حاصل ہوا ہے۔

اس کے علاوہ ریلوے سفر میں مقامی مسافروں کو بڑے اسٹیشنوں پر بھی ریفریشمنٹ کی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے تکالیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بحیثیت مجموعی اس ایسوسی ایشن کی کوششوں کی وجہ سے عوام کی کئی مشکلات کا ازالہ ہوا۔

۱۴؍ستمبر ۱۸۶۶ء ایک ہی دسترخوان پر انگریز کے ہمراہ شریکِ طعام ہونے پر دریافت کیے گئے شرعی سوال کو اپنے جواب کے ہمراہ سید احمد نے ایک ساتھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا جس میں قرآن و حدیث اور رسول کریم کے عمل سے اس امر کو ثابت کیا کہ اہل کتاب کے ہمراہ شریکِ طعام ہونا بالکل جائز ہے بشرطیکہ کوئی ایسی چیز کھانے میں نہ ہو جسے اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ بعد میں اس موضوع پر ایک طویل اور مبسوط مقالہ "احکامِ طعامِ اہلِ کتاب" شائع کیا۔

۲۰؍نومبر ۱۸۶۶ء ابنائے وطن کے لیے تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات کے پیشِ نظر

آگرہ دربار کے موقع پر ان کو ایک تمغہ حسن خدمت پیش کیے جانے کا اعلان کیا گیا۔

یکم جنوری ۱۸۶۷ — ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن لندن کے ممبر مقرر ہوتے یہ انجمن اس مقصد کے تحت قائم کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو جاعتی طور پر جو مسائل پیش آتے ہیں ان سے پارلیمنٹ کے ممبران کو روشناس کرایا جائے اور ان کے حل کی کوشش کی جائے۔ پارلیمنٹ کے اجلاس کے زمانے میں اس ایسوسی ایشن کے جلسے ہوتے تھے۔

۱۱ر فروری ۱۸۶۷ — تمغہ حسن کارکردگی جس کا اعلان ۲ر نومبر ۱۸۶۶ء کو ہوا تھا، دینے کے لیے لفٹیننٹ گورنر شمالی مغربی نے آگرہ میں دربار کیا۔ کیونکہ دربار کی نشستوں میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان امتیاز برتا گیا تھا اور ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مقابلہ میں نیچے جگہ دی گئی تھی۔ سید احمد ناراض ہو کر وہاں سے چلے آئے۔ اگلے روز ۱۲ر فروری کو اضلاع شمال مغربی کے سکریٹری مسٹر آرمسن نے اطلاع دی کہ آپ کا تمغہ معہ میکالے کی تصنیفات کے جو ۹ جلدوں پر مشتمل ہے میرے پاس آگیا ہے۔ کمشنر میرٹھ مسٹر ولیمس اس کو آپ تک پہنچا دیں گے۔

کچھ دنوں بعد انسٹی ٹیوٹ ہال کے ایک جلسہ میں یہ تمغہ سید احمد کو دیا گیا۔ جلسہ سے قبل مسٹر ولیمس اور سید احمد میں تکرار بھی ہوئی کمشنر نے کہا کہ "اگر یہ گورنمنٹ کا حکم نہ ہوتا تو میں یہ تمغہ تم کو نہ پہناتا۔ سید احمد نے جواب میں کہا کہ "اگر یہ سرکار کی طرف سے نہ ہوتا تو میں بھی تمہارے ہاتھ سے لینے سے انکار کر دیتا۔"

۱۸۶۷ — اودھ دربار کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے وائسرائے و گورنر جنرل لارڈ لارنس سے درخواست کی کہ وہ ہندوستانیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف کا اہتمام کریں۔ حکومت نے دو سال بعد ۱۳ر جون ۱۸۶۹ء کو ان ہندوستانیوں کے لیے جو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جانا چاہتے ہوں ۹ وظائف کا اعلان کیا۔ اسی میں سے ایک وظیفہ سید محمود کو بھی ملا۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

یکم اگست ۱۸۶۷ء برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کے سکریٹری کی حیثیت سے حکومت کو ورناکیولر یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو ہو قائم کرنے کی عرضداشت پیش کی۔

اگست ۱۸۶۷ء علی گڑھ سے بنارس تبادلہ ہوا اور عدالت خفیفہ (اسمال کاز کورٹ) کے جج کے عہدہ پر ترقی ہوئی۔

۱۵ اگست ۱۸۶۷ء اسمال کاز کورٹ کے جج کی حیثیت میں ان کے اولین مقدمات میں ہندی کے مشہور ادیب بابو بھارتیندو ہریش چندر کا مقدمہ پیش ہوا جس میں بابو صاحب پر عدم ادائیگی کے سلسلے میں چند ہزار روپیہ کی نالش کی گئی تھی۔ سید احمد ان کی شرافت و سادگی سے بے حد متاثر ہوئے اور عدالت سے باہر مدعی کو ذاتی طور پر کچھ رقم دے کر مقدمہ کو خارج کر دیا۔

۲۵ ستمبر ۱۸۶۷ء بنارس میں ہومیوپیتھک دواخانہ اور ہسپتال قائم کیا۔ سید احمد اس ہسپتال کے سکریٹری اور جے ایچ پی آئرن سائڈ جج بنارس اس کے صدر تھے۔

یکم اپریل ۱۸۶۹ء حکومت ہند نے اہل ہند کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ۹ وظائف کا اعلان کیا جن میں سے ایک سید محمود کو ملا تھا۔ اس لیے سید محمود کی تعلیم کا انتظام کرنے سرولیم میور کی کتاب "حیات محمد" کا جواب لکھنے اور مغربی نظام تعلیم سے راست معلومات حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے بنارس سے رخت سفر باندھا اور لندن جانے کے ارادہ سے سفر کا آغاز کیا۔ مسافران لندن کا یہ مختصر سا قافلہ سید احمد، سید حامد، سید محمود، مرزا خداداد بیگ اور سید احمد کے ذاتی ملازم چھجو پر مشتمل تھا۔ سید احمد نے اس سفر کے لیے اپنا کتب خانہ فروخت کیا، گھر وحائداد رہن رکھی اور پانچ ہزار روپیہ ۱۴ آنہ اور پانچ ہزار آٹھ آنہ فیصدی سود پر قرض لیا لوگوں کو جونہی سید احمد کے سفر انگلستان کی خبر ملی تو کسی نے تو مشہور کیا کہ مکے کے بدلے لندن کے حج کو جاتے ہیں اور کسی نے کہا کہ لندن جاکر ٹکسالی کرسٹان بن کر آئیں گے۔ اکبر نے طنزیہ کہا ؎

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

۲ / اپریل ۱۸۶۹ — الٰہ آباد پہنچے اور لیفٹننٹ گورنر سر ولیم میور سے ملاقات کی۔

۳ / اپریل ۱۸۶۹ — جبلپور پہنچے اور ڈاک گاڑی کی عدم دستیابی کی وجہ سے ۴ شبانروز بیل گاڑی سے سفر کرکے ناگپور پہنچے جہاں سے بذریعہ ٹرین بمبئی پہنچے اور ۹ اپریل کو بذریعہ اسٹیمر لندن کے لیے روانہ ہوئے۔

۸ / مئی ۱۸۶۹ — لندن پہنچنے پر اول دو دن چیرنگ کراس ہوٹل میں قیام کے بعد ۲۱ میکلن برک اسکوائر لندن ڈبلوسی میں منتقل ہوئے۔

۶ / اگست ۱۸۶۹ — ہندوستان کے سابق گورنر جنرل و وائسرائے لارڈ لارنس کی تحریک پر سید احمد کو سی ایس آئی کا خطاب ملا۔ انڈیا آفس میں منعقد ایک تقریب میں وزیر ہند ڈیوک آف آرگائل نے انھیں "نجم الہند" کا تمغہ پہنایا۔ ڈیوک آف آرگائل سائنٹفک سوسائٹی کے پیٹرن بھی تھے۔

۱۰ / مارچ ۱۸۷۰ — وزیر ہند کی دعوت پر وہ ملکہ برطانیہ کی لیوی میں شریک ہوئے جس میں سلطنت برطانیہ کے تمام عائدین شامل تھے۔ سید احمد کے علاوہ دوسرے ہندوستانی نواب ناظم بنگال اور ان کے صاحبزادے تھے۔

۹ / جون ۱۸۷۰ — چارلس ڈکنس نے پینی ریڈنگ کے آخری جلسہ میں شریک ہوئے اس جلسہ میں شرکا کو ایک پینی (پنس) فیس داخلہ ادا کرنی ہوتی تھی اور اس ادبی نشست میں چارلس ڈکنس اپنی نئی تخلیقات پیش کرتا تھا۔ اس دن کی نشست میں طبیعت خراب ہوئی اور دوسرے دن اس کا انتقال ہوگیا۔

۱۸۷۰ — رسول کریمؐ کی حیاتِ طیبہ پر سر ولیم میور کی کتاب کی تردید میں ۱۲ مقالات ۷۰-۱۸۶۹ کے دوران شائع کیے انھوں نے اپنے مقالات کا انگریزی ترجمہ اجرتاً حسن انگریز سے کرایا تھا اس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس

کی لیاقت کا کوئی انگریز ہندوستان میں نہیں، اس انگریزی کتاب کا اردو ایڈیشن معہ جدید اضافہ جات کے "الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ" کے عنوان سے تقریباً ۱۷ سال بعد ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا۔

۴ ستمبر ۱۸۷۰

انگلستان سے ہندوستان کے لیے روانگی۔ لندن میں ان کا قیام ایک سال پانچ ماہ رہا۔ اور شب و روز ان کاموں میں جن کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا مصروف رہے۔ ساتھ ہی اہلِ وطن کی تعلیم کا خیال بھی تھا۔ انھوں نے انگلستان کے طریقۂ تعلیم اور عام تعلیمی حالات کا مطالعہ کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی گئے۔ اور یونیورسٹی کے متعلق ہر جزئی و کلی معلومات حاصل کی۔ ان کے قیام کے دوران پارلیمنٹ میں لندن یونیورسٹی سے تعلق ایک نیا تعلیمی بل پیش ہوا۔ جس کا بہت چرچا تھا یہ بل آکسفورڈ اور کیمبرج کے پرانے نظامِ تعلیم کے برخلاف جدید خطوط پر تیار کیا گیا تھا۔ لندن کے قیام ہی کے دوران انھوں نے انگریزی میں ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں ہندوستانی طریقۂ تعلیم کے نقصانات بالتفصیل ظاہر کیے گئے تھے۔

سید احمد نے بنارس سے روانگی کے وقت ہی سے اپنا سفرنامہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا خلاصہ مسافرانِ لندن کے عنوان سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپتا رہا۔ اس سفرنامے کا یہ پہلو بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے کہ اس کی وساطت سے ان کی اس دَور کی قوم پرستی بھی اجاگر ہو کر سامنے آتی ہے۔ بعض مقامات پر ان کے قلم سے بے اختیار ایسے جملے نکلے جن سے واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے ملک کی غلامی کا انھیں احساس ہی نہیں تھا بلکہ ملک کو آزاد دیکھنے کی آرزو بھی ان کے دل میں کروٹیں لے رہی تھیں۔ انگلستان میں ایک بالکل نئی دنیا ان کو نظر آئی۔ اس دنیا کا ذکر انھوں نے سُنا تھا اور اس کے بسنے والوں کے برے زیادہ اور اچھے کم ہی نمونے انھوں نے اپنے ملک میں دیکھے تھے۔ انگلستان میں سید احمد کی جو قدر و منزلت ہوئی وہ اس وقت تک کسی ہندوستانی کے حصّہ میں نہیں آئی تھی۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۲؍ اکتوبر ۱۸۷۰ء سید حامد کے ہمراہ لندن سے بمبئی پہنچے۔ ان کا دل نئے حوصلوں، امنگوں اور ولولوں سے مملو تھا۔ ظاہری وضع قطع کی طرح ذہن و فکر کے اعتبار سے اب وہ ایک نئے انسان تھے۔ اس سفر نے ان کی خود اعتمادی کو تقویت بخشی اور ان کی قوتِ ارادی کو مضبوط کیا۔

۲۴؍ دسمبر ۱۸۷۰ء واپسی کے بعد ڈھائی ماہ کے اندر انھوں نے "تہذیب الاخلاق" کا اجرا کیا۔ یہ نام انھوں نے ابوعلی احمد بن محمد بن یعقوب ابن مسکویہ کی کتاب "تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق" سے مستعار لیا تھا۔

ٹیونس کے اخبار "الرائد التونسی" کے ماٹو سے متاثر ہو کر انھوں نے تہذیب الاخلاق کے سرنامے کے لیے یہ ماٹو تجویز کیا "قوم کی محبت ایمان کا جز ہے پس جو شخص اپنی قوم کی سربلندی کی کوشش کرتا ہے وہ دراصل اپنے دین کی سربلندی کی کوشش کرتا ہے"۔ یہ ماٹو رسالہ کے جلد ۲ شمارہ ۶ سے شائع ہونا شروع ہوا۔

تہذیب الاخلاق نے اصلاحِ معاشرہ کے علاوہ اردو کی بھی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ایک نیا اسلوب دیا۔ مخالفت کے باوجود اس کی اشاعت میں برابر اضافہ ہوتا گیا مگر سید احمد اپنی دوسری مصروفیات کی بنا پر بعد میں اس پرچہ پر خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے اس لیے یہ کئی بار بند ہوا۔ مگر مداحوں کے اصرار پر اس کو پھر شروع کرنا پڑا۔ تہذیب الاخلاق کے عرصۂ حیات کو ۳ ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

دور اول جلد ۱ — ۷ ۲۴؍ دسمبر ۱۸۷۰ء — ۲۰؍ جنوری ۱۸۷۶ء
دور دوم جلد ۱ — ۳ ۲۳؍ اپریل ۱۸۷۹ء — ۲۴؍ جولائی ۱۸۸۱ء
دور سوم جلد ۱ — ۳ ۷؍ اپریل ۱۸۹۴ء — ۳؍ فروری ۱۸۹۷ء

۲۶؍ دسمبر ۱۸۷۰ء انگلینڈ سے واپسی کے بعد سید احمد نے ایک اشتہار "التماس بخدمت اہلِ اسلام و حکامِ ہند درباب ترقی تعلیم مسلمانِ ہند" مختلف اخبارات میں شائع کرایا اور انفرادی طور پر مختلف افراد کو بھیجا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انگریزی دورِ حکومت میں تعلیمِ جدید سے جو فائدے عام طور پر ہندوستانیوں

کو مل رہے ہیں مسلمان اس سے مستفید نہیں ہوتے اس کے اسباب و علل کے دریافت کرنے کی طرف مسلمانوں کو خود متوجہ ہونا چاہیے۔ اسی مقصد کے تحت بنارس میں مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا۔ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کی تشکیل ہوئی۔ سید احمد اس کمیٹی کے سکریٹری قرار پائے۔

جلسہ میں طے ہوا کہ ایک اشتہار جاری کر کے لوگوں کو اظہارِ خیال کی دعوت دی جائے کہ وہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کے اسباب اور اس کے سدِ باب کے طریقۂ کار کا تعین کریں۔ اس مقصد کے لیے پانچ سو، تین سو اور دو سو روپے کے انعامات کا اعلان کیا گیا۔ جواب میں ۳۲ مضامین موصول ہوئے۔ سید احمد نے ان رسائل کی بنیاد پر ایک عمدہ رپورٹ تیار کی جس میں ان تمام مضامین کے خلاصے اور ان سے حاصل شدہ نتائج کے علاوہ کالج کے قیام کے لیے ایک مجمل اسکیم بھی تھی۔ ان سب کو یکجا رسالہ کی شکل میں شائع کر کے وسیع پیمانہ پر اس کی اشاعت کی۔ وائسرائے کے علاوہ مختلف صوبجات کے گورنروں اور اعلیٰ سرکاری افسران کو بھی اس کے نسخے ارسال کیے۔

۱۸۷۱ ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں اٹھائے گئے اعتراضات اور خدشات کا جواب دیا۔

۱۲ مئی ۱۸۷۲ کمیٹی خواستگار ترقی مسلمانان ہندوستان کے جلسہ میں کالج کے قیام کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے ۱۲۶ اساسی ممبران پر مشتمل ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ نواب محمد حسن میر مجلس اور سید احمد سکریٹری قرار پائے۔ کمیٹی کا نام مجلس خزنۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین رکھا گیا۔

یکم رجب ۱۲۸۹ھ تہذیب الاخلاق میں "مدرسۃ العلوم کیسا ہوگا" کے عنوان سے مجوزہ مدرسہ کا خاکہ شائع کیا۔ جس میں طلبا کی تہذیب و تربیت، عمارات رہائش، طریقۂ تعلیم، داخلہ فیس کے علاوہ درسیات کے مضامین پر

روشنی ڈالی تھی۔

۳۱ جولائی ۱۸۷۲ — سید احمد نے مجوزہ کالج کی اسکیم مختلف اشخاص کو روانہ کی تھی۔ اس کے جواب میں لارڈ نارتھ بروک نے اپنی جیب خاص سے کالج فنڈ کمیٹی کو ۱۰ ہزار روپیہ بہ چند شرائط دینے کا وعدہ فرمایا۔ حیدرآباد سے نواب سر سالار جنگ نے حکومت نظام کی طرف سے ۴ ہزار روپیہ کی امداد ۲ ہزار بالفعل اور ۲ ہزار بوقت قیام مدرسہ دینے کی اطلاع دی۔

۲۵ ستمبر ۱۸۷۲ — کالج فنڈ کمیٹی کی ہدایت پر یہ اعلان مشتہر کیا کہ مدرستہ العلوم کس شہر میں قائم کیا جائے۔ کمیٹی کی نومبر ۱۸۷۲ کی میٹنگ میں سید احمد نے ممبران کو مطلع کیا کہ سب سے زیادہ رائیں علی گڑھ کے حق میں ہیں کیونکہ آب و ہوا کی عمدگی کی بنا پر کوئی ضلع اس کے برابر نہیں ہے۔

۱۵ اپریل ۱۸۷۳ — کالج فنڈ کمیٹی کے جلسہ میں سید احمد خاں نے تحریک پیش کی کہ نواب کلب علی خاں صاحب والیِ رامپور مجلس خزنتہ البضاعۃ لتاسیس مدرستہ المسلمین کے پیٹرن مقرر کیے جائیں جنھوں نے کالج کے لیے تیس ہزار روپیہ کے پرامیسری نوٹ وقفی اور بارہ ہزار روپیہ نقد مرحمت کیا ہے۔ اس تاریخ تک کالج فنڈ میں ایک لاکھ ترپن ہزار چار سو بانوے روپیہ آٹھ آنے جمع ہو چکے تھے۔

۲۶ مئی ۱۸۷۳ — فراہمی چندہ کے لیے عظیم آباد (پٹنہ) کا دورہ کیا۔ کالج فنڈ کے لیے کیے گئے دوروں میں یہ سب سے پہلا سفر تھا۔ سید احمد جب کبھی بھی کالج کے لیے سفر کرتے وہ یا ان کے احباب اس کا بار کالج فنڈ پر نہیں ڈالتے تھے۔

۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ — فراہمی چندہ کے لیے دوسرا سفر لاہور کا ہوا۔

مارچ ۱۸۷۴ — حالانکہ گورنمنٹ نے مدرستہ العلوم کے لیے زمین دینا طے کر دیا تھا۔ مگر دو شرطیں عائد کی تھیں۔ اول عمارات سڑک سے دور ہوں۔ دوئم میونسپل ٹیکس ادا کیا جائے۔ ۲۸ جنوری ۱۸۷۵ کو تین شرطیں مزید عائد کیں کہ کمیٹی کو کسی دوسرے فریق کو زمین منتقل کرنے کا کوئی اختیار

ــــ ماہی فکر و آگہی (علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء)

نہ ہوگا۔ عمارات کے نقشہ جات سررشتہ تعمیرات سے منظور کرائے جائیں۔ اور اگر پانچ سال کے اندر تعمیرات مکمل نہ ہوں تو زمین گورنمنٹ کو واپس کر دی جائے گی۔

۲۴ اکتوبر ۱۸۷۴ء — کالج کو دی گئی اراضی کے قریب واقع بنگلوں کو فنڈ کمیٹی نے ۱۵ ہزار روپیہ میں خرید لیا۔

۲۰ مئی ۱۸۷۵ء — بنارس میں کالج فنڈ کمیٹی کے متعلقہ سکریٹری کو ہدایت کی گئی کہ مدرسۃ العلوم کا افتتاح یکم جون کی بجائے ۲۴ مئی کو کیا جائے اور وہ علی گڑھ میں تنظیم مدرسہ کمیٹی کے سکریٹری مولوی سمیع اللہ خاں کو اس تبدیلی کی اطلاع دیں کہ ۲۴ مئی کو کھولتے مدرسہ کی رسمات بجالائیں۔

۲۴ مئی ۱۸۷۵ء — مدرسۃ العلوم (ایم۔ اے۔ او کالج) کا افتتاح ہوا۔ سید احمد بنارس سے آکر تقریب میں شریک ہوئے۔

یکم جولائی ۱۸۷۵ء — سید احمد خاں کی تحریک پر کالج فنڈ کمیٹی نے سر ولیم میور اور مختار الملک سر سالار جنگ کو مدرسۃ العلوم کا وزیٹر مقرر کیا۔

۱۱ نومبر ۱۸۷۵ء — کالج فنڈ کمیٹی کی طرف سے کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے سر ولیم میور لیفٹننٹ گورنر اضلاع شمالی مغربی کی آمد کے موقع پر ایک رپورٹ پیش کی۔

۶ دسمبر ۱۸۷۵ء — ممبران سوسائٹی و مدرسۃ العلوم کی طرف سے مہاراجہ مہندر سنگھ مہاراجہ پٹیالہ کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا۔ مہاراجہ نے ۱۴ ہزار روپیہ نقد مرحمت فرمائے جس کی آمدنی سے طلبا کے لیے وظائف دیا جانا تجویز ہوا اور مدرسۃ العلوم کے لیے ۱۸۰۰ روپیہ سالانہ کی امداد کا اعلان کیا۔

۸ اپریل ۱۸۷۶ء — سید احمد کو بحیثیت سکریٹری فنڈ کمیٹی اراکین نے ہدایت کی کہ سابق گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک نے دس ہزار روپے کا جو عطیہ دیا تھا اس کی آمدنی سے طلبا کے لیے وظائف قائم کریں۔ شرائط کا فیصلہ سید احمد خاں پر چھوڑ دیا گیا۔

۳۱ جولائی ۱۸۷۶	ملازمت سے قبل از وقت سبکدوشی کی درخواست دی ۔منظوری کے بعد ۔ ۴۰۰ روپیہ ماہوار پنشن مقرر ہوئی۔ بنارس سے رخصت کے وقت اہلیانِ بنارس نے "سرسید میموریل" کی جانب سے الوداعیہ دیا۔ اس موقع پر کمیٹی کے پریسیڈنٹ راجہ شمبھونرائن سنگھ بہادر نے سپاسنامہ پیش کیا جو ایک چاندی کی کشتی میں زربفت سے ملفوف کرکے نذر کیا گیا۔ سید احمد خاں نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مدرستہ العلوم کا قیام ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ اس آرزو نے اب حقیقت کا جامہ پہن لیا ہے۔ مدرسہ کے دروازے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔
اگست ۱۸۷۶	مستقل قیام کے لیے علی گڑھ آمد۔ اور تفسیر القرآن لکھنے کی ابتدا۔
۸ر جنوری ۱۸۷۷	کالج کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں لارڈ لٹن گورنر جنرل و وائسرائے کو ممبرانِ کالج کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا۔
۲ر جون ۱۸۷۷	سر سُریندر ناتھ بنرجی کی علی گڑھ آمد کے موقع پر جو جلسہ ہوا اس کی صدارت کی۔ حکومت نے آئی۔سی۔ایس کے مقابلوں کے امتحان میں امیدواروں کی عمر ۲۱ سال سے کم کر کے ۱۹ سال کر دی تھی۔ مسٹر بنرجی اسی سلسلہ میں ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ سید احمد اس سے قبل ہی حکومت کے اس فیصلہ کے خلاف آواز اٹھا چکے تھے۔ اپنی صدارتی تقریر میں انھوں نے سابق گورنر جنرل لارڈ لارنس کی سفارشوں کا حوالہ دیتے ہوئے عمر کو ۲۱ سال سے بڑھا کر ۲۲ سال کرنے کی مانگ کی اور یہ کہ اس سروس میں ہندوستانیوں کو ترجیح دی جائے۔ اس کے علاوہ ان امتحانات کے انگلستان کی بجائے ہندوستان میں مختلف صوبوں کے صدر مقامات پر منعقد کیے جانے کی مانگ کی۔ ان مسائل پر وہ قبل سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھتے رہے تھے۔
۲۱ر ستمبر ۱۸۷۸	گورنر جنرل آف انڈیا کی کونسل کے ممبر کی حیثیت سے نامزدگی

کے بعد کونسل کے اجلاس میں پہلی مرتبہ شرکت کی۔ کونسل کی اس نشست میں دو سابقہ بلوں "رنگون پورٹ کمشنر بل" اور "ضابطہ دیوانی ترمیمی بل" کی منظوری دی گئی۔ دو نئے بل موسومہ "اودھ قانون مالگزاری ترمیمی بل" اور "برما کوسٹ لائٹ بل"، کونسل میں غور و خوض کے لیے پیش کیے گئے۔ جبکہ اشامپ بل پر بحث ۱۵ جنوری ۱۸۷۹ء کی نشست کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

۱۸۷۸ ہندوستانی دیہات کے نظام پر "قدیم نظام دیہی ہندوستان" شائع کیا جس کا موضوع ہے کہ قدیم زمانے میں گاؤں کی دیہی معاشرت، زراعت، تجارت کس طرح ایک تسلسل کے ساتھ برقرار رہی۔ اس کتاب کو تحریر کرنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ "جو لوگ مال گزاری اور بندوبست کے کام سے علاقہ رکھتے ہیں ان کو اپنے کام کی انجام دہی میں ایک نوع کی زیادہ بصیرت حاصل ہو۔"

۲۰ اکتوبر ۱۸۷۸ کالج کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کی غرض سے حکومت کی اجازت لے کر تیس ہزار روپیہ کی انعامی لاٹری کا اشتہار دیا۔

اس کی منتظمہ کمیٹی میں ضلع مجسٹریٹ جی ایل لنگ پریسیڈنٹ اور ممبران میں جی بی پولکر، ایچ جی اسمتھ، مولوی فریدالدین، منشی گنگا پرشاد شامل تھے۔ سید احمد کمیٹی کے سکریٹری تھے۔

۹ ستمبر ۱۸۷۹ وائسرائے کی کونسل کی ممبری کے زمانہ میں انھوں نے زرعی بینک قائم کرنے کے لیے ایک یادداشت "ترقی حیثیت اراضی و امداد کاشتکاران و تقرر بینک ہائے زراعتی" پر گورنمنٹ آف انڈیا کو پیش کی جو تین سال کی بعد ۲ جنوری ۱۸۸۳ کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کی گئی۔

۳۰ ستمبر ۱۸۷۹ چیچک کے ٹیکہ کو لازمی کرنے کے لیے قانون کا ایک مسودہ کونسل میں پیش کیا۔ اس زمانے تک وہ واحد ہندوستانی تھے جنھوں نے کونسل میں اپنی ممبری کے زمانے میں ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے

پرائیویٹ بل کونسل میں پیش کیے اور جو پاس ہو کر قانون بنے۔ یہ بل ۹ جولائی ۱۸۸۰ کو کونسل کی نشست میں پاس ہوا۔

۵ نومبر ۱۸۷۹ — قانون وقف جائداد کا مسودہ "ایک تدبیر مسلمانوں کے خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچانے کے لیے" شائع کیا۔ سواد اعظم کی طرف سے اس کی بہت مخالفت ہوئی اور انھوں نے اسے کونسل میں پیش نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

۲۳ جنوری ۱۸۸۰ — قانون قاضیان کونسل میں پیش کیا۔ یہ بل ۹ جولائی ۱۸۸۰ کو کونسل سے پاس ہوا۔

۹ جولائی ۱۸۸۰ — کونسل کے اجلاس میں آخری بار شرکت کی۔ حالانکہ ان کی دوسالہ مدت ممبری ختم نہیں ہوئی تھی۔ مگر کالج کی وجہ سے وہ اب اس میں زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۷۸ء سے ۹ جولائی ۱۸۸۰ء کے دوران ۴۸ بل کونسل میں منظوری کے لیے پیش ہوئے۔ سات بلوں کی سلیکٹ کمیٹی میں وہ ممبر رہے اور دو بل خود پیش کیے۔

۱۱ دسمبر ۱۸۸۰ — کالج فنڈ کمیٹی کی طرف سے سر جان اسٹریچی کو سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ سر اسٹریچی نے کالج کے لیے زمین حاصل کرنے اور دوسرے مسائل حل کرنے میں بیش بہا مدد دی تھی۔ ان کی ان ہی خدمات کے اعتراف میں کالج کا سینٹر ہال ان کے نام سے معنون کیا گیا۔

۱۸ مئی ۱۸۸۲ — جب لوکل سیلف گورنمنٹ کے سامنے پیش ہوا تو سید احمد نے اس پر خاصی طویل اور اسی قدر اہم تقریر کی۔ انھوں نے لوکل باڈیز کو وسیع تر اختیارات دینے پر زور دیا۔ ان کی کوششوں سے حکومت نے شمال مغربی اضلاع میں ایک تہائی کی نامزدگی اور دو تہائی کا انتخاب منظور کیا۔

۱۸۸۲-۸۳ — ایجوکیشن کمیشن کے جو ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی سربراہی میں قائم ہوا تھا ممبر مقرر ہوئے۔ کمیشن کے دوسرے ممبر گوالیار کے سردار کر راؤ تھے۔ کیونکہ سید احمد کو خود کمیشن کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کرانا تھا اس لیے

انھوں نے اپنی جگہ سید محمود کو ممبر مقرر کرایا اور خود اپنا بیان ریکارڈ کرایا سب سے اہم بات انھوں نے یہی کہی کہ جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی ہم اسی وقت ترقی کریں گے۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی جدّوجہد میں یہی پیمانہ تھا اور یونیورسٹی کے لیے جدّوجہد کرنے والے یہی آزادی چاہتے تھے۔

۱۸۸۳ "نمیقہ دربیان تصور شیخ"۔ ۴۰ صفحات پر مشتمل تصوف کے اہم موضوع پر کتاب کی اشاعت۔ یہ کتاب فارسی میں ہے۔

۱۸۸۳ محمڈن ایسوسی ایشن کا قیام جس کا مقصد مسلمانوں کی دنیاوی حالت کی ترقی اور بہبودی کے لیے کوشش کرنا، قانونی مسودات جو سرکاری کونسلوں میں پیش ہوتے ہیں ان میں اگر کوئی بات نامناسب ہو تو اس کی طرف توجہ دلانا تھا۔ کوئی سرکاری ملازم اس ایسوسی ایشن کا ممبر نہیں ہو سکتا تھا۔

۹ر مارچ ۱۸۸۳ لیجسلیٹو کونسل اضلاع شمالی مغربی اودھ (یوپی) کے اجلاس میں فوجداری قانون میں ترمیم پیش کی۔

۷ر مئی ۱۸۸۳ سریندر ناتھ بنرجی کی گرفتاری اور سزا کے خلاف جو احتجاجی جلسہ ہوا سید احمد خاں نے اس کی صدارت کی اور گرفتاری کے خلاف تقریر کی۔ ۱۸۸۴ میں جب رہا ہو کر مسٹر بنرجی علی گڑھ آئے تو اس موقع پر بھی جلسہ کی صدارت انھوں نے ہی فرمائی۔

انڈین سول سروس میں شریک ہونے والے امیدواروں کی عمر کے سوال پر تحریک چلانے کے سلسلہ میں جو نیشنل فنڈ قائم ہوا اس کی مقامی کمیٹی کے صدر سید احمد خاں ہی تھے۔

۱۱ر اگست ۱۸۸۳ محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کی تاکہ جو طلبا سول سروس کے امتحانات میں شریک ہونا چاہیں ان کے سفر اور تعلیم کے اخراجات فراہم کیے جائیں۔ اس وقت تک صرف ۲ مسلمان اس امتحان میں شریک ہوئے تھے مگر ناکام رہے۔ سر سیّد نے اس فنڈ کے جمع کرنے کی یہ ترکیب

بتائی کہ ہر ممبر دو روپیہ ماہوار چندہ دے اور اس ایسوسی ایشن کے اگر ۵۰۰ ممبرن جائیں تو ہر ماہ ہزار روپیہ جمع ہوتا جائے گا اور مستقلاً طالب علم انگلستان جاتے رہیں گے۔

۱۸۸۳ تصانیف احمدیہ حصہ اول۔ جلد اول کی اشاعت۔ اس جلد میں ان کے سات پرانے رسالے اور کتابیں جلاء القلوب، تحفہ حسن، کلمۃ الحق راہ سنت، نمیقہ، ترجمہ کیمیائے سعادت اور تبئین الکلام یکجا کر دیے گئے ہیں۔ اس جلد میں انھوں نے اپنی سابقہ تحریر پر خود ہی ریویو کیا ہے کیونکہ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد جب انھوں نے ان مسائل پر جدید نقطۂ نگاہ سے غور کیا تو پرانے خیال کا محاسبہ کرتے ہوئے یہ تحریر کیا کہ میرا پہلا خیال غلط تھا۔ اب میں اس مسئلہ کو اس طرح سوچتا ہوں۔ اس کتاب کی اشاعت کے وقت انھوں نے اس کا التزام رکھا کہ پہلے اصل مضمون شائع کیا اور بعد میں اس پر اپنا ریویو۔

۲۳ جنوری ۱۸۸۴ کالج کے لیے فنڈ جمع کرنے کے لیے پنجاب کے دورہ پر گئے کالج کے لیے فنڈ اور طلبا دونوں ہاتھ آئے۔ سید احمد نے پنجاب کا چار بار دورہ کیا سب سے پہلے ۱۸۷۳ء میں جس کی تفصیلات نہیں ملتیں ۱۸۸۴ء کا یہ دورہ کامیاب رہا۔ اسی کے بعد اہلِ پنجاب سے ان سے وہ تعلقات استوار ہوئے کہ سید احمد نے انھیں "زندہ دلان پنجاب" کا خطاب دیا جو آج بھی مستعمل ہے۔ خاتونانِ پنجاب کی طرف سے دیے گئے ایڈریس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ آج کی شب میرے لیے شب قدر سے کم نہیں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں اور بالخصوص آریہ سماج کی طرف سے بھی انھیں سپاسنامے پیش کیے گئے۔

۳۰ جون ۱۸۸۴ کالج فنڈ کمیٹی میں یہ تجویز پیش کی کہ مختلف کورسیز پر مشتمل ایک تفصیلی نصاب ان طلبا کے لیے تیار کیا جائے جو سائنس، ڈاکٹری، ایگریکلچر اور دوسرے مضامین میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ جانا چاہتے ہیں۔ ان خواہش مند طلبا کا الگ سے تربیت کا انتظام کیا جائے اور

اس کے لیے تین سال کا عرصہ رکھا گیا تھا کیونکہ سول سروس میں داخلہ کی عمر ۱۹ سال کر دی گئی تھی اس لیے امیدواروں کے لیے ضروری تھا کہ ۱۹ سال عمر ہونے سے قبل اس نصاب کی تکمیل کر لیں۔

۲۷ر نومبر ۱۸۸۵ — اپنی سوانح عمری کی پہلی جلد لندن سے بذریعہ ڈاک موصول ہونے پر کتاب کے مصنف کرنل گراہم کو خط تحریر کرتے ہوئے فارسی کے شعر کا ترجمہ لکھا کہ "اگر کسی میں ایک اچھائی اور ۷۰ برائیاں یکجا ہوں تو اس کے دوست اس کی صرف ایک اچھائی پر نظر رکھتے ہیں۔" آپ نے بھی اس کتاب کو تحریر کرتے وقت شاید اسی خیال کو پیش نظر رکھا ہے۔

۲۷ر دسمبر ۱۸۸۶ — محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (کانگریس) کا قیام۔ پہلا اجلاس علی گڑھ میں ہوا۔ مولوی سمیع اللہ اجلاس کے صدر تھے۔ سید احمد کانفرنس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اولاً اس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانگریس تھا مگر ۱۸۹۰ میں سید رضا حسن کی تحریک پر نام بدل کر کانفرنس رکھا گیا۔ پہلا اجلاس مدرسۃ العلوم کے احاطہ میں ہوا۔ مقامی افراد اور کالج کے طلبا کے علاوہ پنجاب وسط ہند اور صوبہ آگرہ و اودھ سے ۱۶۱ اصحاب نے شرکت کی۔ پہلی قرارداد سید احمد کی تھی جو کانفرنس کے مستقل اجلاسوں سے متعلق تھی۔ صدر دفتر علی گڑھ قرار پایا۔

۱۸۸۷ — الخطبات احمدیہ کی اشاعت۔ سر ولیم میور کی حیات محمد کے جواب میں انھوں نے لندن کے دوران قیام جو رسائل تحریر کیے اور جن کی اشاعت اسی دوران عمل میں آئی تھی خطبات احمدیہ کی یہ جلد اسی کا اردو ترجمہ تھی۔ مگر انگریزی ایڈیشن کے مقابلہ میں اس میں کافی اضافے کیے گئے تھے۔

۱۸۸۷ — لارڈ ڈفرن نے سول کمیشن کا ممبر مقرر کیا۔

۱۲ر مارچ ۱۸۸۸ — سید محمود کی شادی سید احمد کے ماموں زاد بھائی خواجہ اشرف الدین کی صاحبزادی مشرف جہاں بیگم سے ہوئی۔ سید محمود کی عمر اس وقت ۳۸ سال تھی۔

مئی ۱۸۸۸ — سید احمد خاں کو کے سی ایس آئی (نائٹ کمانڈر اسٹار آف انڈیا)

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کا خطاب دیا گیا۔ سند اور تمغہ طلبہ پرانسٹی ٹیوٹ ہال میں علی گڑھ کے کلکٹر مسٹر کینیڈی کی صدارت میں جلسہ ہوا جسے دربار سے موسوم کیا گیا ضلع کے سینئر ڈپٹی کلکٹر ای، ایچ ریڈس نے خطاب دیے جانے کا سرکاری اعلان پڑھا۔ اس موقع پر قرب و جوار کے اضلاع کے معززین شریک تھے۔

اگست ۱۸۸۸ء — پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی بنا ڈالی تاکہ جو لوگ کانگریس میں شریک نہیں ہیں ان کے خیالات و مسائل سے انگلستان کی پارلیمنٹ کے ارکان کو باخبر رکھا جائے۔

دسمبر ۱۸۸۸ء — محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے لاہور اجلاس میں سید احمد نے ضلع علی گڑھ کی مسلمان لینیوں اور مسلمانوں کے تعلیمی حالات بڑی تفصیل سے پیش کیے اس کے مطابق ضلع کی کل آبادی ۱۰۲۱۱۸۷ تھی جن میں مسلمان ۱۱۷۲۳۹ تھے، انھوں نے پورے ضلع اور شہر کے الگ الگ محلوں کا سروے کیا اس سے معلوم ہوا کہ ضلع کے سرکاری اسکول میں ۲۷۸ میں ۴۰ مسلمان تھے۔ ایم اے کالج میں ۲۱۱ میں ۱۰۸ مسلمان۔ شہر کے مختلف محلوں میں جو ۲۶ پاٹ شالے اور مکتب تھے ان میں ۲۳۴ میں سے ۲۱۳ مسلمان تھے۔ اس کے بعد انھوں نے پورے ضلع کا تفصیلی جائزہ لے کر بتایا ہے کہ مسلمان طلبار کی تعداد صرف ۱۶٫۹۲ فیصد تھی۔

۲۱ر فروری ۱۸۸۹ء — سید احمد خاں نے تین قلمی کتابیں۔ قرآن الحکیم، احادیث کا انتخاب حصن حصین اور دیوان حافظ جو دنیاوی اموال میں ان کا واحد اثاثہ تھا اور جن کی قیمت ان کے خیال میں پانچ سو روپیہ تھی۔ اپنے پوتے سید راس مسعود کو ہبہ کیں۔ ہبہ نامہ کی تحریر علامہ شبلی کی تھی۔ اس کی رجسٹری ۲۲ر فروری کو علی گڑھ کی عدالت میں ہوئی۔

جولائی ۱۸۸۹ء — سید احمد کی تعلیمی سماجی خدمات، ابنائے وطن کی بے لوث خدمت اور اعلیٰ پایہ کے تصنیفی کام کے پیش نظر ایڈنبرا یونیورسٹی نے انھیں ایل

ایل ڈی کی ڈگری دی۔ یہ ڈگری انھیں ان کی عدم موجودگی میں تفویض ہوئی تھی۔

۲۸ر دسمبر ۱۸۸۹ کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کے آخری جلسہ میں قانون ٹرسٹیان جو پہلے مشتہر ہو چکا تھا ممبران کی رائے موصول ہونے کے بعد منظوری کے لیے پیش کیا گیا۔ کالج کا انتظام اب تک مندرجہ ذیل ۵ خود مختار کمیٹیوں کے تحت تھا۔

۱۔ کالج فنڈ کمیٹی یا مجلس خزنۃ البضاعۃ۔ جس کے تحت کالج سے متعلق تمام آمدنیاں رہتی تھیں اور کالج کے تمام مالی اخراجات اس کمیٹی کی منظوری سے ہوتے تھے۔

۲۔ کمیٹی مدبران تعلیم السنۃ مختلفہ علوم دنیویہ۔

۳۔ کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اہل سنت والجماعت۔

۴۔ کمیٹی مدبران تعلیم مذہب شیعہ اثنا عشریہ۔

۵۔ کمیٹی منتظمہ، جس کے ہاتھ میں مدرسۃ العلوم اور بورڈنگ ہاؤس کے اندرونی انتظام کا اختیار تھا۔ قانون ٹرسٹیان کے نفاذ کے بعد یہ کمیٹیاں خود مختارانہ حیثیت ختم کر کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے تحت آ گئیں۔ سر سید الالف آنریری سکریٹری اور سید محمود الالف جوائنٹ آنریری سکریٹری قرار پائے۔

۶ر فروری ۱۸۹۰ کالج کے چندہ کے لیے نمائش میں پینی ریڈنگ کلب کے تحت ایک تھیٹر شو کیا جس میں سید احمد کے علاوہ ان کے دوست نواب محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی، ضلع کلکٹر مسٹر کینیڈی، سول سرجن ڈاکٹر مور پانی، مولوی محمد یوسف ایڈوکیٹ، مولانا شبلی، ایرانی شاعر آغا کمال سنجر، آغا محمد حسن اور کچھ طالب علموں نے حصہ لیا۔ ٹکٹ کی شرح پانچ روپیہ، دو روپیہ اور ایک روپیہ رکھی گئی تھی۔

۱۲ر اگست ۱۸۹۰ بورڈ آف ٹرسٹیز کا پہلا جلسہ ہوا۔

ستمبر ۱۸۹۱ سید احمد ایک ڈیپوٹیشن لے کر بھوپال اور حیدرآباد گئے۔ بھوپال

میں نواب شاہ جہاں بیگم نے ۱۲ ہزار روپیہ کا عطیہ دیا۔ ۱۰ستمبر کو نظام کو سپاسنامہ پیش کیا گیا جس میں لا کلاس کھولنے اور نظام میوزیم کی عمارت کے نامکمل حالات میں پڑے رہنے کا ذکر تھا۔ اسٹیٹ کی طرف سے کالج کی امداد بارہ ہزار روپیہ سالانہ ہو گئی۔ اس موقع پر حیدرآباد میں مقیم مدرسۃ العلوم کے سابق طلبا نے جن کی تعداد تقریباً ۵۲ تھی، اپنے محسن کو سپاسنامہ پیش کیا۔

۲۵ جون ۱۸۹۲ — انجمن الاخوۃ (برادرہڈ) کا قیام عمل میں آیا جس کے ہر رکن کو فیس ممبری کے بطور اپنی آمدنی کا ایک فیصد دینا لازم تھا سید احمد خاں نے انجمن کی ممبری حاصل کرنے کے لیے پرنسپل سے درجہ نہم میں داخلہ کی درخواست کی۔ کالج کے ابنائے قدیم و جدید دونوں الاخوۃ کے ممبر ہو سکتے تھے۔ اس انجمن کا مقصد آپس میں بھائی چارہ اور مفاہمت کو فروغ دینا تھا۔ یہ انجمن بعد میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں تبدیل ہو گئی۔

۱۸۹۲ — تحریر فی اصول التفسیر کی تصنیف۔

۱۸۹۳ — ابطال غلامی کی اشاعت جس کا موضوع تھا کہ غلامی انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔

جنوری ۱۸۹۴ — بڑے بیٹے سید حامد کا انتقال۔

۲۰ دسمبر ۱۸۹۴ — سید راس مسعود کی تقریب بسم اللہ ہوئی۔ اس تقریب میں موصول ہونے والی سلامی کالج فنڈ میں دے دی۔

۳۰ دسمبر ۱۸۹۴ — محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا کی داغ بیل۔ اس کا قیام کلکتہ کی اینگلو انڈین ڈیفنس ایسوسی ایشن کے طرز پر کیا گیا تھا۔ اس کے مقاصد میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے طریقوں پر غور کرنا اور ان کو روبعمل لانا شامل تھا۔ پہلے اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ پرنسپل بیک رڑکی کے تھامسن انجینئرنگ کالج کے پرنسپل کو مسلمان طلبا کے لیے داخلہ میں کچھ نشستیں

محفوظ کرنے کی طرف توجہ دلائیں۔ اس ایسوسی ایشن کے اجلاس عموماً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے موقع پر ہوتے تھے۔

جولائی ۱۸۹۵ — کالج کے ہیڈ کلرک شیام بہاری لال ناظر نے کالج فنڈ کا ایک لاکھ پانچ ہزار روپیہ غبن کیا۔ اس حادثہ کا سید احمد کی صحت پر بُرا اثر پڑا۔ اس حادثہ کے بعد روپیہ شہر میں لالہ سری رام کی تحویل میں رہنے لگا اور سید احمد خاں کے انتقال کے بعد خزانہ میں جمع ہونے لگا۔

۱۸۹۶ — اپنے نانا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ کے حالات پر سیرۃ فریدیہ تصنیف کی۔

۲۲ نومبر ۱۸۹۶ — ہز ہائنس محمد شاہ آغا خاں سوئم کو سپاسنامہ پیش کیا۔ یہ ان کا پیش کردہ آخری سپاسنامہ تھا۔ اسی کے بعد آغا خاں کا اس ادارہ سے ایک طویل تعلق شروع ہوا اور کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کے لیے جو کمیٹی بنی آغا خاں اس کے صدر تھے۔

مارچ ۱۸۹۸ — ازواجِ مطہرات پر مضمون لکھنا شروع کیا جو امہات المومنین کے جواب میں تھا جس کو ایک عیسائی پادری نے تحریر کیا تھا۔ اپنی موت سے ۱۶ دن قبل انھوں نے لاہور میں مولوی سید میر حسن (علامہ اقبال کے استاد) کو اس رسالہ کے تحریر کیے جانے کی اطلاع دی تھی۔ وہ اس رسالہ کو مکمل نہ کرسکے۔ ان کی موت کے بعد یہ رسالہ نامکمل حالت میں گزٹ کی کئی قسطوں میں شائع ہوا۔

۲۴ مارچ ۱۸۹۸ — احتباس البول کا عارضہ شروع ہوا۔ بیماری کے زمانے میں سید احمد کے دوست نواب محمد اسمٰعیل ان کو اپنے گھر دار الانس لے گئے تھے۔ کیونکہ ان کی کوٹھی سول سرجن کی کوٹھی سے بہت قریب تھی جو سید احمد کے معالج تھے۔ اس زمانہ میں بریلی کے سول سرجن کو بھی طلب کیا گیا۔ مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ۲۶ مارچ کو بیماری کی شدت تیز ہوگئی اور شدید سر درد تھا۔ کسی طرح چین نہ پڑتا تھا۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ — ۱۰ بجے شب سید احمد کی روح نے اعلیٰ علیین کی طرف پرواز کی۔ زندگی کے سفرنامے کا آخری ورق تمام ہوا۔

۲۸ مارچ ۱۸۹۸ — صبح کو غسل ہوا۔ کرکٹ گراؤنڈ پر نماز جنازہ ناظم دینیات عبداللہ انصاری نے پڑھائی۔ قبل نماز مغرب جامع مسجد کے گوشہ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

(بشکریہ تہذیب۔ کراچی۔ مارچ ۱۹۹۸ء)

۵۶

محمد علی جوہرؔ

عرضداشت

بخدمت سر سید احمد خاں مرحوم

بیاں کس طرح ہوا سے سید احمد خاں کہ کیا تم ہو
ہمارے عاشقِ دلدادہ تم ہو، دلربا تم ہو

تمھیں تھے پیشوائے قوم جب تک جان تھی تن میں
مگر سید مُوئے پر بھی ہمارے پیشوا تم ہو

تمھیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علی گڑھ میں
اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جابجا تم ہو

تمہاری روح منڈلاتی ہوئی پھرتی ہے کالج پر
قفس خالی ہے لیکن عندلیبِ باوفا تم ہو

لحد پر تیری کشکولِ گدائی سایہ افگن ہے
کہ زیرِ چرخ زیرِ خاک بھی قومی گدا تم ہو

صفِ آخر میں سرداروں کے رہتے تھے جو دنیا میں
تعجب کیا صفِ اوّل میں گر روز جزا تم ہو

جنہیں احساس ہے قومی محبت کا وہی جانیں
نہیں معلوم جس کو کیا کہیں اس سے کہ کیا تم ہو

ملا ہے تم کو ورثہ قوم کی مشکل کشائی کا
عزیزِ مصطفٰے تم ہو، عزیزِ مرتضیٰ تم ہو

رہا کرتے تھے اکثر سرگراں تم ہم سبک سر ہیں
جو تعبیرِ مذلت ہم ہیں تفسیرِ حیا تم ہو

تمھیں ہو زندۂ جاوید باقی جانے والے ہیں
نمونہ ہیں فنا کا، ہم تو تمثیلِ بقا تم ہو

سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں، تو اس کی ابتدا تم ہو

○

(۱۹۰۷ء میں سید مرحوم کی برسی کے لیے لکھی گئی اور
اولڈ بوائز کی سالانہ ضیافت کے موقع پر پڑھی گئی۔)

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

پروفیسر خلیق احمد نظامی

سر سید — ایک تعارف

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ برطانوی سامراج نے سارے ملک کو انتقامی آگ کے شعلوں میں ڈال دیا ہے۔ ہزاروں معصوم اور بے گناہ انسان ظلم اور بربریت کا شکار ہو رہے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے دیہاتوں میں جگہ جگہ درختوں سے نعشیں لٹکی ہوئی ہیں اور ان کے گرد کوّے اور چیلیں منڈلا رہی ہیں۔ دہلی کے بے شمار کنوئیں نعشوں سے پٹ گئے ہیں بازاروں کا عالم یہ ہے کہ:

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے، نہ کفن ہے، نہ رونے والے ہیں

غم اور مایوسی کی گھٹائیں ہر طرف سے امڈی چلی آرہی ہیں زندگی ایک بوجھ بن چکی ہے تارِ نفس سینوں میں کانٹا سا کھٹک رہا ہے۔ جو ہے کافور و کفن کی تمنا میں لگا ہے اور آسماں کی طرف دیکھ کر کہہ رہا ہے۔

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

اللہ کا ایک بندہ جب اس موجِ خوں کو سر سے گزرتا ہوا دیکھتا ہے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے مصلحت خاموش اشارہ کرتی ہے کہ گھر میں بیٹھو اور بہو بیٹوں کو سی لو۔ سہولت پسندی چپکے سے کان میں کہتی ہے کہ یہاں سے ہجرت کر جاؤ اور ان مصیبتوں سے نجات پاؤ۔ لیکن

وہ اولوالعزم انسان ناساعد حالات کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کر دیتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے کہ اپنی قوم کی ذلت اور نکبت سے نکالنے میں اپنی زندگی کے آخری لمحات تک صرف کر دے گا۔

"غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا، نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا . . . . آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ میں نے ہجرت کا ارادہ ترک کیا اور قوم کی بھلائی کے لیے جدوجہد کی راہ اختیار کی۔ میرے غمخوار مجھ کو اس سے منع کرتے تھے لیکن میرا دل ان سے یہ کہتا تھا:

حریف کاوش مژگان خوں ریزم نہ ناصح
بدست آور رگِ جانی و نشتر را تماشا کن

پھر میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ قوم کو اس زمانے کی ضرورت کے موافق تعلیم دینا اور یورپ کے علوم کا ان میں جاری کرنا کیا اسلام کے برخلاف ہے! مجھے جواب ملا کہ نہیں۔"

دل کے اس جواب نے سید احمد خاں کی زندگی کا رُخ متعین کر دیا۔ انھوں نے مغربی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے لیے تدبیریں سوچنی شروع کیں کہ اسی میں قومی زوال اور انتشار و ابتری کا علاج نظر آتا تھا لیکن یہ کام کسی طرح جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ مسلمان قدیم تہذیب کا خستہ لبادہ اوڑھے بیٹھے تھے اور افسانوی شتر مرغ کی طرح اپنی گردنوں کو عظمت گذشتہ کے ریگ زار میں چھپا رکھا تھا۔ اس طلسمی دنیا سے نکالنے کے لیے "نوائے تلخ" اور "عزمِ کوہکن" دونوں کی ضرورت تھی۔

نئے حالات میں پرانے نظامِ تعلیم کی بے مائگی اور بے بسی سب پر ظاہر ہو چکی تھی لیکن اس میں ترمیم کی ضرورت کسی کو نہ سوجھتی۔ سید احمد خاں نے اعلان کیا:

"ایسے ایسے مدرسوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس!

ماہنامہ فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں۔ اور مگر مچھ کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔۔۔ مرجھاتے ہوئے درخت کی جڑ میں پانی دینے کے بجائے اس کے پتوں پر پانی چھڑکتے ہیں اور سوکھے ہوئے چشموں سے نہریں کھود کر پانی لانے کی توقع کرتے ہیں!
۔۔۔ پچھلا طریقۂ تعلیم واقعی بہت اچھا تھا لیکن وہ تیلیاں جس ڈورے سے بندھی تھیں ٹوٹ گیا۔ اب دوسرا ڈورا ان کو باندھنے کو ہونا چاہیے۔"

اس نئے ڈورے کی تلاش نے سید احمد خاں کو سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا راستہ دکھایا اور انھوں نے اعلان کیا:

"ہنر، فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہیئے۔ ایک متعصب انسان کو ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے علوم سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔ اس کی عقل اور اس کی دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے اور تربیت و شائستگی، تہذیب اور انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا۔"

انھوں نے بار بار بتایا کہ ذہنی آزادی کے بغیر کوئی سماج ترقی نہیں کرسکتا جس قوم نے فکر پر بندشیں لگائیں اس نے اپنی موت کے محضر پر دستخط کر دیے۔ سائنٹفک سوسائٹی نے ہراول کا کام کیا اور سید احمد خاں کی مہم کے لیے راستہ تیار کر دیا۔

اب ایک درسگاہ کے خطوط ان کے ذہن میں ابھرنے لگے۔ ان کو واضح شکل دینے کے لیے لندن کا سفر ضروری محسوس ہوا وسائل کی تنگی نے دامن پکڑنا چاہا تو گھر بار بیچ کر بستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے:

"میرا تو مقصد ہی پورا نہیں ہوسکتا۔ جب تک میں بذات خود اصول اور طرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کرلوں۔"

اس سفر میں جس راہ سے گزرے، جس عمارت کو دیکھا، جس شخص سے ملے، جس جلسہ میں شرکت کی ان کے دل نے بے اختیار اپنے وطن کو پکارا۔

"میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست

ہو دور دراز کا سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ میں
آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں
اور مہذب آدمیوں کو دیکھا جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ
مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود عیش و آرام
کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوب صورت شخص کو دیکھا، مجھ کو
ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی۔ اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم
ایسی کیوں نہیں؟"

نہر سویز بنانے والا انجینئر Lesseps جہاز میں ہم سفر تھا۔ اس سے لوگوں کا
اصرار تھا کہ نہر کا نام اسی کے نام پر رکھا جائے۔ اس نے انکار کیا اور کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ
اس نہر کو canal of France کہا جائے یہ جواب سید احمد کی روح کو تڑپا گیا
اور وہ حسرت سے کہنے لگے:۔

"کاش میرے وطن میں بھی ایسے لوگ ہوتے جو قومی خدمت کو ذاتی
نام و نمود سے علٰحدہ رکھتے اور وطن کی خدمت کا جذبہ ذاتی منفعت پر
غالب آجاتا۔"

جب آکسفورڈ اور کیمبرج کی عالی شان عمارتوں سے گزرے، جب بھلی ال کے
لیکچر روم دیکھے، جب Fenner کے میدان میں طلبا کرکٹ کھیلتے ہوئے نظر آئے
جب Cherwell کے پرسکون سایہ دار درختوں میں ٹہل کر ان کو فکر و نظر کی دنیا
میں بساتے دیکھا اور جب یونین کلب میں ان ہی کو سرگرم گفتگو پایا تو ان کا بے چین دل
اور بے چین ہو گیا۔ ان کے ذہن نے ایک بے صبر انقلابی کی طرح اپنے ملک میں تعلیم کا
نیا خاکہ لندن ہی میں تیار کرنا شروع کر دیا۔

"وقت کم اور کام زیادہ۔ نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن
کو بڑھا دوں، نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت
دے دوں۔۔۔ کوئی رات نہیں جاتی کہ اس مدرسہ کے تقرر کی باتیں اور
تجویزیں نہ ہوتی ہوں۔

اے بھائی مہدی! اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیونکر آتا ہے؟ اور کس طرح پر
کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس
آن کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا۔ مگر مجھ کافر، مردود اور گردن مروڑی ہوئی
مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا!"

انگلستان سے واپسی پر سرسید نے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا تاکہ
قوم کو اس کی پستی کا احساس دلائیں اور توہمات کی تاریک دنیا سے نکال کر ترقی کی راہ
دکھائیں:

"میں نے تہذیب الاخلاق اس واسطے جاری کیا کہ ہندوستانیوں کے
دل جو مردہ ہو گئے ہیں ان میں کچھ تحریک لائی جا دے۔ ہندوستان کی حالت
ایک بند پانی کی سی ہو گئی ہے۔ جس سے طرح طرح کے نقصان اور مضرت کا
اندیشہ ہے۔ اس کے واسطے ایک چپو کی ضرورت ہے کہ وہ اس کو
ہلا دے۔"

تہذیب الاخلاق نے اس چپو کا کام کیا اور ایک بار خاموش سطح پر لہریں نظر آنے
لگیں۔ لیکن فرق یہ تھا کہ کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنے باپ کی نظروں سے چھپا کر اس
کو دیکھنا پڑتا تھا اور پنجاب میں لالہ لاجپت رائے کے باپ ان کو سختہ میں یہ پرچہ لاکر دیتے تھے۔
جب سرسید نے اصلاحی مضامین لکھنے شروع کیے تو ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ اور
مخالفت میں مضامین کی بوچھار ہو گئی، اور تو اور مولانا جمال الدین افغانی بھی اس مخالف
پروپیگنڈا کا شکار ہو گئے۔ کچھ دوستوں نے تردید میں کچھ لکھنا چاہا تو سید احمد خاں نے یہ کہہ
کر روک دیا:

"مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے میں تو ہدف تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز
بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید میرے بعد کوئی زمانہ آوے جب لوگ میری دلسوزی
کی قدر کریں۔"

جب ان مضامین سے کام نہ چلا تو مخالفین نے اپنے ترکش کا آخری تیر نکالا اور کفر
کے فتووں سے یلغار شروع کر دی۔ مخالفوں کی اس مہم نے سید احمد خاں کے عزم کی بنیادوں
میں سیسہ پگھلا کر بھر دیا۔ اور انھوں نے کہا کہ اس مخالفت کے بعد تو مجھے پورا یقین ہو گیا کہ میری

قوم کو اس نئی تعلیم کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ مذہبی بنیاد پر مخالفت کرنے والوں کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں، مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم، اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے۔ آپ کے لیے دولت سرا بناتے ہیں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں اور آپ کے لیے مسجد بناتے ہیں جس میں آپ خدائے واحد و ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوہڑے، چمار، قلی، کافر، بت پرست بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں، مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں پس آپ مجھ کو بھی اس مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی، چمار کے مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے اور اس کی وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا قلی چمار ہے، اپنے گھر کو نہ ڈھائیے کیا آپ مجھ ایک بدبخت، نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی قوم کو اور ان کی اولاد کو ڈبونا اور خراب خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں۔"

جب ان کی یہ آواز تعصب اور تنگ نظری کے پردے چاک نہ کر سکی تو غم اور حسرت کے ساتھ عواقب سے اس طرح آگاہ کیا:

"اے صاحبو ہماری زندگی قریب اختتام ہے۔ چند سال ہی ہماری تمہاری عمریں اور باقی ہیں۔ یہ سفید سفید داڑھیاں، پوپلے پوپلے منھ زمیں میں گڑ کر یا مرگھٹ پر جل کر خاک ہو جائیں گے، مگر یاد رکھو کہ یہ بچے جن کو تم نوجوان چھوڑ جاؤ گے ان کا یہ حال ہوگا کہ روز بروز مفلس اور ذلیل و خوار ہوں گے جیل خانے ان سے بھرا کریں گے۔

. . . اے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیز اور پیارے بچوں کو غارت نہ کرو۔ ان کی آیندہ زندگی اچھی طرح بسر ہونے کا ساماں کرو۔ مجھ کو تم کچھ ہی کہو۔ میری سنو یا نہ سنو۔ مگر یاد رکھو کہ اگر تم ایک قومی تعلیم کے طور پر ان کو

تعلیم نہ دوگے تو وہ آوارہ خراب ہوں گے۔ تم ان کی ابتر حالت کو دیکھوگے اور بے چین ہوگے، روؤگے اور کچھ نہ کرسکوگے۔ تم اگر مر جاؤگے تو اپنی اولاد کی زندگی دیکھ کر تمہاری روحیں قبروں میں تڑپیں گی۔ اور تم سے کچھ نہ ہوسکے گا۔ ابھی وقت ہے اور تم سب کچھ کرسکتے ہو۔ مگر یاد رکھو کہ میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اگر چند روز تم اسی طرح غافل رہے تو ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ تم چاہو گے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دو ان کی تربیت کرو مگر تم سے نہ ہوسکے گا۔ مجھ کو کچھ کہو، کافر، ملحد، نیچری۔ میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا۔ میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لیے کہتا ہوں تم انہیں پر رحم کرو اور ایسا کرو کہ آئندہ کو پچھتانا نہ پڑے۔"

قومی تعلیم کا یہ تصور لوگوں کے ذہن میں نہ آتا تھا وہ سمجھتے تھے کہ اپنی اولاد کی تعلیم کے لیے ان کی انفرادی کوششیں بار آور ہوجائیں۔ سر سید نے سمجھایا:

"یاد رکھو تعلیم اور تربیت کی مثال کمہار کے آوے کی سی ہے کہ جب تک تمام کچے برتن بہ ترتیب ایک جگہ نہیں چنے جاتے اور قاعدہ دان کمہار کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے کبھی نہیں پکتے۔ تم اگر چاہو کہ ایک ہانڈی کو آوے میں رکھ کر پکالو تو وہ ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔ ایک تم میں سے کوئی شخص یہ سوچتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی تعلیم خاص اپنے اہتمام سے اور ہر ایک علم کے عالم نوکر رکھ کر بخوبی کرسکتے ہیں، یا کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ ہم کو اپنی ہی تعلیم و تربیت کی فکر کرنی کافی ہے تو وہ سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ ایسی غلطی خود اپنی اولاد کے ساتھ دشمنی کرتا ہے، جہالت اور ناتربیتی وبا کی مانند ہوتی ہے، جب تک تمام شہر اس بدہوا سے پاک نہ ہو کوئی ایک گھر اپنے تئیں بچ نہیں سکتا۔"

بنارس میں "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" کا جلسہ ہونے والا ہے سر سید نے اپنے دوست محسن الملک کو ایک دن پہلے بلالیا کہ مدرسۃ العلوم کی اسکیم پر گفتگو ہوجائے۔ اس رات کی داستان خود محسن الملک کی زبانی سنیے

"رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا، گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی، دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو ان کی پلنگ پر نہ پایا۔ میں ان کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوس ناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔"

خون جگر کی اس آمیزش سے سرسید نے مدرسۃ العلوم کا خمیر تیار کیا تعلیمی مہم روپیہ کے بغیر ہاتھ پر سرسوں جمانے کے مترادف تھی۔ روپیہ حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ جو لوگ نام و نمود پر ہزاروں لاکھوں روپیہ خرچ کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے ان سے تعلیم کے لیے چند روپیہ بھی حاصل کرنا دشوار تھا۔

"آہ کیا افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے عزیز بیٹے کی بسم اللہ میں ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے ہو۔ اس خوشی میں ہمارا بیٹا پڑھنا شروع کرنے کے لائق ہوا لیکن اس جگہ کے بنانے اور قائم کرنے کی کچھ فکر نہیں کرتے جہاں وہ پڑھے اور تمہاری اس خوشی کو جو قبل از وقوع تم نے فرض کرلیا ہے پورا کرے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بغیر بوئے ہم کھیتی کاٹنے کی توقع کرتے ہیں اور زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اسی غلطی میں پڑے ہیں اور اس کی درستی کی کوئی فکر نہیں۔"

سرسید نے ہمت نہ ہاری۔ دوستوں اور ساتھیوں سے سب سے زیادہ مطالبے کیے۔ ان کے دوست چندہ دیتے دیتے تھک گئے لیکن وہ مانگتے مانگتے نہ تھکتے۔ لیکن صرف دوستوں کی مدد سے یہ مہم کب سر ہو سکتی تھی۔ مجبوراً اور بے بس ہو کر فقیروں کا لباس پہنا اور گلے میں جھولی ڈال کر دربدر بھیک مانگنے نکل کھڑے ہوئے۔ ہندوستان نے فقیروں اور گداگروں کی بے شمار قسمیں دیکھی تھیں لیکن

یہ نومی گداگر جس نے صدا لگائی تھی۔ ان سب سے مختلف تھا۔ اس کی اس گداگری پر ہزار دل ماریں قربان تھیں اور اس کے اس کاسۂ گدائی کے آگے جام جم بھی بے حقیقت تھا۔ ایک دن بڑے رنج سے کہا:

"اب ہمارا تو یہ حال ہوگیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہوگئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا، اس لکھے کی بد ملاتا ہوں۔ مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔"

پھر ایک تھیٹر ترتیب دیا اور چندہ حاصل کرنے کے لیے اسٹیج پر آکر آواز لگائی۔

قوم ما اے قوم ما کز بہر تو
دادہ ام بر باد ننگ و نام را

اور کہا "کون ہے جو آج مجھ کو اس اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا۔ وہی جس کے دل میں اپنی قوم کا درد نہیں۔ وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو ان باتوں کو جن پر شرم و حیا اور غیرت ہونی چاہیے اپنی شیخی اور اپنے افتخار کا باعث سمجھے۔ آہ اس قوم پر جو قوم کی، انسان کی بھلائی کے کاموں کو جو نیک نیتی سے نیکی کے لیے کیے جاویں بے عزتی کا کام سمجھے۔"

"آہ اس قوم پر جو خدا کو دھوکہ دینے کے لیے مکر یا پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع اپنے منہ پر ڈالے مگر اپنی بدصورتی اور دل کی برائی کا علاج نہ سوچے۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے، اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسی بے شرمی کہ بے حیائی بھی شرما جاوے۔ لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفرین کا کام سمجھے۔"

"اے رئیسو اور دولت مندو! تم اپنی دولت اور حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کی حالت بری ہو مگر ہمارے بچوں کے لیے سب کچھ ہے، یہی ان لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے۔ مگر اب ان ہی کے بچوں کی

وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں۔"

شبلی کا غم زدہ دل یہ منظر دیکھ کر رو دیا:

دوستو کیا تمہیں سچ مچ ہی تماشے کا یقیں | کیا یہ سمجھے تھے کہ پردہ کوئی ہوگا رنگیں
نظر آئے گی جو سوئی ہوئی ایک زہرہ جبیں | آئے گا پھول کے لینے کو ارم کا گلچیں
قوم کی بزم کو یوں کھیل تماشا سمجھے | ہائے گر آپ یہ سمجھے تھے تو بے جا سمجھے
نوحۂ غم ہے یہاں نغمۂ عشرت کیسا | ہے یہ حسرت کا سماں جوشِ مسرت کیسا
ہے جنوں خیز یہ ہنگامۂ عبرت کیسا | قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیسا
ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے | دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے
قوم کے خواب پریشاں کی یہ تعبیریں ہیں | ایکٹر یہ نہیں عبرت کی یہ تصویریں ہیں

جب کچھ چندہ جمع ہوگیا تو سرسید نے عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ تیزی سے شروع کر دیا اور رات دن اسی میں مصروف رہنے لگے۔ اکثر ایسی تنگی کی حالت میں کہ گھر میں خرچ کرنے کو ایک پیسہ نہ ہوتا تھا اپنی ساری تنخواہ خزانہ سے منگوا کر مدرسہ کی ضرورتوں میں اٹھا دیتے تھے اور خود قرض پر گزارا کرتے تھے۔ احسان ناشناس قوم نے یہ کہہ کر دل کے زخموں پر نمک چھڑک دیا کہ مالی فائدے کی توقع اس انہماک کا باعث ہے۔ ایک دن ضبط نہ کر سکے تو پکار اٹھے۔

"مجھے اس بات کے کہنے سے شرم آتی ہے کہ میری محنت اور جانفشانی اور تدبیر تھی جو آپ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی اس قدر عالی شان عمارتیں بنی ہوئی دیکھتے ہیں... جو محنت اور مشقت میں نے کی ہے اور جاڑے گرمی برسات میں محنت اٹھائی ہے، قلی کا کام میں نے کیا ہے اور سیر کا کام میں نے کیا ہے۔ انجینئر کا کام میں نے کیا ہے۔ اپنا ذاتی روپیہ خرچ کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ اس کا صلہ ہمارے دوستوں نے اس پمفلٹ میں جو خاص علی گڑھ میں چھاپ کر مشتہر کر دیا ہے کہ تعمیر کا کام سکریٹری اس لیے اپنے اختیار میں رکھتے ہیں کہ ان کو بھی نفع کثیر ہوا کرے جزاہ اللہ ثم جزاہ اللہ۔

"مگر اے دوستو! میں ان باتوں سے رنجیدہ نہیں ہوتا۔ میری قوم نے

مجھ کو اس سے بھی زیادہ سخت و سست کہا ہے۔ اگر قوم کی ایسی بدتر حالت نہ ہوتی تو ہم سب کو قومی بھلائی کی اس قدر فکر کیوں ہوتی کبھی کبھی میں کہہ اٹھتا ہوں اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ مگر درحقیقت میں نے اپنی قوم کے لیے جو کچھ کیا ہو وہ نہ توقع صلۂ قوم کیا ہے اور نہ امید اجر من اللہ ۔

فاش می گویم واز گفتہ خود دل شادم
بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم"

ایک دن اپنوں اور غیروں کی بے رحم تنقید سن کر کچھ دل شکستہ سے ہو گئے اور اپنے مقصد میں ناکامی کے خیال نے کچھ غیر معمولی آزردہ کر دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ عزم اور ہمت کے سوتے ابل پڑے اور بولے:

"کالج سے میری کوئی ذاتی غرض بجز اس کے کہ میں نے قومی بھلائی، قومی بہتری اور قومی بہبودی کے لیے کیا ہے، مطلق نہیں ہے۔ اگر فرض کرو اس میں کامیابی نہ ہو تو کیا۔ ہزاروں انبیاء اور ریفارمر زمین کے تلے دبے پڑے ہیں جن کی بے انتہا کوششیں اپنی قوم کے لیے برباد ہو گئی ہیں۔ پھر اگر ادنیٰ کوشش بیکار ہو جائے تو اس کی کیا حقیقت ہے نوح نے نو سو برس کوشش کی گو غصہ میں کہہ اٹھے۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا

مگر اس کشتی کو جو طوفان کی موجوں میں ہمالیہ پہاڑ سے بھی زیادہ لہرا رہی تھی قوم کو ڈوبتے ہوئے دیکھتا تھا اور کہتا تھا، خدا تیری مرضی۔ سقراط قومی خدمات کے بدلے زہر کا پیالہ پی رہا تھا اور قوم کو نصیحت کرتا جاتا تھا۔ پس اگر یہ واقعات میری کوششوں پر بھی گزریں تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مگر سمجھ لو کہ قومی بھلائی چاہنے والے تو مر جاتے ہیں اور ان کی کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ مگر خدا کی لعنت قوم پر باقی رہ جاتی ہے۔ اے خدا! او خدا! تو میری قوم کے ساتھ ایسا مت کیجیو"

جوں جوں ان کا جگر خون ہوتا گیا اور اشک عنابی بنتے رہے، ان کے لگائے ہوئے پودے پر تازگی اور توانائی کے آثار نمودار ہونے لگے۔

برسوں کی مسلسل جدوجہد نے بالآخر فضا ہموار کر دی۔ سید احمد خاں کا خواب ـــــ

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اور علی گڑھ کے خاموش ویرانہ میں بہار کے آثار نظر آنے لگے۔ حالی نے اس طرح دعوت دی ؎

اگر رکھتے ہیں دل پہلو میں آکر یہ چمن دیکھیں ۔۔۔ ریاض قوم کا فصل خزاں میں بانکپن دیکھیں
کلب میں آ کے گر احباب رنگِ انجمن دیکھیں ۔۔۔ تو زیبِ کرسی صدر اک مجسم یونین دیکھیں
نہ دیکھی ہوں جنھوں نے شفقت و طاعت کی تصویریں ۔۔۔ وہ بک اور اس کے شاگرد دل کو باہم ہم سخن دیکھیں
تاسف کرتے ہیں جو ہند کی نا اتفاقی پر ۔۔۔ کلب میں ہندیوں کے آئیں اور یہ یونین دیکھیں
اگر باور نہ ہو اخلاص سنی اور شیعی کا ۔۔۔ بہم شیر و شکر یاں چار یار و پنجتن دیکھیں
نہ دیکھا ہو جنھوں نے پیار ہندو اور مسلماں کا ۔۔۔ وہ آکر مسلم و ہندو کو یک جان و دو تن دیکھیں
مسیحی پوششیں دیکھیں مسلمانوں کے بچوں کو ۔۔۔ مسیحی کو مسلمانی قبا زیبِ بدن دیکھیں
مجسم دیکھنی ہو شکلِ مہرِ مادری جن کو ۔۔۔ وہ بچوں سے سلوکِ آرنلڈ و میرسین دیکھیں
اگر ہو دیکھنی تقریر میں تصویر معنی کی ۔۔۔ تو والس کا بوقتِ درس اندازِ سخن دیکھیں
دمِ تدریس دیکھیں چکرورتی کو اگر برسوں ۔۔۔ نہ پیشانی پہ بل دیکھیں نہ ابرو میں شکن دیکھیں
ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن ۔۔۔ تو شبلی سا وحیدِ عصر و یکتائے زمن دیکھیں
اگر بوجعفرِ طوسی کو زندہ دیکھنا چاہیں ۔۔۔ تو عباس ابن جعفر سا محیطِ علم و فن دیکھیں
پھر ان کے بعد دیکھیں اک مربی اپنے بچوں کا ۔۔۔ تو اک بچوں سے بڑھ کر زندہ دل پیرِ کہن دیکھیں
خوشی میں رنج میں، صحت میں، بیماری میں، دکھ سکھ میں ۔۔۔ اسے جب آ کے دیکھیں قوم کی دھن میں مگن دیکھیں
نہ سمجھیں یہ کہ ہے اس کو ہماری مدح کی پروا ۔۔۔ اگر سید کا استحقاق اہلِ انجمن دیکھیں

محب قوم سنتا ہے در و دیوار سے تحسیں
جنھیں باور نہ آئے وہ محبِ قوم بن دیکھیں

سرسید کا قوی ہیکل جسم کبھی اسٹریچی ہال کے اندر آتے دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا جیسے کوئی جہاز بادبان پھیلائے طوفانی موجوں میں چل رہا ہے، اب کمزور ناتواں ہو چکے ہیں ذرا تکلف سے داخل ہوتے ہیں ؎

صورت سے عیاں جلال شاہی ۔۔۔ چہرہ پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی ۔۔۔ چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم ۔۔۔ توقیر کی صورت مجسم

سارا مجمع مجسم ادب بن جاتا اور ہزاروں نظریں اس "پیر زندہ دل" پر گڑ جاتی ہیں۔ حالی کا دل جذبات سے امنڈ آتا ہے۔ فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں اور سید کی طرف رُخ کر کے پڑھتے ہیں:

عزیزو حق کی نعمت ہے کہ پیر ناتواں ہم میں
پھر ایسا پیر ہے ہم میں نہ کوئی نوجواں ہم میں

ہزاروں ہم میں ہوں گے بچلپر اور ساسر پیدا
مگر اے قوم پھر یہ صورتیں پیدا کہاں ہم میں

عزیزوں کو خدا وہ نامبارک دن نہ دکھلائے
کہ سایہ تیری ہمدردی کا ان کے سر سے اٹھ جائے

تیرے احسان رہ رہ کے صدا یاد آئیں گے ان کو
کریں گے ذکر ہر مجلس میں اور دہرائیں گے ان کو

جنھوں نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے
انھوں نے پھل سدا محنت کا کم دنیا میں پایا ہے

یہ تیری خوش نصیبی تھی کہ ثمرہ تیری کوشش کا
خدا نے زندگانی میں تری تجھ کو دکھایا ہے

بہت جھکڑ چلے اور آئیں اکثر آندھیاں لیکن
رہا گلزار ہو کر باغ جو تو نے لگایا ہے

امیدیں ہیں بہت وابستہ تیری زندگانی سے
دعائیں قوم کی لے لے کے عمر اپنی بڑھایا ہے

سر سید عصا کا سہارا لے کر مشکل سے کھڑے ہوتے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں آواز بھرا گئی ہے لیکن عزم و خلوص کی دل گیری اب بھی باقی ہے۔

"عزیزو! میرے بےچین دل کو آج کچھ قرار سا آ گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کو ہے۔ میں اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوا چاہتا ہوں۔ میری ہڈیوں کو اس غم نے گھلا دیا تھا کہ میں دیکھتا تھا کہ وقت کا قافلہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے لیکن تم ہو کہ خواب گراں سے بیدار ہونے کا نام نہیں لیتے۔ میں نے برسوں لگاتار تمھیں جگانے کی جدّ و جہد کی۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جب اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بستر غم و اندوہ پر بے قراری کی کروٹیں نہ بدلی ہوں۔ آج مجھ کی محرابیں اور اسٹریچی ہال کے یہ بام و در دیکھتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کی بے قراریوں نے اس کالج کا پیکر اختیار کر لیا ہے۔ دیکھو میری ایک نصیحت یاد رکھنا۔

ماہی فکر و آگہی علی گڑھ مسر ۲۰۰۰ء

خدا کا کوئی حکم تحریری نہیں آتا۔ مگر زمانہ کے حالات سے پایا جاتا ہے":
دیکھو زمانہ کی آواز اب بھی آرہی ہے ؎

اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو
وہ ناصح اور ہونگے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
خبر تم کو بھی ہے کچھ اے مری چالوں سے بیگانو
مری بازی کا منصوبہ گیا اک ۔ کا پلٹ یارو
نصیحت میری مانو اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ
پھری جس وقت دیکھو میری چِتون تم بھی پھر جاؤ

۱۸۹۸ء ہے اور مارچ کی ۲۸ تاریخ۔ سورج آہستہ آہستہ مشرق سے ابھر رہا ہے اور اس کی کرنیں وکٹوریہ گیٹ کے سر بفلک کلس اور اسٹریچی ہال کی وسیع پیشانی سے ٹکرا کر ہر طرف پھیلنے کی کوشش کر رہی ہیں، لیکن بجائے روشنی پھیلنے کے اندھیرا بڑھتا جارہا ہے، فضائیں اداس ہیں اور ہر در و دیوار سے غم اور مایوسی ٹپک رہی ہے۔ ابھی کچھ گھنٹے پہلے وہ آفتاب غروب ہو چکا ہے جس کی ضیا پاشیوں سے کالج کے بام و در برسوں تک جگمگا رہے تھے۔ اپنے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک دوست کی کوٹھی میں سر سید علیہ الرحمۃ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دنیا نے ایسا محسوس کیا کہ:

دھوپ بھی، گئی آفتاب کے ساتھ

پچاس سال تک کوئی سورج ایسا طلوع نہیں ہوا تھا جس نے اس انسان کو اپنی قوم کی فکر میں مبتلا نہ پایا ہو، آسمان پر بکھرے ہوئے بے شمار ستاروں نے اس کی آہ و فغاں نیم شبی سنی تھی۔ وہ سوتا تھا تو قوم کے غم میں، اور جاگتا تھا تو قوم کی فکر میں، اس نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ ایک ہی غم میں بسر کیا تھا اور وہ یہ کہ قوم کسی طرح خواب گراں سے بیدار ہو تعصب اور تنگ نظری کی دلدل سے باہر نکلے اور عزم و ہمت کے ساتھ وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینا سیکھے۔ اس کی موت کا یقین نہیں آتا۔ ہر سننے والا حیران ہے اور سوچتا ہے کہ اس اولوالعزم انسان کو موت نے کس طرح زیر کیا ہوگا۔ اور خود موت پر کیا گزری ہوگی۔

کرکٹ لان پر سر سید کا جنازہ رکھا ہے۔ بے شمار خلقت جمع ہے ہزاروں انسان جن کے دل صدمہ سے بے چین اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں صف بستہ کھڑے ہیں ان میں مسلمان بھی ہیں، ہندو بھی اور عیسائی بھی۔ یوں تو سب ہی غمگین نظر آتے ہیں لیکن

۱۔ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

دوسری طرف سے زار وقطار رونے اور دل کو دہلا دینے والی آہوں کی آواز آرہی ہیں۔
ایک طرف کالج کے وہ طلباء ہیں جن کے مستقبل کی فکر نے مرنے والے کو عمر بھر خواب
اور راحت سے محروم رکھا تھا اور اب ایسا سو گیا ہے کہ دل سوز صدائیں بھی اس کو بیدار
نہیں کر سکتیں۔ اس کی گہری نیند دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اب شاید: ؎

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا

دوسری طرف وہ راج، مزدور، بڑھئی اور سنگ تراش ہیں جن کے ساتھ ۲۶،۲۵ سال
تک اس نے علی گڑھ کی تپتی ہوئی دوپہریں گزاری تھیں، ان کی عورتیں اور بچے جو دیہات
سے یہ جانکاہ خبر سن کر آگئے ہیں۔ اپنے محبوب آقا کو آخری سلام کر رہے ہیں:

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بہ دعا آرزو کنند

تھوڑی سی دیر میں سرسید کا قوی ہیکل جسم مسجد کے ایک گوشہ میں سپرد خاک کر دیا
گیا۔ اور تاریخ کا ایک دور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

عرش کے نوری زمیں کے فرش پر آنے کو ہیں ۔۔۔ اور ایک خاکی کو سیر خلد دکھلانے کو ہیں
باغ جنت کو سدھارا سید عالی مقام ۔۔۔ راہ میں اس کی ملائک نور برسانے کو ہیں

بوسہ گاہ قوم ہوگا تیرا سنگ آستاں
نقش پا پر تیرے لاکھوں قافلے آنے کو ہیں

اسٹریچی ہال میں جلسہ ہے۔ محسن الملک کرسی صدارت پر بیٹھے ہیں ہزاروں نمناک
آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی ہیں۔ خوشی محمد ناظر کا دل یہ حسرت ناک منظر دیکھ کر بھر آتا ہے
ڈائس پر جا کر یہ شعر پڑھتے ہیں اور دل پکڑ کر وہیں بیٹھ جاتے ہیں۔

ہائے بزم قوم میں اب جلوہ فرمائے گا کون؟
ماہ کی مانند ہالے میں نظر آئے گا کون؟
یوں تو لاکھوں آئیں گے اس نجد میں اور جائیں گے
سید احمد سا جنوں ساماں مگر آئے گا کون؟

خاموش مجمع سے سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہر شخص ایک دوسرے کی طرف
دیکھتا تھا اور خاموش تھا۔ شبلی اپنی جگہ سے اٹھے اور آہستہ آہستہ ڈائس کی طرف بڑھے۔

رسالہ فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مجمع پر ایک نظر ڈالی اور بولے۔

"سید احمد خاں اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں چلے گئے۔ دیکھو ہماری قومی عمارت کے ستون ہل رہے ہیں۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اس وقت طاقت گویائی کہاں سے لاؤں؟"

حضرات! اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی قرار پا سکتا ہے تو اس کا آغاز، اس کی نشو و نما، اس کی ترقی، اس کی نمود، اس کا جو کچھ ہوا اس کالج سے ہوا اور یہ کالج جلوہ ہے اسی بڑے شخص کا۔

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

اس کی شخصیت میں کیا جادو تھا، اس کی نظر میں کیا تاثیر تھی، اس کی آواز میں میں کیا کشش تھی۔

دل ہاتھ سے لینے میں یلا تھی — جادو تھی، فسوں تھی، جانے کیا تھی
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں — نشتر سی اتر گئی جگر میں
صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرے پہ فروغ صبح گاہی
لب پہ ہے فغاں کہ اب بھی جاگو — اے خواب گراں کے سونے والو
تا چند رہو گے مست و سرشار — اٹھو کہ سحر ہوئی نمودار

شبلی فرطِ غم سے کچھ ایسے مغلوب ہوئے کہ آگے کچھ کہہ نہ سکے اور بیٹھ گئے۔

محسن الملک نے حالی کی طرف دیکھا اور کہا:

"آپ کچھ کہیں گے!"

یہ جملہ کیا تھا، ایک تیر تھا جو حالی کے دل میں اتر گیا۔

ایک آہ بھری سن کے یہ حالی نے کہ جس سے
دل دہل گئے سب کے لہو ہو گئے پانی

آنسوؤں کی جھڑی ان کے آنکھوں سے چل رہی تھی، چند منٹ تک خاموش کھڑے رہے گردن سے رومال کھولا اور آنکھوں پر رکھ لیا پھر اپنے پر قابو پا کر بولے:

حضرات! دل کی چمک کون دکھا سکتا ہے۔ جو میں دکھانے کی کوشش کروں۔ سر سید کیا گئے، ایک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ،

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ایک نادار ملک کا گنجِ بے بہا، اور میرا مرشد، رہبر اور دوست جاتا رہا۔ ہم نے اس سے قومی خدمت کا مفہوم سیکھا، دوسروں کے لیے اپنی زندگی کا عیش و آرام قربان کر دینے کا سبق پڑھا، جب وہ قومی خدمت کے دشوار گزار راستہ پر آگے بڑھا تو بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے، بہت سے افتاں وخیزاں آگے بڑھے لیکن ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں اور پیروں پر چھالے پڑ گئے، دم چڑھ گیا اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ لیکن وہ اولوالعزم انسان اسی طرح تازہ دم رہا۔ نہ اسے راستے کی تھکان نے مضمحل کیا، نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے سے اس کی ہمت ٹوٹی نہ منزل کی دوری نے اس میں ہراس پیدا کیا۔ اب یہ لیل ونہار دوسرا سید احمد پیدا نہ کر سکیں گے۔"[۱]

محسن الملک کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں بڑی مشکل سے سہارا لے کر کھڑے ہوئے اور کہا:

"جس جگہ آج میں تقریر کرنے کھڑا ہوا ہوں۔۔"

اتنا کہا اور رونے لگے۔ اس جگہ سے ذرا ہٹ گئے اور پھر بولے:

"یہاں سرسید مرحوم کھڑے ہوا کرتے تھے۔ مجھے صرف ان کی ذات سے ہی محبت نہ تھی بلکہ پچاس سالہ تجربہ نے یہ بات میرے دل پر نقش کر دی تھی کہ قومی درد اور بہی خواہی کو جب خدا تعالیٰ نے ایک جسم اور شکل دینی چاہی تو سیّد احمد اس کا نام رکھ دیا۔ خلوت و جلوت، تنہائی و یکجائی، دن رات، صبح شام، جب میں نے ان کو دیکھا اسی حال میں دیکھا ہم لوگ ان کے پیرو دوست کہلاتے تھے، مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو قومی درد اور قومی محبت سرسید میں تھی، اور وہ آگ جو ان میں لگی ہوئی تھی اور وہ درد جس سے ان کا دل بھرا ہوا تھا، ہم میں اس کا نشان بھی نہیں ہے۔ ان میں یہ سب باتیں فطری تھیں، اور ہم میں مصنوعی سرمگیں آنکھ اور چیز ہے اور سرمہ لگانا اور بات ہے۔"

اتنا کہا اور محسن الملک کچھ دیر کے لیے بیٹھ گئے۔ پھر ایک دم کھڑے ہو گئے۔ جیسے

۱۔ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سرسید کی روح نے خاموشی سے کان میں کہہ دیا ہو کہ میرا ماتم بھی کسی تعمیری کام کی بنیاد بننا چاہیئے۔ بولے :

" حضرات جب کوئی بڑا شخص دنیا سے گزرتا ہے تو اس کو استحسان کی نظر سے دیکھنے والے اپنی شکر گزاری اور دلدادگی کے ثبوت میں کوئی نہ کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو ان کے محبوب اور مقتدا کی شان کے لائق ہو۔ ان کے لیے عالی شان مقبرے بنواتے ہیں۔ سنہرے گنبد تعمیر کرتے ہیں، ان کے نام کے لنگر خانے جاری کرتے ہیں، سالانہ عرس کرتے ہیں چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور ان کے پسماندوں کے لیے بڑے بڑے ذخیرے مال و دولت کے جمع کرتے ہیں، تم جس کو چاہتے تھے اور جس کو اپنا مصلح اور پیشوا سمجھتے تھے وہ نہ زندگی میں اپنے لیے نذر و نیاز کا طالب ہوا، نہ اپنی ذات کے واسطے تم سے کسی چیز کا کبھی خواہاں ہوا بلکہ خود اپنا مال تم پر قربان کیا اور اپنی کمائی تمہارے کاموں میں لگائی یہاں تک کہ نہ اپنے مرنے کے لیے ایک جھونپڑا چھوڑا اور نہ اپنے کفن کے واسطے ایک گز کپڑا۔ جو کچھ تم سے لیا انہیں پر خرچ کیا اور تمہارے ہی کاموں میں لگایا۔ مرنے کے بعد بھی اس کی یہ تمنا نہ تھی کہ اس کی یادگار میں مقبرہ بنایا جائے یا اس کی قبر پر لنگر جاری ہو یا اس کے نام کی کوئی خانقاہ بنائی جائے بلکہ یہی آرزو تھی کہ مرنے کے بعد بھی جو کام تمہاری بھلائی کا اس نے شروع کیا تھا وہ پورا ہو، اور قومی ترقی کے اصل وسائل یعنی تعلیم و تربیت کے سامان پورے پورے جمع کیے جاویں۔ اور ایم اے او کالج کو مسلم یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچا یا جاوے سرسید آپ میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کا بتایا ہوا راستہ سامنے ہے۔"

سرسید کی رُوح نے خاموشی سے اپنے جانشینوں کی گفتگو سنی پھر یکایک ان کی لوحِ تربت سے آواز آنے لگی ؎

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر ... اے کہ تری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر

اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ ... شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

فکر رہتی ہے مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقدیر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جواب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا

عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

میں سرسید کی غیر معمولی خدمات کو ایک لحاظ سے صاحبِ ولایت سمجھتا ہوں۔۔ سرسید کی ولایت تھی پیہم کی سعی و عمل، ایک مسلسل حرکت و اضطراب، ایک ہمالیہ کا سا عزم، ایک کبھی نہ خشک ہونے والی عرق آلود پیشانی، اور ایک آگے بڑھ کر کبھی پیچھے نہ ہٹنے والا قدم۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو کارزارِ حیات میں ایک انسان کو کامیاب بناتی ہیں اور انھیں خصوصیات نے سرسید کو بھی غیر معمولی کامیابی بخشی۔ (نیاز فتحپوری)

پروفیسر منظور حسین شورؔ

سر سید

سر اپنا سینکڑوں صدیوں کا نور دُھنتا رہا
اندھیرا وقت کے سینے پہ جال بُنتا رہا

وہ عقل و علم و بصیرت سے انتقام کا جال
وہ تنگ ظرفی مُلّا کی ذہنیت کا سوال

جبینِ صُبح پہ کھینچی تھی رات نے وہ لکیر
دل حرم میں ترازو ہو جیسے کُفر کا تیر

وہ صُبح دم سر دیوار کعبہ تھا کہرام
کہ جیسے حشر کا سورج ہو جلوہ گر لب بام

یہ کہہ رہے تھے مگر حادثات تیز خرام
کہ انقلاب کی سنّت میں ہے سکون حرام

اس اہتمام سے لی آسماں نے انگڑائی
چراغ جہل بُجھا رجعتوں کو موت آئی

جب اپنے ہاتھ میں سیدؒ نے لی حرم کی عناں
منارِ مرگ پہ دی چڑھ کے زندگی نے اذاں

فصیلِ جہل پہ پرچم وہ آگہی کا کھلا
اندھیری رات کے کانٹے پہ آفتاب تُلا

روایتوں کے سلاسل کو توڑنے والا
وہ انقلاب کے دھارے کو موڑنے والا

وہ ایک ذہن تھا، اک ذہن لے کے آیا تھا
گذر گیا تو نہ پھر دھوپ تھی نہ سایہ تھا

ہزار رات کا خرمن، سحر کا ایک شرار
ہزار خواب گراں ایک دیدۂ بیدار

درود کے پڑھ کے علی گڑھ کی سرزمین کو چوم
یہی ہے سجدہ گہِ حکمت و فنون و علوم

یہی ہے خوابگہِ سیدؒ فرشتہ مقام
فرشتے کرتے ہیں جھک کر اسی حرم کو سلام

لیا ہے جب بھی روایت نے ارتقاء سے خراج
اسی چراغ نے پوچھا ہے آندھیوں کا مزاج

اگر ہے اب بھی تجھے اس زمیں سے پیار کی دھن
تو ذرّے ذرّے سے سیدؒ کے دل کی دھڑکن سُن

○

سید عاشور کاظمی (لندن)

علیگڑھ کا پرچم بلند کرنیوالا

مظلوم سیّد

"اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش"

جس طرح اقبال کو ان کے پرستاروں نے خلعتِ محدود نظری پہنا کر تعصب کی سرحدوں پر لا کھڑا کیا ہے اس طرح سید احمد خاں بھی بالکل متضاد اور انتہا پسندانہ مفروضات سے لہولہان نظر آتے ہیں۔

علامہ اقبال کو ایک طرف انتہا پسندانہ رویہ نے محض مسلم فرقہ پرست، متحدہ ہندوستان اور ہندو مسلم اتحاد کا دشمن ثابت کرنے کی شعوری کوشش کی تو دوسری طرف عقیدت کا یہ عالم کہ ان کو صرف حکیم الامت مان کر ہر طرح کی جائز تنقید اور اختلاف رائے سے بالا سمجھا گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کا مرتبہ کسی پیر روشن ضمیر، جلالی بزرگ اور رحمۃ اللہ علیہ کا ہو گیا کہ اب ان کے باب میں ہلکی سی گستاخی کی سزا بھی سنگساری سے کم نہیں۔ اور شاعر اقبال، مفکر اقبال، دانشور اقبال، عقیدت مندوں کے جلوس کے قدموں تلے کچلا گیا۔

بالکل اسی طرح سید احمد خاں کے بارے میں ایک طرف تو یہ فکر کہ وہ صرف مسلمانوں کے مصلح تھے اور ان کے اس فرقہ وارانہ انداز نے ہندو مسلم اختلاف کی خلیج کو وسیع کرنے اور بالآخر ملک کے دو ٹکڑے کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا اور دوسری طرف انھیں انگریز کا پٹھو، اور انگریزی تعلیم پر زور دینے کے جرم میں کافر گردانا گیا۔ کچھ مسلم دانشوروں کی طرف سے سید احمد خاں پر یہ بھی الزام ہے کہ انھوں نے متحدہ ہندوستان کا پرچار کر کے

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

دانستہ یا نادانستہ ان اسباب کو نظر انداز کیا جن کی وجہ سے قائدِ اعظم محمد علی جناح کو ایک علیحدہ ملک حاصل کرنے کی کوشش کرنی پڑی۔ بہر حال اقبال اور سید احمد خاں دونوں کے بارے میں کسی توازنِ فکر یا منصفانہ ضابطۂ نظر سے کام لینے کی منزل ابھی نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کوئی "دانائے مغرب" اس بارے میں اپنے "افکارِ عالیہ" سے ہم کو بصیرت عطا نہیں کرے گا اور اس کے ارشادات ہم تک ترجمہ ہو کر نہیں پہنچیں گے ہمارے علمی اور ادبی حلقوں میں ایسی ہی انتہا پسندانہ آرا کا بول بالا رہے گا کیونکہ دلیلِ دانشوری یہی ہے کہ ہماری اپنی باتیں بھی جب تک کسی "مغربی عالم" کی تحریر کی صورت میں ڈھل کر اور اس کا ترجمہ ہو کر ہم تک نہ پہنچیں ہم انھیں تسلیم نہیں کرتے۔ ۱۲۵۲ء تک ہم نے جن علوم کو آگے بڑھایا، ایجادات کیں، وہ بھی مغربی اقوام کے ہاتھ لگیں اور انھوں نے ان علوم اور کتب کا ماخذ بتلائے بغیر مغربی زبانوں میں ان کے تراجم کو تخلیق کہہ کر پیش کیا تو ہم اپنی بات بھول گئے اور ہم نے ان زبانوں سے دوبارہ ترجمے کر کے اسے مغرب کی دین اور عطا سمجھ لیا۔

برصغیر کی علمی اور ادبی فضا میں، اور خاص طور پر اردو اور مسلم تہذیب کے ایوانوں میں ترقی پسند تحریک نے حرکت اور ترقی کے لیے ماحول سازگار بنایا۔ بہت سے ساکت اور جامد تالابوں میں موجوں اور لہروں کا تغیر بھی پیدا کیا مگر اس کے ساتھ ہر تحریک کی طرح اس میں بھی بعض ناقابلِ تلافی غلطیاں کی گئیں۔ ان میں سے زیادہ نمایاں اور ایک طرح سے پوری تحریک کے لیے مضر ترین پہلو اس کے بعض عناصر کی انتہا پسندانہ روش رہی ہے۔ خود ایک ترقی پسند ہونے کے باوجود مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس روش کی وجہ سے یہ تحریک یک طرفہ رہی ہے جس کے تحت تاج محل کو تو غریبوں کی محبت کا مذاق اڑانے کا اشاریہ سمجھ لیا گیا مگر قحط اور غربت کے تاریک ترین دور میں بھی سومنات کی تعمیرِ نو یا بنارس کے لاتعداد گھاٹ تعمیر کرنے پر کروڑوں روپے خرچ کیے جانے پر کہیں سے کوئی آواز نہ اٹھی اور بنیاد پرستی Fundamentalism کے خلاف دانشوروں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کہا کہ بنیاد پرستی کی ترویج پر کروڑوں روپے خرچ کرنے کے بجائے اس رقم سے لاکھوں انسانوں کی بھوک اور مفلسی دور کی جا سکتی ہے۔ ہماری اس تحریک کے اکابرین میں زیادہ تر وہ حضرات تھے جو مذہب سے بیگانگی کا اظہار کرتے تھے۔ انھوں نے بھی کبھی یہ

نہیں سوچا کہ بنیاد پرستی کو صرف ایک مذہب کے ماننے والوں سے کیوں وابستہ کیا گیا ہے اور اس بات پر کیوں نہیں غور کیا گیا کہ بنیاد پرستی ہر مذہب، ہر فرقے یا ہر مکتبِ فکر میں ہو سکتی ہے۔

نظامِ حیدر آباد کے خلاف تو محمد ہم سے جوش تک، سب نے ملامت کے دفتر کھول دیے۔ کرشن چندر جی نے نظام کی سواری نکلنے پر لعنت ملامت کی بارش شروع کر دی۔ (میں اس تنقید کے خلاف بھی نہیں ہوں) لیکن کشمیر میں اکثریت پر ڈوگرہ شاہی کے مظالم، داڑھی ٹیکس کے نفاذ، اور گاؤکشی کی سزا پھانسی مقرر کیے جانے پر شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ بھی چپ رہے اور میری تحریک کے دانشور بھی . . . خواجہ احمد عباس، کرشن چندر اور عزیز احمد کو ساری خرابیاں حیدر آباد میں نظر آئیں مگر کشمیر میں اجڑتے گھروں اور لٹتی عصمتوں کے سلسلے میں میری تحریک کے کسی دانشور کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ مجھ پر میرے قبیلے کے لوگوں کی طرف سے اعتراض ہو سکتا ہے کہ میں خود ترقی پسند ہوتے ہوئے ترقی پسندوں کے خلاف باتیں کر رہا ہوں۔ مجھے یہ الزام تسلیم ہے مگر کیا کروں سچ بولنا بھی تو اس تحریک نے سکھایا ہے۔

سید احمد خاں کو صرف انہی حلقوں کی طرف سے مطعون نہیں کیا جاتا جہاں سیاسی اور تاریخی مصلحتیں کارفرما ہیں بلکہ ان حضرات کی طرف سے بھی سنگباری کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا جو خود سید کی تحریک کے نتیجے میں عہدِ جدید کے علوم سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ اصل میں یک طرفہ ترقی پسندی نے پوری ایک نسل کی نگاہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی صلاح و فلاح کو کچھ اس طرح مردود اور مطعون کیا کہ اب چند پرانے علی گڑھ پسندوں کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی ایسا مل سکے جو سید احمد خاں کی تحریک میں نہیں بلکہ ان کی جامع شخصیت کے بارے میں کسی طرح کا معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیے بغیر کچھ کہہ سکے۔

سوال سب سے پہلے یہ پیدا ہوتا ہے کہ سید احمد خاں نے ایک متحدہ آزاد ہندوستان کا خواب کیوں دیکھا تھا؟ اور انھوں نے زندگی کا بہترین حصہ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش میں کیوں صرف کیا؟ نیز یہ اعلان کیوں کیا تھا کہ ہندو اور مسلمان مادرِ ہند کی دو آنکھیں ہیں۔ اگر وہ "انگریز پرست" تھے تو انھوں نے لندن میں قیام کے دوران "لندن گزٹ"

میں یہ کیوں لکھا تھا کہ:

"ہندوستان میں جدید علوم کی تعلیم مختلف علاقوں اور فرقوں کی اپنی مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنا کر برطانوی حکومت اصل میں ہندوستان اور ہندوستانیوں کا فائدہ نہیں سوچ رہی بلکہ اس کے پیچھے یہ مقصد ہے کہ اس کی انتظامی مشنری کے لیے تازہ تازہ پرزے فراہم ہوتے رہیں۔"

یہ لکھتے وقت انھوں نے پورے ملک کی بات کیوں کی؟ اور ہندو مسلمان کا امتیاز کیوں نہیں رکھا؟ دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ ابن الوقت اور چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والوں کی طرح خود انگریزی نظام میں کیوں نہ شریک ہوئے جب کہ حضرت اکبر الٰہ آبادی جیسے محب وطن، اور انگریزوں کی ہمہ وقت تضحیک کرنے والے، خود بھی جج بن گئے اور اپنے بیٹے کو بھی سرکارِ انگلیشیہ کی خدمت کے لیے تیار کیا۔ آخر وہ کیا اسباب تھے کہ سید احمد نے نہ صرف اپنا مکان بلکہ گھر کے برتن تک فروخت کر دیے اور انگلستان چلے گئے۔ کیا انگریزوں نے انھیں بلایا تھا؟ یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی وقتی ناکامی کے بعد، بہت سے دیگر حضرات کی طرح وہ بھی کسی مسلم ملک میں ہجرت کا ارادہ رکھتے تھے اور انھوں نے متعدد ہم عصروں سے اس سلسلے میں مشورہ بھی کیا تھا۔

انگلستان آکر بین الاقوامی حالات کے مطالعہ کے بعد، سید احمد خاں نے دو باتوں کو ضروری سمجھا۔ اول یہ کہ مسیحی مبلغین، بہت ہی فعال اور باقاعدہ تحریک کے ذریعے رسولِ مقبول کے بارے میں جو غلط تبلیغ کر رہے تھے، اس کے سدباب کے لیے اہلِ قلم مورخین اور دانشوروں کا حلقہ جمع کریں۔ ان کی اس فکر میں ہندو دشمنی یا متحد ہندوستان کی آزادی کے خلاف جذبہ نہیں تھا بلکہ ایک عالمِ دین ہونے کی حیثیت میں صورتِ حال کا ادراک اور اس کے ازالے کی فکر ایک فطری ردِّ عمل تھا۔۔۔ دوسرے یہ کہ اس کام کے لیے یورپ میں مروجہ عقائد اور علوم کی واقفیت ضروری تھی۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم اور جدید علوم و فنون کی طرف توجہ کا رجحان پیدا کرنے کی ٹھانی۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سید احمد خاں اصل میں اپنے عہد کے بہت بڑے عالم اور مجتہد تھے۔ ان کے متعلق بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ دو تین سو برسوں میں عالم اسلام میں جو اہلِ فکر و نظر پیدا ہوئے سید احمد ان میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ محض علوم معلوم (Knowledge of the known) کے عالم نہیں تھے کہ اس لحاظ سے تو عہدِ اکبری سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک ایک سے ایک بڑا بحر العلوم نظر آتا ہے جو اپنے اپنے سجادے اور خانقاہ پر بہمہ وقت "ہو حق" میں مصروف نظر آتا ہے۔ سر سید کی انفرادیت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے "علوم معلوم" پر نظر ڈالنے کے علاوہ آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر بھی دیکھی تھی۔ حوادثاتِ زمانہ اور آنے والے دَور کے ادراک نے ان کو شخصی نہیں بلکہ قومی کردار ادا کرنے پر مجبور کیا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک کا سفینہ جن چٹانوں سے ٹکرایا ان سے بچ کر نکلنے کی کوشش کے بجائے انھوں نے چٹانوں کو ہلانے کا ارادہ کر لیا۔ ۱۸۵۷ء میں جن کے ہاتھوں سے ملکی اقتدار چھنا، وہ زیادہ تر مسلمان تھے۔ یہ کہنا کوئی تعمیری بات نہیں ہے کہ جس ہنگامے کو غدر کا نام دیا جاتا ہے اس میں کس طبقے اور فرقے نے زیادہ قربانیاں دیں کیونکہ فرقہ بندی کا تصور انگریز کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ جہاں سارا ملک ان کے تسلط سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا ان غیر ملکی سوداگروں نے دو اہم مذہبی فرقوں میں تعصب کا ایسا بیج بو دیا کہ آج تک ایشیا میں کوئی متحد طاقت مغربی استعمار کو للکارنے کے لیے نہیں ابھر سکی۔ گیارہ مئی ۱۸۵۷ء سے ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران انگریزوں نے اپنے جاسوسوں کے ذریعے دہلی میں ہندو مسلم فساد کی ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ بادشاہ کو شہر میں گاؤ کشی کے خلاف حکم صادر کرنا پڑا۔ جنگِ آزادی میں ناکامی کے اسباب میں جہاں یہ سبب نمایاں ہے کہ غداروں کے ذریعے حریت پسند غازیوں کی فوجی نقل و حرکت کی پوری اطلاعات انگریزوں کو ملتی تھیں۔ وہاں فرقہ ورانہ کشیدگی کی وجہ سے بھی حریت پرستوں کی قوت میں کمی ہوئی تھی اور جب ان غداروں کو خلعتیں اور جاگیریں تقسیم کرنے کا وقت آیا تو اسی فہرست میں جہاں میر رجب علی، مفتی صدر الدین، مرزا الٰہی بخش کے نام نظر آتے ہیں وہاں گوری شنکر، ہر گوبند، میگھ راج، مکھن لال اور رائے بہادر جیون لال بھی پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

تحریک آزادی میں ایک طرف سید احمد خاں ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں دوسری طرف متحدہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں غیر ملکی تسلط سے نجات کے جو خواب دیکھے جا رہے ہیں ان میں ہندو مسلم کی کوئی تفریق نظر نہیں آتی۔ پھر یہ کیا ہوا کہ یکایک دو دھارے ہو جاتے ہیں اور ملک تقسیم ہو جاتا ہے۔

سید احمد خاں کے مشن یا ان کی ذات کے بارے میں جب بھی بات شروع ہوتی ہے تو علی گڑھ کالج کے قیام اور اس کے اثرات تک محدود رہ جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ علی گڑھ کالج ایک بڑا کارنامہ ہے لیکن اس کے قیام تک سوچ اور فکر کا جو سفر انھوں نے طے کیا، اس پر اس کے اچھے خاصے مداحین بھی روشنی نہیں ڈال سکتے۔

سید احمد کو ایک مخصوص رنگ میں پیش کرنے کا کام انگریز مورخین نے بھی کیا ہے۔ انھوں نے برطانوی ہند کی (British India) کی تاریخ لکھتے وقت سید احمد کو یا سر آف "مسلم ایجوکیشن" کا خطاب دیا یا سر آف ایجوکیشن کا (Sir Syed) نہیں مزید برآں "سر" کا خطاب دے کر ان کی پیشانی پر اپنے قرب کی مہر لگا دی۔

سید احمد کی زندگی سے واقف حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے سامنے مقصد نئے ہندوستان کی تعمیر کا تھا۔ جو لوگ اس بات سے ناواقف ہیں وہ حالی کی "حیاتِ جاوید" اور شبلی کی مثنوی "صبحِ امید" کے علاوہ محسن الملک اور نذیر احمد کے مقالات بھی دیکھ سکتے ہیں۔ سید صرف مسلمانوں کے محسن نہیں تھے بلکہ وہ ہندوستان کے رہنما تھے۔ ان کو صرف مسلم سیاست کا وکیل قرار دینا ایک خاص ذہنیت سے متاثر ہونے کا ثبوت یا کم علمی کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ ہمیں ایسے مقالات، مضامین یا تقاریر نظر نہیں آتی، جہاں سید احمد نے مسلمانوں کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے ابنائے وطن کو مارنے، پچھاڑنے، یا کچل کر آگے بڑھنے کا تصور دیا ہو، ہندوستان کی ایک بڑی آبادی ترقی و تعلیم کی راہ میں پیچھے رہی جا رہی تھی۔ اس آبادی کو اس ملک میں رہنا تھا اور ترقی اور سربلندی کے لیے دو پہیوں کی طرح گاڑی کو چلانا تھا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، مسلمانوں میں ایک طبقہ وہ پیدا ہو گیا تھا جو جاہ پسند، خود غرض اور ابن الوقت ہونے کی بنا پر انگریزوں کی کفش برداری کو اپنا سرمایۂ افتخار سمجھتا تھا۔ دوسری طرف ایک بہت بڑا طبقہ ان لوگوں کا تھا جو انگریزوں سے

کسی بھی طرح کے ربط و ضبط کو بمنزلِ کفر و الحاد سمجھتے تھے۔ اس طبقے نے انگریزوں کی سو فیصدی مخالفت کرتے ہوئے ہندوستان کو اس حقیقت سے دور رکھنے کی کوشش کی کہ انگریز کی کامیابی کسی مافوق الفطرت خاصیت کے سبب نہ تھی۔ یہ بات ہندوستان کے دوسرے علاقوں اور فرقوں نے محسوس کر لی تھی اور مدراس اور بنگال کی ایک بڑی آبادی نے انگریزی زبان سیکھ کر بدلتے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگی کا کام شروع کر دیا تھا۔ ملک کے دو بڑے فرقوں میں جو تفاوت پیدا ہو چکا تھا۔ اس کا احساس "اسباب بغاوت ہند" اور "تاریخ سرکشی بجنور" کے حوالے سے بہت واضح ہوتا ہے۔ اس احساس کو فرقہ پرستی سے وابستہ کرنا یا ملک میں نفاق کی تخم ریزی سمجھنا بالکل اسی طرح غلط ہے جس طرح برطانوی لیبر پارٹی میں عورتوں اور نسلی اقلیتوں کے ایسے حقوق کی تحفظ کی کوشش کرنا جو ۱۹۶۰ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایسی ہی کوششوں کے بعد نسلی اقلیتوں کو کسی حد تک ملے۔

عصرِ حاضر کا ادراک تو بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کو ہوتا ہے لیکن

واقعہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے

عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

آئینۂ ادراک کے اس عکس کا اعلان وہی کر سکتے ہیں، ماضی جن کا علم، حال جن کی بصارت اور مستقبل جن کی بصیرت کی گرفت میں ہوتا ہے۔ جس وقت سید احمد نے قوم کو آنے والے مسائل کی طرف متوجہ کیا اس وقت کے ہندوستان میں یا تو خان بہادروں اور جاگیرداروں کی طرف سے (Sugar-Coated Pills) تقسیم ہو رہی تھی یا دوسری طرف علوم و معارف اور اقدارِ مطلقہ کے حفاظت کدے اور شریعت خانے سجے ہوئے تھے۔ سید احمد خان نے اسلامی علوم و اقدار کو جب وقت کی ضرورت کی عینک سے دیکھا تو انھیں ان علوم میں کوئی سقم نظر نہیں آیا اور مشرقی و مغربی علوم میں بھی کوئی بنیادی فرق نہ دکھائی دیا، ماسوائے اس کے کہ دوسروں نے کبھی تقابلی مطالعے کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ یا سید احمد کی سمجھ میں وہ وجوہ فوراً آ گئیں جن کی بنا پر اقبال کو کہنا پڑا تھا:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند

ہندوستان میں مسلمانوں کی پسماندگی اور فرنگی قوم کی ترقی کا راز ایک ہی تھا کہ مسلمان "شمشیر و سناں اول کے بعد" طاؤس و رباب" میں گم ہو گئے تھے یا انھیں اس میں مبتلا کر دیا گیا تھا (یہ الگ بحث ہے جو پھر کبھی سہی) اور علوم و فنون کو جہاں مسلمانوں نے چھوڑا تھا وہاں سے یورپی اقوام نے آگے بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ قرون وسطی میں جب یورپ میں کلیسا نے حصولِ علم پر پابندی لگا دی تھی تو مسلم دانشوروں نے ہی تہذیبِ انسانی پر یہ احسان کیا تھا کہ علوم معلوم کو نہ صرف سنبھال کر رکھا بلکہ ان کے تراجم اور نقول تیار کرا کے بغداد، قرطبہ، قاہرہ اور قسطنطنیہ کی لائبریریوں میں محفوظ بھی کیا اور اسے آگے بھی بڑھایا (اس کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ میں "فسانہ کہیں کہے جسے" میں کر چکا ہوں)

سید احمد خاں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ گزشتہ دو تین سو برس میں مغربی اقوام نے جو کچھ بھی کیا ہے اس سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کی جائے تاکہ آگے کی راہیں ہموار ہو سکیں۔ اب یہ اتفاق ہے کہ اس دور میں دنیا کے ایک بڑے حصے پر فرنگی عمل داری تھی، لہٰذا انگریزی زبان کا جاننا ضروری تھا تاکہ مغربی علوم تک لوگوں کی پہنچ ہو سکے لیکن بد قسمتی سے خان بہادروں اور انگریز کے حامی جاگیرداروں کی یک لخت بدلتی اقدار کو دیکھ کر، انگریزی پڑھنے اور جاننے کو مسیحی عقائد و تصورات اپنانا اور ترکِ ایمان سمجھ لیا گیا۔ اسی لیے سید احمد کا سفر دشوار سے دشوار تر ہوتا چلا گیا ان کی مساعی کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھنے کے بجائے ایک بڑے طبقے نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ہندوستانیوں کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو انگریز بنانا چاہتے تھے اور ان کی تعلیمی تحریک کا مقصد "کالے صاحب" پیدا کرنا تھا۔ اس بات کو دانستہ یا نادانستہ، بالکل نظر انداز کر دیا گیا کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ اردو کی ترویج و اشاعت پر کیوں زور دیتے؟ آج بہت سے لوگ اردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کی وکالت کرتے ہیں۔ آخر سید احمد رومن رسم الخط کے وکیل کیوں نہ بنے؟ انھوں نے "علی گڑھ گزٹ" میں واضح طور پر لکھا کہ انگلستان میں تہذیبی اور علمی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ تمام علوم ان کی مادری زبان میں سکھائے جاتے ہیں۔ سید احمد نے مروّجہ علوم کو اردو زبان میں ترجمہ کرنے پر زور دیا اور اس مقصد کے لیے اپنی سائنٹفک سوسائٹی بنائی اور اردو لکھنے والوں کو جمع کیا، اردو رسالے

نکالے اور مسلسل اردو میں مقالات اور مضامین لکھتے رہے۔ کیا وہ یہ سب کام انگریزی میں نہیں کر سکتے تھے۔

لندن گزٹ کا ذکر آچکا ہے جس میں رپورٹ موجود ہے کہ سید احمد نے حکومت پر زور دیا کہ حکومت مغربی علوم کے خزانوں تک رسائی کا انتظام لوگوں کی مادری زبانوں میں کرے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا۔ خان بہادروں اور جاگیرداروں کی انگریز پرستی نے جو فضا قائم کر رکھی تھی اس فضا میں انگریزی جاننے اور پڑھنے کی ضرورت کی نشاندہی کو انگریزوں سے محبت سمجھ لیا گیا اور یہ فراموش کر دیا گیا کہ سید احمد خاں نے انگریزی کو ملکی زبان بنانے کی مخالفت کی تھی جس کا ثبوت لندن گزٹ اور علی گڑھ گزٹ میں موجود ہے۔ لیکن یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کے اس مطلبے کو انگریز کے نمک خواروں اور بہی خواہوں کی حمایت حاصل نہ ہوگی (خود کانگریس اس حمایت سے پہلو تہی کر گئی) انھوں نے اس مطالبے کے ساتھ ساتھ انگریزی جاننے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

سید احمد خاں ہندوستان کی ترقی کے حامی تھے لیکن اس ترقی کی راہ میں مسلمانوں کی پسماندگی اور ماضی پرستی حائل ہو رہی تھی۔ غالباً سید احمد خاں نے کانگریس کے عزائم کو بھی بھانپ لیا تھا۔ اس لیے انھوں نے ۱۸۷۷ء میں مسلمانوں کی طرف سے برطانیہ کے ہاؤس آف لارڈز کو ایک اپیل بھیجی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کو آزادی ملے تو پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی تعداد کے تناسب سے نہ ہو بلکہ مساوی ہو۔ اس کے نتیجے میں برٹش پارلیمنٹ نے ایک بل پاس کیا تھا جو انہی خطوط پر تھا۔

سید احمد خاں کے اس اقدام نے کانگریس کے اخلاص کا پردہ چاک کر دیا اس لیے کہ کانگریس اور اس کے ہم نواؤں نے اسے مسلمانوں کے لیے زیادہ حقوق حاصل کرنے کا حربہ قرار دے کر رد کر دیا (گویا یہیں سے دو قومی نظریے کی عملی ابتدا ہوئی) کانگریس نے اس کے خلاف ایک (Petetion) اپیل ہاؤس آف لارڈز کو بھیجی جس پر لوگوں سے جعلی دستخط کرا کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ لوگ ایک فرد ایک ووٹ کے حق میں ہیں۔ کانگرس کی اس دستاویز کے جعلی ہونے کا ایک ثبوت تو باشندگانِ بٹالہ کا وہ خط ہے جو انھوں نے سکریٹری فار اسٹیٹ، گورنمنٹ آف انڈیا

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مسٹر سٹراچی (Strachy) کو بھیجا تھا جس کا مخطوطہ یہاں پیش کیا جارہا ہے) کانگریس نے ان سے یہ کہہ کر دستخط لیے تھے کہ یہ ٹیکس کی معافی کی درخواست ہے۔ (مخطوطہ لائبریری ریکارڈ میں موجود ہے) اس کے برعکس سید احمد خاں کی اپیل کو جعلی ثابت کرنے کے لیے کانگریس کی پوری مشنری حرکت میں آگئی اور اس بات کی اتنی تشہیر کی گئی کہ سید احمد خاں کے حامی مولانا حالی نے "حیاتِ جاوید" میں لکھ دیا کہ سید احمد خاں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے تھے اور آنے جانے والوں سے اپیل پر دستخط لے لیا کرتے تھے حالی کی اس تحریر کو سید احمد کے خلاف استعمال کیا گیا جبکہ یہ تو اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ سید احمد خاں کی پٹیشن پر مختلف شہروں کے لوگوں کے جو دستخط تھے وہ درست تھے۔ جامع مسجد دہلی میں نمازِ جمعہ کے موقع پر مختلف شہروں سے آئے ہوئے لوگ شامل ہوتے تھے اور آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے لیکن اس سے یہ کہیں نہیں ثابت ہوتا کہ اپیل پر دستخط جعلی تھے۔ اس لیے کہ اپیل اور اس کے (Follow Up) میں جو خطوط سید احمد خاں نے ارسال کیے ان پر دستخط کنندگان کے نام اور شہروں کے پتے درج ہیں۔ ان دستخط کنندگان میں بعض شہروں سے تو صرف آٹھ آٹھ دس دس نام ہی درج ہیں جبکہ جعلی دستخط ہوتے تو ہر شہر سے سینکڑوں یا ہزاروں دستخط ظاہر کر کے اپیل کو موثر بنانے کا حربہ استعمال کیا جاسکتا تھا جو کانگریس نے اپنی اپیل میں کیا۔ مثال کے طور پر سید احمد خاں نے ۲۴ جون ۱۸۹۰ء کو جنرل سٹراچی (Strachy) کو حسب ذیل خط لکھا تھا:

علی گڑھ ۲۴ رجون ۱۸۹۰ء

ڈیئر سٹراچی

میں اس خط کے ساتھ آپ کو کانگریس کے خلاف مسلمانوں کی درخواست کی حمایت میں ۱۲۷۰ دستخطوں کی ایک فہرست بھیج رہا ہوں۔ دستخطوں کی کل تعداد اب ۴۸۰۵۱ تک پہنچ گئی ہے۔ ذیل میں دی گئی فہرست مندرجہ ذیل علاقوں سے حاصل کی گئی ہے: دستخطوں کی تعداد رجگہ کا نام ـــــ ۲۴۵ فرید پور (بنگال)، ۵۹ اکولہ، ۵۴۴ مین پور، ۲۱۲ شاہجہانپور، ۲۱۰ جونپور۔

بے حد آداب

آپ کا ـــــ سرسید

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

دستخطوں کی تعداد سے صاف ظاہر ہے کہ سید احمد نے دستخطوں کی تعداد کو بڑھانے کے بجائے ہندوستان کے مختلف مقامات سے دستخط اور حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔
سید احمد خاں کی بدقسمتی کہ ان دونوں فوٹو کاپی کی سہولتیں میسر نہ تھیں شاید اسی لیے سر سید احمد خاں کے کاغذات میں اس اہم دستاویز کی نقول نہ رہ سکیں۔ بہر حال لائبریری میں اس کا ریکارڈ سید احمد کی صداقت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

مسلمانوں کی پسماندگی کی طرف توجہ دینے کا مقصد نہ جانے کیوں یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ کوشش دوسری قوموں کے خلاف ہے۔ ملک کے ایک طبقے کو دوسرے طبقوں کے برابر لانے کی کوشش کو فرقہ پرستی اور تعصب کہا گیا لیکن برتر طبقوں کی اس خواہش کو کہ ایک طبقہ پس ماندہ رہے، جانے کیوں تعصب کا نام نہیں دیا گیا۔ سید احمد خاں نے جہاں مسلمانوں کی پسماندگی کے تدارک کے لیے تعلیم و ترجمہ کا بیڑا اٹھایا، تعلیم نسواں کے لیے جدوجہد کی وہاں انگریزی زبان کو ملکی زبان بنانے کی مخالفت بھی جاری رکھی اور علاقائی زبانوں کی ترویج پر زور دیتے رہے۔

یہاں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ صرف مسلمانوں کے ترجمان اور رہنما کیوں قرار دیے گئے؟ سو اس کا جواب ایک اور سوال میں ملتا ہے کہ علامہ اقبالؔ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، وہ گلستاں ہمارا

کہنے والے اقبالؔ، ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار اقبالؔ، کیوں مسلم خوابیدہ پر زور دینے لگے؟ خود قائداعظم محمد علی جناح بڑے ترقی پسند، متحدہ قومیت کے وکیل، کانگریس کے دست راست ابتداً ہندو مسلم اتحاد کے مبلغ ہونے کے باوجود صرف مسلم مسائل پر کیوں سوچنے لگے حتیٰ کہ علیحدہ وطن کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ہمیں مسلمانوں کی نہیں بلکہ برادرانِ ہند کی دو صد سالہ تاریخ کا کھلی آنکھوں سے مطالعہ کرنا ہوگا جس کے بعد یہ واضح ہو سکے گا کہ علامہ اقبالؔ، محمد علی جناح اور سید احمد جو متحدہ ہندوستان کے علمبردار تھے اپنے سفر کا رخ موڑنے پر کیوں مجبور ہوئے؟

محمد عشرت حسین

سر سید کی حاضر جوابی

سر سید احمد خاں کی زندگی کے واقعات سے متعلق نہ جانے کتنے مضامین اور سوانح عمریاں لکھی جاچکی ہیں اور ان میں سے اکثر بہت جامع اور مفصل بھی ہیں لیکن آپ کی زندگی کی اتنی جہتیں تھیں کہ یہ کہنا کہ آپ کی پوری شخصیت کا کسی ایک کتاب میں احاطہ ہوگیا ممکن نہیں۔ سر سید جہاں ایک مدبر، مفکر، دور بیں اور دردمند انساں کی حیثیت میں جانے پہچانے جاتے ہیں وہاں ان کی شخصیت کی زندہ دلی اور حاضر جوابی قدرے کم مشہور ہے۔ آپ کی بے مثال ذہانت کے ساتھ قدرت نے آپ کو حاضر جوابی کی صفت بھی دل کھول کر عطا کی تھی۔ آپ کی زندگی کے بعض چھوٹے چھوٹے واقعات اب قصۂ پارینہ بن گئے ہیں اور اکثر بھلائے جاچکے ہیں۔ لیکن انہیں دہرا کر آپ کی شخصیت کا وہ پہلو سامنے آتا ہے جو تشنۂ توجہ رہا۔ ان چند چھوٹے چھوٹے واقعات کو یاد کر کے اسی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ یہ وہ واقعات ہیں جن کو چالیس کی دہائی میں اسکول کی طالبعلمی کے زمانہ میں ان اساتذہ سے سنا جو علی گڑھ ہی کے ہو رہے تھے۔ ان میں سے چند اساتذہ نے تو سر سید کا زمانہ بھی پایا تھا۔ یہ واقعات سینہ بہ سینہ محفوظ چلے آتے تھے اور بوڑھے اساتذہ انہیں مزے لے لے کر اگلی نسلوں کو سناتے اس لئے ان واقعات کو "سینہ گزٹ" کا

مام دیا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ "سینہ گزٹ" کا وہ حصہ جو اب بھی یادداشت میں زندہ ہے حاضر ہے۔

اردو داں انگریز

سرسید احمد خاں کے ایک جاسے والے انگریز تھے جن کا دعوی تھا کہ انہوں نے اردو لغت کا اتنا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے کہ وہ تقریباً انہیں حفظ ہوگئی ہے اور اردو زبان کا کوئی ایسا لفظ نہیں جو انہیں نہ آتا ہو۔ اس دعوے کے ساتھ وہ ایک دفعہ سرسید کے پاس گئے اور انہیں دعوت دی کہ وہ جس طرح چاہیں ان کی اردو زبان کا امتحان لے کر دیکھ لیں وہ یقیناً اس میں پورے اتریں گے۔ سرسید اس وقت فرش پر گاؤ تکیہ لگائے ایک پرانی دری کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس انگریز کا یہ دعویٰ سن کر سرسید نے پھٹی ہوئی دری سے ایک کنارہ نوچ کر اور ہاتھ میں لے کر انہیں دکھایا اور پوچھا یہ کیا ہے۔ انگریز اتنا آسان سوال سن کر مسکرایا اور بولا دھاگہ۔ سرسید نے نفی میں سر ہلایا کہ نہیں۔ تو انگریز پھر بولا تاگا، سرسید نے پھر نفی میں سرہلادیا۔ تب انگریز ذرا چکرایا اور سوچ میں پڑگیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا سوت۔ سرسید کا جواب اب بھی نفی میں تھا۔ بہت دیر سوچنے کے بعد انگریز کی آنکھیں چمکیں اور خوش ہو کر پر اعتمادی سے کہا نہیں یہ چیتھڑا ہے۔ اس کی مایوسی کی انتہا نہیں رہی جب سرسید نے اس بار بھی نفی میں سرہلادیا۔ آخر انگریز مایوس ہوکر ہار ماننے کے انداز میں بولا کہ اچھا پھر آپ ہی بتائیے۔ تب سرسید نے کہا پھوسڑا۔ اس طرح سرسید کا اصل پیغام اس کی سمجھ میں آگیا کہ کوئی زبان صرف ڈکشنریوں پر عبور حاصل کرلینے سے نہیں آجاتی۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ایک اور انگریز اردو داں

اسی طرح ایک اور انگریز کو اپنی اردو پر بڑا ناز تھا۔ اسکا کہنا تھا کہ وہ پانچ سال سے ہندوستان میں مقیم ہے اور اس عرصہ میں اس نے اردو زبان پر پورا عبور حاصل کرلیا ہے۔ وہ ہر قسم کا اردو لہجہ بھی سمجھتا ہے اور اردو محاوروں سے بھی پوری واقفیت حاصل کرلی ہے۔ ایک دن وہ سرسید احمد خاں کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اپنی اردو فہمی کا امتحان لینے کی درخواست کی۔ سرسید نے چھوٹتے ہی کہا "چل بے ڈیوٹ"۔ وہ کچھ سمجھا نہیں۔ لہٰذا پھر اپنا مدعا بیان کیا۔ سرسید نے جواب دیا کہ تم فیل ہوگئے۔ میری بات نہیں سمجھے۔ اس پر وہ انگریز بہت شرمندہ ہوا اور اٹھ کر چلا گیا۔ گھر جاکر کئی لغات اور ڈکشنریاں دیکھیں لیکن ڈیوٹ کے معنی سوائے چراغ دان کے کچھ ہاتھ نہ آئے۔ چنانچہ پھر سرسید کے پاس واپس آیا اور کہا کہ آپ نے جو لفظ ڈیوٹ بولا ہے اسکے معنی تو چراغ داں کے ہیں لہذا چل بے ڈیوٹ کیا جملہ ہوا۔ اس پر سرسید نے جواب دیا کہ بس یہی تم میں اور مجھ میں فرق ہے۔ وہ پھر اپنا سامنہ لے کر چلا گیا۔ لیکن کھوج میں لگا رہا۔ آخر کافی دن کے بعد اسے پتہ چلا کہ لفظ ڈیوٹ گاؤدی اور جاہل کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔

ہائی کورٹ کے جج کا باپ

ایک دفعہ سرسید احمد خاں کسی سفر پر جارہے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا اور پلیٹ فارم پر جاکر گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ ریل گاڑی آئی تو آپ ایک فرسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ (compartment) کی طرف بڑھے۔ اس کمپارٹمنٹ میں پہلے سے ایک انگریز سفر کر رہا تھا۔ اس نے سرسید کا حلیہ اور رختِ سفر دیکھا تو سمجھا کہ بوڑھا سے چارا سادانی میں فرسٹ کلاس میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ لہذا

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

فوراً تنبیہ کی "اے بڈھے یہ فرسٹ کلاس ہے" اس بات کا جواب ہی کیا تھا۔ سرسید نے اس کی بات سنی ان سنی کردی اور قلی سے اپنا سامان رکھوانے لگے۔ انگریز کو یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا اور بھنا کر بولا تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ یہ فرسٹ کلاس ہے۔ سرسید نے نہایت اطمینان سے جواب دیا مجھے معلوم ہے یہ فرسٹ کلاس ہے اور میں یہیں بیٹھوں گا۔ اس پر تو انگریز کا پارہ اور چڑھ گیا اور غصہ میں بولا 'ول تم جانتا ہے ہم کون ہے، ہم ہائی کورٹ کا جج ہے۔ تم کو ابھی یہاں سے باہر نکلوائے گا" اس پر سرسید سے نہ رہا گیا اور بڑی متانت سے جواب دیا 'ہم یہیں بیٹھیں گے۔ ہم ہائی کورٹ کے جج کے باپ ہیں" پھر کیا تھا انگریز نے ریلوے گارڈ کو بلوایا اور سرسید کے وہاں بیٹھنے کی شکایت کی۔ گارڈ نے سرسید کا ٹکٹ دیکھا تو بولا کہ یہ صحیح جگہ بیٹھے ہیں۔ تب انگریز نے شکایت کی کہ ول یہ ہم کو بولا کہ ہم ہائی کورٹ کے جج کا باپ ہے 'تو سرسید خود ہی بولے "ہاں میرا بیٹا سید محمود ہائی کورٹ کا جج ہے"۔ پھر تو انگریز پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

واقعۂ معراج

سرسید احمد خاں سے ایک دفعہ ایک (عیسائی) انگریز نے واقعۂ معراج پر گفتگو کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ظاہر ہے کہ اس شخص نے واقعۂ معراج پر بہت کچھ پڑھا ہوا تھا اور یوں بھی تاریخ اسلام کی کچھ شُدبُد تھی۔ یعنی مستشرقین کے زیر اثر تھا۔ سرسید نے جب اجازت دی تو یوں بولا کہ آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے نواسوں حضرت حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بے حد محبت تھی اور آپ ﷺ اکثر ان کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر کھلایا کرتے تھے۔ سرسید نے جواب میں جی ہاں کہہ کر سر ہلایا۔ پھر سوالیہ انداز میں بولا کہ آپ کو اس پر بھی یقین ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو علوم و معارف اور فراستِ

نبوت عطا فرمائی تھی اس کی بنیاد پر آپ ﷺ کو حادثہ کربلا کا پیشگی علم تھا۔ اور آپ اس پر کچھ ملول بھی ہوجاتے تھے۔ سرسید نے جواب میں پھر سر ہلا کر جی ہاں کہا۔ اس پر بولا کہ آپ کا اس پر بھی ایمان ہوگا کہ معراج میں رسول اللہ ﷺ کی اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوئی تھی۔ سرسید نے پھر جی ہاں کہا اور سر ہلایا۔ تب ان صاحب نے اپنے دل کی اصل بات کہی اور پوچھا کہ ایسی صورت میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے اپنے نواسے کے حق میں سفارش کیوں نہیں کی۔ جب کہ آپ ﷺ کو اتنا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ یہ سن کر سرسید نے ذرا پہلو بدلا اور نہایت سنجیدگی سے بولے کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ کے دل میں تھی اور ان کا ارادہ بھی تھا کہ ملاقات کے وقت اللہ تعالی سے نواسے کی زندگی کے لئے سفارش کریں گے۔ لیکن پھر ہوا یوں کہ جب رسول اللہ ﷺ، اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران و پریشان ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ سر جھکائے مغموم بیٹھے ہیں۔ لہذا رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے اسکا سبب پوچھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدم کی اولاد نے مسلسل نافرمانیاں کر کے بہت پریشان کیا ہوا ہے۔ ہم نے ان کی طرف ان کی ہدایت کے لئے اپنا بیٹا بھیجا تھا۔ ان ناہنجاروں نے اسے مار کر ہماری طرف واپس بھیج دیا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ دم بخود رہ گئے۔ اور دل میں سوچا کہ جب خود سر انسانوں نے اللہ کے بیٹے کے ساتھ یہ سلوک کیا تو میرا نواسہ کیا چیز ہے اور دل کی بات دل ہی میں رہنے دی۔ یہ جواب سن کر اس عیسائی انگریز کے دل پر کیا گزری ہوگی قارئین خود خوب اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کچھ اور لطیفے

"جس زمانہ میں وہ (سرسید) بنارس میں تھے ان کا ایک آرٹکل تہذیب الاخلاق میں اس مضمون پر شائع ہوا تھا کہ اجماع جیسا کہ اہلِ سنّت سمجھتے ہیں حجت شرعی نہیں ہے۔ شیعوں میں سے ایک صاحب جو بنارس میں ملازم تھے اس آرٹکل کو پڑھ کر خوشی خوشی ان سے ملنے کو آئے۔ پہلے کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سرسید سے اس آرٹکل کا ذکر کر کے کہنے لگے۔ "کیوں جناب! جب آپ کے نزدیک اجماع حجت نہیں تو خلیفۂ اوّل کی خلافت کیونکر ثابت ہوگی؟" سرسید نے کہا "حضرت! نہ ہوگی تو ان کی نہ ہوگی۔ میرا کیا بگڑے گا" وہ یہ سن کر اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور سمجھے کہ کچھ پانی مرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے "کیوں جناب! اس اختلاف کے وقت جب کہ کچھ لوگ خلیفۂ اول کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیر کا۔ اگر آپ اس وقت ہوتے تو کس کے لیے کوشش کرتے؟" سرسید نے کہا "حضرت! مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لیے کوشش کرتا؟ مجھ سے تو جہاں تک ہو سکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سوئے بسوئے کامیاب ہوتا۔" یہ سن کر ان کا جی چھوٹ گیا اور جوتیاں پہن گھر کا رستہ لیا۔"

(حیاتِ جاوید ص ۷۰۰)

منشی (نجم الدین) صاحب کی ذمہ داریاں زیادہ تھیں اس لیے یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ کس طرح تنخواہ میں اضافہ ہو ادھر سرسید کانفرنس کے مالی حالات سے مجبور تھے۔ ایک دن موقع پا کر منشی صاحب سرسید سے مخاطب ہوئے۔

"جناب والا آپ میری تحریر کو تو بہت پسند فرماتے ہیں۔ اکثر کہا کرتے ہیں کہ میں لکھتا نہیں موتی پروتا ہوں۔"

"جی ہاں اس میں کیا شک ہے"۔ سید صاحب نے جواب دیا۔

"آپ اکثر یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں بہت تیز لکھتا ہوں اور نہایت صحت سے لکھتا ہوں"، منشی صاحب نے حوصلہ پا کر عرض کیا۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

"بالکل درست" سید صاحب نے فرمایا۔
یہ سب کچھ ٹھیک ہے تو پھر میری تنخواہ میں اضافہ کیوں نہیں ہوتا، منشی صاحب نے سوال کیا۔
سید صاحب ذرا دیر کو لاجواب ہو گئے مگر فوراً ہی بولے "آپ کی تنخواہ میں اضافہ تو نہیں ہو سکتا۔"
"آخر کیوں؟"
"آپ کی داڑھی جو ٹیڑھی ہے۔" سید صاحب اس کے سوا اور کیا جواب دیتے۔
اس وقت بات ہنسی میں اڑ گئی۔ کچھ دنوں بعد کانفرنس کے مالی حالات قدرے بہتر ہو گئے تو منشی صاحب نے ذرا تلخی سے کہا کہ "آخر اب کیا دشواری ہے، اب میری تنخواہ میں اضافہ کیوں نہیں ہوتا؟" مگر سر سید صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مسکرا کے فرمایا "وہی داڑھی والی بات۔" مگر سید صاحب نے منشی صاحب کی تنخواہ میں اضافہ تو نہیں کیا مگر خود برابر زیر بار ہوتے رہے۔ اور ہمیشہ خیال رکھا کہ منشی صاحب کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ یہ تھا سر سید کا جذبۂ ایثار۔ (سہ ماہی فکر و نظر۔ جنوری تا ستمبر ۱۹۸۵ء)

"پروفیسر والس نے ایک دل پسند کام یہ کیا کہ ہر سال کے فرسٹ الیون کے ممبروں کے نام ایک بورڈ پر خوش خط لکھ کر بورڈ یونین میں (کہ وہی اس زمانہ میں ہر قسم کی دلچسپیوں کا مرکز تھی) آویزاں کرا دیا۔"

۔۔۔فکر و آگہی۔ علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مولوی وحید الدین سلیمؔ پانی پتی

نذر سر سید

اس دورِ آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم
اک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا ہوا ہے

سر سبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں
فتووں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے

وقت اپنا، کام اپنا، مال اپنا، جان اپنی
یاروں پہ جس نے سب کچھ قرباں کردیا ہے

وار اس پہ قوم کے ہیں وہ قوم کی سپر ہے
قوم اس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا ہے

دِرہم سے اور قلم سے، دم سے، قدم سے اپنے
جو کچھ کیا ہے اس نے، وہ کس سے ہو سکا ہے

ہمدرد قوم ایسا، دیکھا سنا نہ ہم نے
یہ درد اس کو حد کی میراث میں ملا ہے

تعلیم کی تمہاری بنیاد اس نے ڈالی
ملکوں میں جس کا چرچا، ہر سمت ہو رہا ہے

بعد از قروں اولے کس نے کیا بتاؤ
سید نے کام آکر، جو قوم میں کیا ہے

○

سہ ماہی فکرو آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۲

خدماتِ سرسیّد

وہ جس کا دل غنی ہے، جذبۂ خدمت فراواں ہے
وہ سرسیّد ہے، مردِ حق ہے وہ مردِ مسلماں ہے

۹۸

منشی عنایت حسین کیفی

سیّدِ مخدوم

وہ قوم کا ہمدرد و مسلمانوں کا غم خوار پامرد اولوالعزم خدا ترس نکو کار
وہ حامی اسلام خدا اس کا مدد گار مخدوم ہے پر خدمتِ قومی کو ہے تیار
گو پیر ہے ہمت ہے جوانوں سے زیادہ
ہمدرد ہے، غیروں کا یگانوں سے زیادہ

یعنی وہ مرا سید مخدوم و معظم بہبودئ قومی پہ نظر جس کی ہے ہر دم
جو دل کے ارادے میں کسی وقت نہیں کم ہے فکر وہی اور وہی، کوشش پیہم
یک دم کو غم قوم فراموش نہیں ہے
اس پیر خرد مند میں کب جوش نہیں ہے

جب اس سے نہ دیکھی گئی یہ حالتِ ابتر اس مجلسِ قومی کو کیا اس نے مقرر
سب جمع ہوں آپس میں کریں مشورہ مل کر کام آئے مصیبت میں برادر کے برادر
یہ قوتِ مجموع ہو وجہِ مددِ قوم
دیکھیں نظرِ غور سے یاں نیک و بدِ قوم

گو آج بزرگوں سے ہے اس ہال کو زینت لیکن ابھی کالج کی ادھوری ہے عمارت
امداد کی حاجت ہے اعانت کی ضرورت پورا کریں تعمیر کو اب صاحبِ ہمت
مصروف توجہ ہو ادھر اہل نظر کی
تکمیل کریں مل کے سب اس قوم کے گھر کی

○

یہ نظم ۱۸۹۴ء میں علیگڑھ میں منعقدہ ایک اجلاس میں پڑھی گئی۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مولانا الطاف حسین حالی

سرسید کی مذہبی خدمات

سرسید کی لائف میں منجملہ ان مختلف حیثیتوں کے جو ان کی ذات میں جمع تھیں سب سے زیادہ مہتم بالشان اور سب سے زیادہ لحاظ کے قابل بلکہ ان کی تمام لائف کی جان مذہبی حیثیت ہے۔ جس پر ان کی لائف میں جو عنقریب شائع ہونے والی ہے، ہر ایک پہلو سے نظر ڈالی گئی ہے اور متعدد ابواب میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ ہمیں صرف تین امور پر بحث کرنی منظور ہے۔

جو کچھ گزشتہ چالیس برس میں سرسید نے مذہب کے متعلق لکھا اس کے لکھنے کا منشا کیا تھا؟

یہ لٹریچر مسلمانوں کی مذہبی تصنیفات میں کیا درجہ رکھتا ہے؟

ان تصنیفات سے اسلام یا مسلمانوں کے حق میں کیا نتیجے مرتب ہوئے؟

سرسید کا خمیر اس شہر کی خاک سے ہوا تھا جو کبھی ہندوستان میں اسلام کا مرکز اور مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ تھا اور جس زمانے میں پیدا ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی کے مسلمانوں کے پاس کوئی چیز جس پر وہ فخر کر سکیں، دین اسلام کے سوا باقی نہ رہی تھی اور اس لیے وہاں کے شریف مسلمان خاندان مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے۔ خصوصاً سرسید کا خاندان اس بات میں کسی قدر امتیاز رکھتا تھا۔ اس کو ایسے تین مقدس گھرانوں

ــ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سے قوی تعلق تھا جو نہ صرف دلی میں بلکہ ہندوستان کے دور دراز حصوں میں مذہبی مقتدا و پیشوا سمجھے جاتے تھے۔ ان کے باپ کی ننھیال خواجہ میر دردؔ کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی۔ خود سر سید کی ننھیال کے تمام زن و مرد شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے باپ سید متقی شاہ غلام علیؒ صاحب کے نہایت مقرب اور مخصوص ارادت مندوں میں سے تھے۔ شاہ صاحبؒ ان کو اپنا فرزند اور ان کی اولاد کو اپنے پوتا پوتی سمجھتے تھے۔ سر سید کی والدہ جن کی آغوش تربیت میں انھوں نے نشو ونما پائی تھی نہایت دیندار اور شاہ غلام علیؒ صاحب کی مرید تھیں اور ان کے خاندان کے چھوٹے بڑے عموماً فرائض مذہبی کے پابند تھے۔ پس سر سید نے آنکھ کھول کر اپنے دائیں بائیں مذہب ہی کا جلوہ دیکھا تھا اور چونکہ ان کے خاندان کو ایسے گھرانوں سے جو جامع شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے، ارادت مندانہ تعلق تھا اور ان کے گھر میں ہر ایک کام ان بزرگوں کی ہدایت وارشاد کے موافق ہوتا تھا۔ اس لیے ان کا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور بے ہودہ اوہام اور لغو عقائد سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں۔ گویا سر سید کو ہوش سنبھالتے ہی اسلام کا وہ نقشہ نظر پڑا تھا جو عامیانہ خیالات اور جاہلانہ رسوم اور بدعات کے میل کچیل سے بالکل صاف تھا پھر حسن اتفاق سے چند ایسے اسباب جمع ہو گئے کہ ان کو مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تصنیفات سے جن میں آزادی کی روح موجود تھی، زیادہ دلچسپی ہو گئی اور اس طرح وہ تقلید کی بندشوں سے رفتہ رفتہ آزاد ہوتے گئے۔ مگر غدر کے زمانے تک ان کے مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا۔ وہ اسی شرک و بدعت اور تقلید و عدم تقلید وغیرہ کے جھگڑوں میں الجھے رہے اور اسی لیے ان کی وہ مذہبی تصنیفات۔ جو غدر سے پہلے کی ہیں چنداں امتیاز نہیں رکھتیں۔

ایک ہندی دوہے میں علمی بحث ومباحثے کو گڑیوں کے کھیل سے اور خدا کی معرفت کو بیاہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی جب انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو جس طرح لڑکیاں بیاہ کا لطف اٹھانے کے بعد گڑیوں کے کھیل کو محض فضول سمجھنے لگتی ہیں اسی طرح آدمی خدا کی معرفت کا مرکز پا کر علمی قیل وقال اور مذہبی بحث وجدال کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ غدر کے بعد سر سید کا بھی یہی حال ہوا۔ مسلمانوں کی ہمدردی نے مذہبی تحقیقات کا جو مفید پہلو ان کو سمجھایا تھا اور جو لذت اس کاوش اور خلش میں ان

کو حاصل ہوئی تھی اس کے آگے ان کو اپنے پہلے مذہبی خیالات بچوں کا کھیل معلوم ہونے لگے۔
مسلمان مذہبی تعصبات میں سخت بدنام تھے اور انہی تعصبات کی بدولت غدر کے بعد ان کی پولیٹکل حالت کو سخت صدمہ پہنچا تھا اور آئندہ اس سے بھی سخت تر آفتوں کا سامنا نظر آتا تھا۔ سرسید کو جس طرح اسلام کے دینِ برحق ہونے کا یقین تھا اسی طرح اس بات کا بھی یقین تھا کہ سچا دین انسان کے حق میں خدا کی رحمت ہونا چاہیئے۔ اس لیئے انھوں نے سمجھا کہ اسلام ہرگز ایسے تعصبات کی تعلیم نہیں دے سکتا جن کی بدولت ہندوستان کی چھ کروڑ مخلوق طرح طرح کی آفات و حوادث کا نشانہ بن رہی ہے ورنہ بجائے اس کے کہ اسلام کو خدا کی رحمت سمجھا جائے وہ انسان کے حق میں سخت ترین عذابِ الٰہی ہوگا۔

مسلمانوں کی پولیٹکل مشکلات

اگرچہ گزشتہ زمانوں میں اسلام کو جس قسم کی مشکلات پیش آئیں، علمائے اسلام نے ان کو بخوبی حل کیا اور اپنے فرائض کا حق پورے طور پر ادا کر گئے۔ مگر جو مشکل اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھی چونکہ وہ کبھی ان کے زمانے میں پیش نہیں آئی تھی اس لیئے ان کو اس کے حل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے تک مسلمانوں کو کسی غیر قوم کی رعایا ہونے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا وہ ایک آدھ مستثنیٰ صورت کے سوا ہمیشہ جہاں کہیں رہے حکمراں رہے اور غیر قومیں ان کی محکوم رہیں۔ اس لیے جو برتاؤ مسلمانوں کو اصولِ اسلام کے موافق کسی غیر قوم کے محکوم ہونے کی حالت میں اس قوم کے ساتھ رکھنا چاہیئے اس کی طرف کبھی کسی کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔

حالانکہ اسلام نے بادشاہ کے فرائض اس کی حالت کے موافق اور رعیت کے فرائض اس کی حالت کے موافق اور اسی طرح ہر طبقے کے مصالحِ معاش جدا جدا بیان کر دیے تھے مگر چونکہ مسلمان کبھی (الا ماشاءاللہ) رعیت بن کر نہیں رہے تھے۔ اس لیئے رعیت ہونے کی حالت میں بھی وہ رعیت کے فرائض سے بے خبر رہے انھوں نے اقبال کے دور دورے میں ہمیشہ زمانے کو اپنے ساتھ موافق دیکھا تھا۔ اس لیئے ادبار کی حالت میں بھی وہ اسی بات کے متوقع رہے کہ زمانہ بھی ہمارا ساتھ

دے گا ہم کو زمانے کا ساتھ دینے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔

۲۔ مسلمانوں کی مذہبی مشکلات

یہ مشکلات تو مسلمانوں کی پولیٹکل حالت سے علاقہ رکھتی تھیں مگر ان کے سوا دو نہایت سخت اور خطرناک مشکلیں خاص کر مذہبِ اسلام کو اس وقت اور در پیش تھیں اولاً عیسائی مشنری (مبلغ)، جو تمام دنیا میں دینِ مسیحی کی اشاعت میں سرگرم ہیں اور برٹش انڈیا میں اس کے پھیلانے کو اپنا قدرتی حق سمجھتے ہیں، ان کا دانت ہندوستان کی قوموں میں سب سے زیادہ مسلمانوں پر تھا۔ اگرچہ غدر سے پہلے اکثر مسلمان عالموں نے ان کے مقابلے میں اپنے قدیم طریقۂ مناظرہ کے موافق عمدہ عمدہ کتابیں لکھی تھیں اور بعض نے ان سے زبانی مناظرے بھی کیے تھے جن سے بلاشبہ مسلمانوں کو بڑا فائدہ ہوا اور وہ عیسائیوں کا شکار ہونے سے بچ گئے لیکن غدر کے بعد مشنریوں نے مناظرے کا قدیم طریقہ بالکل بدل دیا تھا اور جس قسم کے اعتراض انھوں نے اب اسلام اور داعیِ اسلام پر کرنے شروع کیے تھے ان کی تردید کے لیے مسلمانوں کو بھی مناظرے کا نیا طریقہ اختیار کرنا ضروری تھا کیونکہ جس طرح آج کل کی نو ایجاد بندوقوں کے سامنے پرانی توڑے دار بندوقیں کچھ کام نہیں دے سکتیں اسی طرح مشنریوں کے نئے طریقۂ مناظرہ سے ہمارے قدیم طرز کے مناظرے کا عہدہ برآ ہونا دشوار تھا۔ چنانچہ سر ولیم میور کی لائف آف محمدؐ جو چار جلدوں میں لکھی گئی تھی، اس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ کوئی کتاب اسلام کی جڑ کاٹنے والی عیسائی دنیا میں ایسی نہیں لکھی گئی جیسی یہ ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے حق میں مشنریوں کا نیا طریقۂ نکتہ چینی حد سے زیادہ خطرناک تھا اور اس لیے ضروری تھا کہ مسلمان بھی اسلام کی طرف سے مدافعت کا نیا طریقہ اختیار کریں۔

دوسری مشکل جو اسلام کے حق میں پہلی مشکل سے بہت زیادہ خطرناک تھی وہ یہ تھی کہ انگریزی تعلیم جس سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا، روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جاتی تھی اور غدر کے بعد اس کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ اگرچہ غدر سے پہلے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کچھ اشاعت نہیں ہوئی تھی لیکن غدر کے بعد اس کے بغیر مسلمانوں کو ابھرنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا محال ہو گیا تھا۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

یہاں تک کہ سرسید کو خود ان میں تعلیم پھیلانی پڑی۔ حالانکہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنریوں کی پریچنگ (تبلیغ مذہب) سے زیادہ اندیشہ ناک تھے۔ یورپ میں جو سخت صدمہ علوم جدیدہ کی تعلیم سے دین عیسوی کو پہنچا تھا وہی صدمہ ان کی اشاعت سے ہندوستان میں اسلام کو پہنچنے کا اندیشہ تھا اور اس مشکل کا اس طرح مقابلہ کرنا کہ مغربی تعلیم مسلمانوں میں جاری نہ ہونے دی جائے، اول تو مسلمانوں کی طاقت سے باہر تھا کیونکہ وہ جس طرح ہندوستان میں روز بروز پھیلتی جاتی تھی اسی طرح تمام دنیا میں یہاں تک کہ ممالک اسلامیہ یعنی ترکی، مصر اور ایران وغیرہ میں بھی عام ہوتی جاتی تھی۔ دوسرے مغربی علوم کی تعلیم کو اس خوف سے کہ مبادا مذہب اسلام کو ان سے صدمہ پہنچے، روکنا اور ان کے انسداد میں کوشش کرنا گویا اس بات کو تسلیم کر لینا تھا کہ اسلام علوم جدیدہ کی روشنی کے آگے نہیں ٹھہر سکتا اور مثل دیگر مذاہب کے اسلام بھی سائنس کے حملے کی تاب نہیں لا سکتا۔

یہ تمام مشکلات ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کو در پیش تھیں اور چھ کروڑ مسلمانوں میں صرف ایک سید احمد خاں ان تمام مشکلوں کا سمجھنے والا، ان کے انجام کا سوچنے والا اور ان کا مقابلہ کرنے والا تھا۔

ہمارے مسلم الثبوت علماء کو اول تو ان مشکلات کا احساس ہونا ہی دشوار تھا اور اگر بالفرض ان کو احساس بھی ہوتا تو ان مشکلات کا تدارک ان کے احاطۂ قدرت سے خارج تھا کیونکہ تقلید کی بدولت ان میں اس بات کی قابلیت باقی نہیں رہی تھی کہ اگر مذہب کے متعلق کوئی ایسی نئی مشکل پیش آئے جو اگلے علماء کو پیش نہیں آئی اور جس کا حل ان کی کتابوں میں صراحتاً موجود نہ ہو تو اس کے حل کرنے میں اپنی سمجھ بوجھ سے کام لے سکیں اور اس کا علاج خود قرآن و حدیث میں جو دینیات کے اصلی مخرج ہیں، تلاش کر سکیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہبی مشکلات کی حل کرنے والی صرف فقہ اور تفسیر علمائے سلف کی کتابیں ہیں۔ قرآن محض تلاوت کے لیے، حدیث محض سننے کے لیے، عقل انسانی امورات مذہبی میں محض معطل اور بیکار رہنے کے لیے ہے اور بس۔

جو مشکلات اسلام اور مسلمانوں کو اس وقت در پیش تھیں ان کے مقابلے کے لیے کسی عالم متبحر کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک ایسے معمولی استعداد کے آدمی کی ضرورت

تھی جو صاحبِ عقلِ سلیم ہو، قدیم طریقۂ تعلیم کا منتر اس پر کارگر نہ ہو، دنیا کے حالات سے باخبر ہو، علومِ جدیدہ کی طاقت سے واقف ہو، تقلید کی بندش سے آزاد ہو، لومۃ لائم سے خائف نہ ہو، اسلام اور مسلمانوں کا حقیقی خیر خواہ اور جاں نثار ہو۔

سر سید نے غدر کے زمانے سے لے کر آخیر دم تک ان تمام مشکلات کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے دلائلِ عقلیہ سے، قرآن و حدیث کے حوالوں سے، ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ عمل درآمد سے بے شمار ثبوت اس بات کے دیئے کہ عیسائیوں کے ساتھ سچے دل سے دوستی کا برتاؤ کرنا، ان کے ساتھ دوستانہ میل جول رکھنا، ان کے کھانوں اور دعوتوں میں شریک ہونا، مصالحِ دنیوی میں ان کی پیروی کرنا، ان کی زبان، ان کے علوم سیکھنا، ان کے آڑے وقت میں کام آنا، ان کے مصائب میں ان کے ساتھ ہمدردی کرنا، عین اسلام کی تعلیم کا مقتضا ہے اور جس طرح قرآن کی رو سے کوئی قوم عیسائیوں سے بڑھ کر مسلمانوں کی دوست نہیں ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی ان کا خالص و مخلص دوست ہونا ضروری ہے۔

انھوں نے پُرزور مذہبی دلائل سے ثابت کیا کہ انگریزی حکومت میں رہ کر مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ سلطنت کی اطاعت، خیر خواہی اور وفاداری میں ثابت قدم رہیں اور جب کبھی سلطنت کو کوئی مشکل پیش آئے تو جان و مال سے اس کا ساتھ دیں۔ غرض ان کو طرح طرح سے عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ یقین دلایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا عزت و آبرو سے رہنا اسی حالت میں ممکن ہے جبکہ وہ برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیر خواہ بن کر رہیں۔

۴۔ سر سید کی مذہبی خدمات اب ہم نہایت مختصر ذکر سر سید کی اس غیر معمولی سرگرمی اور عجیب و غریب لیاقت کا کرتے ہیں جو دینِ اسلام کی حمایت میں بحیثیت اس کے دینِ برحق ہونے کے آخیر دم تک ان سے ظاہر ہوتی رہی ہے اور جس کی رو سے بیشک طور پر ان کو اسلام کے جدید علمِ کلام کا موجد اور سائنس اور مذہب میں دائمی صلح کی بنیاد ڈالنے والا کہا جاسکتا ہے۔

جو کچھ سر سید نے اسلام کی حمایت میں بمقابلہ عیسائیوں کے لکھا ہے اس میں سب

سے زیادہ لحاظ کے قابل وہ بارہ خطبے ہیں جو انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ کی پہلی جلد کے جواب میں لکھے ہیں اور جو اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں چھپ گئے ہیں۔ لیکن جو شخص اس کتاب کی اصل خوبی اور مصنف کی لیاقت سے پوری پوری واقفیت حاصل کرنی چاہے اس کو چاہیئے کہ اردو ایڈیشن کا مطالعہ کرے۔ کیونکہ انگریزی ایڈیشن درحقیقت اردو ایڈیشن کا خلاصہ ہے جس میں بہت سی باتیں بہ نسبت اردو ایڈیشن کے نہایت اختصار کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا لکھنا سرسید کی مذہبی خدمات میں ایک جلیل القدر خدمت ہے اور اس کا بیان بہت طولانی ہے۔ جس کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے اس لیئے ہم اس موقع پر اس کی نسبت زیادہ لکھنا نہیں چاہتے کیونکہ سرسید کی لائف میں اس کا مفصل بیان کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیئے کہ سرسید سے پہلے جہاں تک ہم کو معلوم ہوا ہے کبھی کسی مسلمان نے مثل خطباتِ احمدیہ کے کوئی ایسی کتاب جس میں اسلام کی خوبیاں ظاہر کی گئی ہوں یا اس کے مخالفوں کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہوں ان قوموں کے ملک میں جاکر جن کو مسلمان گمراہ سمجھتے ہیں اور جن پر اسلام کا عرض کرنا اپنا فرض جانتے ہیں انہی قوموں کی زبان میں لکھ کر شائع نہیں کی۔ ایک بہت بڑے عیسائی عالم ریورنڈ رہو پرنے جو ایک زمانے میں لاہور ڈیونٹی کالج کے پرنسپل تھے۔ میرے ایک مسلمان دوست سے کہا تھا۔

"خطباتِ احمدیہ لکھنے سے سید احمد خاں نے اسلام کی ایک ایسی خدمت کی ہے جو تیرہ سو برس میں کسی مسلمان سے بن نہیں آئی۔"

اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اب تک اس کتاب کی کچھ قدر نہیں کی بلکہ معدودے چند کے سوا اس کو کسی مسلمان نے دیکھا بھی نہیں، مگر امید ہے کہ جب وہ ان ضرورتوں کو سمجھیں گے جو مسلمانوں اور اسلام کو فی زمانہ درپیش ہیں اور جن کو سرسید احمد خاں کے سوا بہت ہی کم آدمیوں نے اب تک سمجھا ہے تو اس کی صرف قدر ہی نہیں کریں گے بلکہ فخر کریں گے کہ اس کا لکھنے والا ایک ہندوستان کا مسلمان تھا جس زمانے میں سرسید لندن میں یہ کتاب لکھ رہے تھے اس وقت ترکی کے ایک مسلمان عالم سے وہاں ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ سرسید نے اپنی کتاب کے چند مقالات

اس کو سنائے تو اس کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار سر سید کے ہاتھ چومتا تھا اور اچھلا جاتا تھا۔

کرنل گریہم سر سید کی لائف میں اسی خطبات احمدیہ کی نسبت لکھتے ہیں،

"جو لوگ (یعنی انگریز) مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ دینِ محمدی فی زمانہ انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت متہم دین ہے اور وہ اس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں۔ جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بونا پارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ (یعنی اسلام) عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصب، مغائرت اور تنگ دلی کی اس میں خیال کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ناظرینِ کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں، جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے۔ ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کی تحریروں کی مخالفت کی ہے اور خوب برچھیاں توڑی ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور دقیقہ سنج ناظرینِ کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔"

انگلستان کے اخبار انکوائرر میں جبکہ خطباتِ احمدیہ وہاں شائع ہوئی، ایک مبسوط ریویو (جس کا خلاصہ سر سید کی لائف میں درج کیا گیا ہے) کسی آزاد خیال انگریز نے اس کتاب پر لکھا تھا جس میں توقع سے بہت زیادہ اس کی تعریف کی تھی اور بڑے بڑے اہم مسائل میں سر سید کے جوابوں کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا بلکہ ان کی حد سے زیادہ داد دی تھی اور سر ولیم میور نے ڈاکٹر اسپرنگر کے مقابلے میں سر سید کی کامیابی کا اعتراف کیا تھا۔ اس سے بہتر ایک ایسی کتاب کے حق میں جو عیسائیوں کے مقابلے میں لکھی گئی ہو اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ خود عیسائی قوم کے متعدد ممبروں نے اس کی نسبت ایسی عمدہ رائے ظاہر کی ہے۔

اس کتاب میں چند جزوی اختلافات کے سوا جن کا ایک محقق مصنف کی کتاب میں ہونا لابدی ہے، کوئی ایسی بات نہیں ہے جو جمہورِ اسلام کے خلاف ہو اور امید ہے کہ جس قدر تعصبات کا طوفان فرو تر ہوتا جائے گا (اور اس کے فرو ہونے

کا وقت اب آگیا ہے، اسی قدر اس کتاب کی وقعت روز بروز مسلمانوں میں زیادہ ہوتی جائے گی۔

سب سے زیادہ اہم اور قابلِ غور سرسید کی وہ مذہبی خدمت ہے جو ان کے آخیر دم تک برابر جاری رہی یعنی تفسیر القرآن کا لکھنا جس کا اصل مقصد تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کرنا اور اسلام کو سائنس کے حملوں سے بچانا تھا۔ جس نیت سے سرسید نے یہ تفسیر لکھنی شروع کی اور جن ضرورتوں نے ان کو اس کے لکھنے پر مجبور کیا تھا اس کا مفصل بیان انھوں نے اپنے ایک لیکچر میں کیا ہے جو لاہور میں اسلام پر دیا گیا تھا اور جو سفرنامہ پنجاب میں اور ان کی اسپیچوں اور لیکچروں کے مجموعے میں چھپ گیا ہے۔ اس لیکچر میں انھوں نے اس تفسیر کے لکھنے کا اصل منشا ایسی سچائی اور خلوص اور جوشِ اسلامی کے ساتھ بیان کیا تھا کہ ان کے ایک سخت مخالف مولوی نے جو ان کے برخلاف رسالے شائع کرتے تھے اور ان کو نفرین اور ملامت کے گمنام خط لکھتے تھے، لیکچر ختم ہونے کے بعد علی رؤس الاشہاد اپنی غلط فہمیوں کا اقرار کیا اور سرسید سے اپنے قصوروں کی معافی چاہی اور خود اپنے اوپر یہ جرمانہ کیا کہ اپنی ایک پوری تنخواہ کالج کے چندے میں دی۔

اس تفسیر پر بھی سرسید کی لائف میں مفصل ریویو کیا گیا ہے جو کسی قدر طویل ہے۔ یہاں صرف اس مختصر بیان پر اکتفا کرنا چاہیے کہ جس وقت سرسید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اسی وقت سے ان کو اس بات کی فکر تھی کہ جس قدر دنیوی ترقی کے لیے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف مائل کرنا ضروری ہے، اس سے بہت زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کو تعلیم کے ان مضر نتائج سے جو مذہب کے حق میں اس سے پیدا ہونے نظر آتے ہیں، جہاں تک ممکن ہو بچایا جائے۔

سرسید دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان اور خواہ عیسائی، ان کے دل میں مستثنیٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ وہ جانتے تھے کہ اسی تعلیم کی بدولت روز بروز الحاد اور دہریت پھیلتی جاتی ہے اور عیسائی مذہب میں ضعف آتا جاتا ہے۔ اس لیے ان کو خوف تھا کہ جو

تعلیم وہ مسلمانوں میں پھیلانی چاہتے ہیں اور جو ضرور ان میں پھیلنے والی ہے، مبادا اس سے ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں پیدا ہوں۔ چنانچہ ۱۸۷۶ء میں کہ یہی زمانہ مسلمانوں میں تعلیم کی بنیاد پڑنے اور کالج کے کھلنے کا ہے اور تقریباً یہی زمانہ سرسید کی تفسیر شروع ہونے کا معلوم ہوتا ہے، انھوں نے ایک اسپیچ میں خاص کر مدرسۃ العلوم کے طلبا سے مخاطب ہو کر

> **جلاء القلوب**
>
> **بذکر المحبوب صلی اللہ علیہ وسلم**
>
> جو والد ولد سید احمد خان بہادر عارف جنگ
> کی تالیف کی ہوئی ماہ رمضان المبارک ۱۲۵۹ھ
> ہجری میں جناب سید محمد خان بہادر کے
> چھاپہ خانہ کے لیتھوگرافک پریس میں سید
> عبدالغفور کے اہتمام سے دلی میں چھپی

کہا تھا کہ "یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اس پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے، پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا۔ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہوگے اور جب ہی ہماری قوم کی عزت ہوگی۔"

باوجود اس اندیشہ کے جو ان کو انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں تھا، ان کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ خالص اسلام جس کو وہ ٹھیٹ اسلام کہتے تھے اور جو ان کے نزدیک حالتِ موجودہ میں صرف قرآن مجید میں منحصر تھا، اس کو انگریزی تعلیم سے وہ صدمہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا جو یورپ اور امریکہ میں عیسائی مذہب کو پہنچا ہے ان کو معلوم تھا کہ مغربی تعلیم سے جو ایک عام یقین ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) نوجوانوں کے دل پر نقش ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی امر لاء آف نیچر یعنی قانون فطرت کے

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

خلاف وقوع میں نہیں آتا اور اسی لیئے جو چیز وہ مذہب میں ایسی پاتے ہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے اس پر یقین نہیں کرتے۔ سرسید کو بھی اس اصول پر ایسا ہی یقین تھا اور اسی کے ساتھ یہ بھی یقین تھا کہ قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو درحقیقت قانونِ فطرت کے خلاف ہو۔ مگر ان کا قول تھا کہ قرآن چونکہ کافۂ انام کی ہدایت کے لیئے نازل ہوا ہے اس لیئے اس کا طرزِ بیان ایسا واقع ہوا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اُمّی اور جاہل سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے عالم اور حکیم تک سب اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت پاتے ہیں۔ پس گو اس کی ظواہر آیات سے اکثر موقعوں پر عام ذہنوں میں فوق العادۃ امور کا واقع ہونا سمجھا جاتا ہے مگر جب آیتوں پر تعمقِ نظر کے ساتھ غور کیا جاتا ہے تو ان میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں معلوم ہوتی۔

اسی اصول پر انھوں نے تفسیر القرآن لکھنی شروع کی جو قریب نصف قرآن کے چھ جلدوں میں چھپ چکی ہے اور بہ قدر ایک جلد کے اس کا قلمی مسودہ موجود ہے۔

جس طرح سرسید کے اور اکثر کام سب سے نرالے اور اچھوتے تھے اسی طرح اس تفسیر کا بھی سب سے نرالا کام تھا۔ تیرہ سو برس میں کسی مسلمان نے قرآن کی تفسیر اس اصول پر نہیں لکھی کہ قرآن میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ہے۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس کتاب کی نسبت یہ یقین کیا جائے کہ وہ سرتاسر خدا کا کلام ہے اس کی سچائی کا اس سے بہتر کوئی معیار نہیں ہوسکتا کہ اس میں کوئی بیان درحقیقت قانونِ فطرت کے خلاف نہ ہو۔ مگر جس طرح یہ کہنا آسان ہے کہ "خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں" لیکن اس کے ہر ایک کام کی مصلحت بیان کرنی سخت مشکل ہے، اسی طرح یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ "قرآن میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں" مگر قرآن کے ہر ایک بیان کو قانونِ فطرت پر منطبق کرنا نہایت دشوار ہے۔ کیونکہ جو کتاب خدا کی طرف سے تمام دنیا کی ہدایت کے لیے آئی ہو اس کی شان یہی ہے کہ اس میں کوئی بات عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر نہ ہو اور اسی لیئے ضروری ہے کہ اس میں بہت سی باتیں ایسے پیرایوں میں کی جائیں کہ اگر ان کو ظاہری معنوں میں محدود رکھا جائے تو وہ کسی طرح علمی تحقیقات کی میزان میں

پوری نہ اتر سکیں۔

بہرحال سرسید نے یہ ایک مشکل کام اختیار کیا تھا کہ اگر کوئی اور شخص ایسا ارادہ کرتا تو مشکلات کا ہجوم دیکھ کر اس ارادے سے کبھی کا دست بردار ہوگیا ہوتا۔ مگر انھوں نے باوجود ایسی مشکلات کے اور باوجود اپنے ہم مذہبوں کی سخت مخالفت کے اس ارادے کو اخیر دم تک ترک نہیں کیا بلکہ اس کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد اور اسلام کی خیرخواہی کا سب سے بڑا کام سمجھا۔

اگرچہ ان کو اس تفسیر کے اکثر مقامات میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ جس سے ایک عجیب و غریب تھیالوجیکل (مذہبی) قابلیت ان کے دماغ میں ثابت ہوتی ہے مگر اسی کے ساتھ بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیونکر ایسی تاویلاتِ باردہ پر اطمینان ہوگیا اور کیونکر ایسی فاحش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئی ہیں؟ لیکن درحقیقت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ جن لوگوں نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہے اور زید و عمر کا سہارا چھوڑ کر اپنی خداداد عقل سے کام لیا اور قدما کے علم میں کچھ اضافہ کرنا چاہا ہے ان سب کی رایوں میں اس قسم کی شترگربگی پائی گئی ہے کہ ان کی بعض باتوں پر الہام ہونے کا گمان ہوتا ہے اور بعض انتہا درجے کی رکیک اور نحیف معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک کی دوسری کے ساتھ کچھ نسبت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں جو علوم دینیہ میں اپنے اپنے فن کے امام مانے گئے۔ ان کی غلطیوں سے دین کو کچھ نقصان نہیں پہنچا کیونکہ وہ لغو سمجھ کر آخر کار مردود ٹھہر گئیں۔ مگر ان کی فتوحاتِ جدیدہ سے اسلام کو بے انتہا تقویت پہنچی ہے۔ سرسید کو اپنی اس نئی طرز کی تفسیر کے جن جن مقامات میں پوری کامیابی ہوئی ہے اور ایسے مقامات کی تعداد کچھ کم نہیں ہے، ان سے فی الواقع بمقابلہ علوم جدیدہ کے اسلام میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد پڑگئی ہے اور اس بات کی امید بندھ گئی ہے کہ جب اس قدر مشکلات صرف ایک شخص کی کوشش سے حل ہوگئے ہیں تو باقی مشکلات بھی ضرور کبھی نہ کبھی حل ہوجائیں گی۔ دنیا میں ہمیشہ بڑے بڑے کام اسی طرح پورے ہوئے ہیں کہ ایک شخص کسی کام کی بنیاد ڈالتا ہے اور آئندہ نسلیں اس کام کو پورا کرتی ہیں اور اس کی غلطیوں کی اصلاح کرتی ہیں۔ سرسید نے خود اپنے ایک لیکچر میں جو انھوں نے بمقام لاہور "اسلام" پر دیا تھا، اس بات کا اقرار کیا ہے کہ:

"میں معصوم نہیں ہوں اور نہ معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں ایک جاہل آدمی ہوں۔ اسلام کی محبت سے میں نے یہ کام کیا ہے جس کے میں لائق نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو مگر آئندہ علماء اس کی صحت کر دیں گے اور اسلام کو مدد دیں گے۔ میرے خیال میں مخالفین اور متشککین فی الاسلام کے مقابلے میں اسلام کی تائید اسی طریقے پر ہو سکتی ہے اور کسی طریقہ پر نہیں ہو سکتی۔"

اگرچہ اس نئی طرز کے علم کلام کو جس کی بنیاد بمقابلہ علوم جدیدہ کے سرسید نے اپنی تفسیر میں ڈالی ہے، اب تک ہمارے علماء نے اسی نفرت اور کراہیت سے دیکھا ہے جیسے عباسیہ کے عہد میں محدثین و فقہاء نے قدیم طرز کے علم کلام کو اس کے آغاز کے زمانے میں دیکھا تھا۔ مگر جس طرح قدیم علم کلام آخر کار علوم دینیہ کا ایک نہایت ضروری حصہ سمجھا جانے لگا تھا اسی طرح امید ہے کہ اگر ہمارے علماء نے تعصب اور تقلید کی بندشوں سے آزاد ہو کر ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا اور سرسید کے عمدہ خیالات کو اخذ کیا اور ان کی غلطیوں کی اصلاح کی اور جس عمارت کی انھوں نے بنیاد ڈالی ہے اس کو پورا کرنا چاہا تو تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کے لئے یہ جدید علم کلام نہایت مفید بلکہ علوم دینیہ کا ایک نہایت ضروری حصہ سمجھا جائے گا اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جو کچھ سرسید نے اس مضمون پر تفسیر القرآن یا تہذیب الاخلاق یا چھوٹے چھوٹے متعدد رسالوں میں لکھا ہے اس کا ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ طبقہ) کے مسلمانوں پر عجیب و غریب اثر ہوا ہے۔ میں ایسے متعدد مسلمان نوجوانوں سے واقف ہوں جنہوں نے انگریزی تعلیم پانے کے زمانے میں مذہب کو بالکل خیرباد کہہ دیا تھا اور بعضوں نے عیسائی ہونے کا ارادہ ٹھان لیا تھا اور ایسے تو بے شمار تھے جن کا ایک قدم لامذہبی کی طرف اٹھتا تھا تو دوسرا قدم مذہب کی طرف سے پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ مگر جب سے سرسید مرحوم کی مذکورہ بالا تحریریں شائع ہونا شروع ہوئیں اس وقت سے جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ رخنہ تقریباً بالکل بند ہو گیا ہے۔ بعض مسلمان نوجوانوں نے اخباروں میں بذریعہ تحریر کے اور بعضوں نے پبلک لیکچروں میں اور بعض نے اپنے دوستوں سے زبانی بیان کیا ہے کہ "اگر سید صاحب کی تحریریں ہماری نظر سے نہ گزرتیں تو ہم اسلام سے منحرف ہو جاتے"۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہی مقصد سرسید کا تفسیر القرآن لکھنے کا تھا۔

ایک بار ایک مولوی صاحب سرسید سے ملنے کو آئے اور ان کی تفسیر دیکھنے کو مانگی۔ سرسید نے ان سے کہا کہ "آپ کو خدا کی وحدانیت اور رسول خدا صلعم کی رسالت پر تو ضرور یقین ہوگا۔" انھوں

نے کہا "الحمدللہ" پھر کہا کہ "آپ حشر اور عذاب و ثواب اور بہشت و دوزخ پر بھی یقین رکھتے ہوں گے؟ انھوں نے کہا "الحمدللہ" اس پر سرسید نے کہا "بس تو آپ کو میری تفسیر دیکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اس کی ضرورت ان لوگوں کو ہے جو مذکورہ بالا عقائد پر یقین نہیں رکھتے یا ان میں متردد و مذبذب ہیں۔" سرسید کا خیال تھا کہ اس تفسیر سے کچھ عجیب نہیں بلکہ نہایت قرین قیاس ہے کہ مسلمانوں میں ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) لوگوں کا ایک نیا فرقہ پیدا ہو جائے جو مذہبی خیالات میں مسلمانوں کے موجودہ فرقوں سے کسی قدر مختلف ہو لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ "ایسا نیا اسلامی فرقہ بہ نسبت اس کے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرلیں یا کسی مذہب کے پابند نہ رہیں، ہزار درجہ بہتر ہے۔"

یہاں ایک لطیفہ ذکر کرنے کے قابل ہے۔ علی گڑھ کے ایک مشنری (پادری) صاحب نے سرسید کے ایک دوست سے کہا کہ "سید صاحب یہ تو خوب جانتے ہوں گے کہ محمڈن کالج کے طالب علم مسلمانوں کے طریقہ پر قائم نہیں رہ سکتے۔ پھر وہ تفسیر لکھ کر ان کو ہمارے ہاتھ سے بھی کیوں کھوتے ہیں؟

سرسید نبی نہیں تھے کہ تنقید سے بالاتر ہوں۔ امام نہیں تھے کہ معصوم کہلائیں۔ ولی اللہ نہیں تھے کہ بیعت روحانی کے مدعی ہوں۔ مگر وہ فکر و عمل کے پیشوا ضرور تھے۔ تعصب، توہمات اور جمود کے ماحول میں انھوں نے روشنی، حرکت، عقل اور ایمان کے حق میں اجتہاد کیا۔ وہ انسانوں کے دستگیر اور چار سو سال سے سوئی ہوئی مسلم ملت کے مسیحا اور مجدد تھے۔ ان کے بعض خیالات سے اختلاف ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کے طرزِ فکر کی معنویت اور افادیت ہنوز تازہ ہے۔

(ڈاکٹر حامد مسعود)

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب

سر سیّد: خدمات اور اثرات

سر سید کے کارناموں کا تاریخی ترتیب سے اگر مختصراً تذکرہ کیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ۱۸۴۷ء میں "آثار الصنادید" لکھ کر ماضی کی عظمت اور اسلاف کے کارناموں کی اہمیت کا احساس دلایا۔ مسلمانوں کے آثار، خواہ تاریخی عمارتوں کی صورت میں رہے ہوں یا اہلِ کمال افراد کی صورت میں، ان سب کو اوراق ہی میں نہیں بلکہ اذہان میں محفوظ کرانے کی کوشش کی۔ ۱۸۵۷ء کی رستخیز بے جا" کے نتیجے میں برِصغیر کے مسلمانوں کو جس پسپائی اور ذلت، محرومی اور مایوسی اور برطانوی استعمار کے ظلم و تشدد کا شکار ہونا پڑا تھا اس سے نجات کی راہیں نکالیں۔ حاکم و محکوم کے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی تھی اسے پاٹنے کی کوشش کی مصالحت اور مفاہمت کی تدبیروں کو عملی شکل دی۔ "اسباب بغاوت ہند" تصنیف کی اور رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" جاری کیا۔ قوم کی شیرازہ بندی کی۔ اسے احساسِ شکست و محرومی کی دلدل سے نکلنے اور موجودہ حالات میں زندگی کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے ان کے مطابق عملی اقدام پر متوجہ کیا۔ یورپ کی اکتشافی کارناموں سے اہلِ ملک کو روشناس کرانے اور سائنسی مزاج کو فروغ دینے کے لیے ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا (۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء) تاکہ چھوٹی چھوٹی مختصر مختصر باتوں کا وقتاً فوقتاً ہندوستانیوں کو علم ہوتا رہے اور

انفرادی و اجتماعی اخلاق کی اصلاح ہو۔ صفائی و حفظانِ صحت کا رجحان عام ہو، علمی اور سائنسی نقطۂ نظر کا فروغ ہو، زراعت کے نئے طریقوں پر عمل ہو اور سیاسی معاملات پر رائے عامہ بیدار ہو۔ مسلمانوں کی سوشل ریفارم اور اردو زبان و ادب کی اصلاح و ترقی کے لیے ۱۸۷۰ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ مقتضائے زمانہ کے لحاظ سے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے ۱۸۷۵ء میں ایم اے او کالج قائم کیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کے جذباتی رویے اور نتیجتاً اس قوم کی تباہی اور عبرت ناک انجام کے پیش نظر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے سیاسی دور اہے سے مسلمانوں کو الگ رہنے کی بجا طور پر تلقین کرتے ہوئے ایک مشترکہ لائحہ عمل کے تحت ملک گیر پیمانے پر مسلمانوں میں تعلیمی تحریک پیدا کرنے کی خاطر ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس قائم کی۔ جیسا کہ مولانا حالی نے اشارہ کیا ہے:

"اس وقت سر سید کا یہ خیال بھی صحیح تھا کہ اگر بالفرض یہ کالج ہر طرح مکمل ہو گیا تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور ایک کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیمی کفالت نہیں کر سکتا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی قوم جو ہندوستان کے دور دراز حصوں میں پھیلی ہوئی ہے وہ سب ایک دوسرے کی حالت سے محض بے خبر ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف صوبوں اور مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں، اپنے اپنے خیالات، قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں، ہر حصۂ ملک کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزلی کا حال تمام قوم کو معلوم ہو اور مسلمان جو باوجود ایک قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں ان میں قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اسی بنا پر یہ کانفرنس قائم کی گئی۔"[1]

علیگڑھ تحریک کے امام کی حیثیت سے، سائنٹفک سوسائٹی کے بانی اور گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے مدیر کی حیثیت سے، سوشل ریفارمر اور اردو زبان و ادب کے سچے خادم کی حیثیت سے، ایم اے او کالج اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

[1] سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کے روحِ رواں کی حیثیت سے سرسید نے انفرادی طور پر جو خدمات انجام دی ہیں
ان کا معروضیت اور وسعت نظر کے ساتھ مطالعہ بھی باقی ہے۔
مطالعۂ سرسید کا دوسرا تشنۂ بحث پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے معاصرین
اور رفقا پر جو اثر ڈالا اس کا بھی جائزہ لے کر سرسید کی عظمت و اہمیت کو آشکار کیا
جائے۔ سرسید کے معاصرین میں غالبؔ سب سے بڑے جینئس قرار دیے جاتے
ہیں وہ سرسید سے عمر میں تقریباً اکیس سال بڑے تھے۔ سرسید غیر مقلد تھے اور اجتہادِ
فکر و نظر کے قائل تھے۔ مرزا غالبؔ کو بھی یہی روش پسند تھی ؂

می رویم برا۔ہے کہ کارواں رفت است

لیکن سرسید نے جب ابوالفضل کی آئینِ اکبری کی تدوین (۱۸۵۶ء) کر کے غالبؔ
سے تقریظ لکھنے کی درخواست کی تو غالبؔ نے سرسید کے کارنامے کو ستائش کی نظر
سے نہ دیکھا اور ایسی تقریظ لکھی جو سرسید کے نزدیک بے مصرف تھی چنانچہ انھوں
نے غالب کی خدمت میں واپس لوٹا دیا۔ غالب کے بعض مداحوں کو اس معاملے کی روشنی
میں سرسید کا قد چھوٹا نظر آنے لگا اور غالب دور اندیش قرار پائے کہ انھوں نے
مغل سلطنت کے زوال کو بھانپ لیا تھا اور انگریزوں کی ایجادات نے ان کی
آنکھیں روشن کر دی تھیں لیکن معاملے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ سرسید کے جس
کام کو غالبؔ نے ناپسند کیا وہی کام انھوں نے خود کیا یعنی "مہر نیم روز" لکھی، بہادر شاہ
ظفر کے دربار تک رسائی حاصل کی اور نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ کے
خطابات اور خلعت ہفت پارچہ سے سرفراز ہوئے۔ مہر نیم روز کی تصنیف کا
سبب خواہ بہادر شاہ ظفر یا حکیم احسن خاں رہے ہوں یا غالب کی فارسی انشا پردازی
لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا محرک اول خود سرسید کی "آثار الصنادید" ہے
مزید یہ کہ سرسید کی بصیرت اور دور اندیشی کا تو یہ عالم ہے کہ انھوں نے ۱۸۳۹ء میں
ہی لال قلعہ کی ملازمت کو ٹھکرا دیا تھا اور اعزہ کے اعتراض کے باوجود ایسٹ انڈیا
کمپنی کی ملازمت قبول کر لی تھی۔ دوسری طرف غالبؔ ہیں جنھوں نے ۱۸۵۰ء میں
لال قلعہ کی نوکری کی اور سقوطِ سلطنت تک شہ کے مصاحب رہے۔
سرسید کے رفقا میں علامہ شبلی تھے جنھوں نے سرسید سے ذہنی تربیت حاصل

کی اور انھیں کی تحریک پر ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ دسمبر ۱۸۸۷ء کے لیے "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" پر طویل مقالہ لکھا جو کانفرنس کی رپورٹ میں اور بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہی وہ مقالہ ہے جس نے شبلی کو بقول شیخ محمد اکرام "کالج کے حلقے سے نکال کر ساری قوم کے سامنے ایک سر برآوردہ عالم کی حیثیت سے پیش کیا۔" سر سید کی بدولت ہی وہ گبن، کارلائل، مِل، کولرج، آرنلڈ، ہربرٹ اسپنسر وغیرہ مفکرین سے واقف ہوئے اور اپنی تصانیف میں ان کے افکار سے فائدہ اٹھایا۔

اردو میں تقابلی مطالعے کا آغاز بھی سر سید کی "تبیین الکلام فی تفسیر التورات والانجیل علی ملۃ الاسلام" (حصہ اول مطبوعہ ۱۸۶۲ء و حصہ دوم مطبوعہ ۱۸۶۵ء پرائیویٹ پریس غازی پور) سے ہی ہوتا ہے اور "موازنہ انیس و دبیر" بھی شبلی کے ایسے دور کی تصنیف ہے جب ان کی سخت حنفیت بقول پروفیسر آل احمد سرور سر سید کے اثر سے اعتدال اور اقلیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔" سر سید کی صحبت میں ہی انھوں نے جدید علم کلام کی ضرورت محسوس کی اور اسے تکمیل کو پہنچایا۔ ("الکلام" اور "علم الکلام") سر سید کی کتاب "خطبات احمدیہ" سے ہی شبلی کو "سیرۃ النبی" لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ سر سید کی صحبت میں ہی شبلی نے سیرت نگاری اور سوانح نگاری کا ہنر سیکھا۔ "المامون" (۱۸۸۷ء) "سیرۃ النعمان" (۱۸۹۲ء) اور سوانح مولانا روم (۱۸۹۴ء) لکھیں۔ سوانح نگاری سے متعلق شبلی کا یہی شعور اور شوق آگے چل کر "الفاروق" لکھنے میں معاون ثابت ہوا۔ ایم۔ اے۔ او کالج میں آرنلڈ سے علامہ شبلی نے جو فیض پایا اس کا تو انھوں نے برملا اعتراف کیا ہے۔ "آرنلڈ آں کہ رفیق است و ہم استاد مرا۔" لیکن سر سید سے جو کسب فیض کیا تھا اس کا اظہار باقی رہ گیا۔ فی الوقت میرا موضوع ان کی اکتسابات کی تفصیل نہیں ہے۔

سر سید کے رفقاء میں الطاف حسین حالی ہیں جنھوں نے سر سید کی فرمائش اور ہدایت پر "مسدس" لکھی (۱۸۷۹ء) جس کی بدولت نہ صرف یہ کہ اردو میں نظم نگاری کی روایت کو فروغ اور استحکام حاصل ہوا بلکہ ہندی ساہتیہ پر بھی مسدس نے اپنا نقش قائم کیا اور میتھلی شرن گپت نے مسدس کے جواب میں "بھارت بھارتی" لکھ ڈالی۔

سر سید نے ادب کو معاشرتی اصلاح کا ذریعہ اور زندگی کے مسائل کا ترجمان بنایا تھا، ادب میں افادیت اور مقصدیت پر زور دیا تھا اور اردو زبان و ادب کی اصلاح پر "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے کوشش کی تھی۔ حالی نے یہی کام "مقدمہ شعر و شاعری" لکھ کر انجام دیا۔ مقدمہ پر ملٹن اور کولرج کے اثرات کی نشاندہی میں تو ہمارے کئی محقق اور نقاد بہت دور تک نکل گئے لیکن اس پر سر سید کے اثرات کا ہمیں کبھی خیال ہی نہیں آیا۔

غالب کی شاعرانہ عظمت کا باقاعدہ اور واضح طور پر اعتراف سر سید نے ہی کیا تھا۔ غالب کا اردو دیوان بھی پہلی بار مطبع سید الاخبار سے ہی شائع ہوا تھا لیکن غالب کے سلسلے میں سر سید نے جو کام باقی چھوڑ دیا تھا اسے ان کے رفیق حالی نے مکمل کیا۔ اسی سلسلے کو ذرا اور آگے بڑھ کر دیکھیں تو دبستان سر سید کے فرزند عبد الرحمٰن بجنوری کا نام آتا ہے جنھوں نے "محاسن کلام غالب" لکھی۔ سر سید نے صرف حالی کے ذہن اور قلم پر ہی اثر نہیں ڈالا بلکہ وہ خود بھی ان کی تصنیف کا موضوع بن گئے۔ سوانح نگاری کے اصول و اسلوب میں آج بہت سی تبدیلیوں کے باوجود بھی "حیاتِ جاوید" اس فن میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، حالی کو سر سید سے جو عقیدت تھی اس کا اظہار ان کی تعزیتی تقریر سے بھی ہوتا ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ: "سر سید کیا گئے، ایک برگشتہ قوم کا سرمایہ، ایک نادار ملک کا گنج بے بہا اور میرا مرشد، رہبر اور دوست جاتا رہا۔ ہم نے اس سے قومی خدمت کا مفہوم سیکھا۔ دوسروں کے لیے اپنی زندگی کے عیش و آرام کو قربان کر دینے کا سبق پڑھا۔۔۔ اب یہ لیل و نہار دوسرا سید احمد پیدا نہ کر سکیں گے۔"

سر سید کے رفقا میں مولوی ذکاء اللہ تھے جو سر سید کے اثر سے تاریخ نویسی پر مائل ہوئے اور نام پیدا کیا۔ دوسری طرف محسن الملک، وقار الملک اور مولوی چراغ علی ہیں جنھوں نے سر سید کے تہذیب الاخلاق کے لیے مضامین لکھے اور ان کے تعلیمی مشن کو دور دور تک پھیلا دیا۔ یہ تمام رفقا سر سید کے تربیت یافتہ تھے۔

سرسید نے جس ایم اے او کالج کی آبیاری میں اپنا خونِ جگر صرف کیا تھا اس کی مخالفت کو بھی بڑے صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا۔ انھوں نے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں مگر آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر، مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم، اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے۔ آپ کے دولت سرا بنانے میں، جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لیے مسجد بناتے ہیں جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوہڑے، چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ پس آپ مجھ کو بھی اس مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی، چمار ہے۔ اپنے گھر کو مت ڈھائیے۔ کیا آپ مجھ بدبخت، نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی تمام قوم اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلٍ ڈبونا اور خراب و خستہ حال میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو، اس سے عبرت پکڑو اور برائے خدا اپنی قوم کی، اپنی اولاد کی بھلائی اور بہتری کی فکر کرو۔"

مخالفت کے اسی بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لیے سرسید نے رسالہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت ۲۰ دسمبر ۱۸۷۶ء کے بعد موقوف کردی تھی۔ سرسید کے جانشین نواب محسن الملک نے بھی سرسید کے اسی تدبر اور دوراندیشی سے سبق لیا تھا اور گورنر انٹونی میکڈانل کی اردو دشمنی کو صرف کالج کے مستقبل کی خاطر ہی انگیز کرلیا تھا۔

سرسید کے لٹریری اسسٹنٹ مولوی وحیدالدین سلیم تھے، جنھوں نے سرسید سے صحافت کے آداب سیکھے اور معارف (علیگڑھ)، مسلم گزٹ (لکھنؤ) اور زمیندار (لاہور) کی ادارت کے ذریعہ شہرت پائی۔ اردو میں اصطلاحات سازی کے

اصول مرتب کیے جس کی ضرورت سب سے پہلے سرسید نے ہی محسوس کی تھی۔ سرسید کے دامنِ تربیت سے فیض پانے والوں میں مولوی عبدالحق تھے جو تحقیق و تدوین، لغت و قواعد، تنقید و تبصرہ اور صحافت کے میدان میں سرسید کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بہت آگے بڑھ گئے اور بابائے اردو کہلائے۔

سرسید کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش اور ذہنوں کو متاثر کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود تھی اسی لیے ان کے رفقا کی ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جس نے ان کے مقاصد کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔ کہتے ہیں کہ اگر مقصد بڑا ہو تو اس راہ میں کام آنے والی چیزیں بھی باوقار بن جاتی ہیں۔ سرسید کے دل میں قومی فلاح و اصلاح کے بے حد و حساب عزائم اور مقاصد تھے۔ چنانچہ جنھوں نے ان کا ساتھ دیا وہ ملک و قوم میں سرخرو ہوئے، زندگی میں کامیاب رہے اور زمانے میں نام پیدا کیا۔

دوسری طرف وہ طبقہ بھی ہے جس کے بیشتر افراد کا نام سرسید سے مخالفت کی بدولت ہی زندہ رہ گیا ہے۔ سرسید سے اختلافات کی راہیں نکالنے والوں نے ملک و قوم اور زبان و ادب کی کیسی اور کتنی خدمات انجام دیں فی الحال ہمیں اس سے بحث نہیں ہے، لیکن ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

> انھوں نے تاریخ کے ایک نازک دور میں مسلمانوں کی ذہنی اور ملّی شیرازہ بندی کا کام ہی نہیں انجام دیا بلکہ انھوں نے مستقبل کی گزرگاہوں کو روشن کر دیا ہے۔"
>
> (خلیق احمد نظامی)

مولوی محمد حازق

نذرِ عقیدت بیادِ سرسیّد

جسمِ خاکی پر نہیں قائم بنائے زندگی — بلکہ روحِ پاک ہے وجہِ بقائے زندگی
نیک نامی کی بقاء دنیا میں ہے بعد فنا — موت کو ہرگز نہ سمجھو انتہائے زندگی
پیکرِ انساں سہی زندانِ مرقد میں مگر — ہے زمانے کی زباں پر ماجرائے زندگی
مرکے بھی بُجھتا نہیں روشن ضمیروں کا چراغ — خاک کے ذرّوں سے ہے پیدا ضیائے زندگی
گو بظاہر ٹوٹ کر آئے ہیں گلشن سے مگر — قبر کے پھولوں سے آتی ہے ہوائے زندگی
بادۂ جامِ قضا ہے قطرۂ آبِ بقا — جس کا ملتا ہے مزا بعدِ فنائے زندگی

سختیوں سے موت کی مردانِ حق ڈرتے نہیں
جو خدا کی راہ میں مرتے ہیں وہ مرتے نہیں

ہم سے سرسیّد کی باقی ہے کوئی عظمت اگر — ان کی قومی خدمتوں پر ڈالئے گہری نظر
آج جس بامِ ترقی پر ہماری قوم ہے — درحقیقت ہے اُنھیں کی کوششوں کا یہ ثمر
کھو چکے تھے جو حکومت بن چکے تھے جو غلام — ان سے کیا امید تھی ہوں گے وہ پھر بھی نامور
رحمتِ حق کی مگر چشمِ عنایت ہو گئی — امتِ مرحومۂ خیر الوریٰ کے حال پر
ہو الٰہی روحِ سرسید پہ رحمت کا نزول — اور یہ کھیتی رہے ان کی ہمیشہ بار ور
جس گئی گزری ہوئی حالت سے کچھ پہنچے ہیں ہم — پھر نہ اس قعرِ مذلت تک ہمارا ہو گزر

میرے شعروں پر نہ ہرگز جملۂ تحسیں کہیں
جتنی مانگی ہیں دعائیں ان پر آپ آمیں کہیں

پروفیسر عرفان حبیب

سرسید احمد خاں
اور
تاریخ نویسی

ہندوستان کی روایتی تاریخ نویسی میں جو بڑی تبدیلی انیسویں صدی میں شروع ہوئی، اس میں سید احمد خاں کی اپنی جگہ ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سید احمد خاں کے طرزِ تخیل پر اس جدید تہذیب کی تحریک کا جسے ہم آج کل "بنگال کے نئے جنم" Bengal Renaissance کے نام سے جانتے ہیں، بڑا گہرا اثر پڑا۔

سید احمد خاں کے خاندان کا قریبی تعلق دہلی کے بادشاہی دربار سے تھا جس کے مختلف عہدوں پر ان کے خاندان کے اراکین کئی پشتوں سے فائز رہے تھے۔ مغل دربار کے وفادار دوستوں میں جدید تہذیب کی تحریک کے سربراہ راجہ رام موہن رائے سب سے اگلی صف میں تھے۔ کلکتہ اور لندن میں ۱۸۲۹ء سے اپنی وفات ۱۸۳۳ء تک انھوں نے مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے حقوق، اختیارات اور پنشن کے سلسلے میں بغیر کسی انعام کی خواہش کے انتھک کوششیں کیں اور انگریزی سرکار کی مخالفت کے باوجود شاہی دربار سے "راجہ" کا خطاب لینے سے انکار نہیں کیا۔[۱] سید احمد خاں ۱۶ سال کے تھے جب ہندوستان کی اس عظیم ہستی کا انتقال ہو گیا۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ راجہ رام موہن رائے کے نام سے وہ اچھی طرح واقف ہوں گے اور اغلب یہ ہے کہ ان کے نظریات کے اثرات بھی

ان تک پہنچے ہوں۔ جب سید احمد خاں نے انگریزی سرکار میں ملازمت شروع کی تو ان کے تعلقات انگریز افسروں سے قائم ہوئے۔ حالانکہ سید احمد خاں نے انگریزی پر کبھی عبور حاصل نہ کیا لیکن پھر بھی چند انگریز افسروں کی سرپرستی میں انھوں نے تاریخ اور دوسرے علوم کو جدید نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ اپنی عربی اور فارسی تعلیم کا پورا فائدہ اٹھا کر انھوں نے ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں تحقیقات شروع کیں، جو اب بھی تاریخ دانی کے لیے نہایت اہم ہیں۔

سید احمد خاں تقریباً ۲۲ سال ہی کے تھے کہ فارسی میں ان کی تصنیف "جامِ جم" کے نام سے منظرِ عام پر آئی۔ ان کی اس پہلی تاریخی تصنیف ہی میں مغربی تاریخ نویسی کا اثر جھلکتا ہے۔ کیونکہ "جامِ جم" ایک روایتی تاریخی کتاب نہیں ہے، بلکہ ایک حوالہ کی کتاب Work of Reference ہے۔ جس میں تیمور کے وقت سے لے کر ہندوستان کے بادشاہوں کے شجرے، پیدائش، تخت نشینی اور وفات کی تاریخیں اور القاب وغیرہ دیے گئے ہیں۔ سید احمد خاں ۱۸۳۹ء میں آگرہ کمشنری میں نائب منشی کے عہدہ پر مقرر کیے گئے تھے اور تعجب کی بات نہیں کہ "جامِ جم" انھوں نے آگرہ کے کمشنر رابرٹ ہیملٹن کی فرمائش پر لکھی۔ اور یہ ۱۸۴۰ء میں آگرہ ہی سے شائع ہوئی۔ "جامِ جم" ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کے مشہور انگریز مورخ سر ہنری ایلیٹ کی نظر سے گزری اور جو تنقیدی رائے اس نے ۱۸۴۹ء میں اس نوجوان عالم کی پیش کش پر دی ہے، وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

"یہ مفید جدولات ۱۸۴۰ء میں آگرہ سے شائع ہوئے۔ ان کے خاتمہ پر کئی مستند کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن سے مصنف نے اپنی اطلاعات فراہم کیں۔ حالانکہ تھوڑا سا شک ضرور ہوتا ہے کہ مصنف نے ان سب کتابوں کو واقعی استعمال کیا ہو۔ کیونکہ جب میں نے مصنف سے ذاتی طور پر خط و کتابت کی تو ان سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان میں سے کئی کتابوں میں کیا لکھا ہے اور اب وہ کہاں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ بلکہ کچھ کتابوں میں جن کا انھوں نے حوالہ دیا ہے، متعلقہ زمانہ کے بارے میں کوئی اطلاع ہے ہی نہیں"۔[۲]

کمزوریاں ہر کتاب میں ہوتی ہیں اور "جامِ جم" سید احمد خاں کا پہلا ہی علمی

تجربہ تھا۔ خود ایلیٹ نے ان کی دوسری اہم کتاب "آثار الصنادید" کی تعریف کی ہے۔ "دارالخلافہ دہلی کی شان دار عمارات کا بڑا اچھا بیان ہے۔"[۳۰] سیّد احمد خاں منصف کے عہدہ پر مقرر ہو کر ۱۸۴۶ء میں اپنے وطن دہلی واپس پہنچے۔ یہاں ان کی ملاقات ایڈورڈ ٹامس Edward Thomas سے ہوئی۔ ایڈورڈ ٹامس کو سلاطین اور مغلیہ زمانہ کے بادشاہوں کے سکّوں سے بہت دلچسپی تھی اور اس نے دہلی سلاطین کے سکّوں پر اپنی پہلی کتاب ۱۸۴۷ء میں شائع کی۔ سیّد احمد خاں نے خود اس کی "مدد اور اعانت اور اعلیٰ ہمتی اور قدر دانی" کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے "آثار الصنادید" ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں تیار ہو سکی اور دہلی سے شائع ہوئی۔"[۳۱]

"آثار الصنادید" میں مغربی انداز کی آثار قدیمہ سے دلچسپی کارفرما ہے۔ موجودہ عہد سے پہلے فارسی کی تاریخ نویسی میں عمارات اور کتبات پر رسالے لکھنے کی کوئی روایت نہیں تھی۔ اگر اس بات میں شک ہو تو سٹوری اور دوسرے مستند مصنفوں کی فہرستیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ "آثار الصنادید" کا چوتھا باب (تذکرہ اہلِ دہلی) تو یقیناً تذکروں کی روایت پر لکھا گیا ہے اور پہلے باب کے جدول یا نقشہ (دہلی کے حکمرانوں کی فہرست) میں "جامِ جم" کی جھلک ہے، لیکن دوسرے اور تیسرے ابواب جدید ترین علوم آثار قدیمہ و کتبات Archoeology and Epigraphy کے اثرات سے لبریز معلوم ہوتے ہیں۔ عمارتوں کی تصویریں اسی انداز میں بنائی اور چھاپی گئی ہیں جیسے انگریز مصنف کیمرہ کے استعمال سے پہلے لکڑی Wood Cuts یا پتھر Lithography کے چھاپوں سے شائع کرتے تھے۔ اسی طرح سیّد احمد خاں نے دہلی کے جن کتبوں کی نقلیں دی ہیں ان میں ہندوستان کے قدیم ترین کتبات یعنی اشوک کے ستونی فرامین کو اصل براہمی رسم الخط میں دیا گیا ہے۔ مہرولی کے آہنی مینار کے کتبہ کو بھی اصل خط میں شائع کیا گیا ہے اور بلبن کے عہد کے پالم باؤلی کے سنسکرت کتبہ کا اصل متن ترجمہ کے ساتھ درج ہے۔ قطب مینار کے کتبوں کو ان کی اصلی شکل اور پھر خط نستعلیق دونوں میں دیا گیا ہے۔ اپنی نوعیت کی یہ اتنی اہم تصنیف تھی کہ نہ صرف سیّد احمد خاں کی زندگی میں اس کے تین ایڈیشن نکلے

(دوسرا ایڈیشن، دہلی ۵۳-۱۸۵۴ء اور تیسرا لکھنؤ ۱۸۷۶ء) بلکہ اسی کا ترجمہ فرانس کے مشہور مستشرق گارسن د تاسی نے ۶۱-۱۸۶۰ء میں فرانسیسی میں شائع کیا۔[۵] یہ ضرور ہے کہ مرزا سنگین بیگ، برطانوی ریزیڈینٹ چارلس میٹکاف کی سرپرستی میں دہلی کی عمارات اور کتبات پر ایک کتاب فارسی میں ۱۸۲۱ء میں (اضافات ۱۸۲۹ء) "سیر المنازل" کے نام سے لکھ چکے تھے۔ جس کے کئی مخطوطات ملتے ہیں۔ (سب سے پہلے مخطوطہ میں جو برلن میں ہے، تصاویر بھی ہیں)۔[۶] یہ کتاب سید احمد خاں کی نظر سے نہیں گزری اور ان کی تحقیقات اپنی ہیں۔ نیز ان کی کتاب میں عمارات پر کہیں زیادہ تفصیلات ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے بقول حالی یہ کتاب ڈیڑھ سال ہی میں مرتب کر دی جبکہ انھوں نے اکثر کتبات خود نقل کیے اور عمارات کی تصاویر اور نقشے بنانے میں بھی ان کو کافی وقت لگا ہوگا۔ قطب مینار کے باہر کے کتبوں کو وہ صرف "چھینکے" میں بیٹھ کر پڑھ سکے جو جوکھوں کا کام تھا۔[۷]

چھپائی کے آنے کی وجہ سے فنِ تاریخ میں ایک اور اضافہ یہ ہوا کہ پرانی کتابوں کو شائع کیا جانے لگا اور شائع کرنے کے لیے مستند متن تیار کرنے کی ضرورت ہوئی۔ یہ نہایت دلچسپ بات ہے کہ جس کتاب پر مصحح کی حیثیت سے سید احمد خاں کی پہلی نظر پڑی، وہ کوئی تصوف یا دینیات کا پرانا رسالہ نہ تھا، بلکہ شیخ ابوالفضل کی کتاب "آئینِ اکبری" تھی۔ اس کتاب کا مصنف وہ تھا جس کو اسلامی علما "ملحد" کہتے آئے تھے اور کتاب اس بادشاہ کے نظامِ مملکت کے متعلق تھی جس نے سلطنتِ مغلیہ کو مذہبی تفریق سے بالاتر رکھنے کی پالیسی اپنائی تھی۔ علاوہ ازیں نہ صرف ابوالفضل کا طرزِ تحریر مشکل تھا بلکہ اس کی کتاب میں بے انتہا اعداد و شمار Statistics کے جدول یا نقشے ہیں، جو معاشی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہندوستان کے پرانے تہذیب و تمدن کا بھی اس میں ایک مفصل بیان ہے، جو معمولی فارسی داں کے لیے آسان فہم نہیں۔ سید احمد خاں نے کئی مخطوطات کو سامنے رکھ کر "آئینِ اکبری" کی تین جلدوں میں سے دو جلدوں (اول اور سوم) کو ۱۸۵۵ء میں مع تصویروں کے (جن میں سے اکثر انھوں نے خود بنوائیں) شائع کیا۔ اگرچہ یہ ایڈیشن اس لیے اتنا مستند نہیں

ہوسکا جتنا بلوکمین Blochmann کا (۱۸۶۶-۷۷ء) یا نولکشور، لکھنؤ کا (۱۸۹۲ء) تو
اس کی وجہ یہ ہے کہ سید احمد خاں کو اتنے اچھے نسخے نہ مل سکے جو بعد کے ایڈیشنوں کے
مصحّحوں کو مل سکے۔ وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ کچھ اعداد و شمار گلیڈون کے ترجمے
سے نقل کریں اور دوسری جلد جس میں ہندوستان کے صوبوں کا بیان تھا اور
مالگذاری کے اہم اعداد و شمار تھے وہ تیار ہی نہ کر سکے۔ حالی کا کہنا ہے کہ انھوں
نے دوسری جلد بھی تیار کر لی تھی لیکن ان کا نسخہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ضائع
ہوگیا۔[۵]

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے خاتمہ کے فوراً بعد سید احمد خاں نے اپنی علمی کارروائیاں
پھر شروع کر دیں۔ سید احمد خاں کے "آئینِ اکبری" کے ایڈیشن سے ان کی تاریخی اور
علمی قابلیت کی شہرت کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی تک پہنچ گئی اور سوسائٹی کی
دعوت پر انھوں نے چودھویں صدی کے ہندوستان کے مشہور مورخ ضیاء برنی کی
"تاریخ فیروز شاہی" کا ایڈیشن تیار کیا جس کے پہلے صفحہ (مطبوعہ ۱۸۶۲ء) پر درج
ہے کہ یہ ایڈیشن بہ تصحیح مولوی سید احمد خاں صاحب باہتمام کپتان ولیم ناسولیس
و مولوی کبیر الدین احمد" شائع ہوا۔ یہ کہنا مبالغہ سے کام لینا ہوگا کہ سید احمد خاں
نے ضیاء برنی کی تصنیف کا صحیح معنوں میں ایک تنقیدی Critical ایڈیشن
تیار کیا۔ ان کے پاس صرف چار مخطوطے تھے اس لیے وہ پتہ نہ لگا سکے کہ برنی کی
تاریخ کا ایک پہلے کا متن بھی موجود ہے۔ جس کے کچھ حصّوں کو برنی نے سہواً یا
جان کر اپنے دوسرے متن میں شامل نہیں کیا۔ کئی غلطیاں بھی ناقص مخطوطات کی
وجہ سے ان کے اپنے متن میں آگئیں، پھر سید احمد خاں نے اکثر مخطوطوں کے
اختلافات کو بھی نوٹ نہیں کیا۔ ان سب کمزوریوں کے باوجود سید احمد خاں
کا ایڈیشن اب بھی برنی کی تاریخ کا واحد کامل ایڈیشن ہے اور دہلی سلطنت
کی تاریخ کے لیے سب سے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ابھی ضیاء برنی کی تاریخ کے ایڈیشن کا کام ختم نہیں ہوا تھا کہ سید احمد
خاں نے ایک نئی تاریخی کتاب کو شائع کرنے کا کام اپنے ذمے لیا۔
ایلیٹ نے ۱۸۴۹ء میں اپنے پڑھنے والوں کو اطلاع دی تھی کہ سید احمد خاں کے

بڑے بھائی سید محمد خاں نے "تزک جہانگیری" کا ایک "بہت اچھا متن" تیار کیا ہے جو یقیناً شائع کرنے کی غرض سے ہوگا۔ کیونکہ مصحح نے اس کے لیے ایک مقدمہ بھی تیار کیا تھا جس میں اپنے آبا و اجداد کے بارے میں اطلاعات درج کی تھیں ہو سکتا ہے کہ یہ نسخہ اصل میں سید احمد خاں ہی کا تیار کیا ہوا ہو۔ کیونکہ آکسفورڈ کی باڈلین لائبریری میں (نمبر ۲۲۱) تزک جہانگیری کا ایک مخطوطہ ہے جو ۱۸۴۶ء میں سید احمد خاں نے دس نسخوں کی مدد سے کیا ہو سکتا ہے کہ اب جو متن تزک جہانگیری کا ۱۸۶۳-۶۴ء میں انھوں نے غازی پور (آخری حصہ علیگڑھ) میں چھپوا کر شائع کیا وہ اسی تیار شدہ نسخہ یا اس کی نقل سے لکھوایا گیا ہو۔ باڈلین کے نسخہ کی طرح مطبوعہ تزک میں بھی محمد ہادی کا مقدمہ اور خاتمہ شامل ہیں۔ سید احمد خاں کا یہ ایڈیشن ان کی عالمانہ غیر جانبداری اور تاریخ سے وفاداری کا شاہد ہے۔ جہانگیر مذہبی تعصب کے اظہار سے خوش نہ ہوتا تھا اور اس لیے اس نے شیخ احمد سرہندی کے بارے میں تنقید و تنبیہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن سید احمد خاں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ان الفاظ پر تبصرہ کریں بجائے کہ حذف کر دیں۔

ایک مصحح کی حیثیت سے سید احمد خاں کا انتخاب، یعنی ضیاء برنی، ابوالفضل اور جہانگیر کی تصنیفات معنی خیز ہیں۔ ان کی گہری دلچسپی ہندوستان کی تاریخ سے تھی اور انھوں نے ان تین کتابوں کا انتخاب کیا جو ہندوستان کی تاریخ کے اہم ماخذوں کی کسی فہرست میں بھی لازمی طور سے شامل ہوں گی۔ ۱۸۶۳-۶۴ء میں "تزک جہانگیری" کی طباعت سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سید احمد خاں نے مغل بادشاہوں کے لیے جو سخت الفاظ "اسباب بغاوت ہند" میں ۱۸۵۷-۵۸ء کے غدر کے فوراً بعد استعمال کیے وہ سرکار انگلشیہ کی خوشنودی کے لیے زیادہ تھے اور ان کے دل کی آواز کم۔ آخر کچھ ہی سال پہلے تو وہ اپنے آبا و اجداد کی سلطنت مغلیہ کے لیے خدمات کو بڑے فخر سے بیان کرتے تھے۔

لیکن یہ امر واقع ہے کہ ایک مورخ کی حیثیت سے سید احمد خاں پچھلی حکومتوں ان کی شاندار عمارتوں اور انتظامی کارناموں کے محض مداح ہی نہ تھے۔ ان میں تنقید کا جذبہ تھا اور ۱۰ مئی ۱۸۶۶ء کو علیگڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی کے سامنے

انھوں نے جن احساسات کا اظہار کیا ان سے کون سنجیدہ مورخ اختلاف کر سکتا ہے؟ انھوں نے کہا:

"اگر ہمارے ہم وطن اطمینان سے غور کریں اور اگر وہ سابق حکمرانوں کے اعمال کو انصاف اور اخلاق کی کسوٹی پر پرکھیں وہ اس نتیجہ پر یقیناً پہنچیں گے کہ ان حکومتوں نے ہمارے ملک کو بے حد نقصانات صرف اس لیے پہنچائے کہ ایک تھوڑی سی تعداد کے افراد کو فائدہ ہو۔ پچھلے بادشاہوں اور راجاؤں کی حکومت نہ تو ہندو مذہب کے مطابق تھی نہ اسلامی مذہب کے، وہ صرف ظلم و تشدد پر مبنی تھی۔ اس کے لیے طاقت حق کی دلیل تھی۔ اس کے نزدیک عوام کی آواز کی کوئی شنوائی نہ تھی۔ طاقتور اور زور آور لوگ کمزور اور غریب لوگوں پر ظلم کرتے تھے اور اپنے ذاتی اغراض کو حاصل کرنے کے لیے کل اختیارات پر قابض ہو بیٹھے تھے۔ صرف غاصب اور مفسد لوگ ہی یہ خواب دیکھ سکتے تھے کہ ایسا تحکمانہ نظام جس کے تحت ہندوستان اتنی لمبی صدیاں گزار چکا ہے، پھر سے واپس آجائے۔"[۹]

حوالے

(۱) راجہ رام موہن رائے اور مغل دربار کے مابین تعلقات کے لیے دیکھئے پرسول سپیئر (Percival Spear) "مغلوں کا آخری لمحہ" Twilight of the Mughals کیمبرج ۱۹۵۱ء صفحات ۴، ۴۶، ۴۹، ۵۳، ۵۴، ۱۱۳، ۲۲۶۔ (۲) ایلیٹ اور ڈاؤسن Elliot and Dowson ہندوستان کی تاریخ اس کی مورخوں کی زبانی (History of India as told by its own Historians) جلد ہشتم، صفحات ۴۳۰، ۴۳۱ (۳) ایضاً ۴۳۱ (۴) "آثار الصنادید" مکمل ایڈیشن، دہلی، ۱۹۶۵ء صفحہ ۲۰ (۵) "آثار الصنادید" کا انگریزی ترجمہ آر۔ ناتھ سی دہلی سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ (۶) فارسی ایڈیشن مع اردو ترجمہ مع مترجم شریف حسین قاسمی نئی دہلی ۱۹۹۲ء اردو ترجمہ ار ڈاکٹر نعیم احمد، علیگڑھ ۱۹۸۰ء (۷) الطاف حسین حالی "حیات جاوید" لاہور ۱۹۵۷ء صفحہ ۱۱۵ (۸) "آئین اکبری" کی تصحیح پر دیکھئے حالی "حیات جاوید" صفحات ۱۲۲۔۱۲۷، ۱۸۵۷-۵۸ء میں سید احمد خاں کی "تاریخ ضلع بجنور" بھی بالکل تلف ہو گئی۔

(۹) شانِ محمد، سر سید احمد خاں کی تحریرات اور تقاریر Writings and speeches of Sir Syed Ahmad Khan بمبئی ۱۹۷۲ء، صفحات ۱۱۶-۱۱۷

(بہ شکریہ، تہذیب الاخلاق، علیگڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء)

خلیق انجم

سرسیّد ـــــ بحیثیت مورّخ

ہندوستان میں انیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ سیاسی اعتبار سے بہت ہی پرآشوب تھا۔ حساس، ذہین، معاملہ فہم اور دور اندیش ہندوستانیوں کے لئے یہ شدید ترین ذہنی کرب کا زمانہ تھا۔ مغلوں کی عظمت و شوکت اور جاہ و جلال قصۂ پارینہ بن کر تاریخ کا حصّہ بن چکے تھے۔ اس حکومت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہونے اور اس خاندان کا نام و نشان مٹنے میں صرف چالیس برس کا عرصہ باقی تھا۔ سید احمد خاں نے جب ہوش سنبھالا تو مغل حکومت ہندوستان سے سمٹ کر دلی بلکہ لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اور لال قلعے کے سیاسی معاملات، انتظامی امور اور مالیات پر کمپنی بہادر کا بالواسطہ کنٹرول تھا۔ اکبر شاہ ثانی برائے نام بادشاہ تھے۔ ان کے والد شاہ عالم ثانی کے عہد میں (۱۸۰۳ء میں) لارڈ لیک نے دلی پر قبضہ کر لیا تھا لیکن بعض مصلحتوں کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغل بادشاہت برقرار رکھی۔ شاہ عالم ثانی کی ذاتِ خاص اور ان کے خاندان کے اخراجات کے لئے نوے ہزار روپے ماہانہ مقرر کر دیئے۔ دس ہزار روپے تہواروں کے لئے دیئے جاتے اکبر شاہ ثانی کی پنشن میں دس ہزار روپے ماہوار کا اضافہ کر کے ایک لاکھ روپے ماہانہ کر دیا گیا۔ اکبر شاہ کے جانشین بہادر شاہ ظفر کو بھی ایک لاکھ روپے ماہانہ پنشن ملتی رہی۔

سہ ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

بہادر شاہ ظفرؔ بہت ذہین اور حساس انسان تھے۔ ان کے پہلو میں ایک شاعر کا دل تھا۔ مغل حکومت کی بربادی اور تباہی نے انہیں جس ذہنی کرب میں مبتلا کر رکھا تھا اس کا اظہار ان کی شاعری میں عام طور پر ہوا ہے لیکن اس غزل میں جس کا مطلع ہے :

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا ‌ ‌ یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

ظفرؔ نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔

اس عہد کا طبقۂ اشرافیہ جانتا تھا کہ لال قلعے پر برطانوی جھنڈا لہرانے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ غالبؔ اپنے شاگرد قاضی عبدالجلیل جنونؔ کو ۱۸۵۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعے میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعِ طرح کو کیا کیجئے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھئے گا۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب کے ہی نہ ہو۔ اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔"

بہادر شاہ ظفرؔ ہندوستان کے بادشاہ نہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنشن خوار تھے۔ اپنی بربادیوں اور تباہیوں کے اس حد تک خاموش، بے بس اور لاچار تماشائی تھے کہ خود تماشا بنے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی بے بسی کا پورا پورا احساس تھا۔

۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو جب میرٹھ سے انقلابی سپاہی دلی پہنچے اور انھوں نے ظفرؔ سے انقلاب کی درخواست کی تو انہوں نے جواب میں جو کچھ کہا وہ انتہائی عبرتناک ہے۔ ظفرؔ نے کہا :

"سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے، میں تو فقیر ہوں۔ ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں۔ یہ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضے میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو برسوں پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے جد و آبا کے نوکر چاکر اپنے خداوندانِ نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضے سے ملک نکل گیا۔ قوت لایموت کو محتاج ہو گئے۔ میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں۔ مجھے ستانے کیوں آئے ہو۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمہیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھ سے کسی طرح توقع استطاعت کی نہ رکھو۔"

یہ تھے حالات جن میں سرسیدؔ نے ہوش سنبھالا۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سرسید کا مغل حکومت سے قریبی تعلق تھا۔ ان کے بزرگوں میں سید محمد دوست کو
دکن کا مورچہ ختم کرنے پر اورنگ زیب نے یکہ بہادر کے خطاب سے نوازا تھا۔ سید صاحب کے
دادا سید ہادی کو عزیزالدین عالمگیر ثانی نے ۱۱۶۸ھ (۵۵ - ۱۷۵۴ء) میں "جوادعلی خاں"
اور ان کے بھائی سید مہدی کو "تبادعلی خاں" کے خطابات دیئے اور دونوں کو منصب ہزاری
ذات و پانصد سوار دواسپہ وسہ اسپہ سے نوازا۔ شاہ عالم تخت نشین ہوئے تو انہوں نے سید
ہادی کے خطاب میں "جوادالدولہ" کا اضافہ کر کے انہیں عہدۂ احتساب وکروری صوبۂ شاہجہاں
آباد پر فائز کر دیا کچھ عرصے بعد قضائے لشکر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سرسید کے دادا
کے بعد جب شاہ عالم ثانی نے یہ خطابات سید صاحب کے والد میر متقی کو پیش کئے تو
انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میر متقی کے اکبر شاہ ثانی سے بہت گہرے مراسم تھے۔
جب شاہ عالم ثانی کی وفات کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے تو میر متقی کا مغل دربار
میں بہت اثر ورسوخ ہوگیا۔

سرسید کے نانا دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد بہادر مصلح جنگ بہت
بڑے عالم تھے۔ ریاضی دانی اور موسیقی پر انہیں غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ علم ہیت اور
آلات رصد کے موضوعات پر انہوں نے متعدد رسالے لکھے تھے۔ خواجہ فریدالدین ایسٹ انڈیا
کمپنی کی ملازمت میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ وہ سفیر بنا کر ایران بھی بھیجے گئے تھے۔
اکبر شاہ ثانی نے انھیں دوبارہ اپنا سفیر مقرر کیا اور دبیرالدولہ امین الملک، مصلح جنگ کے
خطابات سے نوازا۔

سرسید کے والد کا بھی مغل حکومت سے قریبی تعلق تھا۔ بقول حالی؛

" سرسید کے والد کو اکبر شاہ کے زمانے میں ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر
پانچ پارچہ اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا۔ مگر آخر میں انھوں
نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سرسید کو باوجودیکہ ان کی عمر
کم تھی، دلوانا شروع کر دیا تھا؛"

سرسید کے والد کو قلعے کے کئی شعبوں سے تنخواہ ملتی تھی۔ یہ تنخواہیں قلعوں کی سازشوں
کا شکار ہو کر بہت قلیل رہ گئیں۔ والد کے انتقال کے بعد تنخواہوں کا بہت کم حصہ تو سرسید
کی والدہ کے نام جاری رہا۔ باقی سب بند ہوگئیں۔ یہ ۱۸۴۸ء کی بات ہے اس وقت

۱۔ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سرسید کی عمر تقریباً بائیس سال تھی۔ نوجوان سرسید نوکری کی تلاش میں نکلے اور چند مہینوں کی کوششوں سے انھیں دلی کی کچہری میں صدر امین کی عدالت میں سررشتہ دار کی نوکری مل گئی۔ تیرہ سال کی مدت میں محنت کرکے اور مختلف امتحان دے کر سرسید منصف امین اور پھر صدر امین کے عہدے پر فائز ہوئے۔

میں نے سرسید اور ان کے خاندان کے مختلف حالات صرف یہ ثابت کرنے کے لئے بیان کئے ہیں کہ سرسید اور ان کے خاندان کے مغل حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں سے گہرے مراسم تھے۔

سرسید بنیادی طور پر مصنف تھے۔ انھیں لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی تاریخ اور خاص طور سے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ سے انگریزوں کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ انگریز ہندوستانیوں پر حکمرانی کرنے کے لئے ان کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش کا ذریعہ ہندوستان کے ماضی کا مطالعہ بھی تھا۔

سرزمینِ دلی پر بہت سے ایسے آثار قدیمہ تھے جو ہندوستان کا قابلِ فخر سرمایہ تھے۔ انگریز ان موضوعات پر کام کر رہے تھے۔ چونکہ ہندوستان کی تاریخ اور یہاں کے آثار قدیمہ پر کام کرنے کے لئے فارسی کا جاننا ضروری تھا۔ اس لیے وہ ہندوستانی منشیوں کو ملازم رکھ کر فارسی تاریخوں سے استفادہ کرتے۔ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ انگریز افسروں نے ہندوستانی علماء کو ترغیب دے کر اس طرح کی کتابیں لکھوائیں۔

سرسید کی پہلی کتاب "جامِ جم" ہے۔ اس کتاب میں امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے بادشاہوں کے مختصر ترین حالات جدولوں کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ سرسید نے آٹھ کتابیں تاریخ کے موضوع پر لکھیں یا مرتب کی ہیں اور ایک کتاب دلی کے آثار قدیمہ پر ہے۔ عتیق صدیقی مرحوم نے سرسید کی تاریخ نویسی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"زندگی کے اس ابتدائی دور میں سرسید مذہبی، سماجی اور علمی معاملات میں قدامت پسند رہے۔ ان کی تصانیف کی مندرجہ بالا فہرست (عتیق صاحب نے اس فہرست میں سید احمد کی "جامِ جم" (سن تصنیف ۱۸۴۰ء) سے لے کر تصحیح آئینِ اکبری (۱۸۵۵ء) تک کی گیارہ تصنیفات شامل کی ہیں) ان کی ذہنی قدامت پرستی کا دلچسپ اشاریہ فراہم کرتی ہے۔ مذہبی نوعیت کی تصانیف سے قطع نظر "آثار الصنادید" اور "آئینِ اکبری" جیسی قابلِ قدر تاریخی

کتابیں بھی حال سے فرار اور ماضی کے دامن میں پناہ لینے کی غیر شعوری کوشش کے علاوہ ان کی فکری قدامت پرستی کی بھی نشاندہی کرتی ہیں۔"

مجھے عتیق صاحب کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ ماضی سے ہمارا رشتہ مثبت بھی ہوتا ہے اور منفی بھی۔ اپنے روشن ماضی کو یاد کرنا، ماضی کے چراغوں سے حال کے چراغ روشن کرنا اور مستقبل کے لئے راستہ تلاش کرنا ہرگز قدامت پسندی یا ماضی پرستی نہیں ہے اور اگر ایسا ہے تو علامہ اقبال کو کس خانے میں رکھیں گے مسلمانوں کی عظمتِ پارینہ کے سب سے زیادہ گیت انھوں نے ہی گائے ہیں۔ اگر سرسید اور اقبال ماضی پرست ہوکر بے عملی، مایوسی اور احساسِ ناکامی کا شکار ہوجاتے تو یقیناً" قدامت پسند اور ماضی پرست کہلاتے اور ماضی سے ان کا رشتہ منفی کہلاتا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان دونوں نے ماضی سے روشنی لے کر مستقبل کی راہوں کی نشاندہی کی ہے۔

سرسید نے اپنے ایک لیکچر میں کہا تھا کہ:

"جب میں اپنے ہم وطنوں کے حال پر غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گزشتہ حالات سے اس قدر ناواقف ہیں کہ آئندہ رستہ چلنے کو ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہے اور اس سبب سے وہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کل کیا ہوگا۔"

اس بیان میں واضح طور پر سرسید نے بتایا ہے کہ وہ ماضی کی تاریکیوں سے مستقبل کے لئے روشنی حاصل کرنے کے قائل تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود عتیق صدیقی مرحوم نے سرسید کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ قول اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ:

"حال کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مستقبل (کذا) قریب کا جائزہ لیا جائے۔"

یہاں سرسید کا جو بیان اور اس پر عتیق صدیقی کا تبصرہ نقل کیا گیا ہے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ عتیق صاحب نے سرسید پر قدامت پرستی کا جو الزام لگایا ہے وہ نئی بات کہنے کا شوق ہے ان کا عقیدہ نہیں یہاں ایک بات اور عرض کردوں۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب تک سرسید بھٹک رہے تھے اور ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے ذہن میں مستقبل کا راستہ بالکل صاف

ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اور روشن ہوگیا تھا۔ جس کے واضح نقوش ان کی کتاب "اسبابِ بغاوت ہند" میں نظر آتے ہیں جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ تاریخ سے ان کا ذہنی رشتہ مثبت تھا، منفی نہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے تاریخ کے موضوع پر آٹھ کتابوں میں سے چار کتابیں ۱۸۵۷ء سے قبل اس وقت لکھی تھیں جب وہ راستہ ڈھونڈ رہے تھے اور باقی چار اس وقت وجود میں آئی تھیں جب وہ اپنے لئے راستے کا تعین کر چکے تھے۔

فنِ آثارِ قدیمہ اس عہد میں ہندوستان کے لئے جدید ترین فن تھا۔ اس لئے "آثار الصنادید" کو قدامت پرستی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

غالب کی وجہ سے سرسید کی مرتبہ "آئین اکبری" کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کو بنیاد بناکر بیشتر مصنفین نے سرسید کو قدامت پرست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس سلسلے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

۱۸۵۵ء میں سرسید نے ابوالفضل کی "آئین اکبری" مرتب کی۔ غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی۔ سرسید کی مرتبہ آئین اکبری کو غیر معمولی شہرت غالب کی اس تقریظ کے قضیے کی وجہ سے ہوئی۔ اس تقریظ کی بنیاد پر ہمارے نقادوں نے غالب کو ترقی پسند اور سرسید کو قدامت پسند اور ماضی پرست ثابت کیا ہے۔ اڑتیس اشعار پر مشتمل اس تقریظ میں میں غالب نے انگریزوں کی مادی فتوحات کی طرف سرسید کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا ہے:

صاحبانِ انگلستاں را نگر — شیوہ و انداز ایناں را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت — سعی بر پیشینان پیشی گرفت
حق ایں قوم است آئیں داشتن — کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند — ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

مزید اشعار میں غالب نے مغرب کی مختلف سائنسی ایجادوں کا ذکر کیا ہے۔ سرسید نے یہ تقریظ "آئین اکبری" میں شامل نہیں کی۔ ناقدینِ سرسید کا خیال ہے کہ ان کو غالب کے ترقی پسندانہ خیال پسند نہیں آئے۔ اس لئے انھوں نے تقریظ شامل نہیں کی میرا خیال ہے کہ اس تقریظ کو شامل نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ "آئین اکبری" کا تنقیدی ایڈیشن

تیار کرنے میں سرسید نے بہت جان کھپائی تھی۔ انھوں نے متنی تنقید کے اس طریقہ کار کو برتا تھا جو متنوں کے تنقیدی ایڈیشن تیار کرنے کے لئے مغرب میں رائج تھا اور جس سے ہندوستانی بالکل ناآشنا تھے۔ ہندوستان میں یہ پہلا تنقیدی ایڈیشن تھا جسے متعدد نسخوں کی مدد سے مرتب کیا گیا تھا اور جس کے حواشی اور تعلیقات خاصے سائنٹفک انداز میں لکھے گئے تھے۔ سرسید اپنے اس کام اور محنت کی داد چاہتے تھے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ سرسید نے غالب سے فرمائش کرتے ہوئے اپنے طریقہ کار اور محنت کا ذکر نہ کیا ہو۔ ان کی یہ توقع بے جا نہیں تھی کہ غالب تقریظ میں ان چیزوں کا ذکر کریں گے۔ غالب متنی تنقید کے فن سے ناواقف تھے۔ انھیں دیدہ ریزی اور جانفشانی سے کئے گئے اس کام کی اہمیت کا اندازہ بھی نہیں تھا! انھوں نے سرسید کی کاوش کی داد بس اس ایک شعر میں دی ؎

مژدہ یاراں را کہ ایں دیرین کتاب
یافت از اقبال سید فتح باب

اس کے بعد یہ اشعار کہے:

وینکہ در تصحیح آئیں رائے اوست ــــ ننگ و عار ہمت والائے اوست
دل بشغلے بست و خود را شاد کرد ــــ خود مبارک بندۂ آزاد کرد

کیا ایسی تقریظ کو سرسید اپنی کتاب میں شامل کر سکتے تھے۔ سرسید کی بات چھوڑیئے آج بھی پیش لفظ صرف اپنی تعریف کے لئے لکھوائے جاتے ہیں۔ اگر تین چار صفحات کے پیش لفظ میں ایک دو فقرے تنقیدی آجائیں تو وہ فقرے نکال دیئے جاتے ہیں پھر پیش لفظ نہیں چھاپا جاتا۔

مجھے یقین ہے کہ تقریظ شامل نہ کرنے کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی کہ اس میں انگریزوں اور ان کی مادی فتوحات کا ذکر تھا۔ سرسید کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کرتے ہوئے اٹھارہ سال ہو چکے تھے اور اس دوران میں وہ بے شمار انگریز افسروں اور دوستوں کے قریب رہ چکے تھے۔ وہ بھی مغرب کے صنعتی انقلاب اور سائنسی ترقی سے بخوبی واقف تھے اور اس کا پورا امکان ہے کہ اس معاملے میں ان کی واقفیت غالب سے زیادہ ہو۔ وجہ صرف یہ تھی کہ غالب نے سرسید کی محنت کی داد دینے کے بجائے مغربی تہذیب اور ان کی سائنسی ایجادوں کی تعریف کی تھی۔ اس لئے سرسید نے تقریظ شامل نہیں کی۔

ــــ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

تاریخ کے موضوع پر سرسید کی کتاب "جام جم" تیس صفحات پر مشتمل فارسی میں ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۴۰ء میں چھاپہ سنگ لیتھوگرافک اکبرآباد سے شائع ہوا۔ سرسید نے اس رسالے میں امیر تیمور صاحب قراں سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تینتالیس مغل بادشاہوں کے حالات جدول کی صورت میں پیش کئے ہیں۔ ہر جدول کے سولہ خانے ہیں ان خانوں کے عنوان ہیں: نام، نام پدر، نام مادر، قوم، سالِ ولادت، محلِ جلوس، عمر بوقتِ جلوس، سالِ جلوس، تاریخ جلوس، مدتِ سلطنت، سکہ، مدتِ عمر، سالِ وفات، تاریخ وفات، لقب بعد وفات، مدفن، کیفیت۔ کتاب میں ان اکیس فارسی تاریخوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ جن کی مدد سے یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔ آخر میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کا کہا ہوا چار مصرعوں کا قطعۂ تاریخ دیا گیا ہے جس کا چوتھا مصرعہ ہے

آئینۂ سکندر جام جم ست بنگر

"جام جم" اب تک کی دریافت شدہ سرسید کی پہلی تصنیف ہے اور اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اگرچہ انہوں نے بے شمار موضوعات پر کتابیں اور مضامین لکھے لیکن انھیں بنیادی طور پر تاریخ میں دلچسپی تھی۔

"جام جم" کا غالباً ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آزاد لائبریری میں موجود ہے۔ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی نے "مقالاتِ سرسید" کے حصہ شانزدہم (مطبوعہ مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء) میں یہ رسالہ شامل کر لیا ہے۔

سلسلۃ الملوک سرسید نے "آثار الصنادید" کے دوسرے ایڈیشن کے لئے دلی کے ان راجاؤں اور بادشاہوں کی فہرست مرتب کی تھی جنھوں نے گزشتہ پانچ ہزار سال میں دلی پر حکومت کی تھی۔ فہرست کا پہلا نام راجا جدشٹر اور آخری نام ملکہ وکٹوریہ ہے۔ دو سو دو فرمانرواؤں کے نام اس فہرست میں شامل ہیں۔

اکہتر صفحوں پر مشتمل یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں دلی کے شرف المطابع سے شائع ہوئی۔ مولانا اسماعیل پانی پتی نے رسالہ مقالاتِ سرسید (حصہ ششم، مطبوعہ مجلسِ ترقی ادب ۱۹۶۲ء) میں شامل کر لیا ہے۔ حالی نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ "اصل میں یہ وہی فہرست ہے جو "آثار الصنادید" کے دوسرے ایڈیشن میں پہلے باب کے ساتھ اضافہ کی گئی ہے۔ اس کو کسی قدر اصلاح کے بعد علٰحدہ چھاپ کر اس کا نام "سلسلۃ الملوک" رکھ دیا ہے۔ حالی کو یقیناً غلط فہمی ہوئی۔ "سلسلۃ الملوک" پہلے کتابی صورت میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں اس میں ترمیم

کر کے "آثار الصنادید" کے ۱۸۵۴ء کے ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا۔

آئینِ اکبری

انیسویں صدی میں مغربی ممالک میں متنی تنقید کا فن بہت ترقی کر چکا تھا۔ بہت سے قدیم متونوں اور خاص طور سے بائیبل کے تنقیدی ایڈیشن تیار ہو چکے تھے۔ مشرقی زبانوں میں غالباً سرسید پہلے متنی نقاد ہیں جنھوں نے انتہائی سائنٹفک انداز میں تین فارسی کتابوں کے تنقیدی ایڈیشن تیار کئے۔ یہ کتابیں ہیں "آئینِ اکبری"، "تاریخ فیروز شاہی" اور "تزکِ جہانگیری"۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ تینوں کتابیں تاریخی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید کو ہندوستان کی تاریخ سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔

یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ سرسید کے زمانے تک "آئینِ اکبری" کے مخطوطے تو ملتے تھے لیکن مطبوعہ ایڈیشن کوئی نہیں تھا۔ جب سرسید دلّی میں منصف تھے تو دلّی کے ایک کتب فروش حاجی قطب الدین نے ان سے فرمائش کی کہ طباعت کے لئے ابوالفضل کی "آئینِ اکبری" کا تنقیدی ایڈیشن تیار کر دیں۔ حاجی نے سولہ سو روپئے اس کام کا معاوضہ دینے کا وعدہ کیا۔ چونکہ سیّد صاحب دلّی میں منصف تھے اس لئے انھوں نے کسی تاجر سے اس طرح کا معاہدہ مناسب نہیں سمجھا۔ جنوری ۱۸۵۵ء میں جب ان کا تبادلہ بجنور ہو گیا تو انھوں نے یہ کام شروع کر دیا۔ انھوں نے متعدد نسخوں کی مدد سے "آئینِ اکبری" کا تنقیدی ایڈیشن تیار کیا۔ بہت سے مصوروں سے تصویریں کھنچوا کر شامل کیں۔ یہ تصویریں سکوں پھل دار اور پھول دار درختوں، ہتھیاروں، زیوروں، آئینِ شکوہ سلطنت کے متعلق ساز و سامان وغیرہ کی ہیں۔

"آئینِ اکبری" میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے ایسے الفاظ استعمال ہوئے تھے جن کا مطلب عام آدمی کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آ سکتا تھا۔ سیّد صاحب نے ان الفاظ کی تشریح کی۔ ابوالفضل نے اپنے زمانے کے اوزان اور سکّوں کے حوالے سے بات کی تھی۔ سرسید نے ان اوزان اور سکّوں کی اپنے زمانے کے سکّوں اور اوزان سے مطابقت کی تاکہ آسانی سے بات سمجھ میں آ سکے۔ ابوالفضل نے بعض جدولوں کے خانے خالی چھوڑ دیئے تھے۔ غالباً متعلقہ معلومات فراہم نہیں ہو سکی تھیں۔ سیّد صاحب نے خود تحقیق کر کے ان خانوں کو پُر کیا۔ غرض یہ ہے کہ آئینِ اکبری کا ایسا تنقیدی ایڈیشن تیار کیا جو آج بھی ہمارے

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

لیے قابلِ تقلید ہے۔

"آئینِ اکبری" کے آخر میں مولانا امام بخش صہبائی کی لکھی ہوئی تقریظ شامل ہے۔ سیّد صاحب نے غالب سے تقریظ لکھوائی تھی۔ غالب نے مثنوی کی صورت میں اڑتیس اشعار پر مشتمل تقریظ لکھی تھی۔ چونکہ اس تقریظ میں غالب نے اس طرح کے کاموں کو غیر مفید اور بے وقت کی راگنی بتایا۔

اس لیے سیّد احمد صاحب نے اسے "آئینِ اکبری" میں شامل نہیں کیا۔ کلیاتِ غالب میں یہ تقریظ شامل ہے۔

آئینِ اکبری کی دو جلدیں پہلی اور تیسری چھپنے کے لیے پریس بھیج دی گئیں۔ دوسری کا تنقیدی ایڈیشن تیار کرنے میں تاخیر ہوگئی۔ جب اس جلد کا کام بھی مکمل ہوگیا تو سیّد صاحب نے "آئینِ اکبری" پر بہت طویل دیباچہ لکھ کر اس جلد میں شامل کرکے چھپنے کے لیے دلی بھیج دیا۔ اس جلد کے ابھی کچھ فرمے چھپنے پائے تھے کہ غدر ہوگیا۔ چھپے ہوئے فرمے اور مسودہ سب ضائع ہوگئے۔

پہلی اور تیسری جلدیں مطبع اسماعیلی سے ۱۲۷۲ھ (۵۶-۱۸۵۵ء) میں شائع ہوئی تھیں۔ پہلی جلد دو سو چھیاسٹھ اور تیسری جلد دو سو چھہتر صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد بھی غالباً اسی مطبع سے شائع ہو رہی تھی۔

تاریخ بجنور سرسیّد دلی میں منصف کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۳ جنوری ۱۸۵۵ء کو انھیں مستقل صدر امین مقرر کرکے بجنور بھیج دیا گیا۔ سرسید کو بجنور پہونچنے پر معلوم ہوا کہ حکومت جن ضلعوں کی تاریخ لکھوانا چاہتی ہے، ان میں ضلع بجنور بھی ہے، ابھی تک کسی مورخ کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چونکہ یہ کام سرسیّد کے مزاج اور ذوق کے مطابق تھا، اس لئے انھوں نے ہامی بھرلی اور کام شروع کردیا۔ جب یہ تاریخ لکھی جاچکی تو کلکٹر نے اس کا مسودہ صدر بورڈ میں آگرے بھیج دیا جہاں وہ غدر کے ہنگامے میں تلف ہوگیا۔

تاریخ سرکشی ضلع بجنور بقول مولانا حالی: "اس کتاب میں غدر کے زمانے کے حالات جو ضلع بجنور سے متعلق تھے بلا رو رعایت اور بے کم و کاست لکھے گئے ہیں۔ جن مسلمانوں نے باوجود متواتر فہمائشوں اور نصیحتوں اور تمام نشیب و فراز سمجھانے کے اور باوجود گورنمنٹ کے احسانات کے سرکار سے بے وفائی کی تھی اور اس سے

مقابلے کے ساتھ پیش آئے تھے، ان کے حالات جوں کے توں بیان کر دیئے ہیں اور جن لوگوں پر بغاوت کا الزام عائد نہیں ہوتا تھا اس کی بھی تفصیل لکھ دی ہے۔

"تاریخ سرکشی ضلع بجنور" کا پہلا ایڈیشن ایک سو پینتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۸۵۸ء میں مفصلات پریس آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک ایڈیشن ڈاکٹر معین الحق نے ۱۸۶۲ء میں سلمان اکیڈمی کراچی سے شائع کیا۔

اسبابِ بغاوتِ ہند ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد انگریز ہندوستانیوں اور خاص طور سے مسلمانوں سے بڑی بے دردی سے بدلہ چکا رہے تھے جسے دیکھ کر سرسید کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ انھوں نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ کر انگریزی حکومت کے دل سے مسلمانوں کے خلاف پیدا ہونے والی بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ثابت کیا کہ بغاوت کا سبب وہ غلطیاں بھی تھیں جن کی ذمہ داری انگریز افسروں پر تھی۔ دوستوں نے اصرار کیا کہ سرسید اس رسالے کی اشاعت نہ کریں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس کی وجہ سے سرسید پر حکومت کا عتاب نازل ہو جائے گا اس کے برعکس سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں اور برطانوی حکومت کے درمیان جو غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اسے دور کرنے کے لئے اس رسالے کی اشاعت ضروری ہے۔ بقول حالی:

"سرسید نے دو رکعتیں بطور نفل کے ادا کیں اور دعا مانگی اور اسی وقت دو کم پانچو جلدوں کا پارسل ولایت کو روانہ کیا اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا میں بھیج دی۔"

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۵۶ء میں مطبع مفصلات گزٹ آگرہ سے شائع ہوا حالی نے "حیاتِ جاوید" (مطبوعہ نامی پریس کانپور ۱۹۰۱ء) میں ضمیمے کے طور پر یہ کتاب شامل کرلی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن چھیاسٹھ صفحات پر مشتمل مطبع مفید عالم آگرہ سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا کسی انگریز افسر نے اس رسالے کا انگریزی میں ترجمہ کیا لیکن وہ پورا نہ کرسکا۔ کرنل گریہم نے یہ ترجمہ مکمل کیا جو ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے ۱۸۵۷ء میں (کراچی اردو اکیڈمی) اور ڈاکٹر فوق کریمی نے ۱۹۵۸ء میں (علی گڑھ یونیورسٹی پبلشرز) اس کے ری پرنٹ مقدموں کے ساتھ شائع کئے۔

تاریخ فیروز شاہی سرسید مراد آباد میں تھے جب انھوں نے ضیاء الدین برنی کی مشہور تصنیف "تاریخ فیروز شاہی" کا ایڈیشن تیار کیا۔ چار نسخوں پر

اس کی بنیاد ہے۔ ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی نے کلکتہ سے چھاپا تھا۔ سرسید نے اس پر ایک دیباچہ لکھا تھا۔ نہ جانے کیا مصلحت تھی کہ یہ دیباچہ کتاب میں شامل نہیں کیا گیا؟ ہاں سائنٹیفک سوسائٹی اخبار کی پہلی جلد میں شائع ہوا۔

تُزکِ جہانگیری تزک کی ترتیب کا کام سرسید نے اس وقت کیا جب وہ بہت مصروف تھے۔ اس لئے اس کی ترتیب میں زیادہ محنت سے کام نہیں لے سکے۔ صرف متن کی درستی کی طرف توجہ کی، حواشی بالکل نہیں لکھے۔ تزکِ جہانگیری کا ۴۲۶ صفحات پر مشتمل یہ ایڈیشن ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا

آثار الصنادید اگرچہ سرسید نے مذہبی، تاریخی، علمی، تہذیبی اور تعلیمی موضوعات پر بڑی تعداد میں کتابیں اور بے شمار مضامین لکھے لیکن سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت "آثار الصنادید" کو حاصل ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی یہ کتاب دلی کے آثارِ قدیمہ کے مطالعہ کے لئے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۸۴۶ء کی بات ہے سرسید فتح پور سیکری میں منصف تھے کہ ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا انتقال ہوگیا۔ چونکہ خاندان کی دیکھ بھال کے لئے دلی میں کوئی نہیں رہا تھا، اس لئے بقول حالی سرسید نے خود درخواست دے کر دلّی اپنا تبادلہ کرا لیا۔

آثار الصنادید کی تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے حالیؔ نے سرسید کا قول نقل کیا ہے:

"میں اپنی کل تنخواہ والدہ کو دے دیتا تھا۔ اس میں سے صرف پانچ روپئے مہینہ اوپر کے خرچ کے لئے مجھ کو دے دیتی تھیں۔ باقی میرے تمام اخراجات ان کے ذمے تھے۔ جو کپڑا وہ بنا دیتی تھیں، پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں، کھا لیتا تھا۔"

حالیؔ نے سرسید کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے:

"ان کے (سرسید کے) بڑے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا جس سے سو روپئے ماہوار کی آمدنی کم ہو گئی تھی۔ قلعے کی تنخواہیں تقریباً کل بند ہو گئی تھیں۔ باپ کی ملک بھی بہ سبب عینِ حیات ہونے کے ضبط ہو گئی تھی۔

سرسید ابتدا سے فراخ حوصلہ اور کشادہ دل تھے۔ خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض

رہتے تھے ۔ لہٰذا ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو۔" سید الاخبار"
جو ان کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا، کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عمارات
دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کرنے کا ارادہ کیا ۔"

حالی کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید نے " آثار الصنادید" مالی منفعت کے لئے لکھی حالانکہ کلی طور پر ایسا نہیں ہے ۔ سرسید کے زمانے میں گرچہ اکبرشاہ ثانی اور پھر بہادر شاہ ظفر بادشاہ تھے ۔ لیکن برائے نام ۔ دلی پر اصل حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی ۔ انگریز اسکالر اور برطانوی حکومت کے افسران ہندوستان کی تاریخ، تہذیب، تمدن، زبان اور ادب میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے ۔ طرح طرح کے حوالے کی کتابیں انگریزی میں لکھی جارہی تھیں۔ ایک طرف ہندوستانی مغربی علوم کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر رہے تھے، دوسری طرف فارسی، اردو اور دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جارہا تھا۔ انگریز افسران اور اسکالرز ہندوستان کے باصلاحیت لوگوں کو مختلف موضوعات پر کتابیں لکھنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ سرسید کو ہندوستان اور خاص طور سے دلی کی تاریخ سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی ۔ وہ ۱۸۴۰ء میں "جام جم" جیسی حوالے کی کتاب لکھ چکے تھے اور پھر دلی اور ہندوستان کے بعض آثار قدیمہ پر کچھ کتابیں لکھی جاچکی تھیں ۔ دلی کے آثارِ قدیمہ کا ذکر بہت سی فارسی تاریخوں میں کیا گیا ہے ۔ ان میں سے بعض کے نام ہیں " تاریخ فیروز شاہی" مؤلفہ ضیاء الدین برنی، "تاریخ فیروز شاہی" از شمس سراج عفیف، "تاریخ مبارک شاہی" مؤلفہ یحییٰ بن احمد بن عبداللہ السہرندی، "سیر المتاخرین" مؤلفہ غلام حسین خاں طباطبائی، "طبقات اکبری" مؤلفہ خواجہ نظام الدین احمد، "طبقات شاہجہانی" مؤلفہ محمد صادق "عمل صالح" مؤلفہ محمد صالح کنبوہ، "فتوحات فیروز شاہی" فیروز شاہ تغلق، "ماثر الامراء" مؤلفہ شاہ نواز خاں "منتخب التواریخ" مؤلفہ ملا عبدالقادر بدایونی، "منتخب اللباب" مؤلفہ محمد ہاشم خاں، "خلاصۃ التواریخ" مؤلفہ سبحان رائے بٹالوی، "مفتاح التواریخ" مؤلفہ ولیم طامس وغیرہ ۔ ان کے علاوہ بھی خاصی تعداد میں ایسی فارسی تاریخیں ہیں جن میں دلی کے آثار قدیمہ کا ذکر مل جاتا ہے ۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں سرسید کی " آثار الصنادید" سے قبل کم سے کم پانچ کتابیں لکھی جاچکی تھیں ۔ لیکن ان میں سے چھپی کوئی نہیں تھی ۔ "سیر المنازل" کے پیش لفظ میں ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے اس موضوع پر تین ایسی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو ہندوستان کے آثار قدیمہ پر لکھی گئی تھیں ۔ یہ تین کتابیں ہیں ۔ (۱) کیفیت مکانات قلعۂ گوڑ لکھنوتی (گوڑ بنگال

کا قدیم دارالخلافہ تھا جسے عام طور پر لکھنوتی کہا جاتا ہے)۔ اس کتاب کے چار ابواب ہیں پہلے باب میں راج شہر میں سلطان شجاع کی بنائی ہوئی عمارتوں کا ذکر ملتا ہے دوسرے میں گوڑ کی مسجدوں دیگر عمارتوں اور شاہی خاندان کی تعمیر کردہ عمارتوں کا ذکر ہے۔ تیسرے باب میں صرف مسجدوں اور عبادت گاہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخری باب میں لکھنوتی کے گزشتہ بادشاہوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب بہ قول قاسمی صاحب ۱۸۱۰ء میں مکمل ہوئی تھی۔

آگرے کے مجسٹریٹ، کلکٹر اور آگرہ گورنمنٹ کے سپرنٹنڈنٹ جیمس اسٹیفن لوشنگٹن نے ۱۸۲۵ء میں اپنے کالج کے طلبا کو ہدایت دی کہ وہ دو مہینے کی مدت میں آگرہ شہر کی عمارتوں کی تاریخ ترتیب دیں۔ اس ہدایت کے نتیجے میں لال چند نے "تفریح العمارات" اور مانک چند نے "احوال شہر اکبر آباد" لکھیں۔ ان کتابوں میں آگرے کی تاریخی عمارتوں، مسجدوں، مقبروں اور باغوں وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں ۱۸۲۵ء میں لکھی گئیں۔ "تفریح العمارات" خدابخش لائبریری پٹنہ اور باقی دونوں کتابیں برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔

دلی کی تاریخی عمارتوں پر اب تک کی دستیاب کتابوں میں، قدیم ترین کتاب مرزا سنگین بیگ کی فارسی میں لکھی ہوئی "سیر المنازل" ہے جو ڈاکٹر شریف حسین قاسمی کے خیال کے مطابق ۱۸۲۱ء سے قبل لکھی جانی شروع ہو چکی تھی اور ۱۸۲۷ء یا اس سے قبل پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

اس کتاب پر گفتگو سے قبل مٹکاف بھائیوں کا ذکر ضروری ہے جن کی وجہ سے دلی کے آثار قدیمہ پر نہ صرف "سیر المنازل" بلکہ اسی موضوع پر انگریزی میں ایک کتاب (   ) وجود میں آئی۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں دلی کی سیاسی زندگی میں مٹکاف خاندان کی بہت اہمیت ہے۔ غالباً سر طامس مٹکاف ایم پی نام کا ایک انگریز دلی میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اس کے دو لڑکے تھے۔ سر چارلس تھیوفلس مٹکاف اور سر طامس مٹکاف۔ چارلس دلی میں مختلف عہدوں پر فائز رہ کر دلی کا ریذیڈنٹ بنا۔ چارلس کی وفات کے بعد سر طامس مٹکاف کو ریذیڈنٹ کا عہدہ ملا۔ طامس مٹکاف کا لڑکا تھیوفلس مٹکاف غدر کے وقت دلی کا مجسٹریٹ تھا۔ اس خاندان کے افراد میں علمی ذوق تھا۔ دلی کے آثار قدیمہ میں سر چارلس تھیوفلس مٹکاف اور سر طامس مٹکاف دونوں بھائیوں کو غیر معمولی دلچسپی تھی۔

دلی کے آثار قدیمہ پر اب تک کی دریافت کتابوں میں پہلی کتاب فارسی کی "سیر المنازل" ہے

۱۔ ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

جس کے مصنف مرزا سنگین بیگ ہیں مرزا نے کتاب کے شروع میں لکھا ہے کہ چارلس تھیوفلس مٹکاف اور ولیم فریزر کے ترغیب دلانے پر میں نے یہ "تاریخ امورات دہلی واحوال مکانات" لکھی ہے ۔ ڈاکٹر قاسمی کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ "مصنف نے بعض مصلحتوں کی وجہ سے ولیم فریزر کا نام بعد میں شامل کیا ہے ۔ ورنہ درحقیقت اس نے یہ کتاب صرف مٹکاف ہی کی فرمائش پر لکھی ہے ۔ مٹکاف نے اس کام سے خوش ہو کر مرزا سنگین کو معقول صلہ بھی دیا تھا ۔ جس کے بارے میں مرزا نے خود لکھا ہے کہ :

"من رہین احسان فراوانش، آنرا نوشتہ مانند تصویر بر خاقان ولیشہ پیش سیلمان بہ حضور بردم و تجلد دی ان بہ صلہ فائز گشتم"

مرزا سنگین بیگ نے "سیر المنازل" کے مقدمے میں لکھا ہے کہ :

"میری اس محنت ومشقت کا سبب صاحب عالی شان اور ملجائے غربان مسٹر چارلس تھیوفلس مٹکاف صاحب اور مسٹر ولیم فریزر صاحب بہادر کا حکم تھا جس کا بجالانا واجب تھا اور ضروری تھا ۔ ۔ ۔ چونکہ ان باکمال صاحب موصوف نے یہ خواہش ظاہر کی کہ دہلی اور یہاں کی عمارتوں کے حالات ترتیب دیئے جائیں اور ان کی خدمت میں پیش کئے جائیں" (فارسی سے ترجمہ)

اس کتاب میں مرزا سنگین بیگ نے

۱۔ دلی کی مختصر تاریخ بیان کی ہے ۔
۲۔ دلی کے آثار قدیمہ کا حال لکھا ہے ۔
۳۔ کتبوں کی عبارتیں نقل کی ہیں ۔
۴۔ دلی کے گلی کوچوں کی تفصیل بتائی ہے ۔
۵۔ اس عہد کے اہم لوگوں کے مکانوں کی نشاندہی کی ہے ۔
۶۔ صنعت کاروں اور بعض فنون کے ماہرین کا حال بیان کیا ہے ۔

چارلس تھیوفلس مٹکاف کے چھوٹے بھائی سر طامس مٹکاف کو بھی آثار قدیمہ سے غیر معمولی دلچسپی تھی ۔ انھوں نے (Remunescence of Imperial Delhi) کے نام سے ۱۸۴۴ء میں ایک کتاب مرتب کی تھی ۔ ان کی بیٹی ایملی انی تھیوفیلا (Emily Annie Theophila) نے بھی ہندوستان میں اپنے قیام کی یادداشتیں کتابی صورت میں لکھیں ۔ غالباً ایملی نے

۔۔۔ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

خود اپنے اور اپنے باپ کے مخطوطوں کو ملا کر ایک ساتھ مجلد کرا دیئے۔ خوش نصیبی سے یہ مجلد مخطوطے مٹکاف خاندان میں محفوظ تھے۔ انھیں ایم ایم کے ای (M M Kaye) نے سنہ ۱۹۸۰ء میں (Golden Calm) کے نام سے انگلینڈ سے شائع کرایا۔ سر طامس مٹکاف کو اپنے بڑے بھائی کی طرح دلی کے آثار قدیمہ سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب میں دلی کی سماجی زندگی اور آثار قدیمہ کی رنگین تصویریں شامل کی ہیں۔ بعض تصویروں پر مصوروں کا نام مظہر علی خاں لکھا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ باقی تصویریں بھی مظہر علی خاں کی بنائی ہوئی ہوں۔ لیکن اس کا بھی امکان ہے کہ جن تصویروں پر مصور کا نام نہیں ہے، کچھ اور مصور یا مصوروں کی بنائی ہوئی ہوں۔ کے ای نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ مظہر علی خاں طامس مٹکاف کے کمیشن میں ملازم تھے۔ ملکہ وکٹوریہ نے کسی زمانے میں دلی کے مصوروں کے حالات لکھوائے تھے۔ یہ ذمہ داری مظہر علی خاں کو سونپی گئی تھی۔ ممکن ہے یہ وہی مظہر ہوں۔

غرض یہ ہے کہ برطانوی افسر دلی کی تاریخ اور دلی کے آثار قدیمہ سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ سر طامس مٹکاف نے دلی کی تقریباً چوہتر عمارتوں کی تصویر اپنی کتاب میں شامل کی ہیں۔ عمارتوں اور ان کے بنانے والوں کے مختصر حالات بھی بیان کئے ہیں۔

سر سید نے آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن انہی سر طامس مٹکاف کے نام معنون کیا ہے۔ سر سید نے مٹکاف کا نام خطابات وغیرہ کے ساتھ اس طرح لکھا ہے:

"معظم الدولہ الملک اختصاص یار خاں فرزند ارجمند بجان پیوند سلطانی سر طامس تیا فلس مٹکاف صاحب بارونٹ بہادر صاحب کلاں بہادر دار الخلافہ شاہجہان آباد دام اقبالہ"

سر سید نے تو نہیں بتایا لیکن عین ممکن ہے کہ سر طامس ہی نے ان کو اس کام کی ترغیب دی ہو اور اس سلسلے میں ان کی رہنمائی اور مدد بھی کی ہو۔

"آثار الصنادید" کی تصنیف سے پہلے "سیر المنازل" اور سر طامس کی کتابیں مرتب ہو چکی تھیں اور بھی کچھ ہوں گی۔ "سیر المنازل" سر سید کی نظر سے گزری تھی یا نہیں، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ سر سید نے اس کتاب کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے اس کتاب کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ اس طرح سر طامس کی کتاب انگریزی میں تھی۔ سر سید اس سے براہ راست استفادہ نہ کر سکے ہوں گے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ سر طامس اس کام کی ترغیب دیں اور اپنے کئے ہوئے

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کام کی تفصیل نہ بیان کریں اور سر سید کو اپنا کیا ہوا کام نہ دکھائیں۔

کچھ اور لوگوں نے بھی سر سید کو ترغیب دی ہوگی۔ اے اسپرنگر نے (Catalouge of the Bibliotheca Sprengeriana) میں "آثار الصنادید" کے پہلے ایڈیشن کا اندراج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سر سید نے یہ کتاب ان کے مشورے پر لکھی تھی۔

"آثار الصنادید" جیسی کتاب لکھنے کے لئے سر سید کو غیر معمولی محنت کرنی پڑی۔ سر سید نے خود تو کہیں نہیں لکھا کہ انھیں اس سلسلے میں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے لیکن حالی نے کچھ تفصیل لکھی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ :

"عمارتوں کی تحقیقات نہایت محنت اور عجلت کے ساتھ برابر جاری رہی۔ سر سید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارات بیرون شہر کی تحقیقات کے لئے شہر کے باہر جاتے تھے اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے۔ ان کے ساتھ اکثر ان کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی مرحوم ہوتے تھے۔

باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا۔ بیسیوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہو گئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ہو گئے تھے اور جو متفرق و پراگندہ اجزاء باقی رہ گئے تھے ان سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اس سے کیا مقصود تھا۔ کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے، ان کا مفصل حال دریافت کرنے کے لئے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی۔ بعض علمی عمارتوں کی حالت ایسی متغیر ہو گئی تھی کہ ان کی ماہیت معلوم ہونی مشکل تھی۔ پھر اکثر عمارتوں کے عرض و طول وارتفاع کی پیمائش کرنی، ہر ایک عمارت کی صورتحال قلم بند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے اور ہر ایک کتبے کو بعینہ اس کے اصلی خط میں دکھانا، ہر کوٹی چھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھنچوانا اور اس طرح کچھ اوپر سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ برآ ہونا، فی الحقیقت نہایت دشوار کام تھا۔ سر سید کہتے تھے کہ "قطب صاحب کی لاٹ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے۔ ان کے پڑھنے کو چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا۔

تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔

سرسید نے ۱۸۴۶ء میں "آثار الصنادید" لکھنی شروع کی اور ۱۸۴۷ء میں تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت میں یہ مکمل ہو کر شائع ہوئی۔

جب تم سب نماز کے لیے ایک جگہ جمع ہو گے اور جماعت سے نماز پڑھو گے تو علاوہ اس کے کہ تم خدا کا فرض ادا کرو گے اس دلی یگانگت کو جو تم آپس میں رکھتے ہوئے عملی طور پر بھی پورا کرو گے۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ شیعہ اور سنیوں نے اپنی اپنی نادانی سے خدا کا فرض ادا کرنے میں بھی تفرقہ ڈالا ہے۔ میں اس کو مٹانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ وہ بجز خدا کے مٹائے مٹ نہیں سکتا۔ مگر میں مسلمان شیعہ طالب علموں کو بھی یہ ضرور کہوں گا کہ نماز کے وقت وہ بھی مسجد میں موجود رہیں جس سے اسلام کی شان اور ایک خدا کے پوجنے والوں کی کثرت ظاہر ہو اور بعد کو وہ بھی اپنے طریقہ پر اسی زمین پر سجدہ کریں جس پر ان کے بھائیوں نے سجدہ کیا ہے اس وحدت کے قائم کرنے کو شیعہ و سنی دونوں کے لیے ایک مسجد بنائی گئی ہے اور شاید تمام ہندوستان میں آپس میں شیعہ اور سنیوں کے اتحاد کی یہ ایک ہی مثال ہے۔

پس اے میرے عزیز شیعہ طالب علموں اور اے میرے عزیز سنی طالب علموں تم اس وحدت کو قائم رکھو اور جہاں تک ہو تفرقہ کو مٹاؤ کہ اس وحدت کا قائم رکھنا تمہارے دین و دنیا دونوں کی بہبودی کا باعث ہے۔ (سرسید)

مولانا شبلی نعمانی

سرسیدمرحوم اور اردو لٹریچر

سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیز یں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کی استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں، ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمران ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو، بعض بالکل ان کے دامنِ تربیت میں پلے ہیں، بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے۔ بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا۔ تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے۔

سرسید کی جس زمانہ میں نشو و نما ہوئی دلّی میں اہلِ کمال کا مجمع تھا اور امرا اور رؤسا سے لے کر ادنیٰ طبقہ تک میں علمی مذاق پھیلا ہوا تھا۔ سرسید جس سوسائٹی کے ممبر تھے اس کے بڑے ارکان مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مرزا غالب اور مولانا صہبائی تھے۔ ان میں سے ہر شخص تصنیف و تالیف کا مالک تھا اور ان ہی بزرگوں

کی صحبت کا اثر تھا کہ سرسید نے ابتدا ہی میں جو مشغلہ علمی اختیار کیا وہ تصنیف وتالیف کا مشغلہ تھا۔ اول وہ رواج عام کے اقتضا سے شاعری کے میدان میں آئے۔ آہی تخلص اختیار کیا اور اردو میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی جس کا ایک مصرعہ انہی کی زبانی سنا ہوا مجھے یاد ہے۔

نام میرا تھا کام ان کا تھا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو شاعری سے مناسبت نہ تھی اس لیے وہ بہت جلد اس کوچہ سے نکل آئے اور نثر کی طرف توجہ کی۔ چونکہ حقائق اور واقعات کی طرف ابتدا ئی سے میلان تھا۔ اس لیے دلی کی عمارتوں اور یادگاروں کی تحقیقات شروع کی اور نہایت محنت وکوشش سے اس کام کو انجام دے کر ۱۸۴۷ء میں ایک مبسوط کتاب لکھی جو آثار الصنادید کے نام سے مشہور ہے۔

اس وقت اگرچہ سرسید کے سامنے اردو نثر کے بعض بعض عمدہ نمونے موجود تھے۔ خصوصاً میر امن صاحب کی چہار درویش جو ۱۸۰۲ء میں تالیف ہوئی تھی اور جس کی سادگی، صفائی اور واقعہ طرازی آج بھی موجودہ تصنیفات کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ مضمون جو اختیار کیا گیا تھا یعنی عمارات اور آثار کی تاریخ وہ تکلف اور آورد سے ابا کرتا تھا۔ تاہم آثار الصنادید میں اکثر جگہ بیدل اور ظہوری کا رنگ نظر آتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی اور مولانائے موصوف بیدل کے ایسے دلدادہ تھے کہ ان کا کلمہ پڑھتے تھے اور جو کچھ لکھتے تھے اسی طرز میں لکھتے تھے۔

سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ آثار الصنادید کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں۔ جو انھوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیئے تھے۔

بہر حال اس کتاب میں جہاں جہاں انشا پردازی کا زور دکھایا ہے اس کا نمونہ یہ ہے۔

"ان حضرات کی طبع رسا شکل رابع سے پہلے اس نے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ

بدیہی الانتاج سے ارباب فہم و ذکا، اور ناخن فکر عقدہ لاینحل کو پہلے اس سے واکرتا ہے کہ گرہ جناب کو انگشت موج دریا معنی فہمی اس درجہ کہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبان سوسن نے کیا کہا اور رمز شناسی اس مرتبہ کو واقعی معلوم ہوگیا کہ نگاہ نرگس نے کیا اشارہ کیا۔ اگر ان کی رائے روشن معجز نما ہو تو نقطہ موہوم کو انگشت سے تقسیم کرے اور جزو لایتجزیٰ کو دو نیم :

اگرچہ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد بزرگوار مولوی محمد باقر نے اردو اخبار کے نام سے اردو کا ایک پرچہ نکالا تھا اور خود سرسید نے ایک پرچہ جاری کیا تھا جس کا نام سید الاخبار تھا اور دونوں پرچوں کی زبان ضرورت کے اقتضا سے سادہ اور صاف ہوتی تھی۔ تاہم اس وقت یہ زبان علمی زبان نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے جب کوئی شخص علمی حیثیت سے کچھ لکھتا تھا تو اسی فارسی نما طرز میں لکھتا تھا۔ سرسید نے بھی اسی وجہ سے آثار الصنادید میں جہاں انشاپردازی سے کام لیا اسی طرز کو برتا۔

"آثار الصنادید جس زمانہ میں نکلی اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ء میں دلّی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اردو کی طرف توجہ کی یعنی مکاتبات وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کیے اور چوں کہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے۔ اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ بنا دیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اسی طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات، مثلاً رنج و غم مسرت و خوشی، حسرت و بیکسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے، اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو انشاپردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے۔ اس کا سنگِ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔

سرسید کو مرزا سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے اس لیے کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ سرسید ضرور مرزا کی طرف سے مستفید ہوئے۔ اسی زمانہ میں ہندوستان کے ہر حصہ

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

میں کثرت سے اردو اخبارات جاری ہوگئے اور انشا پردازی کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی، تمدنی، ملکی، مذہبی، تاریخی مسائل سے کام پڑتا تھا۔ اس لیئے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے تاہم انشا پردازی کا کوئی خاص اسٹائل متعین نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ تھا ابتدائی حالت میں تھا۔

۱۸۷۰ء میں جس کو آج کم و بیش ۲۷ برس ہوئے سر سید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لیئے تہذیب الاخلاق کا پرچہ نکالا اور اردو انشا پردازی کو اس رتبہ پر پہنچا دیا۔ جس کے آگے اب ایک قدم بڑھنا بھی ممکن نہیں۔ سر سید نے اردو میں جو باتیں پیدا کیں۔ اس کو مختصراً تہذیب الاخلاق میں خود ایک مقام پر لکھتے ہیں ان کی خاص عبارت یہ ہے۔

"جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کی علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔"

اس آرٹیکل میں سر سید نے انشا پردازی کے اور بہت سے اصول بتائے جن کو اس موقع پر ہم اختصار کی وجہ سے قلم انداز کرتے ہیں۔

سر سیّد کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے۔ فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعراء اور نثار گزرے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔

فردوسی بزم میں رہ جاتا ہے۔ سعدی رزم کے مرد میدان نہیں۔ نظامی رزم و بزم دونوں کے استاد ہیں لیکن اخلاق کے کوچہ سے آشنا نہیں۔ ظہوری صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے۔ برخلاف اس کے سر سید نے اخلاق، معاشرت، پالیٹکس، مناظرِ قدرت

وغیرہ وغیرہ سب پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے، لاجواب لکھا ہے، مثال کے طور پر بعض بعض مضامین کے جستہ جستہ فقرے نقل کرتے ہیں۔ امید کی خوشی پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں امید کو مخاطب کیا ہے۔ اس کے چند فقرے یہ ہیں:

"دیکھ نادان، بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے، اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچہ میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے۔ سو رہ میرے بچے، سو رہ، اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سو رہ، اے میرے دل کی کونپل سو رہ، بڑھ اور پھل پھول، تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے۔ تیری ٹہنی میں کبھی کوئی خار نہ پھوٹے، کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آئے، سو رہ میرے بچے، سو رہ، میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچے سو رہ، تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا تیری خصلت، تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی، تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو ہم سے کرے گا۔ ہمارے دل کو تسلی دیں گی۔ سو رہ میرے بچے سو رہ، سو رہ میرے پیارے سو رہ۔"

یہ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جب کہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے ماں کے دل کو شاد کرنے لگا، اور امّاں امّاں کہنا سیکھا۔ اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی۔ آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کے بھڑکانے کے قابل ہوا۔ پھر مکتب سے اس کو سرو کار پڑا رات کو ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق عزّ دہ دل سے سنانے لگا اور جب کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور پکارنے لگا، تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہوگئیں اور ہماری پیاری پیاری امید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ ہے۔"

"وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے کوچ پر کوچ کرتے تھک گیا ہے۔ لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے، دلوں میں عجیب قسم کی

خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جب کہ بجلی سے چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوت بازو! اور اے بہادروں کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتحمندی کا خیال اس کے دل کو تقویت دیتا ہے اس کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہے۔"

تم دیکھ سکتے ہو کہ ان چند سطروں میں کس طرح نیچر کی تصویر کھینچی ہے اور اس میں کس قدر درد اور اثر پیدا کیا ہے۔ پالیٹکس کا راستہ اس سے بالکل الگ ہے۔

پنجاب میں جب یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی۔ جس میں اورینٹل تعلیم پر بہت زور دیا گیا تھا۔ سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے پالیٹکس کی بنا پر ہم کو اعلیٰ تعلیم سے روکنا مقصود ہے۔ اس وقت سرسیّد نے پے درپے تین آرٹیکل لکھے۔ ان آرٹیکلوں نے یونیورسٹی کے بانیوں کو اس قدر گھبرا دیا کہ خاص ان آرٹیکلوں کے جواب میں سیکڑوں مضامین لکھے گئے اور ان کا مجموعہ یک جا کر کے ایک مستقل کتاب تیار کی، افسوس ہے کہ اختصار کی وجہ سے ہم ان آرٹیکلوں کا کوئی حصّہ نقل نہیں کر سکتے۔

سرسید نے انشاپردازی کی ترقی کے جو طریقے ایجاد کیے۔ ان میں ایک یہ تھا کہ بہت سے اعلیٰ درجہ کے انگریزی مضامین کو اردو زبان کا قالب پہنایا لیکن ترجمہ کے ذریعہ سے نہیں کیونکہ یہ طریقہ اب تک بے سود ثابت ہوا ہے بلکہ اس طرح کہ انگریزی کے خیالات اردو میں اردو کی خصوصیات کے ساتھ ادا کیے۔ "امید کی خوشی" کا مضمون جس کے ہم نے بعض فقرات اوپر نقل کیے۔ دراصل ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے۔ انگریزی میں ایڈیسن اور اسٹیل بڑے مضمون نگار گزرے ہیں، سرسید نے ان کے متعدد مضامین کو اپنی زبان میں ادا کیا۔

سرسید کی انشاپردازی کا بڑا کمال اس موقع پر معلوم ہوتا ہے جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں اردو زبان چونکہ کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی۔ اس میں علمی اصطلاحات، علمی الفاظ اور علمی تلمیحات بہت کم ہیں، اس لیے

اگر کسی علمی مسلہ کو اردو میں لکھنا چاہو تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔ لیکن سرسید نے مشکل سے مشکل مسائل کو اس وضاحت، صفائی اور دلآویزی سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہے۔

پروفیسر رینان نے جو فرانس کا ایک بڑا مشہور مصنف گزرا ہے، اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "عربی زبان میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ فلسفیانہ مسائل کو ادا کر سکے۔ رینان جن مسائل کے ادا کرنے کے لیئے عربی زبان کو ناقابل سمجھتا ہے دگو اس کا یہ خیال محض غلط ہے)" سرسید نے اردو جیسی کم مایہ زبان میں وہ مسائل ادا کر دیئے ہیں، سرسیّد نے فلسفہ الہیات پر جو کچھ اپنی مختلف تحریروں میں لکھا ہے وہ فلسفہ کے اعلیٰ درجہ کے مسائل ہیں۔

زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں ان کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا تاہم اس سے مجھ کو کبھی انکار نہ ہو سکا کہ ان مسائل کو سرسیّد نے جس طرح اردو زبان میں ادا کیا ہے کوئی اور شخص کبھی ادا نہیں کر سکتا۔

سرسید کی تحریروں میں جا بجا ظرافت اور شوخی بھی ہوتی ہے لیکن نہایت تہذیب اور لطافت کے ساتھ مولوی علی بخش خاں صاحب مرحوم جو سید کے رد میں رسالے لکھا کرتے تھے، حرمین شریفین گئے اور وہاں سے سرسیّد کی تکفیر کا فتویٰ لائے۔ اس پر سرسیّد ایک موقع پر تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں:

"جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا، ان کے لائے ہوئے فتوؤں کو دیکھنے کے مشتاق ہم بھی ہیں۔

بہ بیں کرامت بت خانہ مرا اے شیخ
کہ چوں خراب شود خانہ خدا گردد

سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی، کسی کو ہاجی، کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست   در باغ لالہ رہ ید و در شور، بوم خس

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

"تہذیب الاخلاق" جب بند ہوا ہے تو سرسید نے خاتمہ پر جو مضمون لکھا ہے اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں۔

"سوتوں کو جھنجوڑتے ہیں کہ جاگ اٹھیں اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہوگیا اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے، کچھ جھنجھلائے، ادھر ہاتھ جھٹک دیا اُدھر پیر جھٹک دیا اور اینڈے پڑے سوتے رہے۔ تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے، شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آگئی ہے اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیے۔ بچے اٹھاتے وقت کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھاتے جاؤ گے تو ہم اور پڑے رہیں گے تم ٹھہر جاؤ ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بچہ کڑوی دوا پیتے وقت بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی! یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا پی لے، تم چپ رہو، میں آپ ہی پی لوں گا۔ بھائیو اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھو پی لو، پی لو۔"

حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے اردو انشاپردازی پر جو اثر ڈالا ہے اس کی تفصیل کے لیے دو چار صفحے کافی نہیں ہوسکتے۔ یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے وہ لکھیں گے اور خوب لکھیں گے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ لکھ چکے ہیں اور خوب لکھا ہوگا۔ میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا تھا کہ اس وقت جبکہ تمام ملک میں سرسید کا آوازۂ ماتم گونج رہا ہے اور ہر شخص ان کے کارناموں کے سننے کا شائق ہے، کچھ نہ کچھ مختصر طور پر فوراً لکھنا چاہیئے، میں نے اسی کی تعمیل کی، ورنہ میں مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا اور اس شعر کا مصداق بننا نہیں چاہتا۔

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

"سرسید کی کامیابیوں کا بڑا راز یہ تھا کہ وہ خود بڑے خوش دماغ اور بڑے جری اور مستقل مزاج تھے۔"
(شیخ ممتاز حسین جونپوری)

پروفیسر ثریّا حسین

سرسیّد کی مکتوب نگاری

اردو خطوط نگاری کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔ ابتدا میں فارسی مکتوبات کی طرح اس میں بھی حرفِ مطلب کے بجائے زبان اور اندازِ بیان کو اہمیت حاصل تھی۔ لمبے چوڑے القاب و آداب اور تکلفاتِ ادا ہی کو کمال سمجھا جاتا تھا۔ اردو مکاتیب کے اولین مجموعے "انشائے خرد افروز"، "مکتوبات احمد احمدی و محمدی" اور "رقعات عنایت علی" ہیں۔

مرزا غالب نے ۱۸۵۰ء کے قریب فارسی کے پُرتکلف القاب و آداب ترک کر کے بےتکلف اور غیر رسمی اندازِ تحریر اپنایا اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ عرصۂ دراز تک غالب کی خطوط نویسی کی تقلید ہوتی رہی اور مکتوب نگاروں کی بڑی تعداد ان کے طرزِ نگارش کی پیروی کرتی تھی۔

اردو مکتوب نگاری میں علیگڑھ تحریک سے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اس نے اردو ادب کی دیگر اصناف کی طرح خط نویسی کا رنگ بھی بدل دیا اور تاریخ، سوانح، تحقیق، زبان، تنقید و تبصرہ، ناول و افسانہ، طنز و مزاح اور صحافت نے بھی مراسلے کو فروغ دیا۔

اسلوبیاتی اعتبار سے اس دور کے مکتوبات کی نثر میں عبارت آرائی کے بجائے سادگی، مقصدیت اور واقعیت ملتی ہے۔ سید احمد خاں نے خط مقصد اور ضرورت

کے تحت لکھے اور اپنے مشن سے شدید ذہنی اور قلبی وابستگی نے ان کے خطوط کے مندرجہ ذیل مجموعے منظر عام پر آئے۔

رسالہ تحریر فی اصول التفسیر، مطبع مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علی خاں صوفی ۱۸۹۲ء ابتدا میں سید احمد خاں نے رسالہ مذکور کا تعارف دیا ہے۔ پھر محسن الملک کے تفسیر سے متعلق دو خط مورخہ ۹ راگست اور ۱۹ ستمبر ۱۸۹۲ء شامل ہیں جن کے جواب میں سید احمد خاں نے اپنے اصولِ تفسیر بیان کیے ہیں۔ آخر میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے اور آپ سے مکاتبات ہوں صرف متعلق تفسیر اور وہ بطور رسالہ کے جمع کیے جاویں اور اس کا نام "مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن رکھا جاوے"۔

مکاتب الخلان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن، مرتبہ محمد عثمان مقبول مطبع محمدی علیگڑھ یکم فروری ۱۹۱۵ء۔

اس میں سرسید اور محسن الملک کے اصول التفسیر اور علوم القرآن سے متعلق گیارہ خطوط شامل ہیں۔

"سرسید کے خطوط"، مرتبہ وحید الدین سلیم بچپن خطوط کا مجموعہ، صفحات ۴۰، حالی پریس پانی پت سے شائع ہوا سنہ اشاعت درج نہیں۔ زمانی اعتبار سے یہ خطوط ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۱ء کو محیط ہیں۔ رسالہ معارف کے شماروں میں اپریل، مئی، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۰۱ء میں چھپے اور محسن الملک، زین العابدین، منشی نیاز محمد خاں، میر واحد علی، شیخ محمد عمر، نواب انتظار جنگ، سردار محمد حیات خاں، الطاف حسین حالی اور منشی سراج الدین کے نام ہیں۔

"خطوط سرسید"، مرتبہ سر راس مسعود۔ یہ ۲۴۳ خطوط نظامی پریس بدایوں سے طبع ہوئے۔

اور اس کے دو ایڈیشن منظر عام پر آئے۔

نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء صفحات ۳۴۲

" " ۱۹۳۱ء صفحات ۲۶۲

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ان مجموعوں کے شروع میں سرسید کی تصویر ہے اور دیباچہ عبداللہ خاں وکیل کا تحریر کردہ ہے۔ مرتب نے مکتوب الیہم کا مختصر تعارف بھی دیا ہے۔

"انتخاب مکاتیب" مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ ناشر نصیر الدین ہمایوں، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے ۱۹۵۸ء میں چھپا۔ اس میں سرسید کے چالیس خطوں کو مختلف عنوانات کے تحت منقسم کر کے تفصیلی تعارف اور تبصرہ کیا گیا ہے مگر دو چار خطوں کے علاوہ کسی سے تاریخ تحریر اور تحریر کا پتہ نہیں چلتا۔

مکتوبات سرسید مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب زرّیں آرٹ پریس ریلوے روڈ لاہور سے ۱۹۵۹ء میں طبع ہوئے۔ یہ ۳۴۲ خطوط ۱۸۴۹ء سے ۱۸۹۸ء کے درمیان لکھے گئے جن میں چند فارسی میں بھی ہیں۔ مرتب نے ابتدا میں مختصر طور پر مکتوب الیہم کے ساتھ سرسید کے تعلقات، ان کی سوانح اور اہم اوصاف کا بھی ذکر کیا ہے اور آخر میں "مکتوباتِ سرسید" کے ماخذ" کے تحت ماخذات بھی درج کر دیئے ہیں۔

"مکاتیب سرسید احمد خاں" مرتبہ مشتاق حسین یونین پرنٹنگ پریس دہلی اکتوبر ۱۹۶۰ء۔ یہ دو حصوں میں منقسم ہیں۔ حصہ اول کے ۲۴۲ صفحات میں ایک سو اٹھاون مکاتیب اٹھاون مکتوب الیہم کے نام ہیں جو سوائے اس مجموعے کے اور کہیں نہیں ملتے۔ دوسرے حصے میں ۱۳۷ صفحات میں چونتیس خطوط ہیں مکتوب الیہم کو لکھے گئے جو مختلف اخبارات، رسائل اور کمیاب کتابوں سے جمع کیے گئے سوائے ایک غیر مطبوعہ خط کے جو عبداللہ مہر علی کے نام ہیں۔ مکتوب الیہم کا تعارف، خطوط کی نوعیت اور ماخذات بھی مندرج ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اور تعارف ڈاکٹر عابد حسین نے لکھا ہے۔

سید احمد خاں کے خطوط کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ مبالغہ آرائی، مقفٰی و مسجع انداز بیان کے بجائے وہ اثر آفرینی کو ضروری سمجھتے تھے۔

"یہاں تک کہ دوستانہ خط و کتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے رقعوں میں یہ سب خرابیاں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی خط اور رقعہ ایسا نہیں جس میں جھوٹ اور وہ بات جو کہ درحقیقت دل میں نہیں مندرج نہ ہو۔ پس ایسی طرزِ تحریر نے تحریر کا

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا۔

ان کے خطوں میں سادگی وسلاست، جامعیت اور اختصار ہے۔ القاب و آداب کا کوئی خاص اہتمام نہیں بلکہ سادہ اور برمحل القاب کی وجہ سے ان کے یہاں یگانگت اور گرم جوشی کا احساس ہوتا ہے اور مخاطب سے ان کی وابستگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ جیسے :-

بھائی سراج الدین، عزیز عنایت اللہ خاں، شفیق من، مکرمی زید، اور کبھی لمبے القاب سے بھی دوستوں کو یاد کرتے۔ مثلاً واہ واہ جناب محسن الملک واہ واہ! قبلہ گویم یا خدا یا کعبہ یا پیغمبرش۔ اصطلاح عشق بسیار است ومن دیوانہ ام قبلہ میرے، مخدوم میرے، محب میرے، محبوب میرے، (اب تو صاف لکھ دوں جو بھی ہو سو ہو) سلامت!

دراصل وہ حرفِ مدعا کی ترسیل کے لیے اندازِ بیان کا سہارا لیے بغیر اپنا منشا لکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی نثر میں واقعیت، صداقت اور سنجیدگی ہے۔ مراسلے کو مکالمہ بنانے کا دعویٰ اور نرالا طرزِ تحریر ایجاد کرنے کے بجائے وہ خط کو خالص پیغام رسانی کا پیغام سمجھتے ہیں اور ان کے خطوط پر وقار لب ولہجہ کے حامل ہیں لیکن ضمناً اس میں مزاح کے پہلو بھی نکل آتے ہیں۔ یہ خطوط چونکہ قلم برداشتہ اور ترسیلِ خیال کے لیے لکھے گئے اس لیے ان میں کہیں کہیں جملوں کی ترتیب اور قواعد سے بے پروائی کا احساس ہوتا ہے۔

عام طور سے اس صنفِ ادب کو مکتوب نگار کی شخصیت اور سوانح کا مستند ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے خیالات کے ارتقائی موڑ اور منازل، ذہنی نشو ونما کے تدریجی مراحل اور زندگی کے دلچسپ پہلوؤں کا احاطہ کرنا ممکن ہوتا ہے۔ سید احمد خاں پر حادثاتِ زندگی اثر انداز ہوئے اور ان میں چھوٹی موٹی مخالفتوں اور اعتراضات کو برداشت کرنے اور درگزر کرنے کی قوت تھی۔ مثلاً ایک خط سے ہم ان کی خوبیوں سے متعارف ہوتے ہیں کہ :

"میں نے آپ کا اخبار مورخہ ۸ر جنوری پڑھا۔ بلا شبہ میں آپ کی محبت کا جو آپ کو مجھ ناچیز سے ہے، ممنون اور احسان مند ہوں اور آپ کی اس تحریر کی جو اس پرچے

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

میں ہے بوجہ جوشِ محبت معذور سمجھا ہوں۔ مگر جانے دو جس کا دل جو چاہے کہے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ اگر ہمارا بُرا کہنے سے ان کا دل خوش ہوتا ہے خوش کر لینے دو۔ تم بھی اس برا کہنے سے خوش ہو۔ کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں۔ ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔"

انھیں اپنے زاویۂ نگاہ کی وضاحت میں دوسروں کی نکتہ چینی کا خوف اور مصلحت کا دھیان نہیں رہتا بلکہ مخاطب کو اپنا سمجھ کر وہ خیالات کا اظہار برجستہ کر دیتے اور قطعیت سے کرتے ہیں۔

"آپ جو رسالہ نسبت مرزا غلام احمد قادیانی کے لکھنا چاہتے ہیں، کیا آپ کو بھی کچھ مالیخولیا ہو گیا ہے؟ اس لغو حرکت سے کچھ فائدہ نہیں اور مجھ کو ہرگز اس قدر فرصت نہیں کہ نسبت اس کے کچھ لکھوں۔"

ان کے دل میں ساری زندگی قوم کی خدمت کا جذبہ موجزن رہا۔ وہ لندن کی طلسماتی فضاؤں میں بھی رہ کر اپنے ملک کو نہ بھلا سکے۔ ان کے رقعات سے قوم کا درد اور دکھے دل کی کراہ سنائی دیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالحق قوم کا دکھڑا ان کے دل سے جدا نہیں ہوتا۔ اس کی حالت تپ کہنہ کی ہے جو ہڈیوں تک رچ بس گیا ہے۔

"افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے اور زہر اگلتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی! فکر کرو اور یقین کر لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت کم فاصلہ باقی ہے۔"

یورپ کے قیام کے دوران وہاں کی زندگی اور ماحول کے بارے میں اپنے تاثرات سے احباب کو وقتاً فوقتاً مطلع کیا:

صاف صاف بات یہ ہے کہ یورپ دو آدمیوں کے کام کا ہے۔ اول ان کے جو جواں نوعمر ہیں اور علوم و فنونِ جدیدہ کی تربیت چاہتے ہیں اور یورپ کی زبان سے واقف ہیں۔

دوسرے ان لوگوں کے لیے جو صرف سیر کے خواہاں ہیں یا اپنے ملک اور اس

ی ترقی میں کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ سیر کا تو مختصر حال یہ ہے کہ یہاں وہ چیزیں اور وہ کارخانے وہ صنائع اور وہ عمارات اور ایسی عجائبات ہیں کہ جن لوگوں نے اس کو نہیں دیکھا ہے ان کے سامنے بیان ہوسکیں اور سمجھ سکیں جس وقت انسان یورپ کی سرحد میں پہنچتا ہے حقیقت میں اس کو ایک نیا عالم معلوم ہوتا ہے۔"

سید احمد خاں کی شخصیت کے نمایاں اوصاف سادگی معصومیت، خلوص، مستقل مزاجی اور محنت و ایثار ان کے خطوط میں دیکھے جاسکتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے احباب کی جھلک مل جاتی ہے اور ان کے بے تکلف انداز تخاطب بھی اندازہ ہوجاتا ہے۔

"جس قدر آپ نے درحقیقت مولوی زین العابدین کی محبت کا میری نسبت ذکر لکھا ہے۔ درحقیقت وہ بہت کم ہے۔ اس غارت کن ایمان کو جیسا وہ ہے میں ہی جانتا ہوں۔ اب آپ کو میری طبعیت کا حال بخوبی معلوم ہوگیا ہے ... وہ بچے ہیں۔ انھوں نے دنیا نہیں دیکھی ہے۔ دوستی اور محبت کے معاملات اور برتاؤ سے محض ناواقف ہیں۔ کسی رنڈی پر وہ عاشق نہیں ہوئے۔ ان کو مزہ محبت اور دوستی کا مطلق معلوم نہیں۔ سچ ہے کہ جس نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا وہ خدا کی دوستی کا مزہ جانتا ہے نہ انسان کی دوستی کا اور نہ ہی محبت کے لائق ہے۔"

ان کے مشن کے خدوخال اور علیگڑھ تحریک پر متعدد خطوط ہیں جن میں تعلیم کے علاوہ ان کی اہل اسلام کی عام حالت سے خصوصی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اب کے سال الہ آباد میں ہوگا۔ ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ دسمبر تواریخ اجلاس مقرر ہوئی ہیں۔ پہلے اجلاس میں وہ امور تنقیح پا دیں گے جو بحث کے لیے پیش ہوں گے۔ مگر تمام بحثیں تعلیم مسلمانان سے متعلق ہوں گی۔ نواب محسن الملک، مولوی سید مہدی علی غالباً اسباب تنزل مسلمانان پر لکچر دیں گے ہمارے کالج کے ایک نہایت قابل اور عالم پروفیسر انگریز مسٹر آرنلڈ چین اور جاوا میں اسلام کی ترقی اور وہاں کے مسلمانوں کی حالت پر لکچر دیں گے۔"

ڈاکٹر سید عبد اللہ نے ان کے مکاتیب پر صحیح اظہار خیال کیا کہ:

"سرسید کی ادبی تحریک اور ان کے شخصی رنگ خط نگاری نے بھی خاص حد تک

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

خط وکتابت پر اثر ڈالا۔ سرسید جس طرح نثر میں مدعا اور مقصد کے داعی ہیں اسی طرح خط نگاری میں بھی مقصدیت کے علمبردار ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین تہذیب الاخلاق میں خود اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ صرف کام کی باتیں کہنا چاہتے تھے اور عبارت آرائی تکلف اور اطناب بے مقصد سے احتراز کرتے ہیں، ان کے خط، ان کی عام نثر کے مقابلے میں زیادہ شگفتہ ہیں۔ . . بہرحال یہ مسلم ہے کہ سرسید نے اردو خطوط نگاری کو مضمون کی قطعیت، زبان کی سادگی اور تخاطب کے خلوص سے آشنا کیا۔"

سرسید احمد خاں نے خاص مقصد اور کیفیات کے زیر اثر اپنی نثر میں عبارت آرائی تشبیہہ و استعارہ اور صنائع لفظی و معنوی کی گل کاری کی حالانکہ ایسے خطوں کی تعداد کم ہے۔ اس نثر کی شگفتگی اور انداز نگارش کا حسن اور ان پر مرتب ہونے والے تاثرات سے اس دور کی مخصوص روش کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔

"تبدیل وضع کے باب میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔ وہ بہت بجا ہے بشرطیکہ میرا جادو تو یہ، میرا معجزہ نعوذ باللہ، میری کرامت لاحول ولا قوۃ الا باللہ، میری حماقت بھی تم پر اثر نہ کرے گی۔ ذرا صبر کرو۔ تین مہینے خیر سے گزر جاویں۔ جب الٰہ آباد اسٹیشن پر گلے ملو گے اور چھاتی سے چھاتی لگے گی، اس وقت پوچھیں گے کہ جانِ من (معاف کیجیے بے خودی میں یہ لفظ نکل گیا) قبلہ من اب کیا ارشاد ہوتا ہے۔"

انھوں نے غالب کی طرح بے ساختہ، براہ راست اور بے تکلف خطانویسی کو مروج کیا۔ ان کے معاصرین نے بھی یہی انداز اپنایا۔ اس سلسلے میں محسن الملک، وقار الملک نذیر احمد، حالی اور شبلی اہم ہیں۔ محمد حسین آزاد اور اکبر الٰہ آبادی پر بھی ان کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ سید احمد خاں نے جس منفرد طرز کی مکتوب نگاری کی اس کی تقلید آج تک ہو رہی ہے۔ بعد کے مقلدین میں احسن مارہروی اور ڈاکٹر عبدالحق وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

سرسید اور فنِ تقریر

تقریر یا خطابت کی ابتدا ر وقت، حالات اور ضرورت کے تحت ہوئی۔ یہ ایک معروف فن ہے جس کی مدد سے مقرر اپنا مقصد اور منشا واضح کرتا ہے۔ کسی عمل

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کی جانب ترغیب، اچھے کام کی تلقین اور برے سے اجتناب کا مشورہ دیتا ہے۔
ہندوستان میں مختلف ادوار بالخصوص انیسویں صدی کے وسط میں جو مشہور مقرر ہوئے ان میں اکثر متفرق تحریکوں کے بانی اور روح رواں تھے مثلاً راجہ رام موہن رائے، کیشب چندر سین، دادا بھائی نوروجی اور سریندر ناتھ بنرجی کے نام خصوصیت سے لیے جا سکتے ہیں۔
سید احمد خاں کی ذات مجموعہ صفات تھی۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ مقرر کی ظاہری شکل و صورت، لب و لہجہ اور آواز کا فطری انداز تخاطب اس کی کامیابی کا غماز ہوتا ہے۔ سید احمد خاں کی موثر تقاریر کا راز ان کی بارعب و بردبار شخصیت اور مقصد سے وابستگی میں مضمر تھا۔ وہ فطری باتوں پر زیادہ زور دیتے اور انھیں موزوں الفاظ میں بیان کر دیتے تھے۔
عقل عامہ رکھنے کی وجہ سے وہ عین موقع پر سامعین کے احساسات اور نفسیات کو سمجھ لیتے۔ ان کی معلومات عامہ ان کے مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ کا نتیجہ تھی۔ وہ مشکلات اور مصائب کا ذکر اس طرح کرتے کہ مجمع متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ وہ خود بھی زود حس تھے۔ قوم کی بدحالی انھیں آب دیدہ کر دیتی۔ چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا، آواز میں گھراؤ اور لہجے میں سوز و گداز پیدا ہو جاتا تھا۔ شیخ اسماعیل پانی پتی نے لکھا ہے کہ تقریر کرتے وقت وہ خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے۔
وہ تقریر چاہے کسی موضوع پر کریں کوئی نہ کوئی نیا نکتہ ضرور نکال لیتے تھے۔ برمحل واقعات اور اقوال کے بیان کرنے سے نہ صرف سر سید احمد خاں کے حافظہ بلکہ قوت متخیلہ اور تخلیقی صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔
ان کی زبان میں سلاست اور روانی کے ساتھ اختصار بھی تھا۔ پیچیدہ اور طویل جملوں کے بجائے ان کی تقریریں استدلال اور سادگی ہوتی۔
فی البدیہہ تقریر کو "ارتجالی خطبات" سے موسوم کیا جاتا ہے جن کا تعلق براہ راست موضوع کے علاوہ اسلوب بیان سے بھی ہوتا ہے۔
سید احمد خاں عموماً فی البدیہہ تقریر کیا کرتے تھے۔ انھیں حسب ضرورت اور برجستہ تقاریر کا ملکہ حاصل تھا جو موضوع، مقام اور کیفیت کے اعتبار سے مختلف النوع

ہوئیں اور مسودے موجود نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی تو ضائع ہوگئیں۔ اس وقت تک فن مختصر نویسی رواج نہ پا سکا تھا۔ اس لیے تمام تر تقریر نوٹ کرنی مشکل تھی البتہ کوئی نہ کوئی ان کی تقریر کو تیزی سے لکھنے کی کوشش کرتا اور پھر طباعت کے لیے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ سر سید احمد خاں کی تقاریر "سفرنامہ پنجاب" محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی رودادوں، حیاتِ جاوید اور تذکرہ سر سید میں ملتی ہیں۔ ان کے لیکچرز کے چار مجموعے چھپے جن میں سے دو ان کی حیات میں ہی شائع ہو گئے تھے۔

سر سید کے لیکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین ایڈیٹر سرمور گزٹ ناہن، منصور پریس لاہور سے ۶ دسمبر ۱۸۹۰ء کو ۲۰۰ صفحات پر مشتمل شائع ہوا جس میں سر سید احمد خاں کی تینتالیس تقریریں ملتی ہیں۔

لیکچروں کا مجموعہ "مرتبہ منشی سراج الدین باہتمام منشی فضل الدین تاجر کتب قومی نے لاہور ۱۹۸۳ء سے طبع کیا جس میں پہلے کے مقابلے میں چند لیکچرز کا اضافہ ہے۔

"مکمل مجموعہ لیکچر اور اسپیچ" ۱۸۶۳ء سے ۱۸۹۸ء کے چالیس تک کی تقاریر۔ مرتبہ محمد امام الدین گجراتی، مطبع نول کشور پرنٹنگ ورکس لاہور سے ۴۹۶ صفحات میں فروری ۱۹۰۰ء میں چھپا۔

"خطباتِ سر سید" مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور سے دسمبر ۱۹۷۲ء صفحات ۸۰۰ شائع ہوا۔ جس میں اٹھاون لیکچرز شامل ہیں۔ شروع میں شیخ اسماعیل کا تحریر کردہ جامع اور مبسوط مقدمہ ہے اور ہر تقریر کی ابتدا میں اس کے موضوع اور اندرجات کی مختصراً وضاحت کر دی گئی۔ تقاریر کی ترتیب زمانی اعتبار سے کی گئی ہے۔

سید احمد خاں کی تقریروں کے موضوعات مختلف ہیں۔ بیشتر میں انگریزی تعلیم کی ضرورت و افادیت اور متفرق علوم و فنون کی جانب توجہ نیز موجودہ نصاب میں تبدیلی کی سفارش ہے اور مسلمانوں کو مغربی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی۔

درحقیقت ہندوستان میں اب تک ہائی ایجوکیشن کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں نے ہم کو اب تک صرف ہائی ایجوکیشن کے دروازے تک پہنچا دیا

مگر اس کے اندر جانے کا راستہ بند کر رکھا ہے۔ انسان کی تعلیم کی عمدہ حالت ہونے کو یہ بات لازم ہے کہ وہ ہر فن میں کچھ نہ کچھ جانتا ہو اور ایک میں کامل ہو مگر ہندوستان کے کالجز اور ہماری یونیورسٹیاں ہم کو کچھ کچھ سکھاتی ہیں اور کسی ایک میں کامل نہیں کرتیں۔

گورنمنٹ اپنے فرض سے ہرگز بری نہیں ہو سکتی جب تک وہ تعلیم کا کوئی ایسا طریقہ نہ قائم کرے جس سے ہندوستانی نوجوان بیس برس کی عمر میں اور بموجب قواعد حال کے انیس برس کی عمر میں اس قدر قابلیت حاصل کریں کہ وہ انگلستان میں جا کر سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں اپنے ہم پیشہ انگریزوں کا ساتھ دیں۔"

سید احمد خاں کی تحریک اور اس کے پس منظر میں کچھ نئے اور اہم پہلوؤں کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی ابتدا سے ارتقائی مراحل کا حرف بہ حرف حال ان کی تقریروں کی روشنی میں سامنے آتا ہے اور ان کی تعلیمی تحریک کے جملہ ادوار کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً انھوں نے وکٹوریہ اسکول غازی پور کی بنیاد ۱۸۶۴ء میں رکھی۔ مدرستہ العلوم علیگڑھ کے چندے کے لیے عظیم آباد (پٹنہ) سہارنپور، میرٹھ، گورکھپور اور پنجاب کے اضلاع کا دورہ کیا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور میں مدرسے کے تعلیمی حالات اور جدید واقعات پر تقریریں کیں۔

ان کی تقاریر میں جہاں تعلیمی، تہذیبی، سیاسی اور مذہبی اعتبار سے قابلِ توجہ نکات ملتے ہیں وہیں ان کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ ان سے سیاسی حالات معاشرتی احوال، ملک و قوم کی اقتصادی حالت، قانون اور حکومتِ وقت کی پالیسیاں اور مختلف جشن و جلوس کی کیفیات کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اکثر و بیشتر قانون کے متعلق بھی اظہار خیال کیا۔ مثلاً قانونِ حقوق استفادہ مسودۂ قانون ترمیم فوجداری متولیان اوقاف وغیرہ کے بارے میں اور اس کے علاوہ ٹیکہ لگانے اور ہومیوپیتھی کے علاج پر بھی تقریریں کیں۔ انھوں نے اتحادِ باہمی پر زور دیا کہ:

"ہم کو یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہیے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں ... اسی ملک کی ہوا سے، اسی ملک کے پانی سے، اسی ملک کی پیداوار سے دونوں کی زندگی ہے ... ہمسائے کا ادب ہمارے مذہب کا

جزو ہے اور یہ ہی ہمسائیگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی اور ہم وطنی کی وسعت تک پہنچ گئی ہے۔"

اور مولانا حالی نے اس وصف کے متعلق لکھا :

مگر ۲۹ دسمبر کو جو لیکچر کہ سید صاحب نے راجہ دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں دیا جہاں کئی ہزار کا مجمع تھا اس کا سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا ۔ ۔ ۔ سامعین پر ایک سکتہ سا عالم تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جو زار و قطار روتا ہو اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔ اگر میرا قیاس غلط نہ ہو میرے نزدیک جو اثر تہذیب الاخلاق نے تین برس میں اہلِ پنجاب پر کیا تھا اس لیکچر نے دو تین گھنٹے میں اس کو دو چند کر دیا۔

سید احمد خاں کی تقاریر سے بہت سی ہستیاں متاثر ہوئیں اور اس فن میں ان کا براہِ راست یا بالواسطہ فیض حاصل کیا۔ ان میں ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک، محمد حسین آزاد پھر ان کے بعد مولانا محمد علی، شوکت علی، سید حیدر رمہدی، عطار اللہ شاہ بخاری، شبیر احمد عثمانی، سید سلیمان ندوی، وزیر تعلیم ابوالکلام آزاد اور ذاکر حسین کے نام لیے جا سکتے ہیں اور سر سید کی سادہ پُرجوش انداز میں تقریر کرنے سے مستفید ہو کر روشنی حاصل کرنے والوں کی اب بھی کمی نہیں ہے۔

> اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ایک تعداد کثیر اور اگر کثیر نہیں تو ایک تعداد معقول اپنی قوم کے نوجوانوں کی پیدا کریں جو علم اور قابلیت میں اور ان علوم میں جو اسی زمانے کی حاجتوں کے لیے ضروری ہیں سر برآوردہ ہوں۔ (سر سید)

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

سرسید کا طرزِ ادا

اردو ادب میں سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے صحیح معنوں میں نثر لکھی۔ ان سے پہلے جس چیز کو نثر کہا جاتا تھا وہ نظم سے صرف ان معنوں میں مختلف ہوتی تھی کہ اس میں عروض کی پابندی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ورنہ رنگینی اس میں اس طرح اور اسی قدر ضروری سمجھی جاتی تھی کہ نظم میں سرسید نے بھی شروع میں اس قسم کی نثر لکھی۔ چنانچہ ان کے آثار الصنادید کا رنگ بالکل پرانی نثر کا رنگ اور جدید نظریات کے مطابق نثر کا رنگ نہیں ہے مگر تہذیب الاخلاق سے انھوں نے نہ صرف اپنی نثر نگاری کی ابتدا کی بلکہ اردو نثر نگاری کے لیے ایک صحیح اور سیدھا راستہ کھول دیا۔ اپنے عمل سے انھوں نے یہ واضح کر دیا کہ نثر نگاری کی بنیادی اصول کیا ہونے چاہئیں۔ ان کا کمال اسی امر میں ہے اور اسی کمال کی وجہ سے وہ اردو نثر نگاروں کے سرتاج رہیں گے۔

تہذیب الاخلاق شروع کرنے سے پیشتر ہی ان کو کامل طور پر معلوم ہو چکا تھا کہ نظم اور نثر کے طرز میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ چنانچہ مقاصد اجرائے تہذیب الاخلاق کے سلسلہ میں اسپکٹیٹر اور ایڈیسن کے پرچوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ طرز ادا کے بابت لکھتے ہیں:

"ان پرچوں کے مذاق تحریر اور خیالات کے رنگ ڈھنگ نے بری تحریروں

کے اسباب کو تباہ دیا اور جھوٹی عبارت آرائی اور لغو انشا پردازی کو جو کسبیوں کے بناؤ سنگار کی مانند تھی اور رنڈیوں کے سے طعنے سنے یا لونڈوں کی سی گالم گلوچ کو تحریروں میں تمیز کرنا اور سنجیدہ و متین نکتہ چینی اور تحقیقات کا شوق پیدا کیا۔ ذہانت اور متانت دونوں کو ترقی دی اور تحریر میں مناسبت اور تہذیب کا خیال لوگوں کے دل میں بٹھا دیا۔"

ایڈیسن کی تحریروں سے بالتخصیص طرزِ عبارت بہ نسبت سابق کے بہت زیادہ صاف و شستہ و سلیس اور نہایت دلچسپ ہوگئی اور درحقیقت ایڈیسن کی تحریر سے انگریزی زبان کے علم و انشا میں ایک انقلاب عظیم واقع ہوگیا۔ اس سے واضح ہے کہ وہ جدید نثر نگاری کے راز سے پورے طور پر واقف ہیں۔ وہ سمجھ گئے ہیں کہ نثر میں ذہنی عنصر زیادہ نمایاں ہونا چاہیے لہٰذا نثر کا روزمرہ کی سادہ بات چیت کی زبان سے قریب ہونا بڑا ضروری ہے انھوں نے "تہذیب الاخلاق" کی نثر کو اسی نصب العین پر پورا اتارنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوئے۔ اسی لیے "تہذیب الاخلاق" اردو نثر نگاری کا سنگِ بنیاد ہے۔

سرسید نے خود واضح کر دیا ہے کہ انھوں نے اسٹیل اور ایڈیسن کی پیروی کی ہے۔ ان کا طرز ان انگریزی نثر نگاروں سے کافی حد تک متاثر نظر آتا ہے اسٹیل اور ایڈیسن کا مقصد تھا کہ علم کو کتب خانوں اور عالموں کے بستوں سے نکال کر شاہراہ عام پر لایا جائے۔ اس کام کے لیے عام فہم زبان اختیار کرنا ضروری تھا یہی اسٹیل اور ایڈیسن نے کیا اور یہی سرسید نے بھی۔ مگر ایڈیسن کا جو سب سے خاص طرز تھا اس تک سرسید نہ پہنچ سکے۔ ایڈیسن نے درسِ اخلاق کے لیے یہ طرز ضروری سمجھا کہ وہ اخلاق کو مزاح سے ملائے بداخلاقیوں پر ہنسے ہنسائے اور اس طرح اخلاق کو درست کرے۔ سرسید میں مزاحیہ نگار کی صلاحیتیں کم تھیں اس لیے وہ اس طرز پر نہ چلے لیکن انھوں نے کوشش ضرور کی اور کامیاب بھی ہوئے۔ اس طرز کی مثال، "طریقِ تناول طعام" کا حسب ذیل حصہ ہے۔

"اور اسی ایک دسترخوان پر کوئی توفیرنی کلمہ شہادت کی انگلی سے اور کوئی بغیر چاروں انگلیوں سے چاٹ رہا ہے۔ کوئی پلاؤ اور دہی کا سالن ملا ملا کر

کھا رہا ہے۔ کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھا کر نان آبی سے لتھڑا ہوا پنجہ مبارک پونچھ کر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے۔ کسی نے بورانی کے پیالے کو منہ سے لگا سڑ پا بھرا اور یہ کہہ " واللہ بڑی تیز ہے اور او، کرنا شروع کیا ہے۔ تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا اور چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن کی نکالی ہوئی مکھیاں سب آگے رکھی ہوئی ہیں۔ اس عرصہ میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے اس نے ہاتھ دھونا کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنا اور بیسن سے دانت رگڑنے اور زبان پر دو انگلیاں رگڑ رگڑ کر زبان صاف کرنا شروع کیا ہے اور بے تکلف بیٹھ کر کھانا نوش فرماتے ہیں نہ اس ہاتھ منہ دھونے والوں کو خیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی حرکات ناشائستہ کرتے ہیں اور نہ کھانا کھانے والوں کو ان لوگوں کی یہ آوازیں سننے اور زرد زرد ہلدی کے ملے ہوئے رنگ کا لعاب نکلنے اور بلغم کے لوتھڑے تھوک کر کے چلمچی یا تاش میں تھوک دینے اور بتاشے کی طرح اس کے پانی پر تیرتے پھرنے کی پروا، نعوذ باللہ منہا" یہاں انھوں نے لطیف مزاحیہ انداز میں یہ واضح کر دیا ہے کہ مسلمان کس گھنونے طریقے پر کھانا کھاتے ہیں اور اس طرح وہ ایڈیسن کے طرز کو پورے طور پر برت سکے ہیں۔ مگر اس طرز کے ٹکڑے ان کے یہاں شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ ان کا مخصوص طرز ایڈیسن کے طرز سے مختلف ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایڈیسن کا طرز بالکل اس کا اپنا اور انفرادی ہے انگلستان میں بھی اس کی پیروی کوئی نہ کر سکا۔ ڈاکٹر جانسن نے ایڈیسن کی نقل میں، آئڈلر اور ریمبلر دو پرچے نکالے مگر ایڈیسن کا رنگ نہ پیدا کر سکا کیونکہ وہ مزاجاً زیادہ سنجیدہ تھا۔ سر سید بھی طبیعتاً ایڈیسن کی بجائے ڈاکٹر جانسن سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کے مضامین کا رنگ بھی زیادہ تر سنجیدہ اور فلسفیانہ ہے جس کی وجہ سے ان کو بڑا نثر نگار تو ضرور مانا جاتا ہے اور کم سنجیدہ لوگ ان کے مضامین گہری دلچسپی سے نہیں پڑھ سکتے جس دلچسپی سے ایڈیسن کو پڑھا جاتا ہے۔

مگر یہ امر مسلم ہے کہ سر سید اپنا الگ رنگ رکھتے ہیں۔ ان کی ہستی اور انفرادیت ان کے طرز سے نمایاں ہوئی ہے وہ ایسے حضرات میں سے تھے جن کی فطرت کا جزو اعظم مفکرانہ سنجیدگی ہوتی ہے وہ ہر معاملے پر نہایت خلوص کے ساتھ غور و خوض

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کرتے تھے۔ ان کے رنگ پر اعلیٰ فلسفیانہ تصانیف کی چمک نمایاں ہے۔ ان کے زیادہ تر مضامین فلسفیانہ اور اخلاقی موضوعات پر ہیں ایسے موضوعات جن پر بحث ہو سکتی ہے یا جن کو سمجھانے یا واضح کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بیشتر جگہ پر بحث و مباحثہ ان کے طرز کا جزو اعظم ہے۔ عام طور پر وہ کسی بحث طلب موضوع کو لے کر اس کے سلسلے میں تمام اسباب جمع کر کے نتائج نکالتے ہیں کمال یہ ہے کہ بحث میں اصطلاحیں نہیں آتیں اور زبان نہایت عام فہم اور رواں دواں رہتی ہے۔ اسی طرح اکثر جگہ وہ ایسے موضوع لیتے جن کی وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہایت صاف طریقہ پر وضاحت کرتے ہیں۔ پھر اکثر مضامین میں خیالات Ideas کا تار باندھتے چلے جاتے ہیں۔ ہر خیال گہرے تجربے پر مبنی ہوتا ہے اور کوئی خاص پتے کی بات بتاتی ہوتی ہے۔ ان سب رنگوں سے ان کی نثر میں وہ خاص نثریت پیدا ہو جاتی ہے جو نثر کو نظم سے ممتاز کرتی ہے۔ مگر یہاں ایک اہم مسئلہ بھی سامنے آتا ہے جس کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین خشک ہوتے ہیں اور اگر ان کو بالکل صحیح طریقہ پر ادا کیا جائے تو نثر پر بھی خشکی نمایاں ہو جائے گی اس لیے نثر نگار کے سامنے یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ کیسے وہ خشک خیالات کو دلچسپ بنائے۔ اسے طرز ادا میں کچھ نہ کچھ رنگ ضرور بھرنا پڑتا ہے اور سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ رنگ کس طرح بھرا جائے کہ بناوٹ نمایاں نہ ہو اور موضوع کی وقعت کم نہ ہو۔ یہی ایک بڑا راز ہے جو سچے نثر نگار کو محض منشی سے مختلف کرتا ہے۔ سرسید سچے نثر نگار تھے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ وہ اپنے فلسفیانہ موضوعات کی نہایت لطیف رنگ کے ساتھ وضاحت کرتے ہیں۔ مثلاً انسان کو تعلیم دینا در حقیقت کسی چیز کو باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ اس کے دل کے سوتوں کو کھولنا صرف اندرونی قویٰ کو حرکت میں لانے اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے اور انسان کو تربیت کرنا اسی کے لیے سامان کا مہیا کرنا اور اسی سے کام لینا ہے جیسے جہاز تیار ہونے کے بعد اس پر بوجھ لادنا اور حوض بنانے کے بعد ان میں پانی بھرنا، پس تربیت پانے سے تعلیم کا پانا بھی ضروری نہیں ہے۔ یہاں تشبیہات اور استعارات سے کام لیا گیا ہے مگر اس طریقہ پر کہ ہمارا دھیان موضوع سے ہٹ کر تشبیہ یا

استعارے کو خاص نہیں سمجھنے لگتا۔ ایسے ہی مقامات ہیں جہاں سرسید نثر نگاری کے فرائض سے پورے پورے طور پر عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ یہاں وہ اس امر کی مثال قائم کرتے ہیں کہ نثر میں رنگ آمیزی کی کتنی ضرورت ہوتی ہے اور اتنی رنگ آمیزی وہ کرکے دکھارہے ہیں۔ یہاں انگریزی نثر نگاری کے موجد لارڈ بیکن سے ان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ بیکن کی نثر میں بھی ہمیں صنائع کے استعمال ہی سے ان کی نثر دلچسپ اور دلنشین ہوجاتی ہے جہاں وہ بالکل سادہ اور صاف عبارت لکھتے ہیں وہاں بھی ایک خاص کیفیت میں ہوتی ہے جو بالکل سپاٹ جملوں کو ایک خاص کیفیت میں زندہ کردیتی ہے اور ان کو پڑھنے میں ہمیں ایک خاص کیف محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً غالباً تمام دنیا اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ نیکی بلاشبہ نیک ہے اور اس لیے اس بات کا ماننا بھی لازم آتا ہے کہ ہمیشہ رہنے والی نیکی سب نیکیوں سے افضل و اعلیٰ نیکی ہوگی۔ انسانوں میں نیک وہی ہوگا جس نے ایسی نیکیاں کی ہوں جو سب نیکیوں سے افضل و اعلیٰ ہوں۔ ایسے مقامات پر جملوں میں ایک خاص آہنگ ہوتا ہے جو ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اکثر مقامات پر ان کے رنگ میں تھوڑی خشکی بھی نمایاں ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے غیر تربیت یافتہ ذہن ان کے مضامین کو مشکل اور بے مزہ سمجھنے لگتے ہیں مثلاً رایوں کا بند رہنا خواہ سبب کسی مذہبی خوف کے اور یا گورنمنٹ کے ظلم سے نہایت بری چیز ہے۔ اگر رائے اس قسم کی کوئی چیز ہوتی جس کی قدر و قیمت صرف اسی رائے والے کی ذات ہی سے متعلق اور محصور ہوتی تو رایوں کے بند رہنے سے ایک خاص شخص یا معدودے چند کا نقصان متصور ہوتا مگر رایوں کے بند رہنے سے تمام انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور کل انسان کو نقصان پہنچتا ہے اور نہ صرف موجودہ انسانوں کو بلکہ ان کو بھی جو آئندہ پیدا ہوں گے۔ ایسے مقامات پر ہمیں اپنے ذہن پر زور دینا پڑتا ہے مگر ایسا کرنے سے جو فائدہ ہمیں حاصل ہوتا ہے اس کی کوئی حد نہیں جو لوگ انھیں پر زور دینے سے گھبراتے ہیں وہ ایسے حصول کو بے مزا بتاتے ہیں۔ عام طور پر سرسید کا مخصوص رنگ اسی قسم کے ٹکڑوں میں مثالی بتایا جاتا ہے۔

مگر سرسید کا ایک اور رنگ بھی ہے جو ان کی نثر کو بیک وقت فلسفیوں اور

عام آدمیوں کے لیے یکساں دلچسپ بناتا ہے ہم نے دیکھا کہ وہ ایڈیسن کی نثر سے متاثر ہوئے۔ اس سے انھوں نے سادگی صفائی اور سلاست لی۔ حالانکہ ایڈیسن کے مزاحیہ رنگ سے ان کو خاص مناسبت نہ تھی فطری طور پر وہ بیکن سے قریب آجاتے ہیں اور ہلکے اور مناسب رنگوں کے ساتھ ٹھوس باتوں کو ادا کرنے میں بالکل بیکن کی سی کیفیت پیدا کرتے ہیں مگر بیکن اور ایڈیسن کی نثر میں کچھ خاص کمی ہے جو آگے چل کر لیمب اور ہیزلٹ کی نثر نے پوری کی بیکن کو جذبات سے بالکل تعلق نہ تھا وہ ہر جگہ خشک منطقی کے روپ میں نمایاں ہوتا ہے۔ ایڈیسن بھی جذبات کا قائل نہ تھا وہ اپنا فرض صرف اتنا سمجھتا تھا کہ نفاست کے ساتھ زندگی پر تنقید کو پیش کردے عام طور پر سرسید بھی جذبات سے دور ہی رہتے ہیں۔ مگر حقیقت میں نثر نگار کو جذبات سے بالکل بے تعلق نہیں ہونا چاہیے اور سرسید نے اکثر جگہ جذبات کو بھی نثر میں مناسب جگہ دی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے مضامین، امید کی خوشی سے بہتر مضمون شاید ہی کوئی ہو۔ اردو ادب میں تو اس کا ثانی ملنا مشکل ہے اور ہر طرح پر یہ چارلس لیمب کے بہترین مضمون، ڈریم چلڈرن کا ہم پلہ ہوجاتا ہے اور پورے مضمون پر ایک عجیب جذباتی رنگ طاری ہوجاتا ہے اس پورے کمال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا کوئی حصہ الگ نہیں کیا جاسکتا پھر بھی اس رنگ کی اچھی مثال یہ حصہ ہے۔

"اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید جبکہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات کا آفتاب لب بام ہوتا ہے ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی رنگ فق ہوجاتا ہے۔ منہ پر مردنی چھاجاتی ہے۔ ہوا ہوا میں پانی پانی میں مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے اس وقت اس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے۔ تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی امید ہوتی ہے۔"

اس رنگ میں ایک خاص آہنگ اور ترنم ہے جو نثر کو بھی ایک خاص شاعرانہ اثر عطا کرتا ہے۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ نثر بھی نظم کی ہم پلہ ہو سکتی ہے۔ سرسید کی فطرت میں جو پوشیدہ رومانیت تھی اور جس کو وہ اپنے شعوری کلاسیکی رجحان کی بنا پر قابو میں رکھنا چاہتے تھے۔ یہاں زور کے ساتھ نمایاں ہو کر اردو نثر نگاری میں ایک نیا باب کھولتی ہے۔ وہ محض بنا وٹی یا جذباتیت جو ان سے پہلے اردو نثر نگاروں میں فراوانی کے ساتھ تکلیف دہ حد تک نمایاں نظر آتی ہے۔ یہاں ایک خاص تربیت کے ماتحت ضروری حد تک لطیف طریقہ پر پیش کی گئی ہے اور اس طرح آئندہ نثر نگاروں کے لیے ایک راہ کھلتی ہے۔

مگر سرسید خاص طور پر شاعر نہیں بلکہ مصلح قوم تھے اور نثر نگاری بھی ان کے لیے قومی اصلاح کا ایک خاص ذریعہ تھا۔ تہذیب الاخلاق، اخلاق کی تہذیب کے لیے نکالا گیا تھا اور اس لیے یہ ضروری تھا کہ اس کی نثر میں تبلیغی رنگ نمایاں ہوں۔ تبلیغی نثر اردو میں ان سے پہلے بھی موجود تھی مگر اس کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ثقالت الفاظ کا ایک طومار ہے۔ اکثر مبلغین عربی کے عالم ہوتے تھے اور ان کی اردو بھی اس ساخت کی ہوتی تھی کہ عربی دان بھی نہ سمجھ سکیں پھر طرز ادا کے تیور کچھ ایسے سخت ہوتے تھے کہ اگر کوئی شخص سمجھ بھی جائے تو عمل کی طرف اس آنا مشکل ہوتا تھا۔ تبلیغی رنگ کو ایسے نبھانا کہ قاری کے دل میں بات اتر جائے اور وہ اپنی راہ عمل کو بدلنے کے لیے تیار ہو جائے نثر نگاری کا ایک خاص کمال ہے سرسید بیشتر جگہ اس کمال تک پہنچے نظر آتے ہیں۔ اس رنگ کو انگریزی میں ڈاکٹر جانسن نے بھی کمال کے ساتھ برتا ہے۔ مگر ڈاکٹر جانسن کی بڑے بڑے لاطینی الفاظ سے دلچسپی نے اکثر جگہ اس کے رنگ کو بھاری اور بے مزا بنا دیا ہے۔ برخلاف اس کے سرسید کی تبلیغی نثر خاص نوعیت رکھتی ہے جس کو ان کے معرکۃ الآرا مضمون رسم و رواج سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے برے رسم و رواج کو توڑے۔ اس سلسلہ میں وہ بہت سے مسائل زیر بحث لا کر ان پر عمل کرنے کی صحیح اور قابل عمل رائیں دیتے ہیں۔ مثلاً۔

"اکثروں کا خیال ہے کہ آپس میں اتفاق ہو تو رسموں میں اصلاح و ترقی ہو۔

گویا وہ اصلاح ترقی کو اتفاق پر منحصر رکھتے ہیں۔ مگر میں اس رائے سے بالکل مخالف ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ رسموں کی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف ہے۔ جس شخص کے دل میں اصلاح و ترقی کا خیال ہو اس کو چاہیے کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اس رسم کو توڑے یا اس میں اصلاح و ترقی کرے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام قوم اس کو برا کہے گی اور نکو بنائے گی مگر پھر رفتہ رفتہ لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں گے اور جس طرح کہ وہ اولاً ہدف تیر ملامت ہوا تھا انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصلح قوم شمار کیا جائے گا۔"

ایسے ٹکڑوں کو غور سے پڑھنے پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مبلغ بلا کا فنکار ہے وہ اپنے موضوع کو بحث طلب جملہ سے شروع کرتا ہے اور فوراً زور کے ساتھ اپنی صحیح رائے دینا پھر اس رائے پر عمل کرنے کا وعظ ایسے سیدھے مگر زوردار الفاظ میں کرتا ہے کہ قاری کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور اس کے دل میں خاص قسم کی گرمی پیدا ہوتی ہے اسے یہ محسوس ہوتا ہے سچی راہ سامنے اور اسے اب چل کھڑا ہونا چاہیے۔ سرسید اس پر بس نہیں کرتے بلکہ اس رنگ کو زیادہ گہرا زوردار اور پر اثر بناتے چلتے ہیں اور ایسے الفاظ میں سیدھے سیدھے وعظ پر اتر آتے ہیں۔

"پس میں اپنے عزیز ہم وطنوں سے کہتا ہوں کہ چپکے چپکے اپنے فرقہ کے لوگوں میں بیٹھ کر رسموں کو برا کہنا اور ان کی اصلاح اور درستی کے لیے ساتھیوں کو ڈھونڈنا اور قید سے نکلنے کے لیے قافلہ کی راہ دیکھنا محض بے فائدہ اور سراپا غلطی ہے جو شخص بہادر ہے اور اپنی قوم کا سچا خیر خواہ اس کو خود ان بھاری بیڑیوں کو توڑ کر میدان میں آنا چاہیے تاکہ لوگوں کو بھی اس قید سے نکلنے کی جرأت و ہمت ہو۔"

اس طرح وہ اپنی تبلیغ کا رنگ جماتے چلے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مزید زور کے لیے وہ اہم مصلحین قوم کی زندگی سے مثالیں لیتے ہیں اور ایسے لطیف تخیلی اور جذباتی رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ قاری کی قوت ارادہ بالکل ان کے قابو میں آجاتی ہے اور ان کی بات سے انکار کا سوال ہی نہیں رہتا . . . . . .

مثلاً اوپر اوا کی ہوئی رائے کو وہ یوں طول دیتے ہیں۔

" اگلے اور حال کے زمانہ میں جن لوگوں نے اپنی قوم کی بھلائی چاہی انھوں نے اسی طریقہ پر عمل کیا ہے اور آج تک دنیا میں کوئی مثال ایسی نہیں ہے کہ بغیر اس طریقہ کے کسی دوسرے طریقہ سے قومی ترقی اور بد رسومات کی اصلاح ہوئی ہو۔ دیکھو اس زمانے سے تقریباً ساڑھے اڑتیس سو برس پیشتر 'کلدانیان' میں ایک جوان تھا جس کو ابراہیم کہتے تھے۔ اس نے اپنی قوم کو بت پرستی میں پڑا اور بہت سی بد رسموں میں پھنسا ہوا دیکھا۔ اس کا دل اپنی قوم کی خراب حالت پر جلا خدا نے اس کی مدد کی۔ وہ اپنی قوم کے خلاف کھڑا ہوا۔ تمام قوم نے اس کو لعنت ملامت کی، قتل کرنا چاہا آگ میں ڈالنا چاہا مگر خدا نے اس کو بچایا اور پھر انجام یہ ہوا کہ وہی ابراہیم تمام دنیا کی قوموں کے لیے رحمت ٹھہرا۔"

اس طرح پر ہر اس مضمون میں جس میں مقصد اصلاح ہے وعظ کا نہایت موثر رنگ قائم کیا گیا ہے۔ سرسید کا خلوص اور ان کے کردار کا زور اس رنگ کے کمال کی بنیاد ہے۔

یہ مقولہ کہ طرزِ ادا مصنف کی ہستی کا آئینہ دار ہوتا ہے بہت ہی عام ہوگیا ہے اور طرزِ ادا پر ہر مضمون میں اس کا ذکر ضرور ملتا ہے سرسید کے سلسلہ میں بھی اس کی صداقت کو واضح کیا جاسکتا ہے۔ سرسید کی ہستی ایک پُر خلوص سمجھدار اور صاحبِ عمل مصلح قوم کی ہے۔ ان کے تمام کام اس جہت کے تھے کہ جدید تعلیم یافتہ قوموں کے برابر آ جائیں۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کی طرف ان کی نگاہ گئی اور ہر موضوع پر انھیں فکر کر کے نتائج نکالنا پڑے۔ مسلمانوں کے ادب کی اصلاح بھی ضروری تھی اور اس اصلاح کا سب سے اہم قدم یہ تھا کہ اردو ادب میں نثر کی بنیاد رکھی جائے اور ایسی نثر کو وجود میں لایا جائے جو جدید زندگی کے تمام موضوعات پر خامہ فرسائی کے لیے مفید اور موزوں ثابت ہو۔ اپنے مضمون 'ہماری خدمات' میں سرسید نے واضح کر دیا ہے کہ انھوں نے اردو نثر میں کیا اصلاح کی وہ کہتے ہیں:

" جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ

اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیال سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانہ میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔"

یہاں یہ آخری جملہ خاص توجہ کے قابل ہے۔ طرزِ ادا کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے۔ دوسرے الفاظ میں سب سے زیادہ اہم صفت نثر کی یہ ہے کہ اس میں Appropriateness ہو جذبات رنگینی فلسفہ وعظ و پند ہر چیز کو مناسب مقام دیا جائے۔ اس میں بناو کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ حقیقت کی تمام تر ضرورت ہے۔ سادگی، صفائی اختصار، زور اور رمزیہ پانچ صفتیں جو نثر میں ہونا چاہیے جس قدر ان کا وجود نثر میں ہوگا اتنا ہی نثر کا پایہ بلند ہوگا۔ سرسید کی نثر میں ان صفات کا وجود درجہ کمال تک پہنچا ہوا ہے۔ اس درجہ تک جس کی کیفیت کو اعجاز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جس اعجاز کے پیدا کرنے والے کو Genius کہا جاتا ہے۔ سرسید حقیقت میں نثر نگاری کی جینس لے کر پیدا ہوئے تھے اور یہی نہیں اس کی جینس کا پایہ بھی بلند ہے کہ وہ نثر نگاروں میں ہمیشہ سب سے آگے رہیں گے۔ "ہماری خدمات" میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ ان کی نثر نگاری نے عام نثر نگاری پر کیا اثر ڈالا؟ وہ کہتے ہیں۔

"ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آ گئی ہے اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہے۔ وہ پہلا ناپسند طریقہ ادائے مضمون کا بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے

موٹے لفظوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ بہت کم اخبار ایسے ہوں گے جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ و سلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔"

یہ اثر ان کی طرزِ نگارش کا عام طور پر ہوا۔ مگر یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اثر عارضی تھا۔ سرسید کی نثر ایک دائمی تعمیر کی سنگِ بنیاد ہے اردو نثر کا انھوں نے ایک ایسا ماڈل پیش کیا ہے جو ہمیشہ ایک عینی معیار کی طرح ہر اردو نثر نگار کے سامنے رہے گا۔

•

سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے، لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرّہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمراں ہیں، لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکے۔ بعض بالکل ان کے دامنِ تربیت میں پلے ہیں، بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے۔ بعض نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا۔ تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے۔ (شبلی)

پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

سرسید احمد خاں کی شاعری

سرسید احمد خاں کے چھ فارسی شعر تو بہت مشہور ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب تک فارسی زبان سے ہمارا تھوڑا بہت رشتہ برقرار تھا بہت مشہور تھے۔ ان شعروں کو کسی نے "حرفِ دل" کا نہایت موزوں اور خوبصورت عنوان دیا تھا۔ ان میں سرسیّد کی روح کا اضطراب اور اپنے ایمان کا اعلان ہے، مخالفوں کا جواب ہے، حمد ہے اور نعت۔ چھ شعروں میں سرسیّد نے اپنی ذات کو سمو دیا ہے۔

سرسیّد کی شاعری کو بہت سے نقاد اور سرسید کا مطالعہ کرنے والے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ہمیں اس سلسلہ میں پہلی بات یہ عرض کرنی ہے کہ ایک عہد ساز اور تاریخ کے دھارے کو موڑ دینے والی کسی شخصیت کے کسی پہلو سے سرسری طور پر گزر جانے کا کوئی جواز نہیں، کیونکہ بڑا آدمی ایک سلسلۂ کوہ کی طرح ہوتا ہے اور اس کی ہر چوٹی منظر نامے کی تخلیق میں حصہ لیتی ہے۔

دوسری بات ہم یہ عرض کریں گے کہ سرسید کی شخصیت کے کئی عناصر ایسے ہیں جو شاعری سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی عملی جدّوجہد اور قومی سرگرمیوں نے انھیں شعر و ادب سے دور کر دیا اور وہ شاعری کو زیادہ وقت نہ دے سکے۔ سرسید شدید جذبات کے آدمی تھے اور جذبات کے اظہار کے قائل بھی تھے۔ قوم سے ان کے عشق کا یہ عالم تھا کہ رات کو سوتے میں بھی مسائلِ قوم پر غور کرتے اور گھبرا کر سلسلۂ خواب

منقطع ہو جاتا تو اٹھ کر ٹہلنے لگتے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور سیلاب گریہ مشکل سے رکتا۔ علیگڑھ کے ہر طالب علم سے انھیں ویسی ہی محبت تھی جیسی نام دیوالی وا اپنے پیڑ پودوں سے تھی۔ مالی کے عشق کا ایک نمونہ ہمارے منظور بابا ہیں۔ سرائیکی ملاقے کے یہ نیک نفس مالی ہمارے ہاں جزوقتی کام کرتے ہیں۔ آپ جانیں کراچی میں پانی کتنا بڑا مسئلہ ہے۔ جب دو چار دن ہمارے ہاں پانی نہیں آتا اور ہم انھیں ان پر پانی لگانے یا پودوں کو پانی دینے سے منع کرتے ہیں تو کبھی اداس سے چپ ہو جاتے ہیں، کبھی خوشامد کرنے لگتے ہیں کہ "ایک چھینٹا تو دے لینے دیجئے" اور کبھی لڑنے لگتے ہیں "بے زبانوں پر تو رحم کیجئے۔ آپ کو پتہ ہے کہ میرے یہ پودے سانس لیتے ہیں اور پانی بنا پیاس سے مر جاتے ہیں۔"

سر سید بھی ایسے ہی مالی تھے۔ حیدرآباد دکن گئے تو وہاں اولڈ بوائز کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے "یہی پھول میری زندگی کی بہار ہیں۔ یہی میرے گل و لالہ ہیں اور یہی میری زندگی کی امیدیں ہیں۔"

سر سید کی محبت گہری اور ہمہ گیر تھی۔ وہ اپنے مخالفوں کے غم میں بھی گھلتے کہ خدا انھیں سیدھی راہ دکھائے اور کبھی دشمنوں سے اس درجہ آزردہ ہو جاتے کہ فرانس چل کر ڈوئل لڑنے کی دعوت دیتے۔ ان پر کفر کے فتوے لگائے جاتے تو وہ فتویٰ تلاش اور جمع کرنے والوں سے کہتے کہ میاں حقوق العباد میں گھپلا کر کے کیوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو اور بات کو مذاق میں ٹال دیتے، لیکن اس روش سے وہ اندر ہی اندر بے حد زخمی ہو جاتے اور اس وقت اللہ، رسول اور کتاب پر ایمان انھیں سہارا دیتا۔ اسلام ان کا یونان تھا، جہاں دانشِ افلاطون، ایک بچے کی کچی سوچ سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی اور ان کے دل میں قوم کے درد کا جو درماں تھا اس پر ہر مسیحا کو رشک کرنے کے سوا کوئی چارا نہ تھا۔ یہ درمان، تعلیم اور خدا خوفی تھا۔ ان کا ایمان ایک پیمانۂ عشق تھا، محض فقہی اصولوں کا مجموعہ نہ تھا۔ ان کا سازوسامان وہ قلبِ بریاں تھا جو عشقِ مصطفیٰ میں راکھ ہو کر کیمیا بن گیا تھا اور وہ خدا تھا جو شہ رگ سے قریب تر محسوس ہوتا۔ قرآن حکیم ان کے لیے "گفتارِ معشوق" تھی، اللہ سے قلبِ مصطفیٰ پر نازل ہونے والا صحیفہ... یہاں تو اللہ اور رسول کے درمیان

ــــ ماہی فکر و آگہی ملی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

جبریل امین بھی انھیں حجاب نظر آتے۔ (اس کے شاعرانہ پہلو پر غور کیجئے، ایمانیات کا مسئلہ نہ بنائیے) یہ تو شاعری کے پیرائے ہیں سرسید کی گفتگو اپنے آپ سے اور اپنے معترضین سے تھی۔ پانچواں شعر شاعرانہ ہے جس میں تعلی بھی ہے اور تخیل کی جلوہ گری بھی۔ اپنی تمام شان و شوکت کے باوجود آسمان صرف ایک مطلع خورشید رکھتا ہے لیکن میرے گریبان میں ہزاروں مطلع ہیں کتنے ہی خورشید یہاں سے ابھرتے ہیں۔ میرے ذہن میں تو ناسخ کا مشہور مطلع ابھرنے لگتا ہے۔ اور آخری شعر میں تو سرسید نے اپنے ایمان اور واعظ کے ایمان کا تقابل کیا ہے، مگر وہ نہ تو اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار سمجھتے تھے اور نہ واعظ کی تکفیر ان کا مقصد تھی اسی لیے ایمان کی جگہ انھوں نے برہان کے لفظ کے ذریعہ اپنا اظہار کیا ہے۔ واسطے کے راستے میں تو برہان سے ایمان تک ہزاروں پتھر اور رکاوٹیں ہیں۔ تشکیک کی گھاٹیاں اور دلائل کی خندقیں ہیں، مگر سید کا ایمان تو ایک ہی برہان اور دلیل رکھتا ہے برہان عشق۔

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم — مسیحا رشک می آرد ز درمانے کہ من دارم
ز کفر من چہ می خواہی، ز ایمانم چہ می پرسی — ہماں یک جرعۂ عشق ست، ایمانے کہ من دارم
ہماں یک جرعۂ عشق است ایمانے کہ من دارم — نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
نہ جبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم — ہمہ گفتار معشوق ست قرآنے کہ من دارم
فلک یک مطلع خورشید دارد با ہمہ شوکت — ہزاراں مطلع ہا دارد گریبانے کہ من دارم
ز برہاں تا بہ ایماں سنگ ہا دارد رہ واعظ — نہ دارد ہیچ واعظ، ہم چو برہانے کہ من دارم

سرسید کے یہ اشعار محض کلام منظوم کے دائرے میں نہیں آتے، بلکہ اچھی شاعری کے بیشتر تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ یہ شاعری ہے صرف نہیں ہے۔ ویسے ہمارے بزرگوں نے شاعری کی تعریف یہی بیان کیا ہے کہ "وہ کلام بالقصد موزوں کیا جائے"۔ شاعری میں شاعر کے قصد سے راقم الحروف کو انکار نہیں مگر اس کا خیال ہے کہ ایسا کلام موزوں کاریگری کے ذیل میں آتا ہے۔

کاریگرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے کلام میں لیکن اثر بھی ہے

سرسید کے ہاں قصد کے ساتھ جذبہ بھی موجود ہے۔ جہاں تک میں نے

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

تخلیقی طریقہ کار پر جو غور کیا ہے اس کے نتیجے میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ کوئی جذبہ یا خیال جو شاعر کے دل و دماغ میں پلتا رہتا ہے اور گردش کرتا ہے مناسب وقت پر اس کا اظہار ڈھلے ڈھلائے شعر کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کا انداز شعر کے الفاظ، برجستگی، قوت اور نشست الفاظ سے ہوتا ہے۔

سرسید کی شاعری کے پس منظر اور محرکات کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس عہد میں شاعری آداب مجلسی میں تھی۔ جو لوگ فطری شاعر نہیں بھی تھے وہ بھی معاشرے میں شاعری کے عام رواج اور قبول کی وجہ سے علم عروض سیکھتے اور شعر کہتے۔ شاعری زندگی کے آداب اور شرائط میں شامل تھی۔ شادی کے موقع پر سہرے لکھے اور پڑھے جاتے، بچوں کی پیدائش، لوگوں کی وفات، کتابوں کی اشاعت پر قطعہ ہائے تاریخ لکھے جاتے یوں شاعری کے ساتھ تاریخ گوئی بھی زندہ تھی۔ پھر جلسوں، انجمنوں کے یوم ہائے تعلیمی اور دوسرے اداروں کی تقاریب پر نظمیں پڑھی جاتیں۔ آج ہمارے دور میں ان کی جگہ لوگوں کے ساتھ شاموں نے لے لی ہیں یا استقبالیوں نے۔ سرسید نے کتنی ہی انجمنوں کی بنیاد رکھی، کتنے ہی جلسے کیے وہ خوش نصیب تھے کہ حالی اور شبلی جیسے شاعر ان کے جلسوں میں نظمیں پڑھتے۔ ڈپٹی نذیر احمد بھی نظم خوانی میں کسی سے پیچھے نہیں تھے اور اس احساس اور شعور کے باوجود:

تم اپنی نثر کو لو، نظم کو چھوڑو نذیر احمد
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

لیکن ایسے بہت سے موقعے آئے جب سرسید کو خود کسی کے استقبال کے موقع پر "خوش آمدیدی اشعار" پڑھنے پڑے۔

سر ٹامس مٹکاف کی آمد پر سرسید نے فارسی میں ایک مثنوی پڑھی۔ مثنوی کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ قصیدے کی سی مدح کے باوجود اشعار میں فنی محاسن موجود ہیں۔

ممدوح زمانہ راستایم
صد دفتر کے صفِ او کشایم

۳۰ نومبر ۱۸۶۴ء کو لیفٹننٹ گورنر مسٹر ڈرمینڈ نے سائنٹی فک سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا۔ ان کی آمد پر سرسید نے جو اشعار پڑھے ان میں سے چند درج کیے جاتے ہیں۔

ہم غریبوں کی یہ قسمت ہے کہ آپ آئے یہاں — ورنہ شاہوں کو گداؤں سے کوئی ہے التیام
آپ کی بندہ نوازی کی ہوئی دولت نصیب — آپ کے تشریف لانے سے ہوئی عزت تمام
آپ کے تشریف لانے سے ہوئی ہمت قوی — ورنہ ہم کیا ہیں کہ ہو ہم سے کوئی کام انصرام
اب دعا ہے یہ کہ الطاف آپ کا دائم رہے — جب تک باقی رہے دنیا میں نشانِ صبح و شام

سرسید کے ساتھ قومی کاموں میں جس نے بھی تعاون کیا، سرسید نے اس کے سلسلے میں احسان مندی کا اظہار کیا، ورنہ بقول شبلی۔

روشِ سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی

ان اشعار میں بیشک مبالغہ ہے سید کے ہم عصروں میں ذوق جیسا قصیدہ گو موجود تھا۔ دربار ظفر میں انھوں نے بہت سے قصیدے سنے ہوں گے۔ اس روایت سے بالکل بے تعلق ہونا مشکل تھا، مگر سید کو یہ اطمینانِ قلب حاصل تھا کہ وہ یہ سب کچھ لوگوں کی خدمت کے لیے کر رہے ہیں، ورنہ ان میں اتنی غیرت تھی کہ وہ ان انگریز افسروں سے نہیں ملتے تھے جو ہندوستانیوں کو ذلت کی نظر دیکھتے۔ علیگڑھ کے ایک انگریز کلکٹر سے سرسید ملے تک نہیں میں نے اپنے انتخاب سرسید میں سید والا گہر کی بعض واقعات کے بارے میں اشارے موجود ہیں۔ بنارس کے دربار کی تیاریوں میں وہ پیش پیش تھے، مگر جب ان کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ انگریز اور ہندوستانی افسروں کی نشستوں میں امتیاز برتا گیا تو سرسید نے اس تفریق کو مٹانے کی کوشش کی اور جب انتظامیہ نے اس نکتہ انصاف کو نہ سمجھا تو سرسید حکام بالا سے اجازت لیے بغیر بنارس سے علیگڑھ کے لیے روانہ ہو گئے اور اپنا طلائی تمغہ بھی نہیں لیا۔

شاعری سرسید کے لیے وقت گزاری کا ایک مشغلہ بھی تھی۔ سرسید جب کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کے لیے ایک وفد لے کر سنہ ۱۸۹۱ء میں بھوپال اور حیدرآباد دکن گئے تو شاہ جہاں بیگم والیہ بھوپال نے بارہ ہزار روپے دیے۔ اس موقع پر سرسید نے ان کی خدمت میں مدحیہ اشعار پیش کئے۔ یہ اشعار فارسی میں تھے۔ دو شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

اے شاہ جہاں، باد جہاں حسب مراتب — دارائے جہاں، یاورِ افلاک غلامت
ہم حکم تو نافذ، بہ دلِ خلق جہاں باد — ہم نظمِ جہاں باد، بہ عنوانِ نظامت

اس رسمی اور مدحیہ شاعری کے علاوہ سرسید نے دوستوں کے لیے شعر کہے کتابوں کی اشاعت کی تاریخ نکالی اور ایسے شعر بھی لکھے جو ان کی زندگی سے متعلق ہیں، یا ایسے لمحوں کی یادگار ہیں جب انھوں نے اپنی مصروفیات کی تھکن کو دور کرنے کے لیے شعر کی لطافت اور تخیل کے اظہار کو دوا کے طور پر استعمال کیا۔ کبھی کبھی ہلکے پھلکے شعر کہہ کر زندگی کی کلفتوں کو سہل بنایا۔

بتوں پر دل و دیں فدا کر رہے ہیں
بنارس میں یادِ خدا کر رہے ہیں

یوں شاعری ان کے لیے وقت گزاری کا مشغلہ بھی تھی۔ سرسید تھے تو دلّی کے مگر لکھنؤ کی شعری رعایتیں انھیں ناپسند نہیں تھیں، اسی شعر کو دیکھیے، بنارس کی نسبت سے بتوں کا تذکرہ، پھر ان پر دین کو فدا کرنا . . . اور یہ تو وہ بت تھے کہ یادِ خدا کا سبب بنتے تھے۔ نواب محسن الملک کو یہ شعر لکھ بھیجا جس سے خطاب اپنی ذات سے ہے۔ اس شعر کے پس منظر سے پوری طرح واقف نہ ہونے کے بعد دوستی کی شدت اور تکلفات کے حجاب سے نکل آنے کی خواہش کا احساس قاری کو پوری طرح ہو جاتا ہے۔

میانِ احمد و مہدی نہ بود ہیچ حجاب
تو خود حجابِ خودی، احمد، زمیاں برخیز

بعض شعروں میں سرسید نے اپنی زندگی کے پس منظر، کرداروں اور واقعات پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

بہ مکتب رفتم و آمد ختم، اسرارِ یزدانی
ز فیضِ نقش بندِ وقت، جانِ جانِ جانانی

حضرت شاہ غلام علی نے سرسید کا نام رکھا تھا، ان کے کانوں میں اذان بھی دی تھی اور ان کی بسم اللہ پڑھائی تھی، جس کے بعد وہ مکتب میں باقاعدہ بٹھلائے گئے اس شعر میں "نقش بندِ وقت" حضرت شاہ صاحب کو کہا ہے اور میرزا مظہر جانِ جاناں کے خلیفہ بھی تھے۔

تذکرہ صابر کی تاریخ بھی سرسید نے خوب نکالی اور اسے "ذکر یارانِ ہمدم"

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

قرار دیا۔

کلکِ صابر نگاشت تذکرہ — کہ از و خوب تر بہ دہر ، ہجو
سالِ تاریخ ختم او آہی — ذکرِ یارانِ ہمدم ست بگو

آہی سرسید کا تخلص تھا اور اس کا ذکر ہمیں ان کے حالات[۱۴] میں ملتا ہے۔

اردو میں سرسید نے کم شعر کہے ہیں ان کی ایک خاص طویل اردو مناجات، راہِ سنت در راہِ بدعت کے آغاز میں موجود ہے۔

اس تحریر کے آخر میں سرسید کے دو ایسے فارسی شعر پیش کیے جارہے ہیں جن پر غالب کے بعد کا کوئی بھی فارسی شاعر فخر کر سکتا ہے۔

تابِ یک جلوہ نیاورد، نہ موسیٰ نہ طور — ایں دلم ہست کہ زیں گونہ ہزاراں دیدست
تاک زبالیدگی میکدہ بنیاد کرد — ساقی کا از نشاط جام بکف در گرفت

سرسید زبان کے مزاج داں تھے، فارسی ان کی گرفت مضبوط تھی، شاعرانہ روایات کی گہرائیوں سے آگاہ تھے۔ ان کی شاعری ان کی ذات کا ایسا پہلو ہے جو ان کی تفہیم میں مدد دیتا ہے۔

مسدس "حالی مد و جزرِ اسلام" کی تخلیق ہوئی جسے سرسید نے فنِ شاعری کی تاریخ کا سنگ میل قرار دیا اور جس طرح اس نظم کی داد انھوں نے دی، اس سے بہتر داد دینا شاید ممکن بھی نہیں تھا۔ انھوں نے حالی کو خط میں لکھا:

"بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں ان اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔ (سرسید)

محمد ظفر محفوظ نعمانی

سر سیّد
بحیثیت ایک صحافی

سر سیّد کی حیثیت ایک ادارے سے کم نہ تھی۔ انھوں نے اپنے دَور کے تمام شعبوں پر ذمہ دارانہ نظر ڈالی۔ ان کی ادبی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ تاریخ، سیاست، آثار قدیمہ، صحافت، ادب، مذہب اور سائنس وغیرہ علوم پر اپنے کارنامے دکھائے۔ جس موضوع کو انھوں نے لیا اس کا نہ صرف یہ کہ حق ادا کر دیا بلکہ سرگرم کارکنوں کی جماعت بھی تیار کر دی جنھوں نے ایک طرزِ فکر اور دبستان کی طرح ڈالی۔[1] سرِ دست ایک صحافی کے حوالے ان کی شخصیت کا مطالبہ بین السطور کا مقصود ہے۔

سر سیّد کا دور اردو نثر کا دورِ زرّیں کہا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ نہ صرف انشا پردازی اور علمی نثر نے فروغ پایا بلکہ اردو ادب عصری اور مغربی صحافتی اصولوں سے روشناس ہوا۔ اس قندیل نے مستقبل کی بہت ساری شمعوں کو روشن کیا۔ اس تناظر میں وحید الدین سلیم کے مسلم گزٹ، ظفر علی خاں کے زمیندار، مولانا محمد علی جوہر کے ہمدرد، اور مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال جیسے صحافتی جواہر پارے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ناچیز کی رائے میں گاندھی جی نے جو صحافت شروع کی تھی اس کا پیش خیمہ بھی سر سیّد کی صحافت ہے، اس لیے کہ دونوں ایک ہی ضرورت اور ایک ہی مقصد کے لیے جاری ہوتے۔ گاندھی جی نے جب یہ دیکھا کہ جلیان والا باغ

کے بعد تشدد اور انتشار جاری ہی نہیں ہے بلکہ بڑھ رہا ہے تو انھوں نے عوام الناس
سے بالواسطہ ربط پیدا کرنے کے لیے ہفتہ وار ینگ انڈیا انگریزی میں اور
نیو جیون گجراتی میں جاری کیے۔[۲]

The general awarening and unrest not only continued but was further aggravated by the Jallianwala Bagh massacre at Amritsar To establish direct contact with the masses, Gandhiji started two weeklies, young India in English and Nawjivan in Gujrat

سرسید کے صحافتی کیریئر کی ابتدا ان کے بڑے بھائی سید محمد کے "سید الاخبار"
سے ہوتی ہے۔ اسی اخبار سے سرسید کی قلمی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔[۳] پروفیسر خلیق احمد
نظامی کے مطابق یہ اخبار ۱۸۳۷ء میں دلی سے جاری ہوا۔[۴] اس کی تاریخ کے
بارے میں اختلاف بھی ہے۔[۵]

سرسید کا تعارف ایک صحافی کی حیثیت سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی
کے حوالے سے ہوا جو ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو علیگڑھ سے جاری ہوا اس اخبار
کا اختصاص یہ تھا کہ دو لسانی تھا۔ اس اخبار کے توسط
سے سرسید احمد خاں انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان جو شکوک اور تعصبات
جگہ پا گئے تھے اسے دور کرنا چاہتے تھے تاکہ افہام و تفہیم کرکے راہ ہموار ہو
اور ترسیلی خلا (Communication Gap) دور ہو سکے۔

اصغر عباس صاحب لکھتے ہیں:

"اس اخبار کے دو کالم رکھے گئے ایک انگریزی میں دوسرا اردو میں ہوتا تھا
اس کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ اس کے ذریعہ ہندوستانی اور انگریز ایک دوسرے
کے خیالات کو سمجھیں اور باہم ارتباط پیدا ہو۔"[۶]

سرسید اپنے دو لسانی اخبار کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے خود اپنے
ایک اداریے میں لکھتے ہیں:

جو تعصبات کہ آپس کی محبت اور ارتباط کے مخل ہوتے ہیں ان کو دور کرے
اور ان کے دلوں میں ایسا عمدہ اثر پیدا کرے کہ وہ تمام قوم جسمانی بلکہ روحانی بھلائی

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

وبہبودی کے بڑے بڑے کاموں میں اپنے آپ کو بھائی بھائی سمجھیں۔[۸]

سرسید اپنے دور کے عصری تقاضوں سے کما حقہٗ واقف تھے انھوں نے اپنے دور کی کم مایہ صحافت کو اپنے خلوص وعمل سے گراں بنا دیا۔ سرسید جب صحافتی کوچے میں داخل ہوئے تو انھوں نے اردو صحافت کو زیادہ معقولیت سے سمجھا۔ انھوں نے گزٹ کے ذریعہ اس عہد کے اضطراب کی عکاسی کی اور اس کے ذریعہ انھوں نے ایک نئے اضطراب کو جنم دیا جو شعوری بھی تھا اور منظم بھی۔ اردو صحافت کو عصری اور مغربی صحافتی اصولوں سے مزین کیا لیکن سرسید کی اس کوشش کو ہم نری تقلید یا نقالی سے تعبیر نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ان کی نقالی تنقیدی اور تخلیقی شعور سے خالی نہ تھی بلکہ اس اخبار کو بین الاقوامی سنجیدہ اخبارات کی صف میں کھڑا کرنے کے لیے شروع ہی سے گزٹ نے "لندن نیوز"، "اور لینڈ میل"، "انگلش میل" اور "ریڈ ہزاریویو" جیسے سنجیدہ اخبارات کا شعار اختیار کیا یہی سبب ہے کہ خبروں، اس کے اداریوں اور تبصروں پر انگریزی صحافت کے اثرات واضح طور پر نمایاں ہیں۔[۹]

مختلف النوع سرگرمیوں اور ملازمت کی مصروفیت ان کی صحافتی زندگی میں آڑے رہی۔ اس لیے وہ اس ترتیب کا کام دوسرے معاونین کے سپرد کردیا کرتے تھے۔ ان معاونین میں محمد یار خاں، مولوی محمد اسماعیل اور مولوی سمیع اللہ خاں جیسے باصلاحیت لوگ تھے، جنھوں نے گزٹ کو معتبر بنانے میں نمایاں رول ادا کیا۔ سرسید احمد خاں اخبار کو عوام ان اس کے خیالات کا ترجمان بنانا چاہتے تھے وہ پریس کی آزادی کے خواہاں تھے انھوں نے رائے عامہ کی تشہیر کی زیادہ سے زیادہ کوششیں کیں۔ اپنے اس موقف کا اظہار ایک اداریے میں اس طرح کرتے ہیں۔

"سب سے پہلے اوّل شرط یہ ہے کہ گورنمنٹ چھاپے خانوں میں یعنی اخباروں کی آزادی کو ملک کے اصول حکمرانی میں تسلیم کرے اور جو مزاحمتیں اخبار کی آزادی کے خلاف ہوں ان کو ناجائز سمجھے۔"[۱۰]

جب سرسید احمد خاں لندن چلے گئے تو سین ٹیفک سوسائٹی کے سکریٹری

راجہ جے کشن داس بنا دیے گئے تھے تنبیہ کے طور پر ایک مکتوب میں سرسید احمد خاں ان کو لکھتے ہیں۔

"اپنی سوسائٹی اور اخبار کی آزادی کو ہرگز ہاتھ سے جانے مت دینا۔"[۱۱]

گزٹ اپنے دور کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس دور کی نہایت سچی، واضح اور روشن تصویر ملتی ہے اس دور کے سماج کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کے بارے میں گزٹ نے رہنمائی نہ کی ہو۔[۱۲] اس اخبار میں شہری آبادی کے مسائل ہو یا دنیائے اسلام کی سیاست، حکومت کی پالیسیاں، جنگ و جدل کے واقعات کا ذکر ہوتا تھا، سرسید چونکہ بنیادی طور پر ایک مصلح قوم تھے اسی لیے اپنی تحریروں اور سفارشات سے اصلاح کا کام لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے دور کے ہندوستان کی تمام سماجی، سیاسی اور معاشی خرابیوں کا علاج تعلیم میں پایا۔ انھیں یقین تھا کہ اگر لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی۔[۱۳] انھوں نے پٹنہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"It is categorical verdict of All Nation & great seers of World that national progress depends on education and training'

پروفیسر اصغر عباس اس سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کہ گزٹ میں اولین اہمیت تعلیم کو دی جاتی تھی۔[۱۴] سرسید نے اس اخبار سے بہت حد تک یہ مقصد پورا کیا۔ چنانچہ دس سال بعد اس کی تحریروں کے ذریعہ جو علمی بیداری آئی اس کے بارے میں سرسید خود اپنے ایک اداریے میں رقمطراز ہیں:

"ایک وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کے باشندے سفر کو جانتے بھی نہ تھے اور اس کو نہایت خراب چیز سمجھتے تھے اور اب یہ زمانہ ہے کہ ہر سال ہمارے کان میں ایک نامور رئیس کے لندن اور فرانس اور روم جانے کی خبر سنی جاتی ہے۔"[۱۵]

اس کا یہ مطلب نہیں کہ گزٹ میں دوسرے پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی جاتی تھی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیائے اسلام کی سیاست سے ہندوستانی مسلمانوں نے پہلی بار گزٹ ہی کے توسط سے دلچسپی لی۔ دنیائے اسلام کی سیاست سے دلچسپی کا یہی بیج تھا جو مولانا محمد علی جوہر کے "ہمدرد"، اور مولانا آزاد کے "الہلال" اور

مولانا ظفر علی خاں کے "زمیندار" میں ایک بار آور درخت بن کر نمودار ہوا[۱]
فن اداریہ نویسی میں گزٹ کے قابلِ قدر کارنامے ہیں۔ اردو صحافت میں گزٹ سے قبل کسی اہم مسئلہ پر اداریہ لکھنے کا رواج بہت کم تھا۔ اس سلسلے میں کسی فنی التزام کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا تھا۔ اس کے پیشِ نظر گزٹ میں ہر اہم مسئلے پر نہایت باقاعدگی سے اداریے لکھے گئے اور اداریہ نگاری کی اعلیٰ ذمہ داریوں کے احساس سے غفلت کبھی نہیں برتی گئی[۲]۔ گزٹ کے اسلوبِ نگارش اور اداریہ نویسی پر تبصرہ کرتے ہوئے حالی نے لکھا ہے:

"جو صفائی، تہذیب اور شائستگی اور گھلاوٹ آج عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے اور جس قدر آرٹیکل نگاری کا سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے اور جہاں تک اہلِ قلم میں ہر قسم کے معاملات پر آزادانہ رائے زنی اور نکتہ چینی کا حوصلہ پیدا ہوا ہے اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ سب اسی (سرسید) کے قلم کی بازگشت ہے"[۳]

ایک صحافی کی حیثیت سے سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردو نثر کے فروغ کو اولین اہمیت دی۔ اردو زبان کو شعری حصار سے نکال کر علمی نثر سے قریب کیا جو اس دَور کے مطابق ایک ترقی پسندانہ قدم تھا۔ وہ اردو زبان کو مقصدیت اور افادیت سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔ یہ کافی حیرت کی بات ہے کہ اجرائے گزٹ ۱۸۶۶ء سے لے کر ۱۸۹۷ء تک اس میں مشکل سے دس پندرہ نظمیں ملتی ہیں اور وہ نظمیں بھی مقصدی تھیں۔ اس سے یہ مراد لینا غلط ہوگا کہ وہ شاعری سے متنفر تھے بلکہ وہ تو مقصدی ادب کے خواہاں تھے۔
اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو نثر اور صحافت کی تاریخ میں سرسید کی صحافتی کدّ و کاوش ایک ورثے سے کم نہیں یہی وجہ ہے کہ یہ اخبار اپنے زمانے میں ایک مرکزِ ثقل بن گیا اور بعد کے مستند صحافیوں نے اس کی اتباع کی۔

حوالہ جات

۱۔ سید احمد خاں، پروفیسر خلیق احمد نظامی پبلیکیشنز ڈویژن نئی دہلی ۱۹۷۱ء ص ۱۴
۲۔ گزٹ میں ایڈوین آف انڈیا پبلیکیشنز ڈویژن نئی دہلی ۱۹۷۲ء ص ۱۸
۳۔ فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۳؎ سرسید کی صحافت، ڈاکٹر اصغر عباس انجمن ترقی اردو نئی دہلی ۱۹۷۵ء ص ۱۹۵

۴؎ سید احمد خان پروفیسر خلیق انجم نظامی پبلیکیشن ڈویژن نئی دہلی ۱۹۷۱ء ص ۸۵؛

۵؎ ڈاکٹر قادر علی خاں کے تحقیق کے مطابق سید الاخبار کا سنہ اجرا ۱۸۴۱ء دیکھئے ار دو صحافت کی تاریخ (۱۸۵۷ء ۲۳۔۱۸۔۱۹۸۷ء) ص ۱۲۷

۶؎ سرسید کی صحافت، ڈاکٹر اصغر عباس، انجمن ترقی اردو نئی دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۲۳۰

۷؎ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ، ۱۹ اپریل ۱۸۶۷ء

۸؎ سرسید کی صحافت، ڈاکٹر اصغر عباس، انجمن ترقی اردو نئی دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۲۲۹

۹؎ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ، ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء

۱۰؎ مکاتیب سرسید احمد خاں، مرتبہ مشتاق حسین ص ۴۶

۱۱؎ سرسید کی صحافت ڈاکٹر اصغر عباس، انجمن ترقی اردو نئی دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۲۳۱

۱۲؎ سرسید احمد خاں پروفیسر خلیق احمد نظامی پبلیکیشنز ڈویژن نئی دہلی ۱۹۷۱ء، ص ۶۹

۱۳؎ پٹنہ کی ایک تقریر ۲۶ مئی ۱۸۷۳ء۔ بحوالہ بکس لائٹ۔ مشتاق علی قریشی ۱۹۸۵ء علیگڑھ ص ۱۹

۱۴؎ سرسید کی صحافت، ڈاکٹر اصغر عباس، انجمن ترقی اردو نئی دہلی ص ۲۳۱

۱۵؎

۱۶؎ سرسید کی صحافت، ڈاکٹر اصغر عباس انجمن ترقی اردو نئی دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۲۳۳

۱۷؎ ایضاً 〃 ، 〃 〃 ص ۲۴۰

۱۸؎ سرسید کی صحافت ڈاکٹر اصغر عباس انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی ۱۹۷۳ء ص ۱۴۴ء

ان دنوں ذرا میرے دل کو سوزش ہے ولیم میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں بھیک مانگنے کے قابل ہو جاؤں تو بلا سے۔ (خط بنام محسن الملک لندن [illegible])

(سرسید)

شہاب الدین ثاقب

سیّد کی کانفرنس

سرسیّد کی تعلیمی خدمات صرف ایم اے او کالج کے قیام تک ہی محدود نہیں ہیں۔ سرکاری ملازمت کے زمانے میں انھوں نے پہلا مدرسہ مرادآباد میں ۱۸۵۹ء میں قائم کیا جہاں اس سے قبل کوئی مدرسہ نہیں تھا۔ دوسرا مدرسہ انھوں نے غازی پور میں ۱۸۶۴ء میں قائم کیا جس میں اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا۔ اس سے پہلے سرسیّد نے ورنیکلر (Vernacular) اسکولوں پر سخت اعتراض کیا تھا اور سرکار کو مشورہ دیا تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا انتظام کرے لیکن ۱۸۶۷ء میں انھوں نے ورنیکلر یونیورسٹی کی تجویز صرف اس خیال سے گورنمنٹ میں پیش کی تھی کہ انگریزی علوم و فنون دیسی زبان کے ذریعے سے بکثرتِ عام ہندوستانیوں میں پھیلائے جائیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایم اے او کالج کے قیام سے قبل تعلیم کو ملک گیر سطح پر پھیلا دینے کا منصوبہ سرسیّد کے ذہن میں یقیناً موجود تھا۔ وہ قومی تعلیم کا ایک واضح تصور بھی رکھتے تھے جو زمانے کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ تھا مگر جن حالات میں ایم۔ اے او کالج کا قیام عمل میں آیا تھا وہ ایسے نہ تھے کہ صرف ایک کالج سے کام چل جاتا اور خود یہ کالج بھی شبِ تاریک میں اس تنہا چراغ کی مانند تھا جسے کئی طرف کی آندھیوں کا سامنا تھا۔

ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اس وقت تک سر سید ایک سیاسی مدبّر اور دور اندیش رہنما کی حیثیت سے
بھی اہم خدمات انجام دے چکے تھے یعنی "اسباب بغاوت ہند" لکھ چکے تھے،
برٹش انڈین ایسوسی ایشن (British Indian Association) قائم کر چکے
تھے، گزٹ کے ذریعہ سے سیاسی معاملات پر رائے عامّہ کو بیدار کرنے کا فریضہ
بھی انجام دیا تھا اور آزادیٔ رائے کی اہمیت، بالخصوص پریس کی آزادی سے متعلق
اپنے خیالات کا واضح طور پر اظہار کر چکے تھے، اور یہ سارے کام انھوں نے انڈین
نیشنل کانگریس (Indian National Congress) کے قیام یعنی ۱۸۸۵ء سے
بہت پہلے ہی انجام دیے تھے۔ نیشنل کانگریس کے بانی اے او ہیوم
(Allen Octavain Hume) کا یہ اعتراف بھی غور طلب ہے کہ:

"سب سے پہلی چیز جس نے نیشنل کانگریس کی قسم کی تحریک کے جاری کرنے
کا خیال میرے دماغ میں پیدا کیا وہ خود سر سید کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" تھی"

بعد میں مولانا محمد علی جوہر نے بھی سر سید کے اس پہلو کی جانب اشارہ کیا:

سکھایا تھا تم ہی نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

لیکن اس زمانے کے حالات کے اعتبار سے سر سید کا یہ نقطۂ نظر بالکل درست
تھا کہ:

"جن لوگوں کا خیال ہے کہ پولیٹکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی
ہو گی، میں اس سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ میں تعلیم اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی
کا سمجھتا ہوں۔ ہماری قوم کو اس وقت بجز قومی تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے
کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہماری قوم میں تعلیم کی کافی ترقی ہو جائے گی تو ہم کو دیگر
ذریعہ تنزل کی حالت سے نکلنے کا ہوگا . . . ."

سر سید کا یہ خیال بھی صحیح تھا کہ ایم اے او کالج تمام ہندوستانی مسلمانوں
کی تعلیمی ضرورت کے لیے کافی نہیں ہو سکتا اور کالج کو بھی یہ مسئلہ درپیش تھا کہ طلبا
خواہ طالب علم کہاں سے فراہم ہو سکیں گے؟ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ ایک مشترکہ لائحۂ عمل
کے تحت ملک گیر پیمانے پر ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی تحریک پیدا کی جائے

۱۔ فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اس خیال کو عملی شکل دینا اس لیے بھی اور ضروری ہو گیا کہ حکومت کی جانب سے ۱۸۸۲ء میں ڈاکٹر ہنٹر کی صدارت میں ایک تعلیمی کمیشن قائم ہوا اور ہنٹر کمیشن کی سفارشات کے بعد تمام صوبوں سے جب مسلمانوں کی تعلیمی کیفیت سے متعلق رپورٹیں طلب کی گئیں تو صوبائی حکومتوں نے عام طور سے اپنی رپورٹوں میں یہی لکھا کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے ہیں۔ چنانچہ جولائی ۱۸۸۵ء میں حکومت نے یہ واضح کر دیا کہ:

"سرکاری ملازمتوں میں مسلمان اپنا حصہ پانے کے اسی وقت مستحق ہو سکتے ہیں جب کہ وہ اعلیٰ تعلیم میں ہندوؤں کے برابر چلیں۔"

ایسی صورت میں مسلمانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ یکسوئی کے ساتھ منظم طور پر تعلیم کے میدان میں اتر جائیں اور اسی تقاضے کے تحت سرسید نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس قائم کی لیکن اس سے ایک سال قبل انڈین نیشنل کانگریس قائم ہو چکی تھی جس سے سرسید کو یہ اندیشہ ہوا کہ مسلمان اس سیاسی دھارے میں شامل ہو کر تعلیمی جدوجہد کا حق ادا نہ کر سکیں گے۔ ۱۸۵۷ء کی رستخیز کے نتیجے میں مسلمانوں کی تباہی کا عبرت ناک پہلو بھی سرسید کے سامنے تھا جس کے پیش نظر مسلمانوں کی بقا کے لیے حکومتِ وقت سے مفاہمت بھی ضروری سمجھی گئی تھی۔ چنانچہ سرسید نے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ یکسوئی کے ساتھ ان کی تعلیمی تحریک کا ساتھ دیں اور انڈین نیشنل کانگریس کی سرگرمیوں میں حصہ نہ لیں۔ سرسید کے اس طرزِ عمل پر اس زمانے سے لے کر آج تک جن لوگوں نے سوالیہ نشان قائم کیے انھیں چاہیے تھا کہ حالات کا غیر جانبداری سے تجزیہ کر کے صحیح تناظر میں اپنی رائے قائم کرتے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے اس زمانے میں بہت سے ہندو اکابرین بھی نیشنل کانگریس کو ہندوستانیوں کے لیے مضر خیال کرتے ہوئے اس کی مخالفت پر کمربستہ تھے راجہ شیو پرشاد نے تو الہ آباد کے جلسۂ کانگریس میں خود جا کر اس کی مخالفت کی تھی حتیٰ کہ وہ جلسے سے نکالے بھی گئے۔ حالات کے لحاظ سے سرسید کا فیصلہ غلط نہیں تھا کیونکہ اس زمانے میں مسلمان ہر میدان میں اپنے ہم وطنوں سے پیچھے تھے۔ ان کے اندر اعلیٰ تعلیم کی بھی کمی تھی اور سیاسی شعور کا بھی فقدان تھا بقول پنڈت جواہر لال نہرو:—

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

"سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کردینی چاہئیں، یقیناً درست اور صحیح تھا بغیر اس تعلیم کے، میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔" (میری کہانی ج ۲ ص ۳۱۵)

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا سہ روزہ اجلاس ۲۷ — ۲۹ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بہ صدارت مولوی محمد سمیع اللہ خاں، اسٹریچی ہال کی زیر تعمیر عمارت میں منعقد ہوا تھا جس میں پہلا رزولیوشن سرسید نے یہ پیش کیا کہ:

مسلمانوں میں ہر قسم کی تعلیم کے تنزل کا لحاظ کرکے اور اس خیال سے کہ ان کی ہر قسم کی تعلیم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جاوے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لیے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے جو "محمڈن ایجوکیشنل کانگریس" کے نام سے موسوم ہو، یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص نہ ہوگا بلکہ ہر سال کسی ایسے مقام میں جہاں کے لوگ اس جلسہ کے منعقد کرنے کی خواہش کریں اور اس کا انتظام منظور فرمائیں۔ منعقد ہوگا۔"

ایجوکیشنل کانفرنس کے نام میں وقتاً فوقتاً تبدیلی بھی ہوتی رہی۔ ابتدا میں اس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانگریس تھا لیکن ۱۸۹۰ء میں اس کے پانچویں سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں پہلا رزولیوشن جس کی تحریک مولوی رضا حسین نے فرمائی، یہ تھا:

اس جلسے کی یہ رائے ہے کہ ہمارے اس قومی تعلیمی جلسے کا نام جو محمڈن ایجوکیشنل کانگریس رکھا گیا ہے، لفظ "کانگریس" لوگوں کو شبہ میں ڈالتا ہے بعض سمجھتے ہیں کہ یہ مثل نیشنل کانگریس کے ہے جو اس نام سے مشہور ہے اور بعض سمجھتے ہیں کہ یہ جلسہ اس کے برخلاف اینٹی کانگریس (Anti Congress) ہے۔ حالانکہ اس جلسے کو ان دونوں باتوں سے کوئی تعلق نہیں اس لیے نام میں تفرقہ کیا جاوے اور آئندہ سے اس جلسے کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قرار دیا جاوے۔"

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سرسید کی تائید پر یہ رزولیوشن بالاتفاق منظور ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں اس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس قرار پایا اور ۱۹۲۳ء میں لفظ محمڈن کی جگہ مسلم تجویز کیا گیا لیکن اب یہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے مشہور ہے۔

سرسید کی تحریک پر ۲۸ دسمبر ۱۸۸۶ء کو ایجوکیشنل کانفرنس کی کارروائی سے متعلق دس دفعات پر مشتمل جو قواعد مرتب اور منظور ہوئے ان میں چند دفعات حسب ذیل ہیں:

۱۔ مختلف اضلاع اور صوبہ جات کے لوگوں کا وہ مجمع جو مسلمانوں کی ترقی کا خواہاں ہو اور ان کی بھلائی اور ہر قسم کی ترقیِ تعلیم میں کوشش کرنے کو متحد ہوا ہو جب وہ کسی جگہ اجلاس کرے تو مذکورہ بالا لقب سے ملقب کیا جاوے گا۔

۲۔ ہر ایک قوم اور مذہب کے لوگ جو درحقیقت دل سے مسلمانوں کی بھلائی اور ان کی ترقیِ تعلیم چاہتے ہیں، اس جلسہ کے ممبر ہو سکیں گے۔

۳۔ اس مجمع کا ہیڈ کوارٹر علیگڑھ میں ہوگا اور سکریٹری مینجنگ کمیٹی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، جو وقتاً فوقتاً ہو، اس کا سکریٹری ہوگا اور تمام خط و کتابت متعلق کانگریس، اس کے ممبروں اور کمیٹیوں سے، اس کے ذریعہ سے ہوا کرے گی۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے پانچویں اجلاس (۱۸۹۰ء) میں کانفرنس کے نام میں ترمیم سے متعلق رزولیوشن ۱ (جس کا ابھی ذکر ہوا) اور کانفرنس کے قواعد کارروائی کی دفعہ ۳ پر اگر ہم غور کریں تو اس خیال کو مزید تقویت ملتی ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس نہ تو انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت اور اس کے جواب میں قائم کی گئی تھی اور نہ ہی ہندو مسلم تفریق کو ہوا دینا اس کا مقصد تھا بلکہ یہ کانفرنس مسلمانانِ ہند کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے انھیں اس منزل پر پہنچانا چاہتی تھی جہاں ملک کی دوسری قومیں ان سے پہلے ہی جا پہنچی۔ چنانچہ کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس (۱۸۸۷ء منعقدہ لکھنؤ) میں ہندو اکابرین بھی بحیثیت ممبر شریک ہوئے۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کے وقت اس کے مقاصد حسب ذیل تھے:

(الف) مسلمانوں میں یورپین سائنسز و لٹریچر کے پھیلانے اور وسیع حد تک

ترقی دینا اور اس میں نہایت اعلیٰ درجے کی تعلیم تک ان کو پہنچانے پر کوشش کرنا اور اس کی تدبیروں کو سوچنا اور ان پر بحث کرنا۔

(ب) مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات کو دریافت کرنا اور بقدر امکان عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

(ج) جو لوگ کہ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم قدیم طریقے پر ہماری قوم کے علما سے پاتے ہیں اور اس کو انھوں نے اپنا مقصد قرار دیا ہے، ان کے حالات کی تفتیش کرنا، ان میں اس تعلیم کے قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدابیر کا عمل میں لانا۔

(د) عام لوگوں میں جو عام تعلیم قدیم مکاتب کے ذریعہ سے جاری تھی اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل ہو گیا ہے اس کی ترقی اور عام لوگوں میں عام تعلیم کی مناسب وسعت کی تدابیر اختیار کرنا۔

(ہ) جو مکاتب عام لوگوں کے لڑکوں کے لیے قرآن مجید پڑھنے کے تھے اور جو سلسلہ قرآن مجید کے حفظ کرنے کا تھا اور جن کا اب بہت کچھ تنزل ہو گیا ہے، ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدابیر اختیار کرنا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اپنے مقاصد اور دائرۂ کار کو وسیع کرتی رہی تاکہ مسلمانوں کی ہمہ جہت فلاح و بہبود ممکن ہو سکے۔ کانفرنس کے گیارہویں اجلاس (۱۸۹۶ء بمقام میرٹھ) میں اس کے مقاصد میں جو مزید اضافے کیے گئے وہ حسب ذیل ہیں:

(ب) مسلمانوں نے جو قدیم زمانے میں علوم میں ترقی کی اس کی تحقیقات کرنا اور اس پر اردو یا انگریزی میں رسالہ جات تحریر کرنے یا لیکچر دینے یا ایسے (Essay) لکھنے پر لوگوں کو آمادہ کرنا۔

(ج) نامی علماء اور مصنفینِ اسلام کی لائف کو اردو یا انگریزی زبان میں لکھوانا۔

(د) مسلمان مصنفوں کی تصنیفات جو نایاب ہیں ان کے بہم پہنچانے کی تدبیر کرنا یا پتہ لگانا کہ وہ کس جگہ موجود ہیں۔

(ہ) تاریخانہ واقعات زمانۂ قدیم کی تحقیقات پر رسالہ جات تحریر کرنے یا لیکچر دینے یا ایسے لکھنے پر لوگوں کو آمادہ کرنا۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

(و) دنیاوی علوم کے کسی مسئلہ یا تحقیقات پر کسی رسالہ کے تحریر ہونے یا لکچر دینے کی تدبیر کرنا۔

(ز) فرامینِ شاہی کو بہم پہنچا کران سے ایک کتاب انشا کا مرتب کرنا اور ان کے مواہیر و طغرا کے نمونے فوٹوگراف سے قائم رکھنا۔

سرسید احمد خاں قیام کانفرنس کے زمانے سے وفات تک اس کے آنریری سکریٹری رہے۔ ان کے بعد کانفرنس کو نواب محسن الملک (سید مہدی علی خاں) کی خدمات حاصل ہو گئیں۔ اوائل ۱۹۰۶ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو کانفرنس کا آنریری جوائنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا اور انھوں نے ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم آف بھوپال سے کانفرنس کے صدر دفتر کی عمارت کے لیے مبلغ تیس ہزار اور شاہزدگان سے مبلغ اٹھارہ ہزار روپے کا عطیہ حاصل کیا اور کالج کی طرف سے کانفرنس کو جو زمین ملی تھی اس پر ۲۷ر فروری ۱۹۱۴ء کو ہر ہائنس سلطان جہاں بیگم نے کانفرنس کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ علیا حضرت کے نام پر ہی اس عمارت کا نام "سلطان جہاں منزل" رکھا گیا۔ جس میں ایجوکیشنل کانفرنس کا دفتر آج بھی قائم ہے۔

مختلف شہروں میں کانفرنس کے جو سالانہ اجلاس ہوئے ان کی تعداد ۱۹۲۰ء تک ۳۴ کو پہنچ چکی تھی۔ جلسوں کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کا کام کیا۔ قومی مسائل پر ایک ساتھ مل کر غور کرنے اور انھیں حل کرنے کی صورت نکالی۔ حکومتِ وقت کو بھی ان مسائل پر متوجہ رکھا۔ غریب طلبا کے لیے وظائف کا انتظام کیا۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کو ملک گیر پیمانے پر پھیلایا۔ تعلیم کے طور طریقوں اور نصابات میں اصلاح کی۔ ملک بھر میں علاقائی ضرورتوں کے لحاظ سے صنعت و حرفت، کامرس، میڈیکل انجینئرنگ اور دینی تعلیم کا بندوبست کیا۔ ابتدائی اور ثانوی سطح پر تعلیمی نظام قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم اور مشرقی علوم کی تعلیم پر بھی کوشش کی۔ ملک بھر میں متعدد مسلم اسکولوں اور کالجوں کے قیام میں مدد پہنچائی اور خود ایم اے او کالج کی ترقی کے لیے راہیں ہموار کر کے مسلم یونیورسٹی کی تحریک کو تقویت بخشی

اسی طرح تعلیم نسواں کے انتظام میں بھی کوشش کی۔ اس کانفرنس کے ذریعہ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کا بھی کام ہوا۔ اردو زبان وادب کی ترقی میں بھی اس کانفرنس نے گراں بہا خدمات انجام دیں۔ رسالے جاری کیے، تصنیف وتالیف کا سلسلہ قائم کیا۔ بڑے بڑے مقرر اور خطیب پیدا کیے۔ اردو میں خطبات نگاری کی جو طرح سر سید اور ان کے رفقا نے ڈالی تھی اسے پروان چڑھایا۔ مادری زبان کی اہمیت واضح کی اور اردو کو ایک علمی زبان کا درجہ دلانے کے لیے انجمن ترقی اردو قائم کی۔

ایجوکیشنل کانفرنس نے اب اپنی عمر کے ۱۱۴ سال پورے کر لیے ہیں اور اس کے بانی سر سید کے انتقال کو بھی ۱۰۲ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ایسے موقع پر ایجوکیشنل کانفرنس اور اکابرین ملت کے باہمی اشتراک سے اس سال کے آخیر تک بھی اگر پورے ملک میں کم از کم سو کی تعداد میں اعلیٰ درجے کے Sir Syed Centenary Schools قائم ہو جائے تو کتنا اچھا ہوتا۔ کاش کہ ہم سر سید صدی کے موقع پر کچھ تعمیری پروگرام بھی وضع کرتے اور اپنے ماضی کا احتساب کرتے بقول اقبال:

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

■■

میں مسلم یونیورسٹی کے نوجوانوں سے یہی توقع رکھتا ہوں کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں جہاں تک ممکن ہو اپنی امتیازی شان برقرار رکھنا اپنا ملی فرض سمجھیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ وہ ہندوستان میں جہاں جائیں اور جس جگہ رہیں ذہنی ترقی، اخلاقی برتری اور شہری ذمہ داری کے نقطۂ خیال سے ممتاز نظر آئیں۔

ظفر علی خاں۔ پیغام مدیر علیگڑھ میگزین، (علیگڑھ ۱۹۵۲-۵۳ء)

پروفیسر ایم۔ سوائی انصاری

سرسیّد اور فنِ تعمیر

تمہید

کسی مذہب، ملت، قوم یا ملک کے تہذیب و تمدن اور ثقافت کی ایک پہچان اس کا فن تعمیر بھی ہے۔ چنانچہ ہر مذہب کی عبادت گاہیں نہ صرف اس مذہب کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ اس مذہب کے تہذیب و تمدن اور ثقافت کا ایک پر تو بھی ہیں۔ مثلاً مہاتما بدھ کی مذہبی عمارات ان کے مجسمے اور مصوری بدھ مذہب کے فن تعمیر اور ان کی تہذیب و ثقافت کے اہم اجزاء بن گئے ہیں۔

اسی طرح اسپین میں الحمراء اور مدینۃ الزہرا، مراکش اور رباط کی اسلامی یادگاریں، دمشق اور قاہرہ کے مشہور اسلامی شاہکار، عثمانی و صفوی اور مغل بادشاہوں کی پر شکوہ مساجد اور رفاہ عام کی تعمیرات، فتح پور سیکری کا بلند دروازہ، سلیم چشتی کے مزار کی سنگ مرمر کی جالیاں، دراصل اسلامی فن تعمیر کے امتیازی سنگ نشان ہیں۔ آگرہ میں تاج تو ان تمام عمارات میں خصوصی مقام رکھتا ہے۔

حالیہ حرمین شریفین کی پر شکوہ و مزین توسیع اسی سلسلہ کی تعمیرات میں سے ہے۔ ان توسیعات پر دل کھول کر جدید ترین ٹیکنالوجی کا استعمال ہو رہا ہے۔

فن تعمیر نہ صرف مذہبی عمارات تک ہی محدود رہا بلکہ تعلیمی ادارے اور رہائش گاہیں بھی اس فن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ ان عمارات میں بھی فن تعمیر کے وہی قواعد و ضوابط کار فرما ہیں۔ مثلاً محرابیں، گنبد، وسیع ہرے بھرے سبز تختے، انواع و اقسام کے پھل دار درخت اور پیڑ پودے اور بیلیں اور سجاوٹ اور موزونیت و لطافت و نزاکت ہر عمارت میں نظر آتے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سر سید کی بنوائی ہوئی عمارات وکٹوریہ گیٹ سے لے کر اسٹریچی

ہال تک مسلم فن تعمیر کا ہندوستاں میں آخری نمونہ ہیں۔ مگر بعد کی عمارات مثلاً اولڈ بوائز لاج' یونین ہال' مٹو سرکل' مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ودیگر عمارات سرسید کی تعمیر شدہ عمارات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ البتہ یونیورسٹی کی حالیہ تعمیرات جدید طرز کی ہیں۔ یہ عمارات بے جوڑ ہیں اور ماہرین فن اور اہل بصیرت کو نکتہ چینی کے لئے مدعو کرتی ہے۔

فن تعمیر کے بنیادی اصول

اول اصول

جائے قیام

کسی عمارت' ادارے' رہائش گاہ' سڑک یا پل کا ایک اہم قابل غور پہلو اس کی جائے قیام ہے۔ یہ اصول ہر پروجیکٹ کی جائے قیام کے انتخاب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

انگلستاں سے واپسی پر یہی اہم سوال مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی جائے قیام کا سرسید کو پیش آیا۔ لوگوں' اخبارات اور انجمنوں نے سرسید کو مختلف مقامات میں مدرسہ کو قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ اس بحث کی تفصیل علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۷۲ء میں درج ہے۔ اس رپورٹ کے پڑھنے سے سرسید کی فن تعمیر کی بصیرت اور صلاحیت' اور اس فن پر عبور کا پتہ چلتا ہے۔ اس گزٹ کے حوالے سے راقم الحرف نے مندرجہ ذیل عنواں مرتب کیے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ یہی عنواں کسی جائے وقوع کے سلسلہ میں آج بھی مددگار اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔

(الف) آب وہوا۔

صحت کا دارومدار کسی مقام کی آب وہوا پر ہی ہے۔ آب وہوا ہی ذہن اور دل ودماغ کی افزائش پر اثر کرتی ہے۔ سرسید کی رائے میں علی گڑھ آب وہوا کے اعتبار سے تمام شمالی اور مغربی اضلاع سے عمدہ اور بہتر ہے۔ اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ مسٹر جیمس آر جیکس صاحب ایم۔ ڈی سول سرجن علی گڑھ کی رائے پیش کرتے ہیں۔

آگرہ اس زمانہ میں معروف شہر رہا ہوگا مگر آب وہوا کے اعتبار سے اسے موزوں نہیں سمجھتے اور اسے رد کرتے ہوئے جہانگیر بادشاہ کی تزک کا قول پیش کرتے ہیں "ہوائے آگرہ گرم وخشک است۔ حکماء اطباء آں است کہ روح را بہ تحلیل می برد وضعف می آرد وبہ اکثر طبائع ناسازگار است مگر بلغمی وسوداوی مزاجاں را کہ از ضرر آں ایمن اند' ازایں جہت است کہ حیوانات کہ ایں مزاج وطبیعت دارند مثل فیل وگاو میش وغیر آں دریں آب وہوا خوش می شوند۔'

سہ ماہی فکر وآگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ترجمہ آگرہ کی آب وہوا خشک وگرم ہے۔ اطباء کی رائے ہے کہ آگرہ کی آب وہوا روح کو تحلیل کرتی ہے اور ضعف لاتی ہے اور بہت طبقوں کے لئے ناسازگار ثابت ہوتی ہے صرف بلغمی اور سوداوی مزاج والوں کے۔ یہ لوگ اس کے نقصان سے محفوظ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ جانور جو ایسا ہی مزاج رکھتے ہیں جیسے ہاتھی یا بھینس اس آب وہوا میں خوش رہتے ہیں۔

دراصل سرسید کو مدرسۃ العلوم کے طلباء کی نشوونما صحت و تندرستی مقدم تھی۔ سو وہ جہانگیر کی اس رائے کی روشنی میں آگرہ کو مدرسۃ العلوم کے لئے نامناسب تصور کرتے تھے۔

(ب) وسائل نقل و حرکت۔

کسی بھی منصوبے کا ایک اہم پہلو وسائل نقل و حرکت کو چیدہ مقام تک ہر طرف سے آسانی رسائی ہے۔ اس نظریہ سے تمام مشرقی، مغربی صوبہ جات اور اضلاع سے علی گڑھ آسانی پہونچ سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ علی گڑھ دہلی اور کلکتہ کی ریلوے لائن پر آباد ہے بلکہ شیر شاہ سوری کی لمبی اور چوڑی سڑک پر بھی واقع ہے۔

بقول سرسید "علی گڑھ، دہلی اور اضلاع مشرق پنجاب سے بہت دور نہیں ہے۔ میرٹھ سہارنپور، رڑکی وغیرہ کو ریلوے کے سلسلہ سے اپنے ساتھ ملاتا ہے جنوبی سمت جس میں آگرہ و متھرا و بھرت پور کے علاقے کی مسلمان سادات بستیاں اور علاقہ دھول پور و گوالیار ہے لکھنؤ بھی ریلوے سلسلہ سے جدا نہیں ہونے دیتا"۔

(پ) افادیت

"منصوبہ ایسی جگہ قائم ہو جہاں وہاں کے رہنے والوں کو زیادہ سے زیادہ اس سے فیض پہونچے۔ مدرسہ خاص و عام کے لئے ہو اور یہ بھی ہے کہ مسلمان خاص طور پر اس سے فیض یاب ہوں۔ اس لحاظ سے جو شخص کوئی جگہ تجویز کرے گا علی گڑھ ہی کو تجویز کرے گا۔

(ت) گردونواح کی آبادی

منصوبے کے لئے جائے قیام میں ایک اہم نکتہ گردونواح کے بسنے والوں کا ہے۔ یعنی وہ لوگ منصوبے سے ہمدردی رکھتے ہوں اور اس کے معاون و مددگار ہوں اور مخالفانہ اور معاندانہ رویہ نہ رکھتے ہوں۔ اس مسئلہ زیر بحث پر سرسید کی رائے حسب ذیل ہے

"علی گڑھ میں اور ملحقہ شہر میں جو بالکل اس سے ملا ہوا ہے تمام مسلمان رئیس اور بڑے بڑے تعلق دار و ذی مقدور اپنی قوم کی خراب حالت پر افسوس کرنے والے بھی موجود ہیں"

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

(ث) کوئی مشہور و معروف جگہ

عام طور پر کسی منصوبے کو کسی مشہور و معروف جگہ قائم کیا جاتا ہے تاکہ وہ شہر کی نسبت سے معروف و مشہور ہو جائے۔ اس موضوع پر سر سید فرماتے ہیں "یہ مدرسہ اس مقام کو، جہاں یہ قائم ہوگا، ایسا نامی کر دے گا کہ تمام ہندوستان کے مشہور و نامی شہر اس کے آگے پست ہو جائیں گے"۔

(ج) حکومت کی سر پرستی

کوئی فن، تعلیم، یا منصوبہ یا ادارہ بغیر حکومت کی سر پرستی کے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حکومت کی سر پرستی، امداد اور تعاون اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ سر سید کے پیش نظر حکومت کی امداد تھی۔ "شمالی مغربی اضلاع ہی کی گورنمنٹ نے تمام امدادوں کا وعدہ کیا ہے"۔

(چ) علی گڑھ ایک پیارا نام

"علی گڑھ ایک پیارا نام ہے"۔ سر سید ایک حدیث شریف کے حوالے سے لکھتے ہیں "ہمارے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مشہور یہ قول ہے کہ انا مدینۃ العلم و علی بابہا۔ پس یہ پہلا مدرسہ ہم مسلمانوں کا، جو در حقیقت علم کا دروازہ ہوگا، علی گڑھ ہی میں ہونا چاہیئے"۔

توجہ طلب بات ہے کہ مندرجہ نکات ہی آج بھی کسی منصوبے کی جائے قیام کو منتخب کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ یہی سائنس کے اصولوں کے مطابق ہے۔☆

اصول دوم۔ منصوبہ بندی

ہوسٹل کی پلاننگ

فن تعمیر کا دوسرا اصول عمارات مطلوبہ کی ضروریات ہیں یعنی عمارات کے بنانے کا مقصد اور اس کا استعمال۔ مثلاً رہائش گاہ کا نقشہ، بوجہ ضروریات اور استعمال، ہسپتال کے نقشے سے مختلف ہوگا۔ اسی طرح ہوسٹل کی ضروریات، رہائش گاہ اور اسپتال سے بالکل جدا ہوں گی۔ فی زمانہ ماہر تعمیرات عمارت کی ضروریات اپنے موکل سے طلب کرتا ہے اور اسی بناء پر ہی عمارت کا نقشہ تجویز کرتا ہے۔

اس اصول کے تحت سر سید نے ہوسٹل کی ضروریات کے مد نظر مندرجہ ذیل اصول مرتب کیے

☆ (اقتباسات مالا کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کے نویں اجلاس منعقدہ ۱۸۷۲ء سے لئے گئے ہیں)

ہوسٹل کی ضروریات

تعلیم اور تربیت پر زور دیتے ہوئے سر سید نے جو اہم ضروریات وضع کیں وہ نہایت جامع اور تعلیم و تربیت اور کردار سازی کے اہم عنصر ہیں۔ انہیں ہوسٹلوں کی بدولت علی گڑھ نے برصغیر میں نمایاں ہستیاں پیدا کیں اور یہی ہوسٹل علی گڑھ کا طرۂ امتیاز ہیں۔ وضع شدہ ضروریات کچھ اس طرح ہیں

(۱) ایک مسجد جو ہمارے مذہب اسلام کا اولین فریضہ ہے۔ اس میں ایک موذن اور ایک امام کا تقرر۔ طلباء کی نماز فجر میں حاضری اور کلام پاک کی تلاوت لازمی۔

(۲) ایک کتب خانہ جو علم کا سرچشمہ ہے۔

(۳) ایک بڑا کمرہ (ڈائننگ ہال) مشترکہ کھانا کھانے کے لیے۔

(۴) ایک بڑا کمرہ ایسے کھیلوں کے لئے جو عمارت کے اندر کھیلے جاتے ہیں (برائے انڈور گیمز)۔

(۵) باقی مختصر اور مناسب کمرے انفرادی طور پر طلباء کے رہنے کے لیے۔

اوقات کی پابندی اور ایک پروگرام کے تحت ہوسٹل میں زندگی کی تشکیل لازمی قرار دی۔

طلباء پر ایک اتالیق یا گورنر مقرر ہوگا۔ اس کے ذمہ تمام نگرانی اور بندوبست ہوگا۔

اصول سوم۔ مجوزہ عمارات کے نقشے

فن تعمیر کا تیسرا اصول کسی عمارت کے نقشے یعنی اس کے پلان ایلیویشن اور اس کی تفصیلات ہیں۔ انہیں نقشوں کے مطابق مجوزہ عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

آثار الصنادید

آثار الصنادید نقشوں اور تفصیلات کے اعتبار سے ایک شاہکار ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ سر سید اس اصول اور اس کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ اس اصول کی واقفیت کی بناء پر آثار الصنادید میں ہر عمارت کا فرش وار تفصیل سے موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہر عمارت کی لمبائی چوڑائی اور دیگر تفاصیل موجود ہیں۔ یہی وہ تفاصیل ہیں جو سر سید کے فن تعمیر کے ذوق کی عکاسی کرتی ہے۔ سر سید کو اندیشہ تھا کہ نامورانِ ملک و قوم جو دنیا سے رحلت کرنے کے بعد دہلی اور نواح دہلی میں اپنی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں اب ان کے مٹنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ قبل اس کے وہ نشانات صفحۂ ہستی سے مفقود ہوں ان کے نقشے اور نقشوں کے کتبے صفحۂ قرطاس پر قائم کر کے مدت دراز کے لئے محفوظ کر لیے جائیں۔ ☆

☆ (حوالہ تمہید و دیباچہ آثار الصنادید مطبع نامی پریس کانپور ۱۹۰۴ء)

آثار الصنادید کا فن تعمیر سے متعلق قابل ذکر امتیازی پہلو ہر عمارت کا فرنٹ ویو ہے جو عمارت کی شان، موزونیت، نزاکت و نفاست کی نشاندہی کرتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہر عمارت کی لمبائی، چوڑائی دی ہوئی ہے جو پیمائش کر کے درج کی گئی ہیں۔

انہیں وجوہات کی بناء پر آثار الصنادید مصنف کا شاہکار ہے۔ اور ان کی فن تعمیر کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ صرف ایک سول انجینئر اور ماہر تعمیرات ہی کا حصہ ہے۔

چند حالیہ ایڈیشنوں میں ان فرنٹ ویو کو جو سر سید نے بڑی جانفشانی اور دیدہ ریزی سے تیار کرائے تھے فوٹوگرافوں سے بدل دیا گیا ہے۔ ان فوٹوگرافوں سے عمارات کی شان اور خوبصورتی کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ فوٹوگرافوں سے عمارت کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔

ماہ نو ہے صورت ابرو پر اس کے دو نہیں
ماہ کامل صورت رو ہے مگر ابرو نہیں

دراصل آثار الصنادید کے ذریعے دہلی اور نواح دہلی کی قدیم عمارات کی تاریخ سے زیادہ سر سید کو اسلامی فن تعمیر کو قلم بند کر کے اس کو محفوظ کرنا مقصود تھا۔

اصول چہارم۔ تعمیرات

فن تعمیر کا چوتھا اصول عمارات کی تعمیر اور تزئین ہے۔ آثار الصنادید اگر نقشے اور فرنٹ ویو دیتا ہے تو مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی تعمیرات سر سید کے فن تعمیر کی واقفیت کا زندہ ثبوت ہیں۔ یہ تعمیرات اسلامی فن تعمیر کی ہندوستان میں شاید آخری یادگاریں ہیں۔ مثلاً یونیورسٹی کی جامع مسجد (جو سر سید ہی کا تخیل تھا مگر بعد کو مکمل ہوئی) اسلامی فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس کے محراب و گنبد، مینارے اور کلام پاک کے کتبے جو خالص فن خطاطی کے نمونے ہیں، حرم کعبہ کی طرف سر بسجود ہونے کے علاوہ غرناطہ، بغداد، مصر، ایران اور دہلی کی مساجد کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس کا منبر اور کلام پاک کی کندہ آیات جامع مسجد دہلی کی طرز پر ہیں۔ مسجد کے داہنی طرف بانی درسگاہ اور ان کے رفقائے کار کی ابدی آرام گاہ ہے۔ بائیں طرف برآمدہ اور وضو خانہ ہے۔ مسجد کے سامنے کی طرف دینیات کتب خانہ ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے لیے ایک بلند اور وسیع دروازہ ہے جسے "باب رحمت" کہتے ہیں۔ مسجد کا صحن وسیع اور کشادہ ہے۔ صحن میں وضو کے لیے حوض، خالص مسجد کے فن تعمیر کی نشاندہی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر یونیورسٹی کی جامع مسجد دہلی کی جامع مسجد کا چھوٹا نمونہ ہے۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سر سید ہال کی عمارت قلعہ نما ہونے کے علاوہ اس کی محرابیں برآمدے اور کشادہ لان خالص اسلامی فن تعمیر کی عکاسی کرتے ہیں۔

یوں تو وکٹوریہ گیٹ پر گھڑی کا منارہ خالص مغربی طرز کا ہے مگر گیٹ کی اونچی محراب فتح پور سیکری کے بلند دروازہ کی یاد دلاتی ہے۔ اس کی بالائی منزل پر جانے کے لئے مخفی زینہ مغل فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ وکٹوریہ گیٹ کے سامنے تاریخی اسٹریچی ہال نظر آتا ہے۔ اسلامی طرز کی محرابیں، مغربی وضع کی ڈھلواں چھت کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اسٹریچی ہال میں داخل ہوں تو اوپر دونوں طرف طالبات اور مستورات کے بیٹھنے کے لئے شہ نشیں بنی ہوئی ہے۔ ان پر سامنے کی طرف باریک چلمن مسلمانوں کی تہذیب کے عین مطابق ہے۔ اوپر جانے کے لئے باہر سے طالبات کے لئے خصوصی زینے ہیں۔ اسٹریچی ہال کے دائیں جانب لٹن لائبریری اور بائیں جانب آسمان منزل میں بھی محرابیں اور دالان ہیں جو خالص اسلامی طرز کے ہیں۔ سب عمارات کے سامنے کا حصہ لال پتھر کا ہے۔

اسٹریچی ہال کی مرکزیت

قدرت کا اصول ہے کہ ہر چھوٹی چیز بڑی چیز میں ضم ہو جاتی ہے۔ اسٹریچی ہال کی مرکزیت اب کینیڈی ہال نے چھین لی۔ اسٹریچی ہال کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو دہلی کے لال قلعہ کے ساتھ پیش آیا۔

سر سید گیلری

اسٹریچی ہال ایک تاریخی ورثہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ مسلم قوم کا ورثہ ہے بلکہ ملک کی وراثت ہے۔ یہی وہ عمارت ہے جس نے نامور ان ملک وبیرون ملک کو خوش آمدید کہا۔

اس ہال کی مرکزیت کی بازیابی کے لیے اسٹریچی ہال کو سر سید اور ان کے رفقائے کار کی گیلری بنادیں جہاں ان نامور ان ملک و قوم' سر سید اور ان کے رفقائے کار' اور جن حضرات کو سر سید تحریک سے لگاؤ تھا' ان کی تصاویر آویزاں کریں مثلاً علی گڑھ کے نمایاں اولڈ بوائز' قومی لیڈر مثلاً مہاتما گاندھی' جواہر لال نہرو' مسٹر جناح' علی برادران وغیرہ۔ یہ ہال قومی یکجہتی کا مرکز بن جائے۔

سر سید کی علی گڑھ میں بنوائی ہوئی عمارات کی ایک نمایاں اور قابل غور خصوصیت ان اشخاص کے نام کے کتبے ہیں جنھوں نے تعمیر کے لئے زرعطیہ مرحمت فرمایا۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل ہیں۔ یہ اہل ہنود کی مسلم دوستی اور رواداری کا کھلا اعلان ہے۔

اسٹریچی ہال کے سامنے بڑے اور کشادہ لان ہیں جن میں سلیقے سے سبزہ زار اور پھول دار درخت نظر آتے ہیں۔ یہ باغات چھوٹے پیمانے پر باغات مغلیہ یا باغات بدر کا نمونہ ہیں۔

ماہنامہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

خلاصہ کلام

(۱) اس مقالے کی تیاری میں خاکسار کا بہت کم دخل ہے۔اس روشنی کے مینار پر قلم اٹھانا کمترین کی دسترس سے باہر ہے۔سر سید کی تحریریں اور فن تعمیر کے سلسلہ میں ان کے عملی کام خود اس مقالے کا سبب ہیں۔میں نے ان کی تحریروں کو سرخیوں کے ذیل میں درج کر دیا ہے۔

(۲) سر سید کی تحریروں سے ان کا فن تعمیر کا عرفان اور اس سے واقفیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔

(۳) حوالہ جات کے پڑھنے سے مجھے سر سید کا مقام ایک مورخ سے زیادہ ایک ماہر فن تعمیر کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔

(۴) آثار الصنادید کے جامع نقشے، عمارات کی تفاصیل سر سید کو ایک ماہر فن تعمیر کی حیثیت سے خود بخود پیش کرتی ہیں۔

(۵) سر سید ہال کی ان کی تعمیر شدہ عمارات واقع علی گڑھ ان کے ماہر فن تعمیر ہونے کا زندہ ثبوت ہیں۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام تو ہے، عرفان محبت عام نہیں

(جگر)

☆☆☆

ارمان اکبر آبادی سر سیّد احمد خاں

ارتقا کی راہ پر چلنا سکھایا آپ نے
ملک و ملت کو عطا کی مشعلِ فکر و نظر
آپ کے لطف و کرم کی جاوداں تصویر ہے
یہ تمدن کا چمن، یہ منبعِ علم و ہنر

☆☆☆☆☆

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

تدوین : ڈاکٹر عطیہ سلطان

قومی تماشہ

۶ر فروری سنہ ۱۸۹۰ء کو علیگڑھ کی نمائش کے موقع پر دنیا نے قومی تماشہ دیکھا۔
اس تماشے سے پہلے اشتہارات تقسیم ہوئے
"سر سیّد تھیٹر اور ممتاز اصحاب کا ایکٹنگ"
پہلے سین میں پردہ اٹھا تو ایک کپتان کمر سے تلوار لٹکائے اور ترکی لباس میں ملبوس نظر آیا۔ اور کالج کے بارہ طلبا سپاہیوں کی وردی میں اسٹیج پر فوجی گشت کر رہے تھے پردہ گر گیا اور دوسرے سین میں ایک بزرگ اسٹیج پر آئے۔ کپتان نے پوچھا "کون ہے؟" جواب نہ ملا تو کپتان ان بزرگ کی طرف بڑھا۔ بزرگ خالص عربی لباس میں ملبوس تھے اور ان کے سینے پر مدرستہ العلوم کا تمغہ چمک رہا تھا۔
کپتان نے استقبال کیا اور سر سیّد سے کہا "آیئے اور اپنا پارٹ ادا کیجئے۔
اس پر سر سیّد نے تقریر کی اور حافظ کی ایک غزل سنائی۔ اس غزل کے آخر میں دو شعر سر سیّد کا اضافہ ہیں اور انھیں کے ہیں۔
اس تھیٹر میں کالج کے پروفیسروں اور علیگڑھ تحریک کے رہنماؤں نے بھی اپنا اپنا پارٹ ادا کیا۔
لیڈیز اینڈ جنٹلمین

کون ہے جو آج مجھ کو اس اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

میں اپنی قوم کا درد نہیں ہے، وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے
آہ اس قوم پر جو ان باتوں کو، جن سے انسان کو شرم اور حیا اور غیرت ہونی چاہیے،
اپنی شیخی اور اپنے افتخار کا باعث سمجھے۔ آہ اس قوم پر جو قوم انسان کی بھلائی کے کاموں
کو، جو نیک نیتی سے نیکی کے لیے کیے جاویں، بے عزتی کا کام سمجھے۔ آہ اس قوم پر
جو خدا کو دھوکہ دینے کے لیے مکر یا پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس
کے برقع کو اپنے منہ پر ڈالے مگر اپنی بدصورتی اور دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچے۔
آہ اس پر جو قوم کو ذلت او نکبت کے سمندر میں ڈوبتا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا
ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے
جس سے بے شرمی اور بے حیائی بھی شرما جاوے لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم و
نفریں کا کام سمجھے۔

اے رئیسو! اور دولت مندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت
سمجھو کہ قوم کیسی ہی بدحالت میں ہو، ہمارے بچوں کے لیے بہت کچھ ہے۔ یہی ان
لوگوں کا بھی خیال تھا جو تم سے پہلے تھے، مگر اب انہی کے بچوں کی وہ نوبت ہے
جن کے لیے آج ہم اسٹیج پر کھڑے ہیں۔

اے صاحبان! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز
خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم مفلس ہو گئی ہے، قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سرانجام
نہ ہونے سے ذلیل و رذلیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا
جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں اعانت پہنچے مگر افسوس کامیابی
نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی، بہت ہی قلیل ملی۔ والنٹیئر بنانے چاہے
بہت کم بنے اور جو بنے ان سے بھی کچھ بن نہ آئی۔ پس آج میں اس اسٹیج پر اس لیے
آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں۔

لیڈیز اور یورپین جنٹلمین۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تم نے اپنی قوم کے غریب
بچوں کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ بڑے بڑے ڈیوک ڈیوچس اسٹیج پر آئے ہیں اور
غریبوں کی امداد کرنے سے عزت پائی ہے۔ اس وقت بھی یورپین نے اپنی نیک دلی
ثابت کی ہے کہ باوجود ہم قوم نہ ہونے کے ہمارے شریک ہیں۔ اور تھوڑی دیر میں

ہمارے یورپین دوست اور مسٹر کینڈی کلکٹر و افسر ضلع ہیں۔ نہیں نہیں مسٹر کینڈی میرے دوست۔ اس اسٹیج پر آنے والے ہیں مگر ہندوستانوں کا نہ وہ خیال ہے نہ وہ دل، اور نہ وہ دلی نیکی جو ایسے کاموں کے باعث ہوتی ہے۔ ہندوستان میں پہلا موقع ہے جو میں اس قومی کام کے لیے اسٹیج پر کھڑا ہوا ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کروں گا اور ضرور کروں گا اور لوگوں کو جو وہ بکنا چاہیں بکنے دوں گا۔ کون سی بات ہے جو لوگوں نے میری نسبت نہیں کہی، اور میں نہایت خوش ہوں گا کہ جو کچھ ان کو کہنا باقی رہ گیا ہو وہ بھی اب کہہ لیں۔ اس موقع پر میں حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک غزل پڑھوں گا جو میرے فیلنگ کے مناسب ہے اور جس میں میں نے دو شعر اور ملا دیے ہیں۔

اس کے بعد نہایت جوش سے حافظ (رحمۃ اللہ علیہ) کی یہ غزل پڑھی:

ساقیا برخیز و در دہ جام آ — خاک بر سر کن غم ایام را
ساغر مے بر کفم نہ تا ز سر — برکشم ایں دلق ازرق فام را
گرچہ خواہیم ننگ و نام را — ما نخواہیم ننگ و نام را
بادہ در دہ چند ازیں باد غرور — خاک بر سر کفش نا فرجام را
محرم راز دل شیدائے خویش — کس نمی بینم ز خاص و عام را
با دل آرامے مرا خاطر خوش است — کز دلم یک بارہ برد آرام را
ننگرد دیگر بسرو اندر چمن — ہر کہ دید آں سرو سیم اندام را
کیست آں سرو سہی کاندر سرش — یافتم دین و دل و آرام را
قوم ما، اے قوم ما کز بہر تو — دادہ ام برباد ننگ و نام را
صبر کن احمد بہ سختی روز و شب — آخرش روزے بیابی کام را

سرسید کی غزل کے بعد مسٹر کینیڈی کلکٹر علیگڑھ، ڈاکٹر موریارٹی سول سرجن علیگڑھ دو انگریزوں مسٹر اسمتھ اور مسٹر انتھونی کے ہمراہ اسٹیج پر آئے اور چاروں نے مل کر انگریزی میں ایک گیت گایا۔

پھر آغا کمال الدین سنجر، ایک ایرانی شاعر اسٹیج پر آئے اور نہایت خوبی سے اپنا فارسی قصیدہ پڑھا جو سڑسٹھ (۶۷) اشعار پر مشتمل تھا۔ یہ تمام تر قصیدہ بہترین فنی

خوبیوں سے متصف تھا۔ جس کا اظہار اس کے اس کے اس مطلع سے بخوبی ہوتا ہے۔

اے پیروانِ دینِ حنیفِ پیمبری
فریاد از ستیزۂ ایں چرخِ چنبری

ان کے بعد آغا محمد حسین بجنوری جو ایک مشہور سیاح ہیں اور افغانستان اور کوہستانی علاقوں میں رہے ہیں اور مصر میں اور سوڈان میں کچھ عرصے تک رہے ہیں، سوڈانی بدوی لباس میں اور کھجور کی زنبیل لٹکائے اور برچھی ہاتھ میں لیے اور دنبہ ساتھ اس کی رسّی پکڑے اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے خالص عربی بدوی میں گفتگو کی اور بدوی جوش کو دکھلایا۔ دنبہ کی تعریف کی اور جس طرح کہ بدّو لوگ گیت گاتے ہیں عربی گیت گایا اور سلام علیک تحیۃ کہہ کر چلے گئے۔ انھوں نے اس خوبی سے بدوی لہجے میں گفتگو کی اور اشعار پڑھے کہ جن لوگوں نے بدوؤں کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں، بے حد متعجب ہوئے۔

اب مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب اسٹیج پر آئے اوّل انھوں نے نہایت مختصر اور دلچسپ گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ جب سید صاحب نے اس طرح پر پینی ریڈنگ کا جلسہ کرنا چاہا تو میں نے مخالفت کی مگر جب قوم کی بری حالت پر گفتگو ہوئی اور سید صاحب نے بتایا کہ یہ کام قوم کی بھلائی کے لیے کیا جا رہا ہے تو میری رائے بدل گئی اور میں اس کام میں شریک ہو گیا۔

ایک لطیفہ بھی اس مقام پر لکھنے کے قابل ہے جس وقت مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب سے یہ گفتگو ہو رہی تھی، ایک دوست نے خواجہ صاحب سے کہا کہ اگر تمہیں ایسا ہی قومی بھلائی کا جوش ہے تو میں قوم کی بھلائی کے لیے دو سو روپے تم کو دیتا ہوں بشرطیکہ تم لوگوں کے سامنے پشواز پہن کر اور پاؤں میں گھونگرو باندھ کر ناچو۔ مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب نے نہایت جوش کے ساتھ کہا کہ مجھے یہ شرط منظور ہے مگر افسوس کہ وہ دوست اپنی بات پر قائم نہ رہے۔ غرض کہ اس مختصر گفتگو کے بعد مولوی خواجہ محمد یوسف نے اپنی مثنوی جو اس موقع کے لیے کہی تھی، دردِ دل سے پڑھی۔ یہ طویل مثنوی اکہتّر اشعار پر مشتمل تھی جس کے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں ۔

وہ حمد میں سر سے چل اے قلم کہ وصفِ خدا کچھ کروں میں رقم
کیا اس نے پیدا یہ سارا جہاں زمیں آسماں وحش و طیر انس و جاں
نہیں اس کی توحید میں کچھ کلام اسی سے ہے دنیا کا سب نظام
اسی نے بتائی ہمیں راہِ دیں اسی نے دیا ہم کو علم الیقین
اسی نے یہ اسلام ہم کو دیا محمدؐ سا رہبر ہمارا کیا
زباں اپنی ہے وصف میں اس کے لال صفت اس کی ہو یہ بشر کی مجال
میں کرتا ہوں کچھ حالِ قوم اب بیاں کہ جس کی پریشانیاں ہیں عیاں
یہ وہ قوم با شوکت و جاہ تھی رعایا تھی سب اور یہ شاہ تھی

ان کے بعد پروفیسر آرنلڈ اسٹیج پر آئے اور انھوں نے نہایت عمدگی سے ایک انگریزی نظم پڑھی۔

پھر مولانا محمد شبلی صاحب جو ان دنوں کالج میں پروفیسر تھے، اسٹیج پر جلوہ گر ہوئے اور انھوں نے اپنا تصنیف کیا ہوا مسدس جو اسی موقع کے لیے تصنیف کیا تھا، پڑھا۔ ان کے دل میں خود قومی درد تھا۔ ان کی آواز درد انگیز تھی۔ مسدس کا مضمون جیسا دلچسپ تھا ویسا ہی قومی ہمدردی سے بھرپور تھا۔ اس نظم نے لوگوں کے دلوں پر جو اثر کیا اس کو ان ہی لوگوں کا دل جانتا ہے جو اس وقت وہاں موجود تھے۔

بہر حال جو مسدس انھوں نے پڑھا وہ یہ ہے:

آج کی رات یہ کیوں جمع ہیں احباب بہم بھیڑ کیا ہے نظر آتا ہے یہ کیسا عالم
نوجوانانِ ہنرپرور و اربابِ ہمم جوق کے جوق چلے آتے ہیں کیسے پیہم
کچھ سمجھ میں نہیں آتا جو یہ سب سمجھے ہیں،
شاید اس بزم کو یہ بزمِ طرب سمجھے ہیں

ہے گماں ان کو آیا ہے یہ تھیٹر کوئی یا تماشا ہے یہاں اس سے بھی بڑھ کر کوئی
اس سبھا میں بھی نظر آئے گا اِندر کوئی مسخرا ان کے بھی آئے گا مقرر کوئی
نقل وہ ہوگی کہ دیکھی نہ سنی ہوگی کبھی
سیر وہ آج کریں گے کہ نہ کی ہوگی کبھی

کوئی کہتا ہے کہ تھیٹر تو نہیں ہے لیکن ساز و نغمہ بھی نہ ہو ساتھ نہیں ہے ممکن
راتیں کاٹی ہیں اسی شوق میں تارے گن گن دیکھیں کیا سیر دکھائیں یہ بزرگانِ مُسن

کچھ نہ کچھ تازہ کرامات تو ہو گی آخر
بوڑھے عمر دوں میں کوئی بات تو ہو گی آخر

دوستو کیا تمہیں سچ مچ کا تھا تھیٹر کا یقیں یا سمجھتے تھے کہ پردہ کوئی ہوگا رنگیں
نظر آئے گی جو سوتی ہوئی ایک زہرہ جبیں آئے گا پھول کے لینے کو آرام کا گلچیں

قوم کی بزم کو یوں کھیل تماشا سمجھے
ہائے گر آپ یہ سمجھے بھی تو بے جا سمجھے

ہائے افسوس کہ ہو قوم تو یوں خستہ و زار مرض الموت میں جس طرح ہو کوئی بیمار
نہ معالج ہو کوئی پاس نہ سر پہ غم خوار نظر آتے ہوں دمِ نزع کے سارے آثار

واں تو یہ حال کہ مرنے میں بھی کچھ دیر نہیں
آپ ادھر سیرِ تماشے سے ابھی سیر نہیں

نوحۂ غم ہے یہاں نغمۂ عشرت کیسا ہے یہ عبرت کا سماں جوشِ مسرّت کیسا
ہے جنوں خیز یہ ہنگامۂ عبرت کیسا قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیسا

ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے

ہائے کیا سین ہے یہ بھی کہ گروہِ شرفا صاحبِ افسر و اورنگ تھے جن کے آبا
قوم کے عقدۂ مشکل کے جو ہیں عقدہ کشا ایکٹر بن کے وہ اسٹیج پہ ہیں جلوہ نما

قوم کے خوابِ پریشاں کی یہ تعبیریں ہیں
ایکٹر یہ نہیں عبرت کی یہ تصویریں ہیں

بانیٔ مدرسہ وہ سیّدِ والا گوہر وہ مینیجنگ کمیٹی کے معزز ممبر
شبلی عمزدہ اور وہ اعجازِ اثر اور یہ بادۂ اقبال کے سب برگ و ثمر

نہ تکلف کے کچھ انداز نہ کچھ جاہ کی شان
بزم میں آئے ہیں اس حال سے اللہ کی شان

ـ ہی فکر و آگہی ملی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اپنے رتبوں کا نہ کچھ دھیان نہ کچھ وضع کا پاس   دوستوں سے نہ جھجک اور نہ دشمن سے ہراس
گرچہ سب کہتے ہیں حاصل نہیں کچھ بھی جز یاس   ہائے کیا دھن ہے کہ پھر بھی تو نہیں ٹوٹتی آس

عرض مطلب کی ہے تصویر سراپا ان کا
ہاتھ خود کاسۂ دریوزہ ہے گویا ان کا

ان کا ہر لفظ ہے ایک مرثیۂ جاں فرسا   قوم کی شان دکھا دیتی ہے ایک ایک ادا
دیکھ اے قوم جواب تک ہے نہ تو نے دیکھا   اپنے بگڑے ہوئے انداز کا پورا خاکا

گرچہ تدبیر بھی ہم سے نہیں کچھ کی جاتی
ہائے حالت بھی تو تیری نہیں دیکھی جاتی

یوں بھلانے کو ہم دل سے بھلاتے ہیں مگر   یاد آجاتے ہیں پھر بھی ترے اگلے جوہر
وہ بھی دن تھا کہ جس سمت سے ہوتا تھا گزر   ساتھ چلتے تھے جلو میں ترے اقبال و ظفر

تو کبھی روم میں قیصر کو مٹا کر آئی
کبھی یورپ میں نئے فتنے اٹھا کر آئی

تھے نصیبوں میں ترے دولت و اقبال و حشم   تیرے حملوں سے دہل جاتا تھا سارا عالم
ایشیا کا جو کیا تو نے مرقع برہم   جا کے یورپ کے افق پر بھی اڑایا پرچم

کر دیا دفتر تار تار کو ابتر تو نے
نیرہ گاڑا تھا جگر گاہ تتر پر تو نے

کون تھا جس نے کیا فارس و یونان تاراج   کس کی آمد میں فدا کر دیا جے پال نے راج
کس کو کسریٰ نے دیا تخت و زر و افسر و تاج   کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج

تجھ پہ اے قوم اثر کرتا ہے افسوں جن کا
یہ وہی تھے کہ رگوں میں ہے ترے خوں جن کا

ہم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلا دیں قصے   یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے آب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے   دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے

کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یادگاروں کو زمانے سے مٹا دیں کیوں کر

مرو وشیراز وصفاہاں کے وہ زیبا منظر   بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار و در
مصر وغرناطہ وبغداد کا ایک اک پتھر   اور وہ دہلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر

ان کے ذروں میں چمکتے ہیں جواہر اب تک
داستانیں انھیں سب یاد ہیں ازبر اب تک

ان سے سن لے کوئی افسانۂ یارانِ وطن   یہ دکھا دیتی ہے آنکھوں کو وہی خواب کہن
تیرے ہی نام کا اے قوم یہ گاتے ہیں بھجن   تیرے ہی نغمۂ پُر درد کے ہیں یہ ارگن

پوچھتا ہے جو کوئی ان سے نشانی تیری
یہ سنا دیتے ہیں سب رام کہانی تیری

مولانا شبلی کے بعد محمد سعید خاں صاحب جو درحقیقت درویش صفت شخص ہیں اور درویشوں کی صحبت میں رہے ہیں، درویشی لباس میں اسٹیج پر آئے۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کے کینٹھے پڑے تھے۔ سر پر لمبی ٹوپی تھی اور اس پر گیروا بھبٹا لپٹا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ایک تونبی پکڑی ہوئی تھی۔

اسٹیج پر آتے ہی انھوں نے صدا لگائی "یا علی مدد" اور تونبی لوگوں کو دکھائی اور کہا کہ بابا قوم کے لیے یہ تونبی باندھی ہے اور قوم کے لیے یہ بہروپ بھرا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ہندی دوہے کو نہایت خوبی سے پڑھا جس نے لوگوں کے دلوں پر خوب اثر کیا۔ وہ دوہا یہ ہے ؎

رام کا بیوپاری رے سادھو رام کا بیوپاری
کسی نے لادا لونگ الائچی کسی نے سانبھر بھاری
ہم نے لادا نام سائیں دا پوری کھیپ ہماری
سادھو رام کا بیوپاری

پھر انھوں نے ایک گیت جناب علی مرتضیٰؓ کی منقبت میں پڑھا اور چلے گئے۔
ان کے بعد آغا محمد حسین افغانی لباس پہنے ہوئے اور یاقوت خاں پٹھان اپنا قومی لباس سپاہیانہ پہنے ہوئے اور پٹھانی طریقے سے تلوار لٹکائے اسٹیج پر آئے۔ پہلے ان دونوں نے بطور اجنبی شخصوں کے سلام علیک کی اور پٹھانوں کی طرح گلے ملے۔ پھر آپس میں پشتو زبان میں بات چیت کی۔ بات چیت کرنے میں معلوم ہوا کہ

یاقوت خاں آغا محمد حسین کے بہت بڑے دوست کے بیٹے ہیں۔ ان پر دونوں نہایت خوش ہوئے اور دوڑ کر پھر گلے ملے اور نہایت خوشی کی یہ حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ پھر آغا محمد حسین نے پشتو کا افغانی لہجے میں ایک گیت گایا اور یاقوت خاں نے پشتو کے اشعار پڑھے جو مسٹر بیک پرنسپل کالج کی مدح میں کہے گئے تھے۔ پھر دونوں نے آپس میں ہاتھ پکڑ کر قومی گیت پشتو کا ٹھیک پٹھانوں کی مانند گایا اور چلے گئے۔

اب دس منٹ کی مہلت آرام کے لیے تھی۔

پھر دوبارہ مسٹر کینیڈی، ڈاکٹر موریارٹی، مسٹر اسمتھ اور مسٹر انٹونی اسٹیج پر آئے اور سب نے مل کر ایسا عمدہ انگریزی گیت گایا کہ تمام لوگ عش عش کرنے لگے۔ اب قطب الدین اسٹیج پر آئے اور انھوں نے "بٹیل آف واٹر" کو نہایت خوبی اور فصاحت سے انگریزی میں پڑھا۔ پھر احمد حسین اسٹیج پر آئے اور مولانا حالی کی مثنوی "تعصب و انصاف" پیش کی۔ پوری مثنوی میں پچاس اشعار تھے جن کی ابتدا یوں ہوئی۔

یاد ہے ہم کو وہ عالم اپنا جبکہ ہم آپ تھے اپنے پہ فدا
اپنی جو بات تھی خوش آتی تھی اپنی ایک ایک ادا بھاتی تھی
اپنے انداز کے سودائی تھے اپنے جلوے کے تماشائی تھے
روم کی تھی نہ خبر شام کی تھی آگہی طوس نہ بسطام کی تھی

اس کے بعد عباس حسین اسٹیج پر آئے اور مولانا حالی کے "شکوۂ ہند" کے اشعار جو تعداد میں اکتالیس تھے، نہایت پُرسوز لہجے میں پڑھے۔

رخصت اے ہندوستاں اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن، ہم بدیسی مہماں

مولانا شبلی کے قصیدے کے اشعار پڑھے۔

بزمِ احباب ہے پُرجوش ہے جلسہ کیسا
جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشہ کیسا

یہ قصیدہ بھی طویل تھا اور تیس اشعار پر مشتمل تھا۔

ان کے بعد علیگڑھ کالج کے ایک ہونہار طالب علم مقرر محمد مصطفیٰ خاں چوہدری

اسٹیج پر پہنچے اور قومی ہمدردی کے موضوع پر انگریزی میں نہایت عمدگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پھر خواجہ عبدالعلی نے ملکہ وکٹوریہ کی شان میں یہ دعائیہ مسدس پڑھا۔

زمانہ قیصر کا مدح خواں ہے　　جہاں میں جو ہے وہ شادماں ہے
ہے طفل یا پیر یا جواں ہے　　قوی ہے یا زار و ناتواں ہے
خدا سے کرتے ہیں یہ دعا سب
ہو خیر وکٹوریہ کی یا رب

پروگرام کا آخری جز و یہ دو عربی اشعار تھے جو سر سید احمد خاں، حاجی محمد اسماعیل خاں، مولوی خواجہ محمد یوسف اور دیگر ممبران کالج نے بدوی لب ولہجے میں مسٹر جی کینیڈی کلکٹر علیگڑھ کے اعزاز میں پڑھے۔

نـدعـوا جيبي لكم السلاما　　مـن الالـه ابـداً ودامـا
نحبـه مـبـاركـاً مـادامـا　　وجودكـم يا اكرم الكراما

پھر ہارمونیم باجا بجا اور یہ تھیٹر ختم ہوگیا۔

"اے عزیزو، شاید یہ نتیجہ میری شامت اعمال کا ہو مگر اس کام میں مجھ کو ایک قلی کا سا درجہ ہے۔ مگر کیا تمہاری مسجد و خانقاہ و امام باڑے میں چمار اور چوہڑے چھتری نہیں ڈھوتے اور اس مقدس عمارت کو تعمیر نہیں کرتے۔ تم مجھ کو بھی ایسا ہی سمجھو اور اپنی قومی بھلائی کے کام میں مدد دو۔" (سرسید)

۳

افکارِ سرسیّد

انساں کی اصل عظمت، افکار کی بلندی
کردار کی ہے رفعت، افکار کی بلندی

اکبرالہ آبادی

سرسیداور کالج

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی کی روح
بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے نا تمام
بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم
نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام
تعلیم اگر نہیں ہے زمانے کے حسب حال
پھر کیا امیدِ دولت و آرام و احترام
سیدؔ کے دل پہ نقش ہوا اس خیال کا
ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام
صدمے اُٹھائے رنج سہے گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادمؔ نے اپنا کام
دکھلا دیا زمانے کو زورِ دل و دماغ
بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام
نیّت جو تھی بخیر تو برکت خدا نے دی
کالج ہوا درست بصد شان و احترام

○

ڈاکٹر نورالحسن نقوی

سرسید کا تعلیمی منصوبہ
اور
عہدِ حاضر میں اس کی معنویت*

سرسید نے وہ عہد پایا تھا جب ایک قوم اور ایک تہذیب کے اقبال کا سورج ڈوب رہا تھا اور مسلمانوں کے لیے ایک انتہائی پُرآشوب عہد جنم لینے کو تھا۔ سید احمد خوش نصیب تھے کہ انھوں نے مغل دربار اور کمپنی کے انگریز افسران دونوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ بادشاہ دہلی سید احمد کے والد کو بھائی منتی کہتا تھا۔ اور ان کے نانا دو بار کمپنی کی سفارت کی خدمت انجام دے چکے تھے۔ وہ ایک کی کمزوری اور دوسرے کی طاقت سے بخوبی واقف تھے۔ مستقبل کے ہندوستان کی تقدیر انھیں اس طرح صاف اور واضح نظر آرہی تھی جیسے دیوار پر لکھی ہوئی عبارت۔ انھیں یقین ہوگیا تھا کہ اب ہندوستان ایک عرصے تک انگریزوں کے زیرِ نگیں رہے گا۔ ملازمت کرنے کا وقت آیا تو انھوں نے انگریزی ملازمت کو ترجیح دی اور جب ۱۸۵۷ء کی آگ بھڑکی تو انھوں نے کھل کر انگریزوں کا ساتھ دیا اور اپنی جان پر کھیل کر انگریزوں کے جان و مال کی حفاظت کی۔ کسی لالچ یا کسی خوف سے نہیں بلکہ اس لیے کہ ان کے نزدیک اسی میں ملک و قوم کی بہتری تھی۔

اس ملازمت کے دوران انھیں مسلمانوں کی تباہی کو بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا۔ اور اس سے ان کا ذہنی سکون درہم برہم ہوگیا۔ بقول سرسید مسلمانوں کا یہ حال ہوگیا تھا کہ

"اب تم تمام ہندوستان میں پھرو اور قدیم شہروں اور قدیم قصبوں میں جاؤ اور دیکھو جو معبد کہ ویران اور شکستہ حال پاؤ گے وہ مسلمانوں کی مسجدیں ہوں گی۔ جو چھت بوسیدہ اور خم در خم رسیدہ دیکھو گے وہ سقفِ خانۂ مسلم ہوگی۔ جو دیوار النبیلہ اور از سر تا پا افتادہ پاؤ گے وہ دیوار کسی مسلمان کی محل سرائے کی ہوگی۔" انھوں نے محمد بن تغلق کی اولاد کو ہل چلاتے اور خلیل اللہ شاہجہانی کے پوتوں کو بیر دباتے دیکھا ہے۔

سرسید کا تجزیہ یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے لیکن مسلمان اپنے جوش طبیعت سے مجبور ہوکر پیش پیش ہو گئے اور آخر کار تنہا وہی قصوروار ٹھہرے۔ ایک خط میں غالب نے لکھا ہے کہ دلی میں ہندو تو آباد تھے مگر مسلمان اجڑ گئے تھے اور بلا بحث ان کا داخلہ شہر میں ممنوع تھا۔ انگریز حاکموں کے نزدیک باغی کے معنی تھے مسلمان اور مسلمان کے معنی تھے باغی! سرسید نے اس کی بڑی دردناک تصویر کھینچی ہے۔ لکھتے ہیں "یہ بدبختی کا زمانہ وہ ہے جو ستاون اور اٹھاون میں ہندوستانی مسلمانوں پر گزرا۔ کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانے میں ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی... کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔ جو کتابیں اس ہنگامے کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بولا نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا۔"

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یہ زمانہ روزِ قیامت سے کم نہ تھا۔ ایک خاص طبقے کو چھوڑ کر تمام مسلمان غربت اور جہالت کا شکار تھے۔ تجارت اور صنعت کی طرف ان کی طبیعت کا میلان نہ تھا۔ ملازمتوں میں اب ان کے لیے جگہ باقی نہ رہی تھی۔ بغاوت کے الزام میں ہزاروں مسلمان ملازمت سے برطرف کیے جا چکے تھے۔ ہزاروں جاگیرداروں کی جاگیریں ضبط ہو گئی تھیں۔ بے شمار لوگ سرِعام پھانسی چڑھا دیے گئے تھے سارے ملک کے مسلمان انگریزوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے ہوئے تھے اور اس کے بھی

آثار نہ تھے کہ ایک دن یہ آزمائش کی گھڑی ٹل جائے گی۔ ان حالات نے سرسید کو بہت مضطرب کر دیا تھا مگر مسلمانوں کو اس ادبار سے نکالنے کی کوئی صورت ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ایک مدت اسی غم میں پڑا سوچتا رہا کہ کیا کیجئے۔ جو خیالی تدبیریں کرتا تھا کوئی بن پڑتی معلوم نہ ہوتی تھیں۔ آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کرنا بہتر ہے۔ کر دو جو کچھ کر سکو۔ ہو یا نہ ہو۔ اسی بات پر دل ٹھہرا۔ ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔"

سید احمد نے اس کام کو سب سے مقدم جانا کہ حاکم قوم کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور ان سے انتقام لینے کا جذبہ پرورش پا رہا ہے اسے دور کیا جائے۔ اسباب بغاوت ہند، اور لائل محمڈنز آف انڈیا کی اشاعت کا یہی منشا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے حاکم و محکوم یعنی انگریزوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کی کوشش کی مگر یہ تو محض ایک عظیم الشان مہم کا آغاز تھا۔ اس وقت ان کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کی زبوں حالی کا اصل سبب کیا ہے۔ اس سوال پر غور کیا تو آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی زندگی کا ہر شعبہ اصلاح طلب ہے چنانچہ ان کی رہنمایانہ کوششیں کسی ایک میدان تک محدود نہ رہیں بلکہ انھوں نے مذہب، ادب، سیاست، تعلیم، معاشرت... مسلمانوں کے جملہ مسائل پر توجہ کی۔ اگر انھوں نے اپنی کوششوں اور صلاحیتوں کو کسی ایک شعبے تک محدود اور کسی ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا ہوتا تو شاید اس میں سب سے بڑا ماہر ہونے کا اعزاز پایا ہوتا۔ لیکن اس صورت میں ان کی ذات سے برصغیر کے مسلمانوں کو پورا فیض اٹھانے کا موقع نہ ملا ہوتا۔ اگر وہ صرف قرآن و حدیث کی طرف توجہ کرتے تو بلند پایہ علمائے دین میں گنے جاتے، رشد و ہدایت دینے خانقاہ میں بیٹھ جاتے تو ایک عالم ان سے فیض پاتا، صرف سیاسی امور کی طرف متوجہ ہو جاتے تو میدانِ سیاست میں قوم کے کارواں سالار ہوتے، صرف مسائل تعلیم کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے تو دنیا کے مشہور ماہرِ تعلیم کی صف میں جگہ پاتے، شاعری کرتے تو غالب و اقبال کے ہم پلہ ہوتے مگر وہ مہارت کے تمغے کے طلب گار نہ تھے.. تخصص کا راستہ

وہ اختیار کر ہی نہ سکتے تھے۔ کیونکہ وہ پیدا ہوئے تھے اپنے ملک کے مسلمانوں کو پستی اور ذلت کے گڑھے سے نکالنے کے لیئے۔ اور ان مسلمانوں کو ضرورت تھی ایک ایسے ماہر طبیب کی جس کے پاس ہر مرض کا علاج اور ہر درد کا مداوا ہو۔ چنانچہ سرسید نے اپنے دائرہ کار کو محدود نہیں کیا۔ پھر بھی وہ کون سا میدان تھا جس میں وہ قیادت کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں اور برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جو سرسید کے احسان سے گراں بار نہ ہو۔

انھوں نے بے عملوں کو جدوجہدِ عمل کا درس دیا، تنہا نشینوں کو گوشۂ تنہائی سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا، ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا۔ تنگ نظروں کو وسعتِ نظر سکھلائی، محض اجداد کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنے آپ میں اوصاف پیدا کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ مشرق کے پجاریوں کو مغرب سے روشناس کیا، تقلید پرستوں کو اجتہاد کی اہمیت سے آگاہ اور غور و فکر، تجزیہ و استدلال کی ضرورت سے باخبر کیا، دنیا کو بے حقیقت سمجھنے والوں کو دنیا میں نیکی کمانے اور آخرت کے لیے توشہ جمع کرنے کا راستہ دکھایا، انھوں نے سوتوں کو جگایا، مُردوں میں جان ڈالی۔ غرض یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کو زندہ قوموں کی طرح زندگی گزارنے اور سربلند ہو کر جینے کا سلیقہ سکھایا۔ قومیں سربلند ہو کر کس طرح زندگی گزار سکتی ہیں اس پر مسلسل غور کرنے کے بعد آخر کار انھوں نے ایک نسخۂ کیمیا تلاش کر لیا اور وہ نسخۂ کیمیا تھا تعلیم ... ایسی تعلیم جو اپنے زمانے کی ساری ضرورتوں کو پورا کرتی ہو۔ انھوں نے تعلیم کا جامع منصوبہ تیار کیا جو آج بھی اتنا ہی کارآمد ہے جتنا سرسید کے عہد میں تھا

ملک و قوم کو درپیش مسائل پر سرسید نے جب سے غور کرنا شروع کیا، غالباً اسی وقت سے یہ حقیقت ان پر پوری طرح واضح تھی کہ ہر مسئلے کا حل تعلیم کے فروغ میں پوشیدہ ہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے فوراً بعد کے چند برس انھوں نے دو اہم کاموں میں صرف کیے۔ انگریزوں کے دلوں سے جذبۂ انتقام کو دور نہ کیا جا سکے تو اسے کم کرنا اور دوسری طرف ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی انگریز دشمنی کو ختم کرنا۔ ان دونوں کاموں میں مکمل کامیابی کا حاصل ہونا تو بہت دشوار تھا لیکن

کسی حد تک کامیابی کے آثار نظر آنے لگے تو وہ اصل کام یعنی تعلیم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مراد آباد اور غازی پور میں مدرسوں کا قیام اس سمت میں ان کا پہلا قدم تھا۔

اس وقت تک سر سید ہندو مسلمان دونوں کی تعلیم کے لیے یکساں طور پر کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ غازی پور کے مدرسے کا وزیٹر اور پیٹرن راجا ہر دیو نرائن سنگھ کو مقرر کیا گیا تھا۔ یہ بات صرف ابتدائی زمانے تک محدود نہیں پورے ملک کے باشندوں کا مفاد ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا۔ یہ بہت بعد کی بات ہے کہ انھوں نے ایک تقریر میں فرمایا کہ:

"جو لوگ ملک کی بھلائی چاہتے ہیں ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم و مذہب کے کل باشندگانِ ملک کی بھلائی پر کوشش کریں۔ کیونکہ جس طرح ایک انسان کی اس کے تمام قویٰ اور اعضاء کے صحیح و سالم رہے بغیر زندگی یا پوری تندرستی محال ہے، اسی طرح ملک کے تمام باشندوں کی خوشحالی اور بہبود کے بغیر ملک کی ترقی ناممکن ہے۔"

ایک اور موقع پر انھوں نے کہا تھا کہ:

"ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے، ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں، ایک دریا کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں، ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے، ایک کو دوسرے سے ملے بغیر چارہ نہیں۔ پس کسی چیز کو جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہے، ان دونوں کا علاحدہ علاحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دینا ہے۔"

اس وقت جب ملک میں ایک مضبوط حکومت قائم ہو چکی تھی اور ایسی صورت میں کہ حکمراں قوم تعلیم کی دولت سے مالا مال تھی اور وہ تمام وسائل اس کی دسترس میں تھے جن کی مدد سے محکوم ہندوستان میں تعلیم کو عام کیا جا سکتا تھا، اگر کوئی دردمند ہندوستانی تعلیم کے میدان میں انگریزوں سے تعاون و سرپرستی کی توقع رکھتا تو وہ

حق بجانب تھا۔ لیکن حالات و واقعات نے جلد ہی واضح کر دیا کہ تاجروں کے اس ٹولے سے ایسی توقعات وابستہ کرنا نادانی ہے۔ ۱۸۹۳ء کا یہ واقعہ بھلایا نہیں جا سکتا کہ جب ولبر فورس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کے لیے انگلستان سے اسکول ٹیچرز بھیجے جائیں تو اس کی شدت سے مخالفت کی گئی بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ تعلیم کو عام کرنے کی اسی خواہش کے نتیجے میں امریکہ برطانوی تسلط سے آزاد ہو گیا اور اس حماقت کو ہندوستان میں دہرانا مضر ہوگا۔

۱۸۱۳ء میں حالات کچھ بدلے اور برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان میں تعلیم کے انتظام کو انگریزی حکومت کی ذمہ داری قرار دیا اور بنگال، کلکتہ اور بمبئی کی تینوں پریذیڈنسیوں کے لیے دس دس ہزار روپے تعلیم کی مد میں منظور کیے گئے۔ ۱۸۱۷ء میں لارڈ ہیسٹنگز نے ہندوستانیوں کی تعلیم پر مزید زور دیا جس کے نتیجے میں کلکتہ اسکول بک سوسائٹی اور ہندو کالج کا قیام عمل میں آیا اور ان اداروں کی ہمت افزائی کی گئی جو دیسی زبانوں یا دیسی زبانوں کے ذریعے قدیم علوم کی تدریس میں مصروف تھے یہ سلسلہ کچھ عرصے جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کی صلاح پر ان اداروں کی امداد بند کر دی گئی۔ یہی وہ نظام تھا کہ مسلمان جس کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔ یہ دروازہ بند ہونے کا مطلب تھا کہ مسلمانوں کو تعلیم کے معاملے میں انگریزی حکمرانوں کی طرف سے مایوس ہو جانا چاہیئے۔

دیگر اہلِ وطن کا معاملہ مسلمانوں کے برعکس تھا۔ نہ تو وہ جدید تعلیم سے بیزار تھے کہ انگریزی سرپرستی سے نہ فائدہ اٹھا سکیں اور نہ ان کی مالی حالت مسلمانوں کی طرح ایسی سقیم تھی کہ اپنے تعلیمی اداروں کے اخراجات خود برداشت نہ کر سکیں۔ بنگال میں راجا رام موہن رائے اور ڈیوڈ ہیر کی کوششوں سے ایک انگریزی مدرسہ قائم ہو چکا تھا۔ اس مدرسے نے کافی ترقی کی اور اس کے طلبا کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۸۲۸ء میں چار سو چھتیس طالب علم اس مدرسے میں زیرِ تعلیم تھے۔ بنارس میں وہاں کے ایک رئیس جے نرائن گوشال کی کوشش اور مالی امداد (بیس ہزار روپے نقد اور اراضی) سے ۱۸۱۸ء میں ایک انگریزی مدرسہ قائم ہو چکا تھا۔ ۱۸۲۱ء میں انگریزی حکومت نے

کلکتہ سنسکرت کالج قائم کیا لیکن ؛ وسال کے اندر ہی اس کی شدید مخالفت شروع ہوگئی۔ راجا رام موہن رائے نے اس کالج کے خلاف گورنر جنرل کو ایک یاد داشت بھیجی جس میں کہا گیا تھا کہ حکومت کے اس قدم کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی باشندوں کو تاریکی میں رہنے دیا جائے۔

اس کے برعکس مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ راجہ رام موہن رائے اور ان کے ساتھیوں کے میمورنڈم کے بارہ برس بعد ۱۸۳۵ء میں جبکہ بقول حالی واقعہ مذکورہ پر گیارہ بارہ برس گزر چکے تھے اور ہندوؤں کا شوق دوبالا ہو گیا تھا، کلکتہ کے مسلمانوں نے جس وقت یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انھوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخط تھے۔ اس درخواست کا لب لباب یہ تھا کہ حکومت کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔

مسلمانوں کے یہ شبہات بے بنیاد نہ تھے۔ انگریزی اسکولوں میں جدید تعلیم کے ساتھ عیسائیت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ان اسکولوں میں کسی نہ کسی بہانے عیسائی عقائد کا پرچار کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کا رویہ مذہب کے بارے میں ہمیشہ بے حد مستحکم رہا ہے۔ سرسید اپنی ساری وسیع القلبی کے باوجود اسے ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے بار بار اس کے خلاف آواز اٹھائی اور ایجوکیشن کمیشن کے روبرو شہادت دیتے ہوئے اس طریق کار کی مذمت کی۔ دوسری بات یہ کہ مسلمانوں نے جس سرزمین پر قدم رکھا بالعموم فاتح کی حیثیت سے رکھا اور وہاں اپنے علوم و فنون کو رواج دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انھیں اپنی زبان اور اپنے علوم ترک کر کے دوسرے علوم اور کوئی دوسری زبان سیکھنی پڑ رہی تھی۔ صدیوں حکومت کرنے کے بعد ان میں خود کو حالات کے مطابق ڈھال لینے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اخبار نے لکھا تھا کہ:

> "ہندوؤں کے سامنے اس طرح کے فخر و امتیاز کے مٹنے اور ایسے حالات سے نمٹنے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے آسانی سے سر تسلیم خم کر دیا اور جس صورت حال کا ان کو سابقہ تھا اس سے اپنے کو ساز کر لیا۔ جہاں

وہ حکومت نہیں کرسکتے تھے، وہاں انھوں نے حکم برداری قبول کرلی۔ اس طرح بیشتر حالات میں انھوں نے جہاں کہیں جیسا موقع دیکھا اس میں اپنے کو ڈھال لیا۔۔۔ مسلمانوں کا طرزِ عمل دانشمندانہ نہ تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو تمام ملازمتوں سے علاحدہ رکھ کر اس تعلیم سے خود کو محروم کرلیا جسے انگریزی حکومت یا دوسری ایجنسیاں ان کے لیے فراہم کرتی تھیں اور جو ان کو سرکاری آسامیوں کے قابل بنا سکتی تھی۔ اس دوران میں ہندو بالخصوص بنگالی نے اس حقیقت کو پالیا کہ علم زور بھی ہے اور زر بھی۔"

یہ تھا وہ پس منظر جس میں سرسید نے اپنی تعلیمی مہم کا آغاز کیا۔ زندگی کے آخری لمحے تک تمام ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود ان کے پیش نظر رہی لیکن مسلمانوں کی پسماندگی اور زبوں حالی ان سے خصوصی توجہ کا مطالبہ کرتی رہی۔ انھیں اپنے ملک کے ہندو اور مسلمان دو ایسے بھائی نظر آتے تھے جن میں سے ایک بیمار ہے اور دوسرا صحت مند۔ اس لیے انھیں مردِ بیمار کی زیادہ فکر رہی۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا تھا کہ جو حالت مسلمانوں کی ہے اگر وہ ہندوؤں کی ہوتی تو میں ان کی طرف یقیناً زیادہ توجہ کرتا۔

اور اب پیش خدمت ہے سرسید کے تعلیمی منصوبے کی تفصیل!

سرسید کی تعلیمی مہم کا باقاعدہ آغاز غازی پور سے ہوا۔ بہت غور و فکر کے بعد انھوں نے ایک تجویز تیار کی جسے ۹ جنوری ۱۸۶۴ء کے ایک جلسہ عام میں پیش کیا گیا۔ اس کا عنوان تھا "التماس بخدمت ساکنانِ ہندوستان درباب ترقی تعلیم اہلِ ہند" یہ دراصل اعلان تھا سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا۔ سوسائٹی کے قائم کرنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ یورپی زبانوں میں علوم و فنون کا جو بیش بہا ذخیرہ موجود ہے اسے ہندوستانی زبان یا زبانوں میں منتقل کرنا۔ نیز قدیم ایشیائی مصنفین کی کمیاب اور نفیس کتابوں کو دریافت کرنا اور چھاپنا۔ کوئی گزٹ، اخبار یا روزنامچہ شائع کرنا بھی سوسائٹی کے پروگرام میں شامل تھا۔

دراصل زمانے نے ثابت کردیا تھا کہ قدیم علوم آج بے مصرف ہیں۔ آج

ضرورت ہے تو اس علم کی جو انگریزی یا دوسری مغربی زبانوں میں موجود ہیں۔ اس فرق کو ان لفظوں میں واضح کرتے ہیں:

"ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ مسجدوں اور خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی مسائل کو عقلی براہین سے توڑتے چھوڑتے رہیں اور ان کو تسلیم نہ کریں۔ مگر اس زمانے میں نئی صورت پیدا ہوئی جو اس زمانے کے فلسفے و حکمت کی تحقیقات سے بالکل علاحدہ ہے۔ اب مسائل طبعی تجربے سے ثابت کیے جاتے ہیں اور وہ ہم کو دکھا دیئے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں جو قیاسی دلائل سے اٹھا دیئے جاویں۔"

اس سوسائٹی نے سائنس کی طرف بطور خاص توجہ کی۔ اس کے جلسوں میں اس موضوع پر لیکچر دیئے جاتے تھے اور تجربات کرکے دکھلائے جاتے تھے۔

دو سال بعد جب ورنا کولر یونیورسٹی حکومت کے سامنے پیش کی گئی تو یہ خیال اور پختہ ہو چکا تھا کہ ہندوستان کو ترقی کرنی ہے تو مغرب کے علمی خزانوں سے فیض اٹھانا ضروری ہے۔ اپنی رپورٹ میں انھوں نے اعتراف کیا کہ ایشیائی مصنفین کی بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن کا مواد آج غیر مفید ہے اور برخلاف اس کے آجکل دنیا میں بہت سے ایسے علوم و فنون کی گرم بازاری ہے جو زمانہ حال کی ایجادیں اور ان کا حال ہمارے بزرگوں کو بالکل معلوم نہ تھا۔ ان تک رسائی کا بہترین ذریعہ سرسید کے نزدیک یہی تھا کہ انگریزی زبان سیکھی جائے۔ لیکن یہ ہر ایک کے امکان میں نہیں۔ اس سرمائے کے عام لوگوں تک پہنچنے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ یہ ذخیرہ دیسی زبانوں میں منتقل ہوتا کہ ان زبانوں کے ذریعے یہ زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ انھوں نے کہا کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان بھی ہو لیکن تعلیم کو عام کرنے کے لیے دیگر دیسی زبانوں کو بھی ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ اپنے نقطۂ نظر کی صراحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ:

"اس بات کا خیال کرنا بے جا ہے کہ دیسی زبان کے ذریعے سے اعلیٰ درجے کی تعلیم کرنا انگریزی زبان کو مضر اور حارج ہوگا۔ کیونکہ یہ کہنا بھی

تو اسی طرح سے صحیح نہیں ہے کہ نہر اور سڑکوں دونوں کا ایسے مقاموں میں بنانا جہاں دونوں کی ضرورت ہے، مضر اور ایک دوسرے کا مخالف اور مانع ہوگا۔ حالانکہ یہ دونوں کام ایسے جداگانہ ہیں کہ اپنی ذات سے ہر ایک فیض بخش ہے اور ایک دوسرے کا حارج اور مزاحم نہیں ہے۔"

اپنی تجویز میں سرسید نے بہت زور دے کر کہا کہ بدیسی زبان میں علم حاصل کیا جائے تو طالب علم کا دوگنا وقت صرف ہوتا ہے۔ اس کا سارا وقت اس زبان پر صرف ہو جاتا ہے جس کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے اور اس علم کو حاصل کرنے کے لیے کافی وقت نہیں ملتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ کسی بدیسی زبان کے ذریعے حاصل کیا گیا علم جزوِ ذہن نہیں بن جاتا اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد رفتہ رفتہ ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔

اس تجویز کے جواب میں سرسید کو حکومت کے سکریٹری کی طرف سے ایک جواب موصول ہوا جس میں ورناکولر یونیورسٹی کی تجویز کو سراہا گیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ مشکلات بھی گنائی گئی تھیں جن کے سبب اس یونیورسٹی کا قیام ناممکن تھا اور نہ مناسب۔ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ بتائی گئی تھی کہ دیسی زبانوں میں ایسا مواد موجود نہیں جو اعلیٰ تعلیم کے لیے درکار ہے۔ بالفرض نصاب کی کتابوں کا ترجمہ بھی ہو جائے تو یہ ناکافی ہوگا کیونکہ تعلیم کے لیے نصابی کتابوں کے علاوہ امدادی کتب اور دیگر ساز و سامان کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ آخر میں کہا گیا تھا کہ پسندیدہ ہونے کے باوجود یہ ممکن نہیں کہ حکومت تعلیم کے جملہ اخراجات کی کفیل ہو سکے۔

اس کے بعد سرسید ورناکولر یونیورسٹی کی اسکیم سے دستبردار ہو گئے۔ یہ اندازہ لگانا غلط ہوگا کہ حکومتِ ہند کے سکریٹری کا متذکرہ بالا خط سرسید کے خیال کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسا کہ بعد کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے، سرسید برابر اس مسئلے پر غور کرتے رہے اور آخرکار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دیسی زبانوں کے ذریعے جدید علوم کی تدریس ممکن نہیں۔ ان زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانا ہندوستان میں تعلیمی ترقی کے لیے مضر بلکہ مہلک ہے۔ بنگال کی مثال ان کے سامنے تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جنھوں نے انگریزی زبان کے ذریعے جدید علوم کی تحصیل کی وہ کامیاب رہے اور

تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے۔

سرسید بہت غور و فکر کے بعد کوئی رائے قائم کرتے تھے اور نہایت مضبوطی سے اس پر قائم رہتے تھے۔ لیکن ایک دو نہیں ان کی زندگی کے متعدد واقعات گواہ ہیں کہ وہ اپنی رائے پر نظر ثانی کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے انھوں نے جب جب اپنی رائے کو غلط پایا فوراً اس میں ترمیم کرلی۔ ذریعہ تعلیم کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جس شد و مد کے ساتھ انھوں نے دیسی زبانوں کی حمایت کی تھی، آگے چل کر اسی شدت کے ساتھ اس کی مدلل مخالفت کی۔ انھوں نے کہا:

"یہ خیال بہت پرانا ہے کہ اگر ہماری تعلیم ہماری زبان میں ہو تو ہمارے لیے اور ملک کی ترقی کے لیے زیادہ تر مفید ہے۔ لارڈ میکالے سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس پر بہت کچھ عمل کیا تھا... جن ملکوں نے اس زمانے میں اعلیٰ درجے کی ترقی کی ہے اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ انھوں نے تمام علوم و فنون کو اپنی زبان میں کرلیا ہے مگر جن ملکوں نے ایسا کیا ان میں ایک ہی قوم اور ایک ہی زبان حکومت کرتی ہے مگر ہندوستان میں نہ ہندوستانی حکومت کرتے ہیں نہ یہاں کی زبان حکمراں ہے... ہندوستان میں اس خیال کا پیدا کرنا کہ ہم مشرقی علوم کو ترقی دے کر عزت دولت، حشمت و حکومت حاصل کرلیں گے۔ بعینہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی امریکہ کے باشندوں کو یقین دلائے کہ تم اپنی دیسی زبان اور دیسی علوم میں (جو کچھ کہ ہوں) ترقی کر کے اپنی حکمراں قوم میں عزت و دولت و حشمت حاصل کرو گے۔"

ایجوکیشن کمیشن کے روبرو شہادت دیتے ہوئے سرسید نے پرزور الفاظ میں کہا:

"ہم کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ خود ہم نے اسی اصول پر سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی اور بہت کچھ مباحثہ اور تکرار گورنمنٹ سے کی تھی اور اب ہم اس کے برخلاف ہیں اور ہاں یہ بات سچ ہے... مگر اس زمانے اور حال کے زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں انگریزی

علوم کی حاجت نہ تھی یا یوں کہو کہ قدر نہ تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کے لیے
ادنیٰ درجے کی مشرقی تعلیم کافی تھی... اس زمانے کے مناسب حال
بلاشبہ اس شخص کو جو سچے دل سے اپنے ملک و قوم کی ترقی کا خواہاں ہو،
اس خیال کا پیدا ہونا کہ ہم دیسی زبانوں کے ذریعے ملک و قوم کو ترقی
دیں نہایت واجب اور سچا خیال ہو سکتا ہے مگر رفتہ رفتہ تمام حجابات
رفع ہوتے گئے اور خود زمانے نے بتا دیا کہ کدھر جاتے ہو اور ٹھیک
رستہ کدھر ہے۔"

ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں سر سید کو عملی تجربے کا موقع بھی دستیاب ہوا اور یہ
خیال ان کے دل میں جاگزیں ہو گیا کہ صرف انگریزی زبان کو بطور ذریعہ تعلیم اختیار کرنا
اہلِ ہند کے مفاد میں ہے۔

سائنٹفک سوسائٹی کے بعد تعلیم کے میدان میں سر سید کا سب سے اہم قدم
محمڈن کالج کا قیام ہے جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک نئی اور کامیاب و کامران زندگی
کا راستہ دکھایا۔ لیکن کالج کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے سر سید کے سفرِ انگلستان کے بارے
میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ یہ سفر ۱۸۶۹ء میں پیش آیا۔ اس کے لیے سر سید کو طرح طرح
کی قربانیاں دینی اور طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔ یہیں رہ کر انھوں نے
ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا جس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ قیام مدرسہ کے سلسلے
کی ابتدائی تیاریاں یہیں مکمل ہوئیں۔ یہاں سر سید کو اعلیٰ تعلیم کی درس گاہوں کو دیکھنے
اور ان کے طریق کار کو سمجھنے کا موقع ملا۔ یہیں بعض علما و مفکرین سے ملاقات اور ان سے
تبادلہ خیال کے مواقع بھی میسر آئے۔ یہیں انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان لوٹ کر
وہ ایڈیسن اور اسٹیل کے پرچوں کے نمونے پر ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری
کریں گے۔

قیام انگلستان کے دوران وہ تعلیم کے مسائل پر مسلسل غور کرتے رہے۔ انگلستان
پہنچنے کے تقریباً فوراً ہی بعد انھوں نے ایک مختصر رسالہ Structures upon
the press education system in Indu شائع کیا۔ ہندوستان میں اس
وقت رائج تعلیم میں جو خرابیاں نظر آئیں وہ اس رسالے میں بیان کی گئی ہیں۔ اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک وہ تعلیمی مسائل پر بہت گہرائی سے غور کر چکے تھے انگلستان میں سرسید کو ایک سہولت یہ میسر تھی کہ انگریزی زبان سے بخوبی واقف اور جدید ذہن رکھنے والے سید محمود یہاں ان کے ساتھ تھے۔ اپنے ملک کے مسلمانوں کے لیے جو تعلیمی منصوبہ سرسید نے انگلستان میں تیار کیا اس میں سید محمود کا بھرپور تعاون شامل تھا۔

• ہندوستان واپس آنے کے تقریباً دو ماہ بعد یعنی دسمبر ۱۸۷۰ء میں سرسید نے "تہذیب الاخلاق" جاری کر دیا۔ یہ رسالہ سرسید کے آئندہ پروگرام کا اشاریہ تھا سارے ملک میں اس کا نوٹس لیا گیا، وہ تحریک جو آگے چل کر سرسید تحریک اور علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی، پہلے پہل "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے ملک میں روشناس ہوئی۔ تحریک کے مخالفین مخالفت میں اور موافقین موافقت میں کمر بستہ ہو گئے۔ مگر کالج کے قیام کے لیے راہیں ہموار ہو گئیں۔ اب انھوں نے وہ پمفلٹ شائع کیا جس کا مضمون غالباً وہ انگلستان سے تیار کر کے لائے تھے۔ اس کا عنوان تھا "التماس بخدمت اہلِ اسلام و حکام ہند درباب ترقی تعلیم مسلمانانِ ہندوستان" حالی کے الفاظ میں اس پمفلٹ کا خلاصہ تھا:

"تعلیم کے جو فائدے ہندوستان کے باشندے عام طور پر اٹھا رہے ہیں اور مسلمان ان سے مستفید نہیں ہوتے، اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جو اسباب اور لوگوں نے اب تک بیان کیے ہیں ان پر کافی بھروسہ نہیں ہو سکتا اور یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ درحقیقت وہی اسباب ہوں۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصل جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضروری ہے۔ پس مناسب ہے کہ ایک انعامی اشتہار جاری کیا جائے اور مسلمانوں کو اس مسئلے پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے اور اس کام کے لیے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے۔ جب چندہ بقدرِ ضرورت جمع ہو جائے اس وقت چندہ دہندگان میں سے میر منتخب کر کے ایک کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان منعقد کی جائے۔"

سرسید جن کی زندگی کا کوئی لمحہ قوم کی فکر سے خالی نہ تھا ممکن نہ تھا کہ قومی تعلیم کا نقشہ بار بار ان کے ذہن میں ابھرتا اور سنورتا نہ رہا ہو۔ پھر بھی انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ جدید تعلیم کو مسلمانوں میں عام کرنے کے لیے جو تدبیریں اختیار کی جائیں اس میں قوم کے زیادہ سے زیادہ دردمندوں کا تعاون حاصل ہو۔ چنانچہ انعامی اشتہار جاری کیا گیا جس کے جواب میں بائیس مضامین موصول ہوئے ان مضامین کا خلاصہ خود سرسید نے تیار کیا۔ "کمیٹی خواستگار ترقیٔ تعلیم مسلمانان" بنارس میں قائم کی جا چکی تھی اور سرسید اس کے سکریٹری منتخب کیے گئے تھے۔ مضامین کا خلاصہ اس کمیٹی کے ایک اجلاس منعقدہ مئی ۱۸۷۲ء میں پیش ہوا اور بحث و مباحثے کے بعد مجوزہ کالج کا ایک خاکہ تیار ہو گیا۔ ۱۸۷۳ء کے اجلاس میں سید محمود نے کالج کی اسکیم پیش کی اور ان چند شرائط کو کالج کے لیے لازمی قرار دیا۔

۱۔ پہلی اہم بات یہ کہی گئی کہ کالج کی انتظامیہ پر حکومت کا قطعاً اختیار نہ ہونا چاہیئے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ کوشش کر کے معقول اور مستقل سالانہ آمدنی کا انتظام کیا جائے تاکہ اخراجات کے لیے ادارہ کسی بیرونی امداد کا محتاج نہ رہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ وہ مضامین جس سے عملاً کوئی فائدہ نہیں ہوتا لیکن ذہنی نشوونما میں مدد ملتی ہے وہ بھی کالج میں پڑھے جائیں۔

۴۔ طلبار کی مالی منفعت کو مدِ نظر رکھا جائے۔

۵۔ تعلیم مکمل ہونے پر کامیاب طلبار کو بغیر کوئی ذمہ داری سونپے ہوئے علمی کام جاری رکھنے کے لیے وظائف دیئے جائیں۔

۶۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کالج کو لازمی طور پر اقامتی ادارہ بنایا جانا چاہیئے۔

کالج کے قیام کے لیے علی گڑھ کا انتخاب کیا گیا۔ سرسید کے بیشتر رفقار کو علم تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سرسید کا ارادہ علی گڑھ میں قیام کا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ اسی جگہ کا انتخاب کیا جائے۔ استصواب رائے کے بعد کس طرح مولوی سمیع اللہ کے تعاون سے علی گڑھ میں ابتدائی جماعتوں کا آغاز ہوا اور

کس طرح کالج نے ترقی کی اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں جو عرض کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ ابتداً کالج کو دو صیغوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلا صیغہ انگریزی جس میں تمام علوم کی تدریس انگریزی زبان میں کی جاتی تھی۔ دوسرا صیغہ علوم مشرقی جس میں جملہ علوم اردو زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔ پہلے صیغے میں عربی، فارسی، سنسکرت ثانوی زبان کے طور پر پڑھائی جاتی تھیں۔ اسی طرح دوسرے شعبے میں انگریزی علوم ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائے جاتے تھے۔

جدید علوم کا شعبہ برابر ترقی کرتا رہا لیکن قدیم علوم کا شعبہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا سید محمود کو شکایت تھی کہ اس شعبے کو نظر انداز کیا گیا اور اسے ختم ہو جانے دیا گیا۔ یہ گمان ہو سکتا ہے کہ کالج کے منتظمین نے دانستہ طور پر اس سے بے توجہی برتی۔ کیونکہ وہ خود اسے برقرار رکھنا نہیں چاہتے تھے اور اس کے قائم کرنے میں صرف یہ مصلحت تھی کہ پرانے خیالات کے لوگ کالج کی مخالفت سے باز آ جائیں۔ اس قیاس کی تصدیق یا تردید کے لیے کافی شواہد موجود نہیں ہیں۔ البتہ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں بیچلر آف آرٹس اور ماسٹر آف آرٹ کے ساتھ ساتھ بالغ العلوم اور مالک العلوم کے نصابات بھی شروع کیے گئے تھے۔ ان نصابات کا حشر بھی وہی ہوا جو مدرستہ العلوم میں مشرقی علوم کے شعبے کا ہوا۔

تجربہ شاہد ہے کہ صرفِ کثیر سے جو تعلیم حاصل کی جاتی ہے اس سے کسی نہ کسی درجے میں مالی منفعت یا حصولِ معاش مقصود ہوتی ہے۔ محمڈن کالج کی بنیاد رکھی گئی تو مسلمانوں کی اقتصادی حالت خاص طور پر خراب تھی۔ چنانچہ جن لوگوں نے اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ بھیجا ان کا مدعا یہ تھا کہ یہ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اونچے عہدے پا سکیں گے۔ جو لوگ اپنی اولاد کو مشرقی تعلیم دلانا چاہتے تھے وہ بہ آسانی ان اداروں کا انتخاب کر سکتے تھے جو پہلے سے اس کام میں مصروف تھے۔ نتیجہ یہ کہ علی گڑھ ان طلبا کا مرکز بن گیا جو سرکاری ملازمت کے متلاشی تھے۔ سر سید ملازمت کو اسفل ترین پیشہ قرار دیتے تھے لیکن ان کے ادارے نے ایسے لوگ تیار کیے جن میں سے بیشتر کا رجحان ملازمت کی طرف تھا۔ بظاہر یہ ایک طرح کا تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن سر سید کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے ان کی تعلیمی

اسکیم کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

سرسید کا مجوزہ نظام تعلیم نہایت ہمہ گیر ہے۔ وہ تعلیم کو خاص و عام سب کے لیے ضروری بتاتے ہیں اور تعلیم حاصل کرنے والوں کو چھ حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلی جماعت ان لوگوں کی ہے جو سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے خیال سے تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو ملازمت کے متلاشی نہیں بلکہ تجارت یا صنعت و حرفت کو ذریعہ معاش بنانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے کاروبار کو بہتر طریقے سے چلا سکیں گے تیسری قسم زمینداروں اور جاگیرداروں کی ہے۔ یہ اس خیال سے تعلیم حاصل کرتے ہیں کہ اپنے علاقے کا انتظام بہتر طور پر کر سکیں اور اپنے دوسرے کاموں کو بھی خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔ چوتھی جماعت ان لوگوں کی ہے جو مختلف علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کرنے اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کرنے کے خواہش مند ہیں۔ پانچواں گروہ علم دین حاصل کرنا چاہتا ہے، چھٹی قسم عوام الناس کی ہے کہ ذریعہ معاش خواہ کچھ بھی ہو لیکن تھوڑی بہت تعلیم کامیاب زندگی گزارنے کے لیے بہرحال ضروری ہے۔

مدرستہ العلوم میں ان چھ میں سے کون کون سی جماعتیں زیرِ تعلیم رہیں، یہاں یہ جاننا ضروری ہے۔ سب سے پہلے ہم چھٹی اور آخری جماعت کو لیتے ہیں۔ یعنی عوام الناس۔ ان کے لیے کالج میں داخلہ لینے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پانچویں جماعت جو اپنی تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی وہ دینی تعلیم کے ان نامور اداروں میں داخلہ لیتی تھی جو ایک عرصے سے یہ خدمت انجام دے رہے تھے۔ محمڈن کالج میں دینی تعلیم شروع سے داخلِ نصاب رہی اور سرسید نے اس کے سلسلے میں علماء کا تعاون حاصل کرنا چاہا مگر ان علماء نے وہ روش اختیار کی جو بقول رشید احمد صدیقی کے ان علماء کے رہنایانہ منصب کے شایانِ شان نہ تھی۔

تعلیم پانے والوں کا وہ گروہ جو مختلف علوم میں مہارت حاصل کرکے تصنیف و تالیف میں مشغول ہو جانے کا آرزومند تھا، کالج سے فارغ التحصیل ہو کر نکلا ضرور، لیکن دیر سے۔ ابتدا میں یہ ہوتا تھا کہ ایک خاص سطح تک تعلیم حاصل کر لینے کے بعد

طالب علم کو ملازمت مل جاتی تھی اور سلسلۂ تعلیم منقطع ہو جاتا تھا۔ قدیم نظامِ تعلیم کے برعکس جدید نظامِ تعلیم میں مضامین کی تعداد ابتدائی مراحل میں زیادہ ہوتی ہے اور جتنے اوپر چڑھتے جایئے مضامین کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ گویا اس کی شکل اہرامِ مصر کی سی ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی خاص مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ گریجویشن کے بعد کئی سال تعلیم میں صرف کیے جائیں اور اس زمانے کے حالات اس کی اجازت نہ دیتے تھے، حالانکہ سرسید کی خواہش یہی تھی اور فیلوشپ کا خواب تخصیص کے اسی مقصد سے دیکھا گیا تھا کہ جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اس کو کسی خاص علم میں جس سے وہ مناسبت رکھتا ہو، مصروف رہے اور اس میں کمال حاصل کرنے کے لیے فیلوشپ دی جایا کرے اور اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال پھیلانے کے لیے بمنزلہ آلے کے ہو۔"

تیسری قسم زمینداروں اور جاگیرداروں کی تھی جو اس مقصد سے تعلیم حاصل کر سکتی تھی کہ جاگیر کی نگہداشت میں آسانی ہو۔ اوّل تو مسلمان جاگیردار رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جاتے تھے دوسرے جائیداد کی دیکھ بھال میں نئی تعلیم زیادہ کارآمد نہ ہو سکتی تھی۔ لہٰذا جاگیرداروں کے لڑکوں نے تعلیم حاصل کی تو انھوں نے بھی سرکاری عہدوں کو ترجیح دی۔ دوسری قسم یعنی تاجروں کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ کیونکہ تجارت کی طرف مسلمان مائل ہی نہ ہو سکے۔ سرسید نے ایک دفعہ کہا تھا:

"اندرونی تجارت بالکل ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ جو تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے وہ انھی کے ہاتھ میں رہنے دو کیونکہ نہ ہم دکان پر بیٹھ کر آٹا دال بیچ سکتے ہیں نہ سوت کپاس۔"

اس لیے تعلیم اور تجارت میں کوئی ربط و تعلق پیدا ہو ہی نہ سکا بلکہ مسلمان عام طور پر ان علوم کی طرف بھی ملتفت نہ ہوئے۔ جو تجارت میں کسی طرح مفید ہو سکتے تھے مثلاً ریاضی کی طرف مسلمان کم ہی راغب ہوئے۔

غرض یہ کہ پہلی قسم یعنی سرکاری عہدوں کے متلاشی ہی کالج کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبا نے بالعموم ملازمت ہی کو ذریعۂ معاش

بنایا اور کالج کے منتظمین نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ خود سرسید ملازمت کو ناپسند کرنے کے باوجود اس خواہش کا اظہار بھی کرتے تھے کہ کاش مسلمانوں میں بھی اعلیٰ عہدے دار ہوتے، کرنیل، جرنیل ہوتے اور وہ بھی اپنے دوسرے ہم وطنوں سے کاندھا ملا کر کھڑے ہو سکتے۔ غالباً سرسید اعلیٰ عہدوں کو پسند اور معمولی ملازمتوں کو ناپسند کرتے تھے ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان جن حالات سے دوچار تھے ان میں یہ حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کر کے کہ مسلمان بھی سرکاری ملازمتوں کی طرف متوجہ ہوں، سرسید نے دانشمندی کا ثبوت دیا۔ اگر اس طرف بروقت توجہ نہ کی گئی ہوتی تو مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی حالت کا بہتر ہونا ممکن نہ تھا۔

سرسید کا خیال تھا کہ جب تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کثرت ہو گی تو وہ دوسرے مشاغل کی طرف بھی توجہ کریں گے۔ اس بات کو سرسید نے ایک حکایت سے واضح کیا تھا۔

"ایک دہقان کے بیٹے نے نہایت اضطراب کی حالت میں باپ سے پوچھا کہ "گاؤں کے تالاب میں برابر پانی چلا آتا ہے۔ تالاب بھرنے پر یہ پانی کہاں جائے گا؟" باپ نے کہا "بیٹے فکر نہ کر جب تالاب بھر جائے گا تو پانی اپنے نکاس کا راستہ آپ نکال لے گا"

یہ کہانی سنا کے سرسید نے فرمایا تھا کہ ابھی تعلیم یافتوں کی قلت ہے۔ جب قلت نہ ہو گی اور ملازمت کی گنجائش نہ ہو گی تو لوگ اپنا راستہ آپ نکال لیں گے۔ مولانا حالی نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسے میں فرمایا کہ "تالاب بھرنے میں تو دیر ہے مگر راستہ نکالنے کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے"۔

مولانا نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ یہ صورت حال تسلی بخش نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ جو لوگ ڈاکٹری اور انجینئری کی تعلیم پاتے ہیں وہ بھی نوکریاں ڈھونڈتے دکھائی دیتے ہیں۔ صرف وکالت کا ایک آزادانہ پیشہ ہے جس کی طرف کسی حد تک توجہ ہے مولانا نے اس کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ شمالی ہند مسلمانوں کا دارالسلطنت رہا ہے اور ان تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے بیشتر کے آبا و اجداد خدمت سلطانی پر مامور رہے

ہیں۔ مولانا کی رائے میں یہی سبب ہے کہ ان کا خیال بس سرکاری ملازمت کی طرف ہی دوڑتا ہے۔ کوئی تجارت کی طرف متوجہ ہوتا بھی ہے تو ناتجربہ کاری کے سبب نقصان اٹھاتا ہے اور آخر اس سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ تجارت میں ایک کو نقصان اٹھاتے دیکھ کر دوسرا بھی تجارت سے ڈرتا ہے انھوں نے کسی یورپی مصنف کی رائے دہرائی ہے کہ جس ملک یا قوم کا دارومدار ملازمت پر ہوتا ہے وہ کبھی خوشحال نہیں ہو سکتی اس کی فکری قوتیں ہمیشہ پژمردہ رہتی ہیں اور رفتہ رفتہ بالکل فنا ہو جاتی ہیں۔ لیکن جہاں صنعتوں اور حرفتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے وہاں یہ سمجھنا چاہیئے کہ قومی زندگی کی بنیاد پڑ گئی ہے اور وہ زمانہ قریب ہے کہ تازگی اور رونق چھا جائے گی۔ یورپ کے جن شہروں میں لوگ ملازمت کرنے کے عادی ہیں وہاں تمام کوچوں اور بازاروں میں ہر وقت افسردگی چھائی رہتی ہے لیکن جہاں صنعت اور تجارت کا بازار گرم ہے وہاں ہر شخص کے چہرے پر رونق، شگفتگی اور زندہ دلی کے آثار نظر آتے ہیں۔

کون سا منصوبہ ہے جو تمام و کمال پورا ہو جائے۔ خامی کہاں نہیں رہ جاتی لیکن سرسید کا لگایا ہوا یہ پودا برگ و بار لایا۔ ان کا پروگرام صرف کالج کے قیام کا نہ تھا بلکہ وہ خود یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس وقت اس کے حالات سازگار نہ تھے۔ یہ خواب پورا ہوا مگر ان کی وفات کے بعد، اور اسی ادارے کا فیضان تھا کہ ایک قوم جو تباہی و بربادی کی آخری حد تک پہنچ گئی تھی، ایک بار پھر سربلند ہوئی اور اس کا کھویا ہوا وقار پھر سے بحال ہوا۔

سرسید نے اپنے تعلیمی منصوبے کی تکمیل کے لیے ایک اور ادارہ قائم کیا تھا جو اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے کسی طرح پچھلے دو اداروں سے کم نہ تھا۔ یہ ادارہ تھا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ بقول مولانا حالی جب محمڈن کالج کی حالت کسی حد تک قابلِ اطمینان ہو گئی تو سرسید کو خیال آیا کہ یہ کالج ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت کو کسی طرح پورا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے کسی ایسی انجمن کا قیام ضروری ہے جس کے مساعی سے ملک کے گوشے گوشے میں ایسے مدارس قائم ہو جائیں جن تک عام مسلمانوں کی رسائی ہو اور جس کی کوششوں سے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی دور ہو سکے۔ بالآخر ایک ایسی انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ دو بار تبدیلی کے بعد اس کا نام

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس طے پایا۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ میں، جیسا کہ حالی نے حیاتِ جاوید میں لکھا ہے:

"طے کیا گیا کہ ہر سال کسی مناسب مقام پر جہاں کے ممتاز آدمی کانفرنس کے اجلاس کی خواہش کریں اور کانفرنس کا انتظام اپنے ذمہ لیں، کانفرنس ہوا کرے اور اجلاس کی تاریخوں میں کانفرنس کے ممبر جو تجویزیں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے مطابق مناسب سمجھیں، وہ اجلاس میں پیش کریں، اور بعد غور اور مباحثہ کے اتفاق یا کثرت رائے سے ان کی منظوری یا نامنظوری عمل میں آئے۔ دوسرے جہاں تک ممکن ہو ہر شہر اور قصبے میں کانفرنس کے مقاصد کے لیے کمیٹیاں قائم کی جائیں اور جہاں جہاں اسلامی انجمنیں قائم ہیں، اگر وہ منظور کریں تو انہی کو کانفرنس کی کمیٹیاں تصور کیا جائے، تاکہ یہ کمیٹیاں اپنے اپنے نواح یا ضلع یا شہر یا قصبے کی نسبت وقتاً فوقتاً ہر قسم کے مدارس و مکاتب، صنعت و حرفت، تجارت و زراعت وغیرہ کی ترقی و تنزلی کے حالات جو مسلمانوں سے علاقہ رکھتے ہیں، تحریر کر کے کانفرنس کے جلسوں میں بھیجتے رہیں اور جو تجویزیں کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں منظور ہوں ان میں سے جو تجویز ان کے علاقے میں قابلِ اجرا ہو اس کے جاری کرنے کی کوشش کریں۔"

کانفرنس کے اغراض و مقاصد تھے:۔

۱۔ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ کی کوشش کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کے لیے جو سرکاری اسکول قائم ہوں ان میں مذہبی تعلیم کا بندوبست کرنا۔

۳۔ مذہبی نیز مشرقی علوم کے لیے علماء نے جو مدارس قائم کر رکھے ہیں انھیں مستحکم کرنا۔

۴۔ قرآن خوانی اور حفظِ قرآن کے مدارس کی اصلاح و استحکام۔

۵۔ دیسی اسکولوں کی تعلیم میں اصلاح کرنا۔

کانفرنس کے اغراض و مقاصد کو ملک میں ہر طرف سراہا گیا۔ حالی کی رائے ہے کہ مسلمان جو جدید تعلیم کے نام سے بیزار تھے وہ جس حد تک بھی تعلیم کی طرف متوجہ ہو

اس کا سبب کانفرنس کے وہ سالانہ اجلاس تھے جو ہر سال مختلف مقامات پر منعقد ہوتے رہے۔ ملک کے دور دراز گوشوں سے آکر ان اجلاسوں میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کبھی کبھی تو ایک ہزار سے متجاوز ہو جاتی تھی۔ مولانا کے الفاظ ہیں:

"نہ کسی سیر تماشے کی غرض سے، نہ کبھی کسی حاکم کے حکم سے اور نہ کسی ذاتی منفعت کے لیے، بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے اس میں شریک ہوں، دور دراز سفر کی تکلیف اور آمد ورفت کا خرچ برداشت کر کے کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ایک جگہ کھانا کھاتے تھے، ایک جگہ رہتے تھے، قومی معاملات پر گفتگو کرتے تھے، ہنستے بولتے تھے، انجانوں میں تعارف پیدا ہوتا تھا، دوستوں میں اخلاص پیدا ہوتا تھا۔"

اس کے علاوہ بھی کانفرنس کے قیام سے قوم کو بہت سے فائدے پہنچے جن پر مولانا حالی نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے مثلاً اس کی بدولت تعلیم کا چرچا تو عام ہوا ہی لیکن جس علاقے میں اجلاس ہوتا تھا خاص طور پر وہاں کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا ہو جاتی تھی۔ اجلاس کے لیے چندے سے روپیہ جمع ہوتا تھا اور کانفرنس کے اخراجات سے جو رقم بچ رہتی تھی اس سے غریب طلبار کو وظائف دیئے جاتے تھے۔ کانفرنس کی تحریک اور اس کے تقاضے سے بہت سی مفید کتابیں اور رسالے شائع ہوئے۔ اس کے سبب لوگوں کے دلوں میں عام جلسوں میں تقریریں کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ کانفرنس کے ذریعے مسلمانوں کے بہت سے مطالبات حکومت تک پہنچے اور منظور ہوئے۔ مولانا نے کانفرنس کی اس کوشش کو بہت سراہا کہ ۱۸۹۲ء میں کانفرنس کا اجلاس منعقدہ دہلی میں مسٹر تھیوڈور بیک پرنسپل محمڈن کالج نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کی تعلیمی مردم شماری کرائی جائے اور ان کی تعلیمی پسماندگی کے اسباب کا پتہ لگایا جائے۔ کیونکہ یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کیا شئے ہے جو انھیں جدید تعلیم سے باز رکھتی ہے۔ مذہب، غربت یا محض لاپرواہی؟

بعض حلقوں میں یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ کانفرنس کی کوششوں کے وہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے جن کی توقع کی گئی تھی۔ اس سلسلے میں مولانا نے لکھا کہ:

"جو لوگ کانفرنس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے آج تک کوئی کارِ نمایاں نہیں کیا، وہ گویا اس کو کمہار کا آوا سمجھتے ہیں جس میں برتن بہت جلد پک کر تیار ہو جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ کمہار کا آوا نہیں بلکہ چینی کا خمیر ہے جس کے تیار ہونے کا سالہا سال دراز تک انتظار کرنا چاہیئے۔"

البتہ حیاتِ جاوید کی تصنیف کے وقت یہ احساس مولانا حالی کو بھی تھا کہ کانفرنس کے کاموں کا بوجھ زیادہ تر سرسید کے کاندھوں پر ہی پڑا، قوم کے دیگر بہی خواہوں سے جس حد تک تعاون کی توقع کی گئی تھی اس حد تک پوری نہیں ہوئی، کانفرنس کے قیام کے وقت سے ہی سرسید اس کے سکریٹری تھے۔ آخر وقت تک وہ اس عہدے پر برقرار رہے۔ ان کا طریقہ تھا کہ جہاں کانفرنس کا اجلاس ہونا طے پاتا تو وہاں مقررہ تاریخ سے کئی دن پہلے پہنچ جاتے، منتظمین کی رہنمائی کرتے، اجلاس کا پروگرام مرتب کرتے، تجاویز کا انتخاب کرتے، گزشتہ سال کے حساب اور گزشتہ سال کی تجاویز پر عملدرآمد کی رپورٹ تیار کرتے، خود تجاویز پیش کرتے، ان پر تقریر کرتے، دوسروں کی تجاویز پر رائے دیتے، اجلاس کے بعد اس کی رپورٹ تیار کر کے شائع کراتے، سال بھر اس سلسلے کی ضروری خط و کتابت کرتے، اخبار میں مضامین لکھتے۔ غرض کانفرنس کا کوئی کام ایسا نہیں تھا جو سرسید کے ہاتھوں انجام نہ پاتا ہو۔ مگر بقول حالی دوسروں کا حال یہ تھا کہ "جہاں کانفرنس کا جلسہ ختم ہوا پھر سال بھر تک کسی کو اس کا خیال تک نہیں آتا تھا۔"

یہ شکایات اپنی جگہ مگر سرسید کی وفات کے بعد جب محسن الملک نے کانفرنس کے معاملات کی طرف خصوصی توجہ کی تو مولانا کو آس بندھی کہ شاید سرسید کا لگایا ہوا یہ پودا پھر سے برگ و بار لائے اور قوم کی توقعات کو پورا کر سکے۔ انھوں نے لکھا:

"اگرچہ ۱۸۹۷ء میں جو سرسید کی افسردہ دلی کے سبب کانفرنس کا اجلاس منعقد نہ ہو سکا، اس سے بہت بڑی مایوسی ہو گئی تھی اور لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سرسید کے بعد کانفرنس کا قائم رہنا مشکل ہے۔ لیکن سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوش مسلمانوں میں اٹھا ہے اس سے کانفرنس میں پھر جان پڑتی نظر آتی ہے۔ نواب محسن الملک نے

سرسید کی زندگی ہی میں کئی سال سے کانفرنس کی ترقی پر کوشش کرنی شروع کردی تھی۔ خصوصاً ۱۸۹۶ء میں جیسا کہ گیارہویں اجلاس کی رپورٹ میں مفصل مذکور ہے۔ جو کوشش اور جاں فشانی انھوں نے کانفرنس کی اصلاح اور ترقی میں کی وہ گزشتہ دس سال میں کبھی کسی سے بن نہیں آئی تھی اور اب بھی جس سرگرمی کے ساتھ کہ وہ محمڈن کالج کی ترقی پر متوجہ ہوئے ہیں اسی طرح انھوں نے کانفرنس کی طرف توجہ کی ہے۔ چنانچہ اس سال زندہ دلانِ پنجاب نے کانفرنس کو لاہور میں مدعو کیا ہے جس سے اس بات کی امید بندھی ہے کہ مسلمان اس قومی میلے کو ہمیشہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔"

مسلمانوں کا یہ قومی میلہ کچھ عرصے جاری رہا اور اس نے بعض قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ جلد ہی یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ صنعت، زراعت اور تجارت کی تعلیم بھی بہت ضروری ہے۔ کراچی کے اجلاس میں انڈسٹریل کانفرنس کے انعقاد پر مسرت کا اظہار کیا گیا۔ سرسید کی زندگی میں جب ایک بار حکومت نے ایگریکلچرل کالج کے قیام میں مدد دینے سے انکار کردیا تھا تو سرسید نے اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ حکومت نے ایک نادر موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ کراچی کے خطبۂ صدارت میں زور دے کر کہا گیا تھا کہ اب صنعت، تجارت اور زراعت کی طرف سے مزید غفلت قوم کی بربادی کا سبب ہوگی۔ ضرورت ہے کہ مسلمان لڑکوں کو صنعت و حرفت کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفے دے کر یورپ اور جاپان بھیجا جائے۔ خطبے میں مزید کہا گیا تھا کہ:

"مسلمانوں کی قومی ترقی کے لیے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ تعلیم کے ہر ایک شعبے میں دستگاہ حاصل کریں اور اس دوڑ میں جس میں ان کے ہم وطن ان سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں ورنہ وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ ان کو نہ صرف اپنی عزت و توقیر سے بلکہ اپنی بقا اور ہستی سے بھی ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

یہ تھا سرسید کا سہ ابعادی تعلیمی منصوبہ جس کے ذریعے وہ اپنی قوم کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ مختصر لفظوں میں اسے دہرایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ علم و حکمت کے خزانے جہاں بھی ہیں انھیں حاصل کر کے اپنے ملک اور اپنی قوم کو اس سے مالا مال کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا! اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مرکزی ادارے کا قیام ان کا دوسرا قدم تھا جس کے نتیجے میں اینگلو اورنیٹل کالج وجود میں آیا۔ یہ کالج دراصل پیش خیمہ تھا مغرب کی بہترین درس گاہوں کے نمونے پر ایک اقامتی یونیورسٹی کے قیام کا۔ جس میں قدیم و جدید علوم کی تعلیم انتہائی درجے تک دی جائے اور اس میں مزید تحقیق اور تصنیف و تالیف کی سہولتیں فراہم ہوں۔ مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں سرسید کا تیسرا اور آخری کارنامہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام تھا جس کا یہ مقصد تھا کہ ابتدائی تعلیم کے لیے ملک کے گوشے گوشے میں تعلیمی ادارے قائم ہوں۔ گویا یہ قومی تعلیم کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کی ایک عملی کوشش تھی۔ سرسید کا یہ کارنامہ ناقابلِ فراموش ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی ہمہ گیر تعلیم کا ایک عظیم الشان منصوبہ اس وقت بنایا اور اسے ایک حقیقت میں تبدیل بھی کر دکھایا، جب کہ کسی بھی طرح اس کے لیے حالات ساز گار نہ تھے۔

اب یہ غور کرنا بھی ضروری ہے کہ کیا سرسید کے تعلیمی پروگرام کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جس پر عمل کرنا آج بھی مفید ہو۔ سرسید نے جس کام کی طرف سب سے پہلے توجہ کی یعنی جدید علوم کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش۔ اس کی ضرورت آج پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ یہ خیال محض غلط فہمی پر مبنی ہے کہ علم و حکمت کی دنیا میں ہر لمحہ جو اضافے ہو رہے ہیں ان تک رسائی کسی بدیسی زبان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اس حقیقت سے آج کون واقف نہیں کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی قومیں اپنی زبان میں تعلیم حاصل کر کے ترقی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئیں۔ معلوم یہ ہوا کہ نئی نئی ایجادات اور انکشافات سے باخبر رہنے کے لیے چھوٹے چھوٹے ممالک نے بھی ترجمے کے مراکز قائم کر رکھے ہیں جن میں بدیسی زبانوں کے ماہرین موجود ہیں علم میں کوئی اضافہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں کیوں نہ ہو، بلا تاخیر اسے اپنی زبان

منتقل کر کے ان اصحاب تک پہنچا دیتے ہیں جنھیں اس کی ضرورت ہے۔ مگر ہم ایک
سی زبان یعنی انگریزی سے اتنے مرعوب ہیں کہ آج تک اسی کو تعلیم کی ہر سطح پر
یعہ تعلیم بناتے ہوئے ہیں۔ حد یہ ہے کہ تین برس کے معصوم بچے جب اسکول
اتے ہیں اور جب وہ ماں کی زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں سمجھتے تب بھی انہیں
نگریزی سکھانے کا سوانگ رچایا جاتا ہے۔ کئی برس تک وہ صرف انگریزی گیت،
ماد، حروف تہجی اور چند چیزوں کے نام رٹتے رہتے ہیں۔ یہ عمر وہ ہوتی ہے جب
یل کھیل میں، باتوں باتوں میں اور قصے کہانی کی شکل میں انھیں بہت کچھ سکھایا
سکتا ہے بشرطیکہ اس کے لیے مادری زبان استعمال کی جائے۔ نتیجہ یہ کہ بچے کی
ر کے تقریباً پانچ سال رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق سے
ی انگریز نے کہا تھا کہ میں یہاں سے لوٹ کر اپنے ملک میں ایسا اسکول کھولوں
س میں آپ کی زبان میں تعلیم دی جائے تو لوگ مجھے پاگل خانے میں داخل کر دیں
گے۔ آپ لوگ انگریزی زبان میں بچوں کو تعلیم دیئے جاتے ہیں اور آپ کو کوئی کچھ
نہیں کہتا۔

بدیسی یا کسی غیر زبان کے ذریعے حاصل کیا گیا علم، خاص طور پر ابتدائی درجوں
ں، طالب علم کے ذہن میں واضح اور روشن نہیں ہوتا۔ نہ یہ دیرپا ہوتا ہے۔ تعلیم
مل ہونے کے بعد رفتہ رفتہ یہ ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اسے
حاصل کرنے میں طالب علم کو دوگنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ مضمون سے زیادہ توجہ وہ
بان چاہتی ہے جس کے ذریعے علم حاصل کیا جا رہا ہے۔ ابتدا ہی میں سر سید مادری زبان
کے ذریعے تعلیم کے حامی تھے اور اس کی حمایت میں انھوں نے محکم دلائل پیش
کیے تھے اور کہا تھا کہ :

"انگریزی قوم نے جو اس قدر ترقی کی ہے وہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے
کہ تمام علوم و فنون اسی زبان میں ہیں جو وہ لوگ بولتے ہیں۔ اگر انگریزی
زبان میں تمام علوم و فنون نہ ہوتے بلکہ لیٹن یا گریک میں یا فارسی عربی
میں ہوتے تو تمام انگریز ایسے ہی جاہل اور بے علم اور ناخواندہ ہوتے
جیسے کہ بدنصیبی سے ہم لوگ ہندوستان میں جاہل ہیں اور آئندہ کو بھی

جب تک کہ تمام علوم و فنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے، ہم جاہل اور نالائق رہیں گے اور کبھی عام تربیت نہ ہوگی۔"

اور فرمایا تھا کہ:

"میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حروف میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے لیے کھودی جائے کہ اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دیئے جائیں گے تو کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہوگا۔"

آگے چل کر سرسید اپنی اس رائے پر قائم نہیں رہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے غلط نہیں کہ "سرسید کسی ایک جگہ جم کر نہیں رہے"

انھوں نے زمانے کا رُخ پہچانا اور اپنی رائے میں تبدیلی کر لی۔ انھوں نے محسوس کر لیا کہ اس دیش پر نہ اس کے باشندے حکمراں ہیں نہ ان کی زبان۔ لیکن آج ہم اس جال سے نہ نکلے تو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جب انگریزی سیکھنے کی ضرورت تھی تو ہماری قوم اس سے بیزار رہی۔ اب اس سے چھٹکارا پا لینے کی ضرورت ہے تو ہم اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ جو کام سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی نے انجام دیا آج اسے کہیں بڑے پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آج کی دنیا میں علم و حکمت کے سرمائے میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ایسی ہی ضرورت مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جیسے ادارے کی ہے جو ملک کے گوشے گوشے میں قوم کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے ادارے قائم کرے۔

اعلیٰ تعلیم کے ادارے میں سرسید جدید ترین علوم کو نمایاں مقام دینا چاہتے تھے دینی تعلیم کی اہمیت کو وہ تسلیم کرتے تھے مگر سب کچھ اسی کو نہیں سمجھتے۔ ان کی یہ رائے آج خاص طور پر توجہ کی طالب ہے کہ دین چھوڑنے سے دنیا نہیں مگر دنیا چھوڑنے سے دین بھی ہاتھ سے چلا جاتا ہے۔ پاکستان میں کیا صورت حال ہے اس کا تو ہم کو علم نہیں لیکن ہندوستان میں دینی تعلیم کے مدارس ہزارہا کی تعداد میں ہیں اور اس کے منتظمین زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے نصاب میں کوئی

تبدیلی کریں گے، اس کے آثار نظر نہیں آتے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر اظہار خیال کا
ہمیں حق ہے نہ یہ اس کے لیے مناسب مقام لیکن اتنا اندازہ ہمیں ضرور ہے کہ سر سید
اس صورت حال کو ہرگز پسند نہ کرتے۔ آج ضرورت ہے سائنس اور ٹکنالوجی کی
جدید ترین تعلیم کی اور ساری دنیا کے مسلمان اس میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ خدا
کرے سر سید کا یہ خواب آج نہیں تو کل پورا ہو کہ فلسفہ قوم کے نونہالوں کے داہنے
ہاتھ میں ہو، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ طیبہ کا تاج ان کے سر پر جگمگا رہا ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی رُوح بغیر تعلیم کے کھُردرے
سنگ مرمر کے پہاڑ کی مانند ہے، کہ جب تک سنگ تراش
اس میں ہاتھ نہیں لگاتا، اس کا دھندلا اور کھُردراپن دُور
نہیں کرتا، اس کو خراش تراش کر سڈول نہیں بناتا، اس
کو پالش اور جِلا سے آراستہ نہیں کرتا، اس وقت تک
اس کے جوہر اسی میں چھپے رہتے ہیں، اور اس کی خوشنما
نسیں اور دلربا رنگین اور خوبصورت بیل بوٹے ظاہر نہیں
ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ انسان کا دل کیسا
ہی نیک ہو، مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا،
اس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں
جو اس میں چھپی ہوئی ہیں اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں
ہو سکتیں، ظاہر نہیں ہوتیں۔ (سر سید)

مولوی عبدالحق

سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ

سرسید جامع حیثیات شخص ہوئے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سوسائٹی کا شیرازہ بکھر چلا تھا۔ زندگی کا ہر شعبہ دگرگوں حالت میں تھا۔ دو تہذیبوں کے ٹکرانے سے اس تذبذب میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس وقت ایک ایسے مخلص زمانہ شناس اور ثابت قدم شخص کی ضرورت تھی جو قوم کی خفتہ اور مردہ قوتوں کو جگائے، ان اوہام اور اسقام کو دور کرنے کی کوشش کرے جو گزشتہ تمدن اور حکومت نے پیدا کر دیئے تھے اور اقتضائے زمانہ کے لحاظ سے ان کی ضروریات کو پورا کرے اور جدید حالات کی رو سے ان کی روش کو بدلے۔ سرسید نے اگرچہ زندگی کے ہر اہم شعبے کی طرف توجہ کی لیکن ان کا سب سے بڑا کام تعلیمی اور علمی تھا اور اس کام کا ایک جز سائنٹفک سوسائٹی کا قیام تھا۔ خود یہ نام اس تغیر کی خبر دے رہا ہے جو اس وقت عمل میں آ رہا تھا۔ یہ علمی سعی اردو زبان کے سلسلہ ارتقا کی ایک کڑی ہے اور اس لیے اس کا ذکر اردو زبان کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ضروری ہے۔

سرسید نے ۱۸۶۳ء میں ایک تحریر اس عنوان سے "التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند" چھاپ کر شائع کی جس کا خلاصۂ مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیئے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ

کرا کے چھاپے۔ یہ تھی اصل بنیاد سائنٹفک سوسائٹی کی۔ چنانچہ دوسرے ہی سال انھوں نے اس خیال کو عمل میں لانے کی کوشش کی۔

۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو سرسید نے غازی پور میں جہاں وہ صدرالصدور تھے اپنے مکان پر ایک جلسہ کا انعقاد کیا جس میں یورپین اور دیسی اصحاب کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ یہ جلسہ سوسائٹی کے قائم کرنے اور اس کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا۔ اس میں لیفٹننٹ کرنل گریہم نے (جو سرسید کے بڑے دوست تھے اور اس وقت غازی پور میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے) اور سرسید نے بہت مدلل اور معقول تقریریں کیں۔

سرسید کا یہ خیال بالکل صحیح تھا اور اب بھی تقریباً ۔ سال گزرنے اور مغربی تعلیم کی بہ کثرت اشاعت ہونے کے بعد بھی وہ خیال ویسا ہی صحیح ہے کہ علوم جدیدہ کی اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔" انھوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا" مولانا نے اس سوسائٹی کے مقاصد کو مختصر طور پر نہایت خوبی سے ان الفاظ میں ادا کیا ہے" جو (یعنی سائنٹفک سوسائٹی) اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے، علمی مضامین پر لیکچر دیئے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعہ سے ظاہر کیے جائیں جو اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے۔ ہندو مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اس میں شامل کیے جائیں اور اس طرح قومی مغائرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔" ابتدا میں ۱۲۹ ممبر ہو گئے جس میں ہندو مسلمان اور انگریز سب شریک تھے۔

اس سال یعنی ۱۸۶۴ء میں سرسید غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آ گئے۔ چونکہ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا ان کی غیبت میں چلنا ناممکن تھا۔ اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف وہ اپنے ساتھ علی گڑھ لے آئے۔ مسٹر ولیم جنکسن بریلی جو

۔ ماہی فکر و آگہی علی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اس زمانے میں علی گڑھ کے جج تھے، سوسائٹی کے پریذیڈنٹ قرار پائے۔ اور اس وقت سوسائٹی کے لیے ایک مستقل مکان بننے کی تجویز ہوئی اور سرسید کی نگرانی میں عمارت کی تعمیر شروع بھی کردی گئی۔ مکان کی تعمیر اور آرائش اور کتب و آلات وغیرہ پر تقریباً بائیس ہزار روپے کی لاگت آئی اس کا سنگِ بنیاد لیفٹننٹ گورنر شمال مغرب (رائے ڈری منڈ) نے ۳ر نومبر ۱۸۶۴ء کو رکھا تھا اور ۳۰ر مارچ ۱۸۶۶ء کو جب عمارت بن کر تیار ہوگئی تو مسٹر ولیمس کمشنر قسمت میرٹھ کے ہاتھ سے اس کا افتتاح ہوا۔ ڈیوک آف آرگائل وزیر ہند اس کے پیٹرن (سرپرست) اور اے ڈری منڈ لیفٹننٹ گورنر شمال مغرب وائس پیٹرن قرار پائے اور اول سکریٹری لیفٹیننٹ کرنل گراہم اس کے بعد سرسید ہوئے۔

اگرچہ سوسائٹی کا پہلا قانون ۱۸۶۲ء میں بمقام غازی پور بنا لیکن جب سوسائٹی کا دفتر علی گڑھ میں منتقل ہوگیا تو ۱۸۶۶ء میں اس میں کسی قدر ترمیم کی گئی۔ سوسائٹی کے اغراض و قواعد حسب ذیل قرار دیئے گئے۔

لقب اور مقصد

اس مجمع کا نام سائنٹفک سوسائٹی یعنی علمی سوسائٹی کہا جائے گا اور مقصد اس کا یہ ہوگا۔

۱۔ ان علوم و فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی اور زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔

۲۔ جب کبھی سوسائٹی مناسب سمجھے تو کوئی ایسا اخبار یا گزٹ یا روزنامچہ یا میگزین وغیرہ چھاپ کر مشتہر کرنا جس سے ہندوستانیوں کی فہم و فراست کی ترقی مقصود ہو۔

۳۔ ایشیا کے قدیم مصنفین کی کم یاب اور نفیس کتابوں کو تلاش کر کے بہم پہنچانا اور چھاپنا۔

بناوٹ سوسائٹی

سوسائٹی میں (۱)اول معاون ممبر (دوسرے) آنریری ممبر (تیسرے) رفقار سوسائٹی ہوویں گے اور سوسائٹی کے پیٹرن یعنی مربی اور وائس پیٹرن نائب مربی بھی مقرر ہوا کریں گے۔ معاون ممبر دو قسم کے ہوں گے اول، ممبران حضوری یعنی وہ ممبر ایسے مقام میں یا اس کے قریب رہتے ہوں جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو۔ دوسرے، ممبران مکاتیب یعنی وہ ممبر جو اس مقام سے

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو فاصلے پر رہنے کے سبب سوسائٹی کے جلسہ میں شریک نہ ہوسکیں اور بذریعہ خط وکتابت سوسائٹی سے ارتباط رکھیں۔ تعداد غیر محدود چندہ دو روپیہ ماہانہ آنریری ممبروں کی تعداد دس سے اور رفقائے سوسائٹی کی تعداد ۵ سے زیادہ ہوگی۔

صاحبان ڈائرکٹرز پبلک انسٹرکشن بنگال اور شمال مغرب اور سنٹرل انڈیا اور اودھ و پنجاب موجودہ وقت بشرطیکہ وہ قبول کریں آنریری ممبر ہوں گے۔

رفقائے سوسائٹی سے ایسے شخص ہوں گے جو بسبب تحصیل علم یا علوم کے نہایت نامی ہوں گے مگر ممبری کے عہدہ پر مقرر ہونے کا ان کو کچھ خیال نہ ہو۔

کونسل مشیر کے ذمہ ترجمہ و ترتیب کتب، ترجموں کی پسندیدگی و ناپسندیدگی نیز یہ تجویز کہ ترجمہ اردو، فارسی، عربی، ہندی میں کیا جاوے یا کن کن زبانوں یا کسی زبان میں کیا جائے۔

کونسل کارپرداز، ذمہ دار منتظم اور ایک کتب خانہ کا قیام جو عمارت سوسائٹی نے علی گڑھ میں بنائی وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کہلائے گا اور جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کی عجیب عجیب چیزیں اس مکان میں عجائب خانہ کی غرض سے جمع کی جائیں گے، اور ان چیزوں کے حالات وقتاً فوقتاً مشتہر کیے جایا کریں گے۔

۳۰ر مارچ ۱۸۶۶ء سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری ہوا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا۔ پھر ہفتہ میں دوبار نکلنے لگا۔ ایڈیٹر خود سرسید تھے۔ مولانا حالی نے اس اخبار کے متعلق جو رائے لکھی ہے وہ اس قدر معقول اور صحیح ہے کہ اس کے بعض حصوں کا یہاں نقل کردینا کافی ہے۔

"اول اول سرسید زیادہ تر اس میں پولیٹکل معاملات پر مضامین اور نوٹ لکھتے تھے۔ اس لیے ان کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے اس لیے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اس کا خاص مقصد، گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹیکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس کی ابتدائی جلدوں کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی سیاسی اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کرکے دونوں قوموں کو ملانا چاہتے تھے۔

اس میں سوشل، اخلاق، علمی اور پولیٹکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی علاوہ ان لیڈنگ ارٹیکلوں کے وہ خود لکھتے تھے۔ انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہوکر چھپتے رہتے تھے۔ ہندوستان کے طریق معاشرت یا تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیئے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعہ سے شائع ہوتے تھے۔

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانہ حال کی نئی اطلاعیں اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں ان کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچہ کے اجراء سے شروع ہوئی ہے مگر اس کے ساتھ ہی پولیٹکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی اخبار نے حاصل نہیں کیا۔

ایک خاص وصف جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی زبانوں سے ممتاز ٹھہراتا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے طرزِ تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقے یا کسی خاص شخص کی دل آزاری روا نہیں رکھی۔ اس نے اپنے گاہکوں کے خوش کرنے کے لیے جو ہمیشہ نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی

ایک حرف نہیں لکھا۔ کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اس کے اہلکاروں پر زہر نہیں اگلا۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی۔

یہ سب سچ ہے لیکن یہ اس وقت تک تھا جب تک کہ کالج اور دوسرے کاموں کا ہجوم نہیں ہوا تھا۔ آخر میں تو یہ "ماخوذ از پانیر" ہو کے رہ گیا تھا۔ لیکن جب کوئی خاص مسئلہ یا اہم معاملہ آجاتا تھا تو سرسید خود بڑے پرزور مضامین لکھتے تھے۔

ابتدا میں منشی محمد یار خاں ایڈیٹری کا کام کرتے تھے اور منشی چکن لال انگریزی اخبارات کا ترجمہ کرتے تھے۔ مولوی فیض الحسن اور بابو گنگا پرشاد مترجم کتب تھے اجرت پر بھی کام ہوتا تھا۔ کل عملہ پانچ سو روپیہ ماہانہ کا تھا۔

ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا اور آلات علمی اور کلوں کے نمونے فراہم کیے گئے اور لیکچروں کا سلسلہ قائم ہوا۔ ڈاکٹر کل کلی ہر مہینہ ایک لیکچر نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے۔

سوسائٹی کی ترقی اور فروغ کا سارا دارومدار سرسید پر تھا۔ انھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور محنت اور سالانہ چندوں اور عطیات سے سوسائٹی کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا۔ اپنا ذاتی پریس جو "تبیین الکلام" کے چھاپنے کے لیے خریدا تھا۔ سوسائٹی کے نذر کر دیا۔ جون ۱۸۶۶ء میں جب نواب سکندر بیگم والیہ بھوپال نے یہ سنا کہ سید احمد خاں نے ہندوستانیوں کی بہبودی کے لیے یہ سوسائٹی قائم کی ہے تو انھوں نے بطور اظہار خوشنودی ایک الماس کی انگوٹھی قیمتی اور ایک ہزار روپیہ سرسید کو بھیجی۔ سرسید نے ایک جلسہ عام میں یہ انگوٹھی سوسائٹی کو دے دی۔ اس طرح محض سوسائٹی کو فائدہ پہنچانے کے لیے سرسید نے فوجداری اور کلکٹری کے مختار اور وکیلوں کو قانون پر لیکچر دینے شروع کیے اور اس سے جو فیس وصول ہوتی تھی وہ سوسائٹی کی نذر کر دیتے تھے۔

گورنمنٹ اور رؤسا، امرا اور حکام نے بھی اس کی معقول امداد کی۔ گورنمنٹ نے تین ایکڑ تین روڈ اور تیس پول زمین سرکاری تعمیر مکان کے لیے ایک باغ سرکاری علم فلاحت کی ترقی اور امتحان کے لیے عطا کی۔ مہاراجہ جودھ پور نے سو روپیہ سالانہ

ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مہاراجہ کپور تھلہ نے پچاس روپیہ، مہاراجہ جے پور نے پچاس روپیہ نواب رام پور نے سو روپے سالانہ امداد مقرر کی۔ وائسرائے اور لیفٹننٹ گورنر وغیرہ نے چندوں سے مدد کی۔ سر جان لارنس کو خاص توجہ تھی۔ مسٹر ڈرمنڈ لیفٹیننٹ گورنر شمال مغرب اور میکلوڈ لیفٹننٹ گورنر پنجاب نے بھی چندے دیئے۔ نواب کلب علی خاں نے بارہ سو روپے کی ایک نقرئی کرسی سوسائٹی کو دی۔ مہاراجہ الور اور مہاراجہ اندور اور نواب ٹونک نے عطیات دیے۔ مہاراجہ بنارس کو بھی اس سے خاص دلچسپی تھی۔ عنایت اللہ خاں رئیس بھیکم پور نے دو سو روپے تعمیر جاہ کے لیے دیئے۔ سر آکلنڈ کالون مسٹر سپیٹ کلکٹر میرٹھ اور مسٹر کیمسن ڈائرکٹر تعلیمات بھی اس کے بڑے معاون تھے۔ سرسید کی کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ سالانہ چندے اور اخبار کی قیمت دس ہزار آٹھ سو پچاس تک پہنچ گئی۔

۱۵ اگست ۱۸۶۷ء میں جب سرسید عہدۂ جج اسمال کاز کورٹ پر ترقی پاکر علی گڑھ سے بنارس چلے گئے تو سوسائٹی کا تمام کاروبار راجہ جے کشن داس سی ایس آئی کو جو اس زمانہ میں علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے سپرد کیا گیا اور انھوں نے بڑی توجہ سے اس کام کو سرانجام دیا لیکن سرسید بنارس میں رہ کر بھی برابر سوسائٹی کی اعانت کرتے رہے اور ان کے مضامین سوسائٹی کے اخبار میں شائع ہوتے رہے۔

۱۸۶۷ء میں سرسید بہ تقریب تعطیل دسہرہ بنارس سے علی گڑھ آئے اور ضلع علی گڑھ کے اکثر زمینداروں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ اب تک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے، کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس کی آمدنی مستقل ہوجائے۔ بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اس ضلع کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے اور اس کی شرائط واجب العرض میں بروقت بندوبست کے درج ہوجائیں تاکہ نسلاً بعد نسلٍ ہمارے وارثوں میں سے کوئی کچھ عذر نہ کرپائے۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو سوسائٹی کے جلسہ میں سرسید نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمینداران درخواست دہندہ کی مع ان کے عرضیوں کے اور مع تفصیل ۱۲۳ دیہات کے جارج ہنری لارنس کلکٹر ضلع علی گڑھ کی خدمت میں اپنی چٹھی کے ذریعہ سے بھیج دی تاکہ وہ اس کی تصدیق کر کے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپورٹ کے ذریعہ سے روانہ کر دیئے۔ اس کا

نتیجہ سوا اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوا کہ اس کے جواب میں جو چٹھی پرائیویٹ سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۷ء بنام سرسید وصول ہوئی۔ اس میں حضور وائسرائے کی طرف سے رضامندی ظاہر کی گئی تھی۔

۹ مئی ۱۸۶۸ء کو سوسائٹی نے اڈریس سر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر شمال مغرب کی خدمت میں پیش کیا اور سوسائٹی کی درخواست پر سر ولیم میور نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں ان میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی۔

چنانچہ ۲۶ اگست ۱۸۶۸ء کو گورنمنٹ شمال مغرب نے دیسی کتابوں پر انعام دینے کا اعلان کیا۔ "اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اس تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اس لیاقت کو کام میں لانا نہیں چاہتا تھا برقی قوت کی طرح دوڑ گیا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے۔ خصوصاً اردو لٹریچر صرف اس تحریک کی بدولت جو کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کر دی تھی تھوڑے عرصہ میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا۔

سرسید کی دوراندیشی سوسائٹی کے نام سے ظاہر ہے۔ اس زمانے میں جدید خیالات کی اشاعت اور سائنس کا ذوق پیدا کرنا بہت بڑا کام تھا۔ جب سوسائٹی علی گڑھ میں منتقل ہوئی تو اس نام کے متعلق اختلاف پیدا ہوا اور سرسید بھی کسی طرح مائل ہو گئے کہ یہ نام بدل دیا جائے لیکن جب طریقہ و علم کاشتکاری اور علمی عجائبات کا رہنا طے ہو گیا تو یہی نام مناسب خیال کیا گیا اور آخر تک یہی نام قائم رہا۔

سائنس کے لکچروں کے علاوہ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے علمی تجربے بھی کیے گئے۔ اور علم فلاحت کے اصول کے مطابق سوسائٹی کے باغ میں گیہوں بویا گیا اور جب تیار ہو گیا تو جلسے میں اس کا نمونہ دکھایا گیا۔ ایک ایک دانہ میں ساٹھ ساٹھ ستر ستر شاخیں نکلیں اور بعض میں سو سے بھی زیادہ پھوٹ کر مثل پودے کے جھنڈ کے ہو گیا تھا۔ پودے کا طول ۴ فٹ ۸ انچ اور بال مع تور کے ایک انچ لمبی تھی۔ نو قسم کے گیہوں لندن سے

ماہنامہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

منگائے گئے۔ خود سرسید نے ایک ایک دانہ بونے کے لیے ایک آہنی نلی ایجاد کی اور علم فلاحت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا۔

مختلف علوم وفنون کی کتابوں کی تالیف اور مغرب اور مشرق کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ترجمہ اس سوسائٹی کا ایک بہت بڑا مقصد تھا۔ علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ بہت بڑا ذریعہ تھا۔ سرسید نے پولیٹیکل اکانمی، نیچرل فلاسفی، علم آب وہوا کے ترجموں کی سفارش کی۔ کرنل جے ڈبلیو ہملٹن نے پہلے ہیروڈوٹس کے تاریخ مصر کے ترجمے کی اور بعد ازاں تمام تاریخ کے ترجمے کا مشورہ دیا اور لکھا کہ مقاموں اور شخصیتوں کے ناموں کے معاملہ میں بہ نسبت یونانی کے عربی زبان کی پیروی کرنی چاہیئے اور جو تلفظ کسی لفظ کا یورپ یا ایشیا کی زبان میں مروج ہو وہی اختیار کیا جائے۔ انگریزی زبان کی تقلید لازم نہیں۔ ہندی کے حروف ٹ اور ڈ کا استعمال نہ کیا جائے۔ ہیئت اور جیالوجی (آراضیات) کے ترجمے کی بھی رائے دی۔ دوسرے خط میں سفارش کی کہ ایک عمدہ تاریخ مصر مسمی حسن المحاضرہ مصنفہ سیوطی ہے۔ ہشت بہشت کا نسخہ بھی بھیجا جو ادریس بدخشی کی تصنیف ہے جس میں شاہ مراد کی وفات ۸۵۵ھ تک کے حالات ہیں۔ مصنف کے بیٹے ابوالفضل الاختری نے اسے ۹۸۲ھ تک پہنچایا لیکن یہ نسخہ اصل مصنف کا تھا ۸۵۵ھ تک ہے انھوں نے ہیرن صاحب کی تاریخ کے ترجمے کی بھی رائے دی۔

خود سرسید نے دو کتابوں کی تالیف کا بیڑہ اٹھایا۔ ایک تمام اردو مطبوعہ کتب نظم ونثر کی فہرست کی ترتیب بطور تاریخ زبان اردو، اس میں امور ذیل کی صراحت کی جائے گی۔

نام کتاب، نام مصنف معہ مختصر حال، زمانہ تصنیف، کچھ عبارت بطورِ نمونہ طرزِ بیاں اور بعض مضامین کا خلاصہ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرے اُردو لغات جو سرسید نے لکھنی شروع کردی تھی اس کا نمونہ موجود ہے جو آئندہ ہم اس رسالے میں پیش کریں گے۔ اس پر بعض یورپین فاضلوں نے رائے بھی لکھیں۔

یہ دونوں تجویزیں نہایت قابلِ قدر اور اردو زبان کے استحکام کے لیے لازم

۳؎ سر سید کے صحیح ادبی ذوق اور دور بینی کا اسی ایک بات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ۶۶ برس پہلے اس چیز کا ڈول ڈالا تھا جس کی تکمیل پر ہم آج غور کر رہے ہیں۔

سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں جن میں سے بعض کے نام جو ہمیں معلوم ہوئے ہیں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ تاریخ مصر قدیم مولفہ رولن
۲۔ تاریخ یونان مولفہ رولن
۳۔ رسالہ علم فلاحت اسکاٹ برلن
۴۔ تاریخ چین بزبان فارسی قلمی ترجمہ پادری اکیوس۔
۵۔ تزک جہانگیری قلمی
۶۔ رسالہ علم انتظام مدن (پولیٹکل اکانمی) مولفہ ولیم سینئر۔
۷۔ ایک گفتگو بر عہد لارڈ ڈلہوزی و لارڈ کیننگ مترجمہ کرنل گریہم بزبان اردو۔
۸۔ تاریخ ہند مولفہ الفنسٹن
۹۔ رسالہ علم آلات مولفہ ٹامسن
۱۰۔ رسالہ علم طبیعات مولفہ ٹامسن
۱۱۔ رسالہ علم آب و ہوا مولفہ ٹامسن
۱۲۔ رسالہ برقی مولفہ ہیرس
۱۳۔ دیباچہ تاریخ فیروز شاہی
۱۴۔ ٹاڈ ہنٹر کی کتاب اقلیدس مترجمہ مولوی ذکاء اللہ۔
۱۵۔ جغرافیہ مؤلفہ پادری ولکنس۔
۱۶۔ سیاست مدن (مل کی پولیٹکل اکانمی کا انتخاب) مترجمہ پنڈت دھرم نرائن رائے بہادر میر منشی اندور۔
۱۷۔ ترجمہ علم مساحت مولفہ ٹاڈ ہنٹر۔
۱۸۔ ترجمہ علم مثلث مولفہ ٹاڈ ہنٹر۔
۱۹۔ ترجمہ الجبرا مبتدیوں کے لیے مؤلفہ ٹاڈ ہنٹر۔
۲۰۔ ترجمہ نظریہ مساوات مولفہ ٹاڈ ہنٹر۔
۲۱۔ کال بریتھ اور ہاٹن کی سائنٹفک مینول یوکلڈ ترجمہ۔
۲۲۔ کال بریتھ اور ہاٹن کے سائنٹفک الجبرا کا ترجمہ۔
۲۳۔ برنارڈ سمتھ کی ارتھمیٹک کا ترجمہ۔
۲۴۔ برنارڈ سمتھ کے الجبرا کا ترجمہ
۲۵۔ گال بریتھ کی کتاب حساب کا ترجمہ
۲۶۔ ٹاڈ ہنٹر کے الجبرا کا ترجمہ (کالجوں اور مدارس کے لیے)
۲۷۔ گال بریتھ کی } Plain Oridate Plainco Geometry
۲۸۔ ٹاڈ ہنٹر کی }
۲۹۔ ٹاڈ ہنٹر کا Integral Calculus تکمیلی احصا۔
۳۰۔ ٹاڈ ہنٹر کا Differential Calculus

۱؎ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۷۵۴ Differential Calculus تفریقی احصا۔ ۳۱۔ ترجمہ تاریخ ایران مؤلفہ سرجان میلکم۔

دہلی کالج اور اس کی ورنی کلر ٹرانس لیشن سوسائٹی کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے انگریزی سے مختلف علوم و فنون کے ترجمے اردو زبان میں شائع کیے۔ یہ کام جب آجکل دشوار نظر آتا ہے تو اس وقت کس قدر دشوار ہوگا جب نہ اچھے مترجم دستیاب ہوتے تھے اور نہ ان ترجموں کی قدر کرنے والے کچھ زیادہ تعداد میں تھے۔ علاوہ اس کے عجائب خانہ کے لیے سکے بھی جمع کیے چنانچہ مسٹر شفارن ہل جج سہارن پور اور مولوی فضل احمد تحصیلدار قائم گنج نے کچھ سکے بھیجے۔ ایک اشرفی عہد تغلق کی عنایت اللہ خاں صاحب رئیس بھیکم پور نے دی۔

سرسید کا قاعدہ تھا کہ وہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے تھے ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ چنانچہ سوسائٹی کی بہبودی اور ترقی میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ضلع کے رئیسوں کو اس کی امداد پر آمادہ کیا، گورنمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی خود اپنی بساط سے بڑھ کر اس کو مالی امداد پہنچائی۔ اس کی عالی شان عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بنوائی، اس کی مستقل آمدنی کے لیے عمدہ عمدہ تدبیریں کیں، لائق لائق آدمی ترجمے کے کام کے لیے مقرر کیے، قریب چالیس کے چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔ غازی پور، علیگڑھ، بنارس، جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی کی دھن میں برابر لگے رہے۔

چنانچہ ولایت جاتے ہوئے جو خط کہ انھوں نے مولوی مہدی علی خاں کو عدن سے بھیجا تھا اس میں لکھتے ہیں۔ "مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی کوشش کا واسطے شکست کر دینے سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے۔ بس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کے سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں۔"

محض سوسائٹی کی خاطر کلکتہ کا سفر اختیار کیا اور ۶ر اکتوبر ۱۸۸۳ء کو مذاکرہ علمیہ میں ایک طویل لکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر دیا۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اس سوسائٹی کے ذریعہ سے بعض تعلیمی تحریکیں بھی کی گئی ہیں۔ مثلاً تحصیلی مکاتب کے نصاب تعلیم پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس سوسائٹی کے ضمنی نتائج میں سے ورنی کلر یونیورسٹی کی تحریک تھی جو اس زمانے کے لیے ایک عجیب خیال تھا۔ اس کا حال آئندہ ہم ایک علاحدہ مضمون میں لکھیں گے۔

اس سوسائٹی نے نہ صرف علمی اور تعلیمی خدمات انجام دیں بلکہ اس کی دیکھا دیکھی ملک کے مختلف مقامات میں متعدد انجمنیں اور سبھائیں قائم ہوگئیں جو اپنے اپنے حلقے میں مفید کام کرتی تھیں۔ سوسائٹی کے اخبار کا اردو اور دوسرے دیسی اخبارات پر بھی بہت اچھا اثر پڑا اور وہ سیاسی معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر سنجیدگی سے بحث کرنے لگے۔ اس سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کا اردو زبان اور ادب پر بڑا احسان ہے۔

(اس مضمون کے لکھنے میں علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی مختلف جلدوں گریہم کی لائف آف سید احمد خاں اور حیاتِ جاوید سے مدد لی گئی ہے)

◆

"ہم اپنی قوم کو بارہا جتا چکے ہیں کہ جب تک مسلمان خود اپنی تعلیم کا بوجھ آپ نہیں اٹھائیں گے اس وقت تک ان کی ذلت ان کا ادبار دور نہیں ہوسکتا۔ اس ہمارے قول کی تصدیق بہت ہو چکی ہے اور جو رہی سہی باقی ہے وہ بہت جلد ہو جانے والی ہے۔ قوم کی جو حالت ہونے والی ہے اور جو ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے، اس نے ہمارے دل کو دکھایا ہے اس ہمدردی اور دل کے دکھنے سے ہم نے مسلمانوں کے لیے مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے کا بوجھ اٹھایا ہے۔"

(سر سید احمد خاں)

ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی

علومِ اسلامیہ اور سرسیّد :

مقاصد کا تجزیاتی مطالعہ

سر سید احمد خاں اپنی فطرت میں خالصتاً اسلامی تھے۔ آباؤ اجداد کے مسلم خون کا ورثہ ان کے رگ و ریشہ میں حیات بن کر رواں دواں تھا۔ ماحول اور سماج کے مذہبی اثرات نے اسلام سے ان کی فطری وابستگی کو اور پختہ کر دیا۔ تعلیم و تربیت نے مزید صلابت پیدا کی۔ احساس، شعور اور تفکر و تعقل نے مذہبی فکر اور اسلامی سوچ کو عقل و خرد کی کسوٹی پر کھرا ثابت کیا۔ اسلامی فکر اور شعور نے سر سید کو صحیح العمل مسلم بنایا۔ اسلام سے فطری اور عملی وابستگی نے حب اظہار و بیاں کی صورت اختیار کی۔ تو مذہب اسلام اور علوم اسلامیہ پر ان کی تالیفات وجود میں آئیں۔

قانونِ فطرت کے عین مطابق سر سید کے تالیفی فکر و عمل میں مختلف ارتقائی مراحل ملتے ہیں۔ ان کے سوانح نگار بالعموم عمرِ سر سید کے دو ادوار مقرر کرتے ہیں۔ ایک ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے کا، اور دوسرا آخری ۴۰ برسوں کا۔ زمانی تقسیم ادوار سے زیادہ اہم فکر و عمل کا ارتقا ہے۔ سر سید کے افکار و اعمال اور تالیفات اور تصنیفات میں تسلسل پایا جاتا ہے جو زمانی تقسیم کی سرحدوں کو پار کر جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سر سید کے فکر و اظہار میں مختلف تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں مگر ان تبدیلیوں کو اختلاف فکر، تضاد بیاں، تصادم افکار سے زیادہ ارتقائی فکر و عمل کی بوقلمونیاں سمجھنا چاہئے۔ علوم اسلامیہ کی تالیفات اور مقالات سر سید اپنے انداز اور موضوعات کے لحاظ سے قرآنیات، سیرت نبویؐ، سابقہ صحف سماویہ، علم کلام اور فلسفہ، تصوف اور کسی حد تک فقہ سے متعلق نظر آتی ہیں اور اپنے مباحث اور مقولات میں حدیث، اصول حدیث، اخلاق، تاریخ اور دوسرے موضوعات سے بھی بحث کرتی ہیں۔

ان کے موضوعات اور مباحث میں اصل کار فرما مقاصد سر سید تھے۔ جو ضروریات زمانہ سے زیادہ مصالح امت اور خدمت اسلام کے آفریدہ تھے۔ ابتدائی تصانیف سر سید میں ان کا بنیادی مقصد صحیح اسلامی تعلیمات کو پیش کرنا اور غیر اسلامی تعلیمات سے امت کو محفوظ رکھنا نظر آتا ہے۔ ان کی تحریروں میں بھی اس مقصد کی وضاحت ملتی ہے اور دوسرے تجزیہ نگاروں اور سوانح نویسوں کے بیاں میں بھی۔ رسالہ جلاء القلوب بذکر المحبوب کا موضوع سیرت نبویؐ ہے اور مقصد تالیف یہ ہے کہ صحیح اور معتبر واقعات بیاں

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۔یے جائیں اور مروجہ میلاد کی کتابوں کی غیر مستند روایات اور واقعات سے امت مسلمہ کی حفاظت کی جائے۔ اظہار حق اور تردید باطل کے دونوں مثبت اور منفی پہلو ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مولف گرامی قدر نے صرف تفکر، تعقل اور تدبر ہی کو رہنما نہیں بنایا بلکہ روایت اور درایت کے اسلامی اصولوں سے بھی پوری طرح رہبری حاصل کی ہے۔ یہی مذہبی تفکر اور تدبر اور صحیح تحلیل اور تجزیہ، تجزیے کا شعوری عرفان ان کی دوسری ابتدائی تالیفات میں بھی نظر آتے ہیں خواہ وہ کتابیں کسی بھی موضوع سے متعلق ہوں۔

تجزیہ نگاروں نے تقسیم تالیفات اور ارتقائے فکر سر سید میں حد فاصل کھینچا ہے کہ جنگ آزادی سے قبل سر سید کی فکر روایتی، جامد اور غیر عقلیتی تھی اور دوسرے ادوار میں وہ یکایک عقلیت پسند ہو گئے اور تفود و تعقل کے سبب اسلامی فکر سے منحرف ہو گئے۔ لیکن اگر ان کی ابتدائی تالیفات کا تنقیدی تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تفکر اور تعقل کا عنصر ان میں شروع سے پوری طرح موجود تھا۔ اپنی ابتدائی تالیفات میں بھی وہ روایتی طریقہ تاویل سے اختلاف کرتے ہیں۔ عقل و درایت کی بنا پر ضعیف روایات نقل کرتے ہیں۔ صحیح واقعات اور مستند روایات کو قبول کرتے ہیں اور انہیں کے قبول کرنے پر اصرار بھی کرتے ہیں۔ بعض مطالعات سر سید نے واضح کیا ہے کہ ان کے مسلکی افکار اول تا آخر یکساں رہے اور اُن میں جو بھی انقلاب آیا وہ ارتقائی تھا نہ کہ ترتیبی۔ سر سید کی ابتدائی نگارشات میں اسلامی دائرہ کار ایوں تک محدود تھا۔ اس عنصر نے بھی فکر سر سید کو محصور اور محدود بنا دیا تھا۔ سیرت نبویؐ میں خرافات اور غلط روایات پر تنقید اور صحیح اور مستند واقعات کی تحسین، صحابہ کرام کی تعدیل اور توقیر، کتاب و سنت کی جامع ترین ہدایت و رہنمائی، سنت کی توصیف اور بدعت کی تردید، صوفی افکار و اعمال میں صحیح پیروی کی غرض سے تمیز، جسمانی اور روحانی ترقی، برائے حصول رضائے الٰہی اور امت مسلمہ کی صحیح خطوط پر تعلیم و تربیت، ان کی تالیفات کے محوری عناصر ہیں لیکن ان سب کا تعلق امت مسلمہ کے طبقات ہی سے ہے۔ ان کے عہد کے دوسرے طبقات اور ان کے افکار و اعمال سے نہیں۔ بایں ہمہ سر سید کی اصلاحی کوشش کا عنصر ان میں موجود ہے اور اس کی بنیاد الحاد میں تفکر اور تعقل موجود ہے۔

۱۸۵۷ء تک سر سید احمد خاں سر سید نہیں بنے تھے۔ اس خونی انقلاب نے ان کو کنج عافیت سے تحریر و تالیف کے محدود گوشے سے نکال کر میدان علم و عمل میں آمادہ پیکار و بر سر کار کر دیا۔ انہوں نے دور نو میں جو کارنامے انجام دیئے انہوں نے مسلم رد عمل (Muslim Responce) میں بھی انقلاب پیدا کیا۔ سر سید کی ابتدائی تالیفات اور علوم اسلامیہ پر تحسین و تعریف اور تنقید اور ترہیب کا لہجہ دھیما بھی تھا اور محدود بھی۔ اس کا ایک اہم سبب ان کی تالیفات اور نگارشات کی محدودیت بھی تھی۔ مگر اس سے کہیں زیادہ

۔۔بی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مولف گرامی کی شخصیت اور فکر سے لگاؤ اور اختلاف کی عدم توسیع تھی۔ سر سید نے اپنی تحریروں سے صرف ایک راگ چھیڑا تھا جو کبھی نہیں لڑی تھی۔ علمی اور فکری اختلاف کیا تھا، اپنے اعمال اور افعال سے طوفان نہیں برپا کیا تھا۔ لہذا ان کی تالیعات پر مسلم ردِ عمل بالخصوص علمی اور فکری رہا اور بعض خاص حلقوں تک محدود بھی۔

سر سید نے اپنی تحریروں کا آغاز ہی تفکر و تعقل کی بنیادوں پر کیا تھا اور اس کے پیچھے ان کی مصلحانہ کوشش کارفرما تھی اور یہ اصلاحی مسائل ان کے سوچنے سمجھنے والے دماغ اور فکر اسلامی سے وابستگی کے سرچشموں سے پھوٹے تھے۔ سر سید نے اس دور اوّل میں خرافاتِ زمانہ اور بدعات نامحرمانہ سے سمجھوتا نہیں کیا بلکہ جس فکر و عمل کو صحیح سمجھا اس کو اپنے قارئین اور افراد و طبقات امت تک پہنچایا۔ سر سید کے مقاصد تالیف و نگارش میں اس دوگانہ جہاد کی بناء پر تنوع اور رنگارنگی پیدا ہوئی۔ صحیح اسلامی تعلیمات کو غلط روایات اور واقعات کو پاک صاف کرنے کے علاوہ اب ان کا عظیم ترین مقصد یہ تھا کہ جدید تعلیم اور انگریزی تہذیب کے مضر اثرات سے نونہالان قوم اور طبقات امت کو محفوظ کیا جائے۔ سر سید کو جدید تعلیم اور انگریزی زبان کی افادیت بلکہ ناگزیری کا جس طرح ادراک تھا اسی طرح وہ اس کی مضر اثرات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انگریزی زبان کے مخالفین کی طرح وہ علوم مغرب کی طرف سے آنکھیں نہیں پھیر سکتے تھے کیوں کہ ان کا پختہ یقین تھا کہ جلد یا بدیر امت اسلامیہ ہند کو انہیں اپنانا ہی پڑے گا۔ وہ نہ صرف ان کی دنیاوی ترقی کے ناگزیر وسائل تھے بلکہ ان کے حصول میں دینی مصالح بھی مضمر تھے اور ان سے کہیں زیادہ سرکار انگلشیہ کے عہد تسلط میں اسلامیان ہند و پاک کے ملی تشخص اور دینی شناخت کی بقا اور وجود کے لئے ضروری تھے۔

سر سید نے جدید علوم و فنون کے زہر کے لئے تریاق علوم اسلامی سے کشید کیا اور اپنی تحریروں اور کتابوں کے ذریعے طریقۂ علاج متعین کیا۔ جدید علوم و فنون کے نصابی اور غیر نصابی اثرات بد کے علاوہ امت مسلمہ کو غیر مسلم اقوام بالخصوص عیسائی اور یہودی اہل قلم یعنی مستشرقین کے علمی، دینی اور تخریبی حملوں کا سامنا تھا۔ علمائے امت اپنے طریقوں سے اس کا مقابلہ کر رہے تھے، مگر ان کا دفاع ناکافی بھی تھا اور ناقص بھی، محدود بھی اور معذور بھی۔ وہ انگریزی زبان سے ناواقفیت اور جدید علوم کے طریقے پر تحقیق و تالیف سے اپنے علم کے سبب مستشرقین کے علمی اور دینی اعتراضات اور تنقیدات کے جواب دینے سے قاصر تھے۔ سر سید نہ صرف اپنے ہم وطن علمائے کرام کے علم و دفاع سے واقف تھے بلکہ عالم اسلام کے دوسرے اہل دین کی محدود مساعی کا بھی ادراک رکھتے تھے۔ اس لئے وہ اپنی نگارشات اسلامی کے ذریعہ اسلام پر مستشرقین کے حملوں کا دفاع ہی نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ اسلام کی تعلیمات کی حقانیت ثابت کرنے کی جدوجہد کو تحریک کی شکل دینا چاہتے تھے۔ خطبات احمدیہ اور ان کی دوسری کتابیں اس کی شاہد ہیں۔

فکر۔ آگہی دہلی/علیگڑھ۔ نمبر ۲۰۰۰ء

عصر حاضر میں ملت اس سے کہیں زیادہ عہد سر سید میں ایک اہم ترین چیلنج مذہب اور سائنس
کے درمیان تصادم و منافرت، اور تضاد و تناقض کی صورت میں ابھر اور اُمت مسلمہ کے لئے انتہائی خطرناک
ہو گیا۔ دوسری اقوام نے کہیں مذہب کو رد کر کے اس اختلاف کا حل نکال لیا اور کہیں سائنس کی طرف سے
آنکھیں بند کر کے دھرم اور مذہب کے حصار میں پناہ لے لی۔ اسلامی دینی حلقوں نے اپنی بے خبری کے سبب
چیلنج کو سمجھا اور نہ اس کا سامنا کیا اور جو کیا بھی تو غیر منطقیت کی بنیادوں پر کیا۔ سر سید نے اپنی خداداد بصیرت
بنا پر زیادہ اور علم و فہم کے سبب کم، اس اصلی چیلنج کا مقابلہ کیا۔ اسلامی تعلیمات اور علوم و فنون کی تشریح و
تفسیر اصول نے ایک اصول کی بنیاد پر کی اور وہ اصول یہ تھا کہ مذہب اسلام اور سائنس میں مطابقت ہے نہ کہ
منافرت و تضاد۔ سائنسی علوم و فنون اور تحقیقات اسلام کی تائید و توثیق کرتے ہیں نہ کہ مخالفت و نفی۔ خطبات
یہ میں کسی حد تک اور تفسیر القرآن میں بڑی حد تک سر سید نے مذہب اور سائنس کے درمیان
موافقت اور مطابقت دکھائی اور ثابت کیا کہ جوں جوں سائنسی تحقیقات ترقی کرتی جاتی ہیں وہ اسلام کی حقانیت
ثابت، مستحکم اور غیر متزلزل بناتی جاتی ہیں۔

سر سید کی فکر میں سائنس اسلام کی معاون ہے اور اسلام سائنس کی بنیاد و مبدا۔ سر سید نے
منطقی طرز عمل کو مزید توسیع دی اور ایک اور اصول اپنایا۔ ان کے الفاظ میں "الاسلام الفطرة والفطرة
اسلام" یعنی اسلام ہی فطرت ہے اور فطرت ہی اسلام ہے۔ اپنی تفسیر میں جا بجا اور اصول تفسیر میں اختصار
کے ساتھ سر سید نے واضح کیا کہ اسلام اور فطرت میں کامل ہم آہنگی ہے اور کوئی مغائرت نہیں۔ کلام الٰہی
(Word of God) اور فعل الٰہی (Work of God) ایک دوسرے کی تائید اور تصدیق
کرتے ہیں۔ فطرت یا نیچر فعل الٰہی ہے اور قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔ نیچر کے اصول و قواعد مقرر ہیں لہٰذا
کلام الٰہی ان سے قطعی ہم آہنگ ہوتا ہے اور کلام الٰہی کی تشریح و تفسیر انہیں قوانین فطرت کی روشنی میں کرنی
ہے۔ جو تفسیر و تصنیف فطرت کے مسلمہ قواعد اور مقررہ قوانین کے خلاف ہوگی وہ قابل تسلیم نہیں۔
اس صورت میں فعل الٰہی اور کلام الٰہی میں اختلاف و تضاد نظر آئے گا جو ناممکن ہے۔

حالی نے سر سید کی تفسیر اور دوسری تحریروں پر تنقید کی ہے۔ خاص طور پر تفسیر پر اور اصول
کے دو حصوں پر بحث کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ تفسیر سر سید میں بہت سے نکات ایسے ہیں جن سے
کئے اسلام متفق ہیں، اور بعض ایسی چیزیں ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ان پر بحث کی جا سکتی ہے۔
سر سید نے بقول حالی اپنے تفردات میں بعض غلطیاں کی ہیں اور وہ خاص طور سے معجزات یا خرق عادات سے
تعلق رکھتے ہیں۔ سر سید نے بنیادی طور پر ایک مفروضے کی بنیاد پر طے کر لیا تھا کہ تمام قوانین فطرت
ایک نوعیت کے ہیں اور تنوع نہیں پایا جاتا۔ جس طرح عادت، قانون الٰہی اور اصول فطرت
یا عادت یا معجزہ اصول الٰہی اور قانون فطرت ہے۔ حالات یا مطالبات یا افراد و طبقات

ماہنامہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

قانون فطرت کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں بعض واقعتا موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً آگ کی فطرت جلانا ضرور ہے مگر وہ بعض حالات میں اپنی فطرت اور خاصیت کو چھوڑ بھی سکتی ہے بشر طیکہ ایمان ابراہیمی موجود ہو۔ انسانی جسم میں روح کی ماہیت، موجودگی اور کارفرمائی، مادی قوانین فطرت کے برعکس گل کاریاں کرتی ہے اور گل کھلا سکتی ہے۔ وجود ذات باری کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جا سکتا ہے مگر ذات باری کی حقیقت کو کسی طور نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ عقل انسانی کی حدود سے پرے ہے۔ علاوہ سرسید عقل انسانی سے نوع انسان کے اجتماعی شعور کو مراد لیتے ہیں مگر وہ بہت سی آیات قرآنی اور تعلیمات اسلامی کی تشریح و تفسیر میں مفسرین اور محققین اسلام کے اجتماعی شعور اور اجتماعی عقل کے مقابلے میں اپنی ذاتی فہم اور عقل کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کے اپنے مسلمات اور اصول کے برعکس ہے۔ ایسا محض اس لئے ہوا کہ وہ اپنی فہم اور سمجھ کو رہبر مانتے اور اجماع کے مقابلے میں تفرد کو اصول بناگئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں تفردات کے ساتھ لغزشیں بھی وجود میں آتی ہیں۔

دیگر داعیین اسلام کے مانند سرسید کے فکر و شعور کا ایک محور یہ بھی ہے کہ حق تمام الہامی مذاہب میں دائر اور موجود ہے۔ قرآن مجید کا غیر مبہم واضح اور صاف اعلان ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ کا مصدق ہے۔ سرسید کے اپنی ذاتی ایمان وایقان کے علاوہ ملک و طن کی سیاسی اور سماجی صورت حال نے ان کو مجبور کیا تھا کہ وہ اسلام اور دیگر الہامی مذاہب بالخصوص اسلام اور انجیل و تورات کے ماننے والوں عیسائی اور یہودیوں کے درمیان اتحاد تلاش کریں اور ان کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لائیں۔ عیسائی مذہب اور اسلام کے درمیان اتحاد اور یگانگت کی تلاش انگریزی سرکار اور عیسائی حکمرانوں کو خوش کرنے کی خوشامدانہ حکمت عملی نہیں تھی بلکہ بین الاقوامی اور بین الملی نکات اتحاد تلاش کرنے اور الہامی مذاہب کو ماننے والوں کے درمیان اتحاد اور یگانگت پیدا کرنے کی مخلصانہ کوشش تھی۔ تبئین الکلام اور ان کی دوسری کتابیں اسی نوعیت کی ہیں۔ تبئین الکلام نے اردو میں مذاہب عالم کے تقابلی مطالعے کی بنیاد ڈالی سو ڈالی مگر ایک نئی طرز تعلیم بھی ایجاد کی۔ انجیل کی تفسیر میں وہ عبرانی متن کے دینے کے ساتھ اس کے انگریزی اردو ترجمے دیتے ہیں۔ اصل مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید اور انجیل و تورات میں حق کے دائر اور موجود ہونے کا ثبوت فراہم کریں۔

جس طرح سرسید نے تبئین الکلام وغیرہ میں تمام الہامی مذاہب و کتب میں حق کا اثبات کیا ہے اور اس کو دائر مانا ہے اسی طرح وہ تمام مسلم فرقوں اور مکاتب فقہ میں اسے موجود اور دائر تسلیم کرتے ہیں۔ وہ صرف اصول و فروع ہی میں نہیں بلکہ اصول میں بھی اسے مانتے ہیں۔ تمام مکاتب فکر اور مسالک فکر میں حق اور صحت کی موجودگی مانتے ہیں۔ حالی کا یہ تجزیہ بالکل صحیح ہے کہ اصولاً تمام مسالک فکر اور مکاتب فکر کے

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ماننے والے اور اس سے زیادہ علماء اور ماہرین تمام اسلامی مکاتب و مکاتیب فکر میں حق کے موجود ہونے کے قائل ہیں مگر وہ عملاً اپنے مسلک و فکر کی ترویج کرتے ہیں کہ دوسرے مسالک و مکاتب اور ان کے ائمہ کی تقلید لازمی ہوتی ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے اپنے مسلکِ فکر میں کسی غلطی اور خطایا لغزش کے وجود ہی سے نہیں بلکہ احتمال سے بھی انکاری ہو جاتے ہیں مثلاً احناف صحیح بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ یعنی کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح کتاب مانتے ہیں لیکن بہت سے احادیث صحیحہ کی جو بخاری میں موجود ہیں، ایسی تاویل و تفسیر کرتے ہیں جس سے وہ فقہ حنفی کے تابع ہو جاتے ہیں۔

مسلم مکاتب فکر میں سر سید اشاعرہ کے نسبت معتزلہ کے قریب ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ ان دونوں کو مسلم فرقے قرار دینا صحیح نہیں۔ معتزلہ اور اشاعرہ دونوں فرقے نہیں ہیں بلکہ اسلامی فکر اور دینی فہم کے دو بنیادی مکاتب فکر ہیں۔ ان دونوں کے مثبت اور منفی خصائص ہیں۔ دونوں کے اصول و فنون میں صحت اور خطا کے عناصر موجود ہیں تاہم وہ بنیادی طور پر فکر اسلامی کے ترجمان ہیں۔ سر سید کے نزدیک حالات زمانہ اور مقتضائے عصر کی بنا پر معتزلہ کے اصول و افکار زیادہ قابل قبول نہیں بلکہ بہتر اور مفید تر ہیں۔ ان کی چند لغزشوں کی بنیاد پر ان کی تمام خدمات و افکار و اصول پر پانی پھیر دینا اپنے ایک عظیم اسلامی ورثے سے ہاتھ دھو لینا ہے۔ اس ضمن میں حمایت سر سید میں ایک مثال کافی ہے۔ تمام مسلمان علامہ زمخشری کی "کشاف" کو ایک بلند پایہ تصنیف تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ایک معتزلی تفسیر ہے۔ لیکن معتزلی اور غیر معتزلی سب اس کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔

علوم اسلامیہ سے متعلق تالیفات سر سید کے گوناگوں مقاصد ایک محوری مقصد یا بنیادی نکتے پر آکر ختم ہو جاتے ہیں جس طرح بادہ و ساغر کے بغیر بہت سے موضوعات اور مضامین میں بات نہیں بنتی اسی طرح بقول سر سید مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کا کوئی بھی کام مذہب اور دین کے حوالے کے بغیر نہیں چلتا۔ انہوں نے علوم اسلامی سے اعتنا صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنی تحریروں سے مسلمانوں کو نہ صرف جگایا بلکہ میدان علم و عمل میں متحرک اور فعال اور زندہ و تابندہ بنا دیا۔

پروفیسر عتیق احمد صدیقی

سرسیّد اور تعلیم نسواں

اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا سرسیّد عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے تو اس کے جواب سے پہلے کئی اور سوالوں کے جواب دینا ضروری ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ اس وقت عام تعلیم کی کیا حالت تھی؟ معاشرہ جدید نظام تعلیم کو کس نظر سے دیکھ رہا تھا؟ تعلیم کی طرف خود مردوں کی کتنی توجہ تھی؟ کیا اس نظام میں ہمارے معاشرے کے مطابق لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے رعایت رکھی گئی تھی؟ اور ایسے ہی بہت سے سوال۔

ہم یہ بات نظر انداز نہیں کر سکتے کہ معاشرہ نمو پذیر بھی ہے اور تغیر پذیر بھی۔ وہ کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا، نہ رہ سکتا ہے۔ ہر دور میں معاشرے کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں، انھیں کے مطابق معاشرے کی ضرورتیں ابھرتی ہیں اور انھیں کی روشنی میں ان کی تکمیل کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ ہر دور میں اہلِ بصیرت موجود ہوتے ہیں، ان کی دور رس نگاہیں مستقبل کے پردوں کے پیچھے بھی دیکھ سکتی ہیں۔ وہ زمانہ کی آہٹ کو دور سے سنتے ہیں، وہ زمانہ کے تقاضوں کو دوسروں سے زیادہ سمجھتے ہیں اور ان تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ معاشرے کو بدلتے ہیں اور کچھ زمانہ کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور یوں ایک توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اصلاح کا عمل ہے۔ زمانہ

کی تبدیلیوں سے دیر تک صرفِ نظر کیا جاتا رہے تو اس کے تقاضوں میں شدت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اس کا سیلِ بے اماں اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے جاتا ہے سابق سرمایہ کو نیست و نابود کر دیتا ہے اور تبدیلیوں کے جھنڈے گرما جاتے ہیں یہ انقلاب ہے۔ یہ سمندر کی طوفانی لہروں کی مانند ہوتا ہے کہ جب وہ اٹھتی ہیں۔ تو سب کچھ برباد کر ڈالتی ہیں، شاید کبھی نئی زمینیں بھی دے جائیں جو زرخیز ثابت ہوں۔ پہلا عمل ایک دریا کی سبک خرامی ہے جس کا پانی خشک زمینوں کو سیراب کرتا جاتا ہے، ان کی گہرائیوں تک سرایت کرتا ہے اور دیرپا و دور رس اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ اس سیراب زمین میں بیج بوئے جاتے ہیں تو ان کے کلّے پھوٹتے ہیں، پودا ابھرتا ہے، آہستہ آہستہ ابھرتا ہے، پتیاں اور شاخیں بڑھنا شروع ہوتی ہیں، پھر وہ ایک روز تناور درخت بن جاتا ہے اور برگ و بار لاتا ہے، جس سے مخلوقِ خدا فیضیاب ہوتی ہے۔

سرسید انقلابی نہیں تھے۔ وہ مصلحِ قوم تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جو انقلاب آیا وہ اس کی تباہ کاری دیکھ چکے تھے، اس کے ہولناک نتائج بھی ان کے سامنے تھے وہ ان میں سے کسی کو بھی دہرانا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے اس کے اسباب کو سمجھا بھی تھا، (ظاہر ہے کہ اپنے طور پر۔ جس سے اس وقت بھی بہت لوگوں نے اتفاق نہیں کیا اور آج بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے) اور ان عوامل کو سمجھنے کی کوشش کی تھی جو ایک قوم کی ترقی اور اس کے غلبہ و تسلط نیز دوسری قوم کے زوال اور مغلوبیت کے ذمّہ دار تھے۔ ان کو یقین تھا کہ جب تک ان کا تدارک نہیں کیا جائے گا، کوئی کامیابی حاصل ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ محض سر کٹانے اور خون بہانے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو حالات پیدا ہو گئے تھے ان کی تلافی مناسب تدبیر کے ذریعہ ہی بالخصوص اس صورت میں کہ اہلِ وطن کی ایک بڑی تعداد نے نئے نظام کو قبول کر لیا تھا۔ بلکہ وہ اس کا حصّہ بن کر اس کو تقویت پہنچا رہے تھے۔ اہلِ بنگال اس میں پیش پیش تھے۔ راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک نے انیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں ہی جدید تصوّرات کی راہ ہموار کر کے ایک بڑی تعداد کو اس طرف متوجہ کر دیا تھا۔ برادرانِ وطن کی ایک بڑی تعداد نے عسکری تصادم اور سیاسی

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ٹکراؤ کا راستہ ترک کر کے تعلیم کی راہوں سے اقتدار میں شرکت شروع کر دی تھی۔ مسلمان بوجوہ تصادم کی راہ پر گامزن تھے اور اقتدار وقت سے نفرت و بیزاری کے تصورات کے ساتھ علاحدگی اختیار کیے ہوئے تھے۔ یہ خلیج بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ سرسید نے نہ صرف اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی بلکہ قوم کو تعلیم کی طرف ملتفت کر کے علم کے خزانوں پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے تعلیمی ادارے قائم کر کے اپنی ان کوششوں کو عملی شکل دی تو اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ان کو تقویت بخشی۔ ان کی کوششوں میں جتنی شدت اور تیزی آتی گئی اتنی ہی ان کی مخالفت بھی بڑھی۔ یہ ایک طرح سے جدید اور قدیم کا ٹکراؤ بھی تھا۔ سرسید دیکھ رہے تھے کہ ہمارے قدیم علوم جو ابھی تک ہمارے نظام تعلیم کی بنیاد رہے تھے، اپنی علمی افادیت کھو چکے تھے۔ ان سے کسی حد تک مذہبی رہنمائی ضرور ہوتی تھی، لیکن زمانہ کے نئے تقاضوں کو پورا کرنے کی سکت وصلاحیت ان میں بالکل نہیں رہ گئی تھی۔ جدید علوم سے زندگی میں ایک انقلاب آرہا تھا۔ کلوں کی ایجاد اور ان کے استعمال سے نہ صرف زندگی میں سہولتیں پیدا ہو رہی تھیں بلکہ اس کی سمت ورفتار میں بھی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ طرح طرح کی ایجادات، پھر ان کے ذریعہ نئی کلوں کا بننا، پھر زندگی میں ان کا استعمال اور پھر اس سے زندگی کے رخ میں تبدیلی، یہ سب کچھ ان کے ہاتھ میں تھا، جن کے ہاتھوں میں علم کے خزانوں کی کنجی تھی۔ جدید تعلیم کے حصول کا ایک بہت ہی سطحی مقصد خواہ سرکاری ملازمتیں حاصل کرنا یعنی اقتدار وقت میں شریک ہونا رہا ہو۔ لیکن سرسید کی نظر اس سے کہیں اعلیٰ وارفع مقاصد پر تھی۔ انھوں نے بار بار یہ بات کہی کہ تعلیمی ادارے کے قیام سے ان کا مقصد محض ملازمت کے متمنی لوگوں کے لیے سندوں کا کارخانہ قائم کرنا نہیں تھا، بلکہ عالموں کی ایک جماعت پیدا کرنا تھا جو حقیقی علم کو فروغ دے اور اس کے ثمر وبرکات اور فوائد کو عام کرے۔ مگر ایک ایسے ماحول میں جہاں تعلیم ہی عام نہ ہو، ایسے اعلیٰ مقصد کا پورا ہونا آسمان کو چھونے کی کوشش کرنا تھا۔

یوں تو سارا ملک ہی جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن مسلمانوں میں علم وتعلیم سے بیگانگی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اگرچہ ان کے مذہب نے انھیں علم حاصل

کرنے کا حکم دیا تھا، مگر مذہب کی بھی کون سی پابندی ہو رہی تھی۔ خواص مالِ مست تھے تو عوام کھالِ مست، عوامی مدارس کا رواج ذرا کم تھا۔ درس و تدریس ایک انفرادی معاملہ تھا۔ علماء و مشائخ اپنے گھروں پر ہی تدریس کا شغل جاری رکھتے۔ بالعموم یہ ان کے لیے ذریعۂ معاش بھی نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس کا مقصد علم و معرفت کی ترویج اور رضائے الٰہی کا حصول ہوتا تھا۔ طالبانِ علم بھی علم کو جزو دین سمجھ کر ہی حاصل کرتے تھے، وسیلۂ معاش نہیں۔ چند ایک کے لیے ان کے علمی اکتسابات وسیلۂ معاش بھی بن جاتے، یہ ایک الگ بات تھی۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی توجہ تحصیلِ علم کی طرف سے ہٹتی گئی اور تعلیم کا فقدان ایک عام بات ہو گئی۔ کہیں کہیں تو پوری بستی میں کسی ایک حرف شناس کا ملنا بھی دشوار تھا۔ پورا معاشرہ اسی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا شہروں کے مقابلے میں دیہات کی اور مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی حالت اور بھی زیادہ خراب تھی۔ ہم سیاسی طور پر مساوات کی کتنی بھی باتیں کرتے رہیں لیکن یہ امتیاز ہمیشہ باقی رہا ہے اور بہ ظاہر اس کے ختم ہونے کے آثار آج بھی نظر نہیں آتے۔

شہروں میں عام طور پر تعلیم کا کچھ چلن رہتا تھا، جس سے دیہات عام طور پر محروم تھے۔ علم کے شائق مرد، دور دراز کا سفر کر کے ان مراکز تک پہنچتے اور علم کی چشموں سے سیراب ہوتے۔ یہ مواقع کسی پر بند نہیں رہتے، مگر ان تک رسائی اور ان سے استفادہ کرنے میں اتنی دشواریاں حائل ہوتیں کہ معدودے چند ہی اکتسابِ فیض کر سکتے تھے۔ مرد تو پھر بھی کچھ نہ کچھ تعلیم حاصل کر لیتے لیکن عورتوں کے لیے مزید دشواریاں تھیں۔ معاشرہ کی شہری تہذیب میں عورت کا مقام گھر تھا۔ اس کی چہار دیواری کے اندر ہی اس کی ساری زندگی محدود تھی۔ پردے کے رواج نے مزید رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔ اس کا اچھا برا یا صحیح و غلط ہونا ایک الگ مسئلہ ہے۔ لیکن عورت کا عام رواج کے مطابق اپنے گھر کی دنیا سے باہر قدم رکھنا معیوب تھا۔ دیہات میں عورت معاشی پیداوار میں مرد کے دوش بدوش تھی لیکن شہروں میں معاشی عمل میں عورت کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہ سراسر مردوں کی ذمہ داری تھی۔ تعلیم کا یوں بھی معاشی تفاعل میں کوئی بڑا دخل نہ تھا۔ اس لیے مردوں کو بھی

تعلیم کی طرف خاص رغبت نہ تھی، عورتیں تو اور بھی زیادہ بے نیاز تھیں۔ ان کی ذمہ داری تو یہ تھی کہ وہ گھر کے نظام کو درست رکھیں، خاندان کو مربوط و مستحکم رکھیں، اولاد کی پرورش و تربیت کریں، شادی بیاہ اور گھر کی ایسی دوسری تقاریب کا اہتمام کریں اور خانگی رسوم کی نگہداشت کریں۔ یہ خود ایک پوری دنیا تھی۔ گویا سماج کی دو سطحیں تھیں۔ ایک بیرونی، ایک اندرونی۔ بیرونی پرت مردوں سے متعلق تھی۔ تغیر پذیر، صلابت و سخت کوشی کی متقاضی، سرد و گرم زمانہ کو جھیلنے کی متحمل، معاشی پیداوار کی ذمہ داری یا دوسری اندرونی پرت تھی عورت پر مبنی۔ امور خانگی کی ذمہ دار، نئی نسلوں کی تربیت کرنے والی، خاندان کی شیرازہ بندی کرنے والی روایات و رسوم اور زبان و تہذیب کی پاسبان، نرم و نازک، مگر اس نازک شاخ کی طرح جو بڑے سے بڑے طوفان کو بھی جھکائی دے جائے، ٹوٹے نہیں اور طوفان گزر جانے کے بعد سر بلند ہو کر پھر کھڑی ہو جائے۔ مذہب دونوں میں مشترک تھا، اس کے تقاضے دونوں سے ہی یکساں تھے۔ پورے سماج مرد و عورت کی تعلیم سے بے نیازی اور بے تعلیمی کے باوجود جب کبھی خواتین کی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی یا وہ اس طرف متوجہ ہوئیں تو اس کی ضرورتیں بہت زیادہ نہیں تھیں۔ قرآن پاک کی تلاوت، مذہب کا اتنا علم جو ان کو فرائض و واجباتِ دین سے واقف کرا دے، امور خانہ داری، پرورش اطفال اور صحت و صفائی کے مبادیات، یہ ان کی ضرورتیں تھیں۔ بقول نذیر احمد:

"اس ملک میں مستورات کو پڑھانے لکھانے کا رواج نہیں۔ پھر بھی بڑے شہروں میں بعض شریف خاندانوں کی اکثر عورتیں قرآن مجید کا ترجمہ، مذہبی مسائل اور نصائح کے اردو کے رسالے پڑھ پڑھا لیا کرتی ہیں۔" (مراۃ العروس ص۔۱)

نہ صرف یہ کہ شریف خاندانوں کی عورتیں پڑھ پڑھا لیا کرتی تھیں بلکہ ان کا انتظام بھی شریف خاندانوں کے گھروں میں ہی ہوتا تھا۔ جن کو توفیق ہوئی، ان کے گھروں میں مکتب قائم ہوتا، پاس پڑوس کی بچیاں وہاں جاتیں اور گھر کی بی بی ان کو تعلیم دیتی۔ یہ تعلیم کا مفت رضا کارانہ انتظام تھا۔ آج کی اصطلاح میں سماجی خدمت کہہ لیجئے لیکن وہ خواتین اس کو دین کا، خیر کا اور ثواب کا کام سمجھ کر

انجام دیتی تھیں۔ سماجی خدمت بھی تو کارِ خیر ہی ہے۔ نذیر احمد نے مراۃ العروس اور بنات النعش میں مکتب کے جو نقشے پیش کئے ہیں، وہ اس دور کے تعلیم نسواں کے نظام اور اس کی ضرورتوں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اصغری کی تعلیم کہاں اور کیسے ہوئی۔ لیکن وہ اس دور کی تعلیم یافتہ ذہین اور روشن خیال خواتین کی نمائندہ ہے۔ وہ سلیقہ مند، خوش تدبیر اور نیک سیرت ہے۔ وہ خاندان خواہ وہ میکہ ہو یا سسرال کی بہی خواہ ہے اور اس کے مختلف افراد میں ہم آہنگی و یگانگت پیدا کرنے کی خواہاں ہے وہ اس سماج کے تناظر میں ایک مثالی خاتون کا کردار پیش کرتی ہے۔ یہ محض ایک خیالی ہیولیٰ نہیں تھا، بلکہ اس کے جیتے جاگتے نمونے سماج میں موجود تھے۔ خود سرسید کی والدہ کے بارے میں جو اطلاعات فراہم ہوتی ہیں وہ یہ کہ "وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور ابتدائی کچھ فارسی کی کتابیں بھی پڑھی تھیں"[۱] لیکن ان کی سوجھ بوجھ اور قابلیت معمولی عورتوں سے بہت زیادہ تھی۔ یہ کوئی معمولی خاتون نہ تھیں۔ یہ دبیر الدولہ، امین الملک، خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ کی چہیتی اور ہونہار بیٹی تھیں۔ خواجہ فریدالدین خود "بااقبال، لائق، دانشمند، صاحب علم وفضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے"[۲] ان کے بیٹے یعنی سرسید کے ماموں نواب زین العابدین "فنونِ ریاضی میں یدطولیٰ"[۳] رکھتے تھے۔ سرسید کی بہن صفیۃ النساء بیگم "عورتوں میں ممتاز اور قابل تھیں۔ اکثر مذہبی کتابیں اور کچھ حدیث کی عربی کتابیں بھی مع ترجمہ کے پڑھی تھیں اور ان کے گھر میں کنبے کی اکثر لڑکیاں جمع ہوتیں اور ان سے پڑھتی تھیں"[۴] سرسید کا خاندانِ اشرفیہ کے بھی اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا، لیکن خواتین کی تعلیم ایک مختصر دائرے میں محدود تھی۔ اس سے زیادہ کی اس معاشرے میں ضرورت بھی نہ تھی، نہ اس کا کوئی انتظام و انصرام۔

سرسید جب مختلف تجربات اور کافی غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ قوم کو ذلت و پستی سے نکالنے، زمانہ کے ساتھ قدم سے قدم ملاکر چلنے اور جدید دور کی ترقیات سے مستفاد ہونے کے لیے تعلیم اشد ضروری ہے تو انھوں نے اس دور کے تعلیمی نظام کو قریب اور غور سے دیکھا، اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے

منصوبہ بنایا اور اس کو عملی شکل دینے میں جی جان سے جٹ گئے۔ انگلستان کے سفر کے دوران انھوں نے جہاں تعلیمی اداروں، وہاں کی مجلسوں، شرفار کی محفلوں، بازاروں، شہری آبادیوں اور زندگی کے دیگر مظاہر کو دیکھا وہیں یورپی خواتین کو بھی دیکھا۔ ان کی شائستگی، ان کے مہذب انداز، ان کے تعلیمی و علمی رجحان اور زندگی کے مختلف امور میں ان کی عملی شرکت کا مشاہدہ کیا۔ وہ اس بات سے بھی بے حد متاثر ہوئے کہ کس طرح یہ خواتین مردوں کے دوش بدوش زندگی کے کاروبار میں ہاتھ بٹا رہی ہیں (یہ الگ بات ہے کہ ابتداً اس عمل کا آغاز سماجی مجبوریوں کے تحت ہوا)

ان کے دل میں جہاں یہ ارمان پیدا ہوا کہ ان کا وطن اور ان کے اہلِ وطن انگلستان اور اہلِ انگلستان کی طرح ہو نے، وہیں ان کو ملک اور اہلِ ملک کی موجودہ حالت پر سخت تاسف بھی تھا۔ انھوں نے مولوی مہدی حسن کو (محسن الملک) کے نام ایک خط میں لکھا؛

"پس مختصر حال و نتیجہ سفرِ یورپ کا یہ ہے، مگر ہماری قسمت میں جلنا ہے یہاں کا حال دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حماقت اور بے جا تعصب اور تنزل موجودہ اور ذلت آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔ مذہب جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے خوب اختیار کیا ہے، اس میں بھی وہی حماقت اور نالائقی اور گمراہی ہے جو اور تمام کاموں میں ہے۔ پس کوئی کیا کرے، بد اقبالی، بد نصیبی کا کچھ علاج نہیں۔" ۵ے

بالخصوص خواتین کے بارے میں وہ اور بھی زیادہ دل گرفتہ ہوئے کہ یہ مردوں سے بھی زیادہ پس ماندگی اور ابتری کا شکار تھیں۔ اپنے سفر نامہ لندن میں انھوں نے یہ بیان کر کے کہ کس طرح ایک لڑکی نے ان سے علمی گفتگو کی اور وہ اس کی فہم و دانش سے متاثر ہوئے۔ یہ بھی بیان کیا کہ اپنے ملک کی عورتوں کے بارے میں سوچ کر ان کو کتنا دکھ ہوا، انھوں نے لکھا:

"اگر ہندوستان میں کوئی عورت بالکل برہنہ بازار میں پھرنے لگے تو ہمارے

۵ے ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ہم وطنوں کو کیا تعجب اور کس قدر حیرت ہوگی۔ بلا مبالغہ یہ مثال ہے کہ جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور صلۂ تربیت اور زیورِ تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو بڑا ہی تعجب ہوتا ہے۔"

وہاں موسط طبقہ کی عورتوں میں بھی علم و تعلیم کا رواج اور پھر اس کے اثر سے ان کا شائستہ و مہذب ہونا، خانگی امور میں ان کا خوش سلیقہ ہونا اور پھر سوسائٹی میں ان کا ذی مرتبت و ذی عزت ہونا سر سید نے دیکھا تو ہندوستانی عورتوں کی زبوں حالی کا احساس اور بھی شدید ہوا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ جس سوسائٹی میں مردوں کا ذہن ہی جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہو، وہاں عورتوں کی حالت بہتر ہونے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ چشم زمانہ نے یہ بھی دیکھا کہ خود مردوں کی تعلیم کے بارے میں ان کی کوششوں کی سخت مخالفتیں ہوئیں۔

تعلیمِ نسواں کا معاملہ اور بھی زیادہ نازک تھا اور اس کو چھیڑ کر تعلیمی تحریک کے لیے مزید دشواریاں پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ سوسائٹی کے مرد تعلیم یافتہ ہو جائیں اور تعلیم سے ان کا ذہن روشن ہو جائے تو تعلیم نسواں کے سوتے خود بخود جاری ہو جائیں گے۔ تعلیم نسواں کے لیے جو سرکاری مدارس قائم تھے ان کی حالت اور ماحول اس قسم کا تھا کہ اشراف خاندانوں کے مسلمان اپنی بیٹیوں کو ان اسکولوں میں بھیجنے پر مائل نہیں ہو سکتے تھے۔ نہ اس دور میں سرکار یا کسی ادارے کے لیے ایسے اسکول قائم کرنا ممکن تھا جو "لڑکیوں کے مربیوں کی طمانیت کے لائق ہو"۔ معاشرتی ماحول اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی پابندیاں بھی لڑکیوں کی تعلیم میں حارج تھیں۔ نہ ان سے صرفِ نظر کیا جا سکتا تھا، نہ اس ماحول کو ایک دم بدلا جا سکتا تھا۔ خود ان مصلحین کا ذہن بھی اسی ماحول کا پروردہ تھا، وہ اس میں ترمیمات کر سکتے تھے مگر اس کو توڑ تو نہیں سکتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں سر سید نے تعلیمی کمیشن کے روبرو شہادت دیتے ہوئے تعلیم نسواں کے متعلق کہا:

"جن شخصوں کی یہ رائے ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہیئے وہ غلطی پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ہوجائیں گے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالات پر غور کیا جائے تو اس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے کافی ہے۔ جو کچھ بالفعل گورنمنٹ کو کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے بندوبست کی جانب کافی توجہ کرے، جب کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بخوبی تعلیم و تربیت یافتہ ہو جائے گی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اس کا ضرور بالضرور ایک زبردست خفیہ اثر پہنچے گا۔ تعلیم یافتہ باپ یا بھائی یا شوہر بالطبع اپنی رشتہ مند عورتوں کی تعلیم کے خواہشمند ہوں گے۔"؎

سرسید ہی کی کوششوں سے ۱۸۸۶ء میں "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اولین مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا قرار دیا گیا تھا۔ اس کے اراکین سرسید کے ہمنوا اور ہم خیال لوگ ہی تھے اور تعلیم کی ترویج و اشاعت میں اتنے ہی سرگرم تھے۔ ۱۸۹۸ء میں لاہور میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تو زندہ دلان پنجاب نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ وہ سرسید کی آواز پر پہلے ہی لبّیک کہہ رہے تھے۔ اس اجلاس میں تعلیم نسواں کے مقصد کو تقویت پہنچانے کے لیے مدارس قائم کرنے کے لیے قرار داد پیش کی گئی تو سرسید اس بارے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"کوئی دنیا کی تاریخ اس وقت نہیں مل سکتی کہ جن خاندانوں کے مردوں نے تعلیم پائی ہو، مردوں کے اخلاق درست ہو گئے ہوں، مردوں نے علم و فضل حاصل کر لیے ہوں اور عورتیں تعلیم سے محروم رہی ہوں۔ ہمارا منشا یہی ہے کہ یہ تعلیم ہم جو لا رہے ہیں، لڑکوں کی تعلیم نہیں ہے بلکہ لڑکیوں کی ہے، جن کے وہ باپ ہوں گے۔ اس وقت ہم عام یورپ کی اور تعلیم یافتہ ممالک کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب مرد لائق ہو جاتے ہیں عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہوں عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم کچھ عورتوں کی تعلیم کا خیال نہیں کرتے اس کوشش کو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ذریعہ سمجھتے ہیں۔"؎

اپنے سفر پنجاب کے دوران انھوں نے پھر اسی خیال کو دہرایا۔ خواتین کے

؎ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا؛

''اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت درست ہو گئی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔
تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔'' [۹]

مگر وہ خود اپنی تحریک کے ابتدائی دور میں ہی تعلیم نسواں کی زبردست حمایت کر چکے تھے۔ انھوں نے شریف خاندانوں کو غیرت دلائی تھی کہ ان کی لڑکیاں تعلیم سے بے بہرہ رہ کر زیورِ انسانیت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ اپنے ایک مضمون (۱۸۶۹ء) میں انھوں نے لکھا تھا۔

''ہم تعجب کرتے ہیں ان حضرات شرافت شمار کی شرافت پر کہ وہ کیسے اپنی عورتوں کی ناشائستگی کو پسند کرتے ہیں اور کیوں اس تعلیم کو ناپسندیدہ جانتے ہیں۔ انسان کی آراستگی کے واسطے بالاتفاق زیورِ علم سے زیادہ اور کوئی شئے آرائش و زیبائش کی نہیں ہے۔ پس کیا وجہ ہے کہ عورتوں کی نسبت جہالت پسند کی جائے۔ کیا عورتیں ان کے نزدیک فی نفسہ مرتبہ انسانیت سے خارج ہیں جو ان کو مثل جانوروں کے رکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔'' [۱۰]

نذیر احمد کے کردار اکبری، نعیمہ، غیرت بیگم وغیرہ اسی ماحول کی پروردہ ہیں جہاں عورتوں کی جہالت ان کو نہ صرف ناشائستگی، بدسلیقگی، ضد اور ہٹ دھرمی کا شکار بنا دیتی ہے بلکہ ان کو مثل جانوروں کے زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ان بیانات پر نظر ڈالیئے تو چند باتوں کا اندازہ ہوتا ہے: (۱) سرسید کو اندازہ ہو گیا کہ معاشرے میں مغربی تعلیم سے یک گونہ نامناسبت بلکہ نفرت موجود ہے۔ جب تک معاشرے کی عام طبائع اس سے مانوس نہ ہو جائیں، اس کے فوائد پر مطلع ہو کر اس کو بخوشی قبول نہ کرنے لگیں، اس وقت تک ادھر پوری توجہ نہ ہو گی۔ اس تعلیم کے ساتھ اجنبیت اور بیگانگی ہی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ معاشرے میں بڑے شبہات یہ بھی تھے کہ یہ عیسائیت کی تبلیغ کا ذریعہ ہے اور جو لڑکے یہ تعلیم پائیں گے وہ اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے۔

۹۔ فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

واس کی مثالیں بھی موجود تھیں) جب تک یہ شکوک وشبہات دور نہ ہوں گے، اس وقت تک خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی (۲) جو معاشرہ ان شبہات کی بنا پر لڑکوں کی تعلیم کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ لڑکیوں کو اس تعلیم میں ڈالنا کیسے برداشت کرتا۔ یہ تو گویا معاشرے کے قلب پر براہ راست حملہ ہوتا۔ اس کے خلاف جو ردِّ عمل ہوتا اس سے لڑکوں کی تعلیم بھی متاثر ہوتی۔ اس لیے انھوں نے صبر و تحمل کے ساتھ اپنی رائے میں ترمیم کی اور تعلیم نسواں کو مؤخر کیا کہ جب وہ نسل آجائے گی جس نے جدید تعلیم حاصل کی ہوگی اور جس کا ذہن اس سے مانوس ہو چکا ہوگا وہ خود ہی خواتین کی تعلیم کا انتظام کرے گی اور تب اس قدر بھڑک اور مغایرت محسوس نہ ہوگی۔ یہ ان کی حکیمانہ بصیرت اور دور اندیشی کا تقاضا تھا جو فوری اور عارضی نتائج پر نظر نہیں رکھتی بلکہ دور رس اور مستقل اثرات کو مدّ نظر رکھ کر عمل کا خاکہ بناتی ہے۔ (۳) ہوا بھی یہی کہ سر سیّد کی تعلیمی تحریک شروع ہونے کے بیس پچیس سال کے اندر اندر ہی تعلیم نسواں کے لیے آوازیں اٹھنے لگیں، اس کے مطالبے کیے جانے لگے، نسوانی بیداری اور حقوق نسواں پر بھی زور دیا جانے لگا۔ تاآنکہ سر سیّد کی قائم کردہ ایجوکیشنل کانفرنس میں ۱۸۹۱ء میں تعلیم نسواں سے متعلق مندرجہ ذیل قرار داد منظور کی گئی:

اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کی بھی کوشش لازم ہے کیونکہ قوم کی اصلی ترقی زیادہ تر اسی پر منحصر ہے۔ یہ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ عورتوں کی مذہبی، علمی اور اخلاقی زندگی میں ترقی ہو۔"

آج ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اب سے سوا سو سال پہلے جدید تعلیم کی راہ میں کیا دشواریاں حائل تھیں۔ لوگوں کے دلوں میں بجا طور پر شکوک وشبہات تھے صدیوں کی معاشرتی روایات کو توڑنا یا بدلنا آسان نہیں تھا، مذہبی عقائد اپنی حقیقی شکل سے دور ہو جانے کی وجہ سے، اس راہ میں خود بڑی رکاوٹ تھے۔ صنفِ نازک کا معاملہ اور بھی پیچیدہ تھا۔ شرفا اپنے گھر کی بچیوں کے گھر سے باہر قدم رکھنے کو معیوب جانتے تھے۔ عوامی اسکولوں کا تصور بھی عام نہیں تھا۔ پردہ وغیرہ کا انتظام بھی ہوتا تو شرفا کو اپنے گھر کی لڑکیوں کا حاشا کے ساتھ

بیٹھنا گوارہ نہ تھا۔ اس لیے اس حساس مسئلہ کو چھیڑنا بہت سی دشواریوں کو دعوت دینا تھا۔ سر سید نے اس معاملہ میں مصلحتاً آہستہ روی اختیار کی۔

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ جذب و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

وہ اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جب جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی نسل تیار ہو جائے اور خود ان کے اندر داعیہ پیدا ہو کہ وہ تعلیم نسواں کے کام کو آگے بڑھائیں۔ چنانچہ جہاں ۱۸۹۱ء میں صرف ایک قرارداد منظور ہو کر رہ گئی تھی، وہیں ۱۸۹۸ء میں ایجوکیشنل کانفرنس میں باقاعدہ شعبۂ نسواں قائم ہو گیا۔ اور تعلیم نسواں کا کام بھی اسی زور و شور سے شروع ہو گیا جس طرح دوسری تعلیمی کوششیں جاری تھیں۔ اب یہ آوازیں اٹھنے لگیں کہ خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے بغیر قومی زندگی مہمل رہے گی اور ترقی کا کوئی تصور اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

سر سید نے جب جب عورتوں کی تعلیم کو موخر کرنے یا محدود رکھنے کی بات کہی تو یہ ان کی اصلاحی مصلحت کا تقاضا تھا۔ وہ خواتین کو معاشرے کا اہم جزو سمجھتے تھے اور یہ بھی کہ اتنے اہم جزو کو مہمل اور ناکارہ چھوڑ دینا کسی بھی معاشرے کے لیے نیک فال نہیں ہو سکتا۔ سو سال گزر جانے کے بعد بھی ابھی تک نہ تو ملک کی خواندگی کا مسئلہ حل ہوا اور نہ ابھی تک مردوں اور عورتوں کے درمیان تعلیمی تناسب کا فرق ختم ہوا۔ آزاد ہندوستان میں اس کے لیے برابر کوششیں ہو رہی ہیں۔ حکومت کے ذرائع ابلاغ، حکومت کی پوری مشنری اس کے لیے کوشاں ہے اور بڑا سرمایہ بھی اس کے لیے فراہم کیا جا رہا ہے۔ مگر ملک کے مخصوص حالات کی وجہ سے یہ فرق ابھی تک قائم ہے۔ سو سال پہلے اس راہ کی دشواریوں کو مدِ نظر رکھیں تو سر سید کے جذبات سے عاری حقیقت بینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ قوموں کی تشکیل و تعمیر میں یہی حقیقت بینی مفید و بار آور ہو سکتی ہے۔ سر سید نے اسی کو اپنایا اور قوم کے لیے ٹھوس بنیادیں فراہم کیں۔ معاشرے کے روشن خیال افراد تعلیم نسواں

کی کمی کی تلافی کا بیڑا اٹھا سکیں تو یہ سرسید کو حقیقی خراجِ عقیدت ہوگا۔

حوالے

۱۔ حیاتِ جاوید، ص ۴ (۲) ایضاً، ص ۳۴۔ (۳) ایضاً، ص ۳۵۔
۴۔ ایضاً ص ۴۴۔ ۵۔ خطوط سرسید مرتبہ راس مسعود، ص ۴۲ ۶۔ سفرنامہ مسافران لندن ص ۱۰۹ ۷۔ حیاتِ جاوید، ص ۲۲۸ ۸۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز، ص ۲۱۰۔
۹۔ سرسید احمد خاں پنجاب میں، ص ۱۴۴ ۱۰۔ بحوالہ منتخب مضامین سرسید، ص ۱۸۶۔

"ہماری قوم نے تعلیم کی طرف سے جس کی اس زمانے میں حد سے زیادہ ضرورت ہے اور اس زمانے میں وہی ایک ذریعہ اقبال مندی اور دولت مندی کا ہے، یک لخت توجہ ہٹالی ہے اور خود اپنے تئیں ایسا نالائق کر دیا ہے کہ کسی کام کے لائق نہیں رہے ہیں۔ جن لوگوں کی اقبال مندی اور عروج روز افزوں پر ہم رشک کرتے ہیں وہ تو ایک زمانے میں ہم سے بھی کم درجے پر تھے۔ ہم سوئے وہ جاگے۔ ہم بیٹھے وہ کھڑے ہوئے۔ ہم کھڑے ہوئے وہ چل نکلے۔ ہم چلے وہ دوڑ گئے۔ پس وہ آگے بڑھ گئے ہم پیچھے رہ گئے۔ اگر ہم کو کچھ مانگنا ہے یا کچھ شکایت کرنی ہے تو ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم اوّل اس کے ملنے کے لائق ہو جائیں جس کو مانگتے ہیں۔ اول ہم اپنے تئیں اس شکایت کے لائق کریں جس کی شکایت کرتے ہیں۔" (سرسید احمد خاں)

ڈاکٹر رضیہ حامد

ندائے سرسیّد

سرسیّد احمد خاں کی شخصیت کے ترکیبی عناصر

سرسیّد کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے سو سال سے اوپر ہو گئے۔ وہ قدیم اور جدید کے سنگم تھے۔ وہ اسلام پیغمبر اسلام۔ قرآن اور ملّتِ اسلامیہ سے محبت کرتے تھے۔ ملّتِ اسلامیہ کے سچے بہی خواہ تھے۔ اسی بہی خواہی کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنے بوڑھے کاندھوں پر امت کی ڈوبتی کشتی کو سہارا دیا تھا۔ مرتے دم تک مسلسل جہد وعمل، غور وفکر میں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ گزارا تھا۔ ان کی فکر وعمل سے بہت سے چراغ جل اٹھے تھے جو مخالفت کی آندھیوں میں بھی امت کی رہبری کرتے رہے۔ سیّد القوم کی زندگی کی تصویر ان خطوط سے مرقع ہے ـــــــ

۱۔ اسلام اور پیغمبر اسلام سے سچی محبت۔

۲۔ قرآن کے سچ اور آخری وحی الٰہی ہونے کا کامل یقین۔

۳۔ قرآن کی سچائی ہونے کا اعتماد۔

۴۔ قرآن کے فطرت اور قانون قدرت کے عین مطابق ہونے کا یقین۔

۵۔ قرآن وسنت کی صحیح تعمیل سے ہی امت کی فلاح وبہبودی ممکن ہونے کا کامل یقین۔

۶۔ امتِ مسلمہ کی ترقی کے لیے مر مٹنے کا جذبہ۔

۷۔ تعلیم (قدیم و جدید) تربیت۔ ڈسپلن جیسے اقدار کی پرورش۔ جہدِ مسلسل کو امت کی بدبختی کا یقینی علاج تصور کرنا۔
۸۔ آزادانہ تحقیق و جستجو اور سائنسی مزاج پیدا کرنا۔
۹۔ ضمیر، تقریر و تحریر کی آزادی خواہ مقابلہ دوست سے ہو یا مخالفین سے۔
۱۰۔ حق کے راستہ میں ہار نہ ماننا، اظہارِ حق کا حوصلہ۔
۱۱۔ تمام تعصبات سے بلند ہو کر خدمتِ خلق میں لگ جانے کی لگن۔
۱۲۔ حق کے راستے میں پوری قوت۔ طاقت، جوش انفرادی، اجتماعی، تحریری تقریری، عقلی، تجرباتی، ذہنی استقلال۔
۱۳۔ منصوبہ بندی کے ساتھ راہِ حق میں وسائل کا استعمال۔
۱۴۔ تعصب، بیجا خوشامد، ریا، نا اتفاقی، غلامی، بیجا رسوم، تقلید محض، بیکاری، وقت کے ضیاع، مفلسی، بے عملی، جدت سے پرہیز، سوچ اور عمل میں تیز رفتاری ناقص تعلیم سے بیزاری۔
۱۵۔ بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہ ہونا۔
۱۶۔ صاف ستھری پاکیزہ زندگی گزارنا۔
۱۷۔ رفقاء، ہم خیالوں، اور حق کا ساتھ دینے والوں سے مہربانی۔ ہمدردی اور
۱۸۔ سچی رفاقت دینے اور قائدانہ رہبری کا جذبہ۔
۱۸۔ مخالفین کو آخری حدود تک اپنی صلاحیت کے مطابق تمام عملی اور علمی ذرائع کے استعمال اور خیر خواہی کا تصور، برائی سے نفرت اور بدکار سے خیر خواہی کرنے کا حوصلہ۔
۱۹۔ بے حسی کے خلاف جہاد کا جذبہ۔
۲۰۔ بے غرضی، دیانت داری، انصاف، وفاداری، قوتِ فیصلہ کے استعمال کی صلاحیت۔
۲۱۔ وطن اور اہلِ وطن سے محبت اور برابری کا شوق۔
۲۱۔ پرخلوص مطابقت کا حوصلہ۔
۲۲۔ مسائل کی تہہ تک پہنچ کر باریک بینی سے مسائل کے حل کا پختہ خیال۔

ماہنامہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۲۳۔ پریشانیوں، خطروں، مصیبتوں، تکلیفوں، اذیتوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہنے اور پسپا نہ ہونے کا حوصلہ، عمل اور تعمیر۔

۲۴۔ پابندیٔ وقت کا خیال۔

۲۵۔ ذاتی مطالعہ، محنت، جفاکشی، ذہانت، زندہ دلی، راست بازی، فراخ حوصلگی اپنی رائے پر وثوق سے عمل پیرا ہونے کی مسلسل کوشش۔

بقول حالی ''سرسید احمد خاں کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں ان ہی میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پاسکتے . . . . . سرسید کی لائف ہم کو نصیحت کرتی ہے کہ زمانے کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سمجھ کر اس سے موافقت پیدا کرو تاکہ دنیا میں آرام سے رہو اور عزت سے زندگی بسر کرو۔ جب تم میں عمدہ حاکم بننے کی لیاقت باقی نہ رہے تو عمدہ رعیت بننے میں کوشش کرو تاکہ دونوں عمدگیوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو''۔ سرسید کی زندگی سے حالی ہمیں مندرجہ ذیل سبق لینے کی تاکید کرتے ہیں ــــــ

۱۔ ''کوئی قوم محکوم ہونے کی حالت میں کیونکر قومی عزت حاصل کرسکتی ہے۔ ایک شائستہ قوم میں کیونکر اس کا رسوخ و اعتبار بڑھ سکتا ہے''۔

۲۔ ''ہم کیونکر اپنی آزادی کو قائم رکھ سکتے ہیں''۔

۳۔ ایک طرف ہم کو خودداری اور سیلف ریسپکٹ کی تاکید اور غلامانہ خوشامد سے نفرت دلاتی ہے دوسری طرف حکمراں قوم کا ادب اور اس کی بزرگداشت ہمارے دلوں پر نقش کرتی ہے''۔

۴۔ وہ ہم کو خبردار کرتی ہے کہ قومی تنزل سے قوم کے مذہب کو کیا صدمہ پہنچتا ہے اور اس کا تدارک کیونکر ہوسکتا ہے اور قوم کے متہم ہونے سے قوم کن آفتوں میں مبتلا ہوجاتی ہے اور اس کا علاج کیا ہے''۔

۵۔ وہ ہم کو اسلام کے وہ اعلیٰ اصول یاد دلاتی ہے جن کو قرونِ اولیٰ کے بعد قوم نے بالکل فراموش کردیا تھا اور جن کا مطلب یہ تھا کہ قوم اور وطن کی محبت

۔ فکر و آگہی کا میگزین ۲۰۰۰ء

کو جزوِ ایمان جانو اور قوم کی سرداری کا تمغہ سمجھو۔"

۶۔ "وہ ہم کو سبق دیتی ہے کہ قوم کی حقیقی خیر خواہی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ بہت سے کام ان کی عقل اور عادات اور مرضی کے خلاف نہ کیے جائیں اور ان کی مخالفت کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت نہ کیا جائے۔"

۷۔ "وہ ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ اگر دنیا میں بڑا بننا چاہو تو حرص، طمع، خود غرضی، جھوٹ، آرام طلبی اور عیش و عشرت سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو جاؤ۔"

۸۔ "وہ ہم کو یقین دلاتی ہے کہ تھوڑی سی تعلیم اور بہت سا تجربہ اور بالکل سچائی یہ تینوں مل کر ایسے ایسے عظیم الشان کام انجام کر سکتی ہے جو بڑے بڑے حکیموں اور مدبّروں سے انجام نہیں ہو سکتے۔"

۹۔ "وہ ہم کو تعصّبات سے متنفّر کرتی ہے۔ غیر قوموں کے ساتھ معاشرت سکھاتی ہے۔ دوستوں کے ساتھ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا یہودی، خلوص اور سچائی سے ملنا بتاتی ہے۔

۱۰۔ "وہ ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جیسا دل میں سمجھو ویسا ہی زبان سے کہو اور جو کچھ کہو اس کو کر کے دکھاؤ۔"

۱۱۔ "وہ بہ آواز بلند کہتی ہے کہ وقت کی قدر کرو۔ ڈیوٹی کا خیال رکھو ایک لمحہ بیکار نہ رہو اور کام کرتے کرتے مر جاؤ۔"

مندرجہ حقائق اور حالات کا تقاضہ ہے کہ سر سیّد کے کام اسی لگن سے کرنے کی اُسی طرح ضرورت ہے جیسی آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے تھی۔

"سر سیّد کی جتنی کوششیں اور جتنے کارنامے ہیں ان کی تہ میں مذہب کا ایک وسیع تصوّر اور ایک گہرا مذہبی جذبہ جاری و ساری تھا۔" (شہناز ہاشمی)

ڈاکٹر لطیف احمد سبحانی

سرسید

کا

نظریۂ قومی یکجہتی

"اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے۔ جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جاوے گی اور ایک دوسرے کو برباد کریں گے تو کانی بن جاوے گی پس اے ہندوستان کے رہنے والو ہندو و مسلمانو! اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بناؤ چاہو کانا۔"

یہ دل آویز الفاظ سرسید احمد خاں کے ہیں جس میں ان کے دل کی آواز پوشیدہ ہے۔ سرسید کو اپنے ملک ہندوستان سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ قومی یکجہتی کے دلدادہ بلکہ علمبردار تھے۔ قومی یکجہتی کے تاریخی سفر کا جائزہ لینا مناسب سمجھتے ہیں۔

ہندوستان جیسے کثیر الجہت ملک کے لیے قومی یکجہتی کا وجود اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا کہ انسان کے لیے سانس۔ آج کی طرح تاریخ کے ہر دور میں قومی یکجہتی کی روایت کی خاصی اہمیت رہی ہے چاہے اس کے نقوش دھندلے ہو گئے ہوں لیکن اس سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔

چنانچہ ہندوستان میں زمانۂ قدیم ہی سے دنیا کے گوشے گوشے سے مختلف قوموں، فرقوں، مذہبوں اور زبانوں کے ماننے والے آئے اور ایک عظیم مشترکہ تہذیب کی بنیاد ڈالی۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوقؔ اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

آریہ جس وقت یہاں آئے انھوں نے ایک ترقی یافتہ تہذیب پائی۔ دراوڑوں کو دکن کی طرف ڈھکیل دیا اور اپنے استحکام، ملکی انتظام اور حفاظت کی خاطر اپنے آپ کو فرقوں یعنی برہمن، چھتریہ، ویش اور شودر میں تقسیم کرلیا جس کی وجہ سے پوری قوم ترقی کی اعلیٰ منازل تو طے کرتی چلی گئی لیکن اس تقسیم نے ملک کی سالمیت کو ختم کر دیا۔ اور پورا بھارت ادنیٰ واعلیٰ، حاکم و غلام، جاہل و عالم، سرمایہ دار و مزدور اور اونچ نیچ کے طبقوں میں بٹ کر رہ گیا۔

جب مسلمانوں نے نانک اور گوتم کی اس مقدس زمین پر اپنا قدم رکھا تو ہندوستان کی، سماجی، مذہبی، سیاسی و معاشرتی زندگی کا ڈھانچہ بالکل چکنا چور ہو گیا تھا۔ ملک میں انتشار وافتراق کا ماحول تھا اور وہ کئی علاقوں میں تقسیم تھا۔ ہر علاقے کی ایک اپنی الگ زبان، ایک جداگانہ رسم ورواج ایک علحدہ تہذیب و تمدن تھی۔

مسلمان اس ملک میں آکر بسے اور یہاں کے اصل باشندوں سے مل کر شیر و شکر ہو گئے۔ انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا اور یہ سمجھ کر یہاں رہے کہ انھیں اب اسی خاک کا پیوند ہونا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے ایک ریاست کی بنیاد ڈالی اور ملک کو سنوارنے، بنانے، نکھارنے، اس کے مستقبل کو چمکانے اور متحد کرنے میں مشغول ہو گئے۔ مختلف قوموں اور گروہوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پرو کر واحد بھارتی قوم بنانے میں مسلمانوں نے اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ گنگا جمنی تہذیب اور قومی یکجہتی کا حسین تحفہ مسلمانوں نے ہمارے دیش کو دیا ہے۔ قومی یکجہتی ایک مقدس قومی ورثہ ہے۔

انگریز ہندوستان میں آئے اور اس مقدس قومی ورثہ کے گلدستے کو ٹھوکروں سے اڑا دیا۔ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی خطرناک چال چلی گئی۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نفاق کا بیج بویا گیا۔ ملک کی دو عظیم قوموں میں بے اعتمادی اور نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ایک دوسرے کے مذہبی بزرگوں کی شان میں گستاخیاں اور شرمناک بہتان تراشیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کے نتیجے میں برسوں سے دوست اور ہمسایہ کی طرح رہنے والے لوگ نہ صرف ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے بلکہ ایک دوسرے کے مخالف بھی ہو گئے۔ مذہب ذات پات اور زبان کی تفریق کو جنم دے کر ہندوستان کی اکائی وحدت اور یکجہتی کے مضبوط قلعہ کو ڈھانے کی کوشش کی جانے لگی اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح اس قلعہ کو بچایا جائے۔ چنانچہ ہندوستان کی وحدت کا حسین خواب دیکھنے والے اور ملک و قوم کے خادم سرسید احمد خاں ناخدا کی شکل میں نمودار ہوئے اور طوفان میں پھنسی قوم کی کشتی کو پار لگایا۔ پھوٹ ڈالنے والی اس خطرناک پالیسی کو کچل ڈالنے کے لیے عملی اقدامات کیئے اپنی تقریر و تحریر سے ہندوستانیوں کے دلوں میں قومی یکجہتی کی روح پھونکی وہ کہتے ہیں:

"قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے گو ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اس زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اس زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو مسلمان، عیسائی بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔"

> ہماری بھی مدت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی نہ کرنے سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اور محبت قائم ہوتی ہے تو گائے کی قربانی نہ کرنا اس کے کرنے سے ہزار گنا بہتر ہے۔
> (سرسید)

سرسید تمام عمر ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لیے قومی ترقی اور اصلاح کے لیے جدوجہد کرتے رہے اسی لیے اکثر موقعوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے مذہبی نفاق اور فرقہ وارانہ تعصب پر اپنی بے چینی

اور گہرے رنج کا اظہار کیا ہے۔ وہ احساس کو جگانے کے لیے اور قومی حمیت پیدا کرنے کے لیے ایک جگہ کہتے ہیں۔

"ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار اہلِ وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے اور آپس کے نفاق اور ضد و عداوت ایک دوسرے کی بدخواہی سے ہم دونوں برباد ہونے والے ہیں۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جو اس نکتے کو نہیں سمجھتے اور آپس میں ان دونوں فرقوں میں تفرقہ ڈالنے کے خیالات پیدا کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس نفرت اور نقصان میں وہ خود بھی شامل ہیں اور آپ پاؤں پر کلہاڑی مارتے ہیں۔"

ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا جس میں ہر مذہب، ہر ذات، اور ہر فرقے کے لوگ شامل تھے۔ ان کے زمانے میں اکثر شیعہ، سنی، مقلد اور غیر مقلد اور ہندو مسلمانوں میں مذہبی تصادم ہوا کرتا تھا۔ وہ ہر طبقے کے لوگوں سے یک جہتی یگانگت، اخوت و بھائی چارگی کے خواہش مند تھے۔ اور ان سے ہمیشہ اتحاد و اتفاق کی بات کرتے رہتے تھے۔ انجمن پنجاب کے ایڈریس میں کہا تھا:

"میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلالحاظ قوم و ملت کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بے شک علیحدہ علیحدہ ہے مگر اس کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔ فرض کرو کہ دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے موجود ہیں ان میں کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو مگر اس اختلافِ طبع کی وجہ سے کوئی اس دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو باہم کچھ رنج نہیں ہوتا اسی طرح اس دنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے مختلف مذہب والوں میں کوئی وجہ باہمی رنج کی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص اپنے ایمان کا مختار بلکہ میری رائے میں اس پر مجبور ہے اس لیے جس چیز کا یقین اس کے جی میں ہے، اس کو وہ اختیار کرے گا۔ وہ یقین دوسروں کے دل میں اثر نہیں کرتا، اچھا ہے تو اس کے لیے اور برا ہے تو اس کے لیے۔ لیکن آپس کی محبت میں جو انسانوں کی راحت میں سب سے بڑا جزو ہے اس سے کچھ نقصان نہیں آ سکتا۔"

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سرسید ہندوستان کے رہنے والے سب ہی لوگوں کو ایک گھر کے بھائیوں کی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے کبھی ایسی بات نہیں کی جس سے ذرہ برابر بھی تعصب کی بو آتی ہو یا اپنے ہم وطنوں کی دلآزاری ہوتی ہو۔ انھوں نے ملک و قوم کی خیرخواہی اور بھلائی اسی میں جانی کہ سب مل جل کر رہیں انھوں نے قوم کی ترقی کا راز ایک مشترکہ کلچر کی پاسبانی میں رکھا۔ کہتے ہیں:

"میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں اس کہنے کو بھی پسند نہیں کرتا کیونکہ لوگ علی العموم یہ فرق قرار دیں گے کہ ایک کو دائیں آنکھ اور دوسرے کو بائیں آنکھ کہیں گے مگر میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بطور ایک آنکھ کے سمجھتا ہوں اے کاش! میرے صرف ایک آنکھ ہوتی کہ اس حالت میں عمدگی کے ساتھ اُن کو اس ایک آنکھ کے ساتھ تشبیہ دے سکتا"

انھوں نے اپنے وطن سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار اس طرح کیا ہے جس طرح کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے کرتا ہے وطن ان کی نظر میں محبوبۂ دل نواز کی طرح حسین ہے۔ وہ فرقہ بندی، گروہ بندی اور علاقائی عصبیت کو پسند نہیں کرتے تھے اعلیٰ و ادنیٰ، حاکم و غلام اور نسل و ذات کے امتیاز کے قائل نہ تھے انجمن پنجاب لاہور کے جلسے میں قومیت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ نہایت وسیع جامع اور بلند تر ہے کہتے ہیں کہ:

"میں نے اس وقت انجمن میں اپنی زبان سے کئی دفعہ "قوم" کا لفظ بیان کیا اس سے میرا مطلب صاف مسلمانوں ہی سے نہیں ہے۔ میری یہ رائے ہے کہ تمام انسان بالکل شخص واحد ہیں اور میں قوم کی خصوصیت کے واسطے مذہب اور فرقہ اور گروہ نہیں پسند کرتا میری رائے اگر سچی ہو تو کالے سے کالے رنگ کے انسان کو اور گورے سے گورے رنگ کے انسان کو وہ جو اعلیٰ درجے کی تہذیب میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اور وہ جو اس نیچر کے جوش میں ہیں اور جنگلوں میں اپنے دن کاٹ رہے ہیں سب کو اپنا بھائی اور ایک قوم تصور کرتا ہوں"

مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے کا مقصد ان کے نزدیک یہی تھا کہ:

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

"ہندو مسلمان ایک بینچ پر بیٹھ کر تعلیم پائیں ایک ہی بورڈنگ ہاؤس میں رہیں سہیں ایک ہی ذریعہ سے علم حاصل کریں تو دونوں ایک دوسرے کی محبت اور ہمدردی کا سبق سیکھیں"۔

یہ ادارہ قومی ایکتا، آپسی اتحاد و اتفاق کے لیے ممد و معاون ثابت ہوا اسی طرح سائنٹفک سوسائٹی نے قومی ایکتا کے لیے اہم رول ادا کیا جس میں ہندو مسلم دونوں برابر شریک رہتے تھے۔

قومی یکجہتی کی جڑوں کو ہمارے دلوں تک پہنچانے کے لیے انھوں نے انتھک کوششیں کیں انھوں نے قوم کو زندہ رہنا سکھایا۔ اخوت محبت اور بھائی چارگی کا جذبہ تعلیم کی اہمیت کا احساس، ملکی ترقی کی خواہش، حب الوطنی کا شعور، قومیت کا نیا تصور، آزادی کی اہمیت، باہمی اتحاد کا جوش، ہندوستانیوں میں سرسید کی تحریک نے پیدا کیا۔

ملک و ملت کو دیا تھا جس نے جینے کا سبق
ہاں وہ سرسید وہ عالی وصف و بہتر رہنما

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
(علامہ اقبال)

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

سرسیّد کا تہذیبی شعور

تہذیب کے سلسلے سے سرسید احمد خاں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے بڑے حصے سے، سوائے اس کے اور کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ سرسید کا تصوّرِ تہذیب نہایت سطحی، ظاہر پرستانہ اور اقداری بنیادوں سے عاری تھا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی ہمہ گیر، علمی اور سماجی خدمات کے پیچھے سب سے زیادہ طاقتور محرک، ان کا تہذیبی شعور ہی تھا۔ چنانچہ سرسیّد کے تصوّرِ تہذیب کی نفی کرنے کا ایک مطلب ان کی تمام خدمات سے صرفِ نظر کر لینا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے اُس سیاق و سباق کو سمجھنے کی کوشش کی جائے جس کے بغیر نہ تو تصوّرِ تہذیب کے ارتقا کی پوری تصویر سامنے آسکتی ہے اور نہ سرسیّد کے تہذیبی شعور کی قدر و قیمت کا صحیح تعیین کیا جا سکتا ہے۔

آیئے، تہذیب، تمدّن اور ثقافت کے جھگڑے میں پڑے بغیر تہذیب کو نسبتاً وسیع مفہوم رکھنے والی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جائے اور سرِدست اجتماعی اطوار، رسم و رواج، مدنیت اور کسی معاشرے کے نظامِ اقدار، جیسے جزئیات کو تہذیب کے مفہوم میں شامل سمجھا جائے۔ اس طرح تہذیب نہ تو محض گفتگو اور برتاؤ کی موزونیت یا رسم و رواج کا نام رہ جاتا ہے اور نہ تہذیب کے

لفظ کا اطلاق صرف ان مادّی اشیاء پر باقی رہتا ہے جو انسان کے بلند مذاق اور فنکارانہ رویّے کے طفیل وجود میں آتی ہیں۔ تہذیبوں کا مطالعہ کرنے والے علماء میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو زندگی کے اس نصب العین کو تہذیب کا نام دیتے ہیں جس کو کسی قوم کے افراد اپنی اور اپنے جیسے دوسرے لوگوں کی زندگی کا معیار اور پیمانہ تصوّر کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تہذیب کا نسبتاً وسیع مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "اقدار کے اس شعور کو تہذیب کہتے ہیں جو کسی انسانی جماعت میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے اور اسی شعور کے مطابق وہ اپنی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے[۱]"۔ یہ بات تہذیب کے تصوّر کو ہر چند کہ اقدار کے تصوّر سے وابستہ کر دیتی ہے مگر اس سے تہذیب کا وہ معروضی تصوّر ہمارے سامنے آجاتا ہے جس کی بنیاد پر ہم تہذیب کے موضوعی پہلو کو بھی بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ یعنی افراد کے اخلاق و آداب اور کردار کے وہ عناصر بھی تہذیب کے دائرہ کار میں آجاتے ہیں جن میں اقدار کی رُوح موجود ہوتی ہے۔ اور اسی تصوّر کی مدد سے ہم بعض ایسی اشیاء مثلاً آرٹ، تعمیر اور ثقافت کے مادّی مظاہر کو انسانی اقدار کا مادّی اظہار قرار دے سکتے ہیں، جن کے وسیلے سے انسان ایک طرف تو اقدار کا ایک مادّی نظام مرتب کرتا ہے اور دوسری طرف اپنے مادّی اظہارات میں کسی مخصوص تمدنی عہد کی اجتماعی اقدار کی جھلک بھی دکھلاتا ہے تہذیب کے بارے میں ان نکات سے جو مباحث اٹھ سکتے ہیں ان کا احاطہ سیّد عابد حسین نے تہذیب کی تعریف متعیّن کرتے ہوئے اس طرح کیا ہے:

"تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے جسے وہ اپنے اجتماعی ادارت میں معروضی شکل دیتی ہے اور جسے افراد اپنے جذبات و رجحانات، اپنے سبھاؤ اور برتاؤ میں اور اُن اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو مادّی اشیاء پر ڈالتے ہیں"۔[۲]

سرسیّد کے تہذیبی شعور پر بات کرنے کے لیے ہم کیوں نہ اقدار کے ہم آہنگ شعور کو ہی اپنا نقطۂ ارتکاز بنائیں، کہ اس شعور میں مذہب بھی شامل ہو جاتا ہے اور مذہب کے وسیلے سے روحانیت اور مادّیت کا مسئلہ بھی۔ اور اقدار کے

فقدان کو ہی سرسید پر لکھی جانے والی تنقید میں بنیادی حوالے کے طور پر استعمال بھی کیا گیا ہے۔ سرسید کے ناقدین کا کہنا ہے کہ سرسید کے تصورِ تہذیب میں اقدار کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے یہ دیکھے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ آیا سرسید کی نگاہ صرف مغربی تہذیب کے ظواہر پر تھی اور وہ ان ظواہر ہی کی تلقین میں مصروف رہے، یا سرسید کے پیشِ نظر مذہب اور اقدار کا بھی کوئی تصور موجود تھا؟ ابھی سال دو سال پہلے ڈاکٹر ظفر حسن نے اپنے تحقیقی مقالہ "سرسید اور حالی کا تصورِ فطرت" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید کی تہذیبی اور اصلاحی کاوشوں کا سارا نقص ان کے تصورِ فطرت میں مضمر تھا، اور وہ بھی بالخصوص اس سبب سے کہ وہ مغرب کے اس تصورِ فطرت کے گرویدہ تھے جو گزشتہ تین چار صدیوں میں انسانی زندگی اور کائنات کی تشریح و تعبیر کا سب سے بڑا وسیلہ سمجھ لیا گیا تھا۔

"سرسید پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مغربی افکار کو مسلمانوں سے قبول کروانے کی خاطر مہم چلائی اور منظم تحریک کی بنیاد ڈالی . . . سرسید کی تمام خیال آرائیوں کی بنیاد دو لفظوں پر تھی، ایک 'فطرت' اور دوسرے 'عقل'، فطرت کو انھوں نے خصوصیت کے ساتھ ہر چیز کا معیار بنایا تھا — اتنی بات یہیں عرض کرتے چلیں کہ انسانی تاریخ کی تمام دینی روایتوں اور تہذیبوں میں فطرت کے معنی ایک ہی رہے ہیں اور یہ وہ معنی ہیں جو سرسید کی نیچر سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ صرف یورپ ہی ایک جگہ ہے جہاں فطرت کے ایک دوسرے معنی پہنائے گئے ہیں، اور یورپ میں بھی اس سلسلے کا آغاز بہت دیر میں، یعنی سولہویں صدی میں ہوا اور یہ رجحان اپنے عروج کو انیسویں صدی میں پہنچا۔"[۳۵]

شاید اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ فاضل معترض نے سرسید کے تصورِ فطرت اور تصورِ تہذیب کے ڈانڈے خصوصیت کے ساتھ ہابس (Hobbes) اور جان لاک (John Locke) کے تصورِ معاشرت سے ملائے ہیں۔ سرسید نے ہابس، لاک اور ان جیسے سولہویں اور سترھویں صدی کے مفکرین

اور سائنس دانوں کے تصورات سے براہ راست کس حد تک واقفیت حاصل کی تھی، یہ تو ایک الگ بحث ہے لیکن یہ بات غلط نہیں کہ مغرب میں معاشرت اور تہذیب کا جو تصور رائج اور مقبول رہا اس میں تصورِ فطرت اور اس کے مترادف کے طور پر تصورِ عقل کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ سر سید کے حوالے سے اس نوع کے خیالات سب سے پہلے سر سید کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد یعنی اس صدی کے اوائل میں لکھی گئی وائٹ برکھیٹ (Weit Brecht) کی کتاب "ہندوستانی اسلام اور جدید تصورات"[۱۰] (۱۹۰۵ء) میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں اور ان خیالات کی گونج نہ صرف اس اقتباس میں بلکہ سید طفیل احمد منگلوری اور محمود برکاتی کے خیالات میں بھی موجود ہے۔ محمد حسن عسکری، سلیم احمد انتظار حسین اور اس سلسلے کی آخری کڑی سید ظفر حسن کے یہاں سر سید کی تنقید کے اس پہلو کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے نظر انداز کرکے گزر جانے یا اس کا الزامی جواب دینے کے بجائے، اس مفروضے کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کیا سولہویں اور سترہویں صدی کا وہ یورپی تصورِ فطرت جس نے بعد کے افکار پر بہت گہرا اثر ڈالا، اتنا ہی سادہ اور خطِ مستقیم پر مبنی تھا جس کا اظہار مندرجہ اقتباس میں ملتا ہے؟ اور کیا سر سید نے مغربی تہذیب کی فطری اور عقلی تعبیرات کو من و عن قبول کر لیا تھا؟

اس سلسلے میں یوں تو ڈیکارٹ، ہابس، جان لاک، نیوٹن اور جوزف پرسٹلی کے افکار و خیالات سے رجوع کرنا ضروری ہے لیکن یہاں تفصیل سے گریز کی خاطر دوسرے مفکرین کے مقابلے میں اگر ہابس اور جان لاک کے تصوراتِ معاشرت پر ایک نگاہ ڈال لی جائے تو سولہویں اور سترہویں صدی کے تصورِ عقل اور تصورِ تہذیب و معاشرت کا بنیادی پہلو ضرور سامنے آجائے گا چونکہ ہابس اور لاک کے تصورات ہی مغرب میں فطرت پرستی کی بنیاد سمجھے جاتے رہے۔ اس لیے مغرب کی تہذیبی تاریخ میں ان دونوں کی اہمیت ہنوز مسلم ہے۔ اتفاق سے سر سید کے معاملے میں ان دونوں کے نظریاتِ فطرت کو خلط ملط کرنے کے باعث سر سید کے فکری اور سماجی تناظر کی بحث میں تعبیر کی غلطیاں طویل عرصے تک پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی رہی ہیں۔

۱۰۔ فکر و آگہی، علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ڈیکارٹ، ہابس، لاک اور نیوٹن کو سولہویں اور سترہویں صدی کے اُن روشن خیال مفکرین اور ان کے خیالات کو 'عالمانہ خیالات' کا نام دیا جاتا ہے جن کے وسیلے سے یورپ میں زندگی اور کائنات کے مسائل کی سماجی، عقلی اور سائنسی توجیہات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ ان مفکرین میں ہابس اور لاک کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہابس کے سماجی اور مدنی نظریہ کے مطابق انسانی فطرت خود غرض واقع ہوئی ہے۔ فطری حالت میں انسان ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتا ہے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ معاشرے کو اس کی فطری کیفیت کے لحاظ سے از سرِ نو تشکیل دیا جائے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فطری صورتِ حال اور انسان کی خود غرض جبلت کا مفروضہ قائم کرنے کے باوجود ہابس، انسان کی پسند اور خواہش کو 'خیر' اور ناپسندیدگی کو 'شر' سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کسی نوع کی روحانی یا ماورائی طاقت کو نہیں مانتا اور دنیا کے پورے نظام کو کائنات میں ناگزیر طور پر پائے جانے والے علت و معلول کی خود مکتفی منطق کا تابع گردانتا ہے ـــــ ہابس نے اپنے اس نظریہ میں اس بات پر زور دیا کہ معاشرے میں شامل انسانوں کی فطری بے اعتدالی کو کوئی حکمراں ہی قابو میں کر سکتا ہے۔ اس طرح ہابس نے جہاں فطرت میں علت و معلول کے رشتے کو باضابطہ قبول کر کے مادیت پرستی کا ثبوت دیا وہیں اس نے اپنے عہد کے مطلق العنان بادشاہوں کی مطلق العنانی کو بھی جائز ثابت کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہابس کے نظریۂ فطرت کو جسمانی قوت، غلامی اور استبداد کا نظریہ کہا جاتا ہے۔

جان لاک قوانینِ فطرت کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن ہابس کے برخلاف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ قوانین فطرت انسان کی مسرت کے لیے ضرور ہیں مگر انسان فطری صورتِ حال میں خوش نہیں ہے۔ اس لیے غیر مسرت بخش صورتِ حال سے نجات حاصل کرنے اور فطرت کی افراط و تفریط سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے انسان کو گورنمنٹ کی تخلیق کرنی چاہیئے اور اپنے فطری اختیارات کو نسبتاً بڑے سماجی مقاصد یا اجتماعی بہبود پر قربان کر دینا چاہیئے۔ لاک، ہابس کے

رخلاف حکمرانی کرنے والے کے اختیارات کی نفی کرتا ہے۔ لاک کے خیال میں
طرت صرف انسان کے وحشیانہ جذبات کا نام نہیں، یہ دراصل عقل کا قانون ہے
وہیں عقل کی اہمیت سکھاتا ہے چونکہ سماج کے سارے انسان یکساں ہیں اس
یے ہمیں چاہیئے کہ ہم ایک دوسرے کی جان، مال اور آزادی میں دخل انداز نہ ہوں
ور دوسروں کو تکلیف نہ پہنچائیں۔[۵] ہابس اور جان لاک کے ان نظریات میں
تجربیت، مادیت، فطرت پرستی اور تعقل کی بالادستی اپنی جگہ، لیکن جان لاک
س اعتبار سے ہابس سے خاصا مختلف ہوجاتا ہے کہ اس کے یہاں فطرت
کے ساتھ عقل اور عقل کے ساتھ وجدان کا اقرار بھی ملتا ہے اور اس کے نظریات
یں عقیدے کی گنجائش بھی ہے۔

فطرت پرستی کے بنیادی افکار سے متعلق اس اجمالی جائزے سے اندازہ
لگایا جاسکتا ہے کہ فطرت پرستی اور تعقل پسندی کے جو تصورات سولہویں صدی
سے لے کر انیسویں صدی تک، یورپ کے فلسفیانہ افق پر چھائے رہے وہ اس
حد تک مادی نہیں تھے جس حد تک سرسید کے بعض ناقدین نے سمجھ رکھا ہے
مزید برآں یہ کہ لاک کے نقطۂ نظر سے تو سرسید کی مماثلت ڈھونڈھی جاسکتی
ہے، ہابس یا اس قبیل کے دوسرے مفکرین کے افکار سے نہیں۔ اور جہاں تک
لاک کا سوال ہے تو اس کے نظریۂ فطرت میں وجدان اور عقیدے کی جو گنجائش
ہے اس نے اپنے آپ فطرت پرستی کے خالص مادی نقطۂ نظر میں ایک طرح
کا شگاف ڈالنے کا آغاز کردیا تھا۔ لاک کے حوالے سے جس تعقل پسندی کا ذکر
کیا گیا اس کو صرف فطرت پرستی یا عقلیت کی مغربی روایت کا نام دے کر
کم سے کم لاک کے نظریۂ معاشرت سے انصاف نہیں کیا جاسکتا۔

تصورِ فطرت ہی کی طرح ڈی ازم کے جس فلسفے کو سرسید کے بعض معترضین
نے سرسید کے تصورِ تہذیب کی بنیاد بتایا ہے، اس کی حقیقت بھی دیکھ لینی چاہیئے
سرسید کے تہذیبی شعور کے ایک اہم ناقد سلیم احمد لکھتے ہیں:

"دراصل یہ وہی مذہبی فیشن ہے جسے ڈی ازم کہا جاتا ہے۔ ڈی ازم کا عقیدہ
یہ ہے کہ خدا اور کائنات کا تعلق ایسا ہے جیسے گھڑی اور گھڑی ساز کا۔ گھڑی ساز

[۵] سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نے گھڑی بنا دی۔ اب گھڑی اپنے کل پرزوں کی مدد سے چل رہی ہے، گھڑی ساز کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ سر سید کے قانونِ فطرت کا تصور بھی یہی ہے۔ خدا نے کائنات کو بنا دیا اور بے تعلق ہو گیا۔ اب کائنات اپنے قانون کے مطابق خدا کی مداخلت کے بغیر اپنے راستے پر رواں دواں ہے۔ یہ تصور ایک زمانے میں لوگوں کو بہت اچھا لگا مگر اس میں خرابی یہ تھی کہ بہت جلد لوگوں کو ایسے بے تعلق خدا کی موجودگی غیر ضروری معلوم ہونے لگی۔ انھوں نے خدا کا انکار کر دیا اور خدا کی جگہ فطرت کو خدا بنا لیا۔"[۲۵]

سلیم احمد کی اس رائے کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈی ازم کے فلسفے کو انھوں نے بعض مفکرین کے انفرادی تصورات پر مبنی قرار دے دیا ہے۔ یہ بات، جو ڈی ازم کے نام سے بیان کی گئی ہے دراصل نیوٹن کی ایک تمثیل کی توسیع تھی۔ نیوٹن نے دنیا کو ایک عظیم مشین اور اپنی میکانکی منطق کے اعتبار سے خدا کو ایک میکینک کا نام دیا تھا۔ اس بات کو جوزف پریسٹلی (Joseph Priestly) نے دنیا کو ایک گھڑی اور خدا کو گھڑی ساز، کی مثال قرار دے کر سمجھانے کی کوشش کی، اور یہ کہا کہ گھڑی اپنی کارکردگی کی حالت میں گھڑی ساز سے بے نیاز ہوتی ہے[۲۶] ان دو انفرادی رایوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ خیالات نیوٹن اور پریسٹلی کے ہیں، ڈی ازم کے فلسفے کا اصل الاصول نہیں۔ دوسری بات یہ کہ رڈ ہربرٹ نے اسی زمانے میں ڈی ازم کے مذہبی اصولوں کو پانچ نکات پر مبنی قرار دیا تھا۔ ان نکات میں اس نے خدا کی عظمت، خدا کی پرستش اور موت کے بعد سزا اور جزا کے تصور کو غیر معمولی اہمیت دی[۲۷] ــــ غلط تعبیرات کے مندرجہ بالا نمونوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سر سید کے تہذیبی تصورات پر تبصرہ کرنے والوں میں سے بعض کے یہاں افکار کی تشکیلِ نو اور پیش کش میں کیا تسامحات ہوتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سر سید تعقل کے قائل تھے، وران کا تصورِ فطرت بھی فطرت اور عقلیت کی مغربی روایت سے متاثر تھا، اور یہ بات بھی غلط نہیں کہ انھوں نے مذہب اور تہذیب کی تشریح و تعبیر کے لیے فطرت اور عقل کے مغربی تصورات کا استعمال کیا ہے، اور یہ بھی درست ہے کہ مذہبی عقائد اور احکامات کے معاملے میں اپنے اس نقطۂ نظر کے سبب سر سید نے بعض ایسے

[۲۵] ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نتائج نکالے ہیں جن سے اتفاق کرنا عقیدے کے معاملے میں سمجھوتہ کرنے کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک سرسید کے تہذیبی شعور کا سوال ہے تو اسے صرف تصورِ فطرت کا زائیدہ قرار دینا درست نہیں۔ تصورِ فطرت کی مغربی روایت میں سرسید نہ تو ڈیکارٹ کو قبول کرتے ہیں نہ ہابس کو اور نہ نیوٹن اور اس کے بعد کے دوسرے مادیت پرست سائنس دانوں کو۔ سرسید اگر کسی ایک فطرت پرست کو اپنے تصورِ تہذیب و معاشر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کسی حد تک مثالی نمونہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو وہ جان لاک ہے، جو اپنے عہد کے مفکروں اور سائنس دانوں سے الگ اور مختلف بھی ہے اور مادے کو ماورائیت سے ہم آہنگ کرنے کا تاثر دینے کے باعث سرسید کے مذہب پسند ذہن کے لیے ایک سہارے کا کام بھی دے سکتا ہے۔ جان لاک کے نظریات، فلسفۂ عقلیت کے تین اہم اجزاء' ۱۔ تجربیت کے علمی پہلو۔ ۲۔ افادیت کے اخلاقی تصور' اور ۳۔ انفرادی آزادی کے سیاسی تصور'، سے کہیں آگے جاتے ہیں اور عقیدے اور وجدان کی گنجائش بھی پیدا کرتے ہیں۔

سرسید نے تہذیب کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے 'شائستگی کیا چیز ہے'، کے عنوان سے 'سائنٹفک سوسائٹی' میں تہذیب، شہریت، قانونِ معاہدہ اور آزادی کی نگہداشت جیسے مسائل پر کچھ اس انداز میں لکھا ہے گویا وہ ساری باتیں جان لاک کے خیالات کی بازگشت ہوں۔ سرسید نے بھی لاک ہی کی طرح عقلیت کے فلسفے کے کارآمد اجزا کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ لاک سے بہت آگے بڑھ کر روحانیت، مذہب اور داخلی روشنی یا ضمیر کی اہمیت کو ہر جگہ نمایاں کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب وہ لکھتے ہیں کہ کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے"، تو بجا طور پر عقائد کی درستی، مذہبی حقائق تک رسائی حاصل کرنے کی سنجیدہ کوشش اور مذہبی تعلیمات سے الگ خطوط پر راہ پانے والی رسوم کی اصلاح کی ضرورت پر اصرار کرتے ہیں۔ سرسید درستیٔ عقائد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں مسلمانوں کے عقائد مذہبی جو ان کی کتابوں میں لکھے ہیں

وہ اور ہیں اور جو ان کے دلوں میں ہیں اور جن کا ان کو یقین بیٹھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقائدِ شرکیہ ان کے دلوں میں ہیں۔ پس ان کی تہذیب کرنا اور اپنے عقائد کو سنّتِ اسلام کے مطابق کرنا اور اسی پر یقین رکھنا، تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔"۹

آگے اپنے اسی مضمون میں "تدقیق بعض مسائل مذہبی" کے ذیلی عنوانات کے تحت وہ رقم طراز ہیں:

"جہاں مذہب کے بعض صحیح اور اصلی مسائل ایسے ہیں جن کی پوری تحقیق و تدقیق اب تک نہیں ہوئی اور اگرچہ وہ مسائل فی نفسہ صحیح و درست ہیں، الابیان واضح اور تحقیق کامل نہ ہونے کے سبب، علوم عقلیہ کے برخلاف اور تہذیب و شائستگی کے مخالف معلوم ہوتے ہیں پس ہم کو ان کی تشریح و تفسیر میں تہذیب کرنی چاہیئے۔"

ان دونوں اقتباسات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سرسیّد کے نزدیک مذہب کی غلط تفہیم یا مذہبی معاملات میں بدعات کے عمل دخل سے اجتناب کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ تہذیب کے نام سے وہ صرف توہمات کے ترک کرنے اور غیر مذہبی تصوّرات کی اصلاح کی بات نہیں کرتے بلکہ مذہب کی بنیادی باتوں، نصِ قطعی اور احادیثِ رسول کی تحقیق و تدقیق کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں۔ اگر سرسیّد کے نزدیک تہذیب کا دارومدار مغربی تہذیب کے ظواہر پر ہوتا تو نہ انھیں مذہب کی اہمیت پر زور دینے اور مذہب کی صحیح شکل و صورت کو باقی رکھنے پر اصرار کرنے کی ضرورت تھی اور نہ مذہب کے وسیلے سے انسانی زندگی میں راہ پا جانے والی اقدار پر۔ سرسیّد کے تصوّرِ تہذیب میں مذہبِ اسلام کی مرکزی حیثیت اس لیے بھی باقی رہتی ہے کہ وہ اسلام کو ایک ایسے معقول، قابلِ فہم اور کردار ساز مذہب کے طور پر دیکھتے اور پیش کرتے ہیں جس سے وابستہ رہ کر مسلمانوں کے اندر تہذیبی اور معاشرتی خرابیاں مشکل سے پیدا ہوسکتی ہیں۔ سرسیّد لکھتے ہیں:

"اسلام نے جن چیزوں کو اچھا یا بُرا بتایا ہے وہ وہی ہیں جو فطرت کی

رُو سے اچھی یا بُری ہیں۔ پس وہ بُری چیزوں سے بچنے کی، ان کو یقینی بُرا مان کر اور اچھی چیزوں کے حاصل کرنے کی ان کو یقینی اچھا جان کر کوشش کرتے ہیں، اور بحیثیت مسلمان اور سچے تابعدار بھی شریعت کے ہوتے ہیں بد گناہ بھی کرتے ہیں اور گنہگار بھی ہوتے ہیں، مگر دغا باز اور مکّار اور ریاکار نہیں ہوتے۔" [۱۰]

سرسید کے افکار میں فطرت کی جو معنویت ہے وہ اس اقتباس میں اسلام اور فطرت کے بارے میں مطابقت ثابت کرنے کی کوشش سے عیاں ہے۔ سرسید کا امتیاز یہ ہے کہ وہ نظریۂ فطرت کو اپنے خیالات اور معتقدات کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں، نظریۂ فطرت کی مادّی روایت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال دیتے۔ سرسید نے تہذیب سے متعلق اپنے متعدد مضامین میں مذہب کو اس کی اصلی حالت میں دیکھنے اور رائج کرنے کی بات کہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مذہب کی غلط شکلیں اور مذہبی مسائل کی غلط تفہیم بھی انسان کو تہذیبی اعتبار سے آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔

"غلط مذہب بلاشبہ تہذیب کا بڑا مانع ہے۔ اگر سچے مذہب میں غلط خیالات اور بے جا تعصبات اور مسائلِ اجتہادیہ اور عقائدِ قیاسیہ اس طرح پر مل جایا کریں کہ عملاً اور اعتقاداً اصلی احکام مذہبی میں اور ان میں کوئی تفرقہ اور تمیز باقی نہ رہے ___ بلاشبہ وہ بھی انسان کی ترقی اور تہذیب کا مثل مذہبِ غلط کے مانع قوی ہے۔ الّا سچا مذہب، جیسا کہ مذہب اسلام ہے وہ کبھی حارجِ ترقی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس مذہب کے احکام اور تہذیب و شائستگی کے کام دونوں متحد ہوتے ہیں۔" [۱۱]

مندرجہ بالا اقتباسات میں سے ایک میں مذہبی مسائل کی تحقیق اور علوم عقلیہ سے اس کی تطبیق پر زور دیا گیا ہے۔ یہ ناقدینِ سرسید کا وہی نکتہ ہے کہ سرسید، مذہب اور تہذیب دونوں کو علومِ عقلیہ اور تصورِ فطرت پہ پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس اقتباس کے آخری جملے میں بھی مذہب کے احکام اور تہذیب و شائستگی کے کام کو متحد بتایا گیا ہے۔ یہ بھی

[۱۰] سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

درحقیقت اسی منطق کی توسیع ہے کہ جب مذہبِ اسلام کی مطابقت فطرت کے اصولوں سے ثابت کی جا سکتی ہے تو تہذیب کے فطری اور معاشرتی اصولوں کو بھی ان سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ سرسید کے تہذیبی تصورات پر جو اعتراضات کیئے جاتے رہے ہیں ان کا مرکزی حوالہ سرسید کا یہی رویّہ ہے۔ یہ رویّہ سرسید کے نقطۂ نظر کا حصّہ بن کر نہ تو مذہب دشمن رہ جاتا ہے اور نہ اقدار بیزار۔ اس کے باوجود سرسید کے تہذیبی شعور کا جائزہ لینے والے دانشوروں میں سے بیش تر نے فکرِ سرسید کے محرکات، ان کے زمانے کی غیر معمولی صورتِ حال اور مسلمانوں کی اجتماعی ہزیمت اور بے یقینی کے احساس، جیسے تناظر کو یکسر نظر انداز کر کے سرسید کو عام سماجی اور سیاسی صورتِ حال میں اصلاحی کام کرنے والوں کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل کی زوال آمادہ مغل تہذیب اور نصف ثانی میں گزشتہ تین سو سال سے رفتہ رفتہ اپنی بالادستی کا لوہا منوانے والی مغربی تہذیب کی یلغار نے ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کی تشکیل نو کے علاوہ کوئی راہِ فرار ہی باقی نہیں رکھی تھی۔ اس پس منظر میں بھی سرسید نے محض اپنی اختراعی قوت اور اندھی تقلید سے کام نہیں لیا بلکہ انھوں نے جہاں مغربی تہذیب کے ان عناصر کی تلاش و جستجو کا آغاز کیا جن کی مدد سے وہ مسلمانوں کی مذہبی شناخت کو باقی رکھتے ہوئے ان کو تعلیمی اور تہذیبی طور پر عالمی معیاروں سے آشنا کرا دیں، وہیں سرسید نے اپنی ماضی کی تاریخ میں ایسے علماء اور دانشوروں کا لائحہ عمل بھی دیکھا جن کو اپنے اپنے زمانے کی اضطراری صورتِ حال میں توازن اور اعتدال کی راہ کا انتخاب کرنا تھا۔ اس نقطۂ نظر سے اسلامی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ان کے سامنے آئیں جن سے سرسید کے رویّہ کو توثیق ملی۔ اس سے پہلے کہ اسلامی تاریخ کے بعض دانشوروں کے طریق کار اور سرسید کی معاصر صورتِ حال کا ذکر کیا جائے، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ایک نگاہ کچھ اور ایسے اعتراضات پر ڈال لی جائے جن کی زد براہِ راست یا بالواسطہ سرسید کے تصورِ تہذیب اور نظامِ اقدار پر پڑتی ہے، اور یہ دیکھیے

کی بھی ضرورت ہے کہ ان اعتراضات میں انیسویں صدی کے تہذیبی دباؤ اور مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی حیثیت کو بھی کوئی اہمیت دی گئی ہے یا نہیں ــــــ محمد حسن عسکری، اپنے ایک مشہور مضمون 'پیروئ مغرب کا انجام' میں لکھتے ہیں:

"پیروئ مغرب کے صرف ایک معنی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم مغرب کا طرزِ احساس قبول کر لیں لیکن ہم نے تھوڑی دیر کے لیے رک کر یہ نہیں سوچا کہ ہمارا طرزِ احساس کیا تھا اور اس میں کوئی تبدیلی بھی آئی یا نہیں۔"[۱۲]

عسکری اس بیان کی وضاحت اپنے دوسرے مضمون میں مشرق اور مغرب کی تہذیبوں میں تفریق اور ان کے مابین خطِ امتیاز کھینچ کر کرتے ہیں:

"انسانی تاریخ کی عظیم ترین اور روایتی تہذیبیں تین ہیں۔ چینی، ہندو، اور اسلامی . . . یونانی، یہودی اور ازمنۂ وسطیٰ کی عیسوی تہذیبیں اپنی اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں، لیکن کسی نہ کسی اعتبار سے نامکمل ہیں۔ موجودہ مغرب کسی طرح روایتی تہذیب کے دائرے میں آتا ہی نہیں کیونکہ اس میں روایت کا وجود نہیں بلکہ یہ بات بھی مشکوک ہے کہ جس معاشرے میں تہذیبِ نفس کا کوئی مرکزی اصول نہ ہو اسے تہذیب کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔"[۱۳]

انسان کے طرزِ احساس کا جو تعلق تہذیب اور روایت سے ہوتا ہے یہ کسی کی نگاہ سے مخفی نہیں لیکن اگر مغرب میں کسی تہذیبی روایت کا وجود نہیں تو مغربی تہذیب کی مادیت اور انسان دوستی اور عقل پرستی کو عسکری صاحب اپنی متعدد تحریروں میں تہذیب نہیں تو اور کیا مان کر تنقید کا نشانہ بناتے رہے ہیں؟ اور خود عسکری کے فکری سلسلۂ نسب میں شامل دانشور خصوصاً سلیم احمد اور ڈاکٹر ظفر حسن، فطرت پرستی اور عقلیت کی کس مغربی روایت اور تہذیبی مادیت کو سرسید کے تہذیبی شعور کی تنقیص کے حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں؟ سلیم احمد کا ذکر آ گیا ہے تو اس ضمن میں سلیم احمد کے اندازِ تنقید کا ایک نمونہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

"سرسید اور حالی، افراد کے نام نہیں ہیں بلکہ رجحانات کے نام ہیں۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مغربی تہذیب سے مڈبھیڑ کی اولین کشمکش میں ان لوگوں نے جن خیالات اور رویّوں کا اظہار کیا وہ معاشرہ میں لاشعوری طور پر جڑ پکڑ چکے تھے، اور ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو چکی تھی جو مغربی خیالات کو قبول کرنے کے لیے نہ صرف تیار بلکہ بے چین تھے۔ چنانچہ سرسید اور حالی نے جب ان خیالات کا اظہار کیا تو نہ صرف بڑی واہ واہ ہوئی بلکہ انھیں عہدِ جدید کے اماموں میں تسلیم کر لیا گیا۔"[۱۲]

محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے اعتراضات میں جس مشرقی روایت و تہذیب کو مرکزی روایت کے نام سے بار بار یاد کیا گیا ہے اس کا ذکر ایک سے زیادہ بار آچکا ہے، اس لیے اس کی مزید تکرار کی ضرورت نہیں، البتہ اس بات کی طرف توجہ ضرور دلائی جا سکتی ہے کہ محمد حسن عسکری، سلیم احمد اور ان کے ہم خیال پاکستانی مستشرقین (مستشرقین کی اصطلاح کو نامناسب موقع پر استعمال کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس لفظ سے مراد ان مشرق پسندوں سے ہے جو مغرب کی راہ سے ہوتے ہوئے مشرق کی طرف آئے ہیں) کے مضامین میں اسلامی تاریخ، مذہبی روایت اور مسلمان دانشوروں کا ذکر تو کثرت سے ملتا ہے لیکن معتزلہ، ابن رشد، امام غزالیؒ اور یہاں تک کہ شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی جیسے تاریخ ساز مفکروں کا ذکر نہیں ملتا جنھوں نے صحیح معنوں میں اپنی دانش کا استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر متذکرہ علمائے متکلمین اور مذہبی دانشوروں پر ان حضرات نے تفصیل سے کچھ لکھا ہوتا تو اس سلسلہ میں ان کے موقف کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ معتزلہ نے زیادہ شدت اور انتہائی کے ساتھ اور ابن رشد اور امام غزالی نے قدرے توازن اور اعتدال کو برقرار رکھتے ہوئے اسلام کی معاصر عقلی تعبیرات کی وہی روایت قائم کی ہے جس کو بعد میں شاہ ولی اللہؒ اور سرسید احمد خاں نے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اس بات کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر میں عقائد و احکام کی عقلی تعبیرات کر کے سرسید احمد خاں نے ایک بڑے تسامح کا ارتکاب کیا۔ اس تسامح کا عملی جواب امتِ مسلمہ کی طرف سے ان کو یہ ملا کہ ان کی تفسیر کو اس حد تک ناقابلِ اعتنا گردانا گیا کہ وہ طاقِ نسیاں کی زینت بن کر رہ گئی۔ سرسید کے لیے شاہ ولی اللہؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ ایک بصیرت افروز

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کتاب ثابت ہوئی تھی۔ اس لیے کہ حجۃ اللہ البالغہ، میں شاہ صاحبؒ نے شعائرِ اسلامی کی فلسفیانہ اور عقلی توجیہہ اس لیے کی تھی کہ ان کے زمانے کے روشن خیال مسلمان اگر چاہیں تو اپنے مذہب کو عقل کی کسوٹی پر بھی پرکھ کر دیکھ سکیں۔ سر سید نے بھی اپنے نظامِ افکار کو اسی طرح مرتب کیا اور شاہ ولی اللہؒ ہی کی طرح اس بات کی کوشش کی کہ مذہب کی عقلی توجیہات کے وسیلے سے اپنے زمانے کے تعلیم یافتہ اور سماجی دباؤ کی کشمکش میں مبتلا مسلمان اپنے دل سے ان شکوک وشبہات کا ازالہ کر سکیں جو مذہب کی طرف سے احساسِ مغلوبیت کے نتیجے میں پیدا ہو گئے تھے۔

سر سید احمد خاں نے شاہ ولی اللہؒ کی اس روایت کی نہ صرف توسیع کی بلکہ ان کو مغربی فکر وفلسفہ کی تاریخ کے مطالعہ کا جو موقع ملا تھا۔ اس ضمن میں اس سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ سر سید کے متقدمین علماء کو یہ موقع ظاہر ہے کہ نہیں ملا تھا۔ چنانچہ سر سید نے قیامِ انگلستان کے زمانے میں حاصل کی گئی نئی معلومات اور اسلامی تاریخ کے بعض غیر رسمی فکری رجحانات کی آمیزش سے اپنے لیے ایک جامع نظامِ فکر مرتب کیا۔ اس نظامِ فکر میں اقدار کو زیریں لہروں کی طرح باقی رکھا اور برِ صغیر میں مسلمانوں کی اجتماعی عزتِ نفس کی بحالی کو اپنا بڑا مقصد قرار دیا۔ یہی سبب ہے کہ سر سید کے تصورِ تہذیب کی اوپری سطح پر روحانیت اور اخلاقی اقدار کا ذکر کم ملتا ہے، لیکن سماجی اور تہذیبی اصلاح کے ہر پہلو میں کہیں نہ کہیں اخلاقی اقدار کی موجودگی کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے ـــــ

سر سید، مسلمانوں کو وسیع معنوں میں ایک مہذب انسان بننے کا مشورہ بھی دیتے ہیں اور معاصر تہذیب کے فیوض وبرکات سے انھیں مستفید بھی کرانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرتے کہ دنیاوی فلاح کے کسی بھی تصور کے نام پر عقیدہ اور ایمان کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا۔ سر سید اپنے تہذیبی شعور کی مدد سے مشرق اور مغرب کی اعلیٰ روحانی اور مادی قدروں کو ہم آہنگ کرتے ہیں، اور ان دو عناصر کی شمولیت سے ایک نئے تصورِ تہذیب کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ یہ وہی تہذیبی تصور ہے جس کا عرفان بعد میں علامہ اقبال نے حاصل کیا اور مشرق کی روحانیت (یا جمال) اور مغرب کی مادیت (یا جلال) کو ہم آمیز کر کے

انسانِ کامل کا خواب دیکھا تھا۔ اگر سرسید کے بعد کے زمانے میں اقبال یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ ۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

تو پھر سرسید نے اگر اقبال سے پہلے تثلیث کے فرزندوں کی تہذیب کے عمدہ عناصر کو اپنے نظامِ اقدار کا حصہ بنانے کی کوشش کی تو اسے سرسید کے تہذیبی شعور کا اجتہادی پہلو کیوں نہ قرار دیا جائے۔

تہذیب کا لفظ اگر اپنے اصلاحی معنوں میں تصورِ اقدار اور اس کی موضوعی اور مادّی، تمام جہات کا اعادہ کرتا ہے تو سرسید کا تہذیبی شعور صحیح معنوں میں ایک ایسا ہمہ گیر تہذیبی شعور تھا جس میں روحانیت کے ساتھ مادّیت اور دنیا کے ساتھ دین کا توازن برقرار رکھنے کا رجحان نمایاں ہے۔ سرسید کے تہذیبی رویّہ کو ان کے پورے دائرۂ کار کے تناظر میں رکھ کر نہ دیکھنے کا نتیجہ اب تک سہل پسندانہ فیصلوں اور فتوؤں کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سرسید کے فکر و عمل کو انیسویں صدی کی سماجی اور سیاسی صورتِ حال، اسلامی اور مغربی فکر کی تاریخ اور تشکیک اور بے یقینی کی سرحد پر کھڑے ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی کیفیت، جیسے تمام مسائل کو پس منظر میں رکھ کر از سرِ نو مطالعہ کا موضوع بنایا جائے۔ یہ مضمون سرسید کے تہذیبی رویّہ کی وکالت نہیں اس لیے کہ سرسید کے تہذیبی شعور کا پورا سیاق و سباق متعین کرنے کی محض ابتدائی کوشش ہے، سرسید کے تہذیبی شعور اور سماجی بصیرت کی قدر و قیمت کے تعین کا کام ہنوز غیر مشروط اور صحیح زاویۂ نگاہ کی تلاش میں ہے۔

مآخذ

۱۔ Encyclopedia Britannica P 657 - 60 (1982) اور قومی تہذیب کا مسئلہ؛ سید عابد حسین۔ ص ۱۴۔ ۱۱۵ اور

۲۔ سرسید اور حالی کا تصورِ فطرت۔ ڈاکٹر سید ظفر حسن۔ ص ۱۱۶

۳۔ Indian Islam and Modern Thought Weit Breacht (1905),

۵۔ Backgrounds of American Literary Thought P 84,

R W Horton & H W Edward

۶۔ اسلامی تہذیب، جدید تہذیب اور ادب (رسالہ روایت ۱ لاہور) ص ۲۶۲-۲۶۳

۷-۸۔ Backgrounds of American Literary Thought P 84,
R W Horton & H W Edward

۹۔ منتخب مضامین سرسید (مرتبہ عتیق احمد صدیقی) ص ۴۷

۱۰۔ مقالات سرسید، حصہ سوم (مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی) حصہ دوم، ص ۲۲

۱۱۔ مقالات سرسید؛ مرتبہ عبیداللہ خویشگی، ص ۵۰

۱۲۔ پیروی مغربی کا انجام (ستارہ یا بادبان) محمد حسن عسکری، ص ۱۰۳

۱۳۔ مشرق کی بازیافت۔ مرتبہ ابوالکلام قاسمی، ص ۳۳

(بشکریہ: تہذیب الاخلاق، علیگڑھ ۱۹۹۸ء)

اقبال کے خیال میں سرسید احمد خاں عصر جدید کے پہلے مسلمان تھے جنھوں نے آنے والے دور کی جھلک دیکھی تھی اور یہ محسوس کیا تھا کہ ریاضی علوم اس دور کی خصوصیت ہے انھوں نے مسلمانوں کی پستی کا علاج جدید تعلیم کو قرار دیا۔ مگر سید احمد خاں کی حقیقی عظمت اس واقعہ پر مبنی ہے کہ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے اسلام کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے سرگرم ہو گئے ہم ان کے مذہبی خیالات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی حساس روح نے سب سے پہلے عصر جدید کے خلاف ردِ عمل کیا۔ (حرفِ اقبال ص ۱۴۸

بحوالہ اقبال اور جدید دنیائے اسلام مسائل افکار و تحریکات۔ از ڈاکٹر معین الدین عقیل)

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

رفعت سروش

سرسیّد: معلّمِ اَخلاق

پُرسکون ماحول اور آسودہ حال معاشرے میں شاذ ہی کوئی بڑا آدمی پیدا ہوتا
ہے۔ معاشی انتشار، اقتصادی بدحالی اور غیر محفوظ معاشرے کی کوکھ سے بغاوت
ور انقلاب کی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور انھیں کونپلوں پر جبر حالات کے باعث
ضطراب، بے چینی اور بغاوت کے پھول کھلتے ہیں۔ قوموں کے سوتے ہوتے
نمیر جاگتے ہیں اور ایسے جیالے پروان چڑھتے ہیں جو انقلاب کے پرچم بلند
رتے ہیں۔ ہندوستان میں انیسویں صدی انتشار، کرب اور بغاوت و انقلاب کی
مدی ہے۔ اس صدی نے جن مجاہدینِ آزادی، فکرانگیز دانشوروں، مصلحانِ قوم،
نش نوا قلم کاروں اور بغاوت کا پرچم بلند کرنے والوں کو جنم دیا اور پروان چڑھاکر
نھیں تاریخ عالم میں ایک نمایاں نام عطا کیا۔ ان میں سے ایک نمایاں ہستی
رسید احمد خاں تھے جن کی قومی، ملّی، علمی اور ادبی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔
رِ وقت کے ساتھ ان کی علمی خدمات کی اہمیت اور معنویت بڑھتی ہی جاتی ہے۔
بر الٰہ آبادی جیسے شاعر نے سرسیّد کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے ہیں

۔۔ی فکر و آگہی ۔لی علیگڑھ ۔مبر ٢٠٠٠ء

آج ہم بیسویں اور اکیسویں صدی کے دوراہے پر کھڑے ہوکر انیسویں صدی کے اس مدبر کی عظ[illegible]ت کا جائزہ لیتے ہیں تو اپنی عقل اور علم کو کوتاہ پاتے ہیں۔ ایک ماہر [illegible] وہ، ایک عالمِ دین وہ، جدید معاشرے کے حامی وہ، روشن خیال وہ، سائنسی شعور کو فروغ دینے والے وہ، قلم کار وہ اور سب سے بڑھ کر ایک باعمل انسان وہ کہ جو کچھ سوچتے تھے اس کو عملی جامہ پہناتے تھے۔ وہ گفتار کے نہیں کردار کے غازی تھے۔ بلاشبہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام ان کا اعلیٰ ترین کارنامہ ہے۔ ایک ایسا کارنامہ جس کی عظمت کے بہت سے گوشے وقت کے تقاضوں کے ساتھ آنے والی صدیوں میں اور نمایاں ہوں گے۔

سر سید (۱۸۱۷ء۔ ۱۸۹۸ء) ایک عظیم درسگاہ کے بانی تو ہیں ہی، برصغیر کی مقبول ترین زبان اردو کے فروغ کے سلسلے میں ان کا کام کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ زبان معاشرت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیئے انھوں نے اردو زبان کو جدید تقاضوں سے ہم کنار کیا۔ طوطا مینا کی کہانیوں کے گرداب سے نکال کر اردو نثر کو ایک توانا اور سادہ اسٹائل دیا۔ انھوں نے اپنے قلم سے اصلاح معاشرہ کا کام لیا اور چونکہ وہ عالم باعمل تھے اس لیے ان کی تحریر میں اثر ہے، سوزِ دروں ہے۔ سر سید نے اردو میں انشائیہ نگاری کو فروغ دیا جو انگریزی لفظ Essay کے ہم معنی ہے۔ دورِ جدید کے انشائیہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کا ایک مضمون "گزرا ہوا زمانہ" ایک انسان کی پوری زندگی کی تمثیل ہے۔ زندگی کی رات کے آخری لمحات میں ایک بوڑھا اپنی زندگی کے اوراق پلٹتا ہے: "برسات کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور و شور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت مغمگین ہے مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے اور نہ اکیلے پن پر۔ اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی اخیر رات پر۔"

"برس کی اخیر رات" کے الفاظ کے ساتھ آج ہم سوچنے لگتے ہیں کہ کیا یہ صدی کی آخری رات ہے اور یہ بوڑھا ـــ شاید ایک صدی ہے ـــ اور اس

بوڑھے کے پچھتاوے دراصل ہندوستانی معاشرے کی کج روی کے پچھتاوے ہیں۔ ان پچھتاؤں میں بے پرواہی سے گزرا ہوا بچپن ہے۔ ان پچھتاؤں میں اسے اپنی اخلاقی قدروں کا زیاں یاد آتا ہے۔

"ایسی حالت میں اس کو وہ باتیں یاد آتی ہیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ بھائی بہن، دوست، آشنا سے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا۔ بھائی بہن سے بے مروت رہنا، دوست اور آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا۔ وہ یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ ہائے وقت نکل گیا، اب کیونکر اس کا بدلہ ہو۔"

کس خوبصورتی اور سادگی سے سرسید نے اخلاقی درس دیا ہے۔ یہ انشا نگاری اس وقت اردو میں ایک نیا رنگ اور نیا ذائقہ لے کر آئی۔ اس تمثیلی انداز کے علاوہ ان کے مضامین میں براہِ راست بھی سماجی برائیوں اور معاشی خرابیوں پر اظہارِ خیال کیا، بھرپور وار ہے۔ کیونکہ وہ صحیح طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ان خرابیوں کو دور کیے بغیر ہم اس لعنت سے نجات حاصل نہیں کر سکتے جسے غلامی کہا جاتا ہے۔ وہ کسی سیاسی پارٹی کا پرچم بلند نہیں کرتے بلکہ اپنے اعمال اور اخلاقی درس کے ذریعہ قوم کے دل تک پہنچتے ہیں۔ ان کے مفروضات آج دورِ آزادی میں بھی صحیح اور بامعنی ہیں۔ اپنے مضمون "قومی اتفاق" میں رقم طراز ہیں:

"قوم کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں پر کسی قدر غور کرنی لازم ہے۔ زمانۂ دراز سے جس کی ابتدا تاریخی زمانہ سے بالاتر ہے۔ قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کا باشندہ ہونے سے تھا۔ محمد رسول اللہؐ نے اس تفرقۂ قومی کو جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا، مٹا دیا۔ اور ایک روحانی رشتۂ قومی قائم کیا۔ . . .

مجھے اس بات کے دیکھنے سے نہایت افسوس ہے کہ ہم آپس میں بھائی تو ہیں، مگر مثل برادرانِ یوسف کے ہیں۔ آپس میں دوستی اور محبت یک دل اور یک جہتی بہت کم ہے۔ حسد، بغض و عداوت کا ہر جگہ اثر پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ آپس کی نااتفاقی ہے . . . . ان نااتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت

ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے
.... اتفاق قائم رکھنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے، ایک اور عقلی اور نقلی راہ
ہے جس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ بن سکتی ہے۔" (سرسید کا آئینہ خانہ افکار ص۶۰)

اس نام نہاد مہذب دنیا میں غلامی اور آزادی دو متضاد الفاظ ہی نہیں، حقیقتیں ہیں۔ دراصل غلامی کی اقوام نے ان لوگوں پر تھوپی ہے جو کسی باعث کمزور ہیں۔ مگر یہ صورتِ حال قدرت کے تقاضے کے مطابق نہیں ہے۔ سرسید اس سے بہت رنجیدہ تھے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں کہا:

"آزادی اور غلامی آپس میں ایسی نقیض ہیں کہ نہ دونوں کا اجتماع ہو سکتا ہے اور نہ دونوں کا ارتفاع ــــ غلامی اس قادرِ مطلق کی مرضی اور قانونِ قدرت دونوں کے برخلاف ہے۔ تمام انسان آزاد اور یکساں پیدا ہوئے ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ زندگی اور آزادی اور خوشی حاصل کرنے میں یکساں اور غیر قابلِ انتقال استحقاق رکھتے ہیں۔" (تہذیب الاخلاق ص۱۸۱)

حیاتِ انسانی کی تاریخ شاہد ہے کہ انسان کی برائیوں میں تعصب ہر دور میں اسے نازیبا حرکتیں کرنے پر مجبور کرتا رہا ہے، فی زمانہ تعصب فسادات کی جڑ ہے۔ انسان کی اس ازلی برائی سے سرسید کس قدر بیزار تھے۔ اس کا اندازہ ان کی اس تحریر سے ہو سکتا ہے:

"انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بدخصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کر دیتی ہے۔ متعصب اپنی زبان سے نہ کہے مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلا دیتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل میں ہے، اس میں نہیں ہے۔ متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا۔ تعصب خود دینی ہو یا دنیوی باتوں میں نہایت برا، اور بہت سی خرابیوں کو پیدا کرنے والا ہے۔" (تہذیب الاخلاق ص۱۲۸)

سرسید کی انشا پردازی کا ایک اور دلچسپ نمونہ ان کا مضمون "بحث و تکرار" ہے۔ کیا زبان ہے اور کیا مشاہدہ۔ اور کس مناسب کی مثال سے اخلاقی درس

ــــ۔ بی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

دیا ہے۔

"جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گنگنیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چڑھ کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے داڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور نحیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں، اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں۔ اس کا کان اس کے منہ میں۔ اور اس کا ٹیٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اس کو کاٹا، اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا۔ جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔۔۔۔ نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی اسی طرح آپس میں تکرار ہوتی ہے۔"

سرسید نے کس خوبصورتی سے یہ باور کرا دیا کہ اختلاف رائے ہو مگر مہذب انداز میں۔ عام زندگی کی برائیوں میں ریاکاری بھی صدیوں سے انسانی معاشرے سے چمٹی ہوئی ہے۔ ریا کو سرسید نے اپنے ایک مضمون میں بے نقاب کیا ہے۔ اور نہایت سادہ اور سلیس زبان میں ریاکار کے گھناؤنے کردار سے پردہ اٹھایا ہے۔

"دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ دنیادار اور رند مشرب آدمی جس قدر کہ دراصل وہ بد ہیں اس سے زیادہ اپنے تئیں بد بناتے ہیں۔ دین داری کی بناوٹ کرنے والے جس قدر کہ ہوتے ہیں اس سے زیادہ وہ نیک اپنے آپ کو جتلاتے ہیں۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں قسم کے آدمی چنداں برے نہیں ہیں مگر ایک اور تیسری قسم کے لوگ ہیں جو ان دونوں قسموں سے علیحدہ ہیں۔ ان کی بناوٹ ایک اور ہی عجیب قسم کی ہے۔ وہ اپنی بناوٹ سے دنیا کے لوگوں کو ہی فریب نہیں دیتے بلکہ خود آپ بھی اکثر دھوکے میں پڑتے ہیں۔ یہ بناوٹ خود ان سے ان کے دل کے حال کو چھپاتی ہے جس قدر کہ درحقیقت وہ نیک ہیں اس سے زیادہ ان کو نیک

جتاتی ہے۔ پھر وہ لوگ یا اپنی بدیوں کا خیال ہی نہیں کرتے یا ان بدیوں کو نیکیاں سمجھتے ہیں۔ مقدس داودؑ نے نہایت دلچسپ لفظوں میں اس برائی سے پناہ مانگی ہے اور اس طرح پر خدا کی مناجات کی ہے۔ "کون اپنی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ تو ہی مجھ کو میرے پوشیدہ عیبوں سے پاک کر۔" (تہذیب الاخلاق ۱۲۸۹ھ)

سرسید نے عوام الناس کا اخلاقی معیار بلند کرنے کے لیے انشا نگاری کا جو طریقہ اختیار کیا تھا اس نے انھیں مصلح انسانیت کا درجہ تو دیا ہی، ایک صاحب طرز نثر نگار بھی بنا دیا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ "عزت" ایک نشہ بن گئی ہے اور ہم چشموں میں عزت حاصل کرنے کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ مگر اصل عزت کیا ہے۔ سرسید رقم طراز ہیں:

"جس کی لوگ بہت زیادہ آو بھگت کرتے ہیں اس کو لوگ معزز سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی معزز جانتا ہے، دولت، حکومت، ظاہری طمطراق خواہ مخواہ لوگوں کو معزز بنا دیتی ہے۔ اوصاف ظاہری بھی ایک ذریعہ مرکز ہونے اور معزز بننے کا ہے، جو دولت اور حکومت اور حشمت سے بھی زیادہ ان کو معزز بنا دیتا ہے مگر یہ اعزاز اس سے زیادہ کچھ مرتبہ نہیں رکھتا جیسے کہ ایک تانبے کی مورت پر سونے کا ملمع کر دیا گیا ہو، جب تک وہ مورت ٹھوس سونے کی نہ ہو اس وقت تک درحقیقت وہ کچھ قدر و قیمت کے لائق نہیں ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ جب تک اس کی اندرونی حالت بھی اس قابل نہ ہو وہ معزز نہیں ہو سکتا۔" (تہذیب الاخلاق ۱۳۱۳ھ)

آخر میں انسان کی ایک اور اخلاقی بیماری کا ذکر، سرسید کے الفاظ میں، اور وہ ہے "خوشامد"۔

"دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں بہت سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے، جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے وہ وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔" (تہذیب الاخلاق ۱۲۸۹ھ)

بہ ظاہر بہت سی باتیں ذاتی معلوم ہوتی ہیں اور یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ کسی شخص واحد کے افعال کی گرفت کیوں کریں اور اپنا ذہن اس کی زندگی کی طرف کیوں ملتفت کریں۔

مگر یہ تصور خام ہے، کیونکہ افراد سے ہی قومیں بنتی ہیں، اور ذاتی افعال ہی قومی زندگی کا آئینہ بن جاتے ہیں۔ سرسید احمد خاں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا تھا چنانچہ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں واضح الفاظ میں لکھا ہے:

"قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی محنت، شخصی عزت، شخصی ایمانداری، شخصی ہمدردی کا۔ اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی، شخصی بے عزتی، شخصی بے ایمانی شخصی خودغرضی کا، اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی و بدچلنی جو اخلاقی و تمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے۔ درحقیقت خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کردیں، تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہوں گی، جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کی ترقی نہ کی جائے۔" (تہذیب الاخلاق ۱۲۹۲ھ)

اخلاقی درس کے لیے ان سے بہتر اور ان سے واضح الفاظ نہیں مل سکتے سرسید نے معاشرے کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے کہ اگر قوم و وطن کو بہتر بنانا ہے تو اپنی ذات کی اصلاح کرو اور اپنے آپ میں وہ صفات پیدا کرو جو تم اپنے ملک کے معاشرے میں دیکھنا چاہتے ہو۔

سرسید صحیح معنوں میں صرف ہندوستانی قوم کے ہی نہیں۔ بلکہ عالم انسانیت کے معلّم اخلاق تھے اور ایک مختصر سے مضمون میں ان کی اس اعلیٰ صفت کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

سرسید احمد خاں کی انشاپردازی کے کچھ نمونے کانِ جواہر کے چند موتیوں کے مترادف ہیں۔ ان کی تحریریں ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں اور علوم و فنون کا وہ کونسا طبقہ ہے جس کو انھوں نے جلا نہ بخشی ہو۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ان کی تحریروں کی معنویت بڑھتی جارہی ہے۔ ●●

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

پروفیسر شان محمد

سر سیّد کی سیاسی بصیرت

سر سیّد انقلاب ۱۸۵۷ء کی پیداوار تھے۔ غدر کے پہلے سر سیّد 'جام جم' اور 'آثار الصنادید' کے سر سیّد تھے اور غدر کے بعد وہ 'اسباب بغاوت ہند' 'طعام اہل کتاب' 'تبیین الکلام' 'لائل محمڈنز آف انڈیا' 'تاریخ سرکشی ضلع بجنور' کے۔ ان کے یہ دونوں رُخ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ جو ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔

غدر نے مسلمانوں کو بُری طرح برباد کر دیا تھا اور ان کے پنپنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ایسے نازک دور میں جو سوالات سر سیّد کے ذہن میں ابھرے وہ یہ تھے کہ ان کی تباہی کو کیسے روکا جائے۔ حاکم اور محکوم کے تعلقات کو کس طرح بہتر بنایا جائے چونکہ انگریزوں نے مسلمانوں ہی کو غدر کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا اور ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔ اس لیے مسلمان بھی انگریزوں سے بہت نفرت کرتے تھے اور دونوں کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ان حالات نے سر سیّد کو بہت پریشان کر دیا تھا اور ان کی حالت ایک ایسے آدمی کی سی ہو گئی جس کے مکان میں آگ لگ گئی ہو اور جو اس کو بجھانے میں مصروف ہو۔

سر سیّد نے مسلمانوں کی کمزوری اور انگریزوں کی طاقت کا اندازہ لگا لیا

تھا۔ ان کا پختہ خیال تھا کہ ہندوستانی چاہے جتنی جدوجہد کرلیں اب انگریزوں کو پسپا نہیں کر سکتے اور ان کی سیاسی اور تعلیمی برتری کی مخالفت کرنا کسی طرح بھی ہندوستانیوں کے لیے بہتر ثابت نہ ہوگا۔ ہندوؤں نے پہلے ہی انگریزوں کے نظام تعلیم کے سامنے سر خم کر دیا تھا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم سے ان کو ہر چیز حاصل ہوگی اور وہ انگریزوں سے بہت قریب آجائیں گے مگر مسلمان اپنی نفرت کی وجہ سے انگریزوں سے کچھ لگاؤ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ سر سید نے ہوا کے بدلتے ہوئے رُخ کو پہچان لیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو مغربی تعلیم حاصل کرنا چاہیئے، تاکہ وہ انگریزی حکومت کے قریب آئیں مگر مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ انگریزوں سے علاحدگی کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔

سر سید میں ارادے کی بڑی پختگی تھی۔ غدر کے بعد سر سید نے دہلی کے بجائے علیگڑھ کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنایا۔ انھوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو قریب لانے کے لیئے "تبیین الکلام" اور "طعام اہل کتاب" لکھی اور اس میں قرآن کی آیات سے یہ ثابت کیا کہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان بڑی مناسبت ہے اور مسلمانوں کا انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا مذہباً ممنوع نہیں ہے۔ سر سید مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کی برابر کوشش کرتے رہے اور ۱۸۷۷ء میں انھوں نے علیگڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی اور علیگڑھ تحریک کا آغاز کیا۔ حقیقت میں علیگڑھ تحریک کا آغاز اسی دن ہو چکا تھا جب کہ سر سید نے دہلی چھوڑ کر علیگڑھ کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنایا تھا۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے لیے انھوں نے ملک کے ہر فرقے سے مدد چاہی۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی فرقوں کے روشن خیال لوگوں نے ان کی مدد کی۔ لیکن کسی بھی تحریک کو گورنمنٹ کی امداد کے بغیر چلانا مشکل تھا۔ اس لیے انھوں نے سرکار وقت سے کافی مراعات حاصل کیں۔ سر سید کو یقین تھا کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا مسلمان مغربی تعلیم میں آگے بڑھیں گے۔ بشرطیکہ وہ اپنی پوری توجہ تعلیم ہی پر رکھیں۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ملک میں اس وقت کوئی سیاسی انتشار نہیں تھا اور نہ امید تھی کہ مستقبل قریب میں ہوگا، اس لیے سرسید نے اپنی پوری توجہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج کرنے پر صرف کی اور جب ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس بمبئی میں ہوا تو سرسید نے اس کی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کسی سیاسی آرگنائزیشن کی ضرورت نہیں ہے اور اگر ضرورت ہے تو صرف اعلیٰ تعلیم کی۔ ان کے لیے سیاست انقلاب کا دوسرا نام ہے۔ سیاست سے ملک میں بدامنی پھیلے گی اور سرکار کڑے قدم اٹھائے گی۔ اس سے ملک کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً نقصان ہوگا۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کا غدر دیکھا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی پھر ایسی غلطی کریں، ان کا کہنا تھا کہ اگر ۱۸۵۷ء کا واقعہ نہ ہوا ہوتا تو بڑی تعداد میں ہندوستانی فوج اور انتظامیہ کے عہدوں پر فائز کیے جاتے اور اگر پھر ۱۸۵۷ء کی تاریخ دہرائی گئی تو ہندوستانی ہمیشہ کے لیے انگریزوں کا محکوم ہو جائے گا۔

سرسید کا خیال تھا کہ جیسے جیسے مغربی تعلیم بڑھتی جائے گی ہندوستانیوں میں سیاسی بیداری خود بہ خود پیدا ہوگی لیکن اگر تعلیم ناپید ہوگی تو اس کے اثرات خراب ہوں گے۔ نہ تو وہ سیاسی داؤں پیچ جان سکیں گے اور نہ ہی اپنے حاکموں سے اپنے حقوق کی اور اپنے ملک کی آزادی مانگ سکیں گے۔ یہ بات ان کی اس تقریر سے ثابت ہے جس میں انھوں نے کہا:

"مگر تم دیکھ لو کہ ہندوستانیوں کو علوم و فنون میں اور زیادہ ترقی درکار ہے۔ چند ہندوستانیوں کا لیجسلیٹو کونسل Legislative Council میں داخل ہونا ہندوستانیوں کی ترقی کا شروع ہے، تم میری پیشین گوئی کو یاد رکھو کہ وہ دن کچھ دور نہیں ہے کہ ہر ضلع میں سے ایک شخص کا کونسل میں داخل ہونا ضروری ہوگا۔ وہ دن آوے گا کہ تم خود ہی قانون بناؤ گے اور خود ہی اس پر عمل کرو گے۔"

۱۹۴۷ء میں سرسید کے خواب کی تعبیر سامنے آئی۔ ملک کو آزادی ملی اور ملی اور پارلیمنٹ نے پورے ملک کے لیے قانون بنائے اور اب بھی بناتی ہے۔

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ہندوستان میں برطانیہ گورنمنٹ نے ریفارم کا سلسلہ آہستہ آہستہ شروع کردیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی مغربی تعلیم حاصل کرکے اپنے کو اس کا اہل بنائیں اور ان کے ساتھ تعاون کرکے آگے بڑھیں اور کونسلوں میں داخل ہوں مگر تعلیم یافتہ آدمیوں کا ملنا نایاب تھا اور سرسید برابر اسی پر زور دیتے تھے کہ:

"ہندوستانیوں کو علوم وفنون و تربیت و لیاقت میں ترقی کرنے کی ضرورت ہے۔"

سرسید اپنے کالج میں اسی پالیسی پر عمل کرتے رہے اور ان کی کوشش یہی رہی کہ جلد از جلد مسلمان تعلیم میں آگے بڑھیں۔ ۱۸۸۳ء میں لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر کونسل میں بحث ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو مقامی انتظامیہ میں نمائندگی حاصل ہو تو سرسید نے جو اس وقت وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے اس کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ:

"میں اس عمدہ تجویز کی بڑے فخر سے دلی مگر ناچیز تائید کرتا ہوں کیونکہ میں اس بات کے خیال کرنے سے خوش ہوتا ہوں کہ میں اس قدر عرصے تک زندہ رہا کہ میں نے اس دن کا آغاز دیکھ لیا جب کہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے "سیلف ہیلپ" اور "سیلف گورنمنٹ" کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنھوں نے انگلستان میں ریپریزنٹیٹو انسٹی ٹیوشن کی پیدا کی ہے اور اس کو دنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا ہے۔"

لیکن انھوں نے افسوس ظاہر کیا اور آگاہ کیا کہ:

"مجھ کو یقین ہے کہ ہندوستان کا کوئی حصہ اب تک اس درجہ کو نہیں پہنچا ہے جہاں ریپریزینٹیشن کا قاعدہ معاملات مختص المقام کے لحاظ سے بھی پورا پورا ہندوستان میں جاری کیا جاوے۔ ریپریزینٹیو انسٹی ٹیوشنوں کے ذریعے سے سیلف گورنمنٹ کا اصول شاید سب سے بڑا اور عمدہ سبق ہے جو انگلستان کی فیاضی ہندوستان کو سکھاوے گی لیکن انگلستان سے ریپریزین ٹیٹیو انسٹی ٹیوشنوں کا اصول مستعار لینے

میں ان سوشل اور پولیٹیکل معاملات کا یاد رکھنا نہایت ضروری ہے جن کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے... ہندوستان فی نفسہٖ ایک برِاعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں اور مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے اور ذات کا قاعدہ اب تک بڑے زور و شور سے جاری ہے۔ ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف فرقوں کے باشندے ہوں اور جس حالت میں کہ باشندوں کا ایک گروہ دولت مند اور صاحب تجارت ہو تو دوسرا گروہ باعلم اور ذی رعب ہو۔ ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو اور روشن ضمیری کے جس درجہ ایک گروہ باشندوں کا پہنچ گیا ہو بہ نسبت اس کے جہاں تک کہ باقی باشندے پہنچے ہوں بہت اعلیٰ قوم ہو۔ ایک قوم اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کونسلوں میں ان کی طرف سے ممبروں کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے اور دوسری قوم کو اس قسم کے معاملات کی مطلق پرواہ نہ ہو۔ پس ان صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہے کہ ہندوستان میں ریپریزینٹیو انسٹی ٹیوشنوں کے جاری کرنے سے بڑی مشکل اور سوشل و پولیٹیکل خطرات پیدا ہوں گے۔" میرے لارڈ! ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے جہاں کہ ذات کے اختلافات اب تک موجود ہیں اور جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں ہوئی ہیں اور جہاں کے معلم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک ساوی نامناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی ہے۔ مجھ کو یقین ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کونسلوں میں مختلف مطالبات کی حمایت کی غرض سے الیکشن کے خالص اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے محض تمدنی خیالات کی بہ نسبت زیادہ تر بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی جب تک کہ قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات کا امتیاز ہندوستان کی سوشل و پولیٹیکل حالت میں ایک جزو اعظم رہے گا اور ان معاملات میں جو ملک کے انتظام اور بہبودی سے بشیر متعلق ہیں ان کے باشندوں پر اثر

ڈالے گا اس وقت الیکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا جا سکتا۔ بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آوے گی۔"

سر سید کی یہ تقریر بہت اہم ہے۔ آج کا ہندوستان اب بھی کسی حد تک اسی کش مکش سے دوچار ہے۔ اس سے سر سید کی سیاسی بصیرت اور دوراندیشی کا پتہ چلتا ہے۔

۱۸۸۵ء میں کانگریس کا پہلا جلسہ ہوا اور سر سید کو بھی اس میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ سر سید نے اس کی مخالفت کی اور یہی کہا کہ ہندوستانیوں کو کسی سیاسی تنظیم کی ضرورت نہیں ہے اگر ضرورت ہے تو صرف تعلیم کی جو مستقبل میں خود بخود ان کے اندر سیاسی بیداری پیدا کر دے گی۔ انھوں نے اس سے قبل جسٹس امیر علی کی سینٹرل محمڈن ایسوسی ایشن میں بھی شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا جو ۱۸۷۷ء میں اپنا پہلا اجلاس کر چکی تھی۔ بدرالدین طیب جی نے بھی جنھوں نے کانگریس کا تیسرا خطبۂ صدارت ۱۸۸۷ء میں دیا۔ سر سید کو کانگریس میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ مگر سر سید نے تعلیم کو سیاست پر ترجیح دی۔

سر سید کی کانگریس مخالفت کو نقادوں نے بہت توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ سر سید پرنسپل بیک کے زیر اثر تھے جو ان کی سیاسی رہنمائی کر رہے تھے۔ کچھ کا خیال ہے کہ سر سید گورنر یو۔پی سر آکلینڈ کالون کے دباؤ میں تھے اور کانگریس کے اسی لیے مخالف تھے، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ پرنسپل بیک نے علیگڑھ میں رہ کر برطانوی سامراج کے لیے کچھ بھی کیا ہو۔ وہ ان کا فعل تھا مگر سر سید اور بیک کے کچھ بنیادی اختلافات تھے جو بہت کم منظر عام پر آئے۔ سر سید کی مراسلت پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سر آکلینڈ کالون کی وجہ سے کانگریس کی مخالفت نہیں کی۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں پاینیر کو نومبر ۱۸۸۶ء میں لکھا کہ چاہے سر آکلینڈ کالون۔ لارڈ ڈفرن اور وزیر ہند بھی کانگریس کی موافقت کریں تب بھی وہ کانگریس میں شریک نہ ہوں گے کیونکہ کانگریس نے اپنے اجلاس میں جو قرارداد پاس کیں ہیں وہ گورنمنٹ ہند کے بہت خلاف ہیں۔ اس سے ملک میں انتشار پھیلے گا، بدامنی ہوگی اور ان کی تعلیمی تحریک

خطرے میں پڑ جائے گی۔ کچھ نقاد لکھتے ہیں کہ سرسید نے کانگریس کی مخالفت اس کے ہندو ہونے کی وجہ سے کی، لیکن یہ خیال بھی غلط ہے۔ سرسید کو ہندوؤں کی ترقی نے کبھی پریشان نہیں کیا وہ ان کی ترقی سے خوش تھے اور مسلمانوں کی ترقی کے خواہاں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بنگال، بمبئی اور مدراس کے تعلیم یافتہ مسلمان کانگریس کے حامی ہیں کیونکہ انھوں نے انگریزی تعلیم سے پہلے استفادہ کیا مگر شمالی ہندوستان کے مسلمان انگریزی تعلیم میں کہیں پیچھے تھے اور ان کا کسی بھی سیاسی آرگنائزیشن میں شامل ہونا ان کی تعلیمی تحریک کے لیے مہلک ہوگا۔ سرسید کا ایسا سوچنا غلط نہیں تھا۔ سنجیدہ مورخین نے سرسید کے اس قدم کو سراہا ہے۔ پنڈت جواہر لعل نے لکھا ہے کہ سرسید کا پیغام اس وقت کے لحاظ سے بالکل درست تھا اور ضروری بھی۔ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو اپنے پیغام کو نئی شکل دیتے۔

سرسید کی زندگی میں علیگڑھ کالج کے طلبا نے ان کی سیاسی پالیسی کا احترام کیا اور وہ ہر طرح کی سیاست سے الگ رہے لیکن ان کی وفات کے فوراً بعد علیگڑھ کی پہلی پود نے جو بڑھ کر اب تناور درخت ہونے لگی تھی، برطانیہ کی مخالفت کی اور قومی تحریک کی ضرورت محسوس کی۔

بیسویں صدی کے اوائل میں علیگڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں یہ مسئلہ زیر بحث آنے لگا کہ مسلمانوں کو کون سی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے کیا انھیں کوئی پولیٹیکل آرگنائزیشن بنانا چاہیئے یا اپنی پوری توجہ تعلیم ہی پر لگانا چاہیئے۔ سید امیر علی، اور عماد الملک سید حسین بلگرامی کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو کانگریس کی احتجاجی پالیسی سے الگ رہنا چاہیئے کیونکہ گورنمنٹ سے الجھنا ان کے لیے مہلک ہوگا۔ محسن الملک بھی اسی خیال کے حامی تھے۔ مسلمانوں میں بے چینی بڑھتی دیکھ کر انھوں نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا کہ "مسلمانوں کو اپنے حقوق بچانے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے"۔ انھوں نے ان مسلمانوں کے جذبات کی قدر کی جو سیاسی آرگنائزیشن کے قیام کے لیے بے چین تھے مگر ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو سیاسی انتہا پسندی سے کام نہیں لینا

چاہیئے۔ کیونکہ اس سے گورنمنٹ ان کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھے گی، لیکن وقارالملک ایک سیاسی آرگنائزیشن بنائے جانے کے حق میں تھے اور ان ہی کوششوں سے ۲۱۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو لکھنؤ میں ایک جلسہ سید حامد علی خاں صاحب بیرسٹر کی کوٹھی پر منعقد ہوا۔ اس جلسے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ پہلی بار اس جلسہ میں مسلمانوں نے سنجیدگی سے ایک سیاسی آرگنائزیشن قائم کرنے کی تجویز پر غور کیا۔ اس جلسہ نے جہاں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی بات کی وہیں گورنمنٹ سے بھی اپنی وفاداری کا اعلان کیا۔ اس جلسے نے نواب وقارالملک سے جو سیاسی تحریک کے روح رواں تھے، درخواست کی کہ وہ صوبہ متحدہ آگرہ اودھ کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کریں اور مسلمانوں کو یہ سمجھائیں کہ اب ان کے لیے ایک سیاسی آرگنائزیشن کا قیام ناگزیر ہے۔ میاں محمد شفیع نے پنجاب آبزرور میں کئی مضامین لکھ کر وقارالملک کی تائید کی۔ علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے لوگوں کو بتایا کہ یہ پولیٹیکل آرگنائزیشن لوگوں کے سامنے گورنمنٹ کے خیال اور عمل کی ترجمانی کرے گی۔ اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے عوام کو یہ یقین دلایا کہ یہ سیاسی جماعت کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائے گی جس سے مسلمانوں کو نقصان ہو اور یہ تمام گرم سیاست سے الگ رہے گی۔ جولائی ۱۹۰۳ء میں سہارنپور میں وقارالملک نے ایک نشست میں محمڈن پولیٹکل ایسوسی ایشن بنائی جس نے آہستہ آہستہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی شکل اختیار کرلی۔ امن پسندوں کی یہ سیاسی جماعت سرسید کی سیاسی پالیسی سے متفق تھی لیکن زیادہ عرصہ تک علیگڑھ سرسید کی پالیسی پر قائم نہ رہ سکا۔ علیگڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سیاسی شعور کافی حد تک پیدا ہو چکا تھا۔ محمد علی، شوکت علی، سید محمود اور حسرت موہانی کانگریس کے زبردست حامی تھے اور خفیہ خفیہ ان کے اجلاس میں بھی شریک ہوتے تھے۔ حسرت موہانی کی سیاسی شاعری اور نثری رسالہ اردوئے معلیٰ علیگڑھ کے طلبار کے دل و دماغ پر چھانے لگے تھے۔ مہاراج تلک اور گوکھلے ان کے لیڈر ہو گئے۔ جہاں ایک طرف حسرت نے تلک پر زبردست قصیدے لکھے وہیں علیگڑھ کے طلبار

نے گوکھلے کا اتنا زبردست استقبال کیا کہ ان کی فٹن کو گھوڑوں کی جگہ خود گھسیٹ کر یونین ہال لائے۔ یہ اعزاز بہت کم ہی کسی کو علیگڑھ میں دیا گیا ہے۔

سرسید کی کانگریس مخالفت صحیح تھی لیکن یہ ان کا حرفِ آخر نہیں تھا۔ ان کا اختلاف عارضی تھا۔ اگر سرسید کچھ دن اور زندہ رہتے تو خود ہی اپنے سیاسی نظریات میں تبدیل کرتے اور مسلمانوں کو قومی تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دیتے۔ کیونکہ اس وقت تک مسلمان اپنی ابتدائی منازل سے گزر کر صحیح تعلیمی مقام حاصل کر لیتے اور ان کے لیے ملکی سیاست میں حصہ لینا دشوار نہ ہوتا اور نہ ان کے لیے مہلک ثابت ہوتا۔ اگر مسلمان کانگریس کی ابتدار سے ہی اس میں شریک ہو جاتے تو وہ کبھی بھی اس قدر گرم جوشی سے قومی تحریک میں حصہ نہ لے سکتے تھے جتنی گرم جوشی سے انھوں نے بعد کو کانگریس میں حصہ لیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ علیگڑھ نے قومی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ علیگڑھ نے محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر محمد اشرف، ڈاکٹر ذاکر حسین، رفیع احمد قدوائی، خان عبدالغفار خان، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، چودھری خلیق الزماں، تصدق حسین خاں شیروانی، عبدالمجید خواجہ اور پروفیسر حبیب جیسے ان گنت سپوت پیدا کیے جنھوں نے قومی تحریک کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ اور بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی وہ پیچھے نہیں ہٹے۔ یہ سب کچھ سرسید کی سیاسی دُور اندیشی کی وجہ سے ہوا۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر اپنی زندگی کے آخر تک (۱۸۹۸ء) سرسید مسلمانوں کو سیاست سے الگ کیے رہے تاکہ وہ تعلیم مکمل کر لیں اور جب ان میں سیاسی بیداری اور شعور پیدا ہو جائے تو کھل کر میدانِ سیاست میں آئیں۔ سرسید کا اندازہ صحیح تھا۔

(بہ شکریہ: تہذیب الاخلاق علیگڑھ مارچ، اپریل ۱۹۹۸ء)

۴

علیگڑھ : تحریک

اک نکتۂ انمول ہے یہ شہرۂ آفاق
سچائی میں ہو زہر تو بن جاتا ہے تریاق

سلام اے رہنما اے دردمندِ قومِ سر سید

ساغر چشتی اوجتی

نظر انجام بیں، دل آشنائے صبح عرفاں تھا — تری شامِ تخیل کا ہر اک پہلو درخشاں تھا
ارادہ میں تری مرقوم تھیں، دُنیا کی تعبیریں — تجھے معلوم تھیں تعلیم کی رنگین تفسیریں
ہوائیں ناموافق تھیں مخالف اک زمانہ تھا — ہزاروں بجلیوں کی زد میں تیرا آشیانہ تھا
پھنسی تھی بے طرح سے کفر کے گرداب میں کشتی — مگر ہمت نہ ہاری بارک اللہ تیری جولانی

تجھے دنیاؤں دیں کی عظمتیں سب ملنے والی تھیں
ترے موجِ نفس سے بند کلیاں کھلنے والی تھیں

جہاں تیرا لہو اکثر پسینہ بن کے بہہ نکلا — وہاں پر آج تک جاری ہے چشمہ آبِ حیوان کا
بلا تفریق مذہب جمع ہیں سب تیری محفل میں — ترے دریائے بے پایاں میں رقصاں مستقل موجیں
کہیں قانون، مذہب، فلسفہ، سائنس، اقلیدس — فضائے علم میں حل ہو رہا ہے ہر کس و ناکس
ہر اک اہلِ نظر یوں جانبِ گلشن کھنچ آتا ہے — کہ جیسے سنگِ مقناطیس پر آہن کھنچ آتا ہے
گلستانِ ادب میں تیرے جو پودے لہکتے ہیں — حکومت کے گلستاں ان کی خوشبو سے مہکتے ہیں
کبھی تیرے شجر کے پھول طرفہ رنگ لاتے ہیں — بدل کر بھیس جب دنیا کے بازاروں میں آتے ہیں
نئے انداز سے ذہن و نظر کو گدگداتے ہیں — زمانہ مسکرا اٹھتا ہے جب یہ مسکراتے ہیں
علی گڑھ کی زمیں کو فخر تجھ پر کیوں نہ ہو ساقی — خرد کو ہوش میں لاتی ہے تیرے ہی مئے باقی
شراب نور سے ہے لبریز تیرے شیشہ و ساغر — پیامِ زندگی جاوداں دیتے ہیں بڑھ بڑھ کر
سلام اے منتہائے جستجو اے رحمتِ بے حد — سلام اے رہنما اے دردمند قوم سر سید

لحد تیرے لیے گہوارۂ فردوس ہو جائے
قیامت تک تری مرقد پہ رحمت پھول برسائے

رشید احمد صدیقی

علیگڑھ تحریک

سلطنت مغلیہ کے زوال اور غدر کے عواقب کو کچھ دور ایام سے اور کچھ سرسید کی قیادت کے طفیل مسلمان بھلا چکے تھے اور رفتہ رفتہ عافیت عزت اور فراغت کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ بچی کھچی زمین جائداد تھی، تھوڑی بہت چھوٹی بڑی نوکریاں تھیں، کچھ کاروبار تھا اور بہت کچھ ساکھ تھی۔ کام چل نکلا تھا یہ حالت کم و بیش بیس سال تک قائم رہی جس میں انیسویں صدی کا آخری اور بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد وہ حالات و حادثات پیش آنے لگے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، یہاں تک کہ دوسری جنگِ عظیم آئی اور گزر گئی اور ہندوستان آزاد ہوگیا۔ اب تک ہندوستان دو عالمگیر جنگ کی براہِ راست بلاکتوں سے محفوظ رہا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ کمی ۱۹۴۷ء میں وہ خود اپنے ہاں ایک خونی تقریب مناکر پوری کرے گا۔ اس کا اثر مسلم یونیورسٹی اور مسلمانانِ ہند پر جیسا کچھ پڑا وہ محتاجِ بیان نہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمان جن حالات و حادثات سے دوچار ہوئے، ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انھوں نے کل ہند نوعیت کی جن تحریکات کو چلایا، ان میں غالباً مدرستہ العلوم علیگڑھ، ایم اے او کالج ہی ایسا ادارہ تھا جس پر قوم کا پورے طور ہمیشہ بھروسہ رہا۔ جس نے بحیثیت مجموعی قوم کی سب سے مفید

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اور دیرینہ خدمات انجام دیں اور جس کی خدمات کو متفقہ طور پر تقریباً ہر حلقوں میں سراہا گیا۔ جس نے مسلمانوں کو ہر سمت سے تقویت پہنچائی، ان کے حوصلہ اور عزائم کو پروان چڑھایا اور دُور و نزدیک ان کی توقیر بڑھائی۔ اس کی تاریخ میں طرح طرح کے نشیب و فراز بھی آئے جن پر بحث کی جا سکتی ہے، لیکن اس کی خدمات کے بیش بہا ہونے میں کلام نہیں خالص مذہبی یا نیم مذہبی ادارے میرے پیش نظر نہیں ہیں۔

سرسیّد مغلیہ سلطنت کی تباہی اور غدر کی ہولناکیوں سے برآمد ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت ان صلاحیتوں پر مشتمل تھی جن کو ایک طرف مٹتے ہوئے عہد کی یادگار اور دوسری طرف اس کی جگہ لینے والے عہد کی بشارت کہہ سکتے ہیں۔ وہ ایک ایسے رشتہ یا واسطہ کے مانند تھے جو ایک عظیم ماضی کو اس کے عظیم تر مستقبل سے منسلک رکھتا ہے جس کے بغیر کسی قوم کی تہذیبی شعور میں ربط و تسلسل باقی نہیں رہتا، اور جس کے بغیر خود نسل انسانی اس منزلت پر فائز نہیں ہو سکتی جس سے اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مدرسۃ العلوم کا قیام انھیں صلاحیتوں کا تقاضا تھا جن کو سرسیّد اور ان کے رفقائے کرام نے اپنی تحریر و تقریر، شاعری شخصیت اور عمل محکم و مسلسل سے متشکل مستحکم اور مزین کیا۔

اس طور علیگڑھ مشرقِ وسطیٰ کی اس طرزِ فکر اور طریق بود و مانہ کا ایک طرح سے امین بنا جو صدیوں سے متمدن دنیا کا طرۂ امتیاز رہا تھا۔ اس طرز و طریق کو اس نے غیر قانونی طور پر نہیں اپنایا تھا بلکہ اس میں ہندوستانی تہذیب کے ایسے قیمتی اور دلکش عناصر اس خوبی و خوبصورتی سے سموئے کہ ان کا ایک دوسرے سے جُدا کرنا (اکثر پہچاننا) دشوار ہو گیا۔ اس طرز و طریق میں علیگڑھ اپنی بیداری اور اپنی تخلیقی و تعمیری صلاحیتوں کی بشارت دیتا اور ثبوت پہنچاتا رہا۔ ہندوستان، چین اور ایشیا کے دوسرے ممالک اپنی اپنی مخصوص تہذیبوں پر فائز رہے ہیں اور ان تہذیبوں کے گراں مایہ ہونے میں کلام نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ وہ تہذیب جس کا ذکر اوپر آیا ہے وہ بہت دنوں تک روح عصر کی حیثیت سے ایشیا یورپ اور افریقہ کے مختلف رقبوں پر ضو فگن رہی یہاں تک کہ صنعتی و سائنسی تہذیب نے اس

کی جگہ لے لی یا کہیں کہیں اس کو بہت پیچھے دھکیل دیا۔

میرا ذاتی خیال کچھ ایسا ہے کہ سر سید نہ تو مذہب کے ایسے کوئی جید عالم تھے نہ سیاست کے ماہر یا شعر و ادب کے شیدائی لیکن بقول ایک فاضل کے ایک غیر معمولی صفت ان میں یہ تھی کہ وہ جس موضوع پر جو کچھ لکھنا یا کہنا چاہتے تھے اس کے لیے تمام ضروری معلومات فراہم کرنے کی انتہائی کوشش کرتے جو مستند کام کرنے والوں کا امتیاز ہے۔ وہ بڑے ذہین، مخلص نڈر حوصلہ مند تھے اور کبھی تھکنے یا ہارنے والے نہ تھے۔ ان میں جہانداری اور جہاں بینی دونوں کی جھلک ملتی ہے جو کبھی ہمارے اسلاف کی صفات تھیں۔

غدر کے بعد جہاں تک ہندی مسلمانوں کی تعلیمی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی شیرازہ بندی کا سوال تھا وہ قائد، امام عہد یا روحِ عصر یقیناً تھے۔ وہ شاید کسی فن میں بگانۂ روزگار نہ تھے۔ لیکن اچھے اچھے یگانۂ روزگار ان کے گرد جمع ہو گئے تھے اور شاید جمع ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان سب کی بیش بہا تخلیقی استعدادوں کو ایک مرکز پر مرکوز کر کے قوم و ملک کے لیے بابرکت بنانا سر سید کی غیر معمولی شخصیت کا فیضان تھا۔

سر سید کے رفقائے کرام سے ہم سب بخوبی واقف ہیں اگر سر سید کی عظیم شخصیت Genuinee جینیسوں کو اپنے حلقۂ اثر میں لے کر ان کے بطون میں تہلکے نہ برپا کر دیتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ منتفرق اور منتشر رہ کر یہ قوم و ملک کی کیا خدمت کر سکتے۔ سر سید مسلمانوں کو ملاؤں کی گرفت سے نکالنا چاہتے تھے۔ یہی مہم اقبالؔ کے سامنے تھی۔ دونوں کا زمانہ اور دونوں کا طریقۂ کار مختلف تھا۔ حال کو سدھارنے کے لیے کبھی کبھی ماضی کو بھی سدھارنا پڑتا ہے۔ مذہب اور اخلاق کے معلمین و مصلحین کو اکثر یہ منازل طے کرنے پڑتے ہیں۔ اگلوں سے قطع نظر سر سید شبلیؔ، اقبالؔ، مودودی سب نے یہی کیا۔ آئندہ بھی ایسے لوگ آتے رہیں گے اور یہ مہم انجام پاتی رہے گی۔ مذہب کی بنیادی اور فروعی باتوں میں امتیاز کرنے میں اکثر چوک ہوئی ہے۔ جس کی تلافی کی کوشش ہمیشہ جاری رہے گی۔

قوم کی سیرت مسخ ہونے کا احتمال دو وقت خاص طور پر ہوتا ہے۔ ایک جبکہ

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

حکومت ہاتھ میں آتی ہے۔ دوسرے اس وقت جب ہاتھ سے نکل جاتی ہے،
ہر زمانہ اور ہر ملک میں ہر مصلح اور معلم نے ان موقعوں پر سخت جد و جہد کی ہے،
اور نادانوں اور خود غرضوں کے ظلم سہے ہیں۔ ناواقفوں یا بے وقوفوں کو مذہبی توہمات
سے بچانے نکالنے کے لیے مذہب کی افہام و تفہیم میں سرسید با کسی اور کا کہیں
کہیں غیر محتاط ہو جانا تعجب کی بات نہیں۔ سرسید کے نکتہ چینیوں نے اس پر
غور نہیں کیا کہ غدر مسلمانوں کے حق میں کیسا ہولناک حادثہ تھا اور مسلمان کن
تاریخی حوادث سے دوچار تھے۔ سرسید نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان میں
مسلمانوں کا وہ انجام ہو جو اسپین میں ہوا۔ سرسید نے ہندوستان میں دوسرا اسپین
اسٹیج ہونے کا سدِّ باب کیا۔

میں نے سرسید کا عہد نہیں دیکھا لیکن ذاکر صاحب کی زندگی اور ان کا کارنامہ
پورے طور پر نظروں کے سامنے رہا ہے۔ اس سے اندازہ کر سکتا ہوں کہ سرسید
پر کیا عالم گزرا ہوگا۔ جب غدر کے بھیانک نتائج ان کے سامنے تھے اور ہر بہانے
ہر طرف مسلمان برباد اور ہلاک کیے جا رہے تھے اور ذاکر صاحب پر کیا کیفیت
طاری ہوئی ہوگی، جب تقسیم ملک کے بھیانک نتائج ان کے سامنے آئے اور
انھوں نے ہر طرف بالعموم اور دلّی میں بالخصوص مسلمانوں کو برباد اور ہلاک
ہوتے دیکھا۔ میں نے ذاکر صاحب کا زمانہ نہ دیکھا ہوتا تو سرسید کا اتنا قائل نہ ہوتا
جتنا کہ اب ہوں۔ اس سے سرسید اور ذاکر صاحب کا اتنا موازنہ مقصود نہیں
جتنا دونوں کے سامنے جیسی بے پایاں اور بے پناہ ذمہ داریاں تھیں، ان کی طرف
توجہ دلانا مقصود ہے۔

سرسید نے مدرسۃ العلوم کو مذہبی ادارہ نہیں بننے دیا۔ اسلامی اور علمی ادارہ
بنانے اور رکھنے کی برابر کوشش کرتے رہے ایسا علمی اور اسلامی ادارہ جو
قومی رنگ و آہنگ سے اسنوار و آراستہ رہے۔ ذاکر صاحب نے پچاس سال
بعد جامعہ ملیہ کا بھی قریب قریب یہی نقشہ رکھا اور اس اعتبار سے جامعہ کو جو امتیاز
حاصل رہا اور تعلیمی تنظیم و تشکیل کو جو نئے اور قیمتی تجربے سامنے آئے
وہ مسلّم ہیں۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مدرستہ العلوم کی اس خصوصیت کو ملک کی تقسیم سے چند سال پیشتر تک بڑی قابلیت اور خلوص سے بنایا گیا۔ چنانچہ اس ادارہ کی تاریخ میں ہندو مسلمان شیعہ سنی سکھ قادیانی، پنجابی، بنگالی کوئی قسم کی کشمکش اور ناگواری کبھی نہ پیدا ہوئی باوجود اس کے کہ شروع سے آج تک جتنے مختلف مذہب و مسلک کے طلبا اور اساتذہ اس ادارہ میں یکجا رہے ہیں کسی اور ادارہ میں خواہ وہ ادارہ حکومت ہی کا کیوں نہ رہا ہو، نہیں رہے۔ خواہ وہ حکومت بدیسی رہی ہو، خواہ قومی۔

علیگڑھ سے باہر فرقہ دارانہ جھگڑے اور صوبائی عصبیت کے جہاں جہاں اکثر مظاہرے ہوتے رہے لیکن اس ادارہ کی فضا اس طرح کی نحوست سے ہمیشہ پاک رہی۔ مسلمان حکومتوں کی روایات کو بالخصوص جس خوبی اور پابندی سے علیگڑھ نے بنایا وہ ہندوستان کی تعلیم گاہوں کی تاریخ میں بے نظیر ہے یہی سبب ہے کہ علیگڑھ کے تعلیم یافتہ حکومت کے جن چھوٹے بڑے مناصب پر فائز رہے، یا جہاں کہیں جس حال میں رہے فرقہ وارانہ عفونت سے پاک رہے۔

سیّد جمال الدین افغانی کی پین اسلامک تحریک کا بھی سرسیّد نے ساتھ نہ دیا اور اپنے اس رویّہ سے وہ سیّد موصوف کے عتاب کے بھی مورد نہیں۔ سرسیّد اس حقیقت سے آشنا تھے کہ ہندوستان اتنے فرقوں کی سرزمین ہے اور رہ چکا ہے کہ اب وہ یا تو ہر فرقہ کی سرزمین ہے یا کسی فرقہ کی نہیں، اور جب کبھی یا جہاں کہیں اس میں فرقہ بندی یا کی قسم کی تحریک اٹھائی جائے گی ملک کے صالح مقاصد کو نقصان پہنچے گا۔

سرسیّد کا تعلیمی نیز علمی دیانت کا تصوّر بھی بلند و برگزیدہ تھا ان کو یقین تھا کہ مدرستہ العلوم ایک دن یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچے گا اس لیے انھوں نے تعلیم اور علم کے اعلیٰ تصور کو کسی اور تصور حتیٰ کہ مذہبی تصوّر کا پابند نہیں کیا۔ خالص دینی یا مذہبی تعلیم کے وہ مخالف نہ تھے۔ سرسید کی تصانیف کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ان کو اسلام اور داعیِ اسلام سے کس درجہ شغف تھا۔ سرسیّد چاہتے تھے کہ علیگڑھ کے طلبا اسلامی تاریخ کی بہترین روایات اور مذہبی زندگی کی اعلیٰ قدروں

ماہنامہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کی پیروی کریں۔ مغربی علوم و فنون کے شناور ہوں اور ملک میں باعزت زندگی بسر کرنے اور مل جل کر رہنے کے طور و طریق اپنائیں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے وہ انگریزوں سے لڑتے تھے، ملاؤں سے کفر کے فتوے پاتے تھے اور شاعروں سے طرح طرح کی پھبتیاں سنتے، ہم سے آپ سے گڑگڑاتے تھے۔ اپنی ہر پونجی لگا رہے تھے۔ خواہ وہ معاشی ملکیت کی ہو، خواہ عزت و ناموس کی، خواہ راحت و عافیت کی، خواہ ذہن و ضمیر کی۔ کوئی کچھ نہ کرتا تو خود سب کچھ کر لیتے۔ خواہ وہ اعلیٰ درجہ کا کام ہوتا، خواہ معمولی درجہ کا، خواہ عقل کی روشنی میں کرنا پڑتا، خواہ جذبات کے سیلِ بے اماں میں، وہ سب کچھ کرتے۔ علی الاعلان کرتے اور دیوانہ وار کرتے۔ اپنے بے نظیر کارناموں کے اعتبار سے سرسیدؒ ایک فرد یا ادارہ کی نہیں بلکہ ایک عہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں شاید اتنی جیدّ و جامع حیثیات شخصیت پچھلی دو صدیوں میں نظر نہ آئے اور آئندہ بھی توقع نہیں ہے کہ دوسرا سرسیدؒ کبھی پیدا ہو سکے گا۔

یونیورسٹی کے گیارہ سو طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے اس یونیفارم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی جو سرسیدؒ نے طلبا کے لیے پسند کی تھی۔ سیاہ چست کوٹ گردن تک بٹن لگے ہوئے، سفید پاجامے اور سرخ ترکی ٹوپیاں ترکی ٹوپی تازہ ہوا اور روشنی کا نشان تھی۔ (خالدہ ادیب خانم)

ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری

سر سیّد تحریک کی معنویت

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی"

انسانی زندگی تغیر پذیر اور جہد و عمل سے عبارت ہے۔ زندگی میں ارتقائی عمل ہی اس کو حرکت و حرارت بخشتا ہے جو حیات کی علامت اور تہذیبی ارتقاء کا سبب ہے۔ اور ارتقائی عمل کی موقوفی اور معین طرزِ زندگی پر قیام سکوت و ٹھہراؤ کا باعث ہوتا ہے جو موت کی علامت اور تہذیبی انحطاط کا سبب ہے۔ زندگی کے نئے نئے مسائل اور مختلف مشکلات پر اسی وقت قابو پایا جا سکتا ہے جب انسان طرزِ کہن کے تقدس کے بت کو توڑنے کی جرأت اپنے اندر پیدا کر لے، اور اپنے ذہنی افق کو کھلے دل سے وسیع سے وسیع تر کرنے پر آمادہ ہو۔ دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالیئے تو وہی اقوام ترقی کی راہ پر گامزن ملیں گی جنھوں نے جمود و تعطل کے جال سے خود کو آزاد کر لیا اور عقلی بنیادوں پر رفتارِ زمانہ کا ساتھ دیا۔ اس کے برخلاف وہ اقوام پسماندگی کی ذلتوں کو برداشت کرتی رہیں جو فرسودگی کی جکڑ بندیوں سے خود کو نجات دلانے کا حوصلہ پیدا نہیں کر سکیں اور جہالت و تنگ ذہنی کا شکار ہیں۔ دورِ جدید کے علمی و سائنسی انفجار اور صنعتی تہذیب کی یلغار نے اس حقیقت کو مزید واضح کر دیا ہے اور علمی اعتبار سے پسماندگی کی شکار اقوام کو مزید

پسماندگی میں دھکیل دیا ہے۔

مسلم قوم اگرچہ اس انقلابی فکر کی حامل دعوت کی پیروکار ہے جس نے "آبا و اجداد" کے بتوں کو توڑنے اور حقائق کو غیر مشروط طور پر تسلیم کرنے کی آواز لگائی تھی اور جس کے داعی پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کے ذریعہ حصول علم کے لیے مثالی اور آفاقی مقصد کی جانب رہنمائی کی تھی جو دین و دنیا دونوں کی فلاح و سعادت کی ضمانت دیتا ہے اور ارتقاء کے اصول پر قائم ہے۔ لیکن اب وہی قوم اپنی کوتاہ اندیشی کی وجہ سے پستی اور جمود کا شکار ہو چکی تھی ظاہری اور باطنی ایسی کوئی خامی اور کمزوری نہیں تھی جو ان میں سرایت نہ کر گئی ہو۔ مذہبی اعتبار سے کھوکھلی، اخلاقی اعتبار سے قلاش، سماجی اعتبار سے پست اور بے وزن۔ اقتصادی اعتبار سے مفلس اور علمی اعتبار سے جاہل۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اس حیثیت سے اور بھی زیادہ خراب تھی کہ ان میں احساسِ زیاں جاتا رہا تھا جس کے نتیجہ میں ان میں تعلّی کا مہلک مرض پیدا ہو گیا تھا۔ اور اب ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اپنی کمزوریوں کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنے میں چرب زبان، احساسِ برتری میں سب سے آگے، خود ساختہ رسوم و رواج پر نازاں، اپنی کھوکھلی تہذیب پر مغرور، اعتراضات میں ماہر، دوسروں پر تنقید کرنے اور بزعم خود نیچا دکھانے میں شاداں و فرحاں اور اپنی جہالت و کم علمی کے باوجود ہمہ دانی کے بڑے بڑے دعوؤں میں مشغول تھے۔ الغرض انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی یہ حالت دردمندول رکھنے والوں کے لیے بجا طور پر تشویش ناک تھی۔ لیکن عموماً اصلاح قوم کا بیڑا اٹھانے والوں کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ قوم کے خود ساختہ سماجی اور مذہبی رہنما جن کی معاش کا دار و مدار ہی قوم کو جاہل و پست رکھ کر اپنے پیچھے بھیڑ چال چلوانے پر ہوتا ہے ان کے آگے کسی مخلص اور حقیقت میں قوم کا درد رکھنے والوں کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے قوم کی اس حالت کے ذمہ دار ماضی میں رونما ہونے والے کچھ ایسے عوامل تھے جو قوموں کی زندگی کو تہس نہس کر دیا کرتے ہیں۔ ان کی تفصیل کی گنجائش یہاں نہیں، البتہ یہ بہر حال حقیقت ہے کہ مسلم قوم کے

ـ ماہی فکر و آگہی ملی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

انحطاط کی اصل وجہ قوم کے ارباب حل و عقد کی غفلت، ناعاقبت اندیشی اور مجموعی ترقی کی رفتار میں دوڑنے دوڑتے اچانک تھک ہار کر بیٹھ جانے میں ہی پنہاں ہے۔ سیاسی بساط الٹنے کے بعد انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ہندوستانی مسلمان علمی اور اخلاقی اعتبار سے پوری طرح پسماندگی کے شکنجہ میں جکڑ چکا تھا، رہی سہی کسر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مابعد اثرات نے پوری کردی۔ جنگ آزادی کے بعد جو دلخراش مناظر سرسید نے دیکھے اور اس میں مسلمانوں کو جو ذلت آمیز قیمت چکانی پڑ رہی تھی، اس نے سرسید کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اولاً انھوں نے ہجرت کر جانے کا ارادہ کیا لیکن اپنے وطن اور قوم کی گرتی ہوئی حالت نے ان کے قدموں کو روک دیا، اور انھوں نے اس راہ میں آنے والی دشواریوں اور پریشانیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے قوم و وطن کی خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر ایک ہمہ جہتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس تفصیل سے قطع نظر کہ اس راہ میں ان کو کن دشواریوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے اپنی اصلاحی دعوت کا آغاز کس طرح کیا، یہ بات اپنی جگہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ سرسید نے اخلاص سے مسائل کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور مطالعہ و مشاہدہ کی روشنی میں ایک محکم اور مناسب حل تلاش کر کے قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کو جن مخالفتوں اور سازشوں کا سامنا کرنا پڑا وہ کوئی نئی بات نہ تھی، تمام مصلحین کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے کیونکہ وہ اپنی اصلاحی دعوت میں کسی نئی راہ کی نشاندہی کرتے ہیں جبکہ عوام جن چیزوں سے مانوس ہوتے ہیں انھیں پر کاربند رہنے کو دین و مذہب سمجھتے ہیں اور ان کے مذہبی رہنما ان کو یہی بات سمجھاتے بھی ہیں۔ لیکن مصلحین ان سازشوں اور مخالفتوں سے دل برداشتہ نہیں ہوا کرتے، ان کو اپنی اصلاحی تحریک پر کامل یقین و اعتماد ہوتا ہے اور وہ اپنی قوم سے یکسر مخلص ہوتے ہیں۔ وہ قوم کو ایک ایسے مریض کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جو معالج سے تعاون نہ کرتا ہو اور ضدی ہو گیا ہو، لیکن بہرحال معالج کا فرض مریض کے مرض کی تشخیص اور اس کا مناسب علاج کرنا ہوتا ہے۔

چنانچہ سرسید نے اپنی قوم کی رہنمائی کے لیے کافی غور و خوض کے بعد

جو پہلو قابلِ اصلاح سمجھے ان میں انفرادی، اجتماعی، مذہبی، معاشرتی، لسانی اور معاشی تقریباً سارے پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ مذکورہ تمام پہلوؤں پر انھوں نے اظہارِ رائے کیا ہے اور قوم کی زبوں حالی کے اسباب کا بڑا اسائنٹفک تجزیہ کیا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر انھوں نے اپنے افکار ونظریات اور قول وعمل سے قوم کی بروقت رہنمائی نہ کی ہوتی تو آج یہ قوم اپنے تمام تر دعوؤں کا بوجھ لادے بے شعوری کے جرم میں ماخوذ ہوکر مزید ذلت وخواری کا شکار ہوتی اور اس کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوتا۔ لیکن ان سب پہلوؤں کی اصلاح ان کے نزدیک جب ہی ممکن تھی جب قوم جہالت کی ظلمتوں سے نکل کر علم وعمل کی دنیا میں قدم رکھے۔ اس لحاظ سے تعلیمی اور تہذیبی سطح پر سرسید نے جو اصلاحی کوشش کی ہیں وہ گویا ہمہ جہتی اصلاح کی کوششیں ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"پس ہم کو اپنے اوپر رحم کرنا چاہیے اور ایسی تعلیم اختیار کرنی چاہیے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ وشاداب کرے۔"[۱]

علم انسان کی اولین ضرورت ہے۔ اللہ نے اپنے اولین نبی۔ انسانِ اول حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کے بعد اشیاء کا علم عطا کیا تھا اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہلی وحی بھی قرأت اور قلم وعلم کے ذکر پر مشتمل تھی قرآن نے بھی متعدد مقامات پر علم وعمل پر زور دیا ہے اور جہل کے خلاف آواز بلند کیا ہے۔ سرسید نے اپنی اصلاحی دعوت کی بنیاد اسی "سنت مبارکہ" پر رکھی تھی کہ اسی میں قوم کی روحانی ومادی ترقی کا راز مضمر ہے کہ وہ علوم وفنون میں ترقی کرے علم ہی انسان کو انسانیت کا درس دیتا ہے اور ایک ایسا گوہر بے بہا ہے جو انسان کی انفرادی حالت کو بھی درست کرتا ہے اور اقوام کی اجتماعی حالات کو بھی درست کرکے ان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں سرسید فرماتے ہیں:

"ہم کو زمانہ گذشتہ اور حال پر نظر کرکے ایک ایسا طریقہ تعلیم معین کرنا چاہیے جس سے علوم دینی ودنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجہ تک ہم کو قابو ملے۔"[۲]

سرسید کے نزدیک کسی قوم میں خواہ کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ ہوں تعلیم کے بغیر

اس کی خوبیاں بھی خامیوں کا درجہ لیتی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہیں اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں۔ ظاہر نہیں ہوتیں"۔ سے

تعلیم و تربیت سے انسان کی خوبیوں کو جلا ملتی ہے اور انسان میں غیر مہذب اور ناشائستہ حرکات کو تعلیم کے ذریعہ مہذب بنایا جا سکتا ہے۔ تعلیم کے لیے صرف کتابوں کا سہارا لینا بے سود اور غیر نفع بخش ہے۔ اس سے تعلیم کا جامع مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس جامع مقصد کو اسی وقت حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ کتابوں کے ساتھ ساتھ طالب علم کو تعلیم کے لیے عمدہ سوسائٹی بھی مہیا ہو۔ یعنی علم کوئی ایسی مجرد شئے نہیں جس کو کتاب سے حاصل کر کے تعلیم یافتہ ہوا جا سکے اور اس کے وہ خصائص اپنے اندر پیدا کیے جا سکیں جو انسانوں کو مہذب بناتے ہیں، بلکہ تعلیم کے ساتھ عملی تربیت اور اس کا ماحول ضروری ہے تاکہ تعمل سے علم کی افادیت ذہنوں میں پیوست ہو سکے اور ایک مخصوص تہذیب و کلچر وجود میں آ سکے۔ تعلیم و تربیت بظاہر اگرچہ دو الگ الگ شئے ہیں لیکن معنوی اعتبار سے باہم اتنے مربوط ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کے اثرات ناقص رہتے ہیں۔ سرسید تعلیم و تربیت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جو قوتیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے اور اس کو کسی بات کا مخزن و مجمع بنانا اس کی تربیت ہے"۔ سے

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

"اندرونی قویٰ کو حرکت دینے بغیر تربیت تو ہو جاتی ہے مگر تعلیم کبھی نہیں ہوتی۔ اس لیے ممکن ہے کہ ایک شخص کی تربیت تو بہت اچھی ہو اور تعلیم بہت بری۔ یہی حال ٹھیک ہم مسلمانوں کے عالموں اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہے کہ تربیت تو نہایت اچھی ہے اور تعلیم کچھ نہیں، ظاہر میں دیکھو تو طمطراق بہت کچھ مگر جب اصلیت ڈھونڈو تو کچھ نہیں۔ بھاری بھرکم تو عمامہ و دستار و جبہ و کرتا سے

سے ماہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

بہت کچھ مگر ان کی اندرونی قوتوں کی شگفتگی دیکھو تو کچھ بھی نہیں ہے۔[۲]

سرسید نے جو تعلیمی نظریہ پیش کیا ہے اس کے خدوخال اجاگر کیے جائیں تو نقشہ واضح ہوتا ہے اس کے مطابق وہ ایک ایسے تعلیمی نظریہ کی دعوت دیتے رہے تھے جو بیک وقت عقلی بنیادوں پر مستحکم، سائنسی نقطۂ نظر کا حامل اور اخلاقیات کا پابند ہو۔ اور مجموعی طور پر اس میں حریت، ارتقائی تسلسل اور حرارت عمل کی روح کارفرما ہو تاکہ کسی وقت وہ جمود و تعطل کا شکار ہو کر قدامت و فرسودگی کی علامت نہ بن سکے۔

اسی تناظر میں ان کے افکار کو دیکھا جا سکتا ہے جو انھوں نے مذہب کی تعبیر و تشریح کے سلسلے میں پیش کیے ہیں۔ انھوں نے مذہب کی تعبیر و تشریح میں تقلیدی رویہ کے خلاف مسلم قوم کو بیدار کرتے ہوئے تحقیقی اور خالص اسلامی انداز اپنانے کی دعوت دی ہے اور ان غیر اسلامی عقائد کو ذہنوں سے کھرچ پھینکنے کی بات بڑی جرأت مندی سے کی ہے جو مذہب کا روپ اختیار کر کے مسلمانوں کے ذہنوں اور ان کے مذہبی کتب کا حصہ بن چکے تھے۔ یہ اور بات کہ ان کے مذہبی افکار میں کہیں کہیں بے جا معقولیت اور تجدد پسندی کا غلبہ محسوس ہوتا ہے۔ الغرض سرسید کے افکار و اقوال کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے تعلیم کا جو تصور دیا تھا وہ ایک جامع تصور تھا۔ وہ اس وقت کی انگریز حکومت کی پالیسی سے بھی متصادم تھا، کیونکہ انگریز ہندوستانیوں کو محض اسی قدر تعلیم دینا چاہتے تھے جس سے ان کی دفتری اور سرکاری کام کاج کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اسی طرح ان کا نظریۂ تعلیم مذہبی حلقہ کے اس نظریۂ تعلیم سے بھی مختلف تھا، جو اولاً مخصوص حالات میں دین اور دینی ورثہ کو محفوظ کرنے کی کوششوں کے سلسلہ میں وجود پذیر ہوا تھا اور جس کو ہم اصلاً اسلامی نظریۂ تعلیم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن بعد کے ادوار میں اس عبوری دور کے نظریۂ تعلیم ہی کو عین اسلامی نظریۂ تعلیم کی حیثیت سے جانا گیا اور کسی حد تک ہنوز اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ورنہ دراصل اسلام نے نظریاتی طور پر مقصد تعلیم و تربیت کے حوالے سے تنگ نظری کا ثبوت کبھی نہیں دیا بلکہ بڑی فراخدلی اور وسعت نظر کا ثبوت دیتے ہوئے

[۲] ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کائنات اور اس سے متعلق تمام امور پر غور و فکر اور تدبر کرنے کی واضح ہدایات دی ہیں۔ چنانچہ قرآن و حدیث کی ان واضح ہدایات کی روشنی میں مسلم علما نے جو تعلیمی نظریہ پیش کیا ہے اس میں علما کے مابین عقلی مذاہب کے اختلاف کے باوجود مقاصد تعلیم و تربیت میں دین، دنیا اور علم تین باتیں یقیناً مشترک ہیں۔ جدید دور میں علمی رفتار اور صنعتی انقلاب نے اس ضرورت کو اور اہم بنا دیا اور اب قوم کے لیے یہ تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ تعلیم کے مقاصد میں دین، سماج، عقل علم اور مادیت کا اجتماع ہونا چاہیئے۔ علم کا مزاج ہے کہ اس میں ارتقا ہوتا رہتا ہے اور اگر کسی حلقہ نے علم کے تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر کے صرف ایک پہلو کو ہی اپنا مقصد بنایا ہے تو گویا وہ ناقص تعلیم سے چمٹا ہوا ہے اور قوم کی مجموعی ترقی میں حصہ دار نہیں، لہٰذا اسے ترقی کے وہ مواقع بھی نہیں مل سکتے جو تعلیم کے مجموعی مقاصد کی تکمیل کی صورت میں ملتے ہیں اور نتیجتاً وہ حلقہ پسماندگی اور پستی کا شکار رہے گا۔ سرسید نے انھیں خطوط پر غور کرنے کے بعد تعلیم کے پہلوؤں کا جس طرح احاطہ کیا ہے وہ اس بات کا غماز ہے کہ ان کے ذہن میں تعلیم کا ایک ایسا وسیع اور جامع تصور تھا جس کو حاصل کر کے اقوام اپنے پیروں پر کھڑی ہوتی ہیں اور اپنے دور کی محافظ بھی خود ہی ہوتی ہیں۔

سرسید نے تعلیم کا جو خاکہ مرتب کیا تھا اس کو صرف دعوت کی حد تک محدود نہ رکھا بلکہ اس کے لیے ذہنوں کو تیار کرنے اور رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے "تہذیب الاخلاق" کا اجرا کیا جس کے مضامین نے قوم کے دردمندوں اور مخلصین کے ذہنوں کو جھنجھوڑا اور سرسید کے اردگرد ان کے حامیین اور موافقین کی ایک جماعت اکٹھا ہو گئی۔ اپنی دعوت کو عملی شکل میں پیش کرنے کے لیے انھوں نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی۔ جہاں قوم کے بچے اپنے ماحول سے الگ ہو کر تعلیم و تربیت حاصل کریں۔ وہ تعلیم و تربیت جوان کو باوقار شہری کی زندگی گزارنے کے ساتھ جدید دور کے مسائل سے برد آزما ہونے کا حوصلہ دے سکے اور ان کو جمود و تعطل کے تعفن سے نکال کر حرکت و حیات کے پُر بہار ماحول میں لے آئے، جہاں تقلید پرستی اور تعصب و تنگ نظری کے ماحول سے نکال کر ان کو جدید دور کی علمی ترقیات، سائنسی

انکشافات، تہذیبی ارتقاء اور عقل و ذہن کی وسعتوں سے آشنا کرایا جاسکے۔ جہاں مذہب کو تہذیب جدید سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں ہوں نہ کہ تصادم و ٹکراؤ کا رویہ اپنایا جائے۔ یہ ادارہ جہاں تعلیم و تربیت کو یکساں طور پر ملحوظ رکھا گیا تھا بنیادی طور پر جن اہم خصائص سے متصف تھا، ان میں جمود و تعطل اور تقلید رسوم کے برخلاف ارتقاء، وسعتِ قلب و نظر اور حرّیت فکر کی روح رچی بسی تھی۔ لیکن یہ حرّیت مطلقہ نہیں تھی بلکہ اخلاقی ضابطوں کی پابند حرّیت تھی۔ اس میں کسی بھی مذہب و مسلک سے متعلق ہو، یہاں تعاون و تسامح کے جذبہ کو عملی شکل دی گئی تھی اور ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندو اور مسلمان کو وطنِ عزیز کی دو خوبصورت آنکھوں کی عملی تعبیر پیش کی گئی تھی۔ اس کی تعلیمی پالیسی ہی یہ تھی کہ قوم کے بچے مغربی اور مشرقی علوم کو یکساں طور پر پڑھیں اور مجموعی ترقی میں ترقی یافتہ اقوام کے شانہ بشانہ چلنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں۔ ادارہ کے انتظامی امور میں اجتماعی زندگی گزارنے کی تربیت دینے اور قوم کے بچوں کو جہالت کے ماحول سے محفوظ رکھنے اور ان کو اخلاقی تربیت دینے کی غرض سے خصوصی طور پر اقامتی زندگی کا نظم انتہائی اہم نظم تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ادارہ کی مجموعی تعلیمی پالیسی کے تحت زیر تعلیم بچوں کی تربیت ادارہ ہی کے ماہر اور مخلص اساتذہ کے ذریعہ کرائی جائے۔ اور بچہ جب فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو اس کے پاس محض ڈگری ہی نہ ہو بلکہ وہ ایک مثالی شہری اور قوم و وطن کا ایک ذمہ دار فرد ہو کر نکلے۔ گویا سرسیّد کا قائم کردہ یہ ادارہ محض درسگاہ ہی نہیں بلکہ کردار سازی اور انسانیت کا درس دینے والے ایک ایسے مرکزی ادارہ کی شکل میں پروان چڑھا کہ نہ صرف قوم کو تعلیمی میدان میں ترقی کے مواقع ملے بلکہ رفتہ رفتہ یہ تہذیبی، لسانی، معاشرتی اور علمی تحریکوں کا مرکز بن گیا اور ان تمام تحریکوں میں ایک چیز بہرحال مشترک رہی ہے اور وہ ہے "وسعتِ ثقافت"

سرسیّد کے نزدیک قوم کی زبوں حالی اور پستی کا واحد علاج تعلیم و تربیت میں پنہاں ہے۔ وہی قوم ذلیل و خوار ہوتی ہے جس نے جہالت کی زندگی کو اپنا رکھا ہے اور دین و مذہب کے نام پر اوہام و خرافات اور رسوم کی پابندیاں ان کا شعار

بن چکی ہیں۔ جس سے افراد کے ذہنوں کے دریچے بند ہو گئے ہیں۔ جبکہ ترقی ایک حالت سے بہتر حالت کی جانب مسلسل منتقلی کا نام ہے۔ کہ صدیوں قبل کی اس تہذیب سے جکڑے رہنے کا نام جو اپنے وقت میں ترقی یافتہ اور جدید ترین شکل تھی لیکن اب رفتارِ زمانہ کے ساتھ قدیم اور فرسودہ ہو چکی ہے۔ ہماری قوم کا المیہ یہ ہے کہ ہر قدیم چیز سے چپٹے رہنا اور ہر جدید چیز سے نفرت اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ حالانکہ نہ تو دنیاوی ترقی کے اصول اس کی تصدیق کرتے ہیں نہ قانونِ فطرت اور نہ مذہبی اقدار و روایات، کہ اسلام خود تقلید پرستی کا زبردست مخالف، ترقی کا علمبردار اور علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنے کی ہمت افزائی کرتا ہے، اور اس سلسلہ میں اس کا رویہ اتنا فراخ دلانہ ہے کہ وہ ہر حکمت کو خواہ وہ کہیں بھی ہو، مومن کے گمشدہ شئے سمجھتا ہے۔ سرسید نے اس تحریک کے ذریعہ اسلام کی عطا کردہ اسی حکمت سے کام لیا اور مہذب اقوام کی نفع بخش اور مفید باتوں کو اپنا لینے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔ سرسید پر یہ الزام کہ وہ اس تحریک کے ذریعہ انگریزوں کی کورانہ تقلید کی دعوت دے رہے تھے، بے بنیاد ہے۔ انھوں نے اگرچہ نامہذب اقوام کو تہذیب یافتہ اقوام کی پیروی کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے لیکن ساتھ ہی اندھا دھند اور تقلیدِ محض کے نقصانات سے بھی قوم کو آگاہ کیا ہے۔ چنانچہ اپنے ایک مضمون "مہذب قوموں کی پیروی" میں واضح الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہم بلاشبہ اپنی قوم کو اپنے ہم وطنوں کو سولائزڈ قوم کی پیروی کی ترغیب کرتے ہیں۔ مگر ان سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ان میں جو خوبیاں ہیں، اور جن کے سبب وہ معزز اور قابلِ ادب سمجھی جاتی ہیں، اور سولائزڈ شمار ہوتی ہیں ان کی پیروی کریں نہ ان باتوں کی جو ان کے کمال میں نقص کا باعث ہیں۔" ؎

ان کا خیال ہے کہ ایسی کورانہ تقلید سے بجائے فائدہ الٹا نقصان ہوتا ہے۔

"اور جس قدر ہم نامہذب ہوتے ہیں، اس سے زیادہ ناشائستہ ہو جاتے ہیں۔" ؎

سرسید کے پورے اصلاحی اور تعلیمی مشن اور اس کی کامیابی کا راز ان کے

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

خلوص، شجاعت، صراحت اور تعاون و تسامح کی خصوصیات میں مضمر ہے۔
انھوں نے جو تعلیمی پالیسی مرتب کی تھی اور قوم کی اصلاح کے سلسلہ میں جو رائے قائم کی تھی اس پر پوری جرأت اور اخلاص سے عمل کیا اور اس سلسلہ میں مخالفین کی مخالفت سے نہ دل برداشتہ ہوئے اور نہ انتقامی جذبات کو اپنے اندر پنپنے دیا۔ ان کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ضمیر کا سودا کبھی نہیں کیا۔ اور جس بات کو قوم کے لیے بہتر و نفع بخش سمجھا، لاکھ مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کے باوجود اس کو صراحت سے پیش کرنے میں جھجک محسوس نہیں کی۔ انگریزوں کی اچھی باتوں کو سراہا تو ان کی غلطیوں کی گرفت بھی کی، اپنی قوم کی خوبیوں کا اعتراف کیا تو ان کی پسماندگی اور جہالت پر تنقید بھی کی۔ عام طور پر مصلحین یا تو اتنے مثالی افکار و نظریات پیش کرتے ہیں کہ ان کا عملی دنیا سے ہم آہنگ ہونا محال ہوتا ہے اور یا صرف زبانی جمع خرچ کرتے اور عملی دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔
لیکن سرسید عملی مصلح تھے انھوں نے جو بھی نظریات پیش کیے ان کو عملی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جو ان کی تحریک کی کامیابی کا بنیادی سبب ہے۔ اسی کے ساتھ سرسید کی تحریک اس حیثیت سے بھی انفرادی حیثیت رکھتی ہے کہ انھوں نے اپنے ارد گرد مخلصین اور ہمنواؤں کی ایک ایسی جماعت اکٹھا کر لی تھی جس نے ان کی تحریک کی روح کو بعد تک باقی رکھا اور انھیں خطوط پر ادارہ کو پروان چڑھایا جن پر سرسید نے اس کو قائم کیا تھا۔ عام طور پر تحریکیں اپنے بانیین کے بعد تاریخ کا حصہ بن جایا کرتی ہیں اور ضرورت باقی رہنے کے باوجود بعد کے جانشینوں کے عدم اخلاص کا شکار ہو جاتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ مرورِ ایام کے ساتھ ان تحریکوں کی وہ افادیت بھی باقی نہیں رہ جاتی، کیونکہ جن مخصوص حالات میں کسی تحریک کا وجود ہوتا ہے، حالات کے تغیر سے تحریک کی معنویت بھی ختم ہو جاتی ہے لیکن بعض تحریکات ایسی اصولی ہوتی ہیں کہ وہ تسلسل کی متقاضی ہوتی ہیں۔ سرسید تحریک کی روح بھی چونکہ ارتقاء اور انسان کی بنیادی ضرورت تعلیم و تعلّم ہے اور علم میں روز افزوں اضافہ و ترقی ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس کی افادیت کسی مخصوص زمانہ یا حالات پر منحصر نہیں بلکہ

علمی ترقی کے تسلسل کے ساتھ ساتھ یہ اصولی تحریک بھی تسلسل کا تقاضا کرتی ہے اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی یا اہمال اس کو اسی جمود و تعطل کا شکار بنا دے گا جس جمود کو توڑنے کے لیے سرسید نے اس تحریک کو برپا کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

(ماخوذ۔ تہذیب الاخلاق، علیگڑھ۔ اکتوبر نومبر ۱۹۹۴ء جلد ۱۳ شمارہ ۱) —

حوالے:

۱؎ "تعلیم و تربیت" مقالاتِ سرسید ص۱۸ ۲؎ "کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے" مقالات سرسید ص۶۱

۳؎ "تعلیم" مقالات سرسید ص۵ ۴؎ "تعلیم تربیت" مقالات سرسید ص۸

۵؎ حوالہ مذکورہ ص۸ ص۸۱ ۶؎ ملاحظہ ہو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم،

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن حیث وجدہا فھو احق بھا۔" (ترمذی، ابواب العلم)

۷؎ مہذب قوموں کی پیروی مقالاتِ سرسید ص۶۷ ۸؎ حوالہ مذکورہ ص۶۶

أمرُّ على الديارِ ديارِ ليلى
أقبّلُ ذا الجدارَ وذا الجدارا
وما حبُّ الديارِ شغفنَ قلبي
ولكن حبُّ من سكنَ الديارا

(ترجمہ) میں لیلیٰ کے شہر پر گزرتا ہوں تو اس (شہر) کے در و دیوار کو اور اس کے شہر والوں کو پیار کرتا ہوں کچھ شہر کی محبت نے میرے دل کو فریفتہ نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کی کارفرمائی ہے جو شہر کے رہنے والے ہیں

انجم اعظمی

علی گڑھ

مرکزِ علم و ہنر میکدۂ سوز و ساز — سجدۂ شوق سے آباد ہے رندوں کا حرم
جام در جام ہے صہبائے جنونِ حکمت — دیکھنا ہو تو کوئی دیکھ لے ساقی کا کرم
میکساری کا یہ انداز نہ دیکھا ہم نے — سب کے دُکھ درد کا احساس نشے کا عالم
ایک ہی آگ سے ہر روح جلا پاتی ہے — ہوگئے ایک ہی شعلے میں شرارے مدغم
اپنے ہر درد کی تحریک کا آئینہ لئے — پھر اُٹھاتا ہے علی گڑھ نئی دنیا میں قدم

راہِ دشوار میں اک قافلۂ نکہت و نور
سنگِ خارا کی چٹانوں کے مقابل ہے کھڑا
ٹوٹ جائے گا بہت جلد طلسمِ امروز
نُورِ فردا کے تبسّم میں بدل جائے گا

۵

سرسیّد اور عالمِ اسلام

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

وامق جونپوری

مسلم یونی ورسٹی کی آواز

اے وطن تیرے لئے باعث توقیر ہیں ہم
خوابِ سر سید مرحوم کی تعبیر ہیں ہم

جس کا خاکہ لیے پھرتا تھا مصور کا خیال
آج صد رنگ بہ منظر وہی تصویر ہیں ہم

بخش دیتا ہے جو گلشن کو حیاتِ جاوید
ایسے اک پھول سے مہکی ہوئی تعمیر ہیں ہم

جس کی جھنکار ہے ویرانوں سے ایوانوں تک
حلقہ ہائے فن و دانش کی وہ زنجیر ہیں ہم

جو من المہد الی اللحد دکھائے رہ علم
آیۂ شوق کی وہ معنوی تفسیر ہیں ہم

خود آگہی فکر کی دی حالی و شبلی نے ہمیں
کیسے کیسے مہ و خورشید کی تنویر ہیں ہم

جس زباں کو نہیں ملتی کہیں اب جائے پناہ
اب بھی پہلے کی طرح اس سے بغل گیر ہیں ہم

جنگ انسانیت و ظلم کے ہر میداں میں
سینۂ ظلم پہ چلتی ہوئی شمشیر ہیں ہم

رنگ اور نسل کا ہر فرق مٹانے کے لیے
رزم گاہِ حق و باطل میں عناں گیر ہیں ہم

اپنی آزادیٔ آئین و نظر کی خاطر
چشم بد بیں میں کھٹکتا ہوا اک تیر ہیں ہم

قوم کے قصۂ فردا کا جو عنوان ہے وہ
وقت کے ماتھے پہ لکھی ہوئی تحریر ہیں ہم

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

محمد احمد سبزواری

علیگڑھ اور بھوپال

ڈاکٹر رضیہ حامد قابلِ صد ستائش ہیں کہ جو کام کسی علیگرین کو کرنا چاہیئے تھا انھوں نے اس کا بیڑا اٹھایا۔ گو سرسید علیہ الرحمۃ، علیگڑھ اور علیگڑھ یونیورسٹی کے اکابرین جیسے نواب محسن الملک نواب وقار الملک، سرسید راس مسعود، ڈاکٹر ضیاء الدین اور علیگڑھ کے مامور سپوتوں پر کتابوں مقالوں، اور مضامین کی کوئی کمی نہیں مگر ایسے مجموعے کی سخت ضرورت تھی جس میں اس عظیم درسگاہ اور اس کے بانیوں کی خدمات اور کارناموں کو یکجا طور پر پیش کیا جائے تاکہ نئی نسل کو اپنے اسلاف کی کاوشوں سے روشناس کرایا جا سکے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد جو اپنے جریدہ "فکر و آگہی" کے خصوصی نمبروں اور خصوصاً بھوپال نمبر سے علمی و ادبی حلقوں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔ توقع ہے کہ اس موضوع سے بھی پورا انصاف کریں گی

(محمد احمد سبزواری)

(۱)

اسرار الحق مجاز (علیگ) نے اپنی ایک طویل نظم "میرا چمن" نذر علی گڑھ کی ہے جس میں علی گڑھ کی شوکت، عظمت، منزلت اور محبت کے گن گاتے ہوئے یہ بھی کہا،

ع اس فرش سے ہم نے اڑ اڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں

یہ حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں علی گڑھ برصغیر کے مسلمانوں کا مکہ بن چکا تھا، نہ صرف بنگال، بہار، دکن، مدراس، پنجاب، سرحد بلکہ افغانستان اور

سری لنکا سے بھی مسلمان بچے اس علمی چشمے سے سیراب ہونے کے لیے آتے اور ایک مکمل اور شائستہ انسان بن کر اپنے وطن واپس لوٹتے اور اپنی مادرِ علمیہ کا نام روشن کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں بھوپال کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، اول تو اس ادارے کے قیام ہی سے اس کے روابط بھوپال سے قائم ہوگئے تھے، پھر ان رشتوں سے جن کا ذکر آگے آئے گا یہاں علیگیوں کی آمد کا سلسلہ ابتدا ہی سے شروع ہوگیا تھا، نیز یہاں کا ایک ہائی اسکول کافی عرصہ علی گڑھ سے ملحق رہا۔ چنانچہ یہاں کے ۸۰ فی صد ہندو اور مسلمان طلبا اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ ہی کا رُخ کیا کرتے تھے۔ آبادی کے تناسب سے جتنے علیگیرین سابق ریاست بھوپال میں ہوا کرتے تھے اتنے اور کسی علاقے میں نہیں ملیں گے۔

بھوپال سے علی گڑھ کے روابط کافی پرانے ہیں، ۱۸۵۷ء میں یہاں نواب سکندر جہاں بیگم رئیس تھیں، یہ بڑی بیدار مغز خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے آبائی پٹھانوں کے غیر منظم جاگیرداری علاقے کو نظم و نسق کے ذریعہ ریاست کی شکل دی۔ قوانین نافذ کیے، ریاست حیدرآباد سے گیارہ سال پہلے ۱۸۵۹ء میں فارسی کے بجائے اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان بنایا، دہلی کی جامع مسجد جو ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد اولاً انگریزی رسالے کا اصطبل رہی اور پھر اس کو مقفل کردیا گیا تھا۔ انھوں نے اس کو کھلوا کر نماز ادا کی اور بازیابی کی کارروائی کرکے مسلمانوں کے سپرد کرائی۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق کہ سرسید احمد خاں (مدرستہ العلوم کے بانی) مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی (مدرسہ دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے بانی) اور منشی جمال الدین مدار المہام ریاست بھوپال (وزیر اعظم، مدرسہ جمالیہ کے بانی اور اس کے جملہ اخراجات کے کفیل) یہ چاروں اصحاب ایک ہی استاد حضرت مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے، لہٰذا رئیسہ بھوپال سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، تہذیب الاخلاق اور مدرسے کے قیام سے واقف تھیں اور انھوں نے سرسید کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے الماس کی ایک قیمتی انگوٹھی ارسال کی جس کو سرسید نے جلسہ عام میں سوسائٹی کے فنڈ میں دینا چاہا مگر دوستوں کا اصرار مانع رہا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے حیاتِ جاوید میں اس کا تذکرہ کیا ہے[1]

[1] فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نواب سکندر بیگم کے بعد ان کی بیٹی نواب شاہجہاں بیگم نے اس تعلق کو قائم رکھا بلکہ وہ سائنٹفک سوسائٹی کی سرپرست بننے پر بھی آمادہ ہوگئی تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سرسید کی بڑھتی ہوئی شہرت نے ان کے مخالفین کا دائرہ بہت وسیع کردیا تھا بقول مولوی عبدالحق "سید احمد خان اس زمانے میں مسلمانوں کے ہر طبقے میں موضوع بحث تھے ان کی نسبت کفر و الحاد کا فتوئی تو عام تھا مولوی صاحبان اس ذکر عزیز کو اپنے وعظوں، بحثوں، تحریروں اور تقریروں میں طرح طرح سے مزے لے لے کر بیان کرتے اور تخیل کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیتے، سامع اور معتقدین ان باتوں پر اپنی طرف سے خوب خوب حاشیے چڑھاتے، کوئی کہتا گردن مروڑی مرغی کھاتا ہے، حلال حرام میں کوئی فرق نہیں کرتا، کوئی کہتا اس نے اپنا سر بیچ دیا ہے، مرنے کے بعد اس کا سر انگریز لے جائیں گے"[1] اس پر کے سی ایس آئی کا خطاب سونے پر سہاگہ، کچھ حلقوں میں نیچری اور وہابیت کے الزام بھی تھے، اس زمانے میں منشی جمال الدین کا انتقال ہوچکا تھا، نواب صدیق حسن خاں سے رئیسہ کا عقد ثانی ہوچکا تھا۔ موصوف ولی اللہی جماعت کے ہم نوا تھے، مگر بالاکوٹ کے حادثے کے بعد ۱۲۴۰ھ میں جماعت دو طبقوں میں بٹ گئی تھی، ایک مولانا ولایت علی صادق پوری کی سربراہی میں جو صادق پوری کہلاتی تھی، نواب صاحب بھی اسی پارٹی کے ہمنوا تھے[1] دوسری دہلوی جماعت شاہ محمد اسحاق کو اپنا امام مانتی تھی، گو سرسید سکہ بند وہابی تھے مگر اس وقت بھوپال میں خود وہابیت کا دور دورہ تھا اس لیے اس الزام کی کوئی اہمیت نہ تھی مگر کفر و الحاد کے فتووں نے رئیسہ کو سرسید سے بدگمان کردیا تھا سنہ ۱۸۹۰ء میں نواب صدیق حسن خاں کا انتقال ہوگیا ان کے بڑے بیٹے سید علی حسن خاں جو ریاست میں ڈائرکٹر تعلیمات تھے سرسید کے بڑے معتقد تھے۔ چنانچہ ان ہی کے ایما پر سرسید اپنے رفقاء کے ہمراہ یکم ستمبر ۱۸۹۱ء کو بھوپال پہنچے اور ان ہی کوششوں سے منشی سید امتیاز علی سنئے مدار المہام کی معیت میں بیگم صاحبہ سے جو اب پردہ کرنے لگی تھیں، ملاقات ہوئی جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ سرسید کو ٹانگوں کے درد کی وجہ سے سیڑھیاں چڑھ کر

---

[1] جاگرو آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اوپر آنے میں تکلیف ہوگی تو انھوں نے باغ کی بارہ دری میں ملاقات کا انتظام کرایا اور محل کے دروازے سے بارہ دری تک آنے کے لیے پالکی کا اہتمام کرایا۔ ڈاکٹر محمد نعمان کے مطابق اس ملاقات کی تفصیل ۱۱ اکتوبر ۱۸۹۱ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے[۲۷] اس ملاقات میں سرسید نے مدرسۃ العلوم کی تفصیل بتائی، رئیسہ کی بدگمانی دور ہوئی اور دوسرے روز انھوں نے بارہ ہزار روپے مسجد کی تعمیر کے لیے بھجوائے[۲۸] سرسید نے اس عطیہ کا شکریہ گیارہ شعر کی ایک فارسی نظم میں ادا کیا۔ سرسید علی حسن خاں کو کالج کا ٹرسٹی بھی بنانا چاہتے تھے اور وہ کچھ رقم بھیجا بھی کرتے تھے جب ۱۸۹۵ء میں انگریزی دفتر کے ہیڈ کلرک شام بہاری لال نے ایک لاکھ ستر ہزار کا غبن کیا تب بھی انھوں نے علی حسن صاحب سے امداد کی استدعا کی اور سرکار سے بھی امداد کی خواہش کی اور سرکار عالیہ کی جانب سے ایک ہزار روپے کی امداد ہوئی[۲۹] ڈاکٹر نعمان نے سرسید اور مولوی علی حسن خاں کے درمیان ۲۰ نومبر ۱۸۹۰ء سے ۲۴ جولائی ۱۸۹۷ء تک لکھے جانے والے ۲۴ مطبوعہ خطوط کا ذکر بھی کیا ہے جس سے ان دونوں حضرات کے مابین تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے*

نواب شاہجہاں بیگم کے بعد ان کی بیٹی نواب سلطان جہاں بیگم رئیس ہوئیں۔ انھوں نے تو شروع ہی سے اس ادارے کی ترقی اور نمو کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں، انھیں تعلیم سے خصوصی دلچسپی تھی، ان کے دو بڑے بیٹوں کی تعلیم تو نجی اساتذہ کے ذریعہ ہوئی مگر انھوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کو بھوپال کے الکزنڈرا ہائی اسکول میں داخل کرایا اور جب انٹرینس میں داخلے کا سوال ہوا تو انھوں نے اندور کے چیفس کالج جہاں سنٹرل انڈیا کی ریاستوں کے رئیس بچے داخلے لیا کرتے تھے، پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا " میں چیفس کالجوں کو بہت پسند کرتی ہوں، لیکن میں ان کے موجودہ نصاب و طریقۂ تعلیم کو مفید نہیں سمجھتی ان کا نصاب بہتر معیار پر نہیں، بہتر اور مفید نصاب کے ساتھ ان کو اپنے لیے ایک علاحدہ یونیورسٹی کی بھی ضرورت ہے[۳۰] آگے چل کر وہ لکھتی ہیں " بالآخر میری یہ رائے قرار پائی کہ ہندوستان

۱ دیکھیے ___ (ادارہ)

رسالہ فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

میں مسلمان طلبا کے لیے محمڈن کالج علی گڑھ سے بہتر اور کوئی کالج نہیں جس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمان طلبا کے مذہب، ان کی قومیت اور برٹش سلطنت کے ساتھ خیالات وفاداری کی نشو ونما ہوتی ہے اور جو مسلمانانِ ہند کی آئندہ ترقیوں اور امیدوں کا مرکز ہے۔ اسی بنا پر حمید اللہ خاں کو انٹرنس کلاس کی تعلیم کے لیے کالجیٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا، ان کے قیام کے لیے مولوی سمیع اللہ خاں کی کوٹھی حاصل کی گئی اور سی ایچ پین کو گارجین مقرر کیا گیا۔"[۸]

۱۹۱۰ء میں انھوں نے کالج کے معائنے کے لیے علی گڑھ کا سفر کیا، مسجد میں جا کر سر سید، نواب محسن الملک، سید محمود اور مولوی سید زین العابدین خاں کے مزاروں پر فاتحہ پڑھی۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ہنوز مسجد نا تمام اور غیر مکمل ہے۔[۹]

جب کالج کو یونیورسٹی بنانے کی بات شروع ہوئی تو ہز ہائنس آغا خان کو جو اس منصوبے کے لیے چندہ جمع کر رہے تھے ایک لاکھ روپیہ دیا۔[۱۰]

۱۹۱۰ء میں ہی سرکار نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شعبۂ تعلیم نسواں کے اجلاس کی دہلی میں صدارت کی، جہاں شیخ عبداللہ آنریری سکریٹری نے اپنی مفصل اور مبسوط رپورٹ سنائی، مشہور شاعرہ اور مقرر مسز نائیڈو، مسز سرلا دیبی چودھرانی بی اے اور شبلی نعمانی وغیرہ نے تقریریں کیں۔ مسز نائیڈو کی تقریر ہر اعتبار سے عمدہ اور ان کا طرزِ بیان بھی دلنشین تھا۔[۱۱]

جس زمانے میں علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کا مسئلہ درپیش تھا تو اس وقت سب سے بڑا سوال روپے کا تھا، جس کے لیے پورے ملک میں چندہ جمع کرنے کی مہم چلائی جا رہی تھی۔ چنانچہ سرکار نے اپنی لٹریری سکریٹری آبرو بیگم کو جو مولانا ابو الکلام آزاد کی ہمشیرہ تھیں اور لیڈیز کلب بھوپال کی سکریٹری تھیں حکم دیا کہ اس مقصد کے لیے خواتین کا ایک جلسہ منعقد کیا جائے، خود سرکار نے اس میں شرکت کی اور بڑی پرزور اپیل کی یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس میں کتنا چندہ جمع ہوا۔

مسلم یونیورسٹی کا قانون یکم دسمبر ۱۹۲۰ء میں نافذ ہوا اور اس کی پہلی چانسلر نواب سلطان جہاں بیگم منتخب ہوئیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی خاتون تھیں جنھیں چانسلر بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ۱۹۲۳ء ان کی زیرِ صدارت یونیورسٹی

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کا پہلا جلسہ ہوا جس میں گوشے گوشے سے محبانِ علی گڑھ نے شرکت کی اور انھوں نے یونیورسٹی کو ایک لاکھ روپیہ دیا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی عمارت سلطان جہاں منزل کا افتتاح تو وہ ۱۹۱۶ء میں کر چکی تھیں مگر چانسلر ہونے کے بعد وہ ہر کانوکیشن کی صدارت کے لیے علیگڑھ آیا کرتی تھیں۔ ۱۹۲۵ء میں جوبلی کے سلسلے میں ایک اعلیٰ درجے کے پنڈال کی تیاری اور کوئی سات ہزار مہمانوں کے خیموں کی فراہمی اور تنصیب کا کام افسران ریاست بھوپال کے سپرد کیا۔ الحاج محمد زبیر جو ۴۲ سال کے طویل عرصے میں اسسٹنٹ لائبریرین اور لائبریری سائنس کے لیکچرر رہے۔ دسمبر ۱۹۲۲ء کے پہلے جلسے کے متعلق لکھتے ہیں: "اسٹریچی ہال میں، بیگم صاحبہ ایک زرنگار کرسی پر تشریف فرما تھیں چہرے پر برقع کا نقاب سایہ کیے ہوئے تھا، اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر ایجاد نہیں ہوا تھا پھر بھی ان کے خطبے کا ہر ہر لفظ صاف طور پر سنائی دے رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک انھوں نے خطبہ بہ زبان اردو ارشاد فرمایا جو شروع سے آخر تک علم نوازی، علم دوستی اور تعلیمی افکار و مسائل سے متعلق زریں خیالات سے معمور تھا۔"[۱۲] وہ مزید لکھتے ہیں "جس کانوکیشن کی صدارت یونیورسٹی کی چانسلر ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال فرماتیں اس کی شان و عظمت اور بڑھ جاتی تھی وہ پرشکوہ ڈائس پر ایک زرنگار کرسی پر متمکن ہوتیں، چانسلر کی زریں گون ان کے زیب تن اور تاج شاہی زیب سر ہوتا۔ اس وقت ان کی فرماں روائی حاضرین کے دلوں پر ہوتی تھی۔"[۱۳]

اب ہر ہائنس کی علی گڑھ کے آخری سفر کی روئداد سنئے:

"اب میں سائنس کالج کے سنگ بنیاد رکھنے نصراللہ خاں ہوسٹل کے افتتاح اور پانچویں کانوکیشن کا آنکھوں دیکھا حال اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔ یہ تینوں تقریبات ۱۴۔۱۵ نومبر ۱۹۲۶ء کو صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے عہد وائس چانسلری میں ہوئیں۔ ان میں شرکت کے لیے بڑی تعداد میں مہمان آئے تھے۔ یوں تو ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال کانوکیشن کی صدارت کے لیے تشریف لاتی ہی رہتی تھیں، لیکن اس بار ان کی تشریف آوری کی ایک غرض نصراللہ ہوسٹل کا افتتاح کرنا بھی

تھا جوان کے صاحبزادے نصر اللہ خاں مرحوم کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا، ان کے ہمراہ اعلیٰ
حضرت نواب حمید اللہ خاں بھی تھے (جو اپنی والدہ کی دستبرداری کے بعد رئیس ہو چکے
تھے) ان دونوں جلیل القدر ہستیوں کا بڑا شاہانہ استقبال ہوا۔۔۔۔اس موقع
پر جوبلی گراؤنڈ میں ایک شاندار پنڈال تعمیر کیا گیا جس میں پانچواں کانوکیشن
ہر ہائنس چانسلر کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال
کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا، نواب صاحب نے جوابی تقریر فرمائی اور
دو لاکھ روپے عطیہ دینے کا اعلان کیا، اس تقریب کے بعد اعلیٰ حضرت نے
کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ ایک دن طلبا کے ساتھ کرکٹ میچ کھیلا اور کالج
میں اپنے کرکٹ کپتان ہونے کی یاد زندہ کر دی۔"

"ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال جب نصر اللہ ہوسٹل کا افتتاح کرنے تشریف
لے گئیں تو وہاں لوگوں نے بڑی عقیدت واحترام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔
وہ بڑا پُر اثر منظر تھا۔ ایک ماں اپنے مرحوم بیٹے کی یادگار کا افتتاح کرنے آئی تھیں
پہلے ان کی خدمت میں ایڈریس پیش ہوا، اس کے بعد انھوں نے افتتاح کی رسم
ادا فرمائی۔ ایڈریس کا جو فاضلانہ جواب انھوں نے دیا اس کے یہ چار ٹکڑے تعلیمی
تاریخ کے ہمیشہ روشن باب رہیں گے۔

"حضرات! اینٹ اور گارے، چونے اور پتھر کی رفیع الشان عمارتیں بلاشبہ
جاذبِ نظر ہوتی ہیں لیکن ان کی حقیقی شان اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب
ان کے اندر کیے ہوئے کاموں کے شاندار نتائج ظاہر ہوں، دنیا کی کوئی عمارت
حجرہ نبویؐ کی خام دیوار اور نیچی چھت سے زیادہ شاندار نہیں، یہ وہ مقدس عمارت
تھی جہاں سے علم وفضل کے دریا موجزن ہوئے اور ان سے وہ برقی قوت حاصل
ہوئی کہ بحر و بر منور ہو گئے۔

"مجھے عمر کی ستّر ویں منزل پر پہنچ کر سب سے بڑی تمنا اور سب سے بڑی آرزو
یہی ہے کہ اس دارالعلوم کو نہ صرف ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ممتاز دیکھوں
بلکہ وہ دنیا کی یونیورسٹیوں میں بھی خاص امتیاز رکھتی ہو۔

"مجھے اس خبر سے بھی بڑی مسرت ہوئی کہ مولوی سبحان اللہ خاں صاحب

ے ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

رئیس گورکھپور نے اپنا مشہور اور نادر کتب خانہ یونیورسٹی کو عطا کر دیا میں ان کا دلی شکریہ ادا کرتی ہوں۔

"حضرات! یونیورسٹی شاندار ایوانوں، سر بہ فلک عمارتوں اور رفیع الشان بورڈنگ ہاؤسوں کا نام نہیں، نہ یونیورسٹی ہر سال ہزاروں طلبا کو ڈگری ہولڈر بنانے کے کارخانے کو کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو مطلع العلوم ہونا چاہیئے جس سے علم کا نور دنیا میں پھیلے اور جہالت کی ظلمت و تاریکی دور ہو۔"[۱۴]

اس موقع پر بیگم صاحبہ کے منجھلے بیٹے کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جب ڈاکٹر ضیاء الدین نے اپنے وائس چانسلری کے دور میں یونیورسٹی میں سائنس اور صنعتی تعلیم کا منصوبہ بنایا تو انھوں نے من جملہ اور رؤسا کے ہر ہائی نس کے منجھلے بیٹے جنرل محمد عبید اللہ خاں کی بھی توجہ اس طرف مبذول کرائی، گو یہ فوجی اور کاروباری آدمی تھے مگر ان کو تعلیمی کاموں سے بڑا شغف تھا، بھوپال میں تعلیمی وظائف کے لیے عبید اللہ خاں اسکالرشپ ٹرسٹ قائم کیا، علامہ شبلی کو سیرۃ النبی کی تصنیف کے سلسلے میں حوالے کی کتابیں خریدنے کے لیے عطیہ دیا اور یونیورسٹی کو بھی ٹاٹا کے حصص کی صورت میں ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔[۱۵]

ہر ہائی نس بیگم بھوپال کے تیسرے اور سب سے چھوٹے بیٹے پرنس حمید اللہ خاں نے اپنی والدہ کی منشا کے مطابق کوئی پانچ سال علی گڑھ میں گزارے اور بی اے کی ڈگری حاصل کی، قانون میں بھی داخلہ لیا مگر اس کو مکمل نہ کر سکے، ان کی کوٹھی پر طلبا کا جمگھٹا رہتا تھا، انھوں نے کالج اور کرکٹ کے میدان میں بہت سے دوست بنائے اور ان کے بہت سے دوست اور ساتھی ان کے ایما پر ان کی والدہ کے عہد میں اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہوتے رہے، جس کا سلسلہ ان کے دور میں بھی چلتا رہا، ہمیشہ سے دوست نواز تھے، علی گڑھ میں ان کی زندگی اور دوستی کا عکس دیکھنا ہو تو "ذکر علی گڑھ" میں خان بہادر حکیم احمد شجاع کا مضمون دیکھیے۔

ہر ہائی نس نے ریاست سے دست برداری کے کچھ عرصے بعد چانسلری سے بھی استعفیٰ دے دیا اور نواب حمید اللہ خاں کو اپنی مادر علمیہ کا چانسلر منتخب کیا گیا۔

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مگر اس سے پہلے ۱۹۲۷ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر اور ڈاکٹر ضیاء الدین پرو وائس چانسلر تھے۔ صاحبزادے صاحب کی جانب سے ایک پمفلٹ شائع ہوا جو نہ صرف ممبران کورٹ بلکہ ملک کے دوسرے اکابرین کو بھی بھیجا گیا جس میں ڈاکٹر صاحب پر بعض الزامات عائد کیے گئے تھے، جب یہ تحریر ہز ہائینس کو ملی تو انھوں نے شکایات کی تحقیق کے لیے ایک کمیٹی سر ابراہیم رحمت اللہ اور دو ممتاز ماہرین تعلیم انگریزوں پر مقرر کی۔ یہ کمیٹی بھوپال آئی، ۸ر اکتوبر ۱۹۲۸ء کو ہز ہائی نس چانسلر سے ملی اور پھر علی گڑھ جاکر اپنا کام شروع کیا، کمیٹی کے دفتری کام کے لیے کارکن اور ٹائپسٹ ریاست نے فراہم کیے اور کمیٹی کے سترہ ہزار روپے کے اخراجات بھی سرکار نے اپنی جیب سے ادا کیے۔ کمیٹی کی رپورٹ پر ڈاکٹر ضیاء الدین مستعفی ہوگئے، اور سر سید راس مسعود وائس چانسلر منتخب ہوئے۔

۱۹۳۵ء میں وائس چانسلر کا انتخاب ہونے والا تھا اور آثار و قرائن سے ڈاکٹر صاحب کے دوبارہ منتخب ہونے کے قوی امکانات تھے چنانچہ نواب صاحب نے انتخاب سے ایک دن پہلے استعفیٰ دے دیا اور لارڈ ولنگڈن نے نظام حیدرآباد کو چانسلری قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا۔

یہاں ایک تاریخی واقعے کا ذکر بھی سن لیجیے۔ نواب بھوپال اور لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند میں کافی اچھے تعلقات تھے، دوسری جانب سر ہیری ہیگ گورنر یوپی اور ڈاکٹر صاحب کے اچھے روابط تھے، گورنر نے کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کو وائس چانسلری کا امیدوار بننے کی ترغیب دی مگر وہ راضی نہ ہوئے، تب گورنر نے لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کو اس جانب متوجہ کیا اور ان کے اصرار پر ڈاکٹر صاحب راضی ہوگئے۔ اب ان کی کامیابی یقینی ہوگئی اسی پر نواب بھوپال نے نہ صرف چانسلری سے استعفیٰ دیا بلکہ وائسرائے سے بھی ان کے تعلقات کشیدہ ہوگئے اور وہ وائسرائے سے الوداعی ملاقات کے لیے بھی نئی دہلی نہیں گئے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے دوران مساعی جنگ کے سلسلے میں نواب بھوپال نے نہ صرف صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کا دورہ کیا (کیونکہ ان کے آباء و اجداد کا تعلق اسی علاقے سے تھا) کئی مقامات پر فارسی میں تقریریں کیں جو مسلم یونیورسٹی کے

۱؎ فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

فارسی کے استاد ڈاکٹر ہادی حسن نے تحریر کی ہیں۔ شمالی افریقہ میں کیران کے محاذ پر بھی گئے بلکہ کیران کی فتح والے دن یہ وہیں تھے۔ ۱۹۴۳ء کے آخر میں ایروائس مارشل کی حیثیت سے علی گڑھ گئے اور ملکی وغیر ملکی فوجی افسران کی موجودگی میں ایروناٹیکل ورکشاپ کا سنگ بنیاد رکھا اور پچاس ہزار روپے کا عطیہ دیا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کی اولین پود کے سب سے پہلے گریجویٹ جو بھوپال آئے وہ غالباً ظفر عمر بی اے تھے۔ جو کچھ عرصے سلطان جہاں بیگم کے پرائیوٹ سکریٹری اور پرنس حمیداللہ خاں کے اتالیق رہے، بعد میں یوپی پولیس کے اعلیٰ افسر بنے۔ ان کی کتاب "نیلی چھتری" میں انھوں نے بہرام کی شکل میں ایک نیا کردار اردو میں روشناس کرایا جو عام ڈاکوؤں سے قطعاً مختلف تھا۔ یہ کردار اس قدر مقبول ہوا کہ بہرام کے کارناموں سے معمور درجنوں کتابیں بازار میں آنے لگیں۔ لاہور کے فضل بک ڈپو نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا حتیٰ کہ میری ایک کتاب بھی شائع کردی۔ ظفر عمر صاحب کی دوسری کتاب "لال کھنڈر" تو بھوپال کے علاقے سانچی ہی سے متعلق ہے جو "اونچی ٹوریاں لال کھنڈر، جس میں گڑے چھپن کروڑ" کی پرانی کہاوت کے گرد گھومتی ہے، ان کے خیال میں جس جگہ عہد اشوک کا سانچی اسٹوپا واقع ہے۔ وہاں ایک قیمتی خزانہ مدفون ہے اور تاریخ کی بیشتر لڑائیاں جو مالوے کے اس علاقے میں ہوئیں ان سب کا مقصد اسی انمول خزانے کو حاصل کرنا تھا۔

۱۹۰۳ء میں ریاست میں سکریٹریٹ کا قیام عمل میں آیا اس میں پانچ سکریٹری شامل تھے، ان میں تین علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے، اول عبدالصمد خاں بی اے یہ کوئٹہ کے رہنے والے تھے، پہلے جنرل عبیداللہ خاں کے ملٹری سکریٹری تھے، پھر ہر ہائی نس کے ملٹری سکریٹری ہوگئے۔ ہر ہائی نس کی خود نوشت سوانح کا انگریزی میں ترجمہ انھوں نے ہی کیا، بعد میں حیدرآباد چلے گئے اور صمد یار جنگ سے موسوم ہوئے۔ دوسرے سید لیاقت علی ایم اے ایل ایل بی تھے۔ یہ صاحب زادے حمیداللہ خاں کے اتالیق بھی رہے، یہ ایجوکیشنل سکریٹری تھے، بعد میں یہ مختلف عہدوں پر تعینات رہے اور عرصے تک مشیر المہام (وزیر) روبکاری خاص رہے۔

سے فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

شہر میں یہ ماسٹر لیاقت علی کے نام سے مشہور تھے۔ نواب صاحب ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کو نصیر الملک اور ریاست کا سب سے بڑا خطاب معتمد السلطان ملا۔ سر اسرار حسن خاں نصیر المہام کے بعد یہ ریاست میں دوسرے نائٹ تھے، سرکار کے ساتھ یہ ۱۹۲۶ء میں انگلستان بھی گئے تھے، شہزادی عابدہ سلطان کی شادی پر ریاست کے نمائندے کے طور پر ان کے ساتھ کوروائی بھی گئے ۱۹۴۷ء میں نواب صاحب کی سالگرہ پر جو آل انڈیا مشاعرہ ہوا اس کی صدارت انھوں نے ہی کی تھی اور خطبہ صدارت بھی دیا تھا۔ شادی نہیں کی، عمر بھر مجرّد رہے، ابتدا میں جب یہ بھوپال آئے تو منشی صدیق احمد منتظم پولیس کے گھر عرصے تک مقیم رہے منتظم صاحب کے بچے ان کو چچا میاں کہتے تھے اور یہ ان کے بچوں کو عمر بھر ظہور (خاتون ارشد) اور محمد عمر (شوکت تھانوی) کے نام سے پکارتے رہے، یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی تھے، بھوپال میں انتقال ہوا اور بڑے باغ کے طبقہ صالحین میں مدفون ہیں۔

تیسرے جوڈیشنل سکریٹری محمود حسن خاں بی اے (علیگ) تھے یہ یوپی کے ایک قصبے کے رہنے والے تھے (سر) سید رضا علی کے کلاس فیلو تھے، فٹ بال کے کھلاڑی تھے، گریجویشن کے بعد بھوپال آگئے۔ ہز ہائی نس نے ان کی شادی اپنے خاندان میں سردار اقبال محمد خاں کی بہن سے کرادی، مدتوں ریونیو سکریٹری رہے ان کی تیسری صاحبزادی آفتاب جہاں بیگم سے نواب حمید اللہ خاں نے عقد ثانی کر لیا اور ان کو ثریا جاہ کا خطاب دیا۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی آج کل یہ کراچی یا لندن میں رہتی ہیں۔

پرنس حمید اللہ خاں نہ صرف لکھائی پڑھائی میں ہوشیار تھے بلکہ کھیلوں کے بھی بادشاہ تھے۔ یونیورسٹی میں کرکٹ کے کپتان رہے، ہاکی، فٹ بال، ٹینس، پولو بلکہ پہلوانی کے بھی دلدادہ تھے، بھوپال میں سائیکل پولو ان ہی کی ایجاد تھی جس میں ان کی صاحبزادیاں اور محل کی دوسری لڑکیاں بھی حصّہ لیا کرتی تھیں۔ علی گڑھ کے پانچ سالہ قیام میں ان کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور ان کی وطن واپسی کے بعد بھوپال میں علیگریز کی آمد کا سلسلہ بہت بڑھ گیا۔ اولین آنے والوں میں سلام الدین خاں، وزیر احمد، سید محمد خاں، سید وزیر علی، خواجہ محمد اکرم، عبدالرحمٰن بجنوری،

ماہنامہ فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

علی احمد خاں جیسے لوگ شامل تھے، اوّل الذکر چار اصحاب کرکٹ کے کھلاڑی تھے۔ یونیورسٹی کے کلر ہولڈر تھے۔ سلام الدین خاں ابتداً جوڈیشری میں رہے، پھر جج، پھر چیف جسٹس اور عرصے تک قانون و انصاف کے وزیر رہے، نواب صاحب ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے، والا قدر، ابن الملک وغیرہ کے خطابات اور جاگیر بھی ملی۔ ریاست میں پنجاب پارٹی کے سربراہ سمجھے جاتے تھے مگر ان سے کافی بھوپالیوں کو فائدہ پہنچا، مدھیہ پردیش بن جانے کے بعد بھی انھوں نے بھوپال ہی میں رہنے کو ترجیح دی، وہیں انتقال ہوا اور طبقہ صالحین کے احاطے میں دفن ہیں۔

میر وزیر احمد "وزیر استاد" کے نام سے موسوم تھے، ان کی ایک آنکھ کھیل میں ضائع ہوگئی تھی جب یہ کمشنر سائر کسٹم ہوئے تو مقامی شاعر جناب ڈھینڈس نے ایک ہجو یہ شعر کہا تھا جو شہر میں بچے بچے کی زبان پر تھا، بعد میں کافی عرصے تعلیمات کے سکریٹری رہے۔ سید محمد خاں خورجہ کے رہنے والے تھے، عرصے تک کمشنر سائر رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد وطن چلے گئے۔ سید وزیر علی سلطانیہ انفینٹری میں لفٹیننٹ تھے، بھوپال میں کرکٹ کا زیادہ رواج نہیں تھا مگر جب برصغیر میں جو قومی اور بیخ قومی ٹورنامنٹوں کا آغاز ہوا اور مسلم ٹیم کی قیادت ان کے حصے میں آئی تو یہ کیپٹن اور میجر بنا دیئے گئے، اس زمانے میں ہندو ٹیم کی قیادت نائیڈو کیا کرتے تھے۔ جوانوں کی فوج میں کیپٹن اور بعد میں اپنے کھیل کی وجہ سے میجر اور کرنل ہوگئے، سید صاحب کی قیادت میں ۳۷، ۳۸، ۴۱ اور ۴۴ء میں پنٹا گولر کپ مسلم ٹیم نے جیتا ۳۸ء، ۳۹ء میں انھوں نے رانجی ٹرافی میں جنوبی پنجاب کی قیادت کی اور ۲۲۲ رنز بنائے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی آگئے اور سولجر بازار کے ایک فلیٹ میں مقیم رہے۔ خواجہ صاحب سی پی پولیس کے افسر تھے، کافی عرصے پولیس میں افسر اعلیٰ رہے، پھر سی پی چلے گئے، ریٹائر ہونے کے بعد بھوپال آکر ڈیفنس سکریٹری ہوگئے۔

عبدالرحمٰن بجنوری بھی پرنس حمید اللہ خاں کے ہم عصر تھے، چنانچہ یہ ابتداً انہی کے لٹریری سکریٹری بنے، پھر ریاست کے تعلیمی مشیر اور حمیدیہ لائبریری کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے، یہیں ان کو غالب کا ایک غیر مطبوعہ دیوان ملا، جس پر ایک لاجواب مقدمہ لکھا، ابھی اس کی کتابت ہو رہی تھی کہ ان کا طاعون میں انتقال

ہو گیا۔ اور سیہور جانے والی سڑک پر لال گھاٹی سے تھوڑا آگے والے قبرستان میں دفن ہیں۔ یہ نایاب نسخہ مفتی انوار الحق کے زیر اہتمام نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا۔

علی احمد خاں بی اے ایل ایل بی پرنس کے کلاس فیلو تھے، یہ کوئٹہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے بڑے بھائی عبد الصمد خاں جنرل عبید اللہ خاں کے لٹریری سکریٹری اور بعد میں نواب سلطان جہاں بیگم کے لٹریری سکریٹری ہو گئے۔ یہ سٹی مجسٹریٹی سے ترقی کرتے کرتے چیف جسٹس بن گئے، فقرا سے بڑی عقیدت تھی، ہر سال عرس کے موقع پر اجمیر شریف جایا کرتے تھے، ان کی بیگم نے ان کی سوانح لکھی تھی جو شائع نہیں ہو سکی، میں نے اس کو دیکھا ہے، کافی دلچسپ اور اس دور کی معاشرت کی عکاسی کرتی ہے۔

۱۹۱۱ء میں جنگ بلقان ہوئی جس میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا اور بلغاریہ، یونان اور سرویا نے ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس وقت ڈاکٹر انصاری (مختار احمد) علی گڑھ آئے اور ترکی کے لیئے ایک طبی وفد، جس میں ڈاکٹروں کے علاوہ دوسرے طلبا بھی شامل تھے ترتیب دیا، اس میں چودھری خلیق الزماں اور کلکتہ والے عبد الرحمن صدیقی کے ساتھ جو لوگ شامل ہوئے ان میں شعیب قریشی، حسن محمد حیات اور ڈاکٹر سید عبد الرحمن بھی شامل تھے۔ ۱۹۱۳ء میں یہ لوگ پھر علی گڑھ واپس آ گئے۔ چند سال بعد آخر الذکر تینوں اصحاب بھوپال آ گئے۔ شعیب صاحب کانگریس میں بھی رہے، جیل بھی گئے، مولانا محمد علی کی صاحبزادی سے شادی ہوئی، ابتدا میں مشیر المہام روبکاری خاص اور بعدہٗ کافی عرصے وزیر تعلیم رہے، قیام پاکستان کے بعد کراچی آ گئے، یہاں سفارت اور وزارت کی خدمات انجام دیں۔ حسن محمد حیات علیگڑھ کالجیٹ اسکول میں ماسٹر تھے۔ اپنی سج دھج، نفاست اور انگریزی لباس کی وجہ سے لارڈ حیات کہلاتے تھے اولاً لیجسلیٹو کونسل کے سکریٹری اور پھر کافی عرصے نواب صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری رہے، ڈاکٹر رحمن ۱۹۴۷ء تک شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے انچارج اور صحت عامہ کے ڈائرکٹر رہے، پھر کراچی آ گئے تھے۔

دوسرے آنے والوں میں حیات اللہ کرمانی بی اے ایل ایل بی (سکریٹری پولیٹکل ڈپارٹمنٹ، اولین لیبر کمشنر) ان کے برادر خورد فصیح اللہ کرمانی، بی اے

ایل ایل بی (جج) بشیر الدین بی اے (پبلسٹی افسر) ماسٹر عبدالسلام (ڈائریکٹر و سکریٹری تعلیمات) جمیل احمد، بی اے ایل ایل بی (اولاً اکم ٹیکس آفیسر و کمشنر، بعد کو سکریٹری صنعت و حرفت) اصغر انصاری بی اے (رجسٹرار کوآپریٹیو سوسائیٹیز) اختر عزیز بی اے اور محمد صدیق بی اے (ناظم ضلع شرق و مغرب) اور محمود الحسن صدیقی بی اے شامل تھے، صدیقی صاحب اولاً محکمہ تاریخ میں ملازم ہوئے اور رسالہ "ظل السلطان" کے ایڈیٹر ہوئے۔ محکمہ ختم ہونے کے بعد صحافتی زندگی اختیار کی، ہفتہ وار اخبار "اجہات" نکالا، سر راس کے دور میں ہفتہ وار مصور اخبار ندیم نکالا جس کو سرکاری امداد ملتی تھی، بھوپال میں یہ پہلا اخبار تھا جو اپنے لکھنے والوں کو معاوضہ دیا کرتا تھا۔ سر راس کے بعد اس کا ایک روایتی بورڈ بنا جس میں صدیقی صاحب کے علاوہ ڈاکٹر رضا تیموری اور حکیم قمر الحسن بھی شامل کیے گئے، کچھ عرصے بعد صدیقی صاحب بد دل ہو کر اس سے علٰحدہ ہو گئے۔ ابتدا میں یہ اخبار روزانہ ہو گیا، پھر حکومت نے اس کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا اور یہ اخبار حکیم صاحب کو دے دیا گیا۔ صدیقی صاحب کو سر راس سے بڑی عقیدت تھی، ان کے جسدِ خاکی کے ساتھ حسن محمد حیات تو سرکاری طور پر علی گڑھ گئے مگر دوسرے افراد میں صدیقی صاحب بھی شامل تھے، کچھ دن بعد انھوں نے بھوپال میں سر راس میموریل اسکول کا منصوبہ بنایا اور ماسٹر سلیمان آرزو بی اے (علیگ) اور راقم کو ساتھ لے کر علی گڑھ کا دورہ کیا، متعدد سربرآوردہ اساتذہ سے ملاقات ہوئی مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی، زہرہ جمال اور اختر جمال ان کی دو بیٹیاں ہیں جو دونوں بلند پایہ افسانہ نگار ہیں۔

ہیڈ ماسٹر عبدالحمید قریشی کانپور کے تجارتی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد لندن سے بی ایڈ کیا اور الیکزنڈرا ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ انھوں نے اسکول کا چولا ہی بدل دیا۔ اساتذہ اور طلبائیں جو فاصلہ تھا وہ ختم کر دیا، طلبا میں خود اعتمادی اور آزادی کی روح پھونکی، سوسائیٹز قائم کیں، "گہوارۂ ادب" کے نام سے اسکول کا سہ ماہی مجلہ نکالا، راقم کو اس کے پہلے ایڈیٹر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ بعد میں حمیدیہ کالج کے پرنسپل بھی رہے، پنشن کے بعد کانپور چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

تعلیم کے سلسلے میں دوسرا نام سکینہ قادر کا ہے جس طرح زنا یئڈد، سر وحسنی نایئڈد کے رشتے سے پہچانے جاتے تھے وہی صورت قادر صاحب کے ساتھ تھی، دونوں علیگ تھے، یہ شادی ماسٹر ولی محمد صاحب سابق سکریٹری تعلیمات نے کرائی تھی، قادر خود کچھ نہیں کرتے تھے، ان کی بیگم سلطانیہ گرلز ہائی اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔

سید حسین بھوندو پرنس حمید اللہ خاں کے زمانے میں کرکٹ کے اچھے کھلاڑی تھے۔ جب مولانا شوکت علی اور محمد علی چھندواڑہ جیل سے رہا ہوکر گھر جانے کے بجائے سیدھے علی گڑھ آئے اور بی اماں نے بھی وہیں ان کو خوش آمدید کہا، طلباء نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا، تو انھوں نے کرکٹ بھی کھیلی، پرنس اس میں وکٹ کیپر۔ اور ٹیم میں سید حسین بھی شامل تھے، یہ پہلے کہیں اور ملازم تھے، بہر حال افسر مہمان داری ہو گئے، اس زمانے میں ان کے چھوٹے بھائی محمود حسین اور بعض اعزا مثلاً محمد احمد انصاری جج ہائیکورٹ اور ان کے صاحبزادے جمیل انصاری (روزنامہ ڈان کراچی کے سابق ایڈیٹر) بھی بھوپال میں برسر روزگار تھے۔

نواب صاحب کے آخری دور کے آنے والوں میں سر راس مسعود کا نام سر فہرست ہے، جو علی گڑھ کی وائس چانسلری کے بعد بھوپال آکر وزیر تعلیم اور صحت عامہ مقرر ہوئے۔ مختصر سے عرصے میں انھوں نے یہاں کی ادبی روایات کی بڑی حوصلہ افزائی کی، ندیم اخبار جاری کرایا، سحر بھوپالی کا گم گشتہ کلام جمع کرایا جس کو ماسٹر عبد الجلیل نے مرتب کیا اور موصوف نے مقدمہ لکھا، علمی تراجم کے لیے مصنفیں کی ایک کمیٹی بنائی جس کا سکریٹری مولوی عبد الرزاق ابرامکہ کو بنایا۔ شیخ عبد القادر جیلانی کے حالات پر مشتمل عربی کتاب کا ترجمہ شملہ والے مولوی محمود علی خاں بی اے مولوی فاضل کے سپرد کیا، ایک سنسکرت ڈرامے کا ترجمہ پنڈت لکشمی آیا جی کے ذمہ لگایا اور سب سے بڑا کام یہ کہ علامہ اقبال کو نہ صرف اپنا مہمان رکھا بلکہ نواب صاحب سے علامہ کا پانچ سو روپیہ ماہانہ کا وظیفہ مقرر کرانے میں بھی اہم کردار ادا کیا، ان کا حرکت قلب بند ہو جانے سے اچانک انتقال ہو گیا، ان کی تدفین بھوپال میں ہونے والی تھی کہ ان کی والدہ ماجدہ کے ایما پر میت علی گڑھ لے جائی گئی اور اپنے والد اور دادا کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ ان کی وفات کے بعد

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

تمام منصوبے غصب ہو گئے۔

کچھ علیگرین ایسے بھی ہیں جن کا بھوپال میں زیادہ قیام نہیں رہا مثلاً ڈاکٹر سعید الظفر خاں مشیر المہام تعلیمات وصحت عامہ۔ گو ڈاکٹر صاحب ایم اے او کالج کے طالب علم نہ تھے لیکن جب ۱۹۰۲ء میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم ہوئی تو ان کو آنریری اولڈ بوائے بنا کر ایسوسی ایشن کا سکریٹری منتخب کر لیا گیا، یہ دو ڈھائی سال کے بعد بھوپال سے چلے گئے، اسی طرح ڈاکٹر ضیاء الدین کے ایک عزیز خاں صاحب عبدالقیوم علی گڑھ کے اولڈ بوائے یو پی کے محکمہ زراعت سے ریٹائر ہو کر بھوپال میں زراعت کے ڈائریکٹر ہوئے، ان کے ساتھ ان کے نوجوان بیٹے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے داماد قیوم پاشا بھی بھوپال آگئے اور کچھ عرصہ حمیدیہ اسپتال میں کام کیا، یہ وہی بزرگ تھے جن کی معیت اور نگرانی میں گورنمنٹ ہند کی اجازت سے بڑے پیر پگارا مرحوم کی پھانسی کے بعد ان کے دو کم سن لڑکوں کو علیگڑھ سے جہاں انھیں تعلیم کے لیے داخل کیا گیا تھا انگلستان بھیجا گیا۔

۱۹۴۱ء میں جب بھوپال میں حمیدیہ کالج قائم ہوا تو اس کے اولین استادوں میں سید مسعود الحق ایم اے علیگ بھی تھے۔ یہ دوران تعلیم ان طلبا میں شامل تھے جنھوں نے ۱۹۴۵ء مسلم لیگ کے انتخابی جلسوں میں لیگ کی کامیابی کے لیے پنجاب اور سندھ کا دورہ کیا۔ چار سال بعد یہ اپنی مادر علیہ میں واپس چلے گئے، چار پانچ سال ہوئے کہ یہ انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ یہ مرادآباد کے رہنے والے تھے مگر اب سرسید نگر میں اپنا بنگلہ بنا کر علی گڑھ کے باسی بن گئے ہیں۔ چند روز بعد جاں نثار اختر اور ان کی بیگم صفیہ اختر گوالیار کے ہنگاموں سے تنگ آکر بھوپال آگئے دونوں علیگرین تھے۔ پہلے صفیہ اختر کالج میں اردو کی لیکچرار مقرر ہوئیں اور پھر جاں نثار بھی شعبۂ اردو کے سربراہ ہو گئے، دونوں ترقی پسند تھے اور ان ہی کی کوششوں سے بھوپال میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا وہ جلسہ ہوا جس میں متعدد نامور ترقی پسند ادیب شامل ہوئے اور جس کا افتتاحی خطبہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نے دیا تھا۔ ویسے جاں نثار کا بچپن بھوپال ہی میں گزرا تھا کیونکہ ان کے والد حضرت مضطر خیرآبادی ولی عہد ریاست کی ڈیوڑھی میں جوڈیشنل سکریٹری تھے۔

ماہی فکرو آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

جاں نثار تھوڑے عرصے کے بعد بمبئی چلے گئے اور فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے، صفیہ علیل ہو کر لکھنؤ چلی گئیں اور وہیں انتقال ہو گیا۔

نواب صاحب کی دوست نوازی اور داد و دہش صرف آنکھوں دیکھی نہ تھی بلکہ وہ اپنے نادیدہ احباب کا بھی خیال رکھتے تھے اس کی مثال مسعود ڈباسی مرحوم کے خاندان کی کفالت تھی، مسعود نواب صاحب کے زمانے میں یونیورسٹی میں لیجنڈ کی حیثیت رکھتے تھے ان کے حیرت انگیز اور دلچسپ کارناموں کی داستان پرانے علیگیرین الف لیلوی کہانیوں کی طرح سنایا کرتے تھے، علی گڑھ چھوڑنے کے بعد تحصیلدار ہو گئے مگر جلد انتقال ہو گیا، کالج ہی کے زمانے سے پر تکلف کھانوں اور شاندار لباس کے شوقین تھے پھر ایسے شخص کے پس ماندگان کے پاس کیا ہوتا، نواب صاحب کو جب علم ہوا تو اس خاندان کو جو ماں، بیوہ، دو کمسن بچوں، بیوہ بہن اور ان کے لڑکے پر مشتمل تھا نہ صرف شاہی محل سے ملی ہوئی ایک بڑی حویلی رہائش کے لیے مختص کی بلکہ ایک معقول وظیفہ بھی مقرر کیا، ان کے بیٹے نے علی گڑھ سے بی اے کیا، پہلے فوج میں میجر اور بعد میں فنانس کے سکریٹری کی خدمات انجام دیں، ان کی بیٹی کی شادی بھوپال میں اقبال کے سب سے بڑے پرستار ممنون حسن خاں سے ہوئی۔

بھوپال میں چند بزرگ ایسے بھی تھے جو علی گڑھ کے طالب علم نہیں رہے مگر وہاں سے وابستہ تھے ان میں سر فہرست مولوی محمد عنایت اللہ میر مجلس علمائے تھے یہ مولوی لطف اللہ علی گڑھی کے فرزند تھے، مولوی لطف اللہ بہت بڑے عالم تھے ان کے تلامذہ میں پیر سید میر علی شاہ گولڑہ شریف، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا عبدالحق رامپوری جیسے اصحاب شامل تھے، میر محبوب علی خاں کے اصرار پر آپ نے ریاست حیدرآباد میں مفتی کا عہدہ قبول کر لیا مگر جب وہاں شرعی فیصلوں سے روگردانی دیکھی تو واپس آ گئے اور یونیورسٹی کی جامع مسجد کے عقب میں اپنے حجرے میں ٹاٹ بچھا کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا، مسجد کمیٹی نے آپ کا مشاہرہ دس روپے مقرر کر دیا تھا۔ سرسید نے علی گڑھ کالج میں دینیات کی تعلیم و تدریس پر غور و فکر کے لیے جو کمیٹی بنائی تھی آپ بھی اس کے ممبر تھے۔ مولوی عنایت اللہ میں پدری تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ مرحوم نے مرض الموت میں ایلوپیتھک

دواؤں کو الکحل کے اندیشے سے استعمال کرنے سے انکار کر دیا، حالانکہ ڈاکٹر سید عبدالرحمٰن نے سادات کی قسم کھاتے ہوئے یہ یقین دہانی کی تھی کہ آپ کو الکحل سے پاک دوا دوں گا۔ سلطان جہاں بیگم ان کی بڑی عزت کرتی تھیں۔ ان کے بڑے بیٹے احمد اللہ علی گڑھ کی جامع مسجد میں خطیب اور نکاح خواں کے خدمت انجام دیتے رہے۔ مولوی صاحب کے دیگر چار بیٹوں نے جن میں سے تین حافظِ قرآن بھی تھے علی گڑھ سے گریجویشن کیا۔

مولوی عبدالرزاق البرامکہ کو کانپوری تھے، سر سید اور سید محمود سے قریبی روابط تھے، بڑے پایہ کے مصنف تھے، برمکیوں کی تاریخ البرامکہ تو اس قدر مشہور ہوئی کہ ان کے نام کا جزو بن گئی، یادِ ایام میں انھوں نے سر سید، سید محمود راس مسعود اور دوسرے اکابرین کا تذکرہ لکھا ہے، سر راس ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے اور انھوں نے ان کو علمی کمیٹی کا سکریٹری بھی بنایا تھا، ریاست میں تحصیل دار اور دفتر تاریخ میں رہے، عمر کا آخری حصہ بڑی عسرت میں گزرا، عبید اللہ اسکالرشپ ٹرسٹ کے منتظم ہو گئے جہاں معمولی وظیفہ ملتا تھا۔

تیسرا اہم نام محمد امین زبیری مارہروی کا ہے جو ۱۹۰۳ء میں بھوپال آئے اور چار سال بعد مہتمم تاریخ ہو گئے۔ رسالہ ظل السلطان کے ایڈیٹر رہے، بیگمات بھوپال، افتخار الملک (پرنس حمید اللہ خاں کی سوانح) حیات سلطانی ان کی تین کتابیں بھوپال سے متعلق ہیں باقی ڈیڑھ درجن دوسری کتابیں ہیں جن میں زیادہ تر علی گڑھ سے متعلق ہیں۔ آنریری میجر عبدالشکور قریشی جو عرصے تک پرائیویٹ آفس میں رہے اور پھر پرائیویٹ سکریٹری ہو گئے اور منشی عبدالعزیز جو آخر میں مہتمم کوٹھا ہوئے ان دونوں کا تعلق بھی علی گڑھ سے تھا۔

۱۹۰۹ء میں نواب سلطان جہاں بیگم نے بھوپال میں الکزنڈرا ہائی اسکول قائم کیا اس کا نصاب ڈیلی کالج کا اور معیار چیفس کالجوں کا تھا۔ عارضی طور پر بے نظیر کی شاندار عمارت میں تدریس کا انتظام ہوا، عمارت سے ملا ہوا بورڈنگ ہاؤس، سامنے وسیع کھلا میدان، ایک جانب خوش نما تالاب، شاندار باب الداخلہ، اس کے اوپر پرنسپل کی رہائش گاہ، جو انگریز ہوتا تھا، اسکول کے یونیفارم میں سفید لٹھے

رسالہ فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کا چوڑے پائنچوں کا پاجامہ، سیاہ شیروانی، نیلا صافہ، کالے موزے اور سیاہ پمپ (جوتا) (درباری لباس بھی یہی تھا) سینے پر دھات کا سفید بیج جس پر ریاست کا مونوگرام اور اسکول کا نام لکھا ہوتا تھا، ابتدا میں اس کا الحاق الٰہ آباد یونیورسٹی سے تھا مگر ۱۹۱۴ء میں اس کو علی گڑھ کالج سے ملحق کر دیا گیا۔ بعد میں جب سلطانیہ گرلز اسکول ہائی اسکول بنا تو اس کو بھی علی گڑھ ہی سے ملحق کر دیا گیا، یہاں کے لڑکے اور لڑکیاں انٹرینس کا امتحان دینے علی گڑھ ہی جایا کرتے تھے۔

۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی نئے قانون کے تحت پرائیویٹ امیدواروں کو یہاں امتحان دینے سے روک دیا گیا، ریاست کے شدید احتجاج کے بعد دو سال کے لیے عارضی اجازت ملی، اس جھگڑے سے بچنے کے لیے ۱۹۲۹ء میں اس کا الحاق جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے کر دیا گیا جہاں اردو ذریعہ تعلیم تھی، اور بھوپال امتحانی مرکز بھی قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۳۵ء تک یہ تعلق قائم رہا اور پھر اس کا الحاق اجمیر بورڈ سے ہو گیا۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۹ء تک جتنے لڑکوں، لڑکیوں نے دسویں جماعت کا امتحان دیا اور آئندہ اپنی تعلیم جاری رکھی ان میں سے زیادہ تر نے علیگڑھ ہی کا رخ کیا۔ پھر اس زمانے میں بیرون شہر جانے والے طلبا کو اولاً ساٹھ، بعد میں چالیس اور پھر بیس روپے ماہانہ وظیفہ بھی ریاست سے ملا کرتا تھا، اس طرح بہت سے غریب خاندانوں کے بچوں کو بھی کالجوں کا منہ دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا، مگر ۱۹۲۹ء کے بعد اس تسلسل میں کمی آگئی پھر بھی پرانے روابط کی وجہ سے اکثریت علی گڑھ ہی میں داخلے کو ترجیح دیتی تھی۔ ان سب طلبا کی فہرست بہت مشکل ہے، چند ممتاز اولڈ بوائز کا تذکرہ یہاں کیا جارہا ہے۔

بھوپال سے علی گڑھ جانے والے اولین طلبا میں پرنس حمید اللہ خاں کے علاوہ سید عبدالکریم عرف بابو میاں بی اے ایل ایل بی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے جج تک)، سید عبدالمجید (ہیلتھ آفیسر) اختر علی خاں (کنزرویٹر جنگلات، سکریٹری صنعت)، ماسٹر انیس الدین انصاری بی ایس سی (علیگ) وغیرہ شامل تھے۔ ان لوگوں نے اپنے رفتار کے ساتھ بھوپال کی ثقافتی زندگی میں اہم کردار ادا کیا ہے، یہی

لوگ اولڈ بوائز کلب کے رکن تھے جہاں ٹینس، بلیرڈ وغیرہ کا انتظام تھا، ہاکی کے ٹورنامنٹوں میں بھی یہی لوگ پیش پیش رہتے تھے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ان ہی میں سے چند لوگوں نے بعض غیر سرکاری ملازمین کے اشتراک سے ۱۹۲۹ء میں ینگ مینز نیشنل ایسوسی ایشن بنائی، جس میں بابو میاں، مجید بھائی، ماسٹر انیس محمود اعظم فہمی ترمذی (گل بانگ، شعرستان اور مضراب کے شاعر) یہ سب ریاست کے ملازم تھے۔ غیر ملازمین میں دیوان دولت، رائے زادہ، منشی گوبند پرشاد آفتاب وکیل اور حامد حسین بھوپالی (جامعہ ملیہ والے ڈاکٹر عابد حسین، کے والد) شامل تھے۔

صفدر علی خاں میر ساماں کا خاندان ان چند گنے چنے خاندانوں میں شامل تھا جہاں اعلیٰ تعلیم کا بڑا چرچا تھا، ان کے بڑے بیٹے اختر علی خاں، دوسرے ظفر علی خاں بی ایس سی زراعت (پاکستان کاٹن کمیٹی کے سکریٹری رہے) ڈاکٹر منظر علی خاں (انگلستان چلے گئے) غضنفر علی خاں، بی ایس سی (علیگ) مذہبی رسالہ نشانِ منزل اور اردو روزنامہ آفتاب جدید کے مدیر، سرور علی خاں (انجینئر) اور احمد علی خاں (ڈان کے موجودہ ایڈیٹر) سب علیگ تھے، ان کے عم زاد بھائی انور علی خاں (اسسٹنٹ سکریٹری ریونیو) منور علی خاں (سکریٹری میونسپل بورڈ) دونوں نے علی گڑھ سے قانون کی ڈگریاں لیں۔ منور علی خاں تو گریجویشن کے بعد وکالت کرنے کراچی آئے تھے مگر چند ماہ بعد واپس چلے گئے، قیام پاکستان کے بعد ایبٹ آباد میں وکالت کرتے رہے، اسی خاندان کے دو اور عزیز مسعود رضا اور حامد رضا بھی علی گڑھ کے طالب علم رہے گو ماسٹر انیس الدین نے بی ٹی تو جامعہ عثمانیہ سے کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھی گئے، مگر مادر علمیہ کی محبت میں سرشار رہے اور جب لاہور آکر ٹریننگ کالج کے پرنسپل ہوئے تو تہذیب الاخلاق کو پھر زندہ کیا، اور کئی سال یہ اخبار نکلتا رہا۔ ان کے چھوٹے بھائی (کرنل) نفیس الدین اور دوسرے بھائی وجیہہ الدین انصاری بھی علی گڑھ کے اولڈ بوائز ہیں۔

بھوپال میں سید معشوق علی (علیا حضرت میمونہ سلطان کے پرائیویٹ سکریٹری) پہلے ان کا دوسرے مہدی علی خاں (شاکر علی کے چھوٹے بھائی اور پٹھان اسحاق علی خاں کے داماد) دفتر حضور

کاؤنٹ آفس) تھے سید محبت علی بی اے (اسسٹنٹ سکریٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ) سید ظاہر حسین بی اے (اسسٹنٹ سکریٹری ایونیو) سید منظور حسین بی اے (اسسٹنٹ سکریٹری پی ڈبلیو ڈی) اعزاز الدین خاں بی اے بی ٹی، بی ایڈ (چیف انسپکٹر آف ایجوکیشن صوبہ بمبئی) ماسٹر عظیم اللہ خاں بی اے بی ٹی (پرنسپل سیفیہ کالج) ماسٹر آفاق بیگ بی اے بی ٹی (ہیڈ ماسٹر ماڈل اسکول) ماسٹر محمد ابراہیم بی اے بی ٹی (ہیڈ ماسٹر نارمل ٹریننگ اسکول) جمیل محمد خاں (جاگیردار خاندان کے پہلے بی اے ایل ایل بی، مارکٹنگ اور میلہ افسر) عظیم الدین بی اے (اسپرنٹنڈنٹ پولیٹکل ڈپارٹمنٹ) ظفر حسن بی اے (اسسٹنٹ سکریٹری فنانس) نایاب علی خاں بی اے ایل ایل بی (انڈر سکریٹری) عطاء اللہ خاں بی اے ایل ایل بی (مجسٹریٹ) سید علی اختر بی اے۔ ایل ایل بی (ڈپٹی کلکٹر) وغیرہ شامل تھے۔

جنرل عبید اللہ خاں کے تین فرزند تھے، بڑے نے اوائل جوانی میں خودکشی کرلی تھی، دوسرے کی تعلیم نجی طور پر ہوئی، نواب حمید اللہ خاں اپنے تیسرے بھتیجے کو داماد بنانا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے رشید الظفر خاں عرف رشید میاں کو علی گڑھ بھیجا۔ انھوں نے دورانِ تعلیم ہاکی میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا، بھوپال کی مشہور ٹیم بھوپال وانڈررس کی بنیاد بھی یہیں پڑی۔ اس زمانے میں گوالیار میں ایک ٹورنامنٹ ہو رہا تھا مگر امتحانات کے قرب کی وجہ سے یونیورسٹی کی ٹیم کو اس میں شرکت سے روک دیا گیا، وہاں بھوپال کے کچھ کھلاڑی موجود تھے چنانچہ رشید میاں نے بھوپال وانڈررس کے نام سے ایک مخلوط ٹیم ترتیب دی جس نے ٹورنامنٹ میں حصہ لیا اور کپ جیت لیا۔ اس کے جملہ اخراجات رشید میاں نے اپنی جیب سے ادا کیے، بعد میں رشید میاں ہاکی کے کپتان ہو گئے جب یہ واپس بھوپال آئے تو ان کے ساتھ تاریخ کے استاد سید نوشہ علی اور ہاکی ٹیم کے کپتان اسماعیل عباسی بھی بھوپال آ گئے۔ علی گڑھ میں ہاکی کے جن بھوپالی کھلاڑیوں نے تھوڑے یا بہت عرصے تعلیم حاصل کی ان میں اشرف محمد خاں، محسن محمد خاں گول کیپر، احسن محمد خاں (اولمپین) میجر شکور، صغیر محمد خاں، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے بھوپال کے مقامی الفاظ، مقامی قصے، مقامی شعراء کے اشعار علی گڑھ میں عام

ہو گئے تھے۔

الحاق علی گڑھ کے اختتامی دَور میں محمد نعمان زبیری کا نام سرفہرست ہے یہ محمد امین زبیری کے بڑے بھتیجے تھے اور یونیورسٹی کے سینئر طلبا میں شمار ہوتے تھے، یہ انگریزی کے اچھے مقرر تھے اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری۔ فیڈریشن کی بنیاد بھی عجیب طریقے سے پڑی۔ لکھنؤ میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس کا اجلاس ہوا جس میں نعمان، احسن علی خاں (بھوپال کے ایک ترقی پسند جونیئر طالب علم، سیاسی لیڈر شاکر علی خاں کے عم زاد مشہور افسانہ نگار اختر جمال کے شوہر) وغیرہ شامل تھے، پہلے دن پنڈت نہرو نے خطاب کیا اور دوسرے دن قائد اعظم نے جب انھوں نے کانگریس کو ہندوؤں کی نمائندہ اور مسلم لیگ کو تنہا مسلمانوں کی نمائندہ جماعت قرار دیا تو اس پر شدید احتجاج ہوا، مگر قاعد نے دوبارہ اسی پر زور دیا۔ مسلمان طلبا پریشان تھے، وہ جلسے کے بعد قائد کے پاس پہنچے اور ان سے ملنے کی خواہش کی، قائد نے ان کو صبح آنے کو کہا، رات کو یہ لوگ صلاح مشورہ کرتے رہے کہ نعمان کے ذہن میں ایک دم یہ خیال آیا کہ کیوں نہ مسلمان طلبا بھی اپنی تنظیم قائم کرلیں، یہ تجویز سب کو پسند آئی اور صبح کو وہ یہی منصوبہ لے کر قائد کے پاس پہنچے قائد نے یہ تجویز منظور کرلی، راجہ صاحب محمود آباد کو تنظیم کا صدر اور نعمان کو جنرل سکریٹری چن لیا گیا۔[۱۶] نعمان نے مسلم فیڈریشن پر انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے، قیام پاکستان کے بعد نعمان اولاً کراچی اور پھر ڈھاکہ منتقل ہوگیا اور اپنا کاروبار شروع کیا مگر جلد ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا، احسن نے تعلیمی اور قانونی اداروں میں زندگی گزاری، ان کا کلام "میں محسوس کرتا ہوں، میں سوچتا ہوں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

دوسرے لوگوں میں ظہور الحق بی اے ایل ایل بی (محترمہ صبیح اختر کے شوہر، تحصیلدار، قانون مال گزاری کے مترجم) سید طاہر حسین ایم ایس سی۔ ایل ایل بی (وکیل اور لیجسلیٹو کونسل کے ممبر) مشتاق حسین خاں بی اے ایل ایل بی (مظفر علی خاں وزیر مال کے بھانجے، اردو کے بہت اچھے مقرر، یونیورسٹی کورٹ کے غالباً سب سے کم عمر ممبر، اوائل جوانی میں انتقال) حافظ غلام کبریا بی اے ایل ایل بی (منصف،

[۱۶] ماہی فکر و آگہی (علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء)

سب جج اور وکیل) عبدالحمید بی اے ایل ایل بی (کراچی کی ایک کمپنی میں مشیر قانونی)، سید اشفاق علی ایم اے (سیفیہ کالج کے پرنسپل اور انگریزی میں بھوپال کی تاریخ کے مصنف)، سید ماجد علی بی اے ایل ایل بی (کسی سرکاری دفتر میں افسر، پیر حامد علی کے فرزند) عبدالوحید خاں بی اے ایل ایل بی (سجاد کے صاحبزادے وکالت کے بجائے کاشتکاری کی)، رئیس میاں بی اے ایل ایل بی (وحید میاں کے برادر خورد، حکومت پاکستان میں مشیر قانونی) ولایت علی بیگ بی اے ایل ایل بی (کراچی ہائیکورٹ میں جج) سید وسیم حامد رضوی بی اے ایل ایل بی (گورنر کی انسپکٹنگ ٹیم کے ممبر اور وکیل) یامین زبیری عرف موٹا یامین بی اے ایل ایل بی (اپنے دور کا منھ پھٹ اور فقرہ باز طالب علم، محمد امین زبیری کا فرزند، کراچی کی کسی فرم میں قانونی مشیر) شہزادہ سلطان عالم بی اے (تحصیل دار) نجم عالم بی اے، مہر عالم بی اے (یہ تینوں ہر ہائینس میمونہ سلطان کے بھانجے تھے) اختر سعید خاں اور اظہر سعید خاں ہر دو بی اے ایل ایل بی (حامد سعید خاں کے صاحبزادے، دونوں وکیل، دونوں شاعر، دونوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں) اختر سعید خاں اس وقت شاعری میں بھوپال کی آبرو ہیں، اظہر سعید کراچی میں ایک تجارتی ادارے کے مشیر قانونی ہیں۔ حبیب فخری بی اے (شریف فکری کے صاحبزادے، عرصے تک راولپنڈی میں استادی کے فرائض انجام دیئے) وغیرہ۔

بھوپال سے نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو طلبا اور طالبات بھی علی گڑھ گئے، ابتدائی دور میں تو ہندو طلبا کا علاحدہ ہوسٹل بھی نہ تھا، وہ عام ہوسٹلوں ہی میں قیام کرتے تھے، نہ صرف ترکی ٹوپی، سیاہ ترکش کوٹ اور سفید پاجامہ خوشی خوشی پہنتے تھے بلکہ عموماً علی گڑھ کی سالانہ نمائش میں میرٹھ کے مشہور کباب پراٹھوں سے بھی دل کھول کر انصاف کرتے تھے۔ اس سلسلے میں سر راجہ اودھ نرائن بسریا کا خاندان سب پر سبقت لے گیا، ان کے دونوں لڑکے کنور راجندر نرائن بسریا (سکریٹری ردبکاری خاص) اور رفیع القدر گرجیش نرائن بسریا اور ان کی سب سے چھوٹی صاحبزادی سورج کلا سرور سب مسلم یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے، سرور کا اولین مجموعہ "حریم ناز" تو بہت عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے، ان کا ادبی ذوق بہت بلند ہے۔ راجہ صاحب کے

بھتیجے شیام بھر وسہ ایم اے ایل ایل بی علیگ نے ریاست اور مدھیہ پردیش میں امداد باہمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اسی ذیل کے دوسرے ناموں میں ماسٹر شیو دیال (حافظ غلام فردغی فارسی کے ہیڈ مولوی کے شاگرد اور نارمل ٹریننگ اسکول کے ہیڈ ماسٹر) منشی جادو رائے سری واستو ناظم، مسلم یونیورسٹی کے بی ٹی وڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکول، عمدہ شاعر، بھارت کے قومی ترانے جن من گن کے اردو مترجم شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تمام ترجموں میں اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہوا۔ کانگریسی دور کے ریاستی وزیر بابو کامتا پرشاد بھی علیگڑھ گئے مگر انٹر کے بعد واپس آگئے۔

جب علیگڑھ میں طبیہ کالج کا قیام عمل میں آیا تو اس میں بھوپال کے طلبأ نے داخلے لیے، ان میں حکیم محمد ابراہیم (جو ایک وقت افسر الاطبا بھی ہوگئے) حکیم سلطان مسعود (حکیم سلطان محمود صاحب کے بیٹے) حکیم عبد المنان (ہمدرد طبیہ کالج کراچی کے پرنسپل) کے نام ذہن میں آتے ہیں، لیکن سب سے ممتاز نام تو پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب کا ہے جو نہ صرف وہاں کے فارغ التحصیل ہیں بلکہ شعبۂ مسلم الادویہ کے پروفیسر بھی ہیں، حکیم منان ان کے شاگرد بھی رہے ہیں۔ ایک اور بھوپالی صاحب (نام یاد نہیں) طبیہ کالج میں استاد ہیں۔

بھوپال میں ایسے بہت سے اصحاب ہیں جنھوں نے میٹرک کا امتحان تو علیگڑھ سے پاس کیا مگر بعد میں دوسری جامعات میں چلے گئے جیسے ڈاکٹر عابد حسین (جرمنی)، مظفر علی خاں (برادر انور علی خاں، کلکتہ) پروفیسر عبید رب (لکھنؤ) ظہیر الدین انصاری (برادر ماسٹر انیس، الہ آباد) سید سلیم حامد رضوی (الہ آباد) پنڈت چتر نرائن مالوی سابق وزیر اعظم (بنارس) قدوس، صہبائی (بمبئی) یا ایم عرفان (لکھنؤ) ایسے افراد کی تعداد بھی کافی ہے۔

علیگڑھ اور بھوپال کے مابین بات صرف علم و فن تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ان کے درمیان سوشل تعلقات بھی قائم ہوئے۔ بھوپال کے مشہور ہیڈ ماسٹر سید احسان حسین کی صاحبزادی اُمِ ہانی نہ صرف ایک علیگرین سے منسوب ہوئیں بلکہ عمر بھر گرلز کالج ہی سے منسلک رہیں۔ الکزنڈرا اسکول کے ہیڈ مولوی مظہر احمد بھی

کی صاحبزادی کی شادی پروفیسر علوی سے ہوئی جو یونیورسٹی میں جغرافیہ کے استاد تھے کرنل ابراہیم پاشا کی ایک صاحبزادی کی شادی پروفیسر رضوی سے ہوئی حامدہ سبزواری کی شادی انگریزی کے پروفیسر سید مسعود الحسن سے ہوئی اور خود موصوفہ بھی گرلز کالج سے منسلک رہ کر ابھی حال ہی میں ریٹائر ہوئی ہیں۔

علی گڑھ میں بیک وقت بھوپال کے طلبا کی اچھی خاصی تعداد رہتی تھی جس کی وجہ سے بھوپال کے بہت سے لطائف اور مقامی الفاظ سے غیر بھوپالی علیگرین خوب واقف ہو گئے۔ سید مسعود الحسن زیدی نے جو یوپی کے رہنے والے ہیں اور یونیورسٹی میں ہاکی کے کپتان رہے ہیں یہ علی گڑھ کی باتیں، علی گڑھ کی یادیں" ایک کتاب لکھی ہے اس میں بہت سے الفاظ اسی طرح استعمال کیے ہیں جیسے وہ بھوپال میں بولے جاتے تھے جیسے تاؤ (غصہ) چنٹ (کنجوس یا حسین) جناور (جانور) اچھا بچو دیکھ لیں گے بڑے زوروں سے گت ہو رہی تھی، بیچ بڑے رشا کے ہوا، ڈر کے مارے وہ فقرو ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔

بھوپال کے ایک ہزل گو شاعر ڈھینڈس نے فارسی کے اس مصرع پر تضمین کی۔

اس حرامی کی لحد پر رات بھر ہنڈا جلے
برمزار ما غریباں نے چراغے نے گلے

امریکہ میں ڈاکٹر حفیظ زیدی ایم اے علیگ نے یہ شعر مجھے سنایا تو میں نے پوچھا کہ تم نے یہ کہاں سنا، وہ کہنے لگے یہ تو علی گڑھ میں بہت عام تھا۔ ۱۹۸۹ء میں جناب جلیل قدوائی مرحوم معتمد راس مسعود سوسائٹی نے مجھ سے سر راس پر ایک مضمون لکھنے کی خواہش کی، جس پر میں نے "زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اس کی" کے عنوان سے جو مضمون لکھا اس میں سراج میر خاں سحر بھوپالی کے مجموعے کی تدوین کے سلسلے میں یہ بھی لکھا کہ سر راس قوالی کی ایک محفل میں جس غزل پر پھڑک اٹھے اس کا مطلع یہ تھا۔

سینہ میں دل ہے، دل میں داغ، داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق

قدوائی صاحب نے مجھ سے اس کی وضاحت چاہی، اور جب انھوں نے یہ مضمون شائع

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کیا تو اس پر نوٹ لکھا کہ "یہ شعر کچھ دن ہوئے انگلستان میں اپنے ایک دوست کے پاس بیدم وارثی کے مطبوعہ کلام میں شامل دیکھا تو بڑا تعجب ہوا، ویسے یہ مطلع تو اتنا مشہور تھا کہ راقم اپنے علی گڑھ کے طالب علمی کے زمانے میں غالباً ۱۹۲۵ء میں سُن چکا تھا" ۵۱

غرضیکہ علی گڑھ نے بھوپال کی اور بھوپال نے علی گڑھ کی جو خدمت کی ہے وہ تاریخ کا ایک سنہری باب ہے، پس علی گڑھ اور بھوپال زندہ باد۔

۲

ذات باری تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ اس عمر میں قویٰ اور یادداشت بڑی اچھی ہے مگر عمر کے اپنے تقاضوں اور نصف صدی کی دوری سے کچھ نہ کچھ بھول تو آنا چاہیے اس لیے مندرجہ بالا مضمون میں بعض اہم نام رہ گئے جن کی نشاندہی ڈاکٹر رضیہ حامد نے کی۔ ان کے یاد دلانے پر ذہن کے کونے کھدروں کو ٹٹولا جس کا نتیجہ ذیل میں پیش ہے۔ (محمد احمد سبزواری)

مشاہیر ہند میں شامل ہونے والے بزرگ احمد علی شوق بھوپالی نہیں تھے مگر ملازمت کے سلسلے میں تیس سال بھوپال میں گزارے، درجنوں کو شاعر بنایا آپ نے جنرل عبید اللہ خاں کی فرمائش مسلم یونیورسٹی فنڈ کی امداد کے لیے ایک مثنوی لکھی جو انجمن ترقی اردو کے جریدے "اردو" میں شائع ہوئی۔

یہ بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت سہا مجددی بھی علیگ تھے، وہاں سے انٹر کیا، تقریر میں مہارت حاصل کی، کالج کی جانب سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لیے ان کو رنگون بھیجا گیا، آگے تعلیمی سلسلہ تو منقطع ہو گیا مگر علمی سلسلہ شروع ہو گیا ۱۹۲۱ء میں دیوانِ غالب کی شرح "مطالب الغالب" کے نام سے لکھی جس کا شمار غالب کی اولین شرحوں میں ہوتا ہے۔ بعد میں اپنے علیگڑھی دوست حکیم احمد شجاع کے بلاوے پر لاہور چلے گئے اور رسالہ "ہزار داستان" کی ادارت سنبھالی، بچوں کے ہفتہ وار اخبار "پھول" کے مدیر رہے، مختلف مقامات پر گھومتے ہوئے ۱۹۴۱ء میں مشاعرے کے سلسلے میں بھوپال آئے اور پھر کہیں نہیں گئے، اسی عمر میں شادی بھی کر لی، آخری ایام بڑی پریشانی میں

۵۱ فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

گزرے۔ جناب جوش نے اپنی یادداشتوں "یادوں کی برات" میں جو ذکر کیا ہے وہ افسانہ ہے کیونکہ مخالف سیاسی پارٹیوں سے روابط کی بنا پر ریاست کے سرکاری حلقوں میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ان کا دیوان "افسونِ بھوپالی" کراچی لے آئے تھے مگر وہ شائع نہیں ہو سکا۔☆

عرب کے مشہور خاندان قاضی زین العابدین کے ایک رکن پروفیسر عبدالرحمٰن عرف اچھن میاں نے علیگڑھ سے عربی میں ایم اے کیا، وہ حمیدیہ کالج میں عربی کے استاد رہے اور ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں میں ممتحن، فوجیوں کو پڑھایا ان کے شاگردوں میں راولپنڈی کے مشہور مصنف بریگیڈیر گلزار احمد بھی شامل ہیں، ان کو حکومت ہند کی جانب سے پدم بھوشن کا اعزاز بھی ملا۔ اب ان کی ایک صاحبزادی حفصہ عبید بھوپال میں تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

مرزا فہیم بیگ علیگرین بھی ہیں اور الٰہ آبادی بھی، انھوں نے ایم ایس سی کے بعد انجینئرنگ کی ڈگری لی اور نہ صرف بھوپال میں چیف انجینئر رہے بلکہ بیرونِ بھوپال بھی ماہر تعمیرات کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، الٰہ آباد میں حضرت امیر مینائی کے صاحبزادے جناب اسمٰعیل مینائی ان کے کلاس فیلو تھے۔ یوں اردو ادب کے جراثیم ان میں داخل ہو گئے اور آج کل اقبال ادبی مرکز کے چیئرمین کی حیثیت سے علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

سید اختر پرنسپل ٹریننگ کالج مولوی شکر اللہ سہیل کے پوتے ہیں مولوی صاحب اچھے شاعر تھے ان کی ایک غزل جس کا یہ شعر ہے بھوپال میں بچے بچے کی زبان پر تھی۔

دل لے کے گئی ہے کہ جگر لے کے گئی ہے
کچھ تو تری دزدیدہ نظر لے کے گئی ہے

اس میں ایک جگہ حمید کا نام آگیا ہے جس کی بنا پر اس کو نواب حمیداللہ خاں

☆ اردو اکادمی مدھیہ پردیش نے سہا مجددی کے نام سے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا (ادارہ)

کی غزل سمجھا جاتا تھا، نواب صاحب شاید ترنگ میں آکر شاعری کرتے تھے، میرے پاس ان کے ہزل کچھ اشعار تھے جن کے نیچے ان کے انیشیل (ا ت ح) بھی تھے، اتفاق سے یہ کاغذ غائب ہوگیا۔

ماسٹر محمد رفیع بھوپال کے ممتاز حکیم سید محمد محسن کے بھتیجے تھے، علیگڑھ سے بی، اے کیا ماڈل اسکول میں استاد تھے، اردو کی درسی کتاب گوہر ادب کا سلسلہ شروع کیا جو آٹھویں کلاس تک پڑھائی جاتی تھی، راقم نے جب ۱۹۴۵ء میں انجمن مصنفین بھوپال کی بنیاد رکھی جس کے سکریٹری تمکین سرمش تھے تو ماسٹر صاحب نے بڑے انہماک سے اس کے پروگرام میں حصہ لیا، مگر سرمش کے حیدرآباد چلے جانے اور میرے پاکستان آجانے کی وجہ سے یہ معاملہ ختم ہوگیا۔

ایم پی اردو اکیڈیمی کے سابق سکریٹری محسن علی نہ صرف علیگ بلکہ علیگڑھ کے رہنے والے عبدالشکور قریشی (نواب صاحب بھوپال کے پرائیوٹ سکریٹری) کے داماد بھی تھے، بھوپال میں ۱۹۷۶ء میں اقبال صدی کے سلسلے میں ایک کل ہند سیمنار ان ہی کے دور میں ہوا جس کی روئیداد "اقبال آئینہ خانے میں" کے نام سے پروفیسر آفاق احمد نے مرتب کی۔

ملازمت کے سلسلے میں باہر سے آنے والوں میں چوہدری محمد اطہر بی اے ایل ایل بی مجسٹریٹ اور سب جج بھی شامل تھے۔ غالباً ان ہی کی عدالت میں بھوپال کا وہ سیاسی مقدمہ چلا جہاں ملزم نے کہا کہ عدالت میرے بھائیوں کو اندر آنے دے۔ عدالت نے اجازت دے دی تو ملزم چیخ کر بولا "بھائیو اندر آجاؤ" اس پر پُرجوش عوام کا ایک مجمع عدالت میں گھس گیا، ایک ہنگامہ ہوگیا، مقدمے کی سماعت ملتوی اور لطف یہ کہ خود ملزم پولیس کی گرفت سے آزاد ہو کر عوام کے ساتھ باہر آگیا۔

ریاست کے سابق چیف جسٹس اور وزیر قانون وانصاف سلام الدین خاں کا تو سارا خاندان ہی علیگ تھا، ان کے دونوں بیٹے مسعود صلاح الدین (جنھوں نے اپنے والد سے زیادہ کرکٹ میں نام پیدا کیا) اور نسیم سلام الدین اور ان کی منجھلی صاحبزادی حمیدہ بانو سب علیگڑھ کے فارغ التحصیل تھے، موصوفہ نے

ماسٹر ولی محمد کی صاحبزادی کے اشتراک سے بھوپال میں انگریزی میڈیم کے سب سے پہلے پرائیویٹ کیمبرج اسکول کی بنیاد ڈالی، میرے بڑے بیٹے ممتاز سبزواری نے بھی اس کی ابتدائی کلاسوں میں تعلیم پائی ہے،

بھوپال میں سرکاری سطح پر ہومیو پیتھک اسپتال ۱۹۱۱ء سے قائم ہو گیا تھا اور ایک بنگالی ڈاکٹر گھوش اس کے انچارج تھے ان کے جانے کے بعد غالباً ۱۹۱۹ء میں ایک اور بنگالی نوجوان مسلمان ڈاکٹر تفضل حسین نے ان کی جگہ لے لی (اس زمانے میں ہومیو پیتھی کو بنگال ہی سے منسلک کیا جاتا تھا) انھوں نے یہاں ہومیو کی بلا فیس درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا، ڈاکٹر دوست محمد خاں جو بعد میں اس شعبے میں کافی مشہور ہوئے، ڈاکٹر تفضل حسین ہی کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھوپال ہی میں شادی کی، ان کے بڑے بیٹے بختیار حسین اور ان کی صاحب زادیاں ملیحہ سلطان اور نادرہ سلطان علیگڑھ ہی کے فارغ التحصیل ہیں، بختیار تو بھوپال سے چلے گئے مگر نادرہ سلطان سلطانیہ اسکول میں پڑھاتی رہیں۔ مفتی انوار الحق کی بڑی صاحبزادی رہینہ ممتاز جہاں بیگم (علیگ) ٹیچرس ٹریننگ کالج سے منسلک رہیں۔

سید معشوق علی کے بیٹے سید فاروق علی (علیگ) چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ اور داماد سید آفتاب الدین بی۔ اے سید اعجاز الدین عرف نور نگا کے صاحبزادے بھی علیگ ہیں۔ رسالہ فکر و آگہی کی مدیرہ رضیہ حامد کے شوہر ڈاکٹر سید محمد حامد بی۔ ایس سی انجینئرنگ (علیگ) ایم اے، پی۔ ایچ ڈی آجکل بی۔ ایچ۔ ای۔ ایل میں ایک معزز عہدہ پر فائز ہیں اور ان دونوں کے بڑے صاحبزادے سید محمد مہر بی ایس سی انجینئرنگ علیگ (مارکٹنگ منیجر سی مینس (دوبئی) ہیں۔ سید محمد حامد کی سرپرستی میں فکر و آگہی کے خصوصی شمارے منصۂ شہود پر آئے اور اب یہ علیگڑھ نمبر پیش کر رہے ہیں۔

ضمیر الحسن صدیقی بی ایس سی (علیگ) الکزنڈرا اسکول میں سائنس ٹیچر ہوئے۔ انیس الدین انصاری کے جانے کے بعد ان کی جگہ لے لی، مرزا ابراہیم بیگ کے صاحبزادے اور ماسٹر آفاق بیگ کے برادر خورد مرزا اشفاق بیگ نے علیگڑھ سے بی اے، ایل ایل بی کی ڈگری لی، کچھ عرصے بھوپال میں ریاست

کی پھر بمبئی چلے گئے اور وہاں سے ماسکو، اور وہیں شادی کر کے مستقل سکونت اختیار کر لی، مظفر علی خاں سابق وزیر مال کے فرزند پروفیسر اختر علی خاں نے علیگڑھ سے ڈگری لی اور سیفیہ کالج میں سیاسیات کے استاد ہو گئے، مجتبیٰ مرزا مولوی اصغر انصاری کے داماد، جو پہلے سیہور میں اور پھر بلدۂ بھوپال میں میونسپل افسر رہے علیگڑھ ہی کے لا گریجویٹ تھے ان کی بیگم میمونہ سلطان (ملیگ) مدھیہ پردیش اسمبلی کی رکن رہ چکی ہیں اور ریاست کی مشہور سوشل ورکر ہیں۔ نور محل کی گلی میں ایک بزرگ مولوی حبیب اللہ رہتے تھے ان کے چار بیٹوں میں ایک وحید اللہ نظمی نے علیگڑھ سے معاشیات میں ایم اے کیا، کچھ عرصے کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں اردو کالج میں پڑھاتے رہے، بڑے اچھے مقرر تھے، عبدالصمد خاں سابق جیلر (مزاح نگار عبدالاحد خاں تخلص بھوپال کے برادر بزرگ) علیگڑھ کے بی اے تھے، ان ہی کے زمانے میں بھوپال کی سنٹرل جیل میں قیدیوں نے بغاوت کی تھی۔

جہاں قدر چغتائی نے علیگڑھ میں تعلیم پائی، گوالیار میں جوانی گنوائی، ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد پھر بھوپال آ گئے، ہارون عرب کی صاحبزادی سے شادی کی جہانگیریہ اسکول میں استاد ہو گئے۔ شاعری اور خاکہ نگاری میں نام پیدا کیا شاعری پر یاد آیا کہ بشیر بدر گو ابتدًا بھوپالی نہ تھے، فیض آباد کے رہنے والے تھے، علیگڑھ سے بدرجہ امتیاز ایم اے اور پھر پی ایچ ڈی کیا۔ یونیورسٹی میگزین کے مدیر رہے، بھوپال آ کر بس گئے۔ بین الاقوامی شہرت کے شاعر ہیں، کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سہ ماہی فکر و آگہی کا ایک ضخیم نمبر بھی بشیر بدر نمبر کے نام سے شائع ہو چکا ہے، شعری، باسط، محمد علی تاج اور کیف کے بعد آجکل اختر سعید خاں اور بشیر بدر ہی بھوپال کی آبرو ہیں۔ اور دونوں علیگڑھی ہیں۔

مغلوں کے دور سے یہ رواج چلا آ رہا ہے کہ مرکز اور صوبوں میں خزانچی ہندو ہوا کرتے تھے، بھوپال میں بھی یہی دستور تھا۔ ابراہیم پورہ والی سڑک پر اور گنوری میں آج بھی سابق خزانچیوں کی حویلیاں موجود ہیں، سلطانی دور کے آخر میں پہلی مرتبہ ایک مسلمان کو نائب خزانچی مقرر کیا گیا، جو بعد میں خزانچی بھی ہو گئے۔

بھوپال بینک قائم ہونے کے بعد تو خزانہ ہی ختم ہو گیا، ان ہی نائب خزانچی کے دو بیٹے فضل الرحمٰن (میرے کلاس فیلو) اور عتیق الرحمٰن تھے، فضل نے تو شاید میٹرک کے بعد ہی ہتھیار ڈال دیے مگر عتیق نے نہ صرف علیگڑھ کا منہ دیکھا بلکہ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر ریٹائر ہوئے، ان کی یادداشت کا ایک واقعہ سنیے ۳۳ء میں اسکول کی جانب سے ایک بڑا مشاعرہ ایڈورڈ میوزیم (حال مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری) میں ہوا میں نے ضحاک کے نام سے ایک مزاحیہ غزل پڑھی، مقطع تھا ۔

ضحاک دخت رز سے ہوئے رات ہمکنار
چرچا اسی کا شہر کے ہر اک گھر میں ہے

یہ غزل طلبا میں اس قدر مشہور ہوئی کہ میں نے اسکول کے میگزین "گہوارہ ادب" جس کا میں پہلا مدیر بھی تھا ایک مزاحیہ مضمون ضحاک ہی کے نام سے لکھا، عتیق سے جب ۱۹۹۰ء میں میری ملاقات ہوئی تو اس نے یہ شعر سنا دیا۔

بھوپال میں جہاں تک بھوپالی ڈاکٹروں کا تعلق ہے تو اس میں سب سے پہلے ایم بی بی ایس کی ڈگری لے کر آنے والے ڈاکٹر سلطان (قاضی ولی محمد صاحب کے برادر نسبتی اور سید طاہر حسین وکیل کے خسر) تھے، ورنہ اس سے پہلے پرنس آف ویلز ہاسپٹل (اب حمیدیہ اسپتال) میں صرف دو ڈاکٹر سہراب جی مصا لحہ والا سول سرجن اور ڈاکٹر اگر سنگھ (فزیشن، سرجن سب کچھ) مگر ڈاکٹر سلطان نے ڈگری لکھنؤ سے لی تھی، اس کے بعد کئی ڈاکٹر جیسے عبدالسلیم خاں عبدالرحمٰن (دونوں جامعہ عثمانیہ کے) میرے ایک کلاس فیلو بوہرہ فرقہ کے ڈاکٹر شمشاد یا ڈاکٹر قریشی اور رام نرائن بمبئی کے سند یافتہ تھے، مگر علیگرین میں آنے والے پہلے ڈاکٹر انصاف ہیں، بھوپال میں بہ حیثیت فزیشن یہ بڑے کامیاب اور مقبول ڈاکٹر رہے۔ (میرے ایک طویل قیام بھوپال کے دوران انھوں نے میری بیوی کی ڈپریشن کا کامیاب علاج کیا۔)

مرحوم حاجی سید اظہار حسین سابق سپرنٹنڈنٹ پی ڈبلیو ڈی ریاست بھوپال کے خاندان کو پی ڈبلیو ڈی سے بڑی الفت رہی ان کے داماد سید منظور حسین (علیگ،

اور ان کے پوتے سید نسیم طاہر (علیگ) چیف انجینئر اور بھائی کے پوتے سید محبوب اختر (علیگ) اسسٹنٹ چیف انجینئر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی رہے۔ ایک اور پوتے سید مسعود اختر (علیگ) سول انجینئرنگ کرنے کے بعد پاکستان اور بیرونِ ملک اپنے فرائض منصبی ادا کرکے سبکدوش ہو گئے۔ آجکل لاہور میں مقیم ہیں۔

میونسپل کارپوریشن میں چیف اکاؤنٹنٹ ایک بزرگ محمد ایوب ہوا کرتے تھے جو آخر میں درگاہ حضرت نظام الدین پہنچ گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کو نادر رسالے اور کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا، شاید یہ شوق انھیں اپنے پہلے خسر سید علی مرحوم سے جن کے پاس منتخب اخبارات اور رسائل کے بڑے فائل تھے، ۱۹۸۰ء میں ایوب مرحوم نے مجھے ۱۹۲۹ء میں شہر بھوپال میں ہونے والے میونسپل انتخابات کے رائے دہندگان کی فہرستیں دکھائیں۔ بارہ حلقوں میں ایک ہزار ووٹر بھی نہیں تھے کیونکہ اس وقت بالغ رائے دہی کا طریقہ نہیں تھا، ان ہی کے صاحبزادے احمد ایوب علیگرین ہیں کچھ عرصے بی ایچ ای ایل میں رہے، پھر باہر چلے گئے اور اب اپنا ذاتی کاروبار چلا رہے ہیں۔

علیگڑھ کے ہاکی کے کھلاڑیوں میں رشید میاں، اشرف محمد خاں، محسن محمد خاں، احسن محمد خاں، میجر شکور، صغیر احمد، انوار احمد خاں کے بعد جس نے ہاکی کے میدان میں شہرت کے جھنڈے گاڑے وہ انعام الرحمٰن کی شخصیت ہے، جنھوں نے کھیل اور تربیت دونوں میں اہم کردار ادا کیا۔

ان کے علاوہ سید یوسف علی (رجسٹرار بھوپال یونیورسٹی) آغا سلطان حیدر حیدری، عزیز ظفر صدیقی، بھوپال کے مشہور مفتی خاندان کے صحافی صغیر بیدار، مرزا شمیم بیگ (اے جی ایم بی۔ ایچ۔ ای۔ ایل) حکیم ڈاکٹر اظہر صدیقی مرحوم، ڈاکٹر شبیر بیگ (صدر ڈی ایم کانوینٹ اسکول جن کے متعلق میں کچھ زیادہ نہیں جانتا، مگر یادوں کی برات کے طور پر پرانے نام برابر یاد آتے جاتے ہیں جیسے نائب ناظم منشی عبد الحفیظ انصاری، بی اے (ڈاکٹر عزیز الحسن انصاری پروفیسر اردو، کے والد) عبد المجید خاں بی ایس سی، سید عبد العلیم سابق مہتمم مطبع کے داماد ماجد حسین ایم سی ایس (سر سید لیاقت علی کا مدار کے فرزند) سوبھاش چندر ایم اے (ہاکی کے بہترین کھلاڑی اور سیفیہ کے اولڈ بوائے) محمد اسمٰعیل بی اے تحصیل دار، سید اختر الدین رجسٹرار ہائی کورٹ کے

داماد) جہانگیریہ اسکول کے ماسٹر اور ہاکی کے شائق الطاف حسین، عبد العلیم خاں سکریٹری قانون ایم پی گورنمنٹ (سجاد ادا کے بھتیجے) نور محل والے میاں ظہور الحسن کے صاحبزدگان حسیب الحسن اور ظہیر الحسن، ماڈل اسکول کے ایک ہیڈ ماسٹر، فاضل محمد خاں ایم پی گورنمنٹ کے سابق اسسٹنٹ سکریٹری نضل سعید، ریاست کے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے سپرنٹنڈنٹ لیاقت حسین کے فرزند شوکت حسین انصاری پی ایس سی (ر.ٹ) سعیر ہیں شوگر انڈسٹری کے انجینئر، حفیظ الرحمن بی اے سی آئی ڈی کے افسر، ماسٹر انیس الدین انصاری کے برادر خورد کرنل نفیس الدین اور ان کے کزن وجیہہ الدین انصاری، جن کی صاحبزادی شگفتہ ادیس کراچی میں بھوپال انٹرنیشنل فورم کی بانی صدر ہیں۔ اب بھی بعض نام رہ گئے ہوں گے ان سے دلی معذرت۔

بھوپال میں علیگرین کی اس بھاری اکثریت کے مقابلے میں ہندوستان کی دوسری جامعات کے سابق طلبار کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی، ایک زمانے میں بھوپال کے سب سے بڑے اسکول کا تعلق سات سال تک جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے رہا۔ اس درمیان وہاں کے سابق طلبار کی تعداد بمشکل دو درجن ہوتی ہے، سینیرٹی کے لحاظ سے ان کے نام یہ ہیں، حافظ شجاعت اللہ (بی اے) ماسٹر انیس الدین انصاری (بی ٹی)، مقصود علی خاں نائب ناظم (بی اے) محمد احمد سبزواری (ایم اے) پاکستان اور یو این او کے نیشنل انکم کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر توفیق محمد خاں (ایم اے) محمود علی خاں تحصیل دار (بی اے) عرفان علی بیگ، تبا میاں کے پوتے (بی اے) منظور الحق (سیکنڈ ماسٹر نصیر الحق کے فرزند (بی اے) ان کے علاوہ جنھوں نے وہاں سے صرف انٹر کیا اور پھر دوسری جامعات میں چلے گئے یا تعلیم کو خیر باد کہہ دیا ان میں انجینیر اسد اللہ خاں، فنانس کے اسسٹنٹ سکریٹری محمد نذیر خاں، پی ڈبلیو ڈی کے عزیز احمد، مدھیہ پردیش جیل خانے جات کے ڈائریکٹر جنرل رشید الحسن، ہاکی پلیرز عبد الرشید خاں اور ایم بی بی ایس کرنے والے دو ڈاکٹر عبد السلیم خاں اور کیپٹن عبد الرحمن خاں شامل ہیں۔

ان کے علاوہ دیگر جامعات کے افراد خال خال ہیں جیسے خالص بنگالی

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اور اردو کے اعلیٰ درجے کے ادیب اور مقرر بی گھوشال ڈائریکٹر آثارِ قدیمہ و لائبریری اور ذوالفقار الحق کلکتہ یونیورسٹی کے، پروفیسر عبدالقادر رضوی جنھوں نے تحقیق اور اردو کے فروغ کے لیے بڑا کام کیا ہے پٹنہ یونیورسٹی کے، پنڈت چتر نرائن مالوی سابق وزیر اعظم ریاست بھوپال، پنڈت ادھو داس مہتا ہندو مہاسبھا کے لیڈر اور ماسٹر گیا پرساد کے صاحبزادے وجے کمار، بنارس یونیورسٹی کے سب جج ظہیرالدین انصاری، مشہور ادیب ڈاکٹر سلیم حامد رضوی ممتاز نقاد اور ادیب ڈاکٹر ابو محمد سحر الٰہ آباد یونیورسٹی کے سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما، ریاست کی مقننہ کے رکن، شاعر اور ادیب گوبند پرشاد آفتاب، علامہ خلیل عرب کے برادر خرد حسین عرب، اردو کے محقق اور نقاد ڈاکٹر حنیف فوق، لکھنؤ یونیورسٹی کے، ماسٹر اشرف حسین آگرہ کے، پروفیسر افتخار احمد مختار اور پروفیسر اقبال احمد شوق دہلی یونیورسٹی ضیاء العلوم مفتی انوار الحق نسخہ حمیدیہ کے مرتب مولوی محمود علی مولوی فاضل، ابو سعید بزمی، مدینہ شہباز اور احسان کے ایڈیٹر، ایک بڑے مہاجن کے نونہال گوپی کرشن شوق، کمیونسٹ بلکہ انارکسٹ پنجاب یونیورسٹی کے اور قدوس صہبائی بمبئی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔

البتہ بزرگوں میں ماسٹر نصیر الحق، ماسٹر گیا پرشاد، ماسٹر بھیروں پرشاد، ماسٹر نتھو لال سکینہ، ماسٹر جعفر حسن، ہیڈ ماسٹر سید آفاق حسین یا بعد کے دور کے اساتذہ جیسے ڈاکٹر اخلاق اثر، پروفیسر مظفر حنفی، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر یونس حسنی، پروفیسر فضل تابش، پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر شفیقہ فرحت کی مادرانِ علمیہ کا مجھے پتہ نہیں، اور نئی نسل میں تو اب خود بھوپال یونیورسٹی سے نہ صرف ایم اے بلکہ پی ایچ ڈی پیدا ہو رہے ہیں جیسے ڈاکٹر رضیہ حامد، ڈاکٹر محمد نعمان، ڈاکٹر عزیز الحسن انصاری، ڈاکٹر رفعت سلطان، ڈاکٹر عطیہ سلطان اور متعدد دیگر خواتین و حضرات۔ اللّٰھم زد فزد۔

حوالے:

۱۔ ڈاکٹر محمد نعمان، سرسید احمد، علی گڑھ کالج اور بھوپال، ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، فروری ۱۹۹۵ء صفحہ ۵۹۔

۲۔ عبدالحق، مولوی، ۱۱ اسے اردو، ذکر علی گڑھ مرتبہ عبدالمجید قریشی مکتبہ اردو ڈائجسٹ سمن آباد، لاہور، صفحہ ۳۱۔

۳۔ سید حامد علی وجدی الحسینی، بھوپال تحریکات آزادی کے آئینے میں بھوپال بک ہاؤس بھوپال، ۱۹۸۶ء صفحہ ۲۳۲۔

۴۔ ڈاکٹر نعمان حوالہ بالا، صفحہ ۶۰ ۵۔ ایضاً، صفحہ ۶۱

۶۔ ایضاً صفحہ ۶۵۔

۷۔ اختر اقبال، حصہ دوم گوہر اقبال، مطبع مفید عام پریس آگرہ، ۱۹۱۴ء صفحہ ۹۰۔

۸۔ حوالہ بالا صفحہ ۹۱ ۹۔ حوالہ بالا صفحہ ۹۳۔ ۱۰۔ حوالہ بالا صفحہ ۱۱۳۔

۱۱۔ حوالہ بالا صفحہ ۱۵۹۔ ۱۲۔ الحاج محمد زبیر، ذکر علی گڑھ، صفحہ ۱۷۵

۱۳۔ الحاج زبیر صفحہ ۱۷۹

۱۴۔ الحاج زبیر صفحہ ۱۸۲ (اس سے ڈاکٹر نعمان کے اس دعوی کی تردید ہو جاتی ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم نے علی گڑھ کے صرف تین سفر کیئے۔ دیکھئے نعمان صفحہ ۶۶)

۱۵۔ محمد امین زبیری، ضیائے حیات، کراچی، صفحہ ۱۱۲

۱۶۔ اختر جمال، سمجھوتہ ایکسپریس، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۹ء صفحات ۳۳ تا ۳۵۔

۱۷۔ جلیل قدوائی، اوراق گل، راس مسعود سوسائٹی، کراچی ۱۹۸۹ء صفحہ ۲۳۔

❀❀❀

"اے میرے بچو اور میرے قومی بھولو! میری زندگی اور موت تمہارے لیے ہے۔ تم یقین جانو کہ اگر تمہاری حالت دین و دنیا میں اچھی ہوگی تو میں اپنی قبر میں نہایت خوشی آرام سے دلہن کے سونے کی مانند سوؤں گا اور خدا کا فرشتہ مجھ کو کہے گا نم کنومۃ العروس اگر خدانخواستہ تمہاری حالت دین میں یا دنیا میں اچھی نہ ہوگی تو قبر میں بھی مجھ کو چین نہ ہوگا۔ (محسن الملک)

پروفیسر ظل الرحمٰن

علیگڑھ اور بھوپال

علی گڑھ اور بھوپال کے تعلقات کا آغاز نواب سکندر بیگم (وفات ۱۳ر رجب ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء) کے عہد سے ہو گیا تھا۔ ۱۸۶۶ء سرسید حیدر آباد سے واپسی پر بھوپال ٹھہرے۔ نواب سکندر بیگم نے شرف باریابی بخشا اور الماس کی بیش قیمت انگوٹھی مرحمت کی۔ شاہ جہاں بیگم (وفات ۱۶ر جون ۱۹۰۱ء) کے زمانہ میں نواب صدیق حسن خاں کے زیر اثر ریاست کا سرکاری طور پر تعلق قائم نہیں ہو سکا۔ صدیق حسن خاں کی وجہ سے بھوپال میں علیگڑھ کی سخت مخالفت رہی۔ خود شاہجہاں بیگم سرسیّد کی تحریک کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھیں۔ صدیق حسن خاں کے انتقال (۲۰ر فروری ۱۸۹۰ء) کے بعد حالات میں تبدیلی رونما ہوئی۔ ان کے صاحبزادہ نواب علی حسن خاں کے دل میں کالج سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا۔ صدیق حسن خاں کے انتقال کے ایک سال بعد ۱۸۹۱ء میں جب سرسید کا قافلہ جس میں شبلی بھی تھے حیدر آباد سے واپسی پر بھوپال سے گزرا تو وہاں ان کے قیام کا کیا سوال پیدا ہو سکتا تھا مگر علی حسن خاں نے وزیر امتیاز علی کے ذریعہ بیگم صاحب کو سمجھایا کہ سرسید اپنے عقیدہ میں کیسے ہی ہوں مگر بڑے بڑے انگریز حکام سے ان کی دوستی ہے اس لیے ریاست میں ان کا مہماں ہونا انگریز حکام کی خوشنودی کا باعث ہوگا، چنانچہ اس طرح سرسید اور ان کے رفقاء بھوپال میں سرکاری مہماں ہوئے۔ صدیق حسن خاں کے بعض امراء نے سرسید کی تحریک میں حصہ لیا اور کالج کو اپنے عطیات سے نوازا۔ عہدِ سلطانی (۱۹۰۱ا۔۲۶) میں اس ریاست نے جس قدر فیاضانہ سرپرستی کی وہ علیگڑھ کی تاریخ میں ایک مستقل عنواں کی جگہ پانے کی مستحق ہے۔ ۳۔۱۹۰۲ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں تعلیم نسواں کے صیغہ پر توجہ دی گئی، شیخ عبداللہ کو سکریٹری مقرر کیا گیا اور علیگڑھ میں گرلس اسکول قائم کرنا طے پایا۔ نواب محسن الملک (وفات ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۷ء) کی تحریک پر علیا حضرت نے بارہ سو روپیہ سالانہ کی گرانٹ منظور کی۔ ۱۹۱۰ء میں پانچ ہزار روپیہ سال کالج کے لیے مقرر کئے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے ناگپور اجلاس دسمبر ۱۹۱۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تجویز منظور ہوئی اور اس مقصد کے لیے بیس لاکھ روپیہ جمع کرنا ضروری سمجھا گیا اور طے پایا کہ قوم کے سامنے یہ تحریک پیش کی جائے۔ سر آغا خاں اور نواب وقار الملک جو اس سلسلہ کی کمیٹی کے

صدر اور سکریٹری تھے ایک وفد کے ساتھ سلطان جہاں کے پاس الہ آباد گئے جہاں وہ نمائش دیکھنے تشریف فرما تھیں۔ سرکار عالیہ نے تبادلہ خیال کے بعد یونیورسٹی کی اہمیت و ضرورت سے اتفاق کیا اور فرمایا "ایک لاکھ میں اس وقت دیتی ہوں۔ مگر کہے دیتی ہوں کہ ابھی اور دوں گی۔ اس کے علاوہ میں نے خود دیکھا ہے کہ علیگڑھ میں ہماری قوم کے بچے گرمی میں سخت تکلیف برداشت کرتے ہیں انھیں بجلی کی روشنی اور پنکھے بھی دوں گی اور ریاست کے جاگیرداروں و عمال سے بھی روپیہ دلاؤں گی اور اگر ہز ہائی نس نظام سے ملاقات ہو گی تو ان سے بھی مدد مانگوں گی۔" آغا خاں نے بھرائی ہوئی آواز سے ان الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ "دل بندہ را زندہ کردی دل اسلام را زندہ کردی، دل قوم را زندہ کردی، خدا تعالیٰ بہ طفیل اجرش بدہد" انھوں نے محض خود عطیہ دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جب وصولی چندہ کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی تو بھوپال کی پروانشل کمیٹی میں عمائدین کو چندہ دینے کی ترغیب دی۔ اور خود پرنس آف ویلز لیڈیز کلب میں خواتین کے سامنے ایک پرجوش تقریر فرمائی۔ یہ کلب علیا حضرت نے ۱۹۰۵ء میں قائم کیا تھا جس کی باضابطہ رسم افتتاح ۱۹۰۸ء میں لیڈی منٹو کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کلب کے زیر اہتمام قومی جلسوں میں سب سے پہلے مسلم یونیورسٹی کا جلسہ ہوا، اور غالباً ہندوستان بھر میں اس مقصد کے لیے یہی پہلا خواتین کا جلسہ تھا۔

سلطان جہاں علیگڑھ کالج کے فوائد اور اس کی حالت سے نواب وقار الملک سے دو تین مرتبہ ملاقاتوں کے بعد جب مطمئن ہوئیں تو انھوں نے اپنا دست جود و سخا بڑھایا اور کالج ان کی فیاضیوں سے بہرہ یاب ہوا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء کے موسم گرما میں مسوری میں کچھ عرصہ قیام کر کے واپسی میں وہ کالج کے معائنہ کی غرض سے علیگڑھ تشریف لائیں۔ کلاسوں کو بحالت تعلیم ملاحظہ فرما کر سائنس لیباریٹریز، بورڈنگ ہاؤس، لٹن لائبریری، اسٹریچی ہال، نظام میوزیم، اسکول اور انگلش ہاؤس کا معائنہ کیا۔ سر سید، سید محمود اور محسن الملک کے مزارات پر فاتحہ پڑھی۔ دوران معائنہ مختلف سوالات اور تبصرے کیے۔ گرلس اسکول اور اس کی عمارت کے نقشے ملاحظہ فرمائے اور اسکول کے متعلق گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا۔

شروع ۱۹۱۴ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے بھوپال کا سفر کیا اور علیا حضرت کی توجہ کانفرنس کی طرف مبذول کرائی صدر دفتر کی عمارت کے لیے ریاست سے مبلغ تیس ہزار روپیہ اور شاہزادگان والا تبار بشمول پرنس حمید اللہ خاں سے مبلغ اٹھارہ ہزار روپیہ حاصل کر کے علیگڑھ واپس ہوئے۔ سنگ بنیاد رکھنے کی عرضداشت کو بھی اس معارف پرور فرمانروا نے شرف قبولیت بخشا۔ چنانچہ ۲۵ر فروری ۱۹۱۴ء کو وہ دوسری مرتبہ علیگڑھ

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی۔ علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

تشریف لائیں۔ نواب فیاض علی خاں وزیر جے پور کے پہاسو ہاؤس میں جہاں کالج کے معزز مہمان ٹھہرائے جاتے تھے قیام ہوا۔ اسٹیشن پر ٹرسٹیانِ کالج اور اسٹاف کو پرنس حمید اللہ خاں نے جو کالج میں زیرِ تعلیم تھے، اُن کے حضور باریاب کرایا۔ پہاسو ہاؤس تک خود پرنس حمید اللہ خاں موٹر چلا کر لے گئے تھے۔ علیگڑھ میں وہ کئی دن قومی کاموں میں مصروف رہیں۔ ۲ر فروری کو ایک عظیم الشان جلسہ میں سلطان جہاں منزل کی رسم تاسیس بنیاد ادا فرمائی۔ ۲۰ر فروری کو اسٹریچی ہال میں ٹرسٹیان کالج کا ایڈریس قبول کیا نواب حاجی اسحٰق خاں آنریری سکریٹری نے ایڈریس پڑھا تھا۔ یکم مارچ کو گرلس کانفرنس کا افتتاح اور سلطانیہ بورڈنگ ہاؤس کا سنگ بنیاد رکھا۔

اکتوبر ۱۹۱۵ء میں ہزہائی نس کو گرلس اسکول کے بارے میں ایک شکایت موصول ہوئی اس پر صاحبزادہ آفتاب احمد کو مخفی تحقیق کا حکم دیا۔ جسے انھوں نے رازدارانہ طور پر انجام دیا اور منتظمین کی وقعت کو قائم رکھا جس کی اسکول کے مفاد کے لحاظ سے ضرورت تھی۔ تحقیقات کی یہ رپورٹ بصیغہ راز بھوپال روانہ کی اور اس کا آخری نتیجہ بحق اسکول مفید ثابت ہوا۔

۱۹۱۵ء کے آخر میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں پھر بھوپال گئے اور سلطان جہاں منزل کی تکمیل پر افتتاح کی استدعا کی۔ اس درخواست کو منظور فرما کر بمع ولی عہد نصر اللہ خاں اور پرنس حمید اللہ خاں ۱۹ر فروری ۱۹۱۶ء کو تیسری مرتبہ علیگڑھ میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس موقع پر کانفرنس اور کالج کے نظام عمل اور مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ پر آزادی کے ساتھ اپنے خیالات پیش کئے اور جس طرح نوجوانوں کو نصیحت کی اور اعیان کالج کو توجہ دلائی اسی طرح یورپین اسٹاف کے طرز عمل اور فرائض کے متعلق بھی صاف صاف رائے بیان کی۔ سرکار عالیہ نے ایڈریس کے جواب میں خاص طور پر کہا تھا۔ "تعلیم یافتہ طبقہ جس پر قومی تعلیم ترقی کا انحصار ہے اب تک اپنے فرض کو ادا کرنے سے قاصر رہا ہے آئندہ اس کو کانفرنس کے کاموں میں عملی حصہ لینا چاہیے"۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی مساعی سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو بھوپال سے دو ہزار دو سو روپیہ سالانہ مستقل امداد کی منظوری بھی حاصل ہوئی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں اُن کی تشریف آوری کی یاد میں عبدالمجید خواجہ کے زیرِ اہتمام اولڈ بوائز لاج میں ایک ہال بھی تعمیر ہوا تھا، آج بھی وہ ہال اُن کے دوروں کی یاد تازہ کئے ہوئے ہے۔

۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی قائم ہونے پر وہ پہلی چانسلر مقرر ہوئیں۔ دنیا کی یونیورسٹیوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم یونیورسٹی ایک جلیل القدر فرمانروا خاتون

کی امارت جامعہ سے مفتخر ہوئی۔ پہلی مرتبہ وائسرائے نے اپنے قانونی اختیار سے اور پھر دو مرتبہ کورٹ نے چانسلر منتخب کیا۔

۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی کے پہلے جلسہ عطائے اسناد میں انھوں نے شرکت کی۔

۱۹۲۳ء میں راجہ صاحب محمود آباد کی وائس چانسلری سے استعفیٰ کے بعد سلطان جہاں کی نگاہ انتخاب نواب مزمل اللہ خاں اور صاحبزادہ آفتاب احمد پر پڑی۔ اُن کے تعلیمی سکریٹری نے آفتاب احمد خاں کو لکھا کہ اگر آپ علیگڑھ میں مستقل قیام کے لیے آمادہ ہوں تو ترجیح آپ کو حاصل ہے۔ چنانچہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۳ء کو کورٹ کے جلسہ میں اس کا بحیثیت وائس چانسلر تین برس کے لیے انتخاب ہوا۔[۱]

دسمبر ۱۹۲۵ء میں کالج کی جبلی منائی گئی۔ مہمانوں کے استقبال کے لیے پانچ موٹر کاروں کے بارے میں ملتا ہے کہ بھوپال سے آئی تھیں۔ اسی طرح وہاں سے بہت سے خیمے آئے تھے جن میں تقریباً ۱۷۵ مہمان قیام کر سکتے تھے۔ یونیورسٹی کو اس موقع پر پندرہ سو مہمانوں کے لیے خیموں کا انتظام کرنا تھا۔

جنوری ۱۹۲۵ء کے جلسہ عطائے اسناد میں بھی وہ شریک ہوئیں۔ وائسرائے اور صوبہ کے گورنر وقتاً فوقتاً کالج میں آتے تھے لیکن ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۵ء تک کوئی وائسرائے علیگڑھ نہیں آیا تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی کوشش سے اس موقع پر لارڈ ریڈنگ وائسرائے علیگڑھ آیا۔[۲] سلطان جہاں نے بحیثیت چانسلر اس کے خیر مقدم میں تقریر کی اسی سفر میں نواب زادہ نصر اللہ خاں (وفات ۳ر ستمبر ۱۹۲۴ء) کی یاد میں نصر اللہ ہوسٹل کی تعمیر کے لیے ۸۰ ہزار، نصاب تعلیم نسواں کی ترتیب کے لیے دس ہزار، لائبریری کے لیے دس ہزار اور گرلس اسکول کے لیے بیس ہزار مرحمت کیئے۔ سرکاری نصاب مسلمان لڑکیوں کے لیے مفید نہ ہونے کی وجہ سے ایک مخصوص نصاب کی ضرورت تھی جس کے لیے سرمایہ درکار تھا، انھوں نے اس کا احساس کرتے ہوئے مطلوبہ رقم عطا کی۔ اور بنفس نفیس مسئلہ نصاب پر توجہ فرما کر قوم کے سامنے خود ایک خاکہ پیش کیا۔ نصر اللہ ہوسٹل کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا "میں اپنی قوم کی اقتصادی حالت سے بخوبی واقف ہوں اور یہ بات بھی جانتی ہوں کہ تعلیمی اخراجات روز بروز بڑھتے جارہے ہیں اور محض اس وجہ سے ہماری قوم کے بہت سے بہترین دماغ نشو و نما حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو منعم حقیقی نے دولت و ثروت دی ہے ان کا فرض ہے کہ مختلف شکلوں سے اس نقصان کی تلافی کے لیے فیاضی سے کام لیں۔ اس خیال کو مد نظر رکھ کر میں نے نواب نصر اللہ خاں مرحوم کی بہ یادگار تجویز کیا کہ ایک بورڈنگ ہاؤس بنایا جائے تا کہ جس قدر ممکن ہو غریب طلباء تشنہ کام تعلیم نہ رہیں۔

۱۵ر نومبر ۱۹۳۶ء کے جلسہ عطائے اسناد میں وہ صرف چانسلر کی حیثیت سے شریک ہوئیں۔ نصر اللہ ہوسٹل کا افتتاح کیا۔ ایڈریس کی جوابی تقریر میں انھوں نے کہا تھا "مجھے عمر کی سترھویں منزل پر پہنچ کر سب سے بڑی تمنا اور سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ میں اس دار العلوم کو نہ صرف ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ممتاز دیکھوں بلکہ وہ دنیا کی یونیورسٹیوں میں خاص امتیاز رکھتی ہو"۔

یونیورسٹی کے حالات میں بعض وجوہ سے جو بگاڑ پیدا ہو گیا تھا، اس کی اصلاح کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی۔ اور انھوں نے ماہرین تعلیم کا ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا۔ جس کے تمام مصارف خود عنایت فرمائے اور علیگڑھ کے دوران قیام اس کو اپنا مہمان قرار دیا۔ اس کمیشن میں جو رحمت اللہ کمیشن کے نام سے مشہور ہے۔ سر ابراہیم رحمت اللہ کے علاوہ سر فلپ جوزف ہارٹوک ممبر انڈین پبلک سروس کمیشن اور سر جارج انڈرسن ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب نامزد کیے گئے تھے۔ کمیشن کا کام اس طرح شروع ہوا کہ ۸ر اکتوبر ۱۹۲۷ء کو ممبران نے پہلے بھوپال میں ہر ہائی نس چانسلر سے شرف ملاقات حاصل کیا اور ۱۱ر اکتوبر سے علیگڑھ آکر باقاعدہ تحقیقات شروع کر دی۔ جو نومبر ۱۹۲۷ء کو ختم ہوئی۔ کمیشن نے تحقیقات کی مفصل رپورٹ سرکار عالیہ کو پیش کی اور انھوں نے اپنے نوٹ کے ساتھ ممبران کورٹ کے پاس اسے روانہ کیا۔

آخری مرتبہ کورٹ کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۹ر فروری ۱۹۲۹ء کی صدارت کے لیے ان کی علیگڑھ آمد ہوئی۔ اس میں نئے وائس چانسلر کے انتخاب کا مسئلہ بھی طے پایا اور نواب مزمل اللہ خاں کے بجائے سر راس مسعود چانسلر منتخب ہوئے۔ نواب سلطان جہاں بیگم (وفات ۱۲ر مئی ۱۹۳۰ء) والیٔ ریاست میں واحد فرمانروا ہیں جو خاتون ہونے کے باوجود سات مرتبہ علیگڑھ تشریف لائیں۔ علیگڑھ سے اُن کی محبت اور تعلق کا یہ انتہائی ثبوت ہے۔

کالج اور یونیورسٹی کی ترقی و استحکام کا انھیں ہمیشہ خیال رہا۔ یہ علم ہونے پر کہ سر آغا خاں نے بعض وجوہ سے اپنی گرانٹ ان ایڈ جو وہ علی گڑھ کالج کو دیا کرتے تھے بند کر دی ہے اور ضروریات کالج پر اس کا اثر پڑ رہا ہے تو بلحاظ ان عزیزانہ تعلقات کے جو اُن کے درمیان تھے انھوں نے آغا خاں کو نہایت پر زور طریقہ سے خطوط میں توجہ دلائی اور آغا خاں نے ایک معقول رقم عنایت کی۔ ۱۹۱۸ء میں جب شہریار دکن آصف جاہ سابع دہلی تشریف لائے تو اعیان کالج کی درخواست پر سلطان جہاں بیگم نے نظام کو معائنہ کالج کے لیے ایک پر زور سفارش لکھی۔ گرلس انٹر کالج کے لئے بھی انھوں نے متعدد سفارشی خطوط لکھے اور دوسری ریاستوں سے امداد دلوائی۔

. ء ۱ ۹ ۴

سلطان جہاں بیگم کے علاوہ اُن کے منجھلے صاحبزادے جنرل عبید اللہ خاں (وفات ۲۴/مارچ ۱۹۲۴ء) نے بھی علی گڑھ سے غیر معمولی دلچسپی لی۔ ۱۹۰۹ء میں لارڈ منٹو وائسرائے کی یادگار کے طور پر وسیع عمارت منٹو سرکل تعمیر ہوئی۔ یہ عمارت چار بلاکوں پر منقسم ہے ان میں ایک بلاک نواب عبید اللہ خاں کے پچاس ہزار روپے کے عطیہ سے تعمیر ہوا[۱۵] عبید اللہ ہوسٹل کی یہ عمارت آج کل اسکول کے ایک حصہ کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ جنرل عبید اللہ خاں کی فرمائش پر احمد علی شوق قدوائی نے ۱۹۱۲ء میں مسلم یونی ورسٹی فنڈ کی امداد کی غرض سے اس کی اہمیت پر ایک مثنوی تصنیف کی تھی جو طبع ہو کر مقبول عام ہوئی[۱۶] انھوں نے سینٹرل انڈیا کمپنی کے صدر کی حیثیت سے یونیورسٹی کے لیے کام کر کے معقول رقم جمع کی۔ سن ۱۹۲۱ء میں یونی ورسٹی کو ایک لاکھ کے ٹاٹا کمپنی کے حصے دیئے۔

جس طرح سلطان جہاں بیگم نے اپنی ذاتی رقم تیرہ لاکھ اٹھاون ہزار روپے سے ایجوکیشن ٹرسٹ قائم کیا تھا جو ضرورت مند طالب علموں کی تعلیمی ضرورت کا ضامن ہے[۱۸] اسی طرح جنرل عبید اللہ خاں نے چار لاکھ روپے تعلیم جدید کے لیے وقف کئے۔ اس عبید اللہ خاں اسکالر شپ سے بھوپال کے سیکڑوں طالب علموں نے استفادہ کیا اس میں بیشتر تعداد علیگڑھ میں پڑھنے والوں کی تھی اور آج بھی یہ سلسلۂ فیض جاری ہے۔

رؤسا اور والیانِ ریاست کے بچے عام اسکولوں میں نہیں پڑھتے تھے اُن کے لیے اجمیر اندور اور لاہور میں چیف کالج قائم تھے۔ لیکن ان کا تعلیمی معیار عام کالجوں اور اسکولوں کے برابر نہ تھا۔ سلطان جہاں بیگم ان کے معیار تعلیم سے مطمئن نہیں تھیں۔ پرنس حمید اللہ خاں (پیدائش ۸/ربیع الاول ۱۳۱۲ھ / ۹/دسمبر ۱۸۹۴ء) کی تعلیم کے واسطے بعض اصحاب کا باصرار مشورہ تھا کہ انگلستان کی کسی یونیورسٹی میں داخل کیا جائے لیکن سلطان جہاں بیگم کی نظر انتخاب علیگڑھ پر پڑی۔ ان کے خیال مبارک میں "ہندوستان میں مسلمان طلباء کے لیے محمڈن کالج علیگڑھ سے بہتر اور کوئی کالج نہیں ہو سکتا اور یہی ایک ایسا کالج ہے جس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمان طلباء کے مذہب اور ان کی قومیت کی نشو و نما ہوتی ہے اور جو مسلمانانِ ہند کی آئندہ ترقیوں اور امیدوں کا مرکز ہے[۱۹]" اس عظیم الشان ادارہ تعلیمی کے انتخاب میں مذکورہ بالا خیال کے ساتھ یہ خیال بھی محرک تھا کہ ان میں ابتدا سے عوامی جذبہ اور قومی کاموں میں دلچسپی پیدا ہو۔ ریاست بھوپال کی علمی سرپرستی کا نتیجہ تھا کہ نہ صرف بھوپال کی شاہانہ توجہ علیگڑھ پر مرکوز رہی بلکہ پرنس حمید اللہ خاں کو اس قومی تعلیم گاہ کے حوالے کیا۔ اس طرح وہ پہلے نواب تھے جو کسی قومی ادارہ میں داخل ہوئے۔ سلطان جہاں بیگم خود علی گڑھ آئیں اور شایانِ شان انتظام کے ساتھ مسٹر سی ایچ ٹین ایم اے (اکسن) کی

اتالیقی میں جو پہلے سے اُن کے اتالیق تھے جون ۱۹۱۰ء میں انھیں داخل کر دیا ایس ایس ہال میں (پکی بارک) ایس ایس ایسٹ میں ان کا قیام رہا۔ مادی و اخلاقی اثر کالج کے لیے نہایت مفید ہوا۔ چنانچہ اس کے بعد دولت آصفیہ کے امرائے پائے گاہ کے صاحبزادے کالج میں داخل ہوئے اور آئندہ کے لیے یہ واقعہ ایک عمدہ مثال ثابت ہوا۔

جنگ بلقان و ترکی کے زمانہ میں علی گڑھ کالج کے متعلق معاندانہ افواہوں سے بہت کچھ غلط فہمیاں پھیلانے اور حکام کو بد ظن کرنے کی کوشش کی گئی اور اس میں شک نہیں کہ ان کارروایوں کا کچھ اثر بھی محسوس ہونے لگا۔ اس زمانہ میں پرنس حمید اللہ خاں کالج میں تعلیم پا رہے تھے۔ اسی قریبی زمانہ میں سلطان جہاں بیگم باضابطہ طور پر کالج تشریف لے گئیں اور اس طرح ان افواہوں کو حقیر ثابت کیا جو کالج کے بد خواہ مختلف حلقوں میں پھیلا رہے تھے۔ ان کا معاملات کالج میں حصہ لینا بجائے خود اس امر کی دلیل تھی کہ افواہیں محض بے بنیاد ہیں۔

حمید اللہ خاں نے ۱۹۱۱ء میں ہائی اسکول ۱۹۱۳ء میں انٹر میڈیٹ (سائنس) اور ۱۹۱۵ء میں بی اے کیا۔ فرمانروایان ہند میں وہ پہلے گریجویٹ تھے ان سے قبل کسی ریاست کے حکمراں نے بی اے تک تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ "اپنی ذہانت، تدبیر اور معاملہ فہمی کی وجہ سے وہ نہ صرف والیان ریاست بلکہ فرزندان دارالعلوم کے زمرہ میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ میر ولایت حسین نے علی گڑھ کے نامور تلامذہ میں ان کا نام لیا ہے[۲۱] حمید اللہ خاں کو گیمس سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ کرکٹ، ہاکی، ٹینس اور پولو کے بہترین کھلاڑی تھے۔ ان کی وجہ سے علیگڑھ پولو کلب میں جان پیدا ہوئی۔ انھوں نے بمبئی، پونا، کلکتہ، دہلی اور لکھنؤ کے ٹورنامنٹ میں شرکت کی اور کپ حاصل کیئے[۲۲]۔ وہ علی گڑھ کرکٹ ٹیم کے کپتان رہے اور ان کے دور میں علی گڑھ نے کرکٹ میں بڑا نام پیدا کیا اور ہندوستان کی مشہور اور بڑی بڑی ٹیموں کو ان کی سرگردگی میں یونیورسٹی ٹیم نے ہرایا۔ ۲۸ر فروری ۱۹۱۳ء کو یونیورسٹی کی دو ٹیموں کے درمیان کرکٹ کا جو مقابلہ ہوا اسے دیکھنے والوں میں سلطان جہاں بیگم بھی شامل تھیں جنھوں نے کامیاب ٹیم کو شیلڈ عنایت کی۔ یونیورسٹی ٹیم کے کپتان حمید اللہ خاں تھے۔ اتفاق سے کالج کے اس مقابلے کی کامیاب ٹیم کا کپتان بھی بھوپال کا ایک طالب علم تھا جو سرکار عالیہ کی فیاضی کی بدولت کالج میں تعلیم پا رہا تھا۔ کرکٹ ٹیم کالج کی عزت و شہرت کا باعث تھی۔ سرکار عالیہ نے خوش ہو کر دو سو روپے ماہوار کرکٹ کلب کے لیے مقرر کیئے۔ بعد میں کرکٹ میں تو نہیں لیکن علی گڑھ کی ہاکی پر بھوپال کے لڑکوں کا قبضہ رہا۔ ہمیشہ ٹیم کے آدھے سے زیادہ کھلاڑی بھوپال کے ہوتے تھے۔ اور صورت گزشتہ چند برس پہلے تک قائم رہی۔

۱۷ر مئی ۱۹۲۶ء کو سلطان جہاں بیگم نواب حمید اللہ خاں کے حق میں سبکدوش

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی۔ علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ہوئیں اور ۹ر جون ۱۹۲۶ء کو وہ سریر آرائے ریاست ہوئے۔ مسند نشینی کے فوراً بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے تحریک کی کہ وہ علی گڑھ آئیں اور مجوزہ سائنس کالج کا سنگ بنیاد اپنے دست مبارک سے رکھیں۔ نواب صاحب نے نومبر ۱۹۲۶ء میں تشریف لانے کا وعدہ کیا۔ اس موقع پر جلسہ عطائے اسناد بھی تجویز کیا گیا اور علیا حضرت نے بھی اپنی تشریف آوری کی منظوری دی۔ اس سفر میں نواب حمید اللہ خاں بحیثیت فرمانروا اور سلطان جہاں بیگم صرف بحیثیت چانسلر علی گڑھ آئی تھیں۔ اسٹیشن پر شایان شان استقبال ہوا۔ اعلیٰ حضرت حزال منزل میں مقیم ہوئے۔ ۱۴ر نومبر کو سائنس کالج کا سنگ بنیاد رکھا اور دو لاکھ روپے یونیورسٹی کو عطا فرمائے۔ خان بہادر مولوی بشیر الدین اٹاوہ کے بقول "سب سے زیادہ موثر سین وہ تھا جب کہ رسم افتتاح کے بعد سرکار عالیہ کو معلوم ہوا کہ ان کے نامور فرزند فرمانروائے بھوپال نے مسلم یونیورسٹی کو دو لاکھ روپے عطا فرمایا ہے۔ یہ سن کر سرکار عالیہ نے اپنے سعادت مند فرزند سے خوشنودی مزاج کا اظہار فرمایا اور آئندہ کے لیے قومی کاموں میں دلچسپی لینے کی نصیحت فرمائی۔ جس وقت سرکار عالیہ نصیحت فرما رہی تھیں، ہز ہائی نس نہایت مودبانہ طریقے سے کھڑے ہوئے تھے۔ جب سرکار عالیہ نصیحت فرما چکیں تو ہز ہائی نس نے اپنی مادر مہربان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور بعد ازاں سرکار عالیہ نے فرزند رشید کی پیشانی کو"[۲۲] انھوں نے فرمانروائے بھوپال کی فیاضی کو موسم بہار کی آمد آمد سے تعبیر کیا۔

نواب حمید اللہ خاں سلطان جہاں بیگم کے بعد ۱۹۳۰ء میں یونی ورسٹی کے چانسلر منتخب ہوئے اور پانچ سال اس عہدے پر رہے۔ ۱۹۳۹ء میں یونی ورسٹی نے انھیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

☆☆☆☆☆☆☆

"قومی ترقی اور قومی عزت حاصل کرنے کے ذریعہ دو ہیں۔ اول امن و امان ملک۔ اس دوسرے تعلیم و تربیت افراد ہیں۔"

(سرسید)

حواشی

۱ اردو ادب کی تاریخ کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، سلیم حامد رضوی، مطبوعہ، بھوپال، ۱۹۶۵ء، صفحہ ۱۴۷۔
۲ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، صفحہ ۱۸۷۔
۳ حیات محسن مطبوعہ ۱۹۳۴ء، صفحہ ۱۱۲۔
۴ وقار حیات، مطبوعہ ۱۹۲۵ء صفحہ ۵۲۲۔
۵ حیات سلطانی، محمد امین زبیری، مطبوعہ آگرہ، ۱۹۳۹ء صفحہ ،۱۳۹۔
۶ حیات سلطانی، محمد امین زبیری مطبوعہ آگرہ ۱۹۳۹ء صفحہ ۹۲۔
۷ حیات سلطانی، محمد امین زبیری مطبوعہ آگرہ ۱۹۳۹ء صفحہ ۲۱۵۔
۸ حیات آفتاب مطبوعہ صفحہ ۱۸۲۔
۹ حیات آفتاب مطبوعہ صفحہ ۱۴۰۔
۱۰ حیات آفتاب مطبوعہ صفحہ ۱۳۰۔
۱۱ حیات آفتاب مطبوعہ صفحہ ۲۴۹۔۳۴۸۔
۱۲ حیات آفتاب مطبوعہ صفحہ ۳۱۰۔
۱۳ حیات سلطانی صفحہ ۱۴۸۔
۱۴ حیات آفتاب مطبوعہ ۱۹۴۷ء صفحہ ۳۴۸۔
۱۵ وقار حیات صفحہ ۵۲۲۔
۱۶ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ سلیم حامد رضوی مطبوعہ بھوپال ۱۹۶۵ء صفحہ ۳۴۳۔
۱۷ تاریخ فرمانروایاں بھوپال، مطبوعہ بھوپال ۱۹۷۷ء صفحہ ۱۲۹۔
۱۸ تاریخ فرمانروایان بھوپال مطبوعہ ۱۹۷۷ء ۱۳۸۔
۱۹ حیات سلطانی، محمد امین زبیری مطبوعہ آگرہ ۱۹۳۹ء صفحہ ۳۲۲۔
۲۰ یاد ایام نواب احمد سعید خاں چھتاری جلد دوم صفحہ ۱۹۰
۲۱ آپ بیتی میر ولایت حسین مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۷۰ء صفحہ ۱۸۷۔
۲۲ بھوپال پاسٹ اینڈ پرزنٹ، سید اشفاق علی مطبوعہ بھوپال ۱۹۷۰ء صفحہ ۹۳۔
۲۳ حیات سلطانی صفحہ ۱۶۸۔
۲۴ اردو ادب کی ترقی میں، بھوپال کا حصہ صفحہ ۳۷۳۔
۲۵ تاریخ فرمانروایاں بھوپال صفحہ ۱۷۲۔
۲۶ یاد ایام دوم صفحہ ۱۹۰۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی۔ علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ڈاکٹر محمد نعمان خاں

سرسیّد احمد اور بھوپال

علم وادب کی ترقی، ترویج واشاعت میں ریاست بھوپال کے نوابین کے دوش بدوش بیگمات بھوپال نے بھی اہم رول انجام دیا ہے۔ فتح بی بی، مامجی مولا اور نواب قدسیہ بیگم نے ریاست میں خوشحالی اور امن وامان قائم کرنے کے لیے جہاں اپنی بہترین انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا وہیں نواب سکندر جہاں بیگم، نواب شاہجہاں بیگم اور نواب سلطان جہاں بیگم نے دیگر معاملات کے ساتھ تعلیمی امور پر بھی خصوصی توجہ صرف کی اور اس مقصد کے حصول کی خاطر ریاست بھوپال کے مدارس کے علاوہ دہلی کالج، ڈیلی کالج اندور اور محمڈن کالج علی گڑھ وغیرہ تعلیمی اداروں کی خاطر خواہ مالی اعانت کی۔ مذکورہ تعلیمی اداروں میں جو ادارہ طویل عرصہ تک خصوصی طور پر بیگمات نیز رؤساے بھوپال کی توجہ کا مرکز رہا وہ سرسیّد احمد کا محمڈن کالج علی گڑھ تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اہلِ بھوپال نے اس تعلیمی ادارے نیز اس کے بانی سرسیّد احمد خاں کی اس وقت بھی مالی اعانت کی جب کہ تمام ہندوستان میں سرسیّد احمد اور ان کے رفقاء کے خلاف کفر کے فتوے جاری کیے جارہے تھے اور اس ادارے کے خلاف

مختلف تحریکات سر اٹھا رہی تھیں۔ بقول مولانا حالیؔ۔ دلی، رام پور، امروہہ، مرادآباد، بریلی لکھنؤ، بھوپال اور دیگر مقامات کے ساتھ عالموں اور مولویوں اور واعظوں نے کفر کے فتوؤں پر مہریں اور دستخط کیے تھے۔ محمڈن کالج علی گڑھ اور ریاست بھوپال کے درمیان پہلا تعلق اس وقت قائم ہوا جب سرسید نے ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ نواب سکندر جہاں بیگم نے سرسید کی کوششوں کو بہ نظر استحسان دیکھا اور انھیں تحفہ میں الماس کی قیمتی انگوٹھی پیش کی۔ اس واقعہ کی تصدیق مولانا الطاف حسین حالیؔ کے حسب ذیل اقتباس سے ہوتی ہے۔

"نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ مرحوم رئیسۂ بھوپال نے جب یہ سُنا کہ سید احمد خاں کی کوشش سے ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی ہے تو جون ۱۸۶۶ء میں انھوں نے بطور اظہار خوشنودی کے ایک الماس کی انگوٹھی خاص سرسید کے واسطے بھیجی، سرسید نے جلسۂ عام میں وہ سوسائٹی کے اخراجات کے لیے دے دی۔ لیکن درج ذیل اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ممبران سوسائٹی نے انگوٹھی کو سوسائٹی فنڈ میں شامل کرنے کے بجائے سرسید احمد کو اپنے پاس رکھنے کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اس انگوٹھی کو آپ اپنے پاس رکھیں اور ان کو اپنی کوششوں کے ایسے انعام کے طور پر پہنیں جو بڑی نیک نیتی سے حاصل ہوا ہے اور جب آپ کے بعد آپ کی اولاد اس انگوٹھی کو دیکھے تو اس کی چمک خاندان کو اپنے باپ کی یاد دلائے اور اس کے کاموں کی پیروی کرے اور جب آپ بیگم صاحبہ کو اس کا شکریہ بھیجیں تو ان کو اطلاع کریں کہ جو غرض انھوں نے اس انسٹی ٹیوٹ کے کاروبار میں ظاہر کی، اور جس عمدہ طور سے اس کے بانی کی قدردانی کی اس سے سوسائٹی کے ممبروں کو نہایت خوشی ہوئی۔"

نواب سکندر جہاں بیگم کے بعد ان کی جانشین نواب شاہجہاں بیگم نے اس تعلق کو قائم رکھتے ہوئے نہ صرف مالی معاونت کی بلکہ سائنٹفک سوسائٹی کا سرپرست بننا بھی قبول کیا۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب شاہجہاں بیگم کو بعض علماء کرام

ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نے سر سید احمد خاں اور ان کی سوسائٹی کی طرف سے بدگمان کر دیا چنانچہ اس بدگمانی کو دور کرنے کی خاطر سر سید احمد نے اپنے رفقاء کے ہمراہ یکم ستمبر ۱۸۹۱ء کو بھوپال کا سفر کیا اور سہ روزہ قیام بھوپال کے دوران نواب شاہجہاں بیگم، منشی سید امتیاز علی وزیر اعظم ریاست بھوپال۔ نواب مولوی سید محمد علی حسن خاں بہادر (خلف نواب صدیق حسن خاں) اور دیگر رؤسائے ریاست سے ملاقات کر کے انھیں اپنے فلاحی منصوبوں سے آگاہ کیا۔ سر سید احمد کی اس کوشش سے بیگم صاحبہ کی بدگمانی کسی قدر دور ہوئی۔ اور انھوں نے سر سید کو کالج کی مسجد کی تعمیر کے لیے بارہ ہزار روپیہ نقد پیش کیے جس کے شکریہ کے بطور سر سید احمد نے شاہ جہاں بیگم کی خدمت میں ایک نظم پیش کی۔ بھوپال پہنچنے کے دوسرے دن ۲ ستمبر ۱۸۹۱ء کی سہ پہر کو شاہجہاں بیگم سے ملاقات کا وقت طے ہوا وقت معینہ پر جب سر سید احمد خاں ہمراہ منشی محمد امتیاز علی وزیر اعظم بھوپال۔ تاج محل پہنچے تو یہ دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے کہ محل کے دروازے پر ایک پالکی ان کے لیے تیار ہے اور ان کے درد زانو کی خبر سن کر شاہجہاں بیگم ان سے ملاقات کے لیے قلعہ معلی کے باغ کی بارہ دری میں تشریف لا چکی ہیں۔ اس ملاقات کی تفصیل رپورٹ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۴ اکتوبر ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی تھی، جس کے مطابق حضور ممدوحہ کے اجلاس کا امکان بالاخانہ پر ہے جس پر جانے کے لیے تقریباً تیس پینتیس سیڑھیاں ہیں۔ حضور ممدوحہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ بہ سبب درد زانو کے سید احمد خاں کو سیڑھیوں کا طے کرنا مشکل ہوگا۔ تو نہایت الطاف و عنایاتِ شاہانہ سے ایک باغ کی بارہ دری میں جو محل معلی کے قریب ہے، تشریف لا کر اجلاس فرمانا ارشاد فرمایا اور مزید عنایت و مرحمت سے سید احمد خاں کو دروازہ باغ سے بارہ دری تک بہ سواری پالکی آنے کی اجازت دی۔ سید احمد خاں نے اس نوازش کا بے انتہا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ حضور کی اس نوازش نے مجھے ایسی تقویت دی کہ پالکی سے استعانت لینے کی مجھ کو ضرورت نہ ہوئی۔ باغ کی بارہ دری میں ایک سرخ کپڑے کی اوٹ کے پیچھے نواب شاہجہاں بیگم کپڑے کے سامنے بچھی کرسیوں پر سر سید احمد اور دیگر حضرات آ کر بیٹھے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مطابق جب کہ سید احمد خاں بارہ دری میں داخل ہوئے اور سرخ اوٹ کے قریب پہنچے تو حضور بیگم صاحبہ

نے موافق طریقۂ اسلام۔ سلام علیک کی سید احمد خاں نے اس کا جواب دے کر آداب و تسلیمات عرض کی۔ بیگم صاحبہ نے جو نہایت ذی علم ہیں نہایت خوبی و وضاحت اور نہایت الطاف و عنایت سے سر سید احمد خاں سے گفتگو کی۔ سید احمد خاں نے مدرستہ العلوم کی کیفیت اور مسلمانوں کی حالت اور ان کو حسب متقاضائے زمانہ تعلیم دینے کی ضرورت اور بہ سبب نہ ہونے اس قسم کی تعلیم کے ان کے تنزل کی صورت عرض کی۔ رخصت کے وقت حضور بیگم صاحبہ نے دریافت کیا۔ کہ کب تک یہاں رہو گے، سید احمد خاں نے عرض کیا کہ میں کل جاؤں گا۔ فرمایا کہ بہت افسوس ہے کہ بہت کم یہاں رہنا قرار دیا کم سے کم ایک ہفتہ رہنا چاہیئے تھا۔ بہر حال سید احمد خاں شکریۂ عنایت ادا کرنے کے بعد رخصت ہوئے۔ اس ملاقات کے دوسرے دن جب بیگم صاحبہ نے بارہ ہزار روپے کے کرنسی نوٹ سید احمد خاں کو بھجوائے تو اس عطیہ کے شکریہ میں سر سید احمد خاں نے شاہجہاں بیگم کی خدمت میں حسب ذیل نظم پیش کی۔

اے شاہ جہاں باد جہاں حسب مرامت ۔۔۔ دارائے جہاں یاور و افلاک غلامت
ہم حکم تو نافذ بہ دل خلق جہاں باد ۔۔۔ ہم نظم جہاں باد بہ عنوانِ نظامت
بدخواہ تو پامال لکد کوب حوادث ۔۔۔ طغرائے ظفر باد بہ منطوقِ کلامت
آنانکہ باندیشۂ مدحِ تو گرایند ۔۔۔ بالاتر از اندیشۂ شاں بادِ مقامت
اے نصرتِ اسلام بہ ذات تو مسلم ۔۔۔ دے سکۂ دین پروری امروز بہ نامت
دانی کہ چہ رفتست و چہا می رودِ امروز ۔۔۔ بر امتِ خیر البشر از نکبت و شامت
کارش ز تنزل بر سیدست بہ بجائے ۔۔۔ کش ساختہ خلقی ہدف طعن و ملامت
طوفاں زدہ شد کشتی اسلام مبادا ۔۔۔ کز دست رود رشتۂ امیدِ سلامت
وقت است کہ آنرا برہانند ز طوفاں ۔۔۔ زاں پیش کز و ہیچ نہ پابندِ علامت
تاہست سر درت تکیہ گہہ ملتِ اسلام ۔۔۔ یزدانت معین باد و جہاں بادِ کامت

توشاہ جہاں باشی و خورشید شریعت
پیوستہ درخشاں بود از گوشۂ بامت

نواب سکندر جہاں بیگم اور شاہجہاں بیگم کے علاوہ بھوپال کے جن رؤسا نے

سرسید احمد خاں کے تعلیمی اور فلاحی مشن میں دامے درمے سخنے قدمے، ممکن تعاون کیا ان میں منشی سید امتیاز علی وزیر اعظم بھوپال، میاں عالمگیر محمد خاں بمودر مصنف تذکرہ "شبستان عالمگیری" اور برادر زادہ نواب شاہ جہاں بیگم، اور نواب مولوی سید ابوالنصر محمد علی حسن بہادر المخاطب بہ صفی الدولہ حسام الملک۔ (فرزند ارجمند نواب سید صدیق حسن خاں توفیق) کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ واضح ہو کہ نواب محمد علی حسن خاں اپنے عہد کے مشہور عام تھے۔ ان کے فضل و کمال سے متاثر ہو کر انگریز حکومت نے انھیں "شمس العلمار" کا خطاب عطا کیا تھا۔ نواب شاہ جہاں بیگم ان کی بڑی قدرداں تھیں۔ وہ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹ر نومبر ۱۹۲۶ء کو انتقال کیا۔ "بزم سخن" (تذکرۃ الشعرار)، "فطرۃ الاسلام"، "مردم دیدہ" اور "مآثر صدیق" (سوانح حیات نواب صدیق حسن خاں) ان کی یادگار تصانیف ہیں۔ قومی اور تعلیمی تحریکات سے انھیں گہری دلچسپی تھی لہٰذا وہ سرسید احمد خاں کے گہرے دوست اور زبردست معاون بن گئے۔ انھیں کی کوششوں سے سرسید احمد اور ان کے رفقار کو بھوپال آنے کی دعوت دی گئی اور وہ بدگمانی بھی دور ہو گئی جو کہ شاہ جہاں بیگم کے دل میں سرسید اور ان کے کالج کے تئیں بعض علمار کرام نے پیدا کر دی تھی۔ سرسید احمد، مولوی علی حسن خاں بہادر کو اپنا معتمد ہمنوا اور ہمراز منصور کرتے تھے۔ اور نازک و پیچیدہ مسائل کے تئیں بذریعہ خطوط ان سے مشورہ کر کے ان کے مفید مشوروں نیز مالی تعاون کے تئیں اظہار تشکر بھی کرتے تھے۔ سرسید احمد نے ۲۰ر نومبر ۱۸۹۰ء سے ۱۴ر جولائی ۱۸۹۰ء کے درمیان نواب علی حسن صاحب کے نام جو خط تحریر کیے ہیں ان میں سے صرف ۱۴ر خطوط مطبوعہ صورت میں دستیاب ہیں۔ جن کے مطالعہ سے ان دونوں حضرات کے درمیان بے تکلفانہ تعلقات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ سرسید احمد اپنے سفر بھوپال سے متعلق ان کی مساعی جمیلہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ۸ر اگست ۱۸۹۱ء کو الٰہ آباد سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"جناب مولوی صاحب مخدوم و مکرم، معظم من ابوالنصر مولوی سید محمد علی حسن خاں بہادر۔"

نوازش نامہ عالی محررہ ۲۸ر ذوالحجہ پہنچا۔ ممنون عنایت کیا جو کچھ کہ آپ

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نے واسطے بہتری مسلمانوں کے حق میں سرکار عالیہ سے سعی فرمائی اور مدرسۃ العلوم اور اس ناچیز کے حق میں کلمۃ الخیر فرمائے اس کی نسبت بجز اس کے کہ اجرکم علی اللہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ بلاشبہ سرکار عالیہ کو تائید مدرستہ العلوم میں تامل ہوگا خصوصاً اس وجہ سے کہ مخالفین نے بہت کچھ غلط باتیں نسبت مدرستہ العلوم کے مشہور کر رکھی ہیں۔ اس خیال کو توڑنا اور یہ بات دل میں ڈالنی درحقیقت جس امر کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اور جس کے نہ ہونے سے مسلمانوں کی روز بروز ذلت ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ اسلام کی بھی ذلت ہے۔ اس میں تائید کرنا اور اس ذلت سے مسلمانوں کو نکالنا سب سے بڑی حسنات میں شامل ہیں۔ اگر سرکار عالیہ مسجد ہی کے لیے تائید فرمائیں گی تو بہتر ہے اسی کی کسی قدر تکمیل ہو جائے گی میں کل یہاں سے علی گڑھ جاؤں گا اور وہاں پہنچ کر کوئی تاریخ روانگی بھوپال مقرر کرکے آپ کو اور وزیر صاحب کو اطلاع دوں گا۔ جو خدا کو منظور ہوگا وہ ہوگا مگر آپ نے جو سعی و کوشش کی اس کا شکر ہم پر واجب اور اجر دینا خدا کے اختیار میں ہے۔"

نواب علی حسن خاں بہادر، سرسید احمد کے فلاحی کاموں کے لیے پانچ سو روپیہ ماہانہ رقم پابندی سے روانہ کرتے تھے اور دوسرے امراء اور رؤسا کو بھی اس کے لیے آمادہ کرتے تھے۔ لیکن یہ تمام کام رازدارانہ انداز میں انجام دیئے جاتے تھے۔ اور سرسید احمد کو بھی اس بات کی تاکید کی جاتی تھی کہ وہ اسے مخفی رکھیں جب کہ سرسید احمد اسے اس وجہ سے شہرت دینا چاہتے تھے تاکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب ہو سکے۔ اور قومی عظمت اور اسلامی شوکت کا اظہار ہو سکے۔ چنانچہ علی گڑھ سے ان کے نام تحریر کردہ خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۸۹۰ء میں تحریر کرتے ہیں۔

"آپ کا نوازش نامہ مورخہ تیسری ربیع الثانی ۱۳۰۸ھ معہ قطعہ کرنسی نوٹ تعداد پانچ سو روپیہ پہنچا۔ باعثِ افتخار و ذریعہ ہزاراں اعزاز ہوا۔ گو عطیہ کو میں شعبۂ من الشرک سمجھتا ہوں، مگر اس فیاضانہ مرحمت کو

مدرستہ العلوم کے اور قوم کے لیے فال نیک جانتا ہوں کچھ شبہ نہیں کہ
مدرستہ العلوم اور میری کوشش فلاح قومی دنیاوی امور سے متعلق
ہے لیکن اگر نیت نیک اور تمام کام حسبۃً للہ ہوں تو خدا سے امید
ہے کہ جزا اسے انما الاعمال بالنیات سے جو کہ ایمان ہے محروم نہ رکھے گا
آپ باور کریں یا نہ کریں مگر میں یقین کرتا ہوں کہ اس اسلامی اخوت
اور ہمدردی کی قومی جزا سے خیر ضرور خدا تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے گا یہ
تو مجھ کو یقین کامل ہے جبکہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اس وظیفہ سے
کسی طرح کی شہرت و یادگار آپ کو منظور نہیں ہے اور بلاشبہ خیرات
مخفی ہزاروں درجہ خیرات جلی سے بہتر ہے مگر نیک نیتی اور بے ریائی
کو تسلیم کر کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالنی ضرور ہے کہ اعلان اس قسم کی
خیرات کا جو قومی بھلائی سے نہ شخصی مراعات سے متعلق ہے اور قوم کو
اس قسم کی خیرات کی شدید ضرورت ہے، ذریعہ ہوگا اوروں کی ترغیب
کا اور خیرات دینے والا الدال علی الخیر کفاعلہ میں ضرور داخل ہوگا پس قومی
فلاح کے کاموں میں باعلان خیرات کرنا اگر نیت نیک ہو تو وہ چند اجر
کا مستحق کرتی ہے دوسرے یہ کہ اس اعلان سے قومی عظمت اور اسلامی
شوکت ثابت ہوتی ہے جو ہماری عین تمنا اور آرزوئے دلی ہے۔ آپ نے
مدرستہ العلوم کو ملاحظہ نہیں فرمایا اور جس نے نہ دیکھا ہو اس کے خیال
میں آ ہی نہیں سکتا کہ وہ کیا ہوگا۔ اس کی عمارت جس شان و شوکت
سے بنائی قرار دی گئی اور جس قدر کہ اس وقت تک بن چکی ہے، قومی
عظمت اور اسلامی شوکت کو ثابت کرتی ہے۔ ایک انگریز نے
کہا ہے کہ یہ خیال کہ مسلمانوں میں قومی جوش اور ان میں سے قومی عظمت
جاتی رہی، علی گڑھ میں جا کر اور مدرستہ العلوم کو دیکھ کر بالکل غلط
ثابت ہوتا ہے۔ بس ان وجوہ سے آپ مجھ کو مجاز رہنے دیں کہ اس
روپیہ کو ایک مناسب فنڈ میں داخل کروں اور اس کے ساتھ آپ کے
نام نامی کی بقید ولدیت نشانی قائم رکھوں۔ میرا ارادہ ہے کہ آپ کے

زرِ عطیہ کو بھی اسی فنڈ میں داخل کروں اور آپ کا نام بقید ولدیت کندہ کروں، جبکہ آپ نے یہ روپیہ عنایت کیا ہے اور مجھ کو متولی کیا کہ اس کو کسی کارِ خیر میں صرف کروں تو اب آپ کی اس میں مداخلت ضروری نہیں ہے۔ آپ ثواب میں داخل ہو گئے اب جو گناہ ثواب رہا میری گردن پر ہے۔ اس تحریر کا میں آپ سے جواب نہیں چاہتا میں وہی کروں گا جو اللہ چاہے گا۔ آپ مجھ کو ہمیشہ اپنا نیاز مند ایک عاجز نیاز مند متصور فرمائیں آپ کی خدمت میں نیاز نامجات ارسال کرنے باعث میرے فخر کا ہوگا۔"

سرسید احمد ۲۱ ستمبر ۱۸۹۵ء کے خط میں اپنے تعلق خاطر کو ظاہر کر کے نواب علی حسن خاں صاحب کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی خاطر لکھتے ہیں:

"آپ سے ملنے کو ہمیشہ دل چاہتا ہے مگر فاصلہ اس قدر دور دراز ہے کہ نہ میں آپ کے پاس آسکتا ہوں اور آپ کو ایسے اشغال رہتے ہیں کہ جن سے آپ کو بھی فرصت نہیں ہوتی میں آپ کو اپنا دلی دوست اور معین و مددگار اس قومی کام کا سمجھتا ہوں جس کے انجام پر میں نے اپنی عمر صرف کی ہے۔ اور مجھ کو امید ہے کہ آپ ہمیشہ اس کام کے مددگار رہیں گے۔ اب کے سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس شاہجہاں پور میں قرار پایا ہے جو حسب معمول اخیر دسمبر میں ہوگا اور مجھے امید ہے کہ آپ اجلاس میں تشریف لاویں گے اور مجھ سے اور احباب سے ملاقات ہوگی۔"

سرسید احمد خاں، نواب حسن علی خاں صاحب کو بغرض ملاحظہ کانفرنس کی سالانہ رپورٹ بھیجتے تھے اور دیگر کارروائیوں سے بھی باخبر رکھتے تھے۔ چنانچہ جب کالج کے ہیڈ کلرک نے جعلی چیکوں کے ذریعہ کالج فنڈ سے خطیر رقم کا غبن کر لیا تو اس افسوس ناک واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے ۱۲ جون ۱۸۹۶ء کے خط میں علی حسن خاں صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس نقصان کی تلافی کی خاطر خود بھی چندہ

دیں اور بیگم صاحبہ نیز دیگر احباب کو بھی اس کے لیے آمادہ کریں۔ ایسے نازک حالات میں علی حسن خاں صاحب جو رقم سر سید کو بھیجتے ہیں اس کے موصول ہونے پر سر سید انھیں ۸ ستمبر کے خط میں لکھتے ہیں۔ محمد یعقوب علی صاحب۔ احکام نگار و بخاری جناب کا خط مورخہ ۷ ستمبر ۱۸۹۶ء مع نصف قطعہ نوٹ ہائے تعدادی ایک ہزار روپیہ جو آپ نے از راہ فیاضی و شفقت بزرگانہ بتلافی نقصان کالج عنایت فرمایا ہے میرے پاس پہنچا۔ میں آپ کی عنایت و نوازش کا دل سے شکر ادا کرتا ہوں اور شکر ادا کرتا رہوں گا۔" علی گڑھ کالج کی ترقی کے سلسلہ میں علی حسن خاں کے مسلسل اور بے لوث تعاون سے متاثر ہو کر سر سید انھیں کالج کا ٹرسٹی بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس دلی خواہش نیز دیگر امور کی جانب ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ۱۴ر جولائی ۱۸۹۷ء کو ایک خط تحریر کرتے ہیں کہ "جو کہ مجھ کو آپ کی خدمت میں خالص نیاز مندی ہے اس واسطے میں بلا تکلف تین امر آپ کی خدمت میں لکھتا ہوں آپ بھی بلا تکلف ہاں یا نہ کا ارقام فرما دیں گے۔ امر اول یہ ہے کہ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں آپ کو ٹرسٹی مقرر کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھ کو امید ہے کہ آپ میرے بعد بھی کالج کی بہتری اور سر بلندی کا خیال رکھیں گے۔ دوسرا امر یہ ہے کہ جناب عالیہ بیگم صاحبہ بھوپال نے دس ہزار روپیہ تعمیر مسجد کے لیے عنایت فرمایا تھا۔ اب اس مسجد کی تعمیر کی نوبت پہنچ گئی ہے صرف برج اور مینار اور استر کاری باقی ہے نماز اس میں ہونے لگی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پچاس روپیہ ماہواری یا کم و بیش حضور عالیہ جناب بیگم صاحبہ کی طرف سے واسطے اخراجات مسجد کے مقرر ہو جائے۔

تیسرا امر یہ کہ میں آپ کی عنایت کا اور ان دوستوں کی عنایت کا جنھوں نے واسطے تلافی نقصان کالج چندہ دیا۔ دل سے شکر ادا کرتا ہوں لیکن فاضلات بینک کی اب تک قریب پچیس ہزار روپیہ کے باقی ہے اس کی ادائیگی کے لیے میں چاہتا ہوں کہ چند دوست مل کر بقدر اپنی حیثیت کے روپیہ بطور قرض بلا سود دیں۔ پانچ برس کی میعاد پر اور میں ان کو دستاویز لکھ دوں گا اور بینک سے طمانیت کرادوں گا کہ تاریخ معینہ پر بینک سے روپیہ مل جائے گا۔ ہم کو گیارہ روپیہ سیکڑہ کے حساب سے زر فاضلات سود دینا ہوگا۔ پس آپ ایسی کوشش کر سکتے ہیں کہ حضور عالیہ بیگم

صاحبہ ہم کو کچھ روپیہ قرض دیں۔ یا آپ اپنے پاس سے اور اپنے احباب سے ہم کو کچھ روپیہ قرض دلا سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کا صاف جواب بلا کسی تکلف کے لکھ دیجئے گا۔"

بھوپال سے علی گڑھ کا جو خصوصی تعلق علی گڑھ کالج کے قیام سے قبل شروع ہوا تھا وہ سر سید احمد خاں کے انتقال کے بعد بھی اسی طرح جاری رہا، بلکہ عہد سلطان جہاں بیگم میں اس میں مزید پختگی اور شدت پیدا ہو گئی۔ سلطان جہاں بیگم سب سے زیادہ فعال اور روشن خیال ثابت ہوئیں۔ انھوں نے کالج کی ترقی نیز اسے مسلم یونیورسٹی بنانے میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں، وہ ہماری تاریخ کے روشن باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی فنڈ میں ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ پیش کیا اور دیگر روسائے ریاست کو بھی اس جانب متوجہ کیا۔ کالج سے دلچسپی کے باعث تین مرتبہ علی گڑھ کا سفر کیا اور اپنے چھوٹے صاحبزادے حمید اللہ خاں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر چیفس کالج میں داخلہ کرانے یا انگلستان بھیجنے کے بجائے محمڈن کالج علی گڑھ اس وجہ سے بھیجنا پسند کیا، بقول خود ان کے۔

"ہندوستان میں مسلمان طلبار کے لیے محمڈن کالج علی گڑھ سے بہتر اور کوئی کالج نہیں ہو سکتا اور یہی ایسا کالج ہے جس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمان طلبائے کے مذہب ان کی قومیت کی نشو و نما ہوتی ہے اور جو مسلمانانِ ہند کی آئندہ ترقیوں اور امیدوں کا مرکز ہے۔"

نواب سلطان جہاں بیگم نے علی گڑھ کے تین سفر کیے، کالج کے معائنہ کی غرض سے جولائی ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ کا پہلا سفر کیا اور دوسری مرتبہ ۲۵ فروری ۱۹۱۴ء کو علی گڑھ پہنچ کر یکم مارچ ۱۹۱۴ء تک پانچ دن قیام پذیر رہ کر متعدد قومی پروگراموں میں شرکت کی۔ اس سفر میں بیگم صاحبہ ریاست جنجیرہ اور زہرا بیگم فیضی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ اس سفر کی تفصیلی روداد بیگم فیضی نے نہایت دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔

تیسرا سفر فروری ۱۹۱۶ء میں عمارت کانفرنس کے افتتاح کی غرض سے کیا جس کا نام "سلطان جہاں منزل" رکھا گیا۔ جب علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی بات سامنے آئی تو اہلِ بھوپال اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کسی دوسری ریاست یا شہر سے پیچھے نہیں رہے گھر گھر سے اس کام کے لیے چندہ جمع کرنے کی تحریک

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

شروع ہوئی۔

آبرو بیگم (ہمشیرہ ابوالکلام آزاد اور سکریٹری لیڈیز کلب بھوپال) کی تحریک پر اس مقصد کی خاطر کلب کا پہلا خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا جو ہندوستان بھر میں اس سلسلے کا پہلا اجلاس تھا۔ جسے نواب سلطان جہاں بیگم نے خطاب کرتے ہوئے دلی مسرت کا اظہار کیا اور اہلِ بھوپال سے زیادہ چندہ دیئے جانے کی اپیل کرتے ہوئے کہا:

"سید احمد خاں مرحوم جن کی کوششوں سے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلی اور جنھوں نے اس کالج کو بنایا انھوں نے اور ان کے درد مند ساتھیوں نے آج سے بہت پہلے اس کی کوشش کی تھی کہ مسلمانوں کی یونیورسٹی قائم ہو، جو خود اپنا نصاب بنائے، اس کی تعلیم دے اور امتحان لے کر سند عطا کرے۔ لیکن اس وقت روپیہ نہ تھا، اس لیے یونیورسٹی نہ بنا سکے۔ اس یونیورسٹی کے بنانے کے لیے ایک کروڑ روپیہ کی ضرورت ہے، جس کے واسطے جابجا چندے جمع ہو رہے ہیں اور مسلمان بڑے جوش و شوق سے اس کارِ خیر کی تکمیل میں شامل ہوتے ہیں۔ ہز ہائنس آغا خاں جو ایک بڑے ممتاز اور قابل وی مرتبت امیر ہیں، ہمہ تن اس کام کے انجام دہی کے لیے مصروف ہیں۔ بھوپال میں مردوں کا گروپ نہایت سرگرمی سے اس چندہ کے لیے کوشش کر رہا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ تم سب نہایت فیاضی سے چندہ دو گی اور تمہاری کوششیں کسی طرح اپنے شہر کے مردوں سے کم نہ ہوں گی۔ میں یقین کرتی ہوں کہ تمہاری کوششیں اور امداد، دوسرے شہروں کی مسلمان عورتوں کے لیے ایک عمدہ مثال ہوگی۔ اور یہ ظاہر ہو جائے گا کہ تم کہاں تک اور کس درجہ تعلیم کی دلدادہ ہو، جو سب سے زیادہ اہلِ بھوپال کو ہونا چاہیئے کیونکہ عرصہ سے تم ہر جنس رولر کے فقراتِ ناصحانہ سے مستفید ہوتی ہو۔ یہ جوش صرف اس کلب کی عمارت یا اپنے چندہ دینے تک ختم نہ ہونا چاہیئے، بلکہ تم ایک مسلسل کوشش دوسروں سے بھی چندہ دلوانے کی جاری رکھو، اور اپنے رشتے دار اور قرابت والی بی بیوں

کو بھی آمادہ کرو اور چندہ وصول کرتے وقت اس کا خیال مت آنے دو
کہ کس مقدار کا ہے اور کس سے طلب کیا جا رہا ہے۔ تم کو غریبوں سے
بھی ایک ایک پیسہ نہایت خوشی کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے کیونکہ یونیورسٹی
تمام مسلمانوں کی ہوگی خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔"

نواب سلطان جہاں بیگم دل سے اس ادارے کی ترقی کی خواہاں تھیں جس کے لیے انھوں نے اپنی تحریر اور تقریر نیز عمل سے ممکن کوشش کی بعض وجوہ کی بنا پر جب آغا خاں نے کالج کو دی جانے والی امداد بند کر دی تو سلطان جہاں بیگم نے بذریعہ خطوط امداد جاری کرنے کے لیے پرزور سفارش کی جس کے نتیجہ میں آغا خاں صاحب نے نہ صرف امداد جاری کر دی بلکہ سنین گزشتہ سے متعلق ایک بڑی رقم بھی عطا کی۔ سلطان جہاں بیگم نے نظام حیدر آباد کو علی گڑھ کالج کے معائنہ کے لیے آمادہ کیا اور محمڈن گرلس اسکول علی گڑھ کے لیے گرانقدر عطیہ دے کر اس کے نصاب سے متعلق ایک خاکہ مرتب کر کے پیش کیا۔ ایک بورڈنگ ہاؤس کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یکم مارچ ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ میں مسلم لیڈیز کانفرنس کی صدارت کی اور اس کانفرنس کے نظم و نسق کے لیے گیارہ سو روپیہ سالانہ امداد کی رقم منظور کی ... بھوپال کے آخری فرمانروا نواب حمید اللہ خاں بھی اس ادارے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے۔ انھوں نے یہاں سے نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ اس کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی رہے اور اس سے فارغ التحصیل نامور حضرات کو بھوپال بلا کر مختلف اہم عہدوں پر فائز کر کے ریاست بھوپال کی نیک نامی اور عزت میں اضافہ کیا۔ اس سلسلے میں سر سید احمد کے پوتے سر راس مسعود مرحوم کا نام بطور خاص قابلِ ذکر ہے جنھوں نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے اسی سرزمین بھوپال میں آخری سانس لی۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ محمڈن کالج کے قیام سے لے کر مسلم یونیورسٹی بن جانے تک اور اس کے بعد بھوپال نے غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کر کے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ہماری تاریخ کا ایسا روشن باب ہے جسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

سید نذر الحسن قادری (علیگ)

مسلم علیگڑھ یونیورسٹی
اور
رامپور کے رشتے

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے ابتدائی دور میں والیانِ ریاست رامپور کے عکس ایسے ہی نمایاں نظر آتے ہیں جیسے آج رامپور کے طلبا کی سرگرمیاں یونیورسٹی میں نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ یونیورسٹی میں ابتدا سے آج تک جو کلچر موجود ہے، اس میں رامپوری مزاج صاف نظر آتا ہے۔ گفتگو اور ذہنی مذاق کا لب ولہجہ رامپوری مزاج سے جتنا قریب ہے، اتنا ہندوستان کے کسی دوسرے خطے سے نہیں ملتا۔

حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی جدید علوم کی تحریک ان کے معاصرین کے لیے ابتداً پسندیدہ نہ تھی۔ انگریزوں کے لیے نفرت اور مغربی علوم سے بیزاری کا جذبہ عام تھا۔ اس لیے سرسید کے معاون وہی لوگ ہوتے جو اس وقت انگریزوں سے مراسم رکھتے تھے۔ اس عہد میں سلطنت مغلیہ کے ساتھ ساتھ اکثر ریاستیں ختم یا انگریزوں کے ہاتھوں مغلوب ہو چکی تھیں۔ اہلِ علم اور باکمال ادبا اور شعرا پریشان تھے۔ اس کے برعکس ۱۸۵۷ء کے بعد سے رامپور میں ایسی فضا قائم ہو گئی تھی جو پُر سکون تھی اہلِ علم اور فنکاروں کا یہاں اجتماع ہونے لگا تھا جس کی بدولت رامپور کو "بخارائے ہند" اور خصوصاً نواب کلب علی خاں کے دربار (۱۸۶۵ء تا ۱۸۸۷ء) کو خلیفہ ہارون رشید کے دربار سے تعبیر کیا جانے لگا تھا۔ اس عہدِ زرّیں اور عظمتِ رفتہ کے نقوش "رضا لائبریری" کی شکل میں آج بھی صاف دکھائی دیتے ہیں۔

ـــ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

رامپور کے حکمرانوں کا تعلق انگریزوں سے دوستانہ تھا۔ اس اعتبار سے یہ چھوٹی سی ریاست ہونے کے باوجود انگریزوں اور ہندوستانیوں، دونوں کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہوگئی تھی۔ ایک طرف یہاں کے فرمانروا انگریزوں کو خوش رکھنے تھے، دوسری طرف وہ اس حقیقت کو بھی محسوس کرتے تھے کہ ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کیا جائے؟ ان میں نواب کلب علی خاں سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔ انھوں نے علمی مرکزوں چھاپے خانوں اور مدرسوں کو گراں قدر عطیات دیئے۔ خود رامپور میں انگریزی اور سنسکرت کے مدرسے قائم کیے۔ انھوں نے لڑکیوں کے لیے بھی مدرسہ قائم کیا تھا۔ یہ اقدامات ان کی دور اندیشی اور قوم کے مستقبل کے لیے ان کے افکار کے ترجمان ہیں۔ یہاں اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ قوم نے ان اقدامات پر اتنی کم توجہ کی جس کی خاطر انھیں اخبارات میں اشتہار دینے پڑتے تھے۔ ۲۵ مارچ ۱۸۶۶ء کے "شمس الاخبار" نے جو مدراس سے چھپتا تھا، "انگلش مین" کے اس ضمن میں کیے گئے کالموں کا حوالہ دیتے ہوئے نواب کلب علی خاں کا یہ اشتہار لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت کے بابت چھاپا تھا۔

"چند دنوں پیشتر میں دعوت پر صاحب ایجنٹ لیفٹیننٹ گورنر و کمشنر روہیل کھنڈ کی بریلی کی نمائش گاہ اشیائے کشت و کار کے دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ چونکہ اس وقت ایک جلسے میں لڑکیوں کی پڑھائی کے باب میں مباحثہ اور گفتگو ہوئی تھی، اس لیے مجھ کو اپنی رعایا کی بہبودی و ترقی، اصلاح و فلاح کے لیے یہ لازم ہوا کہ کوئی ایسی تجویز کروں کہ جس سے میرے ممالکِ محروسہ کے لوگ جو آج تک غفلت و جہالت میں گرفتار ہیں، ان سے باز آکر روشن دماغ ہوں اور زیورِ علم و جواہرِ تہذیب سے خوب آراستہ و پیراستہ ہوکر اپنے اموراتِ دینی و دنیوی بخوبی ادا کریں۔ جس طور پر ماں باپ کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت منظور رہتی ہے، بدستور حاکمِ عادل، رحم دل اور نیک نیت کو بھی اپنی رعایا کی بہتری اور خوبی مدام پیشِ نظر رہتی ہے اور اس کو اپنے بچوں کے لیے قائم مقام تصور کرتا ہے۔ ہر آن ان کی تہذیب و رفاہیت کی جانب توجہ رکھتا ہے۔ اس لیے میں نے بھی اپنی رعایا میں تا بہ امکان رواجِ علوم کا دینا واجب و لازم سمجھا ہے۔ پس لڑکیوں کی تعلیم کے واسطے جو مدارس ہوں گے ان کے اخراجات منجانب

ـــــــ
۱۔ ماہ فکر و آگہی علی گڑھ۔ نمبر ۲۰۰۰ء

سرکار جلیں گے۔

چونکہ اس عنوان کا اشتہار عوام لوگ کے لیئے بہت مفید ہے، اس لیئے اس کو جاری کرنا مجھ کو لازم ٹھہرا ہے۔ جو اہلِ اسلام اور ہنود سے اس اشتہار کے دیکھتے ہی اپنی لڑکیوں کو واسطے پڑھانے کے روانہ کردیں گے، انھیں حسب تفصیل محررہ بالا ماہانہ مشاہرہ ملا کرے گا۔ سات اور دس سال کے درمیان کی عمر والی لڑکیوں سے جو داخل مدارس سرکاری ہوں گی، وہ دس سال کی ہوچکنے پر ان کے والدین کو اختیار ہے کہ اور چندے رکھ کر علم پڑھاوے یا بلوالیوے۔ لڑکیوں کے گوشے (پردے) وغیرہ میں کسی طور سے خلل نہ آئے گا۔ اس واسطے کہ ان کی تعلیم کے لیے اچھے گوشے (پردے) کے مکانات اور گوشہ (پردے) والی استانیاں مقرر ہوں گی۔ مدارس میں قرآن، اردو، سنسکرت اور دوسرے علومِ ضروریہ کی بہ درستی پڑھائی ہوگی۔ مجھ کو امید ہے کہ میری کل رعایا نشۂ غفلت کو اپنی آنکھوں سے زائل کرکے میری نصیحت بگوشِ دل وانصاف سماعت کرے گی اور اپنی لڑکیوں کی تعلیم وتادیب کی جانب کہ جس میں فوائدِ دنیا وعقبیٰ متصوّر ہیں، ہمہ تن مصروف رہے گی۔"

اس اشتہار سے یہ واضح ہوگیا کہ جس وقت علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا خمیر تیار ہورہا تھا، رامپور وہ خدمات انجام دے رہا تھا جو اس عظیم ادارے کا بنیادی مقصد نہیں۔

سرسیّد کی ملاقات نواب کلب علی خاں سے خوب تھی۔ خیالات اور طریقۂ کار میں یکسانیت کے باعث وہ سرسیّد کے پورے معاون تھے۔ دونوں انگریزوں سے تعاون کی پالیسی اپنا کر ہندوستانی قوم، بالخصوص مسلمانوں کو زبان وبیان، وضع قطع اور معیارِ زندگی میں انگریزوں سے کمتر نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ دونوں اس راز کو سمجھ گئے تھے کہ حکمراں قوم کو غلام بن جانے کے بعد احساسِ کمتری کے غار سے باہر نکالنے کے لیئے یہ عمل اشد ضروری ہے۔ سرسیّد نے اس کے خلاف کسی ردِّ عمل کو اہمیت نہیں دی۔ نواب کلب علی خاں کو زرِ کثیر صرف کرکے یہ خدمات انجام دینا پڑیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رامپور کے عوام کی جدید علوم سے روگردانی اور توجہ عربی وفارسی علوم پر ہی قناعت کیئے رہنے کی روش سے نواب کلب علی خاں

مایوس نہیں ہوئے۔ انگریزی مدرسہ جو انھوں نے "محل گھر" میں قائم کیا تھا، اس میں طلباء کی تعداد مایوس کن تھی۔ سنسکرت کے مدرسہ میں دو اساتذہ کی موجودگی میں صرف تین طالب علم تھے (اخبار الصنادید، ج ۲ ص۔ ۱۹، مصنفہ علامہ حکیم نجم الغنی خاں مطبوعہ ۱۹۱۸ء مطبع نول کشور، لکھنؤ) اگر آج کے جمہوری دور میں کسی ادارے میں طلباء کی تعداد اتنی کم ہو جائے تو اساتذہ کی تنخواہ گورنمنٹ کو بار گزرتی ہے اور ایسے ادارے کی گرانٹ یا تنخواہ بند ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ نواب کلب علی خاں کی رواداری اور رعایا پروری ہی تھی کہ وہ ایسے مدرسوں کے مدرسین کی تنخواہ کا بوجھ برداشت کیئے رہے سرسید کو بھی ایم اے او کالج کا پہلا گریجویٹ جو مذہبًا ہندو تھا مسلمانوں سے زیادہ عزیز تھا۔

مولانا حالی بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ تحریک سرسیّد میں نواب کلب علی خاں میر کارواں ہیں۔ اس لیئے انھوں نے مدرسۃ العلوم کے افتتاحی جلسہ میں نواب صاحب کی شان میں پڑھنے کے لیئے ایک اردو قصیدہ کہا تھا لیکن نواب صاحب بعض اختلافات کی بنا پر شریک جلسہ نہ ہو سکے تھے۔ البتہ اس قصیدہ کے ۲۹ اشعار ان کے دیوان میں اس نوٹ کے ساتھ موجود ہیں:

"میں نے یہ قصیدہ نواب ممدوح کی شان میں اس وقت لکھا تھا جب وہ مدرسۃ العلوم کا پیٹرن ہونا منظور کر چکے تھے ..."

اس کے علاوہ ۱۸۷۷ء میں دہلی دربار کے موقع پر جس میں حالیؔ، سرسیّد اور اور نواب کلب علی خاں مدعو تھے، حالیؔ نے ۸۷ اشعار کا ایک قصیدہ فارسی زبان میں نواب کلب علی خاں کی شان میں لکھا تھا۔ قصیدہ کے بارے میں حالیؔ کہتے ہیں:

"اس قصیدہ کی تمہید اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ شاعرانہ خیالات میں پہلے پہل انقلاب پیدا ہوا تھا اور مبالغہ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ انھیں دنوں پہلا دربارِ قیصری منعقد ہونے والا تھا جو ۱۸۷۷ء میں بمقام دہلی وقوع میں آیا۔ چنانچہ نواب صاحب کی شرکت کی قوی امید تھی اور انھوں نے سرسیّد کی امدا[د] میں سب سے پہلے سبقت کی تھی اور ان سے فی الجملہ تعارف تھا۔ اس وجہ سے انھیں کو اس قصیدہ کا ممدوح قرار دیا۔"

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

یہ حالی کی محبت ملی اور حب الوطنی کا جذبہ تھا کہ انھوں نے بجائے انگریز حکمراں کے جس کے اعزاز میں دربار منعقد ہو رہا تھا، اپنے ہم وطن رئیس کی شان میں قصیدہ کہا۔ حالی کے اس عمل سے نواب کلب علی خاں کی عظمت جو سرسید کی تحریک کے حامیوں کے دلوں میں تھی، عیاں ہوتی ہے

شمس الاخبار نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۵ مئی سنہ ۱۸۸۱ء میں نواب کلب علی خاں نے اپنی رعایا کے لیئے رفاعی اور فلاحی کاموں کا حوالہ دیتے ہوئے نظام کو ان الفاظ میں متوجہ کیا تھا۔

"... ایک تازی کیفیت نواب صاحب معزی الیہ جو انھوں نے ان دنوں اہالیانِ فرنگستان کے طور پر علم و ہنر کے ترقی دینے کا خیال فرمایا ہے۔ اخبار "ہرکارہ" مورخہ ۱۰ر مارچ سے نقل کی جاتی ہے۔

. نواب صاحب والیٔ رامپور ہندوستان کے چند اچھے، مہذب لائق، مدبر و ہوشمند روٴسا میں شامل ہیں، انھیں زمانے کے نشیب و فراز سے اچھی امتیاز حاصل ہے۔

... انھوں نے اپنی سلطنت کے تمام ممالکِ محروسہ میں اہالیانِ فرنگ کے طور پر ہر ایک علم و ہنر کو بکشادہ پیشانی رواج دینا شروع کیا ہے...

... اب ہم یہاں بکمالِ جرأت و استعجاب قلم بند کرتے ہیں کہ نواب صاحب معزی الیہ سے سہ چند موہ چند مال و منال، دولت و حکومت، قوت و قدرت رکھتے ہیں، سو روٴسائے نامدار جناب نظام دکن وغیرہ کیوں اپنے علاقے کی رعایا کی اطفال کی بہبودی و تعلیم کے لیے ایسے ابوابِ مفید اور نیک کی جانب توجہ کر کے نامور اور فیاضِ عصر کیوں نہیں کہلاتے۔"

۲۳ر مارچ ۱۸۸۷ء کو نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد جنرل اعظم الدین خاں مدار المہام کے اختیارات زیادہ بڑھ گئے تھے اور ان کے زمانے میں علامہ شبلی کے ریاست سے مراسم زیادہ رہے لیکن ۲۷ر فروری ۱۸۸۹ء کو نواب حامد علی خاں کے عنانِ حکومت سنبھالنے پر حالی کے مراسم ریاست رامپور سے پھر بڑھ گئے جو تا حیات قائم رہے۔ حالی ہی کی تحریک پر نواب حامد علی خاں نے مدرسۃ العلوم

کا پیٹرن ہونا منظور کرلیا اور ۲۸ رجولائی ۱۸۹۸ء کو جب سرسید میموریل فنڈ کا ڈپوٹیشن رامپور آیا جس میں نواب محسن الملک، مولوی سمیع اللہ خاں، پروفیسر ماریسن، مسٹر آفتاب احمد خاں، خاں بہادر مولوی زین العابدین خاں، مرزا عابد علی بیگ، حاجی اسماعیل خاں، رئیس دتاولی اور حاجی محمد موسیٰ خاں وغیرہ شامل تھے۔ نواب صاحب نے پچاس ہزار روپیہ نقد اور بارہ سو روپیہ سالانہ کی مستقل گرانٹ منظور کی۔ (وقائع دلپذیر مصنفہ علی اصغر آزاد چشتی)

سرسید نے جب مرادآباد میں فارسی مدرسہ قائم کیا تو اس کے سالانہ جلسے کی صدارت نواب کلب علی خاں نے کی تھی جس کی رپورٹ نصرت الاخبار لاہور نے مع خطبہ صدارت کے شائع کی تھی۔ جن دنوں سرسید غازی پور میں تھے تو انھوں نے وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کے زیر سرپرستی علیگڑھ میں ۱۸۷۲ء میں ایک مدرسہ چند چھوٹے کمروں میں قائم ہوا تھا۔ نواب کلب علی خاں سوسائٹی کے سرپرست اور مربی تھے (سرسید مکتوب بنام سکریٹری گورنمنٹ ممالک مغربی وشمالی (موجودہ یوپی) مورخہ ۱۷ر اکتوبر ۱۸۷۲ء)

جس وقت فوجی چھاونی علیگڑھ سے آگرہ منتقل ہوئی۔ سرسید کے ذہن میں ایک اعلیٰ مدرسہ کے قیام کی اسکیم آئی جس کے لیئے انھوں نے بلٹن کی زمین حاصل کرنا چاہی جس میں نواب کلب علی خاں نے ان کی بھرپور مدد کی۔ یکم مارچ ۱۸۷۴ء کو سرسید رامپور آئے۔ نواب صاحب نے دس ہزار روپیہ نقد اور سو روپیہ ماہانہ کی مستقل امداد دی (اخبار الصنادید ج ۲، ص ۱۵۸) اس مدرسہ کے قیام میں ڈائرکٹر تعلیمات صوبہ شمال مغربی، علیگڑھ کا کلکٹر ایچ جی لارنس اور قائم مقام کلکٹر طرح طرح سے رکاوٹیں پیدا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ مدرسہ کے قیام کے حق میں نہیں تھے جس کے لیے سرسید کو بڑی تفصیلی خط وکتابت جان اسٹریچی گورنر اور سکریٹری جان ایلیٹ سے کرنا پڑی۔ جس میں انھوں نے قائم مقام کلکٹر علیگڑھ کی شکایت بھی سکریٹری سے کی تھی (خطوط سرسید مورخہ ۴ رمارچ و ۱۹ رمارچ ۱۸۷۴ء)

سرسید نے ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کے مدرستہ العلوم کے افتتاحی خطبہ میں فرمایا تھا:

"ہم احسان مندی اور فخر کے ساتھ نواب محمد کلب علی خان بہادر والی رامپور کا
نام بیان کرتے ہیں جن کو کمیٹی کے پیٹرن ہونے کی حیثیت سے ہماری کوشش
کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور جنھوں نے بڑی دریا دلی سے اپنی فیاضی ظاہر فرمائی ہے۔"

دوسرے موقع پر سرسید کہتے ہیں:

"مدرسۃ العلوم کے لیے علیگڑھ میں زمین کے حصول اور ابتدائی تعمیر کے لیے
سرمایہ فراہم کرنا نواب کلب علی خاں کا رہینِ منت ہے۔"

حالانکہ بعض امور میں نواب کلب علی خاں کو سرسید سے اختلاف بھی تھا
پہلا اختلاف یہ تھا کہ نواب کلب علی خان یہ مدرسہ رامپور میں قائم کرنا چاہتے تھے
لیکن کمیٹی کے ممبران کی اکثریت علیگڑھ کے حق میں تھی۔ جیسا کہ سرسید نے اپنے مکتوب
مورخہ ۷ ار اکتوبر ۱۸۷۲ء میں واضح کیا ہے کہ "یہ مقام بہ نسبت دوسرے مسلمانی اضلاع
کے نہایت عمدہ موقع پر واقع ہے اور بذریعہ ریل پنجاب، روہیل کھنڈ اور بندیل کھنڈ
سے ملا ہوا ہے۔"

دوسرا اختلاف یہ تھا کہ نواب صاحب عوامی فلاح کے ساتھ ساتھ اسلامیات
کو عربی زبان میں مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔ جیسا کہ ان کے فرمان مورخہ
۲۳ رمئی ۱۸۷۴ء سے واضح ہے، یہ فرمان رامپور سے جاری ہونے والے ہفت روزہ
"دبدبہ سکندری" کے ۲۲ جون کے شمارہ میں مدیر کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔
(اس وقت یہ فائل جناب حکیم ظل الرحمن صاحب پروفیسر طبیہ کالج علیگڑھ کا مملوکہ و
مقبوضہ ہے جس کی فوٹو کاپی راقم السطور کو ڈاکٹر شعائر اللہ خاں کے توسط سے حاصل
ہوئی ہے، جس کے لیے ان کا مشکور ہوں) فرمان کی نقل جو فارسی میں ہے اور اس
کا اردو ترجمہ نذرِ ناظرین ہے۔

اصل فرمان کا متن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ حمد الشاکرین ونصلی علیٰ خیر خلقہ سیدنا
ومولانا شفیعنا محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نقل مہر سرکار ابد قرار دام اقبالہ

دریں ایام فرخندہ فرجام کہ خاں صاحب مہربان دوستاں سید احمد خان بہادر سی ایس آئی جج عدالت مقدمات خفیفۂ بنارس خواستہ اند کہ بنای مدرسۂ مخاطب بمدرسۃ العمدیہ در بلدہ علیگڑھ عرف کول انداختہ در باب تعلیم و تدریس عامۂ خلائق کوششی بکار برندو برای انصرامش یکتا مجلس شورہ کہ در اصطلاح اہل ہند بہ کمیٹی شہرت وارد مامور گردیدہ و حالا ارباب کمیٹی بخدمت ما برای بذل شفقت و بزرگداشت ملتمس گشتہ از آنجا کہ بفضل تعالیٰ جل شانہ، وعم نوالہ ہمت ما دائما بشیوع امر خیر مایل بیماند و امری کہ در ضمن آں اصلاح جمہور خصوصاً رفاہ زمرہ صائبہ اہل اسلام و آسایش فرقۂ ناجیہ حلقہ بگوشان حضرت خیر الانام افضل الصلوٰۃ والسلام میباشد بدل می پسندیم لہٰذا استدعای کمیٹی را منظور ساختہ اشہب عزیمت را بعرصہ سرانجامش باین صورت مطلق العنان ساختیم کہ دہ ہزار روپیہ نقد برای بنایش و یک صد روپیہ ماہانہ از منافع نوٹ کہ ہنگام عزیمت سفر خجستہ اثر حجاز وقف و اندریں باب خطی بخدمت صاحب ایجنٹ بہادر نیز مرسل فرمودہ ایم دوا ما برای مصارف آن مقرر کردہ شد پس ارباب کمیٹی را ملتزم افتاد کہ مواجب مرقومہ را بترویج و تعلیم علوم دین متین مثل فقہ و تفسیر و حدیث در زبان عربی مطابق مذہب مختار حضرات اہل سنت والجماعت امت برکاتہم صرف کردہ باشند بلکہ این عطای ماہانہ را براہین مبنی پنداشتہ بدانند کہ اگر خدا نخواستہ این سلسلہ موقوف گردید آں نیز حذف خواہد شد حالا ارباب کمیٹی را لازم کہ این تحریر مسجل را بطور سند نزد خود داشتہ ہموارہ بدعای دولت مشغول و موظف مانند و در پی حک نقوش بدعات و ظلام دامن برکمر زدہ شبا روزی در رضای حضرت حق و حبیب سید آن روحی و قلبی فداہ بصد دل و جان سعی بلیغ نمودہ باشند کہ ہمیں کاسۂ صدا خواہد داد۔ (شہری مطبوعہ ۱۹۰۵ء جے نرائن پریس، لکھنؤ صفحہ ۱۱۲، ۹ و اخبار الصنادید، ج ۲ ص ۴۴۵)

فرمان کے بارے میں مدیر دبدبۂ سکندری کا نوٹ

ایک عمدہ امر اشاعت خیر و برکات نشر و ایج حسنات کا ظہور میں آیا ہے (جس کو ہم) ادنیٰ (را سے) ہم رقم کرتے ہیں کہ جناب مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی جج مقدمات خفیفہ بنارس نے مقام علیگڑھ عرف کول میں ایک مدرسہ بنانے کا

ارادہ کیا ہے اور اس مدرسہ کا نام مدرسۂ محمدیہ رکھا ہے بندگان عالی نے جو یہ خبر پائی ہمت والا اوج پر آئی۔ دس ہزار رو اس کی تعمیر میں صرف کے واسطے · یا اور سو روپیہ مشاہرہ اہلِ مدرسہ کے مصارف کے واسطے ماہانہ مقرر کیا۔ سند اس عطا کی جو سرکار فیض آثار سے مرتب ہوئی ہے درج صحیفہ اخبار ہے اس کی مضمون سے حسن نیت بندگانِ حضور مثل آفتاب آشکار ہے

اصل فرمان کا ترجمہ

ان دنوں ہمدردِ دوستاں سید احمد خان بہادر سی ایس آئی جج عدالت مقدمات خفیفہ نے ارادہ کیا ہے کہ ایک کالج کی بنیاد ڈالی جائے جس کا نام محمڈن کالج علیگڑھ عرف کول ہو۔ خلائق کی تعلیم و تدریس کے لیئے جس سلسلے میں وہ کوشش فرماہے ہیں اور کالج مذکورہ کے انصرام کے لیئے ایک مجلسِ شوریٰ مرتب کی ہے جو اہلِ ہند کی اصطلاح میں کمیٹی کہی جاتی ہے چونکہ اس کی بنیاد قائم ہو چکی ہے اور ارباب ارباب کمیٹی ہماری خدمت میں تعاون اور مالی امداد کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہم ہمیشہ امر خیر کی طرف مائل رہتے ہیں۔ ہم ہمیشہ اصلاحِ جمہور اور اہلِ اسلام جو حضور خیر الانام سے متمسک ہیں، بجان و دل ہر خدمت کے لیئے حاضر رہتے ہیں اور اس سعادت کو دل سے پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا کمیٹی کی استدعا کو منظور فرماتے ہوئے دس ہزار روپے نقد قیام کالج کے لیے اور ایک سو روپے ماہانہ منافع نوٹ کی شکل میں اور چونکہ اس وقت میں عازم سفر حجاز ہوں اور اس سفر کی اجازت کے لیئے پولیٹکل ایجنٹ کی خدمت میں درخواست بھیج چکا ہوں، ہم نے رقم مذکورۂ بالا بتصرف کالج مذکور مقرر کر دی۔ لہٰذا اربابِ کمیٹی پر واجب ہے کہ رقم مذکورہ کو تعلیم علوم دینِ متین مثلاً فقہ اور تفسیر و حدیث جو عربی زبان میں ہیں، بطریقِ مذہب اہلِ سنت والجماعت صرف کریں۔

اگر یہ عطیۂ ماہانہ خدانخواستہ اس طرح پر صرف نہ ہوگا تو یہ چیز حذف ہو جائے گی (کہ پھر اس طرح کا مالی تعاون مسدود کر دیا جائے گا) اب اربابِ کمیٹی کو لازم ہے کہ ہماری اس تحریر کو بطور سند سمجھ کر ہمیشہ ہماری ریاست کے لیئے دعائے خیر

فرمائیں اور بدعات و شنعیات کے مٹانے میں شب و روز کمربستہ رہیں اور اللہ اور اس کے حبیب کی رضاجوئی کے لیے جان و دل سے کوشش کرتے رہیں کیونکہ یہی کاسہ صدا دے گا۔

والصلوٰۃ والسلام علیٰ ختم المرسلین وآخرِ دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

(مرقوم ششم ربیع الآخر ۱۲۹۱ھ مقدسہ مطابق بست و سوم ماہ مئی ۱۸۷۴ء)

۱۹۰۰ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس رامپور میں منعقد ہوا جس کے اہتمام اور نواب صاحب کی دلچسپی کی تفصیل سے تاریخ اور اخبارات کے اوراق مزین ہیں۔ اجلاس ۲۷ دسمبر تا ۳۰ دسمبر جاری رہا لیکن ۲۵ دسمبر ۱۹۰۰ء تا یکم جنوری ۱۹۰۱ء تمام سرکاری دفاتر کی ایک ہفتہ تعطیل رہی۔ (اخبار الصنادید، ج ۲، ص ۴۴۶)

۹ مارچ ۱۹۰۱ء کو نواب حامد علی خان جب علیگڑھ گئے تو تمام حکام انگریزی وابستگانِ مدرسۃ العلوم اور رؤسا نے ان کا پرشکوہ انداز میں استقبال کیا۔ طلبا نے تو اس حد تک خوشی کا اظہار کیا کہ باوجود منع کرنے کے شکرم سے گھوڑے ہٹا کر خود گاڑی کو کھینچ کرلے گئے۔ اس موقع پر نواب صاحب نے سو روپیہ ماہانہ مستقل امداد میں اضافہ کیا جو سو روپیہ ماہانہ نواب کلب علی خاں کے عہد سے چلے آرہے تھے اور تیس ہزار روپیہ ملکہ وکٹوریہ کی یادگار قائم کرنے کے لیے نقد دیئے اور بیس ہزار روپیہ بعد میں اسی مد میں ارسال کیے (اخبار الصنادید ج ۲ ص ۱۹ ۴م) ۱۹۰۹ء میں محسن الملک فنڈ میں پندرہ ہزار روپیہ اور سوئز کلب کے چندے میں دس ہزار روپے دیئے۔ اسی بنا پر طلبا یونین کی عمارت کا نام "رامپور حامد ہال" رکھا گیا ہے

(اخبار الصنادید، ج ۲، ص ۴۴۵، ۴۵۱)

۸ فروری ۱۹۱۱ء کو ہز ہائی نس سر آغا خاں رامپور تشریف لائے۔ اس موقع پر مدرسہ کو یونیورسٹی کی شکل میں ترقی دینے کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپیہ یکمشت دیا۔ (اخبار الصنادید، ج ۲ ص ۴۰۹) (۱۹۲۰ء میں کالج یونیورسٹی بن گیا) اپنی ذاتی امداد کے علاوہ دوسرے امرا اور رؤسا کو ترغیب دلانے کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہاں نقل کرنے سے قبل مولانا آزاد کے اس قول کی روشنی میں کہ:

"جب کوئی حقیقت نکتۂ عروج کو پہنچ جاتی ہے تو انسانوں کا رنگ اختیار کرلیتی ہے"

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نواب حامد علی خاں (۱۸۸۹ء تا ۱۹۳۰ء) جن کے کروفر کی داستانیں زبان زدِ خاص و عام ہیں، ان میں کتنی افسانویت ہے اور کتنی حقیقت؟ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن یونیورسٹی سے دلچسپی اور کام کی لگن کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ انھوں نے نظام حیدر آباد (میر محبوب علی خاں) سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی اور حیدر آباد آنے کی اطلاع اس مضمون کی بھیجی کہ سر آغا خان نے مجھ سے یونیورسٹی کی بابت آپ کو متوجہ کرانے کی اپیل کی ہے۔ اس پر ریذیڈنٹ نے تار دیا کہ نظام فی الوقت آپ کی میزبانی کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ نواب حامد علی خاں نے پھر تار دیا کہ،

"میرا حیدر آباد آنا بحیثیت والی ملک کے نہ ہوگا بلکہ مسلم ایجوکیشن کی تائید میں ایک ادنیٰ کام کرنے والے کی حیثیت سے ہوگا۔"

ریذیڈنٹ نے جوابی تار دیا کہ نظام نے عذر لنگ کیا اور پہلو تہی سے کام لیا۔ اس سلسلے میں ان سے مراسلت بے سود ہوگی (اخبار العنادید ج ۲، ص ۴۴۸) یہ بات جدا رہی کہ ان کے جانشین میر عثمان علی خاں نے ادارے کی ایسی خدمت کی جس نے باپ کی عدم توجہی کی کمی کو پورا کر دیا۔

۲۲ر دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس کی صدارت بھی نواب حامد علی خاں نے ہی کی تھی۔ (اخبار العنادید ج ۲، ص ۴۳۲)

ان کے جانشین نواب رضا علی خان (سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۴۹ء) نے سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۴۷ء یونیورسٹی کے پرو چانسلر اور سنہ ۱۹۴۷ء تا سنہ ۱۹۵۳ء بحیثیت چانسلر اپنی ذمہ داری کو نبھایا۔

رامپور سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا جو تعلق رہا ہے، رہے گا۔

پھولوں کی تابناکی بتاتی یہ ہے کہ ہے
میرے چمن کی خاک میں گرمیٔ رامپور
کہتے ہیں بام و در یہ مری درس گاہ کے
تا انتہا رہے گی یہ گرمیٔ رامپور
جس کی بنا میں خشت لگی ہے کیفر کی
اس قصر کی فضا میں ہے گرمیٔ رامپور

سہ ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سیّد شکیل احمد

سرسیّد اور حیدرآباد

سرسیّد نے اپنی تعلیمی تحریک کے سلسلے میں سرسالارجنگ اوّل سے خط وکتابت کا آغاز کیا تھا لیکن بہت جلد یہ خط وکتابت شخصی دوستی سے بڑھ کر امورِ مملکت میں مشاورت کی سطح تک جا پہنچا۔ سالارجنگ ان دنوں (یعنی ۱۸۷۱ء) میں حیدرآباد میں قائم ایجنسی کے رکن بھی تھے اور ریاستِ حیدرآباد کے نظم ونسق کی تجدید میں مصروف تھے۔ سر سالارجنگ کو اس سلسلے میں نظم ونسق کے ماہرین کی خدمات کی ضرورت تھی اور یہ ضرورتِ برطانوی ہند سے ہی پوری ہو سکتی تھی۔ چنانچہ سالارجنگ نے سرسیّد کے نام ۲۷ر جون ۱۸۷۳ء کو ایک خط میں یوں اظہارِ خیالات کیا:

'As I am aware you take great interest with advancement of our Native State, I do not apologize for troubling you on the subject of this letter

I am in want of the services of a few thoroughly good and efficient native gentlemen for service in the Revenue Judicial and Account Departments

I do not care to place much reliance on certificates they may possess but would like you to judge from your own knowledge and experience of them They should be men of experience at character judgement honesty and zeal and not of an apathetic nature and only do what they are told but be of such intelligence as to be able to suggest improvements

I would offer a salary of from 400 to 600 Govt Rupees per mensem and promotion would depend on themselves should the candidates have a knowledge of English it would be a great advantage and I am not at all particular as to caste as long as the applicant is respectable

Should you find such men and in whom you can place confidence pray let me hear all particulars regarding them. I will then let you know whether their services should be secured or not I have addressed another gentlemen on this subject also
(Letter Book From 18th Jan 1858 to 31st Dec 1873 – AP 615 - 16)

سرسیّد کی طرح سالار جنگ نے ایک خط سیّد حسین صاحب بی۔ اے لکھنؤ
کو بھی لکھا تھا۔ سرسیّد نے اس خط کے جواب میں کیا لکھا اس کا اندازہ خود سالار جنگ
کے دوسرے خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے سرسیّد کو ۱۸ اگست ۱۸۷۳ء کو لکھا
(حیدر آباد کے نظم و نسق پر مشاورت کے سلسلے کا صرف ایک خط د
سرکاری اشلہ میں موجود ہے اور وہ ۱۸۶۸ء کا ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے)

I am obliged to you for your favour of the 2nd instant, furnishing me with the names of a few native gentlemen whom you confidently recommended for employment under this government.

Maulvie Mehdi Ali at present Deputy Collector of Mirzapur appears to be suitable person from your recommendation, and I shall be willing to give him employment on salary of Govt Rupees 513-3-9 which is equivalent to 600 Rupees of this Govt Coin After a service of from 3 to 5 years his pay will increase by 200/- we are now drawing up pension Rules but he should avail himself of the British Govt Rules in force and by paying so much a month to them will procure a pension from them also

If the other gentlemen named, you do not mention what their present emoluments are and whether they are conversant with the English language I shall feel glad if you could furnish me with information on these points You are of course aware of the necessary qualification of the person I require and as intimated before, I have asked others to recommend a few also if you kindly send me full particulars of one more it will be sufficient

I know you to be an able officer and of sound good judgement and sense, and therefore do not hesitate to ask how it was that in the first instance you told me that there was no one you could with confidence recommended? Am I right in thinking that you did not like the responsibility or that you supposed that through proficiency in English was sine que non? I should like to know your reason much, for it would probably assist me greatly in making selections and it would be giving me the opinion of a man of your standing and judgement

Thanking you for the trouble you are taking
(- do PP 634 35)

سالار جنگ کے مذکورہ بالا خط سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ سرسیّد نے
اپنے خط میں کیا لکھا ہوگا۔

سالار جنگ کا اس سلسلے کا تیسرا خط ۲ ستمبر ۱۸۷۳ء کا ہے یہ سرسید کو بنارس ہی کے پتہ پر لکھا گیا ہے اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرسید نے سالار جنگ کے خط کے جواب میں کن امور کو اٹھایا تھا۔

I have been duly favoured with your letter of 26th ultimo

I appreciate your motive in having in the first instance hesitated accepting the responsibility of recommending Native gentlemen for service under this state but you have *in part misunderstood me* for I did not for a moment expect that you should be responsible for the future characters and actions of any individual but that you might be able to recommend persons of whose capacity you could judge and who you have known to have hitherto upright characters

I can not agree with you in your opinion that a person possessing a true sense of honour and a faithful conscience can not yet an honorably in Native States. I am of opinion that a man of the character traced by you if he be really hounourable can remain so in any corrupt atmosphere and instead of becoming tainted himself might indeed ought to purify it and as to Native States in general and this one in particular you will easily conceive that had not honest and good men been wanted and considered valuable I should not have taken the pains to trouble you, for mere courtiers you are aware are easily procurable

(Ibid PP 641)

دیسی ریاستوں کے سلسلے میں سرسید کا نقطۂ نظر شمالی ہند کی چھوٹی چھوٹی نوابی ریاستوں میں پائے جانے والے خوشامدانہ ماحول سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سالار جنگ کے پیش نظر چونکہ نظم و نسق کی اصلاحات تھیں اور اس کے لیے وہ باکردار اور باصلاحیت عہدیداروں کی فراہمی کو اہمیت دے رہے تھے اور وہ بھی ایسے مضبوط سرشت کے حامل لوگ جو اپنے ماحول سے متاثر ہو جانے کے بجائے خراب ماحول کی اصلاح پر کمربستہ ہو سکیں۔ اس لیے انھوں نے ابتداً ہی سرسید کو لکھ دیا تھا کہ ان کے تجربہ میں جو لوگ کردار، قوتِ فیصلہ، دیانتداری اور جوشِ کارکردگی سے متصف ہوں ان کی نشاندہی کریں تاکہ انھیں ریاست کے ذمہ دارانہ عہدوں پر لیا جا سکے۔ سرسید نے اولاً مولوی مہدی علی کے نام کی سفارش کی، بعد کے خط میں منشی مشتاق حسین کا تذکرہ کیا۔ چنانچہ سالار جنگ نے اپنے چوتھے خط میں جو ۳ نومبر ۱۸۷۳ء کو سرسید کے نام لکھا گیا تھا یوں تحریر کیا ہے

(D)

I must begin with an apology for not having replied to your letter of the 17[th] September last but you will readily accept my excuse, when I say that my time has of late been occupied with some important matters

I have taken careful consideration all you have kindly taken the trouble of State regarding Maulvi Mehdi Ally and Moonshi/Mushtak Hoosain

With reference to the former it would be an easy matter to obtain the Residents consent to a transfer of the Maulvi s services but *I* think you will agree with me that the servant will serve the master better and the master be better pleased with the servant when they are both independent of outer *influence I therefore approve of your suggestion that Mehdi Ally should* obtain leave and come up to Hyderabad I have confidence that the Maulvi will be thoroughly willing to remain and will be quite satisfied

I am only sorry that the Maulvi should have considered it necessary to suggest any thing having the semblance of conditions especially as he himself and through friends sought employment under this state some time ago at a time when I had not perfected arrangement which would have enabled me to give him employment

My present purpose is appoint the Maulvi on duties similar to those of settlement officer or as judge of the civil court, but the later should not be taken for granted as I shall not be able to appoint him to it for three or four months after his arrival of which time he will have become used to the usages of his court and the people

It would be as well if Mushtak Hoosain also come up on leave after *some time as the Maulvi or as soon as after as possible and I will give him* an appointment suitable to the one he previously held "

(- do P P 664 66)

دو ماہرین نظم و نسق کی خط و کتابت میں امور انتظامی کے سلسلے کے بیش قیمت
نکات کو جا بجا ملنا ہی چاہیئے مگر متعلقہ ذمہ داری میں جذبات انسانیت کی قدر و قیمت
کا جو لحاظ ہونا چاہیئے اس کی مثال سالار جنگ کے حسب ذیل خط سے واضح
ہے (سالار جنگ کا خط سر سید کے نام مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۸۷۳ء)

"I have been favoured with your obliging letter of 13[th] current and was sorry to learn of the death of the only son of Maulvi Mehdi Ally

Pray intimate to him and to Munshi Mushtaq Hoosain that they need not wait for the further instruction from me, but leave for Hyderabad as soon as they can

With reference to your suggestion that they should receive some pecuniary assistance to help them in coming upto Hyderabad, I regret not being able to do so as is not usual to send advance, but if on their arrival here they should be in need of funds, arrangements to meet their wants can be made and the sum advanced stopped from their pay

I am glad to hear of your intended trip to the Punjab and if carry out your present intention of during your next vacation visiting Bombay Madras and possibly Hyderabad I shall be very glad to see you as my guest

(do P P 688 89)

سرسید نے آئندہ سالوں میں حیدرآباد کا دورہ کیا یا نہیں یہ ان کے خطوط سے معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سلسلے کی کوئی مثل دستیاب ہے۔ سالار جنگ کے خطوط مورخہ ۱۰ فروری اور ۱۷ اپریل ۱۸۷۴ء سے جو رسمی نوعیت کے ہیں نظم و نسق کے سلسلے کی کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔ البتہ ان کے خط مورخہ ۲۸ اپریل ۱۸۷۴ء سے چند اہم امور پر روشنی پڑتی ہے۔

I have the pleasure to acknowledge the receipt of your letter of the 22nd instant

I am glad to find I was mis-informed that Maulvi Mehdi Ali had declined coming to Hyderabad and am both satisfied and pl ased with the reasons which prevent his coming before the end of the year

It is incumbent on a faithful servant of Government to fulfil the more especially in a time of need like present and as you are aware of the friendship existing between the British Government and ours the services rendered to the former cannot but be gratifying to us

I, shall be glad when Maulvi Mahdi Ali has completed the duties entrusted to him to see him in Hyderabad

I am glad to hear of Munshi Mushtak Hoosain s promotion and shall be glad if he can come over to Hyderabad

(Letter Book P 65 2nd Jan 1874 to 16th July 1877)

اس کے بعد سالار جنگ کا ایک اور خط مورخہ ۱۵ مئی ۱۸۷۴ء ہے جو سرسید کو گورکھپور کے پتے پر لکھا گیا ہے، اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے سوائے اس کے کہ مولوی مہدی علی صاحب کی جلد از جلد حیدرآباد پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔

البتہ سرسید کا اصلی خط (ORIGINAL LETTER) سالار جنگ کے نام مورخہ ۴ اگست ۱۸۷۸ء سرکاری امثلہ میں موجود ہے اور مذکورہ مثل کے مضمون سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد کے نظم و نسق کی تنظیم جدید کے سلسلے میں ہی یہ تحریر کیا گیا تھا لیکن مذکورہ مثل میں یہی ایک دستاویز ہے اور وہ بھی بغیر کسی

تحریری احکامات کے یونہی شریک مثل کر دی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امثلہ کی تدوین تصویہ کے وقت یہی ایک خط دستیاب ہوا ہوگا اور باقی سابقہ خطوط سالار جنگ کے دفتر میں رہ گئے ہوں گے اس خط میں چند امور لائق توجہ ہیں:

۱۔ مولوی مہدی علی حیدر آباد میں رجوع بکار ہو چکے ہیں۔

۲۔ سالار جنگ نے ایک مرتبہ پھر سرسید سے نظم و نسق کی اصلاح کے سلسلے میں ان کا تعاون طلب کیا ہے۔

۳۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب (خازن علیگڑھ کالج) کو بھی حیدر آباد میں ملازمت کی پیش کش کی گئی تھی مگر موصوف نے قبول نہیں کیا۔

اور سب سے اہم انکشاف یہ کہ سرسید نظم و نسق محکمہ مال کے لیے ایک کتاب بنام (A GUIDE TO THE REVENUE OFFICERS) لکھ رہے تھے جس کے وقت قریب میں اختتام پذیر ہونے کی اطلاع انھوں نے سالار جنگ کو دی تھی۔ چونکہ اس خط کے جواب کا مسودہ ہمیں نہیں مل سکا اس لیے سرسید کا خط جوں کا توں پیش نظر ہے۔

Sub Sir Syed Ahmed's letter to Sir Salar Jung I, regarding certain matters pertaining to the administration of Hyderabad (Copy)

Aligarh
The 4th August 1878

May it please your Excellency,

With many thanks I beg to acknowledge receipt your esteemed favour of the 29th June I shall esteem it a great privilege and an honour to be asked to assist in matters connected with the administration of the Hyderabad State and offer my assurance to your Excellency that I shall not fail to render such service, as lies within my humble power, to your Excellency

I am glad to find that your Excellency has desired maulvies Mehdi Ali to pay a visit to me It will give me full opportunity of discussing the points on which he is desirous to take my advice

It is a source of no small gratification to me that your Excellency approves of my guide for the Revenue officers, which I hope to complete soon

I, would have long before submitted to your Excellency the name of Maulvi Sameeullah Khan had I been certain that he would consent to go to Hyderabad However, I shall do my best to induce him to accept an appointment under His Highness the Nizam's Government and I feel sure that Maulvi Mehdi Ali's presence here will be of no small help to me in this matter

With best respects and sincere wishes for your Excellency's welfare and the success of your administration

Believe me,

Yours obediently

Sd/- Syed Ahmed,

(File No L4/C123 Private Secretary's office) 1878

حیدر آباد کے مدارس کے لیے علیگڑھ سوسائٹی کا انگریزی فنی کتابوں کا اردو ترجمہ

سرسید نے علیگڑھ سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے سالار جنگ کو جو خط ۲؍ جنوری ۱۸۷۱ء کو لکھا تھا اس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ اس خط کے ذریعہ سرسید نے سوسائٹی کی سرگرمیوں سے واقف کراتے ہوئے خصوصاً اس کے پیش نظر انگریزی فنی کتابوں کے اردو ترجمہ کی ضرورت اور اس غرض کے لیے مجوزہ اسکیم سے روشناس کرایا ہوگا۔ چنانچہ سالار جنگ نے فوراً حسب ذیل کتب ریاضی کی فراہمی کے لیے سرسید کو اپنے خط مورخہ ۱۲؍ جنوری ۱۸۷۱ء میں لکھا اور ساتھ ہی ایک ہزار چھپن روپے ۴ آنے بطور پیشگی بذریعہ ہنڈی روانہ کیے۔

۱۔ ٹوڈ ہنٹر کی اقلیدس (TOD HUNTERS EUCLID) پچاس عدد۔ قیمت پچاس روپے مبلغ ایک روپیہ فی عدد کے حساب سے۔

۲۔ ٹوڈ ہنٹر کا جبر و مقابلہ (مبتدیوں کے لیے) (Tod Hunter's Algebra for beginners) پچاس عدد قیمت ۳۷ روپے ۸ آنے مبلغ بارہ آنے فی عدد کے حساب سے۔

۳۔ ترسیمات (Trignometry Tod Hunter's) پچاس عدد۔ قیمت پچاس روپے۔ مبلغ ایک روپیہ فی عدد کے حساب سے۔

۴۔ مساحت (Mensuration Tod Hunter's) پچہتر عدد قیمت چھپن روپے۔ مبلغ بارہ آنے فی عدد کے حساب سے۔

۵۔ جبر و مقابلہ برائے کالج و اسکولس (Algebra for Colleges & Schools by

Tod Hunters) پچاس عدد۔ قیمت پچھتر روپے۔
مبلغ ایک روپیہ آٹھ آنے فی عدد کے حساب سے۔

۶۔ ترسیمات سادہ (Plane Trignometry Tod Hunters)
قیمت ۷۳ روپے ۸ آنے ۔ مبلغ بارہ آنے فی عدد کے حساب سے۔

۷۔ ترسیمات کروی (Spherical Trignometry Tod Huntrers) پچھتر عدد۔
قیمت چھپن روپے چار آنے۔ مبلغ بارہ آنے فی عدد کے حساب سے۔

۸۔ نظریہ مساوات ابتدائی (Elementary Treatise on The Theory Equation
on by Tod Hunters) پچاس عدد۔ قیمت پچاس روپے۔
مبلغ ایک روپیہ فی عدد کے حساب سے۔

۹۔ پیمائش ارضی Plane Coordinate Geometry as applied to the Straight
Line and Conic Sections by Tod Hunters)
قیمت ایک سو بارہ روپے آٹھ آنے۔ مبلغ ایک روپیہ آٹھ آنے فی عدد کے
حساب سے۔

۱۰۔ انٹیگرل کیلکولس

قیمت ایک سو بارہ روپے ۸ آنے۔ مبلغ ایک روپیہ آنے فی عدد کے حساب سے۔

۱۱۔ A Treatment on Differential Calculus by Tod Hunters پچھتر عدد۔
قیمت ایک سو بارہ روپے ۸ آنے۔ مبلغ ایک روپیہ ۸ آنے فی عدد کے
حساب سے۔

۱۲۔ حساب از برنارڈ اسمتھ (Barnand Smith's Arithmatic) پچاس عدد۔
قیمت ۷۳ روپے ۸ آنے۔ مبلغ بارہ آنے فی عدد کے حساب سے۔

۱۳۔ جبر و مقابلہ برنارڈ اسمتھ (Barnard Smith's Algebra) پچاس عدد۔
قیمت ۶۲ روپے ۸ آنے۔ مبلغ ایک روپیہ چار آنے فی عدد کے حساب سے۔

۱۴۔ حساب از ہائن Mannual of Arithmatics by S. Hanbton پچھتر عدد۔
قیمت ۵۶ روپے ۴ آنے۔ مبلغ بارہ آنے فی عدد کے حساب سے۔

۱۵۔ Mannual of Plane Trignometry by S Haughton پچھتر روپے۔
قیمت ۵۷ روپے ۴ آنے۔ مبلغ بارہ آنے فی عدد کے حساب سے۔

۱۶ Mannual of Algebra by S Haughton پچھتر روپے۔ قیمت ۲۷ روپے آٹھ آنے۔
مبلغ آٹھ آنے فی عدد کے حساب سے۔

۱۷ (Mannual of Euclid by S Haughton) قیمت چھپن روپے ۴ آنے۔
مبلغ بارہ آنے فی عدد کے حساب سے۔

یہ کتابیں سر سالار جنگ نے کسی سرکاری مدرسے کے لیے منگوائی ہوں گی جس میں اُردو ذریعۂ تعلیم ہو اور ایسا مدرسہ شہر میں "دارالعلوم" ہی ہو سکتا تھا جس کا قیام ۱۸۵۴ء میں سالار جنگ کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔

سر سیّد نے یہ کتب سالار جنگ کو بذریعہ مولوی مہدی علی صاحب بھجوائیں جس کا شکریہ سالار جنگ نے اپنے خط موسومہ سر سیّد مورخہ اگست ۱۸۷۲ء کو کیا ہے۔

"وہ (سر سیّد) ہندوؤں کے خلاف یا فرقہ پرست نہیں تھے۔ انھوں نے بار بار اس پر زور دیا کہ مذہبی اختلافات کو کوئی سیاسی یا قومی اہمیت نہیں دینا چاہیے انھوں نے کہا کہ "کیا تم سب ایک ہی ملک میں نہیں رہتے ہو۔ یاد رکھو کہ لفظ ہندو اور مسلمان محض مذہبی امتیاز کی نشانی ہیں۔ ورنہ ہمارے ہندوستانی، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی، ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔"

(جواہر لال نہرو)

اشفاق احمد عارفی

سرسیّد تحریک اور صوبۂ بہار

غدر ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد سیاسی و سماجی اور معاشرتی افتاد نے کم و بیش تقریباً ہر صوبے اور قریے کے مسلمانوں کو مستقبل کے بارے میں متفکر اور متحرک کر دیا تھا۔ گویا ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے درمیان خوشحال مستقبل کے لیے یہ پہلی تحریک تھی جب ہندوستانی مسلمان غفلت کی گہری نیند سے نیم بیداری کی حالت میں آ گئے اور مختلف علاقوں میں کچھ ایسے افراد پیدا ہوئے جنھوں نے قوم کے لیے مایوسی اور ناکامی کے گھپ اندھیرے میں روشنی کا کام کیا۔ چھوٹی بڑی انجمنیں بنیں اور ادارے قائم ہوئے، لیکن سب سے بڑی تحریک جس کے اثرات پورے ملک پر مرتب ہوئے وہ سرسیّد تحریک یا علیگڑھ تحریک تھی۔

علیگڑھ تحریک وقت کی ایک اہم ضرورت کی بر وقت تکمیل تھی اس لیے ملک کے ہر صوبے میں اس کی پذیرائی ہوئی اور ہر علاقے میں اسے تقویت پہنچائی گئی۔ سرسیّد تحریک سے متعلق جن مقامات پر مضامین اور مقالات لکھے جاتے رہے ان میں پنجاب، لاہور، حیدرآباد اور بنارس وغیرہ شامل ہیں۔ انھیں میں بہار وہ فراموش صوبہ ہے جو سرسیّد تحریک کی حمایت اور اثرات کے گہرے اور نہایت واضح نقوش کے ساتھ علیگڑھ کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت اور امتیازی مقام رکھتا ہے۔

ہندوستان کے دوسرے مقامات کی طرح بہار میں بھی سرسیّد کے موافقین اور مخالفین

افراد اور اخبارات و رسائل کام کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں جہاں ان کے مخالف اخبار "نور الآفاق" اور "نور الانوار" اور افراد میں مولوی ابو سعید عظیم آبادی کا نام لیا جا سکتا ہے، تو اسی کے ساتھ مداحوں اور موافقین کی بھی لمبی فہرست تیار کی جا سکتی ہے۔ ان میں شمس العلماء مولوی عبد الرؤف، نواب سرفراز حسین، مولانا امجد علی، مولانا اشرف علی (مولانا یحییٰ عظیم آبادی کے فرزند) مولانا ابو محمد ابراہیم آروی، سید سیف احمد بلگرامی، خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی، عبد الغفور شہباز، مولوی امداد علی، سید وارث علی مظفر پوری اور قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی کے ساتھ بہار کے اخباروں میں پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، اردو انڈین کرانیکل پٹنہ، اخبار الپنچ (پٹنہ) اور اخبار الاخیار مظفر پور کے نام بھی شامل ہیں۔

سرسید کی مساعی سے ملک بھر میں جو انجمنیں، ادارے، کمیٹیاں اور تعلیمی مراکز قائم ہوئے ان میں کچھ تو سرسید کی ذاتی کوششوں سے وجود میں آئے، اور کچھ ان کی تحریک کے براہِ راست یا بالواسطہ اثرات کے تحت قائم ہوئے۔ صوبہ بہار میں یہ دونوں صورتِ حال رہی۔ یہ پنجاب کے بعد ہندوستان کا واحد صوبہ ہے جس نے سرسید تحریک کا سب سے زیادہ ساتھ دیا۔ اس سلسلہ میں بہار کے جن دو مقام کو اہمیت حاصل ہے وہ مظفر پور اور پٹنہ ہے۔ مظفر پور مشرقی بہار کا ایک قدیم شہر ہے۔ بہار میں سرسید تحریک کی تاریخ میں اس کو اولیت حاصل ہے۔

سرسید تحریک کا باضابطہ آغاز غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کے قیام سے ہوا۔ سوسائٹی کے قیام کے فوراً بعد دور دور تک اس کے مقاصد اور کارکردگی کی شہرت پھیلتی گئی۔ بعد میں جب سوسائٹی نے اپنا ترجمان اخبار سائنٹفک سوسائٹی (۱۸۶۶ء) نکالنا شروع کیا تو اس کی شہرت اور مقبولیت میں اور بھی اضافہ ہوا اور دور دراز مقامات پر اس کے اثرات بھی مرتب ہونے لگے۔ بہار کا شہر مظفر پور متحدہ ہندوستان کا پہلا شہر ہے جہاں سب سے پہلے سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے واضح اثرات اور عملی حمایت کا سراغ ملتا ہے۔ یہاں ۱۴ مئی ۱۸۶۸ء کو سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے طرز پر ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی گئی اور سرسید اس کے لائف آنریری

سکریٹری مقرر کیے گئے۔ مظفر پور کی سائنٹفک سوسائٹی کے متعلق وافر معلومات فرانسیسی مورخ اُردو گارساں دتاسی کے مقالات سے فراہم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہار کے دوسرے تاریخی دستاویزوں اور اخباروں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

گارساں دتاسی اپنے مقالہ "ہندوستانی زبان وادب" ۱۸۷۰ء میں لکھتا ہے:۔

"بہار کی ادبی اور علمی انجمن اس غرض کے لیے مظفر پور میں قائم کی گئی ہے کہ اہلِ ہند میں مغربی تعلیم کی نشر و اشاعت کرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تعلیم مروجہ زبان میں جو اس علاقے میں سمجھی جاتی ہے، دی جائے گی اور ہندوستان کی قدیم زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ [۱]"

اودھ اخبار اور اخبارِ عالم میں بھی مظفر پور کی سائنٹفک سوسائٹی کے متعلق خبریں ملتی ہیں۔ سوسائٹی سے متعلق اودھ اخبار کی ایک رپورٹ کے مطابق:

"بہار کی سائنٹفک سوسائٹی کا صدر مقام مظفر پور ہے۔ اس انجمن کے معتمد ایک فاضل مسلمان ہیں۔ اس وقت انجمن میں ۳۱۸ ارکان ہیں۔ اس تعداد میں ۱۲۸ مسلمان ہیں، ۱۶۲ ہندو ہیں اور بیس یوروپین ہیں۔ ۔ ۔ ۔ تجویز ہے کہ انجمن مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لیے ایک کالج قائم کرے اور اس کے ساتھ مغربی علوم کی اشاعت کا کام بھی انجام دے۔" [۲]

اودھ اخبار میں شائع اس خبر کی تصدیق گارساں دتاسی کے مقالہ ۱۸۷۰ء سے بھی ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی نے اپنی تجویز کو ایک سال کے اندر ہی مکمل کر لیا۔ دتاسی کے لفظوں میں:۔

"اس وقت انجمن کے پانچ مدارس چل رہے ہیں جن میں بلا امتیازِ مذہب ہندو اور مسلمان شریک کیے جاتے ہیں۔ ان مدارس میں ایک مدرسہ نے خاصی ترقی کی ہے۔ یہاں اردو کے ذریعہ سے مغربی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور طلبا کو اپنی مذہبی زبانوں کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک پنڈت سنسکرت کی تعلیم کے لیے اور ایک مولوی عربی کے لیے مقرر ہے۔"

"اس کی طرف سے ایک کالج قائم ہے جس میں سو کے قریب طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ اس کالج کا ذریعہ (تعلیم) ہندوستانی ہے۔ عربی و فارسی اور یورپین سائنس

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کے مبادیات کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اس کا بھی اہتمام ہے کہ روزمرّہ کی زبان میں مختلف مضامین پڑھائے جائیں۔"[۳۷]

سائنٹفک سوسائٹی بہار کے پاس اپنا ایک کتب خانہ بھی تھا۔ جس میں دوسرے ممالک کی کتابیں بھی منگوائی جاتی تھیں۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۷۱ء کے مقالہ میں سوسائٹی کے کتب خانہ کی تفصیل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس کے کتب خانہ میں مزید ستر کتب کا اضافہ ہوا ہے جو مصر میں طبع ہوئی ہیں۔ انگریزی کی ایک سو تیس کتب کا اضافہ ہوا ہے جو مختلف علوم وفنون اور فلسفہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ انجمن کے معتمد نے بعض فاضل انگریزوں کے مشورے سے یہ کتب منگائی ہیں۔"

سوسائٹی نے تعلیم کے لیے ملکی زبان کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر مدارس کے امتحانات اور جوابات کے لیے ملکی زبان کی اجازت کے لیے کوشش کی اور بالآخر ۱۲ مئی ۱۸۷۲ء کو وسطانیہ درجہ تک کے لیے اس کی منظوری حاصل ہوگئی دتاسی کے مطابق:

"کلکتہ یونیورسٹی کی سینٹ نے وسطانیہ مدارس کے امتحانات کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے اس میں انجمن کے اثرات کو بہت دخل حاصل ہے۔"[۴۷]

سرسیّد کی سائنٹفک سوسائٹی کی طرح بہار کی سائنٹفک سوسائٹی مظفر پور کا بھی مقصد مغربی علوم وفنون کے تراجم کے ذریعہ مسلمانوں کو ان علوم وفنون سے روشناس کرانا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے مظفر پور کی سائنٹفک سوسائٹی نے علیگڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے تعاون سے بہت سی کتابیں شائع کروائیں۔ دتاسی نے سوسائٹی میں ترجمے کے کام کا ذکر کرتے ہوئے پانچ کتابوں کی اشاعت اور بارہ کے زیر ترجمہ ہونے کا ذکر کیا ہے:

"انجمن کی طرف سے ایک فاضل شخص کو تین سو روپے ماہوار تنخواہ دی جاتی ہے جس کے ذمّہ یہ کام ہے کہ وہ انگریزی زبان سے ہندوستانی میں ایسی کتابوں کا ترجمہ کرے جو طلبا کے کام کی ہوں۔"[۴۸]

علیگڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے تعاون سے بہار کی سائنٹفک سوسائٹی نے

سہ ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

پانچ کتابیں شائع کی ہیں اور بارہ کتابیں زیرِ ترجمہ ہیں۔"[۶]

گارساں دتاسی کے مقالہ ۱۸۷۵ء میں سوسائٹی کی علمی کامیابی کا بیان اور بھی واضح الفاظ میں موجود ہے۔ دتاسی کا بیان ہے :

"بہار کی سائنٹفک سوسائٹی نے ایک عمدہ کالج کی بنیاد ڈالی ہے جس کے طلبا سول سروس میں کامیاب ہو کر بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہیں۔"[۷]

مظفر پور کی سائنٹفک سوسائٹی کے تحت دوسرے مقامات پر بھی اس کی شاخیں قائم تھیں۔ گارساں دتاسی نے سوسائٹی کے روحِ رواں اور سکریٹری سید امداد علی کے ذریعہ گیا میں اس کی ایک شاخ کے قیام کا ذکر کیا ہے جس کے تحت گیا میں ایک تعلیمی ادارہ بھی چل رہا تھا دتاسی کا بیان ہے :

"بہار سوسائٹی کا صدر مقام مظفر پور ہے اور یہ صوبہ کے مقتدر مسلمانوں کی کوششوں سے قائم ہوئی ہے، اصل ترغیب مولوی سید امداد علی خاں کی تھی جو ترہت کے جج اور سوسائٹی کے ناظم ہیں۔ حال میں ان کا تبادلہ گیا ہو گیا ہے اور وہاں بھی انھوں نے اس کی ایک شاخ بنا لی ہے۔ گیا میں بھی سوسائٹی نے ایک مدرسہ کھولا ہے جس میں بہت سے طلبا تعلیم پاتے ہیں۔"[۸]

مظفر پور میں سائنٹفک سوسائٹی کے تحت ایک علمی و ادبی انجمن "انجمن تہذیب" بھی قائم کی تھی۔ دتاسی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے ۱۸۷۳ء میں پٹنہ میں اس کی ایک شاخ کے قیام کا بھی ذکر کیا ہے :

"پچھلے سال کے ماہ ستمبر میں مظفر پور کی علمی و ادبی انجمن کی ایک شاخ پٹنہ میں سید وزیر علی خاں کی صدارت میں قائم ہوئی۔"[۹]

"انجمن تہذیب" کا اصل مقصد زبان و ادب پر سیمینار کا انعقاد، تعلیمی نشر و اشاعت اور سماجی اصلاح تھا۔ اس انجمن کی تحریک پر بہار کے مختلف علاقوں میں انجمن اور ادارے قائم ہوئے۔ ان میں مرزا پور اور حاجی پور کی انجمن خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ حاجی پور کی انجمن "رفاہِ عام" کا ذکر دتاسی نے بھی اپنے ۱۸۷۵ء کے مقالہ میں کیا ہے :

"ضلع مظفر پور کے قصبہ حاجی پور (اب یہ ضلع ویشالی کا صدر مقام ہے)

[۱] فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

میں کچھ عرصہ سے انجمن "رفاہِ عام" قائم ہوئی ہے، اس نے اچھی خاصی شہرت حاصل کرلی ہے اس کی دلچسپی کا مرکز بھی ادب اور علم ہے انجمن کا ارادہ ہے کہ اپنے ارکان کے لیے ملک کے تمام اہم اخبار منگوائے۔"[۱۰]

انجمن تہذیب نے علوم وادب کی نشرو اشاعت کے لیے اپنی جن تجویزوں کو عملی شکل دی ان میں مغربی علوم کی تعلیم اور غریبوں کے لیے زراعت وحرفت کا انتظام بھی شامل ہے۔ گارساں دتاسی نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے:۔

"انجمن نے ایک تجویز یہ بھی منظور کی ہے کہ اسباق کے ذریعہ مغربی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ انجمن نے ایک تجویز یہ بھی منظور کی ہے کہ مغربی تصانیف کے ہندوستانی میں تراجم کیئے جائیں۔ انجمن کے ارکان کا ارادہ ہے کہ غربا کے لیے زراعت وحرفت کا خاص انتظام کیا جائے۔"[۱۱]

چند سال بعد انجمن اپنے اس پروگرام کو عملی شکل دینے میں کامیاب ہوگئی جیسا کہ دتاسی کے مقالہ سے معلوم ہوتا ہے:۔

"بہار کی ادبی انجمن کا رکن ہونے کا شرف مجھے بھی حاصل ہے۔ شہزادہ ویلز کی آمد کے زمانہ میں اس نے صنعت وحرفت کا ایک مدرسہ کھولا اور ولی عہد کے نام پر اس کا نام رکھا۔"[۱۲]

صوبۂ بہار میں سرسیّد تحریک کے اثرات کا اظہار کرتے ہوئے سائنٹفک سوسائٹی مظفرپور اور انجمن تہذیب کے بارے میں ڈاکٹر قیام الدین احمد تحریر فرماتے ہیں:۔

"Sir Syed Ahmed advocated another course of adoptation and assimilation of taking with the English education and combining with the traditional system of education Some of the initial steps taken by him to implement this policy, such as the establishment of 1863 of the Scientific society at GHAZIPUR, where he was posted at the time, had raised a favourable response in other parts of the country including Bihar Syed IMAD ALI principal Sadar amin Tirhut, started the scientific society at

[۱۰] ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

MUAFFARAPUR in 1868 with aims and objectives similar to that of Sir Syed's Scientific society It sponsored among other things, the translation of standard work of scientific and literary merits from English into Urdu in order to make them available to non-English Reading Public Another institution, the ANJUMAN-E-TEHZEEB was also formed at MUAFFARAPUR the next year Its objects of Philosophical interest and promotion of education generally '

علیگڑھ سائنٹفک سوسائٹی نے ۱۸۶۶ء میں ایک ہفتہ وار اخبار "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" (علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ) جاری کیا جو کچھ عرصہ بعد سہ روزہ ہوگیا۔ چونکہ سائنٹفک سوسائٹی مظفر پور کے مقاصد علیگڑھ سائنٹفک سوسائٹی سے ہم آہنگ تھے اس لیے یہاں سے بھی ۱۸۶۸ء میں ایک پندرہ روزہ "اخبار الاخیار" جاری کیا گیا۔ مقالات گارساں دتاسی اور بعض دوسرے ہم عصر تاریخی دستاویزات و اخبارات میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ دتاسی نے ۱۸۷۲ء کے مقالہ میں اس اخبار کی پابندی کے ساتھ اشاعت کا ذکر کیا ہے: ـــ

"مظفر پور کی سوسائٹی اپنے "اخبار الاخیار" کو کامیابی کے ساتھ چلا رہی ہے۔ مہینہ میں یہ دو مرتبہ نکلتا ہے۔ اس رسالے کے نسخے اس کے قابل مدیر سیّد امداد علی خاں بہادر از راہِ کرم مجھے بھیج دیا کرتے تھے۔ یکم ستمبر کی اشاعت میں بیس اگست کے جلسے کی کارروائی بھی درج ہے۔"[۱۴]

"اخبار الاخیار" نے مروجہ اور روزمرہ کی زبان میں تعلیم کے حصول کے فوائد کی تشہیر میں نمایاں رول ادا کیا تھا۔ دتاسی نے اخبار میں شائع اس قسم کے ایک مضمون کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے: ـــ

"اخبار الاخیار" میں ایک مضمون ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ روزمرّہ کی زبان میں تعلیم دینے سے تعلیم میں سہولت پیدا ہوگی اور دیہی لوگوں کو تعلیم سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔"[۱۵]

قاضی عبدالودود کے مضمون "اخبار الاخیار مظفر پور اور سر سیّد احمد خاں" اور

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ڈاکٹر مختارالدین احمد کے مضمون "قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی" سے ایسے شواہد فراہم ہوتے ہیں جن سے سوسائٹی اور اخبار کے علاوہ صوبۂ بہار میں سر سید تحریک کے اثرات اور حمایت کی صورت حال واضح ہوتی ہے۔ قاضی عبدالودود کے مطابق:

"اخبار الاخیار" سائنٹفک سوسائٹی صوبۂ بہار، قصبہ مظفر پور ضلع ترہت کا پانزدہ روزہ اخبار تھا۔ یہ سوسائٹی بتاریخ ۲۴ مئی ۱۸۶۸ء قائم ہوئی تھی اس کے صدر سید محمد تقی خاں اور سکریٹری سید امداد علی تھے۔ اس کا ایک مجلد جس میں ۱۵ اپریل ۱۸۶۹ء سے لے کر ۱۵ دسمبر ۱۸۷۱ء کے شمارے (شمارہ ۴۱ تا ۴۴) موجود ہیں۔ جناب شاہ مقبول احمد سنٹرل کالج کلکتہ نے کتب خانہ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کی نمائش کے لیے مستعار دیئے تھے اور میں نے ان کا مطالعہ کیا ہے۔"[۱۶]

یہاں اخبار الاخیار مظفر پور میں شائع چند عنوانات اور خبریں درج ہیں جن سے بہار میں سر سید تحریک کے اثرات اور حمایت کا حال معلوم ہوتا ہے:

۱۔ سفرِ ولایت کی ترغیب:

ہماری سوسائٹی کے لیف آنریری سکریٹری سید احمد خاں بہادر سی، ایس، آئی اپنی ذاتی ہمت کی بدولت لندن میں پہنچے ..."[۱۷] (۱ ستمبر)

۲۔ روداد جلسۂ خاص سائنٹفک سوسائٹی صوبۂ بہار مقام مظفر پور واقع ۸ مئی۔

سکریٹری نے خط سید احمد خاں کا مرقومہ ۶ اپریل جو لندن سے آیا تھا درپیش کر کے اس قدر مضامین جو خریداری کتب عربیہ مترجم زبان انگریزی و جرمنی و فرنچ سے متعلق تھے، پڑھ کر سنائے۔ بعد مباحثہ یہ بات قرار پائی کہ مبلغ ایک ہزار روپے واسطے خریداری کتب عربیہ کے جو متعلق امتحان درجۂ اعلیٰ یونیورسٹی سے ہیں اور زبان انگریزی خواہ جرمنی خواہ فرانسیسی سے بزبان عربی ترجمہ ہو کر ولایت انگلستان یا مصر خواہ دوسرے ملکوں سے میسر ہوں۔ سید احمد خاں کی خدمت میں روانہ ہوں اور ہنڈوی اس کی بذریعہ بنک بنگال سے طلب کی جائے اور ایک خط اطلاعی خدمت ... خاں ممدوح کو بھیجا جائے اور انتخاب خط اخبار الاخیار میں مندرج ہو۔"[۱۸] (۱۵ مئی)

سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ اور سائنٹفک سوسائٹی مظفر پور کے درمیان کتابوں کے تراجم واشاعت کے کام میں آپسی تعاون اور اشتراک بھی موجود تھا جیسا کہ اخبار الاخیار" کی ایک خبر سے معلوم ہوتا ہے: ـــ

سائنٹفک سوسائٹی صوبہ بہار مقام مظفر پور تحریک سید احمد خاں بہادر ہنگام قیام بڑے بڑے امرائے عالی مقام انگلستان نے ایک سرکلر بنام علمائے یونیورسٹی آکسفورڈ، کیمبرج وغیرہ جاری فرمایا وہ فہرست تجویز علمائے موصوفین مرتب ہو کر شامل سید احمد خاں بہادر کے پہنچی۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ مطبوعہ ۴ ار اکتوبر میں مع اسمائے علمائے موصوفین کے چھاپا گیا ہے اور سید احمد خاں بہادر نے چند قطعات فہرست عن الملاقات مقام علیگڑھ سید امداد علی خاں بہادر کے حوالے کیے بایں مطلب کہ بعد مشورہ ہر دو سوسائٹی وہ فہرست بحضور نواب گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل بامید عطائے نصف خرچ ترجمہ کے بذریعہ درخواست ہر دو سوسائٹی روانہ کی جائے اور واسطے ترجمہ کرانے بڑی بڑی دقیق کتابوں کے یہ تجویز ہوئی کہ اسپرنگر (اسپرنگو) صاحب مقیم جرمنی کو مہتمم کیا جائے۔"[۱۹] (۱۰ر دسمبر)

قیام لندن کے دوران سرسید اپنے حالات اور پروگراموں سے اپنے احباب کو مطلع کرتے رہتے تھے۔ سائنٹفک سوسائٹی مظفر پور وہ واحد ادارہ ہے جس کے حالات معلوم کرتے اور بعض اہم تعلیمی امور کے سلسلہ میں اطلاع اور مشورہ فرماتے تھے۔ سوسائٹی کے ترجمان "اخبار الاخیار" میں مولوی سید امداد علی خاں سکریٹری سائنٹفک سوسائٹی بہار کے نام لندن سے بھیجے گئے ایک طویل فارسی خط کے اقتباس سے اس کے شواہد فراہم ہوتے ہیں۔ سرسید اس خط میں کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے ماہرین تعلیم کی مدد سے ایک نصاب تعلیم کی تیاری اور اس کے لیے کتابوں کی فراہمی اور ترجمہ کے تفصیلی ذکر کے بعد بہار کی سائنٹفک سوسائٹی کے متعلق لکھتے ہیں: ـــ

"..... بدریافت حالات ترقی سوسائٹی بہار و شرکت و امداد حکام عالی مقام کہ صرف بتوجہ عالی و تدابیر وسعی جمیلہ سامی شدہ است، بسیار بسیار خوشنود شدم۔

۱۹ـ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اللہ تعالیٰ ترقی روز افزوں نصیب نماید وآں مخدوم را جزائے خیر دہد... ۲۹ئیے (السمی)

صوبۂ بہار میں سرسید تحریک کے سلسلہ میں دوسرا سب سے اہم مقام پٹنہ ہے پٹنہ کے احباب نے ہر سطح پر سرسید کا ساتھ دیا۔ سرسید ہال جنوب کے مشرقی کمروں میں کمرہ نمبر ۲، ۳ پر قاضی سید رضا حسین اور ۴، ۵، ۶ پر مولوی سید فضل الرحمٰن کے نام کندہ ہیں۔ یہ دونوں حضرات پٹنہ کے رئیسوں میں بڑے نام آور تھے۔ اسی طرح اسٹریچی ہال کی تعمیر میں حصہ لینے والوں میں جن لوگوں کے نام کندہ ہیں ان میں پٹنہ کے حافظ سید احمد رضا، نواب سرفراز حسین خاں بہادر، مولوی سید محمد علی اور قاضی سید رضا حسین کے نام شامل ہیں۔ سرسید ڈائننگ ہال کے متصل کنواں "چاہ اخوان الصفا" پر کندہ ناموں میں اٹھارہواں اور انیسواں نام قاضی سید رضا حسین پٹنہ اور حافظ سید احمد رضا پٹنہ کا ہے۔ قاضی سید رضا حسین اور مسماۃ امتہ الرسول، مسماۃ زینب (جو مسماۃ ضمیرن کے نام سے مشہور تھیں) نے اپنی ایک جائداد بھی مدرستہ العلوم علیگڑھ کے نام وقف کی تھی۔ جس کی آمدنی مسلم طلبار کے وظائف کے لیے مخصوص تھی۔ وقف اور اقرار نامہ کی تاریخ ترتیب وار ۱۰؍ اکتوبر ۱۸۸۲ء، ۲۳؍ مئی ۱۸۸۳ء، ۱۸؍ نومبر ۱۸۸۶ء اور ۲۷؍ دسمبر ۱۸۸۶ء ہے[۷۱]۔ قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی کے وقف نامہ کا ذکر خود سرسید نے بھی پٹنہ کی اپنی ایک تقریر میں کیا ہے:

"ہماری قوم میں ہمدردی کے نہ ہونے کے خیال کا ثبوت اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں بہت سی عالی شان مسجدیں ہیں، بہت بڑے بڑے امام باڑے بہت سی بڑی بڑی خانقاہیں ہیں، بہت سی مذہبی درسگاہیں موجود ہیں جن کی تعمیر میں لاکھوں روپیہ خرچ ہوا ہے۔ سیکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے سالانہ آمدنی کے اوقاف مسجدوں، امام باڑوں، خانقاہوں اور درسگاہوں کے لیے وقف ہیں لیکن کوئی ایک پیسہ بھی قوم کی بھلائی اور قومی ضرورت کے لیے موجود نہیں ہے، یہی بڑا نقص ہماری قوم میں ہے اور یہی اصل وجہ ہے کہ قوم نے ترقی نہیں کی اور روز بروز تنزل کرتی جاتی ہے۔ قومی ترقی صرف تعلیم پر منحصر ہے خصوصاً اعلیٰ تعلیم پر۔ مذہبی تعلیم عقبیٰ کے لیے ہے، دنیوی تعلیم دنیوی ترقی و فلاح کے لیے ہے مگر مشکل یہ ہے کہ تعلیم بغیر روپیہ کے نہیں ہوتی اور روپیہ بغیر تعلیم کے نہیں

حاصل ہوتا۔ گو بہت سی صورتوں میں روپیہ جاہلوں کے پاس بھی آجاتا ہے مگر حاصل کرنے اور آجانے میں بڑا فرق ہے۔ آجانے سے قومی عزت نہیں ہوتی بلکہ حاصل کرنے سے قومی عزت ہوتی ہے۔

اس شہر میں ایک سے ایک رئیس اور دولت مند ہیں مگر قاضی سید رضا حسین کے وقف نامے کے جنھوں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر کام کیا ہے، کوئی وقف نامہ ایسا نہیں دیکھا جو خالص قومی بھلائی کے لیے کیا گیا ہو۔"[۲۲]

پٹنہ میں سرسید اور ان کی تحریک کے اصل روح رواں اور سب سے بڑے ہمدرد اور قدرداں قاضی سید رضا حسین تھے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قوانین کا ڈرافٹ جو ۱۸۸۹ء میں شائع ہوا تھا، اس میں جن ٹرسٹیوں کے نام درج ہیں ان میں خان بہادر سید رضا حسین اور مولوی سید امجد علی رئیس پٹنہ کے نام بھی ملتے ہیں۔ قاضی سید رضا حسین سرسید سے ملنے اور علیگڑھ کالج کی نگرانی کے لیے ہمیشہ علیگڑھ حاضر ہوتے تھے۔ علیگڑھ کالج فنڈ کا ایک جلسہ علیگڑھ میں ۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء کو ہوا جس میں قاضی سید رضا حسین کا نام سر فہرست درج ہے[۲۳]۔ قاضی صاحب مدرسۃ العلوم علیگڑھ کی طرف سے حیدرآباد جانے والے ڈیپوٹیشن میں بھی شریک تھے۔ بقول سرسید ان کی شرکت کی برکت سے ڈیپوٹیشن کو نہایت کامیابی حاصل ہوئی[۲۴]۔

سرسید کی شدید ہمنوائی اور موافقت کی وجہ سے پٹنہ کے مخالفینِ سرسید نے قاضی سید رضا حسین کو نیچری کا خطاب دیا اور ان کے عقائد کی اصلاح کے لیے پٹنہ میں ایک کمیٹی بنائی گئی تھی۔

قاضی سید رضا حسین کے علاوہ پٹنہ کے دوسرے احباب بھی سرسید تحریک کے سلسلہ میں کم اہمیت نہیں رکھتے لیکن یہاں اصل توجہ بہار میں سرسید تحریک کی حمایت کے عملی پہلوؤں اور ان اداروں پر دلانی مقصود ہے جو سرسید اور ان کی تحریک کے زیر اثر وجود پذیر ہوئے۔

مدرسۃ العلوم علیگڑھ کے چندہ کی فراہمی کے سلسلہ میں سرسید دو دفعہ پٹنہ تشریف لے گئے، ۲۶ مئی ۱۸۷۳ء اور ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو۔ دونوں موقعوں پر ان کا قیام

سید رضا حسین کے دولت کدہ واقع محلہ لودی کٹرہ پٹنہ سٹی پر ہوا۔ دونوں موقعوں پر سرسید نے جامع تقریر فرمائی جن کے بعض حصّے اور جملے آج بھی مشہور ہیں۔

سرسید کے پٹنہ آنے اور تعلیم کی اہمیت پر تقریر کے اثرات سے پٹنہ کی عملی تحریک میں اضافہ ہوا اور یہاں ۱۸۸۴ء میں ایک محمڈن ایجوکیشنل کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ سید محمود علی خاں صاحب عظیم آبادی مصنف "گل رعنا" لکھتے ہیں:

"... سرسید احمد خاں کے عظیم آباد آنے اور تعلیم کی اہمیت پر تقریر کرنے کا کافی اثر اہلِ عظیم آباد پر ہوا۔ چنانچہ یکم فروری ۱۸۸۴ء کو قاضی سید رضا حسین کے دولت کدہ واقع محلہ لودی کٹرہ ایک جلسہ مسلم اہل الرائے کا منعقد ہوا۔ حاضرینِ جلسہ میں نواب بہادر ولایت علی خاں، قاضی سید رضا حسین، نواب سرفراز حسین خاں، سید ضمیر الدین احمد، مسٹر جسٹس شرف الدین احمد، مسٹر سید نور الہدیٰ شمس العلمار محمد حسن اور میر سید احمد حسین وغیرہ شامل تھے ـــــ ایک ریزولیوشن کے ذریعہ طے پایا کہ بہار میں علیگڑھ کی طرح ایک محمڈن ایجوکیشنل سوسائٹی قائم کی جائے اور اس کا صدر مقام پٹنہ ہو اور اس میں پچاس ممبر ہوں۔ چنانچہ ممبران ایجوکیشنل کمیٹی کی طرف سے اوّل ہی ہفتہ فروری ۱۸۸۴ء میں لفٹننٹ گورنر بنگال کو اس اسکیم کی منظوری کے لیے ایک عرضداشت پیش کی گئی جو پندرہ دن کے اندر منظور ہوکر واپس آگئی۔"[۲۵]

محمڈن ایجوکیشنل کمیٹی کے قواعد وضوابط ــ Constitution کی ترتیب سرسید کے چھوٹے لڑکے سید محمود (جج الہ آباد ہائی کورٹ) نے کی۔ کمیٹی اور اس کے اسکول کے بانی سکریٹری مولوی شمس العلمار محمد حسن تھے۔ کمیٹی کے دوسرے اہم ابتدائی ممبران میں عالمی شہرت یافتہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے بانی مولوی خدا بخش (۱۸۴۲ء ـــ ۱۹۰۸ء) حکیم عبدالحمید (۱۸۲۹ء ـــ ۱۹۰۵ء) شمس العلمار امجد علی (۱۸۴۷ء ـــ ۱۹۳۲ء) مولوی احمد اللہ (۱۸۰۸ء ـــ ۱۸۸۱ء) مولوی یحییٰ علی، نواب ولایت علی خاں (۱۸۶۱ء ـــ ۱۹۳۳ء) جسٹس سید شرف الدین سید نور الہدیٰ (بانی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ) سر علی امام (۱۸۶۶ء ـــ ۱۹۳۲ء) مولانا منظہر الحق (۱۸۶۶ء ـــ ۱۹۰۳ء) شامل تھے۔[۲۶]

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

محمڈن ایجوکیشن کمیٹی پٹنہ کا قیام سرسید اور پٹنہ میں ان کے رفقار کی کوششوں سے ہوا تھا۔ اس لیے اس کے مقاصد بھی سرسید تحریک سے ہم آہنگ تھے۔ کمیٹی نے اپنے ابتدائی دنوں ہی سے مسلمانان بہار میں جدید علوم کی نشر و اشاعت کے لیے عملی کوششیں شروع کردیں۔ چنانچہ کمیٹی نے یکم مارچ سنہ ۱۸۸۴ء کو پٹنہ میں "مدرسۃ العلوم" علیگڑھ کی نہج پر ایک "مدرسۃ المسلمین" قائم کیا اور سرسید احمد خاں کے مشورے سے اس کا نام "محمڈن اینگلو عربک اسکول" رکھا[۲۸]۔ یہ اسکول خود سرسید کے مطابق علیگڑھ کالج کی سب سے پہلی شاخ (اور شاید آخری بھی) تھی۔ جو ہندوستان میں قائم ہوئی[۲۹]۔

اسی محمڈن ایجوکیشن کمیٹی پٹنہ نے ۲۳ جولائی سنہ ۱۹۶۴ء کو اورنٹیل کالج پٹنہ سٹی بھی قائم کیا۔ یہ دونوں ادارے ایک ہی احاطے میں آج بھی حسن و خوبی کے ساتھ قومی تعلیم کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

صوبۂ بہار میں سرسید تحریک کے اثرات، محمڈن ایجوکیشن کمیٹی کی خدمات اور محمڈن اینگلو عربک اسکول کے قیام اور اغراض و مقاصد کو ڈاکٹر قیام الدین احمد نے تفصیل سے پیش کیا ہے:

We also have the important un-noticed evidence of the 'direct impact of Sir Syed s activities On BIHAR MUSLIMS in the memorandum submitted by a cross section of the elite of the town stating the desire to establish a school on the lines of the ALIGARH collegiate school"

"The most important and fruitful achievement of the Mohammedan education committee was the foundation in March 1884 of the Mohammedan Anglo Arabic school in Patna City Explainary the aims and objectives of the school, the members of the committee in the memorandum mentioned above submitted to the Leftenant-Governer of Bengal that your memoriatists are convinced that the main cause which has neither to to prevented Mohammedan from sending their children to Govt. Schools and

adde that they have theretore, established a school on the Principles of the ALIGARH COLLEGIATE SCHOOL where arrangements have been made not only for secular education of all creeds but also for religious education of two sects SUNNIS and SHIAS (as also of) the Mohammedis (Wahabies)"

محمڈن ایجوکیشن کمیٹی پٹنہ نے ۱۸۸۴ء میں اپنا ایک ترجمان "پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" بھی جاری کیا اور اس کی اشاعت کے لیے ایک پریس کا بھی انتظام کیا۔ چونکہ کمیٹی کے سکریٹری مولانا محمد حسن تھے اس لیے ڈاکٹر ذکی الحق ان کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا محمد حسن سرسید احمد خاں کی طرح نباضِ وقت تھے۔ وہ عصری ضرورتوں وقت کے تقاضوں اور ہندوستانیوں کے اہم مسئلوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ انھوں نے خوب غور وفکر کے بعد عصری تقاضوں اور ضرورتوں اور عوام کی معاشی بدحالیوں کے پیش نظر یکم مارچ ۱۸۸۴ء میں محمڈن اینگلو عربک اسکول کی بنیاد ڈالی، اور ساتھ ساتھ حکومت انگلیشیہ کی بدگمانیوں، الزام تراشیوں، ان کی غلط حکمتِ عملی کی تردید واصلاح اور ہندوستانیوں کے صحیح موقف کی ترجمانی کے لیے ایک اخبار بنام "پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ"، جولائی ۱۸۸۴ء جاری کیا۔ اس کے لیے ایک پریس بھی خریدا۔ یہ اخبار چند سال چل سکا پھر بند ہوگیا۔ اس اخبار کے چند شمارے محترم پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی دلیسنوی مقیم بمبئی کے ذاتی ذخیرۂ نوادرات میں محفوظ ہیں۔ پٹنہ کی کسی نمائش میں مذکورہ اخبار آئے تھے، راقم الحروف نے اس فائل کو دیکھا تھا۔"[۲۹]

محمڈن ایجوکیشن کمیٹی کا یہ اخبار پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ انگریزی اور اردو کے متداول کالموں میں شائع ہوتا تھا۔ ڈاکٹر قیام الدین احمد اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"It also set up a printing press at a cost of RS 10,000 only to publish a GAZETTE of the committee and to print the School registers and forms etc This was the institute Gazette that was printed in English and Urdu in opposite columns and of which some old copies with available in the school library until recently These could have provided useful information not only

۲۹۔ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

on the history of the school itself but also about the cultural and educational history of the town in general

اس کے علاوہ "تذکرۂ صادقہ" میں بھی پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا ذکر ملتا ہے، جس سے اس کے پہلے ایڈیٹر کا بھی علم ہوتا ہے:

"۱۳۰۱ھ میں مولوی محمد حسین مرحوم نے محمڈن اسکول کی بنا ڈالی تو مولوی یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی (خلف محمد یحییٰ علی اندمان) ہیڈ مولوی مقرر ہوئے، اور نیز پٹنہ انسٹی ٹیوٹ کی ایڈیٹری کا کام چھ برس تک بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ یہ اخبار اردو، انگریزی زبانوں میں (مقابل کالموں میں) چھپتا تھا۔"[۱۳]

صوبۂ بہار میں سرسید تحریک کی حمایت اور اثرات سے متعلق یہ تحریر سرسید اور مدرسۃ العلوم علیگڑھ سے نظریاتی اور عملی دلچسپی رکھنے والے افراد واشخاص کے علاوہ ان اداروں، انجمنوں، سوسائٹیز اور اخبار ورسائل سے متعلق تھی جو سرسید اور ان کی تحریک سے وجود میں آئے۔ پٹنہ اور مظفر پور کے علاوہ بہار کے دوسرے قدیم علمی وادبی مقامات سے متعلق بھی اگر تلاش وجستجو کی جائے اور سرکاری وغیر سرکاری کاغذات اور دستاویزات دیکھے جائیں تو اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی مفید معلومات ہو سکیں گی۔

تعلیقات وحواشی

۱۔ مقالات گارساں دتاسی، مقالہ ۱۸۷۰ء "ہندوستانی زبان وادب" انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۳ء

۲۔ اودھ اخبار، ۱۰ نومبر ۱۸۶۹ء

۳۔ مقالات گارساں دتاسی، مقالہ ۱۸۷۰ء

۴۔ مقالات گارساں دتاسی، مقالہ ۱۸۷۲ء، ص ۱۶۹

۵۔ ایضاً۔ مقالہ ۱۸۷۰ء

۶۔ ایضاً۔ مقالہ ۱۸۷۱ء

۷۔ ایضاً۔ مقالہ ۱۸۷۵ء، ص ۱۷۶

۸۔ ایضاً۔ مقالہ ۱۸۷۵ء، ص ۱۷۶

۹۔ ایضاً۔ مقالہ ۱۸۷۷ء، ص ۹

۱۰۔ ایضاً۔ مقالہ ۱۸۷۷ء، ص ۲۸۳

۱۱۔ ایضاً۔ مقالہ ۱۸۷۰ء ص ۴

۱۲۔ ایضاً۔ مقالہ ۱۸۷۷ء، ص ۲۷۶

سہ ماہی فکر وآگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ARTICLE – THE MOHAMMEDAN EDUCATION COMMITTEE PATNA 1884 BY DR.QAYAMUDDIN AHMAD M E.C & M.A.A. School Patna, Centenary Celebration Souvenir Volume P No 28,29 .

۱۴ مقالات گارساں دتاسی، مقالہ ۱۸۷۲ء ۱۵ مقالات گارساں دتاسی، مقالہ ۱۸۷۲ء

۱۶ مضمون "اخبار الاخیار مظفر پور اور سید احمد خاں" از قاضی عبد الودود مشمولہ "فکر و نظر" علیگڑھ۔ جولائی ۱۹۹۶ء ص ۲۴
(مضمون "قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی" از ڈاکٹر مختار الدین احمد مشمولہ "فکر و نظر" علیگڑھ خصوصی شمارہ ناموران علیگڑھ، دوسرا کارواں)

۱۷ ایضاً۔ ۱۸ ایضاً۔ ص ۲۷

۱۹ ایضاً ص ۳۱ ۲۰ ایضاً، ص ۲۷ سے ۲۹

۲۱ ، مضمون قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی" از ڈاکٹر مختار الدین احمد، مشمولہ "فکر و نظر" علیگڑھ (ناموران علیگڑھ، دوسرا کارواں)

۲۲ تقریر سر سید بمقام پٹنہ ۱۸۸۳ء، مجموعہ لیکچرز سر سید احمد خاں۔

۲۳ علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۳۱ر دسمبر ۱۸۸۹ء ۲۴ علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲ر جوری ۱۸۹۲ء

۲۵ محمڈن ایجوکیشن کمیٹی پٹنہ کی جانب سے حکومت کو جو عرضداشت پیش کی گئی تھی اس کی ایک کاپی حکومت بہار کے میں موجود ہے۔ اس میں درج ذیل افراد کے دستخط ہیں۔
محمد صدر الحق، محمد یوسف، آیت اللہ، عبد القیوم، عبد الرؤف، محمد اسحاق، عبد المجید، عبد الرحیم، عبد الباری، احمد حسین، خدا بخش، سید شرف الدین، سید نور الہدیٰ، منشی محمد امیر، سرفراز حسین خاں، محمد حسن۔

۲۶ مضمون ــــ محمڈن ایجوکیشن کمیٹی پٹنہ، مشمولہ مجلہ جشن صد سالہ محمڈن اینگلو عربک اسکول و محمڈن ایجوکیشن کمیٹی پٹنہ۔ ص ۲۹ ــــ ۳۰۔

۲۷ مضمون "قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی" از ڈاکٹر مختار الدین احمد، مشمولہ "فکر و نظر" علیگڑھ، (خصوصی شمارہ ناموران علیگڑھ، دوسرا کارواں، ص ۲۶)

۲۸ Mohammedan Education Committee Patna 1884 By Dr Qayamuddin Ahmad M F C & M A A School Patna, Centenary Celebration Souvenir Volume P No 29,30

۲۹ مضمون "موسس محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ" از ڈاکٹر محمد ذکی الحق مشمولہ مجلہ جشن صد سالہ محمڈن اینگلو عربک اسکول و محمڈن ایجوکیشن کمیٹی پٹنہ ص ۱۸۔

۳۰ مجلہ مذکور، حصہ انگلش ۳۱ تذکرہ صادقہ، مطبوعہ ۱۹۲۷ء، ص ۱۰۵

پروفیسر شان محمد

سرسیّد اور تخلیقِ پاکستان

مورخین کا ایک طبقہ سرسید احمد خاں کو دو قومی نظریہ کا بانی اور تحریک پاکستان کا روح رواں تصور کرتا ہے۔ پروفیسر ایم ایس جین اپنی کتاب The Aligarh Movement میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۵۸ء میں ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم بننے کا موقع ملا تھا لیکن اس موقع کو سرسید نے استعمال نہیں کیا کیونکہ وہ صرف مسلمانوں کے لیے ہی سوچتے تھے۔ ان کی علیگڑھ تحریک نے صرف مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سوچا اور یہ خیال بڑھتے بڑھتے تحریک پاکستان میں بدل گیا۔ ایک دوسرے مورخ ڈاکٹر لال بہادر نے اپنی کتاب The Muslim League میں لکھا ہے کہ محمد علی جناح نے بیسویں صدی میں وہ حاصل کرلیا جس کی داغ بیل سرسیّد نے ۱۹ویں صدی میں ڈالی تھی سرسید نے مسلمانوں کے دماغ میں علاحدگی کا بیج بویا اور جناح نے اسے تقویت دی اور مسلمانوں کے لیے ایک ملک تراش لیا۔ سرسید اور جناح ایک ہی تحریک کے علمبردار تھے اور دونوں نے ایک ہی مقصد کو آگے بڑھایا۔ مندرجہ بالا کتابوں کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سرسید نے ہندو اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم بنایا۔ انھوں نے کانگریس کی مخالفت صرف اس کے ہندوؤں کی ایک جماعت ہونے کی وجہ سے کی انھوں نے

ماہنامہ فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

Representative Government کی مخالفت کی جس نے جداگانہ انتخابات کی بنیاد ڈالی اور قیام پاکستان پر جا کر دم توڑ دیا۔ گویا تخلیقِ پاکستان کا سہرا سرسید کے ہی سر ہے۔ میں نے اس مقالے میں اِن تمام الزامات کے تجزیے کی کوشش کی ہے۔
سرسیّد ان غیر معمولی حالات کے پیداوار تھے، جنھوں نے ایک حکومت کو اجڑتے اور دوسری کو سرسبز ہوتے دیکھا تھا۔ غدر کی ناکامی کے بعد انھوں نے بڑے بڑے امرار، رؤسا کو رات کی تاریکی میں کاسۂ گدائی لیے ہوئے دیکھا تھا۔ غدر ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مگر انگریزوں نے صرف مسلمانوں کو ہی نشانۂ ستم بنایا تھا اور ان کی پوزیشن ہندوؤں سے مختلف ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے حالات میں سرسید کو مسلمانوں کے لیے وہی کام کرنا تھے جن کو راجہ رام موہن رائے پچاس سال قبل ہندوؤں کے لیے کر چکے تھے۔
سرسید کا پختہ خیال تھا کہ اگر مسلمان مغربی علوم حاصل نہ کریں گے تو وہ ہمیشہ کے لیے دوسرے فرقوں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا:

"بے علمی مفلسی کی ماں ہے جس قوم میں علم و ہنر نہیں رہتا وہاں مفلسی آتی ہے اور جب مفلسی آتی ہے تو ہزاروں جرموں کے سرزد ہونے کے باعث ہوتی ہے۔ اب تم اپنی قوم کے حال پر غور کرو کہ یہ بدبخت دن ان پر آ گئے ہیں۔ تمام قوم پر مفلسی اور محتاجی اور قرضداری اور ذلت چھا گئی ہے .... تمام قوموں نے اور بڑے بڑے دانشمندوں نے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ قومی ترقی، قومی تعلیم و تربیت پر منحصر ہے۔ پس اگر ہم اپنی قوم کی بھلائی چاہتے ہیں تو قومی تعلیم اور قوم کو علم و ہنر سکھانے کی کوشش کریں۔"

ان حالات کے پیشِ نظر انھوں نے علیگڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی اور ایک تعلیمی پروگرام تیار کیا تاکہ مسلمان بادِ مخالف کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ اپنے تعلیمی پروگرام میں سرسیّد نے ہندوؤں کی مدد بھی حاصل کی کیونکہ ان کے بغیر وہ کوئی کام کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کالج میں ہندو اور مسلمان طلبا برابر سے پڑھتے تھے، اور بلا امتیازِ مذہب ہر ایک کو داخلہ دیا جاتا تھا۔ ان کے اسٹاف میں ہندو اور

مسلمان دونوں ہی تھے۔ انھوں نے کالج میں مذہب کی بنا پر کسی کو ترجیح نہیں دی۔ اس لیے علیگڑھ تحریک ایک علاحدگی پسند تحریک نہیں تھی۔ خاص حالات کی بنا پر انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم پر مخصوص توجہ دی کیونکہ غدر نے ان کو بہت تباہ کردیا تھا اور ایک ملک میں جہاں بہت سے فرقہ کے لوگ رہتے ہوں، کسی بھی ایک کا پیچھے رہنا پورے ملک کے لیے مہلک تھا۔ اس لیے وہ مسلمانوں میں مغربی تعلیم پھیلانے کے لیے صدق دل سے لگ گئے۔

۲۶ جنوری ۱۸۸۴ء میں جو تقریر سرسید نے امرتسر میں کی، اس میں کہا:

"مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہے بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی سے ہے مدرسۃ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کے درست کرنے کے لیے اور جو افسوسناک محرومی ان کو یورپین سائنس اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی اس کو رفع کرنے کو قائم کیا گیا۔ مگر اس میں ہندو اور مسلمان دونوں پڑھتے ہیں، اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے، دونوں کو دی جاتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو کسی کو مسلمان کہیں مگر غیر ملک میں ہم سب نیٹو Native, یعنی ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں۔ غیر ملک والے خدا بخش اور گنگارام دونوں کو ہندوستانی کہتے ہیں . . . . اور یہی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پاویں، ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پئیں، ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پاویں، ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لیے موجود نہ کیے جاویں، ہماری عزت نہیں۔ مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں میرا یہی مطلب تھا۔"

باشندگان ضلع گورداس پور پنجاب میں جب سرسیّد اپنے مشن کا پرچار کرنے گئے تو ان کو ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر ایک سپاسنامہ پیش کیا جس کے جواب میں انھوں نے کہا:

"قومی کام میں واقعی اس وقت تک مدد نہیں ہوسکتی جب تک کہ لوگوں کے

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

دلوں میں ملک کی بھلائی، قومی ہمدردی، اپنے ملک کے تمام بچوں کی تربیت کا جوش نہ آجائے۔ بیشک میں اس قدر کہوں گا اور یقین دلاؤں گا کہ میرے دل میں یہ جوش شاید زیادہ ہے، اس سب سے میں نے قوم کی کچھ خدمت کی اس کے قوم بنانے کی مجھے تمنا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہندوستان میں جس خدا نے ہم کو اور ہمارے ہندو بھائیوں کو آباد کیا ہے جس سے اس کا منشا پایا جاتا ہے کہ ہم دونوں گروہ بھائی ہو کر اور ایک دوسرے کو بھائی سمجھ کر ایک دوسرے کو مدد دیں روز بروز ترقی کرے گا۔ پنجاب اور پلیٹ فارم گورداسپور پر یکجائی مجمع ان دونوں گروہوں کا دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اسی چیز کی ہندوستان میں ضرورت ہے۔ . . . میری دعا ہے کہ خدا ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی مدد کا خیال پیدا کرے اور ایک کو دوسرے کا حامی کرے۔"

ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں۔ اس پر سرسید نے بڑی تفصیل سے تقاریر کی ہیں اور ان کے سننے والوں میں دونوں فرقوں کے لوگ کثرت سے شامل ہوتے تھے۔ ان کے نظریات قومی یکجہتی پر مندرجہ ذیل کی تقریر سب سے بہتر ہو سکتی ہے جس کے پڑھنے کے بعد یہ شبہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک الگ قوم مانتے تھے۔

"اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں آباد ہیں اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب و ہوا کے شریک ہیں۔ ایک دریا یا کنویں کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتے ہیں ایک دوسرے سے ملے بغیر چارہ نہیں۔ پس کسی چیز کو جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔ ہم کو ایک دل ہو کر مجموعی حالت میں کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ایسا ہوگا تو سنبھل جائیں گے نہیں تو ایک دوسرے کے اثر سے دونوں قومیں تباہ اور بگڑ جاویں گی۔ پرانی تاریخوں میں پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں

سے فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں۔ مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرضکہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے گو ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے بسنے والے ہو۔ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے، یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے۔ اسی پر جیتے ہو اسی پر مرتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔"

اس طرح سر سید کی درجنوں تقاریر ہیں جن میں انھوں نے ہندو اور مسلمانوں کو ایک ہی قوم تصور کیا۔ انھوں نے نہ تو فرقہ وارانہ تقاریر کیں، نہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسایا اور نہ ملک کے بٹوارے کی بات کی اور نہ مسلمانوں کے لیے سروس میں Reservation, مانگا اور نہ انتخاب جداگانہ Separate Electorate کو ہوا دی بلکہ اس بات کی نصیحت کرتے رہے کہ مسلمان اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں تاکہ وہ ملک کو ترقی کی راہوں پر لے جائیں۔

۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس بنی تو سر سید نے اس کی مخالفت کی۔ اس لیے نہیں کہ وہ ہندوؤں کی جماعت تھی بلکہ اس لیے کہ وہ قبل از وقت تھی۔ ہر سیاسی تنظیم مسلمانوں کے لیے مہلک تھی اور اسی لیے انھوں نے جسٹس امیر علی کی محمڈن نیشنل کانفرنس میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ جس کی دعوت امیر علی، سر سید کو بار بار دے رہے تھے۔ چنانچہ سر سید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی پوری توجہ تعلیم پر لگانی چاہیے اور جب ان میں تعلیم آجاوے گی تو وہ قومی تحریک میں خود بخود آجاویں گے جیسا کہ بعد کو ہوا۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع تک علیگڑھ تحریک نے اپنا کام بخوبی انجام دیا۔ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری ہوئی اور ان کا ایک طبقہ سیاسی گٹھ جوڑ کی باتیں کرنے لگا۔ ان میں مولانا محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی سرِ فہرست تھے۔ لیکن کانگریس کے چند اراکین دل آزار باتیں کرنے لگے جس سے مسلمانوں کو تکلیف ہوئی۔ تقسیم بنگال سے ہندوؤں کو خوشی نہیں ہوئی لیکن مسلمان اس سے بے حد خوش ہوئے۔ اس طرح کے مسائل سے دونوں کے تعلقات میں وقتی کشیدگی پیدا ہوئی اور مسلمان اپنی ایک الگ سیاسی آرگنائزیشن بنانے کی سوچنے لگے تاکہ وہ مسلمانوں کے خیالات کو گورنمنٹ کے سامنے مؤدبانہ پیش کر سکیں۔ اس طرح ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ وجود میں آئی جس نے مسلمانوں کی قیادت کا بیڑہ اٹھایا۔

عام طور پر لکھا گیا ہے کہ مسلم لیگ ہندو مخالف جماعت تھی لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب مسلم لیگ کے قیام کے لیے نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ کے غیر مسلم سکریٹری نے سرکلر جاری کیا تو اس میں صاف طور پر لکھا کہ مسلمان ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے قیام کے لیے جمع ہوں جو کانگریس کی مخالفت میں بنائی جا رہی ہے۔ جب یہ سرکلر مسلم لیڈروں کے پاس پہنچا جس میں محسن الملک وقار الملک مظہر الحق شامل تھے تو سب نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور یہ سرکلر قبول نہ ہوا۔ مسلم لیڈروں نے صاف طور پر بیان کیا کہ ان کا مقصد کانگریس کی مخالفت نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے معاملات کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنا ہے جو کانگریس نہیں کرتی۔ اس کے بعد منٹو مارلے ریفارم آئے کانگریس اور لیگ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ ہوا پھر خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں شروع ہوئیں اور دونوں ہندو اور مسلمان شانہ بہ شانہ ان میں شامل ہوئے اور یہ سلسلہ ۱۹۲۸ء تک بخوبی چلتا رہا۔ البتہ فرقہ پرستی کا زور ۱۹۲۳ء سے شروع ہوا اور جگہ جگہ بلوے فساد ہوتے اور یہاں تک نفرت کا بول بالا ہوا کہ جب اسٹیشنوں پر گاڑیاں رکیں تو پانی پلانے والے آواز لگاتے "ہندو پانی والا"، "مسلم پانی والا"۔ گویا پانی بھی ہندو مسلم شکل میں بیچا جاتا۔

؎ فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سکا۔ لیکن یہ عارضی تھا اور مہاتما گاندھی اور علی برادران کی کوششوں سے یہ دور بھی ختم ہوا۔

۱۹۲۸ء کے بعد ہندوستانی سیاست نے زبردست کروٹ لی۔ نہرو رپورٹ نے مسلم لیگ کے نظریہ انتخاب کو تسلیم نہ کیا اور اس سے لیگ اور کانگریس کے درمیان خلیج پیدا ہو گئی۔ جناح نے اقلیتوں کے حقوق پر زبردست بحث کی اور جب نیشنل کونسل نے ان کی دلیل مسترد کر دی تو انھوں نے ہمیشہ کے لیے کانگریس کو خیرباد کہہ دیا اور لیگ میں ایک نئی روح پھونکی۔ اس وقت تک سرسید اور علیگڑھ تحریک پر کسی نقاد نے دو قومی نظریے اور نہ ہی تخلیق پاکستان کا لیبل لگایا لیکن جب جناح نے ایک الگ ملک کی مانگ کی تو سرسید اور جناح کے خیالات میں بڑی مناسبت بتائی گئی اور جناح کو سرسید کا جانشین قرار دیا گیا لیکن ایک گہرے مطالعہ کے بعد یہ دونوں الزامات ماند پڑ جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کا قیام علامہ اقبال کی دین ہے جنھوں نے اپنے خطبہ صدارت لیگ ۱۹۳۰ء میں ایک خود مختار حکومت کا خیال پیش کیا۔ اس کے بعد چودھری رحمت علی نے ۱۹۳۱ء میں ایک کتابچہ کی شکل میں پاکستان کا رنگ روپ پیش کیا جو زیادہ مقبول نہ ہوا اور مسلم لیڈروں نے اس کو ایک بچکانی اسکیم کہہ کر ٹال دیا۔ مگر ۱۹۴۰ء میں جناح نے مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ لاہور میں بڑی صفائی سے ایک مسلم اسٹیٹ کا مطالبہ کیا۔ جناح نے ہندو اور مسلمان کو دو قومیں بتایا جن میں کبھی دوستی ممکن نہیں انھوں نے ان دونوں کے مذہبی تفریق اور زبان پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی تہذیب، ان کا ادب، ان کی تاریخ ان کے ہیرو، ان کے رسم و رواج ان کے نظریاتِ زندگی ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں اور اس لیے ان کے ایک ساتھ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے برخلاف سرسید نے ہندو اور مسلمانوں کو ہندوستان کی دو خوبصورت آنکھیں بتایا اور کہا کہ ایک کی بدنمائی سے ہندوستان کی خوبصورتی پر اثر پڑے گا اور خدا کی یہ مرضی ہے کہ ہندو اور مسلمان اسی زمین پر جئیں اور اسی پر مریں۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۷ر اپریل ۱۸۸۸ء کے گزٹ میں انھوں نے لکھا۔ "یہ ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں اس قسم کی دوستی و برادری اور محبت روز بروز بڑھتی جائے اور سوشل حالات میں ایسی ترقی ہو کہ مسلمان بجز مسجدوں کے اور ہندو بجز مندروں کے پہچانے جائیں۔"

سر سید اور جناح کے خیال میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سر سید نے انیسویں صدی کے ہندوستان کے لیے حکومت نمائندگان Representative Government کی مخالفت کی کیونکہ ان کے خیال میں قبل از وقت تھی۔ سر سید کی دلیل یہ تھی کہ جب تک ملک کا ہر طبقہ تعلیمی اور معاشی حیثیت سے برابر نہ ہو جائے ایسی حکومت کسی بھی فرقہ کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی تھی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے سب سے پہلے ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھا جبکہ غالباً کسی نے دُور تک اس کو سوچا بھی نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں ان کی تقریر ۱۸۶۴ء بمقام غازیپور بہت واضح ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

"چند ہندوستانیوں کا لیجسلیٹو کونسل میں داخل ہونا ہندوستانیوں کی ترقی کا شروع ہے تم میری اس پیشین گوئی کو یاد رکھو کہ وہ دن کچھ دور نہیں ہے کہ ہر ضلع میں سے ایک شخص کا کونسل میں داخل ہونا ضروری ہوگا وہ دن آئے گا کہ تم خود ہی قانون بناؤ گے اور خود ہی اس پر عمل کرو گے۔"

اس لیے سر سید کا تخلیق پاکستان سے دُور دُور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔

❀

> "آج جس چیز کی وجہ سے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی ہے، جس نے ہماری طاقت کو بالکل گھٹا دیا ہے، جس کی وجہ سے گورنمنٹ کی نگاہ میں اس گروہ کی عظمت نہیں رہی، جس کی وجہ سے مخالفین کو ہم پر شماتت کا موقع ملا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اختلاف و اتفاق کو اصلی حدود پر نہیں رہنے دیتے۔" (علامہ شبلی نعمانی)

۶

سرسیّد اور مشاہیرِ اسلام

تہذیب جہاں شوخیٔ افکار کا اعجاز
سیّد کو عطا کی گئی افکار کی پرواز

ظہیر احمد صدیقی

نذرِ عقیدت

مادرِ درسگاہ کی خدمت میں

یہ کعبہ عقل و دانش ہے، یہ علم و ہنر کا مخزن ہے
تا حشر خزاں آئے نہ جہاں یہ گلشن ایسا گلشن ہے

یاں بادۂ عقل کے ساغر بھی اور عشق کے رنگیں جام بھی ہیں
اس میکدۂ عرفاں میں کئی رومی بھی ہیں اور خیام بھی ہیں

اس علم کدہ میں جینے کے آداب سکھائے جاتے ہیں
انسانیتِ عظمیٰ کے سبق انساں کو پڑھائے جاتے ہیں

گمراہیاں فطرت انساں کی اس محفل میں کھو جاتی ہیں
اخلاق کی اقدار اعلیٰ کردار میں ضم ہو جاتی ہیں

اس شمع سے اہل محفل کو ہستی کے شرارے ملتے ہیں
طوفانِ تردّد میں بھٹکے مانجھی کو کنارے ملتے ہیں

انساں کو ہجومِ غم سے یہاں پیغامِ اماں مل جاتا ہے
گم کردۂ منزل راہی کو منزل کا نشاں مل جاتا ہے

یاں دیپک علم و عرفاں کا گوشے گوشے میں روشن ہے
یہ خطہ خطہ یوناں ہے، یہ وادی وادیٔ ایمن ہے

اس بزم میں حق و صداقت کا پیغام سنایا جاتا ہے
اخلاق سنوارا جاتا ہے، کردار بنایا جاتا ہے

ہر ذرے میں جاری و ساری ہے سید کا فیضِ روحانی
تکمیل یہاں پا جاتی ہے ناپختہ سرشتِ انسانی

تا ساریٔ فطرتِ آدم کو اس در سے دوا دی جاتی ہے
اور علم و عمل کے شعلوں کو دامن سے ہوا دی جاتی ہے

ہر لحظہ جلائیں پاتا ہے اور اک یہاں احساس یہاں
ہے صدق و صفا کا ذوق یہاں اور مہر و وفا کا پاس یہاں

اس ارضِ پاک پہ شام و سحر انوار کی بارش ہوتی ہے
مٹی نہ کہو یہ سونا ہے، شبنم نہ کہو یہ موتی ہے

یاں عقل و جنوں کی آمیزش انساں کا سہارا بنتی ہے
طوفان حوادث ہستی کی موجوں میں کنارا بنتی ہے

لافانی عظمت و شوکت کے عنوان بنائے جاتے ہیں
اس علم کدہ میں اے ساقی انسان بنائے جاتے ہیں

ہر دل میں خوشی کے نغمے ہیں، ہر لب پہ ہیں کیف کے افسانے
اس علم و ہنر کی بستی میں دیوانے بھی ہیں فرزانے

یاں درسِ عمل بھی ملتا ہے اور ذوقِ نظر بھی ملتا ہے
عرفانِ خودی بھی ہوتا ہے اور سوزِ جگر بھی ملتا ہے

اللہ کرے یہ علم کدہ تا روزِ ابد آباد رہے
ہر آفت سے محفوظ رہے، ہر خدشے سے آزاد رہے

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

عبدالقوی دسنوی

سرسید احمد خاں
اور ان کا ایک عقیدتمند۔ اقبال

سرسید احمد خاں نے جو ذہنی، تعلیمی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کی تحریک شروع کی تھی وہ آہستہ آہستہ ہندستان گیر بنتی گئی اور دیکھتے دیکھتے اس نے سارے ہندستان میں نمایاں اثر دکھایا اور اگرچہ اس تحریک کی بعض گوشوں سے مخالفتیں بھی ہوئیں لیکن اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ تعلیم یافتہ عوام کا ایک بڑا طبقہ اس تحریک سے متاثر ہوا اور اس کا اہم حصہ بن گیا۔
۱۸۷۵ء میں سرسید احمد خاں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد علی گڑھ میں ڈالی جس کے بعد اس تحریک میں نئی جان پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے انیسویں صدی کے آخری ربع حصہ میں سارے ہندستان میں اس تحریک کی گونج سنائی دینے لگی تھی اور ہر طرف اس کے چرچے ہونے لگے تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے سرسید کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت اچھی بات یہ لکھی ہے کہ

> ''سرسید نے جو کچھ کیا وہ صرف ایک فرد کا تنہا اور خودمختار کارنامہ نہیں ہے۔ اُن کی شخصیت کی بڑائی، اُن کی نظر کی گہرائی ان کے جوش اور جذبے کی توانائی مسلم ہے مگر ان سب کی عظمت چند تاریخی قوتوں کے عرفان کی وجہ سے ہے۔ سرسید چند فطری قوتوں کا آلہ تھے۔ وہ ایک اجتماعی بصیرت کے ترجمان تھے، وہ ایک سماجی ضرورت کو پورا کر رہے تھے۔ سرسید نے شمالی ہندستان میں اردو ادب کے ذریعہ سے جو تہذیبی، تعلیمی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی خدمات انجام دیں وہ ایک ایسے طوفان کی موج ہیں جو ملک کے دوسرے حصوں میں تہذیبی اور ادبی ہیجان برپا کر چکا تھا۔''[1]

اور اس ہیجان سے جہاں ہندستان کے مختلف علاقوں کی مختلف تعلیم یافتہ شخصیتیں متاثر ہوئیں وہاں ان میں ایک شخصیت محمد اقبال کی بھی تھی وہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے اور سرسید احمد

---

[1] علی گڑھ نمبر، علی گڑھ میگزین مرتبہ نسیم قریشی ص ۳۷

[2] سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نے ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو وفات پائی، گویا سرسید کے انتقال کے وقت محمد اقبال کی عمر ۲۲ سال سے کچھ اوپر تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہوش سنبھالتے ہی محمد اقبال کے کان سرسید کے نام سے آشنا اور دل و دماغ سرسید تحریک سے متاثر ہونا شروع ہو گئے ہوں گے اور ان کی وفات کے وقت تک اقبال، سرسید تحریک کی قدر و قیمت اور اہمیت سے نہ صرف باخبر ہو گئے ہوں گے بلکہ سرسید کی عظمت کے معترف بھی ہو چکے ہوں گے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ سرسید کے انتقال کے بعد ہی انھوں نے ایک نہایت اہم نظم "سید کی لوح تربت پر" قلم بند کی جو جنوری ۱۹۰۳ء مخزن میں شائع ہوئی اور مقبول ہوئی۔

شخصیات سے متعلق اقبال نے اردو میں کئی اہم نظمیں لکھی ہیں جو بانگ درا، بال جبریل ضرب کلیم اور ارمغان حجاز میں محفوظ ہیں جن کے ذریعہ جہاں ان شخصیتوں کا تعارف کرایا گیا ہے وہاں خود اقبال نے زندگی اور دنیا سے متعلق اپنے نتائج فکر سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان نظموں میں داغ، سوامی رام تیرتھ، رام، فاطمہ بن عبداللہ، والدہ مرحومہ، نانک، بلال، شیکسپیر، مسولینی، سلطان ٹیپو کی وصیت، اور مسعود مرحوم وغیرہ اہم ہیں، ان میں کچھ تو وہ شخصیتیں ہیں جو تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، کچھ وہ ہیں جو اُن کے دور کی ہیں یا جن سے ان کی ملاقاتیں رہی ہیں۔

علامہ اقبال ایسی ہی شخصیتوں میں ہیں جن کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ سرسید کے زمانے کے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آخری دور میں اقبال نے سرسید کو دیکھا بھی ہو۔ اقبال نے اپنی اس قسم کی نظموں میں عام طور سے شخصیتوں کا تعارف کرایا ہے یا ان کی خوبیاں بیان کی ہیں لیکن "سید کی لوح تربت پر" انھیں سرسید کی نصیحتیں سنائی دیتی ہیں۔ اس طرح ان کی نظم "عرفی" میں بھی تربت سے صدا آتی ہے۔

صدا تربت سے آئی "شکوۂ اہل جہاں کم گو نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی" (بانگ درا ۲۶۸)

"سلطان ٹیپو کی وصیت" میں دراصل ٹیپو کی وصیت کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس نظم میں سلطان سے متعلق اقبال کے اپنے تاثرات ہیں جن کے ذریعہ انھوں نے ہماری ذہنی تربیت کرنے کی کوشش کی ہے اور رہنمائی فرمائی ہے اس نظم میں کل پانچ شعر ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

تو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول!
لیلیٰ بھی ، ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز!
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں!
محفل گداز! گرمیٔ محفل نہ کر قبول!
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول!
باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول [۱]

سوامی رام تیرتھ، اقبال کے دوست تھے ۱۷ر نومبر ۱۹۰۶ء کو گنگا میں نہانے گئے، جہاں اُن کا پانو پھسل گیا اور وہ ڈوب گئے۔ تیسرے دن اُن کی لاش نکالی گئی، اقبال کو اُن کی موت کی خبر نے بے حد رنجیدہ کیا جس کے نتیجہ میں یہ نظم "سوامی رام تیرتھ" وجود میں آئی۔ اقبال نے اس نظم کے ذریعہ زندگی کے راز سے اس طرح باخبر کیا ہے

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب! تو — پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہر نایاب تو
آہ! کھولا کس ادا سے تو نے راز رنگ و بو — میں ابھی تک ہوں اسیر امتیاز رنگ و بو
مٹ کے غوغا زندگی کا شورش محشر بنا — یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آذر بنا
نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا — لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا
چشم نابینا سے مخفی معنی انجام ہے — تھم گئی جس دم تڑپ، سیماب سیم خام ہے
توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق — ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

لیکن "سرسید کی لوح تربت پر" ایک ایسی نظم ہے جس میں اقبال نے سرسید کے انداز فکر ہی سے آگاہ نہیں کیا ہے بلکہ اُن کی زبانی اپنی بات 'عالم دین، مدبر اور شاعر تک پہچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم مخزن لاہور جنوری ۱۹۰۳ء میں اڈیٹر کے حسب ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی

"تخیل کے کانوں نے سرسید مرحوم کی قبر سے وہ صدائے پُر درد سنی، جس کی ایسے دل سے جو مرحوم کے پہلو میں تھا، توقع ہو سکتی تھی۔ خوبی یہ ہے کہ سرسید زندگی میں کئی حیثیتوں کا جامع تھا، اسی طرح اس کی لوح تربت سے وہ کلمات نصیحت شیخ محمد اقبال کی طبع رسا نے اخذ کیے ہیں جو زندگی کے مختلف مشاغل کے جامع ہیں اور جن سے ہر طبقے کے لوگ مستفید ہو سکتے ہیں۔" [۲]

---

۱ ضرب کلیم ص ۱۷

۲ مطالب بانگ درا غلام رسول مہر ص ۴۴

ابتدا میں اس نظم میں کل بتیس شعر تھے جن میں سے بیس شعر حذف کر دیے گئے۔

اے کہ زائرین کے میری قبر پر آیا ہے تو — اے کے مستانہ ے حسن عقیدت کا ہے تو
یہ وہ نظارہ ہے یاں ہر گل سراپا دیدہ ہے — اپنی گلشن کی زمیں میں باغباں خوابیدہ ہے
دیکھ اپنوں میں کہیں پیدا نہ ہو بیگانگی — چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا پیکار کی
دین کے پردے میں تو دنیا کا سودائی نہ ہو — آڑ میں مذہب کے شوق عزت افزائی نہ ہو
گالیاں دینا کسی کو دین کی خدمت نہیں — یہ تعصب کوئی مفتاح درجست نہیں
راہ بر کو قافلے کے ساتھ رہنا چاہیے — کیا چلے گا کارواں جب رہنما پیچھے رہے
ہو شرابِ حب قومی میں اگر سرشار تو — ہو نہ اپنی عزت افزائی کی تجھ کو آرزو
قافلہ جب تک پہنچ جائے نہ منزل کے قریں — رہنما ہوتے ہیں جو رستے میں دم لیتے نہیں
کیا مزہ رکھتی ہے ابنائے وطن کی فکر بھی — اس میں کچھ ہوتی نہیں اپنے کفن کی فکر بھی
دیکھ آواز ملامت سے نہ گھبرانا ذرا — عشق کے شعلے کو بھڑکاتی ہے یہ سن کر ہوا
وہ شجر ہے عشق اخواں زندگی ہے اس کا پھل — قوم کے عاشق کو چھو سکتا نہیں دست اجل
عالم عشقی میں ہے سب سے بڑی عزت یہی — عشق اخواں میں اگر مطعون ہو جائے کوئی
عشق ہر صورت میں تسکین دل ناشاد ہے — پر کہیں نالہ، کہیں شیون، کہیں فریاد ہے
خود بخود منہ سے نکل جاتی ہے ایسی نے ہے یہ — شیشۂ دل سے اچھل جاتی ہے ایسی مئے ہے یہ
چو زمینائے محبت خوردہ بودم بادۂ — تا ثریا رفت ایں قوم بخاک افتادہ
اپنے حق کے مانگنے میں رکھ ادب مد نظر — چاہیے سائل کو آداب طلب مد نظر
معنی رحر اطاعت کی نہ ہو جس کو خبر — چاہیے دنیا کو اس ناداں کی صحبت سے حذر
آب چوں در روغن افتد نالہ خیزد از چراغ — صحبت ناجنس باشد باعث آزارہا
دیکھ اے جادو بیاں تو نے اگر پروانہ کی — آبرو گر جائے گی اس گوہر یک دانہ کی
از شراب حب ہیم جنسان خود مستانہ باش — شعلہ شمع وطن را صورت پروانہ باش

اور یہ دو شعر اصلاح شدہ ہیں۔

ہے خموشی ہاں رہینِ لذت تقریر دیکھ — دیدہ باطن سے تو اس لوح کی تحریر دیکھ
(کلیات اقبال مرتبہ مولوی عبدالرزاق ص۔۶۴)

اصلاح شدہ۔ سنگ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ — چشم باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ
(بانگ درا ص۴۲)

ـــ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ مسر ۲۰۰۰ء

وصل کے ساماں پیدا ہوں تری تقریر سے دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تحریر سے
(کلیاتِ اقبال مولوی عبدالرزاق ص ۶۴)

اصلاح شدہ: وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
(بانگ درا ص ۴۲)

اور اسی کے ساتھ یہ دو شعر بانگ درا میں زیادہ ہیں

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

اور "ابتدائی کلام اقبال" مرتبہ ڈاکٹر گیان چند میں یہ دو شعر زیادہ ہیں

بسکہ ہے بادِ صبا یاں کی اخوت آفریں یہ وہ گلشن ہے جہاں سبزہ بھی بیگانہ نہیں
چاہیے ہو باعث آرام جاں شاعر کی لے لاج اس جزو نبوت کی ترے ہاتھوں میں ہے

اس نظم میں اگرچہ عام انسانوں کو پیغام دیا گیا ہے اور کامیاب اور اچھی زندگی کے راز سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن خاص طور سے عالم دین، مدبر یا سیاست داں اور صاحب قلم حضرات یعنی شاعر کو مخاطب کیا گیا۔ اور انھیں اُن کے فرائض سے باخبر کیا گیا ہے۔

عالم دین کو متوجہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا ہے

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وانہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
محفل نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ رنگ پر جو اب نہ آئیں اُن فسانوں کو نہ چھیڑ

یعنی اہل دنیا کو ترک دنیا کی تعلیم نہ دینا، فرقہ بندی کے بجائے تیری تحریروں کو اتحاد و اتفاق کا ذریعہ بننا چاہیے اور ایسی پرانی باتوں کا کہیں ذکر نہیں آنا چاہیے جن سے اتحاد و اتفاق کو نقصان پہنچنے کا خوف ہو۔ عام طور سے ہمارے سیاست داں وقت کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں جس کی وجہ سے بزدل بن جاتے ہیں اس لیے اقبال سیاست دانوں کو دلیری کی تعلیم دیتے ہوئے کہتے ہیں

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

یعنی ہمارے رہنماؤں کو سچا اور جرات مند ہونا چاہیے۔ انھیں حق بات کا اظہار بے خوف ہوکر کرنا چاہیے۔

اور صاحب قلم، خاص طور سے شاعروں سے اس طرح مخاطب ہوئے ہیں

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذ رحمانی ہے تو! ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو!

اور آواز دیتے ہیں!

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے خرمن باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

عالم دین، سیاست داں اور شاعر کسی قوم کی تعمیر میں اہم حصہ ادا کر سکتے ہیں اسی لیے اقبال نے اس نظم کے ذریعہ انھیں خاص طور سے مخاطب کیا ہے کہ وہ بھی سر سید کی طرح قوم کی رہنمائی اور تعمیر میں معروف ہو جائیں اور اس طرح سر سید کی دلی آرزو پوری ہو۔

اقبال کو اس کا احساس تھا کہ سر سید تحریک نے پیشہ ور مولویوں کی گرفت کو کم کرنے میں مدد کی ہے جس کے اثرات قوم پر صحت مند پڑ رہے تھے۔ انھوں نے ۲۰ را پریل ۱۹۲۵ء کو اپنے مکتوب بنام اکبر شاہ نجیب آبادی میں سر سید کے اس اہم کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھیں بھی ایسے پیشہ ور حضرات نے کافر قرار دیا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا

''آپ نے ٹھیک فرمایا ہے پیشہ ور مولویوں کا اثر سر سید احمد خاں کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا، جو یہاں ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا، انشاء اللہ شائع بھی ہو گا۔ مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا''[1]

اور سر سید سے اقبال کا جو ذہنی اور قلبی گہرا تعلق تھا اس کی ہی وجہ سے انھوں نے ۳۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو رات کو سر سید احمد خاں کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ اس زمانے میں اپنے علاج کے سلسلہ میں بھوپال تشریف لائے تھے اور فکر مند تھے، ان کا قیام ''شیش محل'' میں تھا۔ اپنے خواب کی اطلاع انھوں نے سر راس مسعود کو ۲۹ رجون ۱۹۳۶ء کے خط کے ذریعہ اس طرح دی تھی

'' ۳۰ اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا میں نے تمھارے دادا رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں عرض کر۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل

[1] کلیات مکاتب اقبال جلد ۲ مرتبہ سید مظفر حسین برنی ص ۵۸۴

[2] ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ساتھ شعر ہوئے۔ لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہے۔ الحمدللہ یہ مثنوی بھی اب ختم ہو گئی ہے مجھ کو اس مثنوی کا گمان بھی نہ تھا بہر حال اس کا نام ہو گا "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔" [1]

اور شاید سر سید احمد خاں سے اس گہرے اور مضبوط رشتے ہی کی وجہ سے علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے درمیان نہایت اچھے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سر راس مسعود کی علالت کے دوران وہ بہت زیادہ فکر مند رہے اور اچانک وفات پر بے حد مضطرب ہو گئے تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے خط مورخہ یکم اگست ۱۹۳۷ء بنام بیگم مسعود میں اس طرح کیا ہے

"مائی ڈیر لیڈی مسعود۔ میں آپ کو صبر و شکر کی تلقین کیونکر کروں جب کہ میرا دل تقدیر کی کاٹتوں سے خود لبریز ہے، مرحوم سے جو میرے قلبی تعلقات تھے اس کا حال آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ۔ اس بنا پر میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں آپ کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ غالباً مرحوم کے دوستوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہو گا جس کے دل پر مرحوم نے اپنی لواری، بلند نظری اور سیر چشمی کا گہرا نقش نہ چھوڑا ہو۔ مسعود اپنے باپ دادا کے تمام اوصاف کا جامع تھا۔ اس نے قدرت سے دادا کا دل اور باپ کا دماغ پایا تھا اور جب تک جیا، اس دل و دماغ ملک و ملت کی خدمت کرتا رہا۔ خدا تعالیٰ اسے غریق رحمت کرے۔" [1]

اس المناک حادثہ کے بعد ہی غم سے نڈھال ہو کر ایک نظم "مسعود مرحوم" قلم بند کی جو اکیس اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے نہایت دردمندی کے ساتھ اپنے اس طرح کے جذبات پیش کیے ہیں

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی ۔۔۔ وہ یادگار کمالات احمد و محمود
زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اس کی ۔۔۔ وہ کارواں کا متاع گراں بہا مسعود!
مجھے رلاتی ہے اہل جہاں کی بے دردی ۔۔۔ فغان مرغ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود!
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست ۔۔۔ نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود [2]

پوری نظم اقبال کے دردمند دل کے جذبات اور احساسات کے ساتھ ان کے زندگی اور دنیا سے متعلق انداز فکر کی آئینہ داری کرتی ہے۔

[1] خطوط اقبال رفیع الدین ہاشمی ص ۲۶۳ ۔ اقبال اور دار الاقبال بھوپال عبدالقوی دسنوی ص ۲۳۲
[1] اقبال نامہ حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۳۹۱
[2] کلیات اقبال (اردو) ص ۶۶۶
[3] ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اور شاید یہ اقبال اور سرسید کے گہرے تعلق ہی کا نتیجہ ہے جس نے ۱۹۰۷ء میں ان سے ایک اہم نظم "طلبہ علی گڑھ کالج کے نام" لکھوائی تھی۔ یہ نظم جون ۱۹۰۷ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی جس میں کل بارہ اشعار تھے لیکن بانگ درا کے لیے صرف سات اشعار انتخاب کیے گئے۔ باقی پانچ شعر حذف کر دیے گئے۔ مدیر مخزن نے اس نظم کے ساتھ یہ بھی تحریر کیا تھا:

"کلام اقبال علی گڑھ کالج میں ہمیشہ سے مقبول ہے اور شوق و توجہ سے پڑھا جاتا رہا ہے مگر پیام اقبال جو ہم آج شائع کرتے ہیں نہایت ہی غور سے پڑھے جانے کے لائق ہے۔ طلبہ علی گڑھ کو خصوصیت سے مخاطب کرنے کی یہ وجہ ہے کہ مسلمانان ہند کی آئندہ امیدیں بہت کچھ ان کے ساتھ وابستہ ہیں، ورنہ سب پڑھے لکھے نوجوان اس دردمندانہ مشورے کے مخاطب ہو سکتے ہیں جو حضرت اقبال نے ان چند اشعار کے جامع الفاظ اور بلیغ اشارات میں انھیں دیا ہے۔"[۱]

اس نظم کے ذریعہ اقبال نے اپنی ان خواہشوں اور امیدوں کا اظہار کیا ہے جو ان کے سرسید سے گہرے تعلق کی وجہ سے علی گڑھ کے طلبہ سے وابستہ تھیں۔ انھوں نے نظم کی ابتدا میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ عشق ملت میں ڈوب کر کہہ رہے ہیں۔ اوروں سے ان کو کوئی نسبت نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے　　　عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

اس کے بعد پانچ شعروں میں انھوں نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ تم طائر زیر دام کی باتیں سن چکے، اب آزاد پرندوں کی باتیں سنو، مراد ہے کہ وہ رہنما جو ذہنی طور پر حکومت وقت کے زیر اثر ہیں ان کی باتیں سننے کے بجائے آزاد خیال لوگوں کی باتیں سنو۔

اقبال نے پہاڑ کو پرسکون زندگی کی علامت بتاتے ہوئے کمزور چیونٹی کی عملی زندگی کو سراہا ہے۔ وہ قوم کو اس کی طرح باعمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ خیال درست ہے کہ ملت اسلامیہ اس وقت تک نمایاں نہیں ہو سکتی جب تک اس کے دل میں حرم پاک سے عشق نہ ہو یعنی ہمیں دین سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔

زندگی مسلسل جستجو یا حرکت کا نام ہے اور عیش دوام میں انساں کی موت ہے۔ چراغ صبح نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ حرارت زندگی کے لیے ضروری ہے کہ جستجو کی گرمی زندگی کو کامرانی اور ابدیت عطا کرتی ہے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اقبال نے اس نظم کے اختتام پر

۱۔ مطالب بانگ درا　　　غلام رسول مہر　　　ص ۱۲۵

سرسید کی بات اس طرح کہی ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسا ابھی

یعنی حکومت وقت سے ٹکرانے کے بجائے تم ملت کی تعمیر میں لگ جاؤ اس لیے کہ ابھی ٹکرانے کا وقت نہیں آیا ہے۔

بلاشبہ اقبال کے کلام کے مطالعے کے دوران اکثر مقام ایسے آتے ہیں جہاں اقبال سرسید کے ہم خیال نظر آتے ہیں لیکن "سید کی لوح تربت پر" اور "طلبہ علی گڑھ کے نام" کو پڑھنے کے بعد واضح طور سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال سرسید سے گہرا تعلق بھی رکھتے تھے اور ان کی عظمت کے معترف بھی تھے۔ انھوں نے سرسید سے متعلق اپنے اس طرح کے خیالات کا اظہار مختلف موقعوں پر کیا ہے۔

"وہ (سرسید) دور جدید کے پہلے سے مسلمان ہیں جس نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کی ایک جھلک دیکھ لی، لیکن ان کی حقیقی عظمت اس میں ہے کہ وہ پہلے ہندستانی مسلمان ہیں جس نے اسلام کی نئی تعبیر کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کے لیے سعی کی"۔

"سرسید کی ذات بڑی بلند تھی، بڑی ہمہ گیر، افسوس ہے مسلمانوں کو پھر ویسا رہنما نہیں ملا"

"علی گڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا ہوئی اور قوم کے قوائے علم و عمل حرکت میں آئے۔ یہ گویا ہماری نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک تحریک تھی"۔

اقبال نے "سرسید کی لوح تربت پر" میں خاص طور سے عالم دین، سیاست داں اور شاعر سے مخاطب ہو کر جو کچھ کہا ہے اُن کی اہمیت جیسی اس وقت تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔ کاش آج ہمارے عالم دین، سیاست داں اور شاعر، وقت کی ضرورت کو سمجھیں اور دین کی صحیح خدمت کریں۔ صحت مند سیاست کو فروغ دیں اور ایسا کلام پیش کریں جو قوم کی صحیح رہنمائی میں مدد کرے اور گمراہوں اور مفاد پرستوں سے نجات دلائے، تاکہ قوم میں نئی زندگی اور بیداری پیدا ہو جائے۔

اس طرح جہاں وہ ملک و قوم کی تعمیر میں اہم فرض ادا کریں گے وہاں اقبال کی تمنائیں ۹ بھی بر آئیں گی اور سرسید کے خواب کی تعبیر بھی ظاہر ہو گی۔ (۱ سرسید، اقبال اور علی گڑھ اصغر عباس ص ۵۸)

(بشکریہ: کتاب نما اکتوبر ۲۰۰۰ء)

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ظفر احمد صدیقی

سرسیّد احمد خاں
اور
مولانا محمد قاسم نانوتوی

سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء — ۱۸۹۸ء) اور مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۳۲ء تا ۱۸۸۰ء) کو عام طور پر دو متحارب شخصیتوں کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایم۔ اے۔ او کالج علیگڑھ، اور دارالعلوم دیوبند کو بھی ایک دوسرے کا حریف ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی محض ایک مفروضہ ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی یا اس عہد کے دیگر علمائے کرام انگریزی زبان یا دوسرے علوم جدیدہ کی تعلیم و تحصیل کو ناجائز تصوّر کرتے اور اس سے روکتے تھے۔ علماء کا سرسید سے اختلاف درحقیقت عقائد کی بنیاد پر تھا۔

راقم الحروف کے پیش نظر مولانا محمد قاسم نانوتوی کا ایک رسالہ ہے "تصفیۃ العقائد"، یہ سرسیّد کے ایک خط کا جواب ہے۔ اس رسالے کے نام اور پھر اس کے مواد و مشتملات کو دیکھ کر صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا کو سرسید سے نہ تو کوئی ذاتی اختلاف تھا نہ ان کی تعلیمی تحریک سے کوئی پرخاش۔ البتہ عقائد کے باب میں سرسیّد کی تعبیرات نیز آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں ان کی پیش کردہ تاویلات و توجیہات کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔

اس رسالے کا آغاز سرسیّد کے ایک خط سے ہوتا ہے یہ خط پیرجی محمد عارف

کے نام ہے لیکن اس میں روئے سخن مولانا محمد قاسم نانوتوی کی جانب ہے خط کا متن حسبِ ذیل ہے:

"جناب پیر جی صاحب مخدوم مکرم سلامت!

بعد سلام مسنون کے عرض ہے کہ بزرگانِ سہارنپور نے جو نوازش و دل سوزی میرے حالِ زار پر کی جس کا ذکر آپ نے مجھ سے فرمایا۔ میں دل سے ان کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو میری سعادت ہے۔ میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔ مگر اس وقت مرزا غالب کا ایک شعر مجھے یاد آیا، وہو ہٰذا ـ

حضرتِ ناصح جو آویں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا

جناب من! میری تمام تحریریں جن کے سبب میں کافر و مرتد ٹھہرا ہوں اور وحدانیت و رسالت کی تصدیق کے ساتھ کفر جمع ہوا ہے، جو میرے نزدیک محالات سے ہے چند اصول پر مبنی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان اصولوں کو بزرگانِ سہارنپور کی خدمت میں بھیج دیں۔ اگر ان میں کچھ غلطی ہے تو بلا شبہ نصیحتِ ناصح کارگر ہوگی۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ ناصح ہی مجھ سے ہو جائیں۔ اور وہ اصول یہ ہیں۔۔۔"[1]

اس کے بعد محولا بالا اصولوں کی تفصیل مذکور ہے۔ یہ پندرہ اصول ہیں اور ڈیڑھ پونے دو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعض اقتباسات ہم آئندہ صفحات میں نقل کریں گے۔ سردست ہم یہاں سرسید کے خط کا جواب پیش کرنا چاہتے ہیں، جو مولانا نانوتوی کا تحریر کردہ ہے۔ یہ جواب بھی پیر جی محمد عارف کے نام ہے لیکن اصل خطاب سرسید سے ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجموعۂ عنایات پیر جی محمد عارف صاحب!

السلام علیکم وعلیٰ من لدیکم

آج بندہ درگاہ دلی سے میرٹھ واپس آیا تو مولوی محمد ہاشم صاحب نے

[1] سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مولانا محمد یعقوب (۱۲۴۹ھ — ۱۳۰۲ھ) کا عنایت نامہ جو آیا رکھا تھا، عنایت فرمایا کھولا تو آپ کا خط اور جناب سید احمد خاں کی ایک بڑی تحریر اندر سے نکلی۔ شاید یہ قصہ اس گفتگو کا نتیجہ ہے جو آخر ماہ شوال میں بمقام انبیٹھ مابین احقر و جناب ہوئی تھی۔ سید صاحب کی تحریر سے کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ آپ نے میرے آنے کا کچھ تذکرہ ان سے کیا ہوگا۔ مگر مجھ کو یاد نہیں آتا کہ آپ نے کس بات سے سمجھا ہوگا۔

اس وقت کی عرض معروض کا ماحصل فقط اتنا ہی تھا کہ سید صاحب کی ہاں میں ہاں ملانا، ہم سے جبھی متصور ہے کہ سید صاحب اپنے ان اقوالِ مشہورہ سے رجوع کریں جو ان کی نسبت ہر کوئی گاتا پھرتا ہے اور سید صاحب ان پر اصرار کیے جاتے ہیں۔ اور رجوع نہیں فرماتے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ گذارش میری طرف سے آپ کی اس استدعا کے جواب میں تھی جو آپ نے دربارۂ شمولِ حالِ جناب سید صاحب اس ناکام سے کی تھی۔ بہرحال آنے جانے کا کچھ مذکور نہ تھا۔

آپ ہی فرمائیں کہ ہم سے گرفتاروں کو اتنی رہائی کہاں کہ بنارس غازی پور اُڑ جائیں اور ہم سے بے چاروں کو اتنی رسائی کہاں کہ سید صاحب کے درِ دولت تک نوبت پہنچائیں۔ اپنا مبلغ پرواز میرٹھ، حدّ نہایت دلی ہے۔ تس پہ نقار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے؟ کیا آپ کے خیال میں یہ بات آسکتی ہے کہ صدر الصدورِ اعظم ایک غریب سے مزدور کے طور پر ہو جائیں؟ اجی حضرت امیروں کے ذہن و فہم و عقل و ادراک کے ہزاروں گواہ ہوتے ہیں، غریبوں کے فہم و فراست کا کہیں ایک بھی نہیں سنا۔ اس صورت میں کیونکر کہہ دیجیے کہ سید صاحب ایک غریب سے شیخ زادہ کی مان جائیں۔

کب وہ سنتے ہیں کہانی میری\
اور پھر وہ بھی زبانی میری

ہم سے شکستہ حالوں کی باتوں پر موافق مصرعِ غالب ؏\
میں کہوں گا حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ایسے عالی مراتب و دانش مند ہرگز توجہ نہیں فرمایا کرتے۔ بہ ایں ہمہ ایسی ایسی چھیڑ چھاڑوں میں کبھی نہیں دیکھا کہ کسی ادنی نے بھی کسی اعلیٰ کی مانی ہو۔ اس صورت میں ایسی برعکسی کی کیا امید باندھیے؟

پیرجی صاحب!

یہ گمنام کبھی کسی سے نہیں الجھتا اور اگر الجھے بھی تو کیونکر الجھے۔ وہ کون سی خوبی ہے جس پر کمر باندھ کر لڑنے کو تیار ہو۔ ایسی کیا ضرورت ہے کہ اپنے عمدہ مشاغل کو چھوڑ کر اس نفسا نفسی میں پھنسوں۔ ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندی اہلِ اسلام کا معتقد ہوں۔ اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہارِ محبت کروں تو بجا ہے۔ مگر تاہم اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فسادِ عقائد کو سن سن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں۔

مجھ کو ان کے کمالِ دانش سے یہ امید تھی کہ میرے اس رنج کو ثمرۂ محبت سمجھ کر تہ دل سے اپنے اقوال میں مجھ سے استفسار کریں گے۔ بہ ایں خیال کہ

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں

بغلط برہدف زند تیرے

اس طرف کو دل لگائیں مگر ان کی اس تحریر کو دیکھ کر دل سرد ہوگیا۔ یہ یقین ہوگیا کہ کوئی کچھ کہو، وہ اپنے وہی کہے جاویں گے۔ ان کے اندازِ تحریر سے یہ بات نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلط نہ کہیں گے۔ اس لیے جی میں آتا ہے کہ قلم ہاتھ سے ڈال دیجئے مگر کیا کروں آپ کا تقاضا جدا جان کو کھائے جاتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب کا ارشاد جدا ہی ڈراتا ہے۔ ؎

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

جب بے کہے نہ بنی تو قلم کو روک روک کر کچھ مختصر مختصر ایک بار عرض کر دینا مناسب جانا اور جی میں یہ ٹھانا کہ ہرچہ بادا باد۔ پھر قلم نہ اٹھانا۔ کہیں مدلل کہیں بے دلیل ایک بار تو اپنے مافی الضمیر کو لکھ کر روانہ کرا دیئے۔ اگر سید صاحب نے انصاف فرمایا تو پھر بھی دیکھا جائے گا۔ ورنہ اپنے حق میں کوئی جابر نہیں، جو مجبوری کا اندیشہ ہو۔ بہرحال بہ ترتیب اصول مسطورۂ سید صاحب یہ معروضات

معروض ہیں۔" ؎۲

مولانا نانوتوی کے جواب خط کے مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا کو سرسید کی تعلیمی تحریک یا ان کے دوسرے قومی و اصلاحی کاموں سے کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ وہ تو صراحتًا لکھتے ہیں کہ:

"سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندیٔ اہل اسلام کا معتقد ہوں۔"

ہاں اگر اختلاف تھا تو سرسید کے ان "اقوال مشہورہ" سے تھا جس کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں کہ:

"سید صاحب ان پر اصرار کیے جاتے ہیں اور رجوع نہیں فرماتے۔"

اس طرح مولانا نے اس کی بھی صراحت کر دی کہ سرسید سے ان کی شکایت یا رنجیدگیِ خاطر کا سبب ان کی ذات نہیں، ان کے عقائد ہیں۔

"ان کے فسادِ عقائد کو سن سن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں۔"

نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں ضمناً سرسید کے تحریر کردہ بعض اصول اور ان سے متعلق مولانا نانوتوی کے جوابات بھی نمونتاً پیش کر دیے جائیں۔ سرسید کہتے ہیں:

"(اصل) دوم: اس (خدائے واحد ذوالجلال) کا کلام اور جس کو اس نے رسالت پر مبعوث کیا، اس کا کلام ہرگز خلافِ حقیقت اور خلافِ واقعہ نہیں ہو سکتا۔"

مولانا نانوتوی اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"جواب اصل دوم: کلامِ خداوندی اور کلامِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم جیسے مخالفِ حقیقت اور مخالفِ واقعہ نہیں ہو سکتا ایسے ہی حقیقت اور واقعہ کے دریافت کرنے کی صورت اس سے بہتر کوئی نہیں کہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی طرف رجوع کیا جائے۔ سو اگر کوئی طریقہ دربارۂ اخبارِ واقعہ اور حقیقت مخالف کلام اللہ اور احادیثِ صحیحہ ہو تو کلام اللہ اور احادیث کے وسیلہ سے اس کی تغلیط کر سکیں گے۔ پر کلام اللہ اور احادیث کی تغلیط اس طریقے کے بھروسے نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں اگر اشارۂ عقل معارضِ اشارۂ نقل ہو

؎۲ ماہی فکر و آگہی (دہلی) علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

تو ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔

غرض عقل کی بات یہ ہے کہ کلام اللہ اور احادیث صحیحہ نمونۂ صحت اور سُقم دلائلِ عقلیہ سمجھے جائیں نہ برعکس۔ علیٰ ہذا القیاس مضمونِ متبادر کلام اللہ و حدیث کو جو باعتبار قواعدِ صرف و نحو دلالتِ مطابقی سمجھے جاتے ہوں۔ اصل مقرر کر کے دلائلِ عقلیہ کو اس پر مطابق کریں۔ اگر کھینچ کھینچا کر بھی مطابق آجائے تو فبہا ورنہ قصورِ عقل سمجھیں، یہ نہ ہو کہ اپنے خیالات و اوہام کو اصل سمجھیں اور کلام اللہ و حدیث کو کھینچ تان کر اس پر مطابق کریں۔"

اسی طرح اصل سوم کے تحت سرسید رقمطراز ہیں:

"قرآن مجید بلاشبہ کلامِ الٰہی ہے۔ کوئی حرف نہ اس کا خلافِ حقیقت ہے نہ خلافِ واقعہ۔"

اس کے جواب میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"جواب اصل سوم: اس میں کچھ شک نہیں کہ قرآن مجید کا کوئی کلمہ خلافِ واقعہ نہیں مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کبریٰ کلیہ کے لیے کوئی صغریٰ جزئیہ بوسیلہ عقل دریافت کرلینا، ہم سے ہیچ دانوں کا تو کیا حوصلہ؟ جناب سید صاحب اور مولوی مہدی علی خاں صاحب (معروف بہ محسن الملک ۱۸۳۷ء۔۱۹۰۷ء) کا بھی کام نہیں۔ یعنی بوسیلۂ عقل یوں نہیں کہہ سکتے کہ "ہذا حقیقۃ" و "واقع" (یہ حقیقت ہے یا واقعہ ہے) اور کہیں تو تاوقتیکہ کلام اللہ کے معنی متبادرِ مطابقی کے مطابق ہے تو بصر و چشم، ورنہ کالائے زبوں بریش خاوند۔

مگر یہ یاد رہے کہ معنی مطابقی سے زیادہ لینے کی اجازت نہیں۔ ہاں اگر کوئی اور دلیل نقلی یا عقلی سے ایسی بات ثابت ہو جائے جو معنی مطابقی کے مخالف نہیں، تو کچھ مضائقہ نہیں۔ غرض "جاءنی زید" (زید میرے پاس آیا) سے زید کا فقط آنا ثابت ہوگا۔ سوار ہونے یا پیادہ آنے سے سروکار نہیں۔"

"اصل چہارم" کے تحت سرسید تحریر کرتے ہیں:

"قرآن مجید کی جس قدر آیات کہ ہم کو بظاہر خلافِ حقیقت یا خلافِ واقعہ معلوم ہوتی ہیں، دو حال سے خالی نہیں یا تو ان آیات کا مطلب سمجھنے میں

ہم سے غلطی ہوئی ہے یا جس کو ہم نے حقیقت اور واقعہ سمجھا ہے، اس میں غلطی کی ہے اس کے برخلاف کسی محدث یا مفسر کا کلام تسلیم نہیں ہے۔"

اس کے جواب میں مولانا نانوتوی لکھتے ہیں:

"جواب اصل چہارم: واقعی مخالف کلام اللہ نہ کسی محدث کا قول معتبر ہے نہ کسی مفسر کا، بلکہ خود حدیث اگر مخالفِ کلام اللہ ہو تو موضوع سمجھی جائے گی۔ مگر تخالف اور توافق کا سمجھنا ہم جیسوں کا کام نہیں اس کے لیے تین علموں کی ضرورت ہے ایک تو علم یقینی معانی قرآن، دوسرے علم یقینی معانی قولِ مخالف۔ تیسرے علم یقینی اختلاف۔

جس کو یہ منصب خدا عطا کرے، اس کے بڑے نصیب، اور یوں جاہل اور نیم ملّا اس بات میں ٹانگ اڑانے لگیں تو ان کا یہ دخل بے جا ایسا ہی ہوگا جیسے کسی طبیب حاذق کی بات میں کسی نادان یا کسی نیم طبیب کا دخل ہو۔ سو جیسے طبیبِ حاذق سے بوجہ خطا و نسیانِ ذاتی، مخالفتِ قوانینِ طب کسی خاص واقعہ میں ممکن ہے، پر اد و یہ پر گرفت کرنا مریضِ نادان یا نیم طبیب کا کام نہیں۔ ایسے ہی محدّث اور مفسّر سے مخالفتِ غرضِ قرآنی بوجہ خطا و نسیان کے ممکن ہے ہم سے جاہل یا نیم ملّا کا یہ منصب نہیں کہ ہم بھی اس کو دریافت کرسکیں یا در بابِ صحتِ تخالف ہمارا قول معتبر ہو سکے۔ ہاں البتہ یہ بات ممکن ہے کہ دو تفسیریں سن کر بشہادتِ وجدان ایک کو راجح دوسرے کو مرجوح سمجھ لیں۔ اس لیے کہ بات کا نکالنا مشکل ہے۔ یہ بتلانے پر سمجھ لینا آسان ہے۔ بہر حال: "ہر کارے و ہر مردے" مخالفت کا سمجھ لینا ہر کسی کا کام نہیں اور بعد اطلاع مخالفت جب اکابر کے اقوال قابلِ قبول نہ ہوئے تو ہمارے تمہارے یا سیّد صاحب کے اقوال اگر مخالف کلام اللہ یا حدیث ہوں گے تو بہ درجۂ اولیٰ مقبول نہ ہوں گے۔"[1]

سر سید کے تحریر کردہ اصول اور ان سے متعلق مولانا نانوتوی کے جوابات کی نوعیت سمجھنے کے لیے مندرجہ بالا مثالیں کافی ہیں۔ ان کی روشنی میں اہلِ علم حضرات بذاتِ خود یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ منشائے اختلاف کیا تھا؟ اور کیا یہ کشاکش جمود اور روشن خیالی، رجعت پسندی اور ترقی پسندی کے مابین تھی؟ یا

[1] فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اس کی تعبیر کے لیے کوئی دوسرا پیرایۂ بیان تلاش کرنے کی ضرورت ہے؟

ہم نے اس مضمون کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کو علیگڑھ کالج کا حریف اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کو علوم جدیدہ کا مخالف تصور کرنا درست نہیں۔ یہاں اس سے متعلق تفصیلی گفتگو کی جاتی ہے۔ حضرت نانوتوی کے سوانح نگار مولانا مناظر احسن گیلانی "سوانح قاسمی" میں تحریر فرماتے ہیں:

"نہ علوم جدید کی افادیت ہی کے آپ منکر تھے اور نہ آپ کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو ان علوم و فنون سے الگ تھلگ رہنا چاہیے۔"

البتہ کلام اس میں تھا کہ: "عصر حاضر کے عام علمی حلقوں میں امتیاز و وقار یورپ کے جن علوم و فنون اور السنہ یا زبانوں سے آگاہی حاصل کیے بغیر علمی کاروبار کرنے والے حاصل نہیں کر سکتے، ان کا پیوند اپنے یہاں کے دینی علوم، اور دوسرے عقلی و ذہنی قدیم فنون سے کیسے قائم کیا جائے؟"

بقول مولانا گیلانی اس کی تین شکلیں ممکن تھیں ایک تو یہ کہ دینی علوم اور قدیم تدریسی فنون کے ساتھ ساتھ جدید علوم والسنہ کی کتابیں بھی نصاب میں شریک کر لی جائیں۔ دوسری یہ کہ:

"جدید علوم و فنون سے فارغ ہونے کے بعد اسلامی علوم کے سیکھنے کا موقع طلبار کے لیے فراہم کیا جائے۔"

تیسری یہ کہ:

"مسلمان بچوں کو دینی و اسلامی علوم سے کم از کم وقت میں قدر ضرورت کی حد تک واقف بنا لینے کے بعد، ان کو جدید علوم و فنون کی یونیورسٹیوں میں شریک کیا جائے۔"

مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ: ان میں سے تیسری شکل کو اپنے نصب العین میں حضرت والا نے شریک کرنا چاہا تھا۔"[۴]

مولانا گیلانی کے اس بیان کی بنیاد حضرت نانوتوی کی ایک تقریر ہے، جو اس جلسہ میں کی گئی تھی جو دارالعلوم دیوبند کے فارغ طلبار کو سند و انعام دینے کے لیے ۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۹ جنوری ۱۸۷۳ء کو دیوبند میں منعقد ہوا تھا۔ تقریر کا

متعلقہ حصہ حسبِ ذیل ہے:

"اب ہم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ بابِ تحصیل، یہ طریقۂ خاص کیوں تجویز کیا گیا؟ اور علومِ جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا گیا؟ منجملہ دیگر اسباب کے بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص، اس بات کا لحاظ چاہیے جس کی طرف ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو۔ سو اہلِ علم پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرتِ مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو زمانۂ سلاطینِ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی۔ ہاں علوم نقلیہ کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانے میں نہ ہوا ہوگا۔ ایسے وقت میں رعایا کو مدارسِ علوم جدیدہ کا بنانا، تحصیل حاصل نظر آیا۔ صرف بجانبِ علوم نقلی اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے، انعطاف ضروری سمجھا گیا۔

علوم نقلیہ اور ان کے ساتھ علوم دانش مندی کو داخل تحصیل کیا۔ اس کے بعد اگر طلبہ مدارس ہٰذا، مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمالات میں یہ بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی۔ زمانۂ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعثِ نقصانِ استعداد رہتی ہے۔"[۵]

اپریل ۱۸۸۰ء میں مولانا نانوتوی نے وفات پائی۔ اس حادثے سے متاثر ہو کر سرسید نے 'تہذیب الاخلاق' میں ان پر ایک مضمون تحریر کیا۔ اسے پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود سرسید کی نگاہ میں مولانا نانوتوی اور ان کے قائم کردہ دارالعلوم دیوبند کی کیا قدر و منزلت تھی؟ وہ لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ جناب ممدوح حضرت مولانا قاسم نانوتوی نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رو چکا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا۔ لیکن ایک ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آوے، نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علماء میں بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ و ورع میں معروف و مشہور تھے، ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بے مثل تھے۔

۵۔ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی اسحاق کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ و ورع اور تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل ایک اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے جو کہ چند باتوں میں ان سے زیادہ ہے۔

ابھی بہت سے لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مولوی محمد قاسم کو نہایت کم عمری میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے۔ انھوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیکی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے۔ اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا۔

بالائے سرش ز ہوش مندی

می تافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیلِ علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے، ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبانِ زدِ اہلِ فضل و کمال تھے ان کو جناب مولوی مظفر حسین کاندھلوی کی صحبت نے اتباعِ سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہؒ کے فیضِ صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت عالی رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابندِ شریعت تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی پابندِ سنت و شریعت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ بہ ایں ہمہ تمام مسلمانوں کی بھلائی کا ان کو خیال تھا۔ ان ہی کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی و کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے وہ کچھ خواہش پیر و مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے، لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاعِ شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے، مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو، خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر تھے، بلاشبہ للّٰہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے، اس کی پیروی کرتے تھے۔ ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے لیے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے۔ مسئلہ حب للّٰہ اور بغض للّٰہ خاص ان فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو، بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلوماتی علم میں شاہ عبدالعزیزؒ سے کچھ کم ہو، الّا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی، نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی اسحاقؒ سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ وہ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے آدمی کے وجود سے زمانے کا خالی ہوجانا ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں، نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے، زبانی عقیدت اور ارادت بہت ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت اور افسوس کے کہہ کر خاموش ہوجائیں۔ یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کرلیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے۔ اور اس کے ذریعے سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے۔"[۶]

اردو کے مشہور صاحب قلم اور مصنف شیخ محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس علیگڑھ کے زبردست حامی اور اس کے پرجوش وکیل تھے۔ انھیں سرسید کی سیرت و شخصیت سے غیر معمولی عقیدت اور والہانہ لگاؤ تھا۔ انھوں نے اپنی گراں قدر تصنیف "موج کوثر" میں سرسید احمد خاں، ان کے نامور رفقاء اور علیگڑھ تحریک سے متعلق بہت مبسوط

[۶] ماہنامہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اور مفصل گفتگو کی ہے۔ ہم یہاں خاتمۂ کلام کے طور پر ان کا ایک اقتباس نقل کرنا چاہتے ہیں جس سے ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ علمائے کرام نے عام طور پر انگریزی یا علوم جدیدہ کی تحصیل کی ہرگز مخالفت نہیں کی اور یہ کہ اس کے برخلاف جو کچھ کہا اور لکھا جاتا ہے، غلط یا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ موصوف "سر سید کی مخالفت" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"یہ غلط فہمی بہت عام ہے کہ علماء نے سر سید کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ وہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے سر سید کے موافق اور مخالف تحریروں کا مطالعہ کیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ خیال غلط ہے اور علماء اور اسلام کے ساتھ صریح بے انصافی ہے۔۔۔

اس کے علاوہ جب شاہ عبدالعزیزؒ سے انگریزی کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے سے متعلق فتویٰ لیا گیا تو انھوں نے بزور کہا، "جاؤ انگریزی کالجوں میں پڑھو اور انگریزی زبان سیکھو۔ شرعاً ہر طرح جائز ہے۔" اب لوگ حیران ہیں کہ جب سرکار کے قائم کیے ہوئے کالجوں میں پڑھنا جائز تھا تو ایک ایسے مدرسۃ العلوم کی کیوں مخالفت ہوئی جو مسلمانوں کا جاری کردہ تھا، اور جس میں مذہبی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔

اس معمّہ کے حل کرنے کے لیے ان مضامین اور فتاویٰ کا مطالعہ کرنا چاہیے جو سر سیّد کی مخالفت اور ان کی تکفیر میں شائع ہوئے۔ ان کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ علیگڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جانے تھے بلکہ اس لیے ہوئی کہ اس کی بنا میں سر سید کا ہاتھ تھا اور سر سیّد اپنی کتب اور تہذیب الاخلاق میں معاشرتی اور مذہبی مسائل کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے جنھیں عام مسلمان اسلاف کے خلاف سمجھتے تھے علیگڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتاویٰ میں یہ نہیں لکھا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے، بلکہ یہی درج ہے کہ جس شخص کے عقائد سر سیّد جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں۔ اور جو مدرسہ ایسا قائم کرنا چاہے اس کی اعانت جائز نہیں۔ شروع شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ سر سید اپنے مدرسے میں ان عقائد کی تبلیغ کریں گے جن کا اظہار وہ اپنے رسائل و کتب میں کر رہے

۱۔ ماہنامہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

تھے۔ سرسید نے ایسا نہیں کیا لیکن ان کی تصانیف میں کئی باتیں ایسی ہوتی تھیں جن سے مخالف بلکہ موافق بھی بدظن ہو جاتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔

جن لوگوں نے سرسید کے حالات بغور نہیں پڑھے وہ سمجھتے ہیں کہ سرسید کی مخالفت ان دقیانوسی علماء نے کی جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے اور سرکارِ انگلشیہ اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے۔ دونوں معززِ سرکاری ملازم، یعنی مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سب جج۔ حالی نے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں، ان کا منبع انھیں دو صاحبوں کی تحریریں تھیں"۔[7]

حواشی

[1] "تصفیۃ العقائد" مولانا محمد قاسم نانوتوی، کتب خانۂ اعزازیہ، دیوبند، سند ندارد۔ ص ۲

[2] ایضاً۔ ص ۴۔۵

[3] ایضاً۔ ص ۶۔۷

[4] مولانا گیلانی کے مذکورہ اقتباسات کے لیے ملاحظہ ہو سوانح قاسمی حصہ دوم، الجمعیۃ پریس دہلی۔ طبع ۱۳۷۳ھ۔ ص ۲۷۶ - ۲۷۹

[5] ایضاً۔ ص ۲۷۷ - ۲۸۳

[6] تہذیب الاخلاق بحوالہ موجِ کوثر، شیخ محمد اکرام، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۷ء۔ ص ۷۶۔۹۰

[7] موجِ کوثر۔ ص۔ ۹۰۔۹۲

علم کی طلب میں نکلنے والا دراصل اللہ کے راستے میں نکلنے والا ہے۔ (حدیث)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

سرسیّد اور اکبر الہ آبادی

سرسیّد احمد انیسویں صدی عیسوی کے ان گنے چنے مفکرین اور سماجی مصلحین میں سے ہیں جن کی بڑائی منوانے کے لیے اب کسی مدلل تقریر یا مقالے کی ضرورت نہیں رہی۔ اور تو اور جس گروہ کی طرف سے سرسیّد احمد کی ذات و صفات پر کسی زمانے میں سخت حملے کیے گئے تھے اور جن کی نظر میں سرسیّد کی اصلاحات قومی کی کوئی اہمیت نہ تھی آج وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ سرسیّد احمد خاں فی الواقع ایک غیر معمولی دماغ اور غیر معمولی قوت ارادی کے مالک تھے۔

سرسیّد احمد خاں جامع شخصیت کے مالک تھے اور مسلمانانِ ہند کی اصلاح کا ایک جامع منصوبہ رکھتے تھے۔ اس منصوبے میں سماجی، معاشرتی اور مذہبی زندگی کے سبھی پہلو شامل تھے۔ ہر پہلو کی اصلاح کے سلسلے میں چونکہ سرسیّد کا اندازِ فکر آزادانہ اور طریقۂ کار جدید تر ہونے کے ساتھ عقلیت پسندانہ تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے اکثر طبقے جو ایک مدت سے صرف تقلید، تنگ نظری، تعصب اور جذباتی سطح پر زندگی بسر کر رہے تھے، سرسیّد کے مخالف ہو گئے۔ اس مخالفت کا طوفان یہاں تک بڑھا کہ بعض رجعت پسند طبقوں کی طرف سے انھیں ملحد اور کافر تک کے القابات سے نوازا گیا۔

مخالفت کرنے والوں میں مختلف الخیال لوگ شامل تھے۔ بعض ان کی تعلیمی سرگرمیوں کے مداح تھے لیکن دوسری سماجی اصلاحات کو پسند نہ کرتے تھے۔ بعض سماجی اصلاحات کو سراہتے تھے لیکن تعلیمی پروگرام کو گمراہ کن خیال کرتے تھے۔ بعض ان کی معاشرتی زندگی یعنی انگریزوں کے ساتھ رہنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے میں

شریک ہونے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بعض ان کی مذہبی تحریروں کے سبب انھیں ناپسند کرتے تھے۔ بعض اس لیے انھیں برا کہتے تھے کہ وہ مذہب کے ہر پہلو کو عقلیت اور سائنس کی میزان پر تولتے تھے اور بعض کو ان کے اصلاحی پروگرام سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ سرسید احمد کا کوئی کام انھیں پھوٹی آنکھ نہ بھاتا تھا اور ہر کام میں کیڑا نکال لینے اور ان کی پگڑی بے سبب اچھال لینے ہی کو مقصدِ حیات جانتے تھے۔ ایسے لوگوں کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا اور دنیا بھر کی مخالفت کے باوجود سرسید کا نام اور کام دونوں آج بھی زندہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مخالفین کی نہ کوئی اہمیت ہے اور نہ سرسید کے ساتھ کسی نہج سے ان کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ہاں بعض مخالفین ایسے تھے جن کی شخصیتوں اور جن کے اختلافات کو سرسید کے ذکر میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میری مراد اردو کے ممتاز ترین طنز نگار شاعر اکبر الٰہ آبادی سے ہے۔ مولانا شبلی کی طرح اکبر کو بھی سرسید کی اصلاحی تحریک کے بعض پہلوؤں سے اختلاف تھا اور شدید اختلاف تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا شبلی کے اختلاف کا تعلق زیادہ تر سرسید کے سیاسی مسلک سے تھا اور اکبر الٰہ آبادی کا سرسید کے مذہبی مسلک سے لیکن اکبر نے جس شد و مد کے ساتھ سرسید کی اصلاحات قومی کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے، شبلی نے نہیں بنایا۔ اکبر الٰہ آبادی کا سارا زور سرسید تحریک کی مخالفت میں صرف ہوا ہے۔ بظاہر اکبر کے موضوعات شاعری کا دامن بہت وسیع نظر آتا ہے۔ معاشرت، مذہب، سیاست، قیادت، حکومت، تعلیم، تہذیب اور اخلاق کے مختلف شعبوں کے ساتھ ساتھ شیخ، واعظ، مرزا، جمن، صلو، کلو، بدھو، دفاتی، مولوی مدن، ہر چرن داس، گاندھی جی اور کرزن مہاراج، سبھی کو انھوں نے طنز و تعریض کا نشانہ بنایا ہے۔ لیکن موضوع کے اس ظاہری تنوع کے باوجود اگر آپ ان کی ظرافت کا مرکز و محور تلاش کرنا چاہیں تو چنداں دقت نہ ہوگی۔ کلیاتِ اکبر پر سرسری نظر ڈالتے ہی سرسید احمد خاں، مختلف موضوعات کے پردے میں سامنے آجائیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اکبر نے سرسید اور ان کے اصلاحی پروگرام پر جس انداز اور جس کثرت سے وار کیے ہیں کسی اور پر نہیں کیے ہیں۔ ان کے یہاں سرسید سے متعلق ایک دو شعر نہیں، سیکڑوں ہیں۔ ان اشعار کو یکجا کرنے کا یہ محل نہیں پھر بھی اکبر کے طنز کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے چند اشعار

دیکھتے چلیے۔

نئی تہذیب میں دقت زیادہ تو نہیں ہوتی
مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے

یہ بہتر علیگڑھ جا کے سید سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجئے مجھ کو مسلماں کیجئے

نظر ان کی رہی کالج کے بس علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

علیگڑھ کو شرف بخشا ہے اقبال و نصاریٰ نے
کہ جو مسلم اٹھا شوقِ ترقی میں یہاں آیا

سید کی سرگذشت کو حالی سے پوچھئے
غازی میاں کا حال ڈفالی سے پوچھئے

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشا اللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

طفلِ دل محوِ طلسم رنگ کالج ہو گیا
ذہن کو تپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا

کالج سے آ رہی ہے صدا پاس پاس کی
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

کالج و اسکول و یونیورسٹی
قوم بے چاری اسی میں مر مٹی

دلا دے ہم کو بھی صاحب سے لائلٹی کا پروانہ
قیامت تک رہے سید ترے آنر کا افسانہ

ابتدا کی جناب سید نے
جن کے کالج کا اتنا نام ہوا

انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا

اکبر نے ان اشعار میں سرسید کی ذات یا ذاتی صفات کو نہیں بلکہ ان کی تحریک علیگڑھ کے بعض نتائج و اثرات کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ علیگڑھ تحریک چونکہ ایک ہمہ گیر تہذیبی و تعلیمی تحریک تھی۔ اس لیے برصغیر کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے اچھے یا برے اثرات سے محفوظ نہ تھا۔ سائنس، سائنسی آلات کے اثرات حکومت و قیادت کی روایات، مجلسی آداب و اخلاق، مذہبی عقائد و خیالات طریقہ تعلیم و تدریس اور علوم و فنون سبھی اس تحریک سے متاثر ہوئے تھے۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اکبر سرسید کا ذکر کرتے اور ان چیزوں کو نظر انداز کر دیتے۔ چنانچہ انھوں نے ان مسائل پر رائے زنی کی ہے اور بار بار کی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا

کہ اکبر الہ آبادی رجعت پسند یا تنگ نظر اور سرسید علیگڑھ تحریک کے دشمن تھے کسی طرح درست نہیں۔

اکبر نے سائنس، عقلیت اور علم کا مذاق فی نفسہٖ اڑایا ہی نہیں۔ ہاں سرسید دینی اصلاح کے لیے ان کا استعمال جس طرح کر رہے تھے اس کا مذاق انھوں نے ضرور اڑایا ہے اکبر نہ تو سیاسی و تعلیمی جدوجہد کو بیکار سمجھتے تھے۔ نہ بے جا توکل و قناعت کا پرچار کرتے تھے اور نہ سعی و عمل کو کار لایعنی خیال کرتے تھے۔ سعی و عمل کے بارے میں تو سرسید اور ان کے درمیان کوئی اختلاف رائے تھا ہی نہیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے مسلمان اقتدار چھن جانے کے بعد جس بے بسی و بے عملی کا شکار تھے۔ اس کا اظہار اکبر، سرسید، حالی، نذیر احمد سبھی نے ایک جگہ نہیں جگہ جگہ کیا ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اکبر کا ایک منظوم لطیفہ سن لیجیے۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں — نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ — کیا ہے میں نے جس کو زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے — کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم۔ اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطری جوشش طبیعت — کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے — ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی — مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود — نہیں منظور مغز سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ — تو استعفیٰ مرا باحسرت و یاس

اگر آپ اسے واقعی صرف لطیفہ خیال کرتے ہیں تو ایک رباعی اور سن لیجیے۔

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش — ذلت ہے دراصل جاہ و شوکت کی تلاش
اکبر تو سر در طبع کو علم میں ڈھونڈ — محنت میں کر سکون و راحت کی تلاش

اور اگر اسے بھی محض شاعری سمجھتے ہیں تو اس سلسلے میں ان کے وضاحتی بیان

پر نظر ڈالتے چلیے کہتے ہیں۔

"ہماری قوم اس قدر غافل و مجہول ہو چکی ہے کہ اگر میں مسلمانوں کو دو روپے کی تمدنی یا مذہبی کتاب پڑھنے کو دوں اور اس کتاب کے مفید ہونے کا یقین بھی دلادوں تب بھی وہ پڑھنے پر تیار نہ ہوں گے اور یہی سبب ہے کہ میں اپنے کلام کو ظرافت کی چاشنی سے مرغوب تر بنا دیتا ہوں، تاکہ لوگ ہنس کر متوجہ ہوں اور پھر غور کریں۔"

اکبر نے اس طرح کا اظہارِ خیال ایک جگہ نہیں سیکڑوں جگہ کیا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا کہ وہ سعی و عمل کے قائل نہ تھے یا بے جا توکل و قناعت اور مریض و مجہول روحانیت کا پرچار کر رہے تھے، کسی طرح درست نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ خود سعی و عمل کی تلقین کیوں کرتے۔ خود انگریزی کیوں پڑھتے۔ عشرت کو انگلستان مغربی تعلیم کے لیے کیوں بھیجتے اور مسلمانوں کی بے بسی پر آنسو کیوں بہاتے۔

حقیقتاً اکبر کو سرسید اور علیگڑھ تحریک سے بھی کوئی دشمنی نہ تھی۔ ایک مصلح کی حیثیت سے وہ ان کے دشمن ہو بھی کیسے سکتے تھے۔ دونوں نیک نیتی سے قومی فلاح کے آرزومند تھے۔ دونوں چاہتے تھے کہ مسلمان بے عملی، تنگ نظری اور جہالت سے نجات پاکر غیور، وسیع النظر اور صاحبِ عمل بن جائیں۔ اصلاحِ قوم کے سلسلے میں دونوں کی نظر ایک ہی منزل پر تھی۔ ہاں منزل تک پہنچنے پہنچانے کی راہیں الگ الگ تھیں۔ تو سرسید اور ان کی تحریک علیگڑھ کے زیرِ اثر مغرب سے مرعوبیت اپنی چیزوں سے نفرت، مذہب و اخلاق سے بیگانگی ابن الوقتی، خود فراموشی اور مغرب کی کورانہ تقلید کا جو رجحان عام ہو رہا تھا اکبر اسے پسند نہ کرتے تھے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ اکبر کو علومِ جدیدہ، عقلیت اور سائنس سے کد بھی تھی۔ ایسا نہیں ہے، سرسید احمد خاں ان کے ذریعے اصلاحِ دین کا فرض جس طرح ادا کرنا چاہتے تھے اسے البتہ وہ مستحسن خیال نہ کرتے تھے۔

چنانچہ جس شدت کے ساتھ سرسید نے دینی امور اور مذہبی عقائد میں عقلیت و سائنس کی مداخلت روا رکھی، اسی شدت کے ساتھ اکبر نے ان کے اس رویئے کی مخالفت کی۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی شاعرانہ قوت زیادہ تر اسی کام میں صرف ہوئی۔

اکبر، سرسید کے خلوص اور جذبۂ ایثار و عمل کے قائل تھے۔ ان کے ذاتی

اوصاف کا اعتراف انھوں نے کئی جگہ اس طور پر کیا ہے۔

واہ رے سید پاکیزہ گہر کیا کہنا ‫ ‫ یہ دماغ اور حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں پر سوز جگر کیا کہنا ‫ ‫ ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا ‫ ‫ نہ پوچھو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر ‫ ‫ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ذاتی خوبیوں کے اس اعتراف کے باوجود سرسید نے قومی و دینی اصلاح کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا تھا اس سے وہ متفق نہ تھے۔ بقول شخصے جتنی نیک نیتی سے سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان زندہ رہیں، اتنی ہی نیک نیتی سے اکبر کی یہ کوشش تھی کہ مسلمان، مسلمان رہ کر زندہ رہیں۔ رشید احمد صدیقی کے لفظوں میں "سرسید کی نظر مسلمانوں کی معاشی پستی اور تعلیم سے بیگانگی پر تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ دونوں درست ہو گئیں تو اور خود بخود درست ہو جائیں گی۔ شکستہ دل اور شکستہ قومیں تباہی سے امن و تجارت کی طرف بڑھتی ہیں تو ہر رہنما کی پالیسی وہی ہوتی ہے جو سید کی تھی۔ آبادکاری کی پہلی منزل یہی ہے۔ اکبر بھی مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی زبوں حالی سے پوری طرح آشنا تھے اور ان سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن ایک اعتبار سے سرسید سے آگے دیکھتے تھے اور ان سے زیادہ دیکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ علیگڑھ کو مغرب کی پیروی آنکھ بند کر کے نہ کرنی چاہیے اور مغرب کی برکات سے فائدہ اٹھانے میں خود اپنی میراث کی طرف سے غفلت برتنا مناسب نہ تھا۔ میں یہ نہیں مانتا کہ اکبر علیگڑھ اور سرسید تحریک پر کسی تنگ نظری یا رجعت پسندی کی بنا پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ ان کی نظر قوم کی میراث پر بھی تھی اور قوم کی تقدیر پر بھی۔ قوم کی میراث قوم کی تقدیر سے علاحدہ نہیں کی جا سکتی۔ حالی اور اقبال دونوں اسے مانتے تھے۔

دونوں کے اصلاحی نقطۂ نظر کا یہ فرق بظاہر کوئی فرق نہیں ہے لیکن غور کریں تو بہت بڑا فرق ہے۔ اسی فرق نے تو اکبر کو سرسید کے ساتھ قدم ملا کر چلنے سے باز رکھا۔ گویا اکبر کو سرسید تحریک کے صرف ایک حصے سے جس میں مذہبی امور و اقدار کو سائنس کے اصول و تجربات کے عین مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی اختلاف تھا اور یہ اختلاف ذاتی نہیں اصولی تھا۔ کلی نہیں

جزوی تھا۔ وہ سرسید کی تحریک اصلاح کی معاشی و تعلیمی افادیت کو محسوس کرتے تھے، لیکن سرسید مذہب اور سائنس کے درمیان جس طرح کا سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے اکبر اسے پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی ان کے سامنے سرسید کی تحریکِ اصلاح کو من و عن قبول کرنے کا سوال آیا تو انھوں نے اپنا نقطۂ نظر اس طور پر واضح کردیا کہ۔

سید صاحب سکھا گئے جو شعور نہ | کہتا نہیں میں رہو تم اس سے نفور
سوتوں کو جگا دیا انھوں نے لیکن | اللہ کا نام لے کے اٹھنا ہے ضرور
تہذیب وہ ہے کہ رنگِ مذہب بھی ہو | آزاد وہ ہے کہ جو مؤدب بھی ہو
تزئین وہ ہے کہ خاکساری ہو ساتھ | اسپیچ وہ ہے کہ جس میں یارب بھی ہو؟
تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو | جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
لیکن یہ سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد | اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اصلاحِ مذہب کے باب میں بھی سرسید اور اکبر کے باہمی اختلافات کی نوعیت ان کے معاصر مولویوں سے بہت مختلف تھی۔ اس لیے اصلاحِ دین کے طریقۂ کار کے اختلاف کے باوجود انھوں نے نہ سید کی ذات و صفات کو کبھی طعن و طنز کا نشانہ بنایا۔ نہ ان پر رکیک حملے کیے، نہ اپنے عہد کے بعض تنگ نظر مولویوں کی طرح انھوں نے انگریزی پڑھنے کو حرام قرار دیا، نہ مغربی تعلیم کو ملکی و قومی ترقی کے لیے مہلک خیال کیا۔ نہ علیگڑھ کالج کو گمراہی و ضلالت کا مرکز سمجھا، نہ سرسید اور ان کے ساتھیوں کو بے دین و بے عقیدہ ٹھہرایا اور نہ کبھی ان کو کافر یا دہریہ کہہ کر ان کے جنت کے دروازے بند کیے۔ یہی نہیں سرسید اور علیگڑھ کالج کے خلاف بے عمل اور تنگ نظر مولویوں نے جو ہنگامہ برپا کر رکھا تھا اسے بھی وہ پسند نہ کرتے تھے۔ انھیں سرسید کی نیک نیتی اور مولویوں کی تنگ نظری کی پوری خبر تھی تبھی تو کہتے تھے کہ اللہ میاں، سرسید کو بخش دیں گے۔ لیکن مذہب کے اجارہ دار مولوی انھیں نہ چھوڑیں گے۔ کیا عمدہ کہا ہے۔

مرکے چلے جو سوئے جنت سید | لپٹے کے امام ابو حنیفہ دوڑے
مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گر بخش دے | گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو

ان امور سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر کا اس رجعت پسند مولویانہ ذہنیت سے کوئی تعلق نہ تھا جو روایت پرستی و تقلید محض کے سوا زندگی کے کسی شعبہ میں درایت اور اجتہاد کو قبول نہ کرتی تھی۔

بعض ناقدین ایک اور سبب سے اکبر کو رجعت پسند اور مجہول روحانیت کا علمبردار سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں سر سید جس تہذیبی انقلاب کی پیش گوئی و رہنمائی کر رہے تھے وہ تقاضائے وقت کے عین مطابق اور اکبر اس کو روکنے کے لیے جو کچھ کر رہے تھے وہ تقاضائے وقت کے یکسر منافی تھا اور اسی لیے سر سید اپنے مشن میں کامیاب اور اکبر ناکام رہے۔ کامیابی و ناکامی کا ذکر بعد میں آئے گا۔ اس جگہ ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ سر سید مغرب کے زیر اثر جس دھارے کا ساتھ دے رہے تھے۔ اکبر اسے روکنے کے لیے نہیں صرف اس کارد رکم کرنے اور اس میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کے لیے اٹھے تھے۔ سر سید کی طرح وہ بھی سرکاری ملازم تھے۔ جج کے عہدے پر فائز تھے۔ مسلمانوں کی معاشی بدحالی اور سیاسی بے بسی کے ساتھ ساتھ مغرب کی مادہ پرست ذہنیت، اس کے تعصبات اور سیاسی منصوبے سب پر ان کی نظر تھی۔ مغربی تہذیب و تعلیم سے ہر پہلو کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے کے جو خطرناک نتائج مرتب ہو رہے تھے یا ہونے والے تھے وہ بھی ان کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں تھے۔ انھیں مشرق کی بے بسی اور مغرب کے بڑھتے اقتدار کی قوت دونوں کا پورا اندازہ تھا۔ اچھی طرح جانتے تھے کہ جو کچھ ہونے والا ہے نہ وہ ان کے روکے رک سکتا ہے اور نہ وہ خود اس کے اثر سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ تبھی تو کہتے تھے۔

مفر نہیں ہے ہیں خانقاہِ سید سے — قفس میں ہیں تو اس اڈے کو چھوڑ جائیں کہاں
حضرت واعظ سے اب یہ قوم زندہ ہو گی کیا — اتنے مردے کو مسیحا بھی جلا سکتے نہیں
شعرِ اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب — یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

یہی نہیں اس انقلاب کے ہاتھوں، مشرقی تہذیب و ادب کے لیے جو مستقبل مقدر ہو چکا تھا اس کی تفصیل بھی انھوں نے اپنی ایک غزل میں اس طور پر بیان کر دی ہے۔

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے — نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی — نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی — نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے

بدل جائے گا انداز طبائع دورِ گردوں سے — نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے

خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیلِ ملت سے — نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہوں گے

بہت ہوں گے مغنّی نغمۂ تقلیدِ مغرب کے — مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال سب ہوں گے

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی — لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا میں ضم ہوں گے

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں — زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا — ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے — کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے

تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر — بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ اکبر جو کچھ کہہ رہے تھے نتائج سے بے خبر ہو کر کہہ رہے تھے۔ خود کہنے والے کی بے خبری کا پتہ دیتا ہے۔ سرسید کی کامیابی اور اکبر کی ناکامی کا تصور بھی تاریخی شعور کی کمی، اور برِّصغیر کی زندگی پر سرسید اور اکبر کے اثرات سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

سرسید ایک انقلاب لانا چاہتے تھے لاکر رہے۔ اکبر اس انقلاب کے زور کو کم کرنا چاہتے تھے کم کر کے رہے، ظاہر ہے کہ اپنے اپنے مشن میں دونوں کامیاب رہے اور دونوں کے مشن سے ہماری تہذیبی و سیاسی زندگی متاثر ہوئی۔ بلکہ اگر ہم برصغیر کی سیاسی و ملی تحریکوں اور تعلیمی و تہذیبی تنظیموں کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ان پر جتنا گہرا اثر اکبر کے مسلک کا ہے سرسید کے مسلک کا نہیں ہے۔ مولانا شبلی، حالی، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور سید سلیمان ندوی جنھوں نے مسلمانوں کے دینی و ملی شعور پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ سب کے سب سرسید سے کہیں زیادہ اکبر کے خیالات سے متفق و متاثر ہیں۔ یہ مانا کہ اوپر علم و ادب اور ملت و مذہب کے جن مصلحین کے نام لیے گئے ہیں وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ خانقاہ سرسید کے تربیت یافتہ ہیں لیکن یہ بھی پتہ چلتا

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ہے کہ اس تربیت کا اثر مثبت انداز میں نہیں منفی انداز میں ہوا ہے۔

جن لوگوں نے سرسید اور ان کے رفقار کار اور اکبر کے اصلاحی خیالات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ان بزرگوں کے اساسی خیالات میں اتنا فرق نہ تھا جتنا کہ ان کے ناقدین نے بعد کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ بعض لوگ اکبر کو سرسید اور ان کی تحریک کا مخالف سمجھنے لگے۔ قومی، اصلاحی اور تعلیمی اشاعت کے باب میں تو اتنا سبھی جانتے ہیں کہ علیگڑھ کے قیام سے سرسید کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ مسلمان قوم میں صرف چند انگریزی داں افسران پیدا ہو جائیں بلکہ ان کے پیش نظر علیگڑھ کالج کے ذریعے ایسے لائق افراد پیدا کرنا تھا جو اپنے اندر مسلمانوں کے روشن مستقبل کے لیے دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہوں اور اپنے فکر و عمل کے ذریعہ انگریز کے اور ہندو کے مشترک سیاسی اور اقتصادی حملوں سے مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات دلا سکتے ہوں اور مسلمانان ہندوستان کے تہذیبی و ثقافتی ورثے کو نہ صرف محفوظ رکھ سکتے ہوں بلکہ اس میں اضافہ کر سکتے ہوں لیکن جب علیگڑھ اس مقصد کو پورا کرتا نظر نہ آیا تو ایک اکبر کیا خود سرسید اور ان کے رفقائے کار اپنی محنت کو رائیگاں خیال کرنے لگتے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں جالندھر کے ایک جلسے میں سرسید احمد خاں نے جب یہ کہا تھا:

"اے دوستو ہماری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونیورسٹی کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی۔ ہم اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹی کی غلامی کے ہم اپنی قوم میں علم پھیلائیں گے، فلسفہ ہمارے داہنے ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ کا تاج سر پر۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو نچر بناتی ہے۔"[۱]

تو بے سبب نہیں کہا تھا۔ علیگڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی روش کو دیکھ کر اور وہاں کی تعلیم و تربیت کے بعض مضر اثرات کو ذہن میں رکھ کر کہا تھا اور علیگڑھ کے مستقبل سے مایوس ہو کر کہا تھا۔

بقول مولانا الطاف حسین حالی جب سید محمود ولایت سے اعلیٰ تعلیم حاصل

[۱] ماہ فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کر کے واپس آئے اور ان کا تقرر ہائی کورٹ کی ججی پر ہو گیا تو سر سید احمد خاں نے بارہا یہ بات کہی کہ:

"میرا جو اصل مقصد سید محمود کی تعلیم سے تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ سید محمود ملازمت کے پھندے میں چلا ہے کتنی ہی ترقی کر جائیں مگر قوم کو جس قسم کے تعلیم یافتوں کی ضرورت ہے اس میں سید محمود سے کچھ مدد نہیں پہنچ سکتی۔"

سر سید احمد خاں نے علیگڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا رونا ایک جگہ نہیں بار بار رویا ہے، بلکہ آخری زندگی میں وہ صرف اس لیے مغموم رہتے تھے کہ انھوں نے علیگڑھ میں تعلیم کا جو درخت لگایا تھا اس نے وہ پھل نہ دیا جس کی ان کو توقع تھی۔ تب ہی تو ۱۸۹۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے ہیں اور جن سے قوم کی بھلائی کی امید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم بنتے جاتے ہیں۔"

مولانا شبلی تو خیر اکبر کی طرح علیگڑھ کی تعلیم سے بہت پہلے بدظن ہو چکے تھے اور چند سال بعد ہی ۱۸۸۴ء میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ:

"معلوم ہوا کہ انگریزی خواں قوم نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دیجیے خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی اور ترقی کا جوش برائے نام ہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر ہی نہیں آتا۔ پس خالی کوٹ پتلونوں کی نمائش ہے۔"

لیکن حالی خود فرماتے ہیں کہ:

"چھبیس برس کے تجربے سے ان (سر سید) کو اس قدر معلوم ہو گیا تھا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو اس زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی فضول اور اصل لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔"

اسی طرح مولوی عبدالحق صاحب حالی کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ:

"جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہتے تھے۔ آخری عمر میں ہمارے کالجوں کے طلباء کو دیکھ کر انھیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ان کے حیدرآباد میں ایک روز اولڈ بوائے آیا تو اسے پڑھ کر بہت افسوس کرنے لگے۔ اس میں سوائے مسخراپن

ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کے اور کچھ نہیں ہوتا۔"

ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں انسان فرار کے راستے تلاش کرتا ہے چنانچہ مسلمانوں نے بھی داستانوں اور رومانوں میں مداوئے غم روزگار ڈھونڈا اور تحیر اور حرماں کے سیلاب میں غرق ہو گئے۔

ان بیانات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ سرسید ان کے رفقاء اور اکبر کے خیالات میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں ہے۔ صرف یہ کہ اکبر نے جس چیز کو بہت پہلے بھانپ لیا۔ سرسید اور ان کے رفیقوں کی نظر اس تک بعد کو پہنچی۔

اس کے بعد بھی سرسید کو ترقی پسند اور اکبر کو رجعت پسند کہنے کا سوال باقی رہتا ہے تو جو لوگ کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا کہتے ہیں۔ ان کے لیے سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اگر ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی، مولانا حالی، حسرت، جوہر، اقبال، سلیمان ندوی اور مولانا ظفر علی خاں رجعت پسند تھے تو یقیناً اکبر بھی رجعت پسند تھے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اگر اس طرح کے دو چار رجعت پسند بھی کسی ملک و ملت کو میسر آجائیں تو پھر اس کی رہنمائی کے لیے کسی ترقی پسند کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

"افسوس ہے کہ مسلمان ڈوبتے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمان کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔" (محسن الملک کے نام ایک خط سے اقتباس)

رفعت سروش

نذرِ سرسید

اور پھر یوں ہوا

آخری کیل ٹھوکی گئی جب کہ تابوت میں مغلیہ دور کے

موت ارزاں ہوئی قتل و غارت کے بازار میں

تیغِ افرنگ سے سر قلم کر کے لٹکائے پوراہوں پر

اور بچوں کو نیزوں پہ ایسے اچھالا گیا

جیسے لاشیں ہوں مستقبلِ ملک و ملت کی

اور خوں سے لکھ دیا

'درسِ عبرت ہے یہ'

کلمہ گو ایسے چن چن کے مارے گئے

جیسے حرفِ غلط کو مٹائے کوئی صفحۂ زیست سے

مسجدیں اصطبل بن گئیں

مدرسے ڈھے گئے

کوچے، ایواں، دیواں خانے مٹے

ہو کا عالم ہوا

رہ گیا نام اللہ کا

اور پھر یوں ہوا،

منتشر ملتِ احمدی اور بھی منتشر ہو گئی

ہو کے مفتوح، محصور، بے دست و پا،

کچھ نہ تھا دل میں اب نفرتوں کے سوا

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نفرت انگریز سے،
نفرت اس حرف سے جو زباں پر تھا انگریز کی
نفرت اس علم سے جس نے انگریز کو ظلم ڈھانے کے قابل کیا
نفرت انگریزیت کے ہر اک طور سے
کلمہ گو،
سر پہ نفرت کی گٹھری اٹھائے ہوئے
بیچ رستے پہ آکر کھڑے ہو گئے
عافیت کس طرف ہے، کدھر جائیں ہم!
زخم سینے کے اب کس کو دکھلائیں ہم!!
کیسے انگریزیت سے اماں پائیں، ہم!!!
اور پھر یوں ہوا،
اک جواں حوصلہ، مردِ حق، کلمہ گو،
ان سے گویا ہوا
"بزدلی جرم ہے،
بے حسی جرم ہے
جہل دنیا میں سب سے بڑا عیب ہے
علم ایمان ہے،
علم ہے توشۂ آخرت
علم عزت سے جینے کا سامان ہے
علم ہی روحِ ادیان ہے
علم حرفِ محمدؐ ہے، تفسیرِ قرآن ہے

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ ستمبر ۲۰۰۰ء

علم جاگیر کب ہے کسی قوم کی
علم محصور کب ہے کسی ملک میں
علم ہے موج آب رواں،
تشنگی جو بجھائے ہر اک شخص کی
علم سورج کی ہے روشنی
جو چمکتا ہے سب کے لیے
علم ابرِ بہار،
جو برستا ہے سب کے لیے
منحصر ظرف پر ہے یہ اقوام کے
علم کو کس قدر، اور کس طرح اپنائیں وہ
پرچم علم کیسے فضاؤں میں لہرائیں وہ
تم مسلماں ہو،
نام لیوا محمدؐ کے ہو،
تم سے وابستہ ہیں علم کی عظمتیں
تم کو تاکید ہے، علم حاصل کرو
چاہے جانا پڑے چین کو
آج مغرب ہی گہوارۂ علم ہے
آج سائنس کی برکتوں سے ملا ہے نئی زندگی کا سراغ
تیرہ و تار گوشوں میں ایجاد کے جل گئے ہیں چراغ
جیسے تفسیر روشن ہوئی حرف قرآن کی
اختراعات مغرب سے آساں تر ہو گئی زندگی

ماہی فکر و آگہی علی گڑھ مارچ ۲۰۰۰ء

عام ہے علم و سائنس کی روشنی
ہاں مگر شرط ہے ذوق و شوق طلب

اور پھر یوں ہوا

حرف سیّد نے جادو کیا
جذبۂ حب قومی سے سرشار افراد آگے بڑھے
اک قدم دو قدم دم قدم
کارواں تیز ہوتا گیا،
تیز تر تیز تر تیز تر
درس گاہِ علی گڑھ نئی زندگی کا نیا باب تھا،
خوابِ سیّد کی تعبیر تھی،
ایک تحریک تھی
علم پھیلا اجالے بڑھے
گوشے گوشے سے پرچم نئی آگہی کا لیے
خیمہ زن ہیں یہاں وقت کے قافلے
آج یہ گلشنِ بے خزاں،
ہے بہاروں کی رنگینیوں کا امیں،
حدوں آندھیوں پر ہیں برگ و ثمر
بلبلیں اس کی ہر شاخ پر نغمہ گر
اس کی عظمت کا قائل زمانہ ہے آج
روحِ سیّد کو دیتی ہے دنیا خراج

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۷

علیگڑھ: عمارتیں

حسرتِ تعمیر ہو جس کے لہو میں موجزن
خاک پر اک دن کھلا سکتا ہے محلوں کے چمن

۴۸۰

سرسیّد احمد خاں

سیّد سجاد حیدر یلدرم علیگ

درد دل سے اب خیال زحمت آلام کر
کوثرو تسنیم سے شیریں دہاں و کام کر
واسطہ اللہ کا اس وقت اتنا کام کر
جانشینوں کو ذرا تفہیم کر افہام کر
خوب محنت کرچکا آرام کر آرام کر

مشکلوں کا ہم پہ گر باراں ہے تو تجھ کو کیا
قالبِ قومی اگر بے جان ہے تو تجھ کو کیا
ایک عالم ششدر و حیران ہے تو تجھ کیا
خانہ جنگی کا اگر سامان ہے تو تجھ کیا
تجھ کو کیا گر ششدر و حیران و ویراں ہے بش

اب مسلمانوں میں ایسا درد والا کون ہے
طلعتِ اسلام کا شیدا و والا کون ہے
بہتری کا جس نے ایسا ڈھنگ ڈالا کون ہے

سہ ماہی فکر و آگہی ہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اپنے سر پر بھار یوں لینے والا کون ہے
کون ہے جو دے دعا، دو شام دیں اس کو اگر
رحمتیں تجھ پر کہ تو اب کام اپنا کر چکا
کام اپنا کر چکا اور نام اپنا کر چکا
اپنے ہم عصروں سے اونچا نام اپنا کر چکا
کلفتیں بھی سب گئیں آرام اپنا کر چکا
تیری روحِ پاک پر ہو حق کی رحمت کا گذر
(۲۸ر مارچ ۱۹۱۷ء)(مرسلہ مہر الٰہی ندیم)

ارمان اکبر آبادی

گہوارۂ علم و فنون

حضرتِ سید کے عزم و جہد کا ثمرہ ہے تو
یہ حقیقت ہے کہ تو ہے نازشِ ہندوستاں
تیرے دامن میں مہکتے ہیں ثقافت کے گلاب
جلوہ گر ہے ہر روش پر علم و فن کی کہکشاں

☆☆☆☆☆

حبیب بدایونی علیگ

علی گڑھ کی یاد میں

ہے چشمِ تصور میں ابھی تک وہ نظارا — وہ مادرِ علمی و ثقافت کا ادارہ
دنیا نے لیا جس سے سبق مہر و وفا کا — وہ بارگہِ علم وہ تہذیب کا دھارا
وہ سیدِ مرحوم کے اک خواب کی تعبیر — نذرانۂ جاں دے کے جسے اُس نے سنوارا
ہر صوبہ کے افراد وہاں شیر و شکر تھے — تاریخ کی آنکھوں نے یہ دیکھا ہے نظارا
وکٹوریہ گیٹ، ایک تھا اک بابِ عزّل — وہ ایک کنارہ تھا تو یہ ایک کنارا
رہتے تھے عجب شان سے طلابِ علی گڑھ — ستی ہال میں۔ ممتاز میں ہوتا تھا گذارا
وہ ٹھنڈی سڑک درس گہِ مہر و محبت — تعلیم جہاں پائیں خواتینِ خود آرا
جلسوں کی وہ رونق تھی نمائش کے وہ چرچے — وہ جلوے نگاہوں نے نہیں دیکھے دوبارا
تھے جوہر و حسرت بھی علی گڑھ کے پرستار — دنیائے سیاست میں رہا حسن کا اجارا
بابائے صحافت ہوں کہ اردو کے ہوں بابا — تھا اُن میں ہر اک کشتیِ ملت کا سہارا
تقسیم علی گڑھ کو خدا کر نہیں سکتی — ہم سب ہیں علی گڑھ کے علی گڑھ ہے ہمارا
بوڑھے سہی ہم آج مگر پھر بھی جواں ہیں — دل میں ہے ابھی مادرِ علمی کا شرارا
اے خالقِ عالم سے یہی اپنی دعا ہے — پھولے پھلے یا رب وطنِ پاک ہمارا
پائندہ رہیں ہم سے روایاتِ علی گڑھ — توہین علی گڑھ کی نہ ہو ہم کو گوارا
قائم رہے وہ مادرِ علمی بھی ہماری — جو اب بھی ہے دنیا کے مسلماں کا سہارا

فعّال رہے انجمن اولڈ بوائز
چمکائے یہ اس ملک کی قسمت کا ستارا

رسالہ فکر و آگہی علی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۴۸۳

ڈاکٹر معظم علی خاں

اے علی گڑھ

ماں کی ممتا باپ کی شفقت کا آغوش ہے
دین دنیا کا ترے سائے میں ہم کو ہوش ہے
دل ربا تیری ادائیں، خوش نظر تیرا جمال
نور بھر دیتا ہے ذہنوں میں ترا مہر خیال
رقص کرتی ہے ترے آنگن میں بست کی گھٹا!
کس قدر پُر کیف ہے تیرے درختوں کی ہوا
گرمیوں کی چاندنی راتوں کا منظر کیفِ جاں
دودھ کا ٹھنڈا سمندر، برف جیسی کشتیاں
تیرے دیوانے رہے ہیں کتنے ہی اہلِ خرد!
تیرے راہو پر سکوں کی نیند سوئے نیک و بد
علم کی اک سرسبز وادی ہے یہ تیری سرزمیں
ایسی ہریالی تو شاید ساری دنیا میں نہیں
حسن کو پاکیزگی تو نے عطا کی عمر بھر
عشق کو سنجیدگی تو نے عطا کی عمر بھر
ہر محقق کے دور میں تو اک شجر ثابت ہوا
شجر ہی کے واسطے بھی راہبر ثابت ہوا

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

رحمان خاور (علیگ)

نذرِ سرسید احمد خاں

ہمارا قائد
ہمارا محسن
کہ جس نے علم و عمل سے اپنے
حقیقتوں کی ڈگر پہ ہم کو
زمیں سے تافلک ابھارا
وہ بانیٔ "ایم یو علی گڑھ"
جہاں میں درد آشنائے مسلم
وہ جس نے برصغیر میں کی
عطا مسلماں کو سربلندی
جو پستیوں میں پڑے ہوئے تھے
بلندیوں سے انہیں ملایا
جو جہل کی تیرگی میں دنیا سے کٹ چکے تھے
وہ علم کی روشنی میں ان سب کو لے کے آیا
ہماری گم گشتہ منزلوں کا پتا بتایا
وہ آج ہم میں نہیں بظاہر
مگر حقیقت میں تاقیامت
ہماری روحوں کو روشنی بخشتا رہے گا
اور آنے والے سبھی زمانوں کو زندگی بخشتا
رہے گا
وہ رہنمائے جہانِ علم و ہنر ہمارا
وہ حسن کی صورت حسین و دلکش
عمل بھی پیارا
چلا گیا ہے رہِ طلب میں
چراغ عرفان و آگہی کے
بڑھا گیا ہے
جہاں نور و ضیاء میں
معیار روشنی کے
ہم اس کے سائے میں
پرچم آرزو اٹھائے
نئے زمانے کی رہگزاروں پر
اس کی ان منزلوں کی جانب
رواں دواں ہیں
جو اس زمیں پر
مثالِ مہتاب و کہکشاں ہیں
خلوص کا اس کے یہ ثمر ہے
کہ رہبری میں ہمارا اس کی
اسی طرح آج بھی سفر ہے
نہ خوف ہے رہزنوں کا کوئی
نہ رہنمایانِ کم نظر کا
رہِ تمنا میں کوئی ڈر ہے
کہ دھوپ سے رنج و غم کی ہر دم
قدم قدم پر بچانے والا
وہ اک شجر ہے
جو کارواں ہے
جو رہگزر ہے
جو منزلیں ہے، جو راہبر ہے

سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی

علیگڑھ کا تاریخی پس منظر

غدر ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کی تاراجی اور مسلمانانِ ہند کی پسماندگی سے سرسید نہایت متاثر تھے۔ ان کو مسلم قوم کی گری ہوئی حالت اور مسلمانوں کے مستقبل کا خیال ہمہ وقت دامن گیر تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو تحریک جاری کی وہ علیگڑھ تحریک کے نام سے موسوم ہوئی۔

علیگڑھ وہ سرزمین ہے جہاں سرسید کی تحریک بارآور ہوئی۔ یہ تحریک عملی کارگزاری کے اعتبار سے مسلمانانِ ہند کی سب سے زیادہ نمایاں اور کامیاب اور تعمیری آل انڈیا تحریک کی حیثیت سے یگانہ ہے۔ علیگڑھ تحریک بلاشبہ جدید ہندوستان کی جدید تاریخ کا ایک بابِ زرّیں ہے۔ اس تحریک کی بدولت غدر کے بعد سے مسلمانوں کی قومی پراگندگی تباہی اور بربادی ختم ہوئی اور مسلمانوں کو عروج حاصل ہوا۔

علیگڑھ تحریک ہی کے تحت علیگڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی قائم ہوئی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے روز شنبہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو "مدرسۃ العلوم مسلمانان" کی ابتدا ہوئی جو آج "عظیم الشان" علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ" کی صورت میں معراج پاکر دنیا کی عظیم یونیورسٹیوں میں ایک ممتاز درجہ حاصل کر چکی ہے۔

علیگڑھ تحریک کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے علیگڑھ کے تاریخی پس منظر سے

واقفیت ضروری ہے جو علیگڑھ میں اس عظیم تحریک کے افتتاح کے لیے سبب قوی قرار پایا۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر علیگڑھ کا تاریخی پس منظر میں ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

شمالی ہند میں دہلی سے ۱۲۶ کلومیٹر جانب جنوب مغرب ایک بستی "کول" تھی۔ کوہِ کول پر قلعہ علیگڑھ کی بنا ہوئی تو یہ نام اس قدر مشہور و مقبول ہوا کہ عروج پانے کے بعد پورا شہر علیگڑھ کہلایا اور کول نے اسی شہر کی ایک تحصیل کی صورت اختیار کر لی۔ قلعہ علیگڑھ کی صورت بھی رفتہ رفتہ تبدیل ہوتی رہی اور یہ متعدد محلوں کی صورت میں آباد ہوا اور خاص قلعہ پر ایک محلہ بنام "محلہ بالائے قلعہ" آباد ہوا۔

شمس الدین التمش کے عہد (۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۶ء) میں کول میں ایک حصار "بقعہ" بالائے قلعہ علیگڑھ کے مقام پر تعمیر کیا گیا تھا جس کا کتبہ حسبِ ذیل ہے:

بنا ایں "بقعہ مبارک"، در عہدِ سلطنت بادشاہ اسلام شمس الدنیا والدین ذوالامان لاہل الایمان)...

در نوبت ایالت خداوند خواجہ جہاں دستور صاحب قرآن نظام الملک ملوک الوز (راء)....

جامع مسجد بالائے قلعہ علیگڑھ کے جانب مغرب ایک محل "وزیر کا محل" کے نام سے مشہور تھا۔ یہ محل اس سڑک کے کنارے واقع تھا جو بالائے قلعہ علیگڑھ سے دہلی کو جاتی ہے۔ یہ محل جب منہدم ہو گیا تو اس کا ملبہ خاندانِ شیخ کے افراد نے گنیشی لال مرحوم کو ۲-۲-۱۹۲۴ء میں مبلغ سات سو روپے میں بیع کر دیا (علیگڑھ ڈسٹرکٹ مولفہ، جمال محمد صدیقی لکچرر ان ہسٹری، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی صفحہ ۲۲۲)

غیاث الدین بلبن نے سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں ۱ر رجب ۶۵۲ھ / ۲۶ راگست ۱۲۵۵ء میں ایک مینار بمقام بالائے قلعہ علیگڑھ تعمیر کرایا تھا۔ اس مینار کا کتبہ جانبِ جنوب دروازہ کے اوپر نصب تھا اور اس دروازہ تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں انگریزوں نے اپنے عہدِ حکومت میں ۱۸۶۲ء میں اس عالیشان مینار کو منہدم کرا دیا۔ اس مینار کا کتبہ

دورِ حاضر میں سر سید ہال کے نظام میوزیم کی دیوار میں نصب ہے۔ اس کا ذکر اوّلاً ایڈورڈ تھومس نے ۱۸۴۷ء میں کیا ہے۔ اس کتبہ کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

هذه العمارة فی عهد مملکة السلطان الاعظم مالك رقاب الامم ناصر الدنیا والدین سلطان السلاطین ذی الامان لاهل الایمان وارث ملك سلیمان صاحب الخاتم فی ملك العالم ابی المظفر محمود بن السلطان خلد الله ملکه وسلطانه . . . الملك العالم الکبیر اعظم قتلغ خان بهاء الحق والدین ملوك الشرق والصین بلبن الشمسی فی ایام ایالته دام معالیه فی العاشر من رجب سنة اثنی وخمسین وستمائة۔

مذکورہ مینار کی تعمیر کے بعد ہی غیاث الدین بلبن کے عہد میں کول کے جانب شمال مشرق تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر حصار جلالی اور اس کی مسجد تعمیر ہوئی جس پر غیاث الدین بلبن کے عہد کا ۶۶۵ھ / ۱۲۶۶ء کا کتبہ نصب ہے جس کا ذکر آئندہ صفحات پر کیا جائے گا۔

ابراہیم لودھی کے عہد (۱۵۱۷ء / ۹۲۳ھ تا ۱۵۲۶ء / ۹۳۲ھ) میں عمر خاں شروانی کی جگہ محمد خاں کول کے شقدار مقرر ہوتے تو انھوں نے شہر سے باہر شمالی میدان میں (علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے شمال میں ایک میل کے فاصلہ پر) ایک جدید قلعہ ۹۳۰ھ / ۱۵۲۴ء میں تعمیر کرایا اور اس کا نام "محمد گڑھ" رکھا۔ اس قلعہ پر جو کتبہ نصب تھا وہ ۱۸۴۲ء میں برآمد ہوا جس کو کلکٹر علیگڑھ نے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ روانہ کر دیا۔ یہ کتبہ کلکتہ میوزیم میں محفوظ ہے اس کی ایک نقل حاجی عباس خاں شروانی مولف شروانی نامہ نے حاصل کر کے کتب خانہ حبیب گنج میں محفوظ کی، وہ منظوم کتبہ حسبِ ذیل ہے:

نخستیں حمد گفتم مر خدا را   کہ پیدا کرد حضرت مصطفےٰ را
نبشتم چند بیت از پے حصارے   بماند من بماند یادگارے
حصارے استوار و اصل محکوم   کہ اتمامش شدہ در عہد شاہم

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

که نامش است ابراهیم سکندر — که بخشد سائلاں را سیم و هم زر
به شقداری محمد ابن عمرؓ — دبیرے بد شهاب الدین منوّر
که در بابِ عمارت رنج بُرده — باندک مدتے اهتمام کرده
ز هجرت بود نه صد شی و سالے (۹۳۱) — که حصنے یافته زیب و کمالے

من بیچاره کو نام است احمد
بیابد روز محشر سایه احمد

محمد خاں شروانی نے قلعہ علیگڑھ کا دہلی دروازہ بھی تعمیر کرایا تھا جس کا ذکر مسٹر اے حلیم نے کیا ہے کہ محمد خاں کے نام کا کتبہ دہلی دروازہ میں اس کی تعمیر سے متعلق نصب تھا۔ علاوہ ازیں محمد خاں شروانی نے محلہ بنی اسرائیلیان علیگڑھ کی کالی مسجد بھی تعمیر کرائی۔

نواب ثاقب خاں ترکمان فرخ سیر (۱۷۱۳ء/۱۱۲۵ھ تا ۱۷۱۹ء/۱۱۳۲ھ) اور محمد شاہ کے عہد (۱۷۱۹ء/۱۱۳۲ھ تا ۱۷۴۸ء/۱۱۶۲ھ) میں کول کے حاکم ہوئے۔ انھوں نے قلعہ محمد گڑھ کو از سرِ نو درست کرا کے قصرِ ثابت تعمیر کرایا جو ثابت گڑھ کے نام سے موسوم ہوا۔

نواب ثابت خاں ترکمان نے قلعہ علیگڑھ میں مسجد جامع بھی اعلیٰ پیمانہ پر تعمیر کرائی اور پنجتن پاک علیہم الصلوٰۃ والسلام سے عقیدت کی بنا پر اس میں پانچ در اور پانچ وسطی گنبد تعمیر کرائے۔ قطعہ تاریخ، مسجدِ جامع کے دروازہ پر بصورت کتبہ نصب ہے جو حسبِ ذیل ہے:

بعہدِ داورِ عالم محمد شاہ دیں پرور
بنا چوں کرد ثابت خاں بہادر مسجدِ جامع
کہ از پیشانیش پیداست نورِ ظلِ سبحانی
مکارم گفت تاریخش بہ گیتی قبلۂ ثانی (۱۱۴۰ھ)

اخبار الجمال میں راجے محمد کوہی نے ارقام فرمایا ہے کہ اوّلاً اسی مقام پر قطب الدین ایبک نے مسجد تعمیر کرائی تھی اور اس کے بعد اس کی درستی سلطان شمس الدین التمش و ناصر الدین محمود و محمد بن تغلق نے کرائی اور موجودہ مسجد جامع نواب ثابت علی خاں ترکمان کی تعمیر کردہ ہے۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نواب ثابت خاں نے مسجد جامع کے علاوہ قلعہ علیگڑھ کا ترکمان دروازہ، تالاب ثابت خاں، موتی مسجد شہر علیگڑھ اور بازار ہردوا گنج بھی تعمیر کرایا۔

نواب ثابت خاں کی قبر ان کے باغ میں تھی جہاں محلہ کلاث گنج آباد ہوا اور اب یہاں اناج کی منڈی ہے۔ اس منڈی کی مسجد کے متصل نواب ثابت علی خاں کی قبر ہے۔

۱۷۴۸ء میں محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا لڑکا احمد شاہ تخت نشین ہوا اس نے صفدر جنگ کو جو شیعہ تھا، برخاست کیا اور اس کی جگہ سابق وزیر شہاب الدین عماد الملک کے بیٹے انتظام الدولہ کو وزیر بنایا اور عماد کو میر بخشی مقرر کیا۔ صفدر جنگ نے اودھ میں ایک خود مختار حکومت قائم کی اس طرح دیگر صوبے رفتہ رفتہ علاحدہ ہوتے گئے یہاں تک کہ سلطنتِ مغلیہ صرف دہلی کے قرب وجوار اور ممالک متحدہ کے کچھ شہروں میں محدود رہ گئی۔ کچھ عرصہ بعد عماد الملک اور بادشاہ کے درمیان بھی تعلقات ناخوشگوار ہو گئے۔ حتیٰ کہ بادشاہ کو ۱۷۵۴ء میں تخت سے اتار کر اندھا کر دیا اور اس کے بعد جہاندار شاہ کے لڑکے عزیز الدولہ کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھایا گیا۔ اس بادشاہ کے عہد میں سلطنت کی حالت اور ابتر ہو گئی۔ احمد شاہ ابدالی نے کئی مرتبہ ہندوستان پر حملے کیے۔ مرہٹے دہلی میں بہت بااثر ہو گئے اور انھوں نے وزیر کو مدد دی۔ وزیر نے بادشاہ کو مروا ڈالا اور دوسرے مغل شہزادہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ ولی عہد شاہ عالم نے بھاگ کر نواب اودھ کے یہاں پناہ لی۔ وزیر اور مرہٹوں نے ابدالی کو بہت ناراض کیا پس وہ مرہٹوں سے جنگ کے لیے ایک بڑی فوج لے کر آیا اور ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ ابدالی نے شاہ عالم کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور شجاع الدولہ کو وزیر بنایا اور نجیب الدولہ کو فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔

عماد الملک نے بھرت پور کے جاٹوں کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔ سورج مل جاٹ والی بھرت پور نے کہ شوکت وسپاہ عظیم رکھتا تھا۔ آگرہ وکول وغیرہ پر قبضہ کر لیا اور قلعہ ثابت گڑھ کا نام رام گڑھ رکھا۔ انھیں ایام میں درجن سنگھ جاٹ ساکن موضع بھولی پرگنہ اترولی نے اپنی دختر ہنسکنور، راجہ سورج مل جاٹ کو دے کر قلعداری

ثابت گڑھ عرف رام گڑھ حاصل کی ۱۷۵۳ء میں سورج مل جاٹ بمقابلہ نجیب الدولہ مارا گیا تب سے جاٹوں کا تسلط کم ہوا اور اس کے بعد بحکم دربار شاہی چھ سال عملداری راجہ سو چیت رائے مرہٹہ رہی۔

سنہ ۱۷۶۰ء میں شاہ عالم نے بمدد مرہٹہ وشجاع الدولہ یورپ سے آکر تخت دہلی پر جلوس کیا اور کول شجاع الدولہ کے قبضہ میں آیا اور مرزا نجف خاں نے پایۂ نیابت وزارت پایا اور علیگڑھ کے شمالی قلعہ ثابت گڑھ کو علیگڑھ میں شامل کیا اور اس طرح پورا شہر علیگڑھ کے نام سے موسوم ہوا۔

امراؤ گر گوشائیں کا ایک چیلہ ہمت بہادر گوشائیں نواب شجاع الدولہ کے امرا میں شامل ہوا۔ امراؤ گر نے مرزا نجف خاں کی خدمت میں آکر اعزاز پایا۔ بعد انتقال مرزا نجف خاں سنہ ۱۲۰۰ھ میں کمال بدانتظامی ہوئی۔ مادھوجی سندھیہ اور اس کے بعد دولت راؤ سندھیہ برفع ہنگامہ غلام قادر خاں ولد ضابطہ خاں، مورد عنایت شاہی ہوئے۔

مادھوجی سندھیا نے اپنے عہد میں فوجی طاقت میں اضافہ کیا۔ علیگڑھ ۱۷۹۱ء میں فرانسیسی جنرل ڈی بائن کے حوالہ کیا اور ان کے جانے کے بعد ستمبر ۱۷۹۷ء میں علیگڑھ کا چارج جنرل پیرون نے لیا۔

جنرل پیرون نے فوجی طاقت میں اضافہ کیا اور چھاؤنی کو موجودہ سلیمان ہال تک وسیع کیا اور یہاں اپنی قیام گاہ کے لیے ۱۸۰۲ء میں ایک باغ کی بنا کی جو صاحب باغ کے نام سے مشہور ہوا۔ جنرل پیرون کے نام سے علیگڑھ کا ایک محلہ پیرن گنج کے نام سے موسوم ہوا جو اب پدرو گنج کہلاتا ہے۔

نواب سعادت علی خاں کے عہد میں ۲۲ ستمبر ۱۸۰۱ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ضلع علیگڑھ کا علاقہ پندرہ میل تک اپنے قبضہ میں لیا۔ اس علاقہ میں پرگنہ جلالی، اکبر آباد (اکرا باد) سکندرہ راؤ اور کنگیری شامل تھے۔

۴ ستمبر ۱۸۰۳ء کو فرانسیسی جنرل پیرون نے انگریزی جنرل لیک سے شکست کھائی اور علیگڑھ پر انگریزی حکومت کا قبضہ اس تاریخ سے ہو گیا۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کول عہدِ مغلیہ میں

تاریخ علیگڑھ کا سب سے روشن زمانہ عہدِ سلطنت مغلیہ ہے جب کہ یہاں امن وامان تھا اور ہر طرح خوشحالی میسر تھی اور یہ مقام سرسبز وشاداب تھا حتیٰ کہ علیگڑھ سے گزرنے والے سیاح بھی اس شہر کو "سبزہ باد" کا نام دینے پر مجبور ہو گئے۔ جب خاندان لودھی نے مغلوں سے شکست کھائی تو دیگر علاقوں کی طرح "کول" کا علاقہ بھی سلطنت مغلیہ کے مقبوضات میں ہوا اور سرکار کول بنا۔ شہنشاہ بابر نے یہاں کے حکمراں الیاس کو گرفتار کر کے آگرہ اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لیے بھجوادیا اور یہاں کی حکومت کی باگ ڈور محمد علی جنگجنگ فاتح کول کے سپرد کی آپ نے "حصار کول" کو جو الیاس خاں کے زمانے میں کھوکھلا کر دیا گیا تھا از سرِ نو ایک بار مضبوط و مستحکم کرایا اور اس حصار کا نام فاتح خیبر کے اسم مقدس سے منسوب کر کے "علیگڑھ" رکھا اور عجب اتفاق کہ اس کے بعد یہاں جو بھی حکمراں مقرر ہوئے۔ وہ فرقہ شیعہ اثنا عشری ہی کے پیرو تھے لہٰذا اعتقاداً یہ نام جاری رہا اور مقبول ہوا۔

عہدِ اکبری میں علیگڑھ کے حاکم "میر محمد گیسو" ہوئے جو شیعہ تھے۔ ان کی یادگاریں علیگڑھ میں مندرجہ ذیل ہیں:۔

دارالعلوم

حضرت سید محمد گیسو علیہ الرحمۃ نے علیگڑھ میں ایک دارالعلوم ۹۷۰ھ میں قائم فرمایا تھا جس کے کتبہ کی نقل حسبِ ذیل ہے:۔

مکانِ خیر شد از بہرِ اہلِ علم بنا	کہ تا بعلم و عمل روز را بشب آرند
یمین حضرت سید محمدے گیسو	تمام گشت چو در اہتمام ہست بود
سوال سالِ بنائش زہر کہ جستم گفت	برو حساب کُن وا مکان خیر طلب

ترجمہ۔ ۱۔ اہل علم کے واسطے ایک مکان خیر کی بنا رکھی گئی تاکہ علم و عمل میں دن کو رات کر دیں۔

۲۔ حضرت سید محمد گیسو رحمۃ اللہ علیہ کی برکت سے (یہ) اہتمام ہوا ہے۔ یہ سنت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۳۔ میں نے اس کی بنیاد کا سال جب لوگوں سے پوچھا اور سوال کیا تو لوگوں نے کہا حاجب کراور "مکانِ خیر" سے طلب کرے۔

تاریخی روایات کی روشنی میں واضح ہے کہ جامع مسجد بالائے قلعہ علیگڑھ کے عقب میں ایک "خانقاہ" واقع تھی اور اسی مقام پر حضرت سید محمد گیسو علیہ الرحمہ کے عہد میں ایک دارالعلوم (مدرسہ) قائم کیا گیا تھا۔ یہ عمارت منہدم ہوگئی تو اس کا مذکورہ کتبہ شیخ داؤد کے مقبرے کے احاطے کی جنوبی دیوار میں نصب شیخ برادران مکونہ بالائے قلعہ علیگڑھ کو حاصل ہوا اور ایک عرصہ دراز کے بعد جامع مسجد بالائے قلعہ کے عقب میں خانقاہ اور مدرسہ بناکردہ حضرت میر محمد گیسو علیہ الرحمہ کے مقام پر ایک جدید اسکول کی عمارت تعمیر کی گئی جس کے صدر دروازہ پر "لطیفہ ہائی اسکول ۱۹۹۰ء" کا کتبہ نصب ہے۔

تاریخی اعتبار سے حضرت میر سید محمد گیسو علیہ الرحمہ نے علیگڑھ میں پہلا دارالعلم (مدرسہ) قائم فرمایا تھا جو افسوس کہ باقی نہ رہ سکا مگر خداوند عالم کا شکر ہے کہ اس مقام پر ایک مدرسہ بنام "لطیفہ ہائی اسکول قائم ہوا ہے۔

اور پھر ایک مدرسہ سرسید علیہ الرحمہ نے علیگڑھ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان یکم جون ۱۸۷۵ء میں قائم فرمایا تھا جو دور حاضر میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے ایک عظیم دارالعلوم کی شان اختیار کر گیا ہے اور یہ دارالعلوم مسلمانان ساری دنیا میں مشہور و معروف ہے۔

عیدگاہ

یہ علیگڑھ کی قدیم عیدگاہ ہے۔ دہلی دروازے سے شاہ جمال کو جانے والی سڑک کے کنارے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ عیدگاہ، حضرت میر محمد گیسو نے ماہ رمضان ۹۷۱ھ اپریل، مئی ۱۵۶۳ء میں تعمیر کرائی تھی۔ اس عیدگاہ کے کتبہ کی نقل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ بعہد خسرو غازی بدور شاہِ دیں پرور	جلال الدین محمد شاہِ دیں شاہنشہ اکبر
۲۔ بناکرد ایں عمارت را محمد گیسو آں خانے	نبی را میوہ جانست و علیؑ را دیدۂ انور

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۲۔ مرتب شد بخوبی ایں عمارت درمہ رمضان   ز ہجرت بود سالش نہصد و ہفتاد بالا تر

ترجمہ ۱۔ خسرو غازی، شاہ دیں پرور جلال الدین محمد اکبر کے دور میں۔

۲۔ اس عمارت کو محمد گیسو ملقب بہ خاں نے تعمیر کرایا۔ یہ عمارت جی کے لیے میوۂ جان اور علی کے لیے آنکھوں کا نور ہے۔

۳۔ یہ عمارت رمضان کے مہینے میں مکمل ہوئی ہے۔ ہجرت کا سال ۹۷۰ سے اوپر تھا۔

مذکورہ قطع سے واضح ہے کہ حضرت میر محمد گیسوؒ کو "خان" کے خطاب سے عہدِ اکبری میں ملقب کیا گیا تھا خان آپ کے نام کا جزو نہیں ہے۔

مذکورہ عیدگاہ اور اس کے مذکورہ بالا کتبہ کی تصدیق و توثیق مسٹر اٹکنسن نے ۱۸۷۵ء میں اور مولوی اشفاق علی صاحب نے ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء میں اپنی تحقیق کے مطابق کی ہے۔ اور تحریر فرمایا ہے کہ یہ عیدگاہ موجود ہے اور بوسیدہ ہے۔

مذکورہ عیدگاہ آج بھی مقبرہ حضرت سید محمد گیسو کے جانبِ مغرب سترہ فٹ کے فاصلہ پر موجود ہے۔ اس کے گرد و نواح میں مسلمانوں کے بے شمار مقابر واقع ہیں۔ اس عیدگاہ کی دیوار کے دونوں جانب ہشت پہل دو ستون اور وسط میں تین محرابیں ہیں۔ وسطی محراب بڑی اور گہری ہے اور جانبی محرابیں چھوٹی ہیں۔ اس دیوار کی بنیاد سنگ سیاہ سے اور اس کا بالائی حصہ لکھوری اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس دیوار پر چونے کا پلاسٹر ہے اور اس پر زرد، سبز اور فیروزی مختلف رنگوں سے نقاشی کی گئی ہے اور بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ وسطی محراب کے جانبین پر گول خوشنما دائرے بنائے گئے ہیں جن میں لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کندہ ہے۔ اس عیدگاہ کے احاطہ کی دیوار اور فرش بھی اُدھڑا پڑا ہے۔

مذکورہ قدیم عیدگاہ کے جانبِ مغرب تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر اختیار خاں میواتی کی تعمیر کردہ وسیع و عریض عیدگاہ ہے جسے سردار خاں میواتی نے ۱۷۹۶ء ۱۲۱۱ھ میں مزید وسعت دی اور بارونق بنایا ہے۔

عیدگاہ کا مذکورہ کتبہ مورخین کے مشاہدہ کی رو سے مقبرہ میر سید محمد گیسوؒ[7] کے متصل قبرستان کی دیوار میں نصب تھا۔

۔ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مقبرہ

حضرت سید محمد گیسوؒ کا مقبرہ مذکورہ عیدگاہ قدیم کے صحن میں تعمیر کیا گیا۔ یہ مقبرہ دو منزلہ ہے۔ پہلی منزل زیر زمین تہ خانہ کی صورت میں ہے جس کے احاطہ کی بنیادیں سنگ سیاہ سے اور دیواریں لکھوری اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہیں اور ان پر چونے کا پلاسٹر کیا گیا ہے۔ تہ خانے میں اترنے کے لیے جانب جنوب ایک چھوٹا دروازہ (کھڑکی) ہے اور اس کے نیچے پانچ سیڑھیاں ہیں۔ اس تہ خانہ میں تین قبریں ہیں اور ہر قبر کے سرہانے دیوار میں ایک محراب ہے۔ وسطی قبر بڑی ہے اور حضرت سید محمد گیسو علیہ الرحمہ کی ہے۔ اس تہ خانے کی چھت سنگ سرخ سے بنائی گئی ہے تہ خانہ مربع ہے شرقاً غرباً و شمالاً جنوباً پیمائش دس فٹ نو انچ ہے۔ اور باہر سے پیمائش دونوں سمتوں میں ۲۳ فٹ ۷ انچ ہے۔

اس مقبرہ کی دوسری منزل سنگ سرخ سے تعمیر کی گئی ہے۔ یہ منزل بارہ دری کی صورت میں ہے۔ ہر سمت تین تین در مستطیل شکل کے ہیں۔ وسطی در بڑا اور جانبی در چھوٹے ہیں جن کے بالائی و جانبی حاشیوں پر منقش بیلیں ہیں۔ مغربی وسطی در کے بالائی حاشیہ پر خوشنما پھول سنگ سرخ میں تراش کر بنائے گئے ہیں اور گول پھول دائروں میں اسم اللہ اللہ ابھرے ہوئے حروف میں تراشا گیا ہے۔ گنبد کے نیچے سرخ پتھر کے حاشیہ پر بھی پھول تراشے گئے ہیں جن کے وسط میں اسم اللہ اللہ مسلسل تراشا گیا ہے۔ اس بارہ دری کے اندر شمالی، جنوبی اور مشرقی حاشیوں پر آیت الکرسی ابھرے ہوئے نقوش میں تراشی گئی ہے اور مغربی در پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ انا فتحنا لک فتحا مبینا ابھرے ہوئے حروف میں کندہ کیا گیا ہے۔

مقبرہ کا گنبد بارہ دری پر ہشت پہل چوکی پر بنایا گیا ہے جو شکستہ اور بوسیدہ ہے۔

مقبرہ کا صدر دروازہ جانب مشرق ہے اس دروازہ کی بنیاد بھی سنگ سیاہ سے تعمیر کی گئی ہے جس کی لمبائی تیرہ فٹ چار انچ ہے۔ دروازہ محراب دار سنگ سرخ

سے تعمیر کیا گیا ہے اور پھر مابین خوبصورت حاشیے تراشے گئے ہیں۔ دروازہ کی چوڑائی اندر سے ۵ فٹ ہے۔

حضرت سید محمد گیسوؒ کے حالات صاحب ماثر الامرا صمصام الدولہ شاہنواز خاں نے بھی بیان فرمائے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ وہ خراسان (ایران) کے سادات سے تھے۔ عہد اکبری میں اپنی خدمات کی بنا پر بکاول بیگی کے منصب پر مامور ہوئے۔ یہ عہدہ مخلص معتمدوں کے سوا کسی اور کو نہیں ملتا تھا۔ اکبر نے میر گیسو کو بھکر کے قلعہ میں متعین فرمایا اور قلعہ کی کنجیاں انیسویں سال جلوس اکبری ۹۸۲ھ۔ ۷۴-۱۵۷۳ء میں ان کے سپرد کی گئیں۔ اس طرح ایک آباد ملک ان کے قبضہ میں آ گیا۔ بعدہٗ اکبر نے اس ولایت کی حکومت ترسوں خاں کے لیے مقرر فرمائی اور میر گیسو میرٹھ اور اس کے اطراف کے محالات اور دہلی کے مضافات کی فوجداری پر مقرر ہوئے (یہ علاقے دو آبے کے بہترین محالات تھے اور دو آبہ سے مراد گنگا و جمنا کے مابین علاقہ ہے۔

ماثر الامرا کے بیان کے مطابق سید محمد گیسو خراسانی دو آبہ کے علاقہ میں فوجدار کی حیثیت سے رہے اور علیگڑھ بھی دو آبہ کا ایک اہم فوجی مرکز رہا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی سید محمد گیسو کا قیام رہا ہے۔ اور بعد شہادت ان کا مقبرہ بھی علیگڑھ میں تعمیر ہوا۔ میر گیسو خراسانی کی شہادت کے حادثہ کو بھی صاحب ماثر الامرا نے بیان کیا ہے۔ خلاصہ بیان حسب ذیل ہے:۔

اٹھائیسویں سال جلوس اکبری ۹۹۱ھ ۱۵۸۱ء میں کچھ سرکش سپاہیوں نے بغاوت کی میر گیسو نے ان پر حملہ کیا لیکن میر کے ساتھیوں نے بے دلی دکھائی اور میر گیسو کا خاتمہ ہو گیا سرکش سپاہیوں نے اپنی خباثت کی وجہ سے ان کے جسم کو آگ سے جلایا۔ اکبر بادشاہ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو وہ سخت غضبناک ہوا اور ان سپاہیوں میں سے بہت سوں کو قتل کرا دیا۔ میر گیسو کے فرزند میر جلال الدین مسعود کہ جو منصب دار تھے جلوس جہانگیری کے تیسرے سال فوت ہوئے اور ان کی محبت میں ان کی ماں نے افیون کھالی اور بیٹے کے مرنے کے بعد وہ بھی مر گئیں۔ میر گیسو کے مقبرہ میں تین قبریں ہیں۔ مذکورہ بیان تاریخ کی روشنی میں قیاس غالب ہے کہ وسطی قبر میر گیسو کی دائیں جانب ان کی بیگم کی اور بائیں جانب ان کے فرزند کی قبر ہو۔

فکر و آگہی دہلی میگزین مئی ۲۰۰۰ء

مقبرۂ محمد گیسو خراسانی ایک قدیم تاریخی مقبرہ ہے اور علیگڑھ میں شاہانِ مغلیہ کے عہد کی یادگاروں میں سے ہے لیکن برباد پڑا ہے اور اس کے نقش و نگار بھی دن بدن مٹتے جارہے ہیں۔ اگر حکومت ہند کا محکمہ آثارِ قدیمہ اس کو اپنے تحت لے لے تو اس قدیم تاریخی یادگار کا تحفظ ممکن ہے۔

عیدگاہ قدیم علیگڑھ بنا کردہ حضرت میر سید محمد گیسو علیہ الرحمہ اور مقبرۂ حضرت میر سید محمد گیسو خراسانی علیگڑھ کی قدیم یادگار تاریخی عمارت سے ہیں۔

قلعہ، کول (علیگڑھ)

اور اس میں سادات عظام کا قیام

راجے محمد کولوی اپنی تالیف اخبار الجمال ۱۱۵۳ھ میں قصبہ کول کی تاریخ کے بارے میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"قصبۂ کول کہ آبادانی آں از ہر چہار اطراف بمساحت نیم نیم کردہ باشد گرداگرد ہر طرفش تا بیک یک کردہ باغہائے انبہ بکثرت انبوہ کہ بدیدنش رفع اندوہ است فیما بین میان دوآب کہ بشمال آں بست کردہی دریائے گنگ و جنوبی آں نیز بست کروہی دریائے جون (جمنا) کہ ہم رنگ گنگ است واقع شد و بمسافت پنجاہ کردن بغروب آں دہلی و در جنوب آں بمسافت سی کردہ آگرہ کہ ہر دو شہر پایۂ تخت ہندوستان آشکار اند باعتبار مراتب شمار دفاتر سلاطین روزگار بست و در محال پرگنات قرب و جوار از قصبۂ مذکور ملحوق ساختہ بسرکار کول صوبۂ آگرہ مسمی و اشتہار و تمامی سرزمین میان دوآب خالی از کوہ و شیریں بآب و بزراعت نیز صواب۔"

اور قلعہ کول کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"قلعہ کول کہ ہر چہار دیوارہائے آں مسافت پاؤ پاؤ کردہ دارند واقعہ فیما بین قصبہ مذکور است کہ بارتفاع و استحکام نہایت مشہور است چنانچہ علامی حسن بسطامی در تاج المآثر تاریخ معز الدین محمد سام عرف شہاب الدین غوری در مقام افتتاح قلعۂ کول ارکام دارد کہ قلعہ کول از معتبر ترین و امہات قلاع ہنداست کہ سر برج آں در برج دو پیکری شود و شعاع بصر از حضیض آں نمی گذشت و دہم نیرنگ ـــــ

ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

بذروہ اس نمی رسید بیت ؎

نہ باس راگزند از ابر خورشید
نہ بومش نہیب از باد باران

چونکہ قطب الدین ایبک نام غلام معزالدین محمد سام پنجاہ ہزار سوار در سنہ تسع وثمانین وخمس مائۃ از قلعہ دار کفار بسخت کارزار فتح ونصرت واسلام دریافت کہ بعد از فتح باندکے مدت در سنہ مذکور سلطان معزالدین محمد سام نیز مرور نمودہ تماشائے قلعہ کول دید وحکومت کول بہ حسام الدین اغلبک مقرر ساخت والحال یازدہم ربیع الثانی سنہ یک ہزار ویک صد وپنجاہ ویک کہ ہجری است از انعدام مرمت بپایہ انہدام رسیدہ مسکن مردم خاص وعام است لیکن چوں حضرت نظام الدین ابوالمؤید قدس سرہٗ از جماعت ایشاں رئیس انام اند گویند کہ انجام فتح قلعہ نیز بہ برکت قدوم وطفیل میمنت لزوم شیخ نظام الدین ابوالموید شیخ اسلام کہ در اصل حویلی قلعدار کفار بجناب ایشاں مسکن ومقام است۔"

اور مسجد بالائے قلعہ علیگڑھ کی بابت ارشاد فرماتے ہیں :

مسجد جامع مشتمل بر چہار ہزار دراع زمین کہ واقع فیما بین قلعہ کول ہمچو بر انگشتری نگین وباخبار قیاس گزیں مشہور چنانست کہ اوّلاً بتخانہ معبد کفار وبعد از فتح قطب الدین ایبک نصرت انجام ہندوستان بعہد سلطان معزالدین محمد سام بتخانہ شکستہ بشرف اسلام در آورد کہ تا مسجد مسلمین بپا است وبعد از انہدام آں سلطان ناصرالدین محمود بن سلطان شمس الدین یلتمش بمعہ مینار نیز ترتیب داد کہ مینار ساختہ سلطان ناصرالدین محمود ملصق بچپ مسجد تا دریں ایام قیام وقرار داد وبعد از شکستگی بنا ر ناصرالدین محمود سلطان محمد شاہ بن تغلق مسجدے ہفت دری درست ساخت بندہ برائے نماز درآں مسجدے کہنہ بہمتے رسیدم واز نہہ ابیات تاریخش بیتے کشیدم ؎

مجدد گشت طاق مسجد جمعہ بخطۂ کول عرش آسا
بامر شاہ عالم بوالمجاہد خسرو گیتی شہ والا

محمد ابن تغلق شاہ سلطان ابن سلطان شاہ ہفت اقلیم
نفاذ امر او در شرق در غرب است جابلقا و جابلسا
بنصف ماہ رمضاں بود تاریخ ایں عمارت سال بہ
سہ وسی بر سر ش بنوشت ایں کاتب بریں طاق سپہر آسا

راجے محمد کوسی نے اخبار الجمال میں سکان اندرون قلعہ کول و بیرون قلعہ کول میں سادات عظام کا ذکر بھی فرمایا ہے تفصیل حسب ذیل ہے:

سید محمد میر ابن سید امان اللہ و سید محمد ابن سید عبدالکریم وغیرہما بنائر سید اجمل اندرون قلعہ کول سکونت داشتہ بنجابت اہل اعتبار اند۔

میر محمد غلام درویش و میر محمد وغیرہ بنائر میر سبحن ابن نورالدین بنجابت از اعیان مشہور اند منقولست کہ سید نورالدین مذکور از نسل سید علی ہمدانی بدامادی میر عبداللہ صدر یکے ز منشیاں مرزا کامران ابن سلطان بابر بود چنانچہ ابوالفضل در اکبر نامہ ارقام فرمودز قبر ش بسنگ سرخ بر چبوترہ زیر درخت نیم بیروں قصبہ کول و اندرون دروازہ باغ گیسو خان (میر محمد گیسو خان) مقرر نمود۔

میر نظام الدین بیرہ میر محمد مذکر بسیادت واصالت نیز مشہور میر قطب الدین ابن میر بھورے سادات حسینی نیز بقرابت میر عبداللہ صدر اندرون قلعہ شہر کول بعزت تمام قیام دارد۔

میر محمد علی ابن میر اشرف کہ از عہد شاہجہاں باندرون قلعہ کول قرار گرفتہ بنجابت اشتہار۔

سید لطف اللہ و سید منور وغیرہما جماعت بست کس باشند از قوم سادات رسول دار بنائر میر ابوالقاسم واسطی کہ در تفصیل نسب ایشاں نیز بالا گشت باعزاز و اکرام بسکونت بیرون قلعہ کول قیام دارند۔

حیدر علی خاں عرف سید جعفر، سید فتح محمد ابن سید جان محمد، سید جمال وغیرہم از انسال مخدوم جہانیاں سید جلال بخاری بسکونت بیرون قلعہ کول بحال اند۔

حکیم سید ثناء اللہ ہمدانی مفتی ولی اللہ فرخ آبادی عہد بنگش میں آپ کے بارے میں ارقام فرماتے ہیں: ان کا نسب سید علی ہمدانی پر ختم ہوتا ہے اور طب میں حکیم محمد جعفر اکبر آبادی سے نسبت رکھتے تھے اور کول میں ساکن تھے۔ حکیم

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ثناءاللہ جوانی میں نواب فتح علی خاں ولد نواب ثابت خاں کے ملازم رہے۔ ان کے مطب کی گرم بازاری تھی۔ وفات ۱۲۰۱ھ ۔ ۸۷-۱۷۸۶ء میں ہوئی "رضی اللہ عنہ" سے تاریخ نکلتی ہے۔ ان کے دو بیٹے تھے ایک حکیم مظہر علی معتمد معالج نواب مظفر جنگ تھے کہ وہ اور ان کے بیٹے حکیم حیدر علی کامل تقرب رکھتے تھے۔ حیدر علی کے بیٹے مولوی ببر علی بھی سرکار سے تعلق رکھتے ہیں۔ خدا ان کو زندہ رکھے۔ حکیم مظہر علی نے ۵ رمضان کو اور حکیم حیدر علی نے ماہ ذیقعدہ ۱۲۳۳ھ کو وفات پائی۔ دوسرے بیٹے حکیم ممتاز علی تھے جنہوں نے عالم جوانی میں وفات پائی۔ انھوں نے دو بیٹے غلام مصطفیٰ المتخلص بہ طیب اور غلام حسین یادگار چھوڑے۔ دونوں کا انتقال ہو گیا۔ حکیم سید ثناءاللہ کی ایک بیٹی تھیں۔ جن کا نکاح مولوی سید دائم علی کے ساتھ ہوا جو کڑہ کے سید تھے۔

بیرون قلعہ کول یعنی علیگڑھ میں جانب جنوب سادات (شیعہ اثنا عشری) کا ایک مستقل محلہ سید واڑہ ہنوز آباد ہے جس میں سادات شیعہ اثنا عشری آج بھی آباد ہیں۔

راجے محمد کولوی نے اخبار الجمال میں بیان سکانِ قرب و جوار کول کے ضمن میں سادات ہمدانی مسکونہ جلالی کے تعارف میں ارقام فرمایا ہے۔ "سید فتح محمد و سید ضیاء اللہ وغیرہ جماعت کثیر سکان آبادانیِ آنجا سادات مشاہیر خود را از نسل سید ہمدانی، سید علی ہمدانی گویند۔"

شاہ جمال میں سادات کے قدیم مقابر

قلعہ علیگڑھ (محلہ بالائے قلعہ) کے جانب مغرب قدیم قبرستان ہے جس میں قدیم مزارات و مقابر موجود ہیں۔ شاہ جمال میں سادات عظام سے تین قدیم قبریں ایسی ہیں کہ جن پر کتبات قدیم طرز کے نصب ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ قبر میر عبداللہ الملکی دہلوی۔ مقبرۂ شاہ جمال کے احاطہ کے اندر جو قبرستان ہے وہاں یہ قبر واقع ہے اور اس کے سرہانے ایک محراب دار کتبہ نصب ہے۔ یہ کتبہ سنگ سرخ کا ہے اس کا طول ۱۶۸ اور عرض ۳۵ سینٹی میٹر ہے۔ اس پر میر عبداللہ دہلوی کا سنہ وفات ۱۱۳۵ھ ۲۳-۱۷۲۲ء درج ہے جو محل وارث فردوس سے اخذ کیا گیا ہے قطعہ تاریخ وفات جو کتبہ پر کندہ ہے حسب ذیل ہے۔

۔ سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اللہ باقی

زہے دریائے فیض و معدن حلم | کشا از ہر بن مو چشمۂ علم
بتلمیذیش افلاطوں سر افروز | بہ طبعش عقل کل را مایۂ ناز
ز دہلی میر عبداللہ اکمل | کہ در ہر جوہر آمد عقل اول
پئے آسودن جسم مطہر | بنائے ساختہ چوں مہر انور
چو تاریخ از ضمیر خویش جستم | محل وارث فردوس گفتم ۱۱۳۵ھ

۲۔ قبر آقا محمد — یہ قبر مقبرہ شاہ جمال کے احاطہ کے اندر قبر شاہ جمال کے سرہانے واقع ہے اس کے کتبہ سے واضح ہے کہ یہ قبر آقا محمد ابن آقا امین کی قبر ہے جن کی وفات ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں ہوئی ہے۔

۳۔ قبر سید مبارک علی خان۔ مقبرہ شاہ جمال کے احاطہ کے اندر قبر شاہ جمال کے دائیں جانب پچاس میٹر کے فاصلہ پر ایک قبر ہے جو قدم رسول کے نام سے موسوم ہے اس لیے کہ اس پر قدم رسول کا نشان نصب تھا۔ کتبہ سے واضح ہے کہ یہ سید مبارک علی کی قبر ہے جن کی وفات ۲۱ محرم ۱۱۹۹ھ/۴ دسمبر ۱۷۸۴ء میں شاہ عالم ثانی کے عہد میں ہوئی ہے۔ قطعہ تاریخ وفات حسب ذیل ہے؛

ھوالباقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مبارک علی خاں سیادت پناہ | چو بنمود رحلت ز دار الفنا
خرد گفت سال وفاتش بدل | خدایا بیامرز ایں بندہ را

بتاریخ بیست و یکم شہر محرم الحرام سنہ ۲۶ جلوس شاہ عالم بادشاہ، غازی۔ ۱۱۹۹ھ

شاہ جمال میں اکثر قدیم مقابر ایسے ہیں کہ جن کے کتبات باقی نہیں رہے۔ لہٰذا یہ تحقیق ممکن نہیں کہ کتنے سادات کے مقابر یہاں واقع ہیں۔

شاہ جمال کے جنوب مغرب میں تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر قدیم کربلا واقع ہے جہاں محرم کے تعزیوں کے جلوس یوم عاشورہ محرم اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ یہاں بھی سادات و شیعان علیگڑھ کے مقابر بتعداد کثیر واقع ہیں۔

مذکورہ تاریخی شواہد کی روشنی میں واضح ہے کہ سادات کا تعلق قلعہ علیگڑھ سے

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

دیرینہ ہے مزید براں سادات، شیوخ اور شروانی پٹھانوں کی بستیاں علیگڑھ کے قرب و جوار میں واقع تھیں جو اہل علم و فضل تھے مزید براں اس شہر میں مدرسہ زمانہ قدیم سے قائم تھا۔ لہٰذا سرسید کی نظر انتخاب اپنی تحریک کے اجرا کے لیے علیگڑھ پر پڑی اور اسی شہر کو انھوں نے اپنی تحریک کا مستحکم مرکز قرار دیا اور ان کی تحریک اسی شہر میں بار آور ہوئی۔

اگر سرسید چاہتے تو خانقاہ میں بیٹھ جاتے اور ایک عالم کے رشد و ہدایت کا وسیلہ بنتے۔ خالص سیاست کا راستہ اختیار کرتے تو ایک بڑی جماعت کے قائد ہوتے۔ منصب اور عہدے کی فکر کرتے تو سب سے اونچی کرسی پر بیٹھتے۔ ادیب و شاعر ہونا پسند کرتے تو ایک زمانے سے داد حاصل کرتے۔ مورخ ہوتے تو قوموں کے عروج و زوال پر اسناد کا درجہ پاتے۔ فلسفہ اور مذہب کی وادی میں نکل جاتے تو کتنے قافلوں کے سالار بنتے۔ صرف عمارت کی تعمیر سے دلچسپی رکھتے تو دورِ شاہجہانی کی بازیافت کرتے۔ قانون پر اکتفا کرتے تو اپنے عہد کے بہت بڑے مقنن ہوتے۔ محض تعلیم سے تعلق رکھتے تو ایک نئے نظام تعلیم کے بانی ہوتے اور کیا کیا نہ ہوتے! لیکن تخصیص اور تخصص کا راستہ اختیار نہ کرنے کے باوجود کون کہہ سکتا ہے کہ متذکرہ صدر کم و بیش تمام حیثیتیں ان کی شخصیت میں جلوہ گر نہ تھیں۔ (رشید احمد صدیقی)

پروفیسر اصغر عباس

علیگڑھ کا آثار الصنادید

اٹھارہویں صدی کے جاتے جاتے انگریز اپنے علوم کی طاقت اور ہندوستانی سپاہیوں کے ذریعہ سارے ہندوستان پر امر بیل کی طرح چھائے چلے جا رہے تھے۔ مغل بادشاہ جو کبھی ہندوستان کے بائیس صوبوں کا نگہبان تھا۔ اب اس کے تصرّف میں فوجداری کول بھی نہ رہ گئی تھی۔ راجپوتوں کی طاقت نے بھی انگریزوں کی بالادستی تسلیم کر لی تھی یہاں تک کہ مرہٹہ سردار دولت راؤ سندھیا کی فوج کے کمانڈر جنرل پیراہ نے ۴ ستمبر ۱۸۰۳ء کو علیگڑھ قلعہ میں انگریز جنرل لیک کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ علیگڑھ قلعے کے قریب جہاں مرہٹہ فوج نے ہتھیار ڈالے تھے بعد میں جا کر انگریزی فوج کی مشقیں ہونے لگی تھیں۔ اسی میدان میں ۱۸۶۴ء میں سر سید اپنے شعور میں شوق کی ثروت، دل میں خدمت اور عقلیت کی پیاس لیے پہنچے تھے اور اپنے خالق سے یہاں تہذیبی باغبانی کے لیے ایک گھر بنانے کی دعا کی تھی۔

۷۴ ایکڑ کے اس بے آب و گیاہ پریڈ گراؤنڈ کو سر سیّد کی درخواست پر سر جان اسٹریچی کی کوششوں سے مجوزہ مدرسۃ العلوم کے منتظمین کو حکومت نے عطا کیا۔ ۱۶ اپریل ۱۸۷۵ء کو اس زمین پر قبضہ ملا اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علیگڑھ چھاؤنی

کے میس ہاؤس میں اس کالج کا افتتاح ہوا جو بعد میں دہلی، سمرقند و بخارا اور آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرح مشہور ہوا۔ سر سید نے کالج کی عمارتوں کے لیے جو نقشہ تجویز کیا تھا وہ یہ تھا:

دو مسجدوں کے علاوہ (۱) چاہ جس سے مسجدوں اور تمام مکانات بورڈنگ ہاؤس میں بذریعہ کل پانی جاوے گا۔ (۲) دو یا تین دروازے احاطہ مدرستہ العلوم کے (۳) بڑا ہال جو امتحان اور تقسیم انعامات وغیرہ اجلاسوں کے لیے بنایا جاوے گا۔ (۴) ایک دروازہ غربی اندرونی عمارت متصل ہال جس کے ذریعہ سے مدرسہ کے ایک چوک سے دوسرے چوک میں جانے کا راستہ ہو گا۔ (۵) ایک دروازہ شرقی اسی غرض سے بہ جواب دروازہ غربی (۶) ایک کتب خانہ جو نہایت عمدہ خوبصورت بنایا جاوے گا (۷) ایک میوزیم یا عجائب خانہ جس میں آلات علمی رہیں گے اور ان کا تجربہ سکھایا جاوے گا (۸) ایک بڑا کمرہ کھانے کا (۹) پارک متعلق مدرستہ العلوم (۱۰) گیند گھر جس کو کرکٹ شیڈ کہتے ہیں۔"

بہت جلد سر سید کا خواب خلاء میں تبدیل ہوا اور رفتہ رفتہ ایک نقش الفت تعبیر ہو گیا۔ ۱۸۷۶ء میں سر سید نے ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی اور مدرستہ العلوم کی عمارتوں کی نگرانی کے لیے بنارس سے مستقل قیام کے لیے علیگڑھ آ گئے۔ کالج کی عمارتوں کی تعمیر میں سر سید کو کن جاں گسل آزمائشوں سے گزرنا پڑا اس کی تفصیل ان کتابچوں میں ملتی ہے جن کے نام تھے 'لٹھ'، "آرہ"، "درّہ"، "جوت"، اور "کنٹاپ"، وغیرہ۔ کالج کے قیام کے لیے کبھی انھیں انگریز حکام کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور کبھی بقول عبدالحلیم شرر درو دیوار سے لعنت و نفریں کی صدائیں سننی پڑیں۔

سر سید کو اپنے مقصد سے جیسی والہانہ شیفتگی تھی اس نے انھیں اپنے سفر میں دشواریوں اور صعوبتوں کو کبھی حائل نہ ہونے دیا۔ انھوں نے ایک بے صبر عاشق کی طرح کالج کی عمارتوں کی تعمیر شروع کرا دی۔ دھیرے دھیرے مسجد و مینار نے، لٹن لائبریری اور اسٹریچی ہال نے، وکٹوریہ گیٹ اور سالار منزل نے سر بلند کرنے شروع کر دیے۔ ہاسٹل لیکچر روم کرکٹ فیلڈ اور باغ نمودار ہوئے۔ مدرسہ کے

چاروں طرف سنگ سرخ کی جالیاں کھنچ گئیں۔ سر سید مئی جون کی تپتی ہوئی دوپہر میں
جب سوا نیزے پر آفتاب ہوتا تعمیرات کا خود معائنہ کرتے اور تعمیر کی ایک ایک
جزئیات کی بیک وقت نگرانی بھی کرتے اور کام کرنے والوں کو تیزی سے کام
پر بڑھائے جاتے۔ کبھی کبھی تو ان پر وہ اضطرابی کیفیت طاری ہوتی تھی کہ جب تک
معماروں کے ساتھ وہ پتھر نہ اٹھواتے انھیں چین نہ آتا تھا۔ اسی طرح عمارتوں کی
بنیادیں حیرت ناک تیزی سے ابھرتی چلی گئیں ایسا لگتا تھا جیسے کوئی سر سیّد
کے کان میں کہہ رہا ہو کہ وقت کے پر لگے ہیں وقت تیزی سے قریب آرہا ہے
انھوں نے مدرسۃ العلوم کے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"عزیزو! میرے بے چین دل کو آج کچھ قرار سا آگیا ہے معلوم ہوتا ہے
میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کو ہے میں اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوا چاہتا
ہوں۔ میری ہڈیوں کو اس غم نے پگھلا دیا تھا کہ میں دیکھتا تھا کہ وقت کا قافلہ
تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جارہا ہے لیکن تم ہو کہ خواب گراں سے بیدار
ہونے کا نام نہیں لیتے۔ میں نے برسوں لگاتار تمھیں جگانے کی جدّ وجہد کی
خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جب اس مقصد کی طلب سے میرا دل
خالی ہوا ہو اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے اس کی تمنا میں
اپنے بستر غم واندوہ پر بے قراری کی کروٹیں نہ بدلی ہوں۔ آج مسجد کی محرابیں
اور اسٹریچی ہال کے بام و در دیکھتا ہوں، تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے
دل کی بے قراریوں نے اس کالج کا پیکر اختیار کر لیا ہو۔"

مارچ ۱۸۹۸ء میں سر سیّد فوت ہوگئے۔ اس وقت تک مدرسۃ العلوم
کی جو عمارتیں مکمل ہوگئی تھیں ان کا احوال یہ ہے: علیگڑھ اسٹیشن سے تقریباً
دو کلومیٹر مشرق کی طرف آیئے تو مغرب اور جنوب کے گوشے میں ایک گیٹ
فیض علی خاں کا بنوایا ہوا فیض گیٹ کے نام سے ملتا ہے۔ یہ کالج کے احاطہ
کا دروازہ ہے۔ اس دروازہ سے مشرق اور شمال کی طرف چلیں تو احاطہ کا دوسرا
دروازہ ظہور گیٹ ملتا ہے۔ فیض گیٹ سے چند قدم مغرب کی طرف چلیں تو
تو ایک پختہ کنواں چاہِ اخوان الصفا کے نام سے دکھائی دے گا اس کی تعمیر میں

شائیں لوگوں نے تعاون کیا تھا جن کے نام پتھر پر کندہ ہیں اس چاہ کی بنیاد مدرستہ العلوم کے سب سے کم عمر طالب علم جن کی عمر آٹھ سال تھی اور حیدر آباد کے رہنے والے تھے سید محمود علی نے رکھی تھی۔ چاہ سے چند قدم مغرب کی طرف چلیں تو دائیں جانب وکٹوریہ گیٹ ملتا ہے بائیں طرف کالج کا بہت بخش پارک دکھائی دے گا۔ اس پارک کے وسط میں کھجور کا درخت بھی تھا جس کا پودا سر سید نے وادی بطحا سے منگوایا تھا۔ وکٹوریہ گیٹ مدرستہ العلوم کا صدر دروازہ ہے۔ گیٹ کے بالائی حصے پر چند مدور سنگ مرمر لگے ہیں جن میں سے ایک پر کالج کا مونوگرام کندہ ہے۔ دروازہ کی پیشانی پر چھ پتھر او نصب ہیں جن پر عربی اشعار کندہ ہے جن کا اردو ترجمہ یہ ہے "قوم کے بزرگوں نے جو غفلت کے اندھیروں کے لیے مثل چراغوں کے ہیں، ایک عالی شان مکان بنایا ہے جس کی بنیاد تقویٰ الہٰی پر ہے تاکہ اس میں علوم دینی اور علوم دنیوی سکھائے جائیں اور عالم کے اخلاق شائستہ بنائے جائیں۔" یہ دروازہ ۱۸۹۳ء میں مکمل ہو چکا تھا۔ دروازہ کے اوپر وہ گھڑی ہے جسے کالج کے پرنسپل بک کے والد نے تحفتاً کالج کو دیا تھا۔ اس گیٹ کے اندرونی حصے کو ختم کرنے کے بعد اس کے دوسرے رخ پر بہت سی عربی عبارتیں کندہ ہیں۔ یہاں سے کھڑے ہو کر دیکھیں تو مشرق و مغرب اور جنوب کی طرف دور تک پختہ بورڈنگ ہاؤس کا سلسلہ نظر آئے گا اور سامنے اسٹریچی ہال۔ اور مغرب کی طرف کالج کی مسجد دکھائی دے گی جو اتنی دلکش ہے کہ اپنے سوا کسی اور چیز کو دیکھنے نہیں دیتی۔

مسجد : اس مسجد کی خشت اول سید محمود کے ہاتھوں رکھی گئی تھی اور ۱۸۷۹ء میں اس کی تعمیر شروع ہو گئی تھی اس مسجد سے یونیورسٹی کے مختلف اطراف کے فاصلے کا بھی اندازہ کیا جاتا تھا یہ مسجد مساحت میں زیادہ نہیں لیکن حسن تناسب میں بے نظیر ہے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسی مسجد ہو جس کے سرخ میناروں اور اجلے گنبدوں میں انفرادی اور مجموعی طور پر ایسا تناسب واقع ہوا ہو۔ اس مسجد کے دلکشا صحن کے بیچوں بیچ ایک حوض ہے جو مسجد کی دلکشی میں اضافہ کرتا ہے۔ مسجد کے بیرونی محراب پر شاہ جہاں کے زمانے کے

مشہور خطاط قاضی عصمت اللہ یاقوت رقم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی سورۂ والفجر کندہ ہے۔ یہ کتبے شاہ جہاں کی زوجہ نواب افسرالنساء بیگم عرف اکبرآبادی محل کی ۱۶۵۰ء میں بنوائی ہوئی فیض بازار میں واقع مسجد اکبرآبادی دہلی کے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں جب یہ مسجد مسمار ہوئی تو اس کے مذکورہ کتابے گورنمنٹ نے صاحب عالم مرزا الٰہی بخش کو دے دیے، سرسیّد نے ان کتابوں کو علیگڑھ کالج کی مسجد میں نصب کرنے کی فرمائش کی۔ بعد میں مرزا الٰہی بخش کے بیٹے مرزا سلیمان جاہ۔ نے ان کتبوں کو علیگڑھ کالج کی مسجد کے لیے مرحمت فرمایا۔ سرسیّد نے ان کتبوں کی سطروں کی قاشیں کتر وا کر کالج کی مسجد میں چسپاں کرایا۔ مولوی ذکاءاللہ لکھتے ہیں کہ سرسیّد کو دعا دینی چاہیئے کہ انھوں نے ان بے مثل کتبوں کو سنگ ریزہ ہونے سے بچا کر ایک خانۂ خدا سے دوسرے خانۂ خدا میں منتقل کر دیا۔ اسی طرح ایک اور پتھر پر سورۂ جمعہ کندہ ہے جو دو سو روپیہ کو خریدا گیا تھا اور مسجد کے اندرونی در پر نصب ہے مسجد کے احاطے کے شمالی حصّے میں محمود منزل اور سیّد محمود کا مقبرہ ہے اور یہیں متصل سرسیّد کی تربت ہے یہاں وہ شجرۂ نسب بھی کندہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پینتیس واسطوں سے سرسیّد کا سلسلہ رسولِ اکرم سے مل جاتا ہے۔ قریب ہی راس مسعود، ڈاکٹر ضیاءالدین، سیّد زین العابدین اور محسن الملک مدفون ہیں۔

اسٹریچی ہال : مدرسۃ العلوم کی عمارتوں میں اس زمانے میں یہ ہال سب سے بڑا سمجھا جاتا تھا۔ شبلی نے کہا تھا کہ اتنا بڑا ہال بنوانے کی کیا ضرورت ہے۔ ۱ار دسمبر ۱۸۸۰ء کو سرجان اسٹریچی جن کے ناخن تدبیر نے ان گتھیوں کو سلجھایا تھا جو مدرسۃ العلوم کو زمین ملنے میں پڑ گئی تھیں، کے نام پر اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ ۱۲ر نومبر ۱۸۹۴ء کو اس عمارت کا افتتاح ہوا۔ یہ ہال معہ برآمدوں اور طرفین کی گیلریوں کے ۱۰۷ فٹ لمبا ہے اور ۱۸ فٹ چوڑا اور ۵۴ فٹ بلندی میں ہے اس میں تقریباً ۷۰۰۰ مربع فٹ کا رقبہ شامل ہے جس میں ہال کا اندرونی رقبہ ۵۰۰۰ مربع فٹ ہے۔ ہال کے اندر مشرقی اور مغربی سمت میں اوپر کے حصّے کی طرف دو گیلریاں ہیں۔ اس عمارت کا صدر رخ جنوب کی جانب

ہے۔ یہاں اس کے ستونوں اور دروازوں کے ارد گرد آکلینڈ کالون، مسٹر مارلین اور جان اسٹریچی کے ایڈریس اور جواب ایڈریس پتھروں پر کندہ ہیں۔ یہ عمارت تقریباً نوّے ہزار میں تیار ہوئی تھی اور اس کے لیے تقریباً ایک سو بیس حضرات نے زر تعاون دیا تھا۔ ان میں پنجاب کے ایک اسکول کے مدرس بھی شامل ہیں جنھوں نے اپنی بیٹی کی شادی پر خرچ کرنے کے لیے پانچ سو روپے جمع کر رکھے تھے جسے انھوں نے اس عمارت کی تعمیر کے لیے دے دیا۔ سر سید لکھتے ہیں:

"نہایت تعجب کی بات ہے کہ جناب ممدوح ایک غریب اشراف شخص ہیں مگر ان کا دل امیروں سے بھی زیادہ امیر ہے اگر ہم زندہ ہیں اور خدا کو منظور ہے تو ہم اپنے مخدوم کا نام سنہری حرفوں میں سینٹرل ہال میں کندہ کریں گے۔"

اس عمارت کے افتتاح کے موقع پر سر سید نے کہا تھا کہ جس جگہ ہم لوگ اس وقت جمع ہیں ایک روز وہ اولوالعزم نوجوانوں کی بے تاب تمناؤں کا مرکز بنے گا اور یہاں سے علمی اعزاز اور سرفرازی کے قافلے روانہ ہوں گے۔"

سالار منزل: سر سید ہال کے مشرقی گوشے میں جو ڈائننگ ہال ہے اسے سالار منزل کہتے ہیں۔ یہ عمارت ۱۸۸۲ء میں تیار ہو گئی تھی۔ ڈائننگ ہال کے اندرونی اور بیرونی درجے میں چار کمرے ہیں ۱۸۷۷ء میں نظام حیدر آباد میر محبوب علی خاں دہلی آئے، کالج کا ایک وفد ان سے ملنے گیا۔ نواب مختار الملک سر تراب علی خاں سالار جنگ کے توسط سے کالج کو خطیر رقم ملی، اسی کے اعتراف میں یہ عمارت ان کے نام سے منسوب ہے۔ ۱۸۸۵ء میں میر لائق علی علیگڑھ آئے تو اس کا افتتاح ہوا۔

وکٹوریہ گیٹ سے جنوب مشرقی گوشے کی طرف چلیں تو طلبا کے رہنے کے لیے ۴۴ کمرے ہیں ۱۸۸۳ء تک مکمل ہو چکے تھے ان کمروں کی تعمیر کے لیے جن بزرگوں نے زر تعاون دیا ان کے نام کے پتھر کمروں پر نصب ہیں۔ ان میں چودھری شیر سنگھ، قاضی سید رضا حسین پٹنہ، چارلس اے ایلیٹ، کنور لیکھ راج سنگھ سید پور، منشی صفدر حسین گورکھپور، راؤ کرن سنگھ برولی، راجہ شیو نرائن سنگھ سید پور، منشی محمد اکرام اعظم گڑھ، سید حسین بلگرامی حیدر آباد، گھنشیام سنگھ مرسان، اودے پرتاپ سنگھ،

ولیم ہنٹر، لالہ پھول چند باتھرس، لالہ باسدیو سہائے سکندرہ، عبدالمجید جونپور، سید محی الدین علوی مدراس، ڈپٹی نذیر احمد دہلی اور سرسید اور ان کے دوسرے رفقاء کے نام ہیں۔

وکٹوریہ گیٹ سے جنوب مغربی گوشے کے طلبا کے رہنے کے تمام کمروں کی بنیادیں سرسید کی حیات میں پڑ چکی تھیں لیکن یہ ان کی وفات کے بعد مکمل ہوا۔ ان کمروں کے لیے جن لوگوں نے زرِ تعاون دیا ان کے نام کے پتھر کمروں پر نصب ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں سرسید نے تجویز پیش کی کہ اسٹریچی ہال کی جانب مشرق جو دروازہ ہے وہ "لارنس گیٹ" کے نام سے منسوب ہوگا مسٹر لارنس نے مدرستہ العلوم کی تعمیر کے لیے ایک قطعہ زمین ملنے کی ابتداً حکومت سے تحریک کی تھی اس کے متصل جو لکچر روم ہے وہ علیگڑھ کے طالب علم حمید اللہ خاں کے ولایت سے تعلیم پا کر آنے کی خوشی میں ان کے دوستوں نے دعوت کے عوض میں جو زرِ تعاون دیا تھا اس سے یہ لکچر روم تیار ہوا۔ اس سے متصل جو بلی روم ہے اور اس سے ملا ہوا بک منزل ہے۔

بک منزل: تھیوڈر دبک ۱۸۸۳ء میں مدرستہ العلوم کے پرنسپل ہو کر ولایت سے آئے ان کے طالب علم ڈپٹی حبیب اللہ لکھتے ہیں کہ بک صاحب کو دیکھ کر ہر طالب علم کے دل میں جوشِ محبت پیدا ہوتا تھا۔ بک صاحب نے اس چھوٹی سی دنیا یعنی بورڈنگ ہاؤس میں اپنے اخلاق اور ہمدردی اور مہربانی سے جو کچھ سلوک کیا اس کو صرف ان لوگوں کا دل جانتا ہے جو اس چہار دیواری کے اندر رہ چکے ہیں۔ بک صاحب کی یہی مقبولیت تھی کہ جب ان کے والد علیگڑھ آئے تو طلباء نے ان کا شاندار استقبال کیا اور علامہ شبلی نے ان کی مدح میں قصیدہ پڑھا۔

لٹن لائبریری: ۸ رجنوری ۱۸۷۷ء کو جب وائسرائے لارڈ لٹن علیگڑھ کالج کا افتتاح کرنے آئے اور سرسید کے مہمان ہوئے تو منتظمین کالج نے اس لائبریری کو لارڈ لٹن کے نام سے منسوب کیا۔ اس عمارت کی تعمیر ۱۸۸۱ء میں شروع ہوئی۔

مہدی منزل : یہ عمارت محسن الملک کی کالج اور علیگڑھ تحریک کی خدمات کے اعتراف میں ۱۸۸۱ء میں بننا شروع ہوئی اور سرسید کی حیات میں مکمل ہوگئی تھی۔
اسٹریچی ہال سے پیوستہ جانب مغرب کا دروازہ خلیفہ سید محمد حسن کے نام سے منسوب ہے اس درسگاہ کے ابتدائی دور جو دیا جلانے کا زمانہ تھا اور اس دیا کی لَو کے لپکنے کے دور میں بھی خلیفہ سید محمد حسن نے کالج کی بہت مدد کی تھی اسی کے اعتراف میں یہ دروازہ ان کے نام سے منسوب ہے۔
تصدق رسول عربک روم : یہ لکچر روم راجہ تصدق رسول کے زر تعاون سے بنا اور ان کی خواہش کے مطابق اسے عربی کے درس کے لیے مخصوص کیا گیا۔
برکت علی خاں لکچر روم : شاہجہانپور کے رہنے والے برکت علی خاں جن کی ساری عمر پنجاب میں گزری وہاں انھوں نے افکارِ سرسید کے فروغ میں بیش از بیش حصّہ لیا ان کی خدمات کے اعتراف میں یہ لکچر روم ان کے نام سے منسوب ہے۔
آسمان منزل : ۲۴ دسمبر ۱۸۸۸ء کو سر آسمان جاہ وزیر اعظم حیدرآباد علیگڑھ آئے۔ مدرسۃ العلوم کی امداد انھوں نے جی کھول کر کی انھیں کی یادگار میں یہ عمارت تعمیر ہوئی۔
نظام میوزیم : ۱۸۹۱ء میں ریاست حیدرآباد نے مدرسۃ العلوم کی سالانہ گرانٹ چوبیس ہزار کردی۔ اس عمارت کی تعمیر میں صرف اہل حیدرآباد نے حصّہ لیا۔ اسی دارالنوادر میں سرسید کا فراہم کردہ عہد بلبن کا کتبہ بھی نصب ہے۔
مشتاق منزل : نظام میوزیم کے بعد ہی مشتاق منزل ہے جس کی حد کالج کی مسجد ہے اس عمارت کے لیے ۱۸۹۱ء میں سرسید نے تجویز کیا کہ یہ مشتاق حسین کی خدمات کے یادگار میں ان کے نام سے موسوم ہوگی۔
کچی بارک : سرسید ہال کے جنوبی چوک سے شمالی چوک میں جائیں تو طلباء کے رہنے کے مشرق و مغرب اور جنوب میں کمروں کا ایک سلسلہ ملے گا۔ کبھی اس میں ستر کمرے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں یہ طے کیا گیا کہ کچی بارک کے پچیس کمروں کو پختہ بنا دیا جائے۔ ۱۹۱۸ء میں جب نظام حیدرآباد علیگڑھ آئے تو انھوں نے کچی بارک کے بقیہ کمروں کو پختہ بنانے کے لیے پچاس ہزار روپیہ دیا۔ ۱۹۱۵ء میں رشید احمد صدیقی اسی کچی بارک

کے مکین تھے۔ رشید صاحب لکھتے ہیں "جس کسی نے کچی بارک دیکھا نہ ہو وہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ کچی بارک کیا چیز تھی، کوئی عمارت تھی، عبادت تھی یا علامت۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ تینوں تھی۔ پھر بھی کچھ ایسی زار و زبوں عمارت اس وقت کالج کے رقبہ میں کہیں اور نظر نہ آتی تھی معلوم نہیں کب کی بنی ہوئی کھپریل کی چھت مٹی کی دیوار، در نہایت درجہ نیچا بودا بوسیدہ برآمدہ جس کی کڑیاں جگہ جگہ سے گل بھی گئی تھیں اور کھسک بھی رہی تھیں جن میں لکڑی کے آڑے ترچھے طرح طرح کے پیوند لگائے گئے تھے۔ جون کی گرمی اور آندھی میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پوری بارک مٹیالی، گرم، دردری، دھول اور دھند میں جھول رہی ہے کراہتی، کھانستی، ایک طرف اس زمانے کے علیگڑھ کا وہ طنطنہ اور دوسری طرف یہ کچی بارک، ہر حیثیت اور ہر درجہ کے گھرانوں کے لڑکے ان میں آباد تھے لیکن باوجود طرح طرح کی تکلیف اٹھانے کے ایک متنفس نے بھی کبھی اس کی شکایت نہ کی کہ کچی بارک میں رہنا صحت، عافیت، حیثیت، شان یا شرافت کے خلاف تھا ایسی نہیں بلکہ کتنے اس کی آرزو کرتے تھے کہ کچی بارک میں جگہ مل جائے اس زمانے کی کچی بارک کی صبح و شام اور زمین و آسمان کا خیال کرتا ہوں تو تصور میں ریگستان کا وہ منظر آجاتا ہے جہاں خضرِ راہ میں اقبال نے کہا ہے:

ریگ کے تودے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام

یا —

وہ خضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل

آدم جی پیر بھائی منزل: باب اسحاق سے شمال مغرب کی طرف چلیں تو چند قدم پر بمبئی کے تاجر آدم جی پیر بھائی کی بنوائی ہوئی یہ عمارت ملے گی جس میں ایک عرصہ تک مشہور ناظم دینیات مولانا سلیمان اشرف اور رشید احمد صدیقی مقیم رہے۔

باب اسحٰق: سر سید ہال کے مشرق اور شمالی گوشے میں یہ دروازہ سر سید کے دوست نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے بیٹے محمد اسحٰق خاں کے نام سے موسوم ہے یہ وقارالملک کے بعد کالج کے سکریٹری ہوئے اور انھیں کے زمانہ میں یہاں سے

کلیات خسروؔ کی تدوین اور طباعت عمل میں آئی۔ سرسید کی بنوائی ہوئی تمام عمارتوں کا نقشہ نویس اور انجینئر خود سرسید کی جامع صفات ذات تھی حالیؔ نے لکھا ہے کہ ایسا انجینئر ملنا ناممکن تھا جو خود ہی تعمیر کے لیے روپیہ فراہم کرے خود ہی عمارت بنوائے اور دیانت داری سے اپنا کام انجام دے اور ہر عمارت کو ایسے شوق سے بنوائے گویا اپنا گھر بنوا تا ہے۔

سرسید کی بنوائی ہوئی کالج کی ان عمارتوں کا حسن اس کی عظمت جلال اور سادگی میں ہے کہیں بھی اس کو آرائشی کام کے زیور سے لادا نہیں گیا ہے۔ صبح کا سہانا سماں ہو یا دوپہر کی چلچلاتی دھوپ یا شام کا جھٹپٹا ان میں سے کوئی اس کی عظمت کو متاثر نہیں کرتے لیکن ان عمارتوں کی اصل بہار دیکھنی ہو تو چاندنی رات میں دیکھیے جب رات کا سنّاٹا ہو، در و دیوار چاندنی میں نہائے ہوئے ہوں اس وقت ایسا محسوس ہوگا جیسے جوشِ ایثار، ہمت و عزم نے سنگِ سرخ اور خشتِ احمر کا پیکر اختیار کر لیا ہو۔ ان عمارتوں میں جہاں جس گوشے میں جائیے ہمیں اس کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارا ماضی ہمارے حال کا حصہ ہے۔ حالیؔ نے جب پہلی مرتبہ کالج کی عمارتوں کو دیکھا تو نظیریؔ کے الفاظ میں اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ؎

این کعبہ را بنا نہ بباطل نہادہ اند
صد معنیٔ جمال دریں گل نہادہ اند

> "ایڈیسن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ادب کو درباروں اور محلوں سے نکال کر قہوہ خانوں اور بازاروں تک پہنچا دیا۔ سرسید نے اردو ادب کو خانقاہ، دربار اور کوچہ و بام سے نکال کر دفتروں، تعلیم گاہوں اور متوسط طبقے کے دل و دماغ تک پہنچا دیا۔" (آل احمد سرور)

محمد عشرت حسین

ظہور وارڈ

(۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۴ء تک)

ظہور وارڈ ایک ہوسٹل کا نام ہے جو کہ سرسید احمد خاں کے رفیق و معتمد جناب ظہور حسین صاحب کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ظہور حسین صاحب کا تعلق مراد آباد سے تھا اور وہ ایک اونچے درجے کے ایڈوکیٹ تھے۔ کہتے ہیں اس ہوسٹل کی تعمیر میں ظہور حسین صاحب کا بہت بڑا حصہ تھا۔ ہوسٹل کا دروازہ ایک بڑی محراب کے اندر تھا۔ دروازہ کے اوپر لیکن محراب کے اندر "ظہور حسین وارڈ" کی تختی لگی تھی۔ محراب کے اوپر سنگ مرمر کی ایک اور تختی لگی تھی جس پر عربی میں "بیوت الاطفال الصغار" لکھا تھا یعنی چھوٹے بچوں کی رہائش گاہ۔

ظہور وارڈ میں داخلہ ملنا یونیورسٹی کے تمام ہوسٹلوں کے مقابلے میں دشوار تھا۔ اس ہوسٹل میں صرف دس رہائشی کمرے تھے جس میں سے ایک کمرہ ہاؤس ماسٹر کے لیے مخصوص تھا۔ ایک چھوٹا کمرہ (گیٹ کے مقابل) صرف دو بچوں کی رہائش کے لیے تھا۔ باقی کمروں میں چار چار بچے رہتے تھے۔ اس طرح مجموعی رہائشی گنجائش صرف ۳۸ بچوں کے لیے تھی۔ داخلہ کے لیے عمر کی قید بہت سخت تھی۔ یعنی نہ ۹ سال سے کم نہ ۱۲ سال سے زیادہ۔ ہر بچہ کو ۱۲ سال کی عمر پر پہنچتے ہی منٹو سرکل بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ عمل ہر سال تعلیمی سال کے آغاز پر کیا جاتا تھا۔ لہٰذا ہر سال کے شروع میں صرف اسے ہی نئے طالب علموں کو ظہور وارڈ میں داخلہ مل سکتا تھا جیسے ۱۲ سال کی عمر میں پہنچنے پر منٹو سرکل بھیجے جاتے یا کوئی طالب علم ذاتی ضرورت کے تحت ہوسٹل چھوڑ دے تو جگہ خالی ہو جاتی۔ رہائشی کمروں کی کمی کی وجہ سے ظہور وارڈ میں داخلہ محض اہلیت MERIT کی بنا پر ملتا تھا ظہور وارڈ کی فیس بھی اسکول اور یونیورسٹی کے دوسرے ہوسٹلوں کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔ ۱۹۴۱ء میں ظہور وارڈ کی فیس بیس روپیہ تھی جبکہ یونیورسٹی میں ان دنوں بائیس اور چوبیس روپیہ کے درمیان فیس ہوتی تھی۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نعیم الدین خاں صاحب ہاؤس ماسٹر تھے۔ بوٹا قد، چھوٹی سفید داڑھی جس میں کہیں کہیں ایک آدھ سیاہ بال بھی جھلکتا نظر آتا۔ نعیم الدین خاں صاحب کی صحیح عمر کا تو علم نہیں لیکن ایسا کہا جا سکتا ہے کہ چالیس کی دہائی کے شروع میں ۵۰-۶۰ کے پیٹے میں تھے۔ یونیورسٹی کی ملازمت سے فراغت کے بعد انھیں ظہور وارڈ میں ہاؤس ماسٹر کی حیثیت سے رکھ لیا گیا تھا۔ انھوں نے سرسید کا زمانہ دیکھا تھا اور کبھی کبھی بچوں کے اصرار پر سرسید کے زمانے کی باتیں سنایا کرتے۔ سرسید کا سوال تعمیر انھیں ازبر تھا۔ علی گڑھ کو ان کی آنکھوں نے درجہ بدرجہ ابھرتے دیکھا تھا۔ وہ جب کبھی علی گڑھ یونیورسٹی کی تعمیری تاریخ دہراتے تو آنکھوں میں ایسی چمک نمایاں ہوتی جیسے سرسید کی روح ان کے جسم میں اتر آئی ہو۔ ایک عجیب احساس طمانیت ان کے وجود میں عود کر آتا۔ نعیم الدین خاں صاحب نے اپنی ساری زندگی علی گڑھ کے لیے وقف کر دی تھی۔ باوجود اپنی پیرانہ سالی کے نعیم الدین خاں صاحب نہایت چاق و چوبند تھے۔ ہر روز نماز فجر کے بعد آدھا گھنٹہ JOGGING کے انداز میں دوڑ لگاتے۔ یوں تو بچوں کے ساتھ نہایت شفیق اور رحم دل لیکن ساتھ ہی نظم و ضبط کے معاملے میں بے حد سخت تھے۔ صبح صادق کے فوراً بعد ایک چکر کمروں کے باہر ہوسٹل کے برآمدے کا لگاتے جو اکثر جوگنگ کرتے ہوئے ہوتا اور برابر آوازیں لگاتے رہتے "اٹھتے جاؤ، اٹھتے جاؤ صبح ہو گئی" اگر کوئی بچہ اتفاق سے سوتا رہ گیا تو دوسرے چکر میں اسے باقاعدہ اٹھا کر کھڑا کر دیتے۔

رات کو بھی عمل دس بجے کے بعد روشنیاں بند کر دینے کے بعد ہوتا۔ اس چکر میں کہتے "سوتے جاؤ سوتے جاؤ" ہر دو آوازوں میں یعنی اٹھتے جاؤ اٹھتے جاؤ اور سوتے جاؤ سوتے جاؤ میں کچھ ایسا آہنگ تھا کہ بچے اپنی معصوم شرارت میں اکثر کہا کرتے کہ ماسٹر صاحب بھول کر رات کو اٹھتے جاؤ اور صبح کو سوتے جاؤ کہہ رہے ہیں۔ نعیم الدین خاں صاحب کا چالیس کی دہائی کے آخر میں علی گڑھ ہی میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان کے ایک صاحبزادے وسیم الدین خاں ان کے ساتھ ہی ظہور وارڈ میں رہتے تھے۔ وہ پاکستان ایئر فورس میں ونگ کمانڈر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مس قمر جہاں

مس قمر جہاں ظہور وارڈ کی انچارج یا پرنسپل کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن کہلاتی میٹرن تھیں۔ بچے ادب سے "میڈم" کہتے تھے۔ ظہور وارڈ کے ایک کونے میں ان کے لیے ایک رہائشی گھر بنا ہوا تھا جس میں وہ اپنے ایک بھائی اور بہن کے ساتھ رہتی تھیں۔ یہ دونوں بھائی/بہن یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ مس قمر جہاں نے شادی نہیں کی تھی لیکن وہ بچوں سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتی تھیں۔ ہر بچے کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت بھی اُن سے اوجھل نہ رہتی تھی۔ کھانے کے وقت اکثر وہ ڈرائنگ روم میں آتیں اور یہ اطمینان کرنے کے بعد وہاں سے جاتیں کہ ہر بچہ کھانا شوق سے تناول کر رہا ہے۔ نعیم الدین خاں صاحب کے مقابلے میں مس قمر جہاں ذرا کم ہی ہوسٹل کے اندر آتیں لیکن وہ جب بھی آتیں بچے انھیں میڈم میڈم کہہ کر گھیر لیتے اور اپنی اپنی ضرورتوں سے آگاہ کرتے جو وہ اکثر پوری بھی کرا دیتیں۔ مس قمر جہاں ظہور وارڈ کی میٹرن ہونے کے علاوہ "چھوٹے اسکول" کی ہیڈ مسٹریس بھی تھیں۔ "چھوٹے اسکول" کا درجہ پرائمری اسکول کا تھا جہاں پرائمری سے چوتھی جماعت تک کی کلاسیں ہوتی تھیں۔ پانچویں سے دسویں تک کی کلاسیں منٹو سرکل میں ہوتی تھیں۔ مس قمر جہاں نے جاپان سے مانٹی سوری MONTFSSORI کی تعلیم حاصل کی تھی جس کا وہ کبھی کبھی اظہار بھی کرتیں۔

پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء میں ہاکس بے HAWKS BAY پر وہ بحیرۂ عرب کی ظالم لہروں کی نذر ہو گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

منشی جی

ظہور وارڈ میں چونکہ کافی کم عمر بچے رہتے تھے اس لیے اُن کی مدد کے طور پر ایک منشی جی ملازم تھے جو ہر بچہ کے کپڑوں کا حساب رکھتے تھے۔ ہر ہفتہ دھوبی کو دُھلنے کے لیے کپڑے ان ہی کی وساطت سے دیے جاتے جن کو وہ باقاعدہ رجسٹر میں درج کرتے۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

جب دھوبی کپڑے دھو کر لاتا تو ہر بچے کے ساتھ مل کر منشی جی گنتی پوری کرا لیتے۔ پھر اگر کوئی بٹن ٹوٹ جاتا یا کسی کپڑے کو کھونٹا لگ جاتا تو اس کی مرمت کرنا بھی منشی جی کی ذمہ داری کا حصہ تھا۔ پھر ہر طرح سے دھلے ہوئے کپڑوں کو چیک کر کے فرداً فرداً ہر بچے کی الماری میں رکھ دیتے۔

نظام الاوقات

نظام الاوقات کی پابندی سی طرح بھی فوج کے ڈسپلن سے کم نہ تھی۔ صبح سے شام تک کی مصروفیات جیسے کسی مشین سے باہر نکلتی رہتیں۔ درمیان میں بہت تھوڑا وقت خوش گپیوں کے لیے ملتا۔ دن بھر کی بھرپور مصروفیات کے بعد رات کو بتی بند ہوتے ہی سب بچے گہری نیند سو جاتے۔ اول تو بچپن میں یوں بھی نیند زیادہ آتی ہے اس پر دن بھر کی تھکا دینے والی مصروفیات گویا سونے پہ سہاگہ۔

صبح صادق پر سب بچوں کو جگا دیا جاتا اور دن کی روشنی نمودار ہوتے ہوتے فجر کی نماز ادا کر لی جاتی۔ اس کے بعد پندرہ بیس منٹ کے لیے بچے PLAY GROUND یا باغ میں جا کر دوڑ لگاتے یا کوئی اور کسرت EXERCISE کرتے۔ وہاں سے واپس آ کر نہا دھو کر تیار ہو جاتے۔ تیاری کے بعد ہر بچہ کی فرداً فرداً یونیفارم چیک کی جاتی کہ پاجامہ قمیص دھلے ہوئے ہیں۔ شیروانی میں سلوٹیں تو نہیں ہیں، سر کی ٹوپی کا پھندنا تو نہیں ٹوٹا ہوا ہے۔ جوتے پہنے ہیں، جوتا پالش ہے (جوتا پالش کرنے کی ایک بیرے کی ڈیوٹی تھی) لباس کی چیکنگ CHECKING ہاؤس مانیٹر اور نعیم الدین خاں صاحب کرتے۔ کبھی کبھی یہ کام مس قمر جہاں بھی انجام دیتیں۔ بچوں کے تیار ہوتے ہوتے ناشتہ کی گھنٹی بج جاتی۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر اپنا اپنا بستہ لے کر چار چار، پانچ پانچ کی ٹولیوں میں بچے اسکول روانہ ہو جاتے۔ اسکول سے واپس آتے ہی کھانے کی گھنٹی بج جاتی۔ بمشکل اتنا وقت ملتا کہ بستہ کمرے میں رکھیں اور ہاتھ منہ دھو کر ڈائننگ روم پہنچ جائیں۔ کھانے کے فوراً بعد ظہر کی اذان ہو جاتی، ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر آدھا گھنٹہ قرآن شریف کی تلاوت کرتے اور جن کو عربی پڑھنا نہیں آتی تھی وہ مولوی صاحب سے قرآن پڑھنا

سیکھتے۔ قرآن کی تلاوت سے فراغت کے بعد ایک گھنٹے کا اسٹڈی ٹائم ہوتا تھا جس میں ڈائننگ روم میں بیٹھ کر ہوم ورک کیا جاتا۔ سردیوں میں دن چھوٹا ہو جانے کے سبب اسٹڈی ٹائم سہ پہر کے بجائے مغرب کی نماز کے بعد تبدیل ہو جاتا۔ اسٹڈی ٹائم کے بعد عصر کی نماز ہوتی اور اس کے فوراً بعد شام کی چائے۔ اس کے بعد کھیل کا لباس تبدیل کر کے پلے گراؤنڈ میں پہنچ جاتے۔ کھیلوں میں حصہ لینا لازمی تھا نعیم الدین خاں صاحب بہ نفس نفیس یہ دیکھتے کہ کوئی بچہ ہوسٹل میں نہ رہ جائے اور میدان میں جا کر کھیلوں میں حصہ لے۔ کھیلوں سے فارغ ہوتے ہی مغرب کی اذان ہو جاتی۔ جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے مسجد PRAYER ROOM پہنچتے اور مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد مولوی صاحب اور نعیم الدین خاں صاحب سے دین کے مسئلے مسائل سیکھتے۔ رات کی تاریکی پورے طور پر طاری ہو جانے پر رات کے کھانے کی گھنٹی بج جاتی۔ رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے کچھ دیر بعد نماز عشاء ادا کرنے اور یوں دیکھتے دیکھتے دن تمام ہو جاتا۔ چنانچہ اپنے اپنے کمروں میں پہنچ کر رات کا لباس تبدیل کرتے اور پھر اجازت تھی کہ کچھ دیر یا تو LIGHT READING کریں یا آپس میں گفتگو۔ رات کے دس بجے ہر بچے کو کمرے کی بجلی بند کر کے اپنے اپنے بستر میں لیٹ جانا ہوتا تھا اگر دس بجے کسی کمرے کی بجلی کھلی ہوتی تھی تو نعیم الدین خاں صاحب خود آ کر بند کر دیتے نظام الاوقات پر پابندی کی سختی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر نو وارد بچہ ایک ہفتے کے اندر اندر بغیر جھجھک کے اس پر عمل شروع کر دیتا تھا۔

چھوٹا اسکول

چھوٹا اسکول طہور ورارڈ (ہوسٹل) کی مشرقی جانب سڑک کے دوسری طرف واقع تھا اس میں انفینٹ (INFANT) سے چوتھی تک کی ابتدائی جماعتوں کی تعلیم ہوتی تھی۔ دراصل یہ پرائمری یا پریپریٹری (PREPARATORY) اسکول تھا۔ مس قمر جہاں اس اسکول کی ہیڈ مسٹرس تھیں۔ یہاں لڑکوں کے علاوہ لڑکیوں کو بھی داخلہ کی اجازت تھی جو زیادہ سے زیادہ تیسرے درجے تک اس اسکول میں تعلیم حاصل کریں پھر گرلس کالج کے اسکول میں تبادلہ کرا لیتیں۔ یہ بچیاں عام طور سے یونیورسٹی سے منسلک اساتذہ اور دوسرے ملازمین کی بچیاں تھیں جو کہ یونیورسٹی کیمپس ہی میں مقیم تھے۔

سہ ماہی فکر و آگہی (دہلی) علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

جو چھٹے درجے تک قاعدہ کے بعد تمام طالب علم بڑے اسکول یا منٹو سرکل منتقل ہو جاتے تھے۔ منٹو سرکل طہور وارڈ سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ درمیان میں متعدد ہاسٹلوں کے گراؤنڈس اور سائنس کے مختلف شعبے واقع تھے۔ جو بچے طہور وارڈ میں رہتے ہوئے منٹو سرکل پڑھنے جاتے انہیں روزانہ یہ فاصلہ پیدل طے کرنا ہوتا تھا۔ روزانہ صبح ناشتے کے بعد ٹولیوں کی شکل میں طہور وارڈ سے منٹو سرکل کے لئے روانہ ہوتے اور اسکول میں چھٹی کے بعد دوپہر میں تمام طہور وارڈ والے اکٹھے منٹو سرکل سے واپس آتے۔ واپسی کا سفر عجیب امید و بیم سے بھرپور اور دلچسپ ہوتا کیونکہ اس وقت تک بھوک لگی ہوتی۔ صبح کو خراماں خراماں جاتے ہوئے تقریباً بیس پچیس منٹ میں یہ سفر طے ہوتا جبکہ واپسی میں مشکل سے پندرہ منٹ میں طہور وارڈ پہنچ جاتے کیونکہ تیز تیز چلنے کی رفتار کبھی کبھی دوڑ میں تبدیل ہو جاتی۔ بہرحال اس کا خاص خیال رکھتے کہ کوئی ساتھی بچھڑ نہ جائے۔

چھوٹے اسکول میں دینیات کی باقاعدہ تعلیم تیسرے درجے سے شروع ہوتی۔ پہلے اور دوسرے درجے میں دینیات کے پیریڈ (PERIOD) میں انبیا کے قصے کہانیوں کی شکل میں سنائے جاتے۔ جبکہ بچوں کے لیے دینیات کا پیریڈ سب سے دلچسپ ہوتا۔

کھانا

طہور وارڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بیسیوں سے زیادہ ہوسٹلوں میں (انگلش ہاؤس کے علاوہ) وہ واحد ہوسٹل تھا جہاں کھانا سرسید کے لکھے نسخے کے مطابق نہیں ملتا تھا۔ یہاں کھانا نہ صرف عمدہ، صاف ستھرا اور لذیذ ہوتا تھا بلکہ بافراط بھی۔ اس کے علاوہ یہاں یونیورسٹی اور اسکول کے دوسرے ہوسٹلوں کے برعکس دن میں چار دفعہ کھانے کو ملتا تھا۔ یعنی صبح کا ناشتہ جس میں علاوہ توسٹ (یا علی گڑھ کے بسکٹ) مکھن، انڈا اور چائے کا ایک پیالہ (تقریباً ایک پاؤ) دودھ۔ دوپہر میں کھانے پر ایک گوشت کا سالن اور دال یا سبزی۔ سہ پہر میں نماز عصر سے پیشتر یا بعد میں چائے کے ساتھ علی گڑھ کے بسکٹ (پاپے) اور رات میں کھانے پر گوشت کا سالن اور کوئی دال یا سبزی۔ [illegible] کو دوپہر کے کھانے پر بریانی اور جمعہ کو رات کے کھانے پر کوئی میٹھا جس میں فروٹ

کریم بچوں کو سب سے زیادہ مرغوب تھی۔ پیر کی دوپہر کی بریانی اور جمع کی رات کے میٹھے کو علی گڑھ کی اصطلاح میں ویرائٹی (VARIETY) کہا جاتا تھا۔ جس کا بڑی شدومد سے انتظار رہتا۔ کھانے پر چپاتیاں اور نان گرم گرم ملتے۔

ڈائننگ ہال میں تین بڑی بڑی میزیں تھیں جن پر ۱۲-۱۴ بچوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ بعد میں ان کی جگہ چھوٹی میزیں لگادی گئی تھیں جن پر چار چار بچے بیٹھتے۔ کھانا تیار ہوتا تو بیرا گھنٹی بجادیتا۔ بچے ہاتھ دھوکر اپنی اپنی میز پر بیٹھ جاتے تو کھانا چن دیا جاتا۔ لیکن کوئی کھانا شروع نہیں کرتا۔ جب فوڈ مانیٹر یہ تسلی کرلیتا کہ ہر بچہ کے پاس کھانا پہنچ گیا تو وہ با آواز بلند بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتا، پھر سب کھانا شروع کرتے۔ اسی طرح کھانے کے اختتام پر کوئی بچہ اپنی جگہ چھوڑ کر باہر نہیں جاتا جب تک کہ فوڈ مانیٹر "الحمد للہ یا اللہ تیرا شکر ہے" نہ کہہ لیتا۔ کھانے کے دوران اکثر مس قمر جہاں یا نعیم الدین خاں صاحب اچانک آجاتے۔ وہ کھانے کے معیار کے علاوہ بچوں کے آداب طعام پر بھی خاص نظر رکھتے تو ضرورت ہوتی تو اُن کی اصلاح بھی کردیتے۔ جن لوگوں کو ظہور وارڈ کے علاوہ منٹوسرکل اور یونیورسٹی کے ہوسٹلوں میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا انھیں ہمیشہ ظہور وارڈ کا کھانا بہت یاد آتا۔ ظہور وارڈ میں کھانا صرف ڈائننگ ہال میں ملتا کمروں میں کھانا کھانے کا بالکل دستور نہ تھا۔

نماز

ڈائننگ روم سے ملحق کمرہ پریئر روم (PRAYER ROOM) تھا جس میں باقاعدہ پانچ وقت کی نماز ادا کی جاتی سوائے جمعہ کی نماز کے جو صرف یونیورسٹی کی جامع مسجد میں ہوتی تھی۔ نماز پڑھانے کے لیے ایک مولوی صاحب تھے جو پانچ وقت کی نماز پڑھانے کے علاوہ ظہر کی نماز کے بعد آدھا گھنٹہ قرآن اور قرأت کی تعلیم دیتے۔ بعض ایسے بھی بچے آتے جنھوں نے قرآن بالکل نہ پڑھا ہوتا۔ ایسے بچوں کو عربی قاعدہ سے قرآن کی تعلیم شروع کی جاتی۔ عام طور سے بچے دس سال کی عمر پہنچنے تک قرآن ختم کرلیتے۔ قرأت کا باقاعدہ سالانہ امتحان اور مقابلہ ہوتا جس کا اہتمام یونیورسٹی کی جامع مسجد میں ہوتا۔ قرأت کے امتحان میں کامیاب ہونے والے بچوں کو یونیورسٹی کی طرف سے سند ملتی۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سینیر (SENIOR) بچوں میں سے ایک بچہ کو پریر مانیٹر (PRAYER MONITOR) مقرر کر دیا جاتا تھا جس کا کام پریر رجسٹر میں نماز کے بعد بچوں کی حاضری لگانا تھا۔ اس کے علاوہ پریر مانیٹر یہ بھی دیکھتا تھا کہ سب بچے نماز سے پہلے وضو کر رہے ہیں یا نہیں؟ نماز کے لیے اذان بھی عام طور سے پریر مانیٹر ہی دیتا تھا یا اس کے لیے وہ کسی دوسرے بچے کی ڈیوٹی لگا دیتا۔ یہ کام باری باری تمام بچوں سے لیا جاتا لیکن ٹھہرائے بچوں کے سپرد کر دیا جاتا جو خوش الحان ہوتے اور اونچی آواز سے اذان دے سکتے۔ اسی طرح کبھی کبھی مولوی صاحب امامت بھی بچوں ہی سے کرالیتے یا کسی وجہ سے مولوی صاحب نہ آسکتے تو وہ امامت کی ذمہ داری پریر مانیٹر یا کسی دوسرے بچے کے سپرد کر دیتے۔ اس تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ ظہور وارڈ کا تعلیم یافتہ طالب علم زندگی کے باقی سفر میں ضرورت پڑنے پر امامت بھی کر لیتا اور مؤذن بھی بن سکتا تھا۔ ایک اور اہم چیز یہ بھی کہ نماز میں کسی کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ سب ایک ساتھ باجماعت نماز پڑھتے تھے۔ صرف اتنا فرق ضرور تھا کہ شیعہ بچے اپنے رواج کے مطابق ہاتھ باندھ کر نہیں بلکہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے تھے۔

ظہور وارڈ کی زندگی اس قدر نظم و ضبط میں ڈھلی ہوئی تھی کہ کسی بچہ کا نماز سے غیر حاضر ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ پھر بھی اگر کوئی بچہ بغیر کسی قابلِ قبول عذر کے غیر حاضر ہوتا تو فی نماز ایک آنہ جرمانہ ہوتا جو اسے اپنی پاکٹ منی سے ادا کرنا ہوتا۔ جرمانہ کا مقصد اور روح بچہ کی جیب پر بوجھ ڈالنا تھا نہ کہ والدین کی جیب پر۔ اس لیے جرمانہ اس کی پاکٹ منی سے مہیا کر لیا جاتا۔ پاکٹ منی کے متعلق بھی یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وہ فیس کا حصہ ہوتی تھی جو کہ والدین ہر ماہ کے شروع میں ہوسٹل کی انتظامیہ کو ادا کر دیتے تھے اور پھر ہاؤس ماسٹر اس کو بچوں میں ہر ہفتہ تقسیم کر دیتے تھے۔ والدین کو براہ راست اپنے بچوں کو پاکٹ منی دینے کی اجازت نہیں تھی اس طرح تمام بچوں کو ایک برابر پاکٹ منی ملتی تھی۔ کسی کو کم یا زیادہ کا سوال نہیں تھا۔ یوں بچپن سے مساوات کا بھی سبق مل جاتا تھا۔ چالیس کی دہائی کے شروع میں چار روپیہ مہینہ پاکٹ منی مقرر تھی۔ جو اس زمانے کی ضروریات کے لیے بہت کافی تھی۔ نماز کے جرمانہ سے جو رقم جمع ہوتی تھی وہ بچوں کے مشورے اور اجازت سے کسی نیک کام پر خرچ کر دی جاتی۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

رمضان

رمضان کے مہینے میں سب ہی بچے روزے رکھتے گو چھوٹے بچوں کے لیے (۱۰ سال کی عمر والے) روزہ رکھنے کی پابندی نہ تھی لیکن شاذونادر ہی کوئی بچہ روزہ چھوڑتا۔ سحری اور افطار کا باقاعدہ اہتمام ہوتا اور عشاء کے ساتھ صلوٰۃ تراویح بھی پڑھی جاتی۔

کھیل

کھیلوں میں حصہ لینا ہر بچہ پر لازم تھا۔ نعیم الدین خاں صاحب ہوسٹل میں چکر لگا کر دیکھتے اور اگر کوئی بچہ رہ گیا ہوتا تو اسے فوراً ساتھ لے کر گراؤنڈ میں بھیج دیتے۔

دو ٹیمیں ساکر ہاکی یا فٹ بال کھیلتے اور کچھ بچے کرکٹ کی پریکٹس کرتے۔ جمعہ کی چھٹی میں اکثر کرکٹ کے میچ کھیلے جاتے غرض عصر اور مغرب کی نمازوں کے درمیان کھیل کے دوران اتنا بھاگتے کہ پسینہ پسینہ ہو جاتے۔ جن بچوں کو اتھلیٹکس (ATHLETICS) کا شوق ہوتا تو ان کو اس کی ٹریننگ دی جاتی۔ کھیلوں کی ٹریننگ اور پریکٹس کے لیے ایک الگ کوچ (COACH) تھے جو کھیل کے میدان میں موجود رہتے۔

خود کھیلنے کے علاوہ طہور وارڈ کے بچوں کا ایک دلچسپ مشغلہ یونیورسٹی کی ہاکی، کرکٹ اور فٹ بال کی ٹمور کے میچوں میں یونیورسٹی کی ٹیم کو بیک اپ کرنا اور مخالف ٹیموں کو ہوٹ کرنا تھا۔ یہ عمل ایسا انگیز تھا کہ طہور وارڈ کے بچے اس کام کے لیے بطور خاص بلائے جاتے تھے۔ اسٹریٹجی (STRATEGY) یہ ہوتی تھی کہ مخالف ٹیم کے گول پوسٹ کے پیچھے اور اس کے آس پاس بچے جمع ہو جاتے اور گول کیپر اور دوسرے کھلاڑیوں کو وہاں سے مسلسل ہوٹ کرتے رہتے۔ گول کیپر یا دوسرے کھلاڑی جتنا چڑھتے اتنا ہی زیادہ ہوٹ کیے جاتے۔ دہدنی سماں وہ ہوتا جب مخالف ٹیم پر گول ہو جاتا۔ دوسرے تماشائی تو تالیاں بجاتے پر طہور وارڈ کے بچے ٹوپیاں اچھالتے۔ یاد رہے کہ یونیورسٹی کی یونیفارم میں ترکی ٹوپی ایک اہم حز تھی۔ جب ٹوپیاں اچھالی جاتیں تو اکثر ان کے پھندنے ٹوٹ جاتے۔ لہٰذا ٹوپیاں اچھالتے وقت بچوں کا ایک ہاتھ اپنے سر پر اپنی ٹوپی بچانے کے لیے ہوتا اور دوسرے ہاتھ سے برابر والے بچے کی ٹوپی اتار کر اچھال دی جاتی۔ غرض ایک ہنگامہ ہوتا اور فضا میں ٹوپیاں

ہی ٹوپیاں اور پھندے عجیب کیفیت پیدا کر دیتے۔ ہنگامہ دراصل ٹوپی ٹوٹنے اور پھندنوں کی تلاش ہوتی۔ ٹوپیاں تو آسانی سے مل جاتیں۔ پھندنے کھیل ختم ہونے پر کھیل چھٹنے کے بعد ہی دستیاب ہوتے۔ واپس ہوسٹل پہنچ کر ٹوپی اور پھندنا مسٹر حق کی نذر کیا جاتا جو برا بھلا کہہ کر بہرحال اسے ٹانک دیتے میچ کے خاتمے پر اسی ہم وا۔ تمام بچوں کی پھلوں اور کیک پیسٹری سے تواضع کرتے

بڑے بھائی بہنوں سے ملاقات

اگر کسی بچے کے بڑے بھائی اسکول یا یونیورسٹی میں تعلیم پا رہے ہوں تو بچے والوں کو یہ سہولت بھی تھی کہ چھوٹے بھائیوں سے آکر فرصت کے اوقات میں مل لیں۔ بشرطیکہ ان بڑے بھائیوں یا رشتہ داروں کے نام بچے کے والدین نے ملنے والوں کی فہرست میں درج کرائے ہوں۔ بچوں کو صرف جمعہ کے دن سہ پہر میں جا کر بڑے بھائی بہنوں سے ملنے کی اجازت تھی۔

یونیورسٹی ایکٹیویٹیز

یونیورسٹی ایکٹیویٹیز سے ظہور وارڈ کے بچوں کا کوئی واسطہ نہ تھا مثلاً نہ یہاں اسٹوڈنٹس نائٹ ہوتی تھی، نہ عصرانہ پارٹی، نہ الیکشن کا ہنگامہ البتہ مڈرائٹ ضرور کھیلی جاتی جس کی پیشگی اجازت لینی ہوتی تھی۔

باغ

ظہور وارڈ ہوسٹل کا اپنا ایک باغ بھی تھا جو اس کے بڑے دروازے MAIN GATE کے بالمقابل سڑک کے پار واقع تھا۔ بچوں کو جب فرصت ہوتی اس باغ میں جانے کی اجازت تھی۔ یعنی باغ میں جانے پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ پابندی تھی تو صرف پھول توڑنے پر۔ یہ باغ تقریباً سو سوا سو فٹ مربع شکل میں تھا۔ گو اس باغ میں عام قسم کے پودے اور درخت تھے لیکن فرصت کے اوقات میں یہ بڑا پُرفضا نظر آتا تھا اور بچے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں دس گیارہ کرکے نظر آتے

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

چھٹیاں

تعلیمی سال یونیورسٹی میں جولائی کے دوسرے ہفتہ کے آغاز سے شروع ہوتا تھا اور اپریل کے اواخر میں ختم ہوتا تھا۔ تدریسی سال کے درمیان میں دس بارہ دن کی دو دفعہ چھٹیاں ہوتی تھیں پہلی اکتوبر کے اوائل میں اور دوسری دسمبر کے آخری ہفتہ سے لے کر جنوری کے پہلے ہفتہ تک۔ زیادہ تر بچے ان چھٹیوں میں اپنے اپنے گھر چلے جاتے تھے۔ علاوہ ان کے جن کے گھر دور دراز علاقوں میں واقع تھے اور آنے جانے میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ چھٹیوں کا بڑی بے تابی سے انتظار رہتا تھا۔ ان چھوٹی چھٹیوں کی خاص بات یہ تھی کہ جہاں ایک طرف والدین اور عزیز و اقارب سے ملنے کی خوشی ہوتی تھی وہاں یہ چھٹیاں بہت تیزی سے گذر جاتی تھیں۔ لہٰذا بچے گھر والوں سے ملاقات کے بعد تازہ دم ہو کر پھر اپنے معمول پر آجاتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں کا بھی جو کہ دو سوا دو ماہ کی ہوتی تھیں بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ اس انتظار کی خوشی دوبالا یوں ہوتی تھی کہ ایک طرف تو گھر جانے کی خوشی اور دوسری طرف سال کے اختتام پر اگلے درجہ میں جانے PROMOTION کی مسرت۔ یہ خوشیاں بہر حال فطری تھیں۔ لیکن حیران کن خوشی بچوں کو اس وقت ہوتی تھی جب اسکول کھلنے کے دن قریب ہوتے تھے۔ علی گڑھ کی ہوسٹل کی زندگی میں اس قدر جاذبیت تھی کہ نئے سال کے آغاز پر علی گڑھ جانے کی اتنی ہی خوشی ہوتی تھی جتنی کہ چھٹیوں کے شروع میں گھر جانے کی۔ غرض چھٹیاں شروع ہونے سے پہلے اپنے اپنے گھر جانے کی خوشی میں ان کا انتظار رہتا اور چھٹیوں کے اختتام سے پہلے ہوسٹل جانے اور دوستوں سے ملنے کی آرزو اس خوشی کو دوبالا کر دیتی۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۵۲۳

محمد عشرت حسین

منٹو سرکل

(زمانہ ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۸ء)

مسلم یونیورسٹی اسکول لارڈ منٹو (جو ہندوستان کے وائسرائے تھے) کے نام سے موسوم تھا۔ ایک بہت بڑے دائرہ کے باہر چار عمارتیں تھیں جو ایک دوسرے سے قوس (Arc) کی شکل کی ایک اونچی فصیل کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔ اس فصیل کو سرورق کی تصویر میں منٹو سرکل کے صدر دروازہ سے ملحق دیکھا جاسکتا ہے۔ اسطرح چاروں عمارتیں مل کر ایک قلعہ کی مانند تھیں۔ ہر عمارت سائز (Size) میں برابر اور انگریزی کے حرف یو کی شکل (U Shape) میں سی ہوئی تھی۔ ان عمارتوں کے نام منٹو اے (A)، منٹو بی (B)، منٹو سی (C) اور منٹو ڈی (D) تھے۔ ان عمارتوں میں صرف منٹو بی (B) دو منزلہ تھی باقی تینوں ایک منزلہ تھیں۔ منٹو بی (B) کی دوسری منزل اور منٹو اے تدریسی جماعتوں کے لئے مخصوص تھیں جبکہ منٹو سی (C)، منٹو ڈی (D) اور منٹو بی (B) کی پہلی منزل رہائشی ہوسٹل تھے۔ ہر عمارت میں آمنے سامنے دو ہوسٹل تھے۔ اس طرح منٹو سرکل میں کل چھ ہوسٹل تھے۔ تدریسی جماعتیں پانچویں سے دسویں درجہ یا میٹرک تک تھیں۔ پانچویں سے آٹھویں جماعتوں تک ہر جماعت کے دو سیکشن (Section) تھے۔ نویں اور دسویں جماعت کے تین تین سیکشن تھے۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ہر سیکشن میں تقریباً ۲۵ طالبعلم تھے۔ اس طرح پورے منٹو سرکل میں تقریباً پانچ سو طالبعلم تعلیم پاتے تھے۔ ہر ہوسٹل میں بارہ کمرے تھے۔ کمرہ نمبر ایک، ایک بیڈروم اپارٹمنٹ کی مانند تھا۔ جس میں ایک بیٹھنے کا کمرہ، ایک سونے کا کمرہ اور ایک باتھ روم تھا۔ یہ اپارٹمنٹ وارڈن صاحب کے لئے مخصوص تھا جو اساتذہ ہی میں سے ہوتے تھے۔ کمرہ نمبر ۲ پینٹری (Pantry) تھا۔ جس میں صبح کا ناشتہ تیار ہوتا تھا اور جب کبھی ڈائننگ ہال میں کھانا نہیں ہوتا تھا تو خوانوں میں لگ کر کھانا پینٹری (Pantry) میں آجاتا تھا جہاں سے ہر طالبعلم کو اس کے کمرے میں پہنچادیا جاتا تھا۔ کمرہ سر چھ اور دس کے پیچھے چھوٹے دو دو کمرے تھے جو بیک روم (Back Room) کہلاتے تھے اور سینئیر (Senior) لڑکوں کو دیئے جاتے تھے۔ ان کمروں کا ملنا (Allotment) بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

منٹو بی (B)، منٹو سی (C) اور منٹو ڈی (D) کے ہر دونوں ہوسٹلوں کے درمیان ایک بڑا ہال تھا جو منٹو بی (B) میں مسجد کے طور پر استعمال ہوتا تھا، منٹو ڈی (D) میں ڈائننگ ہال اور اسکول کی تقریبات (Functions) کے لئے اور منٹو سی (C) میں کامن روم (Common Room) کی حیثیت سے، جہاں انڈور گیمس (Indoor Games) اور اخبار رسالے وغیرہ میسر ہوتے تھے۔ منٹو اے (A) کا درمیانی ہال سائنس لیبارٹری کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

ہر ہوسٹل میں تقریباً چالیس پینتالیس طلباء کی رہائش کی گنجائش تھی۔ اسطرح منٹو سرکل کے چھ ہوسٹلوں میں سب ملاکر تقریباً ڈھائی پونے تین سو طالبعلم رہائش پذیر ہوتے تھے۔ منٹو سی (C) اور منٹو ڈی (D) میں نماز کے لئے اپنے اپنے درمیانی ہال کے اوپر دوسری منزل پر کمرہ بنا ہوا تھا۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

منٹو سرکل کے اندر صدر دروازے (Main Gate) سے داخل ہونے پر، سڑک کی شکل میں ایک بہت بڑا دائرہ تھا۔ یہ سڑک کُٹی ہوئی روڑی سے بنائی گئی تھی جس پر ہر قسم کی سواریاں یکے، تانگے، سائیکل، رکشے اور موٹر گاڑیاں چلتی تھیں۔ سڑک کے کنارے ذرا فاصلہ سے دو رویہ اشوک کے درخت لگے ہوئے تھے جن کی خوبی یہ تھی کہ سال بھر ہرے بھرے رہتے تھے۔ گول دائرہ والی سڑک، چاروں عمارتوں تک جانے کے کام آتی۔ صدر دروازہ (Main Gate) منٹو اے (A) اور منٹو سی (C) کے درمیاں واقع تھا۔ صدر دروازے سے سڑک باہر نکل کر یونیورسٹی کے سائنس کے شعبہ جات (Science Departments) کی سمت چلی جاتی تھی اور آگے چل کر وی۔ ایم ہال (V. M. Hall) سے آنے والی پختہ سڑک میں مل جاتی تھی۔ منٹو سرکل کے صدر دروازہ سے وی۔ایم۔ ہال کی پختہ سڑک تک کا ٹکڑا بھی روڑی ہی کا تھا۔

منٹو سرکل کے اندر منٹو اے (A) اور منٹو (B) کی عمارتیں آمنے سامنے واقع تھیں۔ اسی طرح منٹو سی (C) اور منٹو ڈی (D) کی عمارتیں آمنے سامنے تھیں۔ منٹو اے (A) سے منٹو بی (B) کو ملانے کے لیے ایک سیدھی سڑک دائرہ والی سڑک کے اندرونی حصّہ میں واقع تھی۔ یہ سڑک بھی کُٹی ہوئی روڑی سے بنائی گئی تھی۔ لیکن یہ سیدھی سڑک قدرے تنگ تھی۔ اس پر سواریوں کا استعمال (علاوہ سائیکل کے) نہیں ہوتا تھا۔ یہ سڑک طلباء کے کلاسوں کو پیدل آنے جانے کے کام آتی تھی۔ اسی طرح منٹو سی (C) اور منٹو ڈی (D) کی عمارتوں کو ایک سڑک ملاتی تھی۔ اس طور پر منٹو سرکل کی اندرونی سڑک والا دائرہ چار برابر کے حصوں میں (Quadrants) میں تقسیم تھا۔ ہر کواڈرینٹ (Quadrant) بذات خود اتنا بڑا تھا کہ اس میں

جمال پور

ڈائننگ ہال
مسجد
پی ٹی گراؤنڈ
بیڈمنٹن کورٹس
والی بال کورٹس
ٹینس کورٹس
فصیل
کنواں
سائنس لیبارٹری
کامن روم
گیٹ
کھیل کے میدان
وی ایم ہال کی سڑک

ے ایک میں ٹینس کورٹس (Tennis Courts)، دوسرے میں بیڈمنٹن کورٹس (Badminton Courts)، تیسرے میں والی بال کورٹس (Volleyball Courts) اور چوتھے پر پی۔ ٹی (Physical Training) کی کلاسیں ہوتی تھیں۔ غرض پورے منٹو سرکل کو بڑی خوبی سے رہائشی ضرورت اور کھیلوں کیلئے استعمال میں لایا جاتا تھا۔

منٹو اے (A) سے منٹو بی (B) اور منٹو سی (C) سے منٹو ڈی (D) کو ملانے والی نسبتاً تنگ سڑکوں کے کنارے چھوٹے پودے (Bushes) لگے ہوئے تھے اور اس کے علاوہ کیاریوں میں موسمی پھول لگائے جاتے تھے۔

طہور وارڈ کے باغ کی طرح یہ چاروں کواڈرینٹس (Quadrants) بھی ملحقہ ہوسٹل کے لیے باغ کی ضرورت بھی پوری کرتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں طلباء اکثر یہاں چہل قدمی کرتے یا بیٹھے ہوئے خوش گپیوں میں مشغول نظر آتے۔ اس طرح سے منٹو سرکل ایک خود کفیل (Self-contained) قلعہ کی طرح تھا۔

منٹو سرکل کی چاروں عمارتیں ایک دوسرے سے قوس کی شکل کی ایک اونچی فصیل سے ملی ہوئی تھیں۔ ہر دو عمارتوں کے درمیان فصیل کے بیچ میں ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ یہ چھوٹے دروازے عام طور سے بند رہتے تھے۔ لیکن کبھی کبھار جب کسی وجہ سے کھیل نہ ہوتے تو انھیں تھوڑی دیر کے لئے شام کے وقت کھول دیا جاتا تھا مثلاً برسات میں جب کھیل کے میدانوں میں پانی بھر جاتا یا سالانہ امتحانوں سے پہلے جب کھیل بند کردئیے جاتے تھے۔ منٹو بی (B) اور منٹو ڈی (D) کے درمیان والے دروازہ سے گذر کر اکثر لڑکے کھیتوں میں چہل قدمی کے لئے چلے جاتے اور ملحقہ گاؤں جمال پور کے باسیوں سے گپ شپ کرکے واپس آجاتے۔

طہور وارڈ اور یونیورسٹی کے دوسرے ہوسٹلوں کی طرح منٹو سرکل میں پانی پہنچانے کا نظام نلوں کے ذریعے نہیں تھا۔ یہاں پانی

کنوؤں سے آتا تھا جو بھشتی مشکوں میں لے کر آتے تھے۔ منٹو بی(B) اور منٹو سی(C) کو ملانے والی فصیل کے باہر کی جانب ایک کنواں تھا جس میں پانی نکالنے کے لئے رہٹ لگا ہوا تھا۔ یہ پانی گرمیوں میں قدرے سرد اور جاڑوں میں ہلکی حرارت لیے ہوتا تھا اور پینے میں شیریں۔ سردی، گرمی ہر موسم میں عموماً ہر لڑکا صبح کو غسل کرتا تھا اس لیے صبح کے وقت سقّوں پر کام کا زور زیادہ ہوتا تھا۔ عام طور سے تو لڑکے سردیوں میں بھی کنویں کے تازہ پانی سے نہانا پسند کرتے لیکن صبح کے وقت گرم پانی کا بھی انتظام رہتا۔ پانی گرم کرنے کا نظام بھی بڑا انوکھا تھا۔ مٹی کے چار بڑے بڑے مٹکوں کو ساتھ رکھ کر اُن کے گرد اور اوپر اینٹوں سے چوکور چبوترہ بنا دیا جاتا۔ اس چبوترے میں نیچے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے موکھلے چھوڑ دیے جاتے۔ جن کے ذریعہ لکڑی اندر ڈال کر آگ جلا دی جاتی۔ چبوترے کے اوپر مٹکوں کے منہ جتنے سوراخ ہوتے، جنھیں مٹی کے رکابی نما ڈھکنوں سے ڈھک دیا جاتا اور جب گرم پانی نکالنے کی ضرورت ہوتی تو ڈھکن اُٹھا کر کسی برتن سے نکال لیا جاتا تھا۔

ماخوذ ۔ علیگڑھ کی تربیت گاہ اول ۔

ریڈیکل

کچّی بارک

مثل مشہور ہے کہ" جھونپڑوں میں رہنا اور خواب محلوں کے"۔ چنانچہ رہتے تو ہیں کچّی بارک میں مگر کہیں گے یہی کہ ہم ایس ایم کورٹ میں رہتے ہیں کیونکہ کچی بارک کا لفظ زبان پر لانا کسرِ شان اور ذاتی ہتک خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ جن کمروں کے مجموعوں کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً ہر طرح سے ان عمارت کے ہم پلّہ اور برابر ہیں جن میں کہیں کے سپاہی یا باڈی گارڈ کے جوان پہرہ دیا کرتے ہیں اور بابو گڑھ کے ان اصطبلوں سے جن میں گھوڑے آرام کیا کرتے ہیں کسی طرح کم نہیں ہو سکتے چنانچہ اثباتِ تشبیہ کے لیے جہاں کچی بارک کا کچا نقشہ نگاہ کے سامنے آیا فوراً اشک دور اور شبہ کافور ہوا اور بہر بھائی منزل پر چڑھتے ہی مغرب کے سمت ذرا نظر اٹھائی تو اول کھپریل نظر آئی جو کہیں سے سرخ اور کہیں سے زمردی ہے گویا کہ اس میں بھی کوئی خاص کاریگری ہے؛ پھر کمروں کے سامنے نیم کے درختوں کی ایک قطار ہے جس سے بارک میں عجیب دلق اور بہار ہے ذرا اور پیچھے نگاہ دوڑا لیتے تو تین پگڈنڈیاں دکھائی دیں گی جن کو اگر کچی بارک کی گرینڈ ٹرنک روڈز . . . . کہا جائے تو بجا ہے کیونکہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں بلکہ کچی بارک کا میدان انھیں سے سجا ہے "مرلی منزل" کے سامنے (جس کو اصطلاحِ کالج میں چیتا آفس کہتے ہیں) ان پگڈنڈیوں کا اتصال ہوتا ہے

جہاں پر علی الصباح طلبا رکا ایک انبوہ کثیر اور جم غفیر نظر آتا ہے اور اکثر اصحاب لوٹا یعنی بدھنا ہاتھ میں لیے اس کے سامنے پیچ و تاب کھاتے ہیں کیونکہ تمام کوٹھیاں پُر ہوتی ہیں اور امیدواروں کی زبان سے "کوئی۔۔۔۔ خالی نہیں" کی صدا گشت لگاتی رہتی ہے جس سے باہر کھڑے رہنے والوں کو ایک گونہ بے قراری اور اضطراب ہوتا ہے۔ یہ بیچارے مجبوری اور بیکسی کی صورت بنائے ادھر اُدھر ٹہلتے رہتے ہیں کبھی تو فرش پر پاؤں مارتے ہیں اور کبھی بیت الخلاء کی دیواروں کو کھٹکھٹاتے ہیں اور کوٹھی کے خالی ہوتے ہی مصیبت زدہ امیدوار نمبر وار داخل ہونے لگتے ہیں و ہمچنیں مسلسل۔

برسات کے موسم کا سین بھی قابلِ تحسین ہوتا ہے۔ کچی بارک کا صحن جو بفضلہٖ تعالیٰ کسی قدر نشیب میں واقع ہوا ہے بارش ہونے پر پانی سے لبالب بھر جاتا ہے اور برسات کی خودرو مخلوق یعنی مینڈک بھی ساتھ ساتھ آ ٹپکتے اور جگہ بہ جگہ اس حیوانی جھیل میں جو نفاست و وسعت میں سانبھر جھیل سے مقابلہ کرتی ہے جا بجا پھدکتے اور غوطہ لگاتے نظر آتے ہیں۔ اور بہ ہنگام شب یعنی رات کے وقت عجیب و غریب نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ ان کی غیں غیں کی آواز سے ناک میں دم آجاتا ہے اور شب کا آرام حرام ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں بارش کے دنوں میں ایک اور منظر بھی قابلِ دید ہوتا ہے۔ یعنی کچی بارک کا میدان آبِ باراں سے لبریز ہوتا ہے اور یہاں کے باشندوں کو "مرلی منزل" جانے کی ضرورت پیش ہوتی ہے تو بیچارے مصیبت کے مارے ایک ہاتھ میں تو لوٹا اور دوسرے ہاتھ میں کسی مہذب انسان کی طرح پاجامے کے پائینچے اوپر اٹھائے اور شانۂ مبارک سے چھتری لگائے سرپٹ کرتے چلے جاتے ہیں اور نہایت ہی ناپ تول کر قدم رکھتے ہیں کہ کہیں پاؤں پھسلتے ہی بیچارے نیچے نہ آجائیں اور دیگر حضرات ان کی طرف قہقہہ لگائیں۔

خیر! اب اس سے بھی زیادہ پُر لطف اور قابلِ رحم حالت ملاحظہ ہو۔

جس وقت اندھیرا گھپ ہوتا ہے اور ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا عالم چھا جاتا ہے اور اِس سرے سے اُس سرے تک جملہ اصحاب اپنی اپنی چارپائیوں

یلے قطار میں ہاتھ پاؤں پھیلائے بے خبر سوتے ہیں اور باران رحمت یکبارگی نزول
ماتے تو چار پائیاں کھٹا کھٹ برآمدے میں داخل ہو جاتی ہیں لیکن حسب بارش
بوچھار یہاں بھی چین نہیں لینے دیتی تو دفعتاً کمروں میں جا گھسی ہیں۔ اب ملپ روشنی
اندھیرے موسلا دھار مینہ یہاں بھی کھپریل میں چھن چھن کر آنے لگا۔ ایک کونے سے آواز
ں "ٹپ ٹپ" دوسرے گوشے میں چارپائی سرکائی تو وہاں بھی پانی کے چھینٹے آنے
لگے۔ اب بکس وغیرہ ہٹا کر میز پر رکھا اور پلنگ بیچ میں کھینچا! بھئے وہ میز پر بھی دھار
نے لگی"۔ "الہی یہ کیا آفت ہے"، وہاں سے سب چیزیں الگ کیں اور پلنگ پر
ھٹر خود چھاتہ لگا کر بیٹھ گئے۔ گویا چوڑیالے کے اسٹیشن پر مال گودام کی حفاظت کر رہے
ں۔ خدا خدا کر کے رات کٹی، صبح ہوئی، دماغ کو تعفونت اور دل کو تسکین ہوئی مینہ تھما
ا ندھیرے کھنگڑ کو جائے مقررہ پر آراستہ کیا اور شب کے ہارے تھکے ذرا دیر کو سو گئے۔ کوئی
بکار نا ہے تو کہتے ہیں ؎

بھائی چھیڑو نہیں رہنے دو کمرے میں پڑا ہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را

سورج نکلا اور دن چڑھا تو کوئی پائنچے چڑھائے ننگے سر پھر رہا ہے اور کوئی بیچارہ
جس نے رات کو زیادہ مصیبت اٹھائی تھی لکھنؤ کی رولی دار واسکٹ پہنے پھٹے بانس کی
طرح بول رہا ہے کوئی کہتا ہے کہ "کھانے کی ٹلی بج گئی چلو ڈائننگ ہال" غرضیکہ مختلف
نوازیں اور طرح طرح کے لباس یعنی لنگیاں۔ شرعی اور پنجابی پاجامے نظر آتے ہیں مگر
ڈائننگ ہال جانے کی ہمت کہاں، بسکٹ وسکٹ کھائے اور پیٹ بھر لیا۔ اللہ اللہ
خیر صلا! جانے کی مصیبت سے چھوٹے۔

اب ہم ناظرین کی ظرافتِ طبع کے لیے کسی ایک کمرہ کا فوٹو کھینچتے ہیں۔ یوں تو یہاں
کے اکثر کمرے رشکِ فردوس بریں اور نگار خانۂ چین بنے ہوئے ہیں مگر بعض کمرے
بالکل مختلف ہیں جو رشک مسافر خانہ اور ویٹنگ روم سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ آئیے
ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی ہم تو ایک چارپائی پر بیٹھے ہیں جو ایک گوشہ میں بچھی ہوئی
ذرا سی بوجھ سے چوں چوں کرتی ہے اور آپ اس اکیلی کرسی پر تشریف رکھئے جس کا پشتہ
ندارد ہے۔ سب سے پہلے ہماری نظر اس میز پر پڑتی ہے جو ایک کونے میں کھڑی ہوئی
ہنڈولے کی طرح ہل رہی ہے، یا کسی مریض کے مانند لڑکھڑا رہی ہے۔ میز کے اوپر ایک

نوسی لیمپ رکھا ہوا ہے جو غالباً اس وقت کا ہے جب کہ مسٹر ٹوٹے صاحب الہام پی
تاریکی میں اندھیرا کرنے والے لیمپ ایجاد کیے تھے اور ہمارے دوست کے اجداد میں سے
ن کی مغفرت کرے کسی نے اس کو عجوبہ آباد سے خرید لیا تھا اب وہ ہمارے دوست
لہ پدری میں ہاتھ آیا ہے اور رات کو اچھا خاصا کام دیتا ہے۔ ذرا آپ کا ٹرنک بھی ملاحظہ
و اوپر سے پچکا ہوا ہے اور جس کا روغن تمازت آفتاب کے باعث کہیں کہیں سے
ل اڑ گیا ہے۔ مگر یہ الفاظ کہ "میدانِ افریقہ" یعنی افریقہ کی ساخت پورے طور پر نظر
ہیں۔ ہاں لیجیے ذرا حقہ بھی ملاحظہ ہو جو آپ کے روم فیلو زعفران پر اپنی رحمت کی
ن کرے، ایک طرف کو بیٹھے چپ چاپ اور خفیہ خفیہ گڑگڑا رہے ہیں۔

غالباً اب اس بیان سے آپ کی طبیعت سیر ہو گئی ہو گی۔ لہٰذا اب ہم بھی "عیب
بلہ بگفتی ہنرش نیز بگو" پر کاربند ہو کر کچی بارک اور خصوصاً حصۂ غربی کی خصوصیات
قوتیں درج کرتے ہیں جس سے ناظرین کو معلوم ہو جائے گا کہ گدڑی میں لعل بھی ظاہر
تے ہیں۔ لیجیے ذرا سنئے:

۱۔ کچی بارک کا کرایہ دیگر دارالاقامہ کی بہ نسبت کم۔ شور کم۔ غل کم۔ طریقۂ رہائش بالکل
سادہ اور فیشن کی پابندی معدوم۔

۲۔ یہ بارک ہمیشہ کالج کے قابل ترین طلبا کا مسکن رہی۔ مسٹر ان محمد علی ایڈیٹر "ہمدرد"
ظفر علی خاں محرر خصوصی اخبار "زمیندار" ملک پنجاب۔ اور مولوی محبوب عالم صاحب
ایم اے مدیر مسئول اخبار "الہلال" یہیں قیام رکھتے تھے۔

۳۔ یہاں کے طلبا بالعموم ایف اے اور بی اے کے امتحان میں فرسٹ آتے ہیں
مثال کے طور پر مسٹر عبدالغنی انصاری، مرزا جلیل القدر صاحب۔ کالج کے جونیئر اور
سینئر اسکالر بھی یہیں کے ہوتے ہیں جن کی مثالیں اب بھی موجود ہیں۔

۴۔ کھیل کود میں بھی یہاں کے باشندے ہمیشہ ممتاز رہتے ہیں چنانچہ اس سال
بھی اس فن میں سب سے زیادہ تمغے اور پیالے اس غربی حصہ نے حاصل کیے ہیں۔

۵۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہاں پر کوئی کسی کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ نہ لکھنے
میں نہ پڑھنے میں۔ نہ بیماری میں نہ تیمارداری میں۔ ان امور کے لحاظ سے اگر ہم کچی
بارک کو بھی فردوس کہیں تو بجا ہے کیونکہ ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد ۔۔۔ کسے را باکسے کارے نباشد ●●

سیّد فرخ جلالی

سرسیّد ہال کتبات کے آئینے میں

سرسیّد ہال علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا قدیمی، اقامتی، تدریسی، دینی اور انتظامی مرکز رہا ہے۔ اس ہال میں یونیورسٹی کے سب سے زیادہ کتبے اور نوشتہ جات ہیں۔ یہ کتبے فارسی، عربی، انگریزی اور اردو میں ہیں۔ لیکن کسی کتبے پر "سرسیّد ہال" نہیں لکھا ہے دنیا کا طویل ترین اردو کتبہ اسٹریچی ہال کے جنوبی دالان میں نصب ہے۔ اس ہال میں داخل ہونے کے چھ راستے ہیں۔ چار دروازوں پر کتبے لگے ہیں۔

۱۔ وکٹوریہ گیٹ۔ جنوبی دروازہ ۲۔ باب اسحاق۔ شمالی دروازہ

۳۔ باب رحمت۔ مغربی دروازہ ۴۔ باب العلم چھوٹا مشرقی دروازہ

جنوبی دروازہ کا نام وکٹوریہ گیٹ ہے۔ یہ نام انگریزی میں لکھا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ محمڈن اینگلو اورنیٹل کالج (موجودہ یونیورسٹی) کا افتتاح ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو ہوا۔ جو ملکہ وکٹوریہ اور سیّد محمود ابن سرسیّد احمد کا جنم دن ہے (سیّد محمود ۱۸۵۰ء۔ ۱۹۰۳ء)

باب اسحاق شمالی دروازہ کا نام ہے۔ یہ نواب محمد اسحاق خاں ابن نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد و ہوڈل پلول کے نام پر ہے جو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک سکریٹری رہے جن کے عہد میں یونیورسٹی کی جامع مسجد مکمل ہوئی جن کی کوشش سے امیر خسرو کی تصانیف نہایت شان و شوکت اور تحقیق سے شائع ہوئیں۔ مثال کے طور پر مثنوی

دول رانی، خضر خاں، اور مثنوی لیلیٰ مجنوں وغیرہ۔ نواب اسحاق خاں کے بیٹے نواب اسمٰعیل خاں ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ نواب اسمٰعیل خاں ٹریزرر بھی رہے۔

نواب اسحاق خاں کی شادی غالب اور سرسید کے دوست نجم الدین حیدر کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

وکٹوریہ گیٹ میں اندر داخل ہونے پر ایک طویل عربی کتبہ ہے جو نواب حاجی اسمٰعیل خاں شیروانی کی طرف سے سمیع اللہ خاں اور سرسید احمد خاں کی قومی خدمات کی یادگار میں اکتوبر ۱۸۸۳ء مطابق ۱۳۰۱ھ میں لگایا گیا ہے۔ سمیع اللہ خاں ۱۸۷۵ء سے ۱۸۸۹ء تک سرسید کے ساتھ رہے۔ وہ ابتدائی دور میں سکریٹری بھی رہے۔ ۱۸۸۹ء میں سمیع اللہ خاں قانون ٹرسٹیان کے سلسلے میں سرسید سے الگ ہو گئے۔ وہ مقصد کے حصول میں مخلص اور نیک تھے مگر سمیع اللہ خاں قانون ٹرسٹیان کی ضرورت اور افادیت کو سمجھ نہیں سکے یا کسی اور مجبوری سے الگ ہو گئے۔ سمیع اللہ خاں نے جس حوصلہ اور ایثار سے سرسید کا ساتھ پندرہ برس تک دیا۔ وہ اس کا متقاضی ہے کہ یونیورسٹی میں ان کو یاد رکھا جائے۔ اس کتبے کی اوپر کی منزل کا نام سمیع منزل ہے جو ۱۹۲۰ء میں بنی ہے۔

حاجی محمد اسمٰعیل خاں شیروانی دتاولی کے رئیس تھے۔ حاجی فیض احمد خاں کے بڑے بیٹے تھے۔ محمد اسمٰعیل خاں کے کئی بھائی تھے۔ دتاولی میں انھوں نے کئی خوشنما عمارات بنوائیں، باغات لگوائے۔

محمڈن اورنٹیل کالج میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں شیروانی بڑے بڑے عہدوں پر رہے۔ اس کتبہ کی تحریر سے پہلے وہ مجلسِ منتظمہ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کے نائب صدر رہے۔ وہ کالج کی مالی مدد اس وقت کرتے رہے۔ جب علیگڑھ اور بلند شہر کے زیادہ تر رئیس سرسید کی شدید مخالفت کرتے رہے۔ نواب حاجی اسمٰعیل خاں کی یاد میں ایک وظیفہ لائل اسمٰعیل اسکالرشپ کے نام سے دیا جاتا رہا۔ سرسید کی حیات سے متعلق مواد نواب حاجی اسمٰعیل خاں نے سراج الدین سے جمع کرایا تھا۔ سرسید کے انتقال کے بعد نواب اسمٰعیل خاں شیروانی نے یہ مواد حالی کو دے دیا۔ سرسید نہیں چاہتے تھے کہ حالی ان کی سوانح حیات لکھیں۔ حیاتِ جاوید سرسید کی ایک

نیم مخالفانہ سوانح حیات ہے۔ حالی نے اقرار کیا ہے کہ نواب اسمٰعیل خاں کا شمار سرسید کے اعضاء میں جوارح کا تھا۔

حاجی اسمٰعیل خاں نے علمی صحافت میں اضافہ کیا۔ علیگڑھ سے ایک رسالہ 'معارف' نکالا جس میں وحید الدین سلیم ان کے ساتھ تھے۔ حاجی اسمٰعیل خاں نے کئی کتابیں لکھیں جن کے نام یہ ہیں؛

۱۔ جوش مذہبی ۲۔ فلاح دارین ۳۔ احادیث خیر الانام ۴۔ تربیت الدجاج ۵۔ ابتدائی جغرافیہ ۶۔ وبائی مہینہ میں ہم کو کیا کرنا چاہیے ۷۔ ترک ہمک لری۔

وہ یوپی میں گورنر کونسل کے ممبر رہے سرسید کا انتقال ان کی کوٹھی میں ہوا۔ اس کوٹھی نشاط میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوا۔ یہ کوٹھی ۱۸۹۲ء میں نواب اسمٰعیل خاں شیروانی نے سوہن پال سے خریدی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں آگرہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سرسید ہال میں جامع مسجد کے پاس نظام میوزیم نام کی عمارت ہے جس میں ایک زمانہ تک شعبۂ تاریخ تھا۔ اس میں ایک کتبہ "بادشاہ اسلام" سلطان التمش کے بیٹے سلطان ناصر الدین محمود کے عہد کا ہے۔ شہر علیگڑھ (کول) کی جامع مسجد کے سامنے ایک مینار تھا جس کو برطانوی سرکار نے ۱۸۵۷ء کے بعد توڑ دیا۔ یہ قدیم جامع مسجد کا ماذنہ تھا (اذان دینے کی اونچی جگہ) اور قطب مینار (مینارہ معزی) کے قریبی عہد کا تھا۔ جب یہ مینار توڑ دیا گیا تو سرسید نے اس کو حاصل کر لیا۔ یہ کتبہ کئی مرتبہ شائع ہوا ہے۔ آخری مرتبہ ڈاکٹر جمال صدیقی کی کتاب "علیگڑھ ضلع ایک تاریخی جائزہ" ص ۲۲۵-۲۶ پر طبع ہوا ہے یہ کتبہ ۱۲۵۴ء مطابق ۶۵۲ھ کا ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ کتبہ ناصر الدین محمود کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود قرآن مجید کی کتابت بھی کرتا تھا۔ اس کتبے کی شان خطاطی میں قدیم زمانے کی قرآنی کتابت کے آثار ہیں۔ اس کے عہد کی کتاب طبقات ناصری مصنفہ سراج منہاج میں ۶۵۲ھ میں سلطان ناصر الدین کا کول (علیگڑھ) آنا ثابت ہے۔ اس کتبے میں غیاث الدین بلبن کا عہد امیری کا نام بہاء الدین بلبن موجود ہے۔ لیکن اس نام کے ساتھ قتلغ خاں اور ملک ملوک ومشرق وصین کے خطابات حیرت میں ڈال دیتے ہیں کیونکہ منہاج سراج نے ۶۵۸ھ میں بلبن کا نام الغ خاں بتایا ہے اور قتلغ خاں ملک ملوک الشرق مسعود جانی شہزادہ ترکستان

کا خطاب تھا جس نے سلطان ناصر الدین محمود کی ماں یعنی التمش کی بیوہ سے شادی کرلی تھی۔ اس بات کو سلطان ناصر الدین محمود ناپسند کرتا تھا شاید بلبن نے زبردستی یہ خطاب حاصل کر لیئے تھے۔ علیگڑھ (کول) تیرہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے وزیر اعظم کی جاگیر اور ایالت (گورنری) میں رہتا تھا جس کا ثبوت اس کے قدیم فارسی کتبے سے ملتا ہے جو مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ میں ہے۔

سرسید ہال کے وسط میں جانب مغرب باب رحمت ہے۔ اس کے پاس یونیورسٹی کی جامع مسجد ہے۔ اس کے سامنے کے دالان کی وسطی کامہ کے باہر ایک طویل کتبہ ہے جس پر سورۂ فجر کندہ ہے۔ یہ کتبہ شاہ جہاں کے عہد کا ہے۔

دہلی میں سرجینی نائیڈو ہسپتال اور حضرت شاہ کلیم اللہ کے مزار کے قریب ایڈورڈ پارک تھا جس کا نام اب سبھاش پارک ہے۔ یہاں شاہ جہاں کے عہد کی ایک مسجد اکبر آبادی مسجد کے نام سے تھی۔ یہ مسجد مع حمام کے مثل فتحپوری کے تھی۔ شاہ جہاں کی ایک اعز النساء عرف اکبر آبادی محل نے ایک لاکھ پچاس ہزار کے صرفہ سے تعمیر کی تھی۔ اور ایک بڑی جائیداد اس کے نام وقف کی تھی۔ شاہ ولی اللہ کے خاندان کے بعض علماء نے اس مسجد میں درس دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی آزاد حکومت کے ارکان بھی اس میں جمع ہوتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے آزادی کے مجاہدوں کے انتقام میں اس عظیم الشان مسجد کو توڑ کر شہید کر دیا۔ اکبر آبادی مسجد میں دو کتبے تھے ایک کتبہ جس پر سورۂ فجر کندہ ہے وہ سرسید ہال کی اس مسجد میں موجود ہے۔ یہ کتبہ سنگ مرمر کا ہے اور سیاہ سنگ موسیٰ سے آیات کندہ ہیں۔ مسجد اکبر آبادی کو جب شہید کیا گیا تو ایک مدت کے بعد سرسید کو قرآن کریم کی شاندار خطاطی کا یہ نادر نمونہ مل گیا اور علیگڑھ لایا گیا۔ بانیۂ مسجد کی دعا کے طفیل اور سورۂ فجر کی برکت سے مسجد اکبر آبادی کے آثار کا ایک حصہ موجود و محفوظ ہے جس میں اقتصائے عالم کے مسلمین صلوٰۃ ادا کرتے ہیں لہٰذا دعا میں کبھی کبھی شاہ جہاں کی پرستار خاص اکبر آبادی محل کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔ شاہ جہاں کی دوسری پرستار خاص بیوی ارجمند بانو ممتاز محل کے مقبرہ تاج محل (روضہ ممتاز محل) کے قرآنی کتبات کا طرز تحریر اور ایس ایس ہال کی مسجد جامع کے کتبے سے مشابہ ہے۔ مسجد اکبر آبادی کا وہ عکس جو سرسید نے ایک مغل شاہزادہ مرزا شاہ رخ ابن مرزا دارا بخت ابن بہادر شاہ ظفر

سے تیار کرایا تھا۔ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مسجد ۱۸۷۵ء کے بعد سے تعمیر ہونا شروع ہوئی اور ۱۹۱۵ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس وقت نواب اسحاق خاں کالج کے سکریٹری تھے اور نواب مزمل اللہ خاں جوائنٹ سکریٹری تھے آگرہ اور دہلی کے معمار اس کی تعمیر میں شریک تھے۔ بقول شبلی سید محمود نے اس مسجد کی تعمیر میں خصوصی دلچسپی لی تھی۔

اس قرآنی کتبے کے علاوہ ایک اور تاریخی کتبہ مسجد اکبرآبادی دہلی میں تھا۔ جو اب کھو چکا ہے اور سرسید نے ۱۸۴۷ء میں اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں اس کتبہ اور مسجد کا عکس دیا تھا۔ گمشدہ کتبہ یہ تھا۔

"ایں مسجد فیض انتہا سرائے راحت جا حمام نظافت جا چوک دلکشا کہ عبادت گاہ حق پرستاں روز گار و روح فزا۔ ے مرد اقطان و نزہتکدہ آسمانیا ست و دار النفع زمینانست در عہد سعادت مہد پادشاہ اسلام کہف انام سایہ والد پایہ پروردگار خلیفہ برگزیدہ کردار رحمت اعز ذی الجلال مظہر اتم دادرسی جمال ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہ جہاں بادشاہ غازی پرستار خاص بادشاہی پرستندہ باخلاص ظل الٰہی مرقمہ خیرات و برکات محررہ سعادت و حسنات اعز النسار مشہور بہ اکبرآبادی محل بفرمان معلی بنا کرد بجہت ابتغار رضا الٰہی و اقتنا ثواب اخروی حاصل سری محوی بر مسجد با حقوق و مرافق داخلہ و خارجہ وقف لازم شرعی نمود و مقرر ساخت کہ اگر مرمت ایں امکنہ احتیاج افتد آنچہ حاصل موقوف افتد و ید الترمیم باقی ماند بخدمہ مسجد و حمام و طلبہ علم رسانند و الد تمام را بجماعہ سطور بدہند ایں منازل منیعہ در عرصہ دو سال بصرف صد و پنجاہ ہزار روپیہ آخر شہر رمضان المبارک سال ہزار و شصت ہجری مطابق بست و چہارم سال جلوس عالم آرا صورت انجام پذیرفت ایزد تعالیٰ اجر ایں خیر جاری و نفع باقی بروزگار فرخندہ آثار بادشاہ دیں پرور و حق گزیں و حق گستر و بانیہ ایں مبنائے عامرہ ایں مغالی عابدہ کردہ اندز آمین یارب العلمین۔

سیّد مجتبیٰ احمد

سرسیّد ہاؤس

سرسید نے اپنی رہائش کے لیے دو مکان تعمیر کیے تھے جن میں ان کے قیام کی مدت بہت ہی مختصر رہی۔ علیگڑھ میں مستقل رہائش کے خیال سے سرسیّد نے اپنا مکان انسٹی ٹیوٹ ہال (سائنٹفک سوسائٹی ہال) سے چند قدم کے فاصلے پر بنایا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ ہال (اجمل خاں طبیہ کالج اسی احاطہ میں واقع ہے) اور سرسید کے مکان کے درمیان صرف انگریزوں کا قبرستان ہے۔ ۱۸۶۹ء میں سرسیّد نے سرولیم میور کی کتاب حیات محمد کا جواب لکھنے اور مغربی تعلیم سے راست معلومات حاصل کرنے کے لیے جب لندن کے لیے رختِ سفر باندھا تو یہ مکان اپنے عزیز مولوی سمیع اللہ خاں کے ہاتھ بیع کر دیا تھا۔ جیل روڈ پر واقع اسی مکان میں جس کا نام اب سمیع منزل ہے۔ ۲۵ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم کا افتتاحی جلسہ ہوا تھا اور تنظیم مدرسہ کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے مولوی سمیع اللہ اس جلسہ کے منتظم و منصرم تھے اور انہی کے صاحبزادے حمید اللہ مدرسہ کے پہلے طالب علم تھے۔

سرسیّد نے دوسرا مکان الہ آباد میں ۱۸۸۲ء میں اس وقت بنایا تھا جب وہ صوبۂ شمال مغربی کی کونسل کے ممبر نامزد ہوئے تھے۔ اسی مکان میں رہ کر وہ کونسل کی کارروائی میں حصّہ لیتے رہے۔ بعد میں یہ مکان سیّد محمود کی رہائش گاہ

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

بنا جنھوں نے اس کو اپنے دوست موتی لعل نہرو کے ہاتھ فروخت کر دیا. موجودہ آنند بھون محمود منزل ہی کی توسیع ہے۔ بعد میں آنند بھون کے اس حصّہ کو سوراج بھون کا نام دیا گیا اور اس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا مرکزی دفتر قائم ہوا۔

جب اگست ۱۸۷۶ء میں سرسید پنشن لے کر مستقل قیام کے ارادے سے علیگڑھ تشریف لائے تو ان کا قیام اس مکان میں ہوا جس کو اب سرسید ہاؤس کہتے ہیں

کول (موجودہ علیگڑھ) کی چھاؤنی کے علاقے میں واقع یہ مکان فوجی افسروں کے قیام کے لیے مخصوص تھا اور فوجی بارکوں کے قریب واقع تھا۔ چھاؤنی کے کول سے منتقل ہونے کے بعد اسے جسٹس محمود نے خرید کر اس کی از سرِ نو تزئین اور آرائش کی اور اسے انگریزی ساز و سامان سے آراستہ کیا۔ یہ بہت بڑا اور وسیع بنگلہ تھا جس کی دیواروں کا ہودہ کافی وسیع تھا پکی دیواروں کے بیچ میں کچی اینٹوں کی دیواریں تھیں تاکہ مکان کے اندر کا درجۂ حرارت باہر کے درجۂ حرارت سے زیادہ متاثر نہ ہو۔ اس طرح چھت کے اوپر قدیم انداز پر بلیوں اور شہتیر کے ٹھاٹ کے اوپر پھوس کا چھپر قائم کیا گیا تھا۔ اس چھپر نے پوری عمارت کو ڈھک لیا تھا۔ کمروں میں صاف ستھری چھت گیریاں تھیں۔ پھوس کی چھت کی وجہ سے کمرے عموماً ٹھنڈے رہتے تھے۔ مگر انھیں زیادہ ٹھنڈا رکھنے کے لیے سرسید نے دہلی کی قدیم عمارات میں اس مقصد کے لیے مستعمل طریقہ اختیار کیا تھا۔ آثار الصنادید کی تصنیف کے دوران سرسید نے قدیم عمارات اور ان کی طرزِ تعمیر کا بہت باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔ اسی کو مدِ نظر رکھ کر انھوں نے چھت اور چھپر کے درمیانی حصے میں مٹی کے گھڑے رکھوائے تھے۔ ان خالی گھڑوں میں بھری ہوئی ہوا سورج کی تمازت کے مقابلے میں حاجز (انسولیٹر) کا کام دیتی تھی اور باہر کے درجۂ حرارت کے مقابلے میں کمروں میں غیر معمولی ٹھنڈک ہو جاتی تھی۔

اس مکان کے داہنی طرف ایک بڑا کشادہ چبوترہ تھا جس پر شام سے رات گئے تک احباب کے ساتھ گفتگو رہتی۔ مکان کے چاروں طرف پھولوں کے تختے اور لانس تھے۔ سرسید کو پھول اور سبزہ کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے باغ کی خود ہی

ــــــ
سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

دیکھ بھال کرتے اور اس کام میں کافی رقم صرف کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ "جو خوشی آپ کو اپنی خوبصورت اور زیورات سے لدی پھندی بیگم کو ساتھ رکھ کر ہوتی ہے وہی مجھے اپنے تر و تازہ اور پُر بہار پھولوں اور نظر افروز سبزہ سے مزیّن باغ کو دیکھ کر ہوتی ہے۔" باغ میں آب پاشی کے لیے شرقاً غرباً دونوں اطراف میں کنویں تھے۔ پھولوں کے علاوہ موسمی پھلوں کے درخت بھی تھے۔

مدرستہ العلوم کے ایک سابق طالب علم محمود علی خاں نے تحریر کیا ہے کہ ایک زمانے میں وہ سرسیّد کے ہمراہ مقیم تھے۔ انجیر کے پھل کافی لگے ہوئے تھے مالی روزانہ تقریباً ڈیڑھ پاؤ انجیر صبح ان کی میز پر رکھ دیتا تھا جو سرسیّد بہت شوق سے کھاتے تھے۔ محمود علی کا کہنا ہے کہ ہم نے بھی انجیر کے پیڑوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ جب صبح کے ناشتے میں انجیر کم ہونے لگے تو سرسیّد نے مالی سے اس کمی کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا سرکار (سرسیّد کو گھر پر لوگ سرکار ہی کہہ کر مخاطب کرتے تھے) گلہریاں کھا جاتی ہیں۔ سرسیّد نے کہا خیال رکھنا دو پیروں والی گلہریاں ہیں اور مالی دو پیروں والی گلہریوں کو تلاش کر کے بھگانے میں سارا دن مشغول رہتا۔

سرسیّد کا اوّلیں سوانح نگار کرنل گراہم سرسیّد کے اس گھر اور ان کے معمولات کے بارے میں لکھتا ہے :

"یہاں کا سارا ماحول علم کی خوشبو سے مہکتا ہے۔ سیّد صاحب کی نشست گاہ جس میں وہ دن کا زیادہ حصّہ اپنی میز سے لگے ہوئے کام کرنے میں گزارتے ہیں، کتابوں اور کاغذات سے پٹی پڑی ہے۔ ان کے کھانے کے کمرے میں دیواروں سے لگی ہوئی چاروں طرف الماریاں ہی الماریاں کھڑی ہیں جو معیاری کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔ وہ اتنے مصروف اور خوش اوقات واقع ہوئے ہیں کہ انھیں وقت گزرنے کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کی ایک بڑی صفت مسلسل جم کر کام کرنے کی صفت و صلاحیت ہے۔ قومی مسائل پر ان کی بے پناہ وسیع النظری کے علاوہ ان میں ذرا سی تفصیلات پر توجہ دینے کی ایسی قابلیت ہے جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ چار بجے صبح بیدار ہوتے ہیں اور اخبارات کے لیے اپنے مضامین، کتابیں اور تصنیفات کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری ملاقاتیوں سے ملتے ہیں اور دن میں

سہ ماہی فکر و آگہی (دہلی) علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ہی نہیں اکثر رات گئے تک کالج کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ وہ زوردار قہقہہ لگاتے ہیں اور مذاق سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔"

اردو زبان کے مشہور مترجم اور ایم۔ اے۔ او کالج کے سابق طالب علم مولوی عنایت اللہ دہلوی جن کے والد مولوی ذکاء اللہ سرسید کے بہت گہرے دوست تھے۔ جب اپنے والد کے ہمراہ الٰہ آباد جاتے ہوئے علیگڑھ ٹھہرے اور سرسید کے ہمراہ ٹھہرے تو ایک دس سالہ بچے کے ذہن پر اس پہلی ملاقات کا جو نقش ثبت ہوا وہ تمام عمر باقی رہا۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں اس واقع کو یاد کرتے ہوئے انہوں نے تحریر کیا ہے:

"میں نے سرسید کو پہلی دفعہ دیکھا تو بہت جسیم شحیم نظر آئے۔ شیر کا سا کلّہ تھا، سپید سر، سپید داڑھی اور سپید لباس میں معلوم ہوتے تھے کہ انوار کا پیکر بنے آسمان سے اتر رہے ہیں۔ موٹے موٹے پاؤں تھے جن میں سلیپر یں دیکھ کر معلوم ہوتا کہ قالین کے ٹکڑے بندھے ہوئے ہیں۔ دہلی میں ان کو علیگڑھ والا کہتے تھے۔ ان کے گھر میں ہر چیز بڑے سلیقے سے رکھی تھی۔ ان کے کمرے کی دیواروں پر ہلکا فروزی رنگ تھا، نیچے فرش پر زرد حاشیہ اور سرخ اور نیلی دھاریوں کی دری بچھی رہتی، براق سی سپید چھت گیری تھی۔ سنہرے چوکھٹوں میں تصویریں لٹکی تھیں، آتش دان کی کارنس پر نادر چیزوں کی نمائش لگی ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز جو سرسید کی دوات معلوم ہوئی اس کے اوپر کا ڈھکنا کہیں سونے کا کہیں چاندی کا ہو بہو شیر کا سر معلوم ہوتا تھا جس کی آنکھیں لال لال نگینوں کی طرح خوب چمکتی تھیں۔ ان کے کھانے کی میز پر سپید چادر بچھی رہتی۔ کھانے کے وقت چینی کے برتنوں کے علاوہ چاندی کے چمچے، کانٹے، ہاتھی دانت کی چھریاں ہوتیں۔ ان کے غسل خانے کا فرش چینی کا تھا اور بڑا صاف ستھرا رہتا تھا۔"

سرسید کا حلقۂ احباب وسیع تھا جو اطرافِ ہند میں پھیلے ہوئے تھے اور اکثر علیگڑھ آتے اور سرسید کے مہمان رہتے۔ ان مہمانوں کے علاوہ ایسے لوگوں کی بھی معقول تعداد تھی جو مستقلاً گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے ان کے ہمراہ رہتے تھے۔ اور قومی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ انہی میں اردو کے نامور اہلِ قلم وحیدالدین سلیم

بھی تھے۔ جب سرسید کو ایک لٹریری اسسٹنٹ کی ضرورت ہوئی تو سرسید کے ایک دوست نے مولانا سلیم سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے طے کیا ہے کہ کسی کی ملازمت نہیں کروں گا۔ ان کے جواب میں سرسید نے وحیدالدین سلیم کو تحریر کیا کہ نوکری کی بات کون کرتا ہے میرے ساتھ میری طرح رہو۔ میں مرجاؤں گا تم گاڑ دینا تم مرجاؤ میں گاڑ دوں گا۔ جس کے بعد مولانا سلیم علیگڑھ تشریف لائے۔

کہتے ہیں کہ کپڑے کی ایک تھیلی جس میں رقم ہوتی تھی، کمرے میں ایک میز پر رکھی رہتی تھی جس کو جو ضرورت ہوتی اس میں سے نکال کر خرچ کرلیا کرتا تھا۔ اس میں سرسید اور ان کے متوسلین شامل تھے۔ ان کا دسترخوان وسیع تھا جہاں ان کے دوست شریکِ طعام رہتے تھے۔

سید زین العابدین (سرسید کے زینو بھیا) ریٹائر ہونے کے بعد سرسید ہاؤس کے قریب ہی ایک بنگلہ میں رہتے تھے، اور مدرستہ العلوم کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کا ملازم صبح کے ناشتے کے وقت خوان لے کر آیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ سرسید قابیں اٹھا کر پھینکتے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری میز پر بیٹھ کر اپنے گھر سے کھانا منگاتا ہے۔ اس طرح تمام برتن ایک ایک کرکے توڑ ڈالے۔ سرسید کے انتقال کے بعد سید زین العابدین کا مرتے دم تک یہ طریقہ رہا کہ نمازِ فجر یونیورسٹی کی مسجد میں ادا کرتے اور سرسید کی قبر کے پاس بیٹھ کر صبح کا ناشتہ کرتے جو ان کا ملازم لے کر آتا تھا۔

سرسید کی حیات ہی میں سید محمود نے جن کی صحت اور دماغی قویٰ مستقل کمزور ہوتے جا رہے تھے لوگوں کے بہکانے پر یہ کوٹھی اپنی زوجہ مشرف جہاں بیگم کے نام کردی تھی۔ یہ بیع نامہ بھی لوگوں کے مطابق اپنے مواد اور ہیئت کے لحاظ سے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا ایک ہی بیع نامہ تھا۔

سرسید کے انتقال کے بعد اس کوٹھی کی رونق اجڑ گئی۔ باغ، پھولوں کے تختے سب ویران ہو گئے۔ ایم۔ اے۔ او کالج کے پرنسپل تھیوڈر ماریسن کی تحریک پر جب کالج میں انگلش ہاؤس کے نام سے ایک نیا ہاسٹل شروع کیا گیا تو وہ سرسید ہاؤس کے ایک حصہ میں قائم ہوا۔ دوسرے حصہ میں بیگم محمود رہتی تھیں۔

جب ۱۹۲۹ء میں سر سید راس مسعود یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو وہ اپنے مکان ہی میں مقیم ہوئے اور سر سید کی روایت کے مطابق اگلے پانچ سال تک سر سید ہاؤس، وائس چانسلر کی رہائش گاہ، گھریلو دفتر، مہمان خانہ سب یہی تھا۔

تقسیم ہند کے بعد راس مسعود کے دونوں لڑکے پاکستان چلے گئے اور یہ عمارت حکومتِ ہند کی وزارتِ آبادکاری کے محکمہ کسٹوڈین کے تحت آگئی۔ اس قبضے کے بعد عمارتیں جس بے توجہی کا شکار ہو جاتی ہیں وہی ہوا۔ انگلش ہاؤس کی وجہ سے اس مکان کی مرمت وغیرہ پر یونیورسٹی جو خرچ کرتی تھی وہ سلسلہ ختم ہوا حتیٰ کہ وہ عمارت کھنڈر ہو گئی۔ اس ویرانے میں ٹوٹے کمروں میں یونیورسٹی کے ملازمین رہنے لگے تھے اور آس پاس کے جانور یہاں پڑے رہتے تھے اور پرندوں نے اس میں بسیرا کر لیا تھا۔

وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی بڑی تگ و دو کے بعد سر سید ہاؤس کو خریدنے کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے معتدبہ رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور سنہ ۱۹۶۰ء میں ۸۲، ۱۶۲ روپے میں یونیورسٹی نے سر سید ہاؤس کے کھنڈر مع ۷، ۱۳ ایکڑ اراضی حکومتِ ہند کی وزارت آبادکاری سے خرید لیا۔

حکومت جموں و کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ جناب بخشی غلام محمد نے اس کی تعمیرِ نو کے لیے پچاس ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ جس سے ابتداً دو بڑے کمرے تعمیر کیے گئے۔ باقی عمارت کی تکمیل آہستہ آہستہ ہوئی جو پروفیسر عبدالعلیم کے عہد میں مکمل ہوئی۔

سر سید ہاؤس کی تعمیرِ نو میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا کہ وہ پرانے خطوط پر ہی تعمیر ہو۔ آج کل سر سید ہاؤس میں سر سید اکادمی قائم ہے اور ایم اے او کالج سے متعلق تمام کاغذات یہاں محفوظ کرائے گئے ہیں۔ سر سید اکادمی کی سلسلۂ مطبوعات کے تحت وقار الملک کے خطوط، سر سید کے خطوط (دو جلدوں میں) اور کالج کے پرنسپل تھیوڈر بیک کی خط و کتابت بھی شائع کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ دوسری مطبوعات بھی ہیں۔

۵۴۴

اظہرؔ عنایتی (علیگ)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دیارِ علم، مری درسگاہ فضل و کمال
تیرے وقار کو اور تیری عظمتوں کو سلام
بھٹک رہے تھے اندھیروں کے جب سرابوں میں
پیمبروں کی طرح راستہ دکھا کے ہمیں
نئے اجالوں میں چلنا سکھا دیا تو نے
نظر کو وسعتیں ذہنوں کو تازگی دے کر
تری فضاؤں نے جینا سکھا دیا ہم کو
سلیقہ لکھنے کا، پڑھنے کا، گفتگو کا دیا
قرینہ چلنے کا، بڑھنے کا جستجو کا دیا
ترے حضور کبھی سر اٹھا نہ پائیں گی
ہماری نسلیں بھی تجھ کو بھلا نہ پائیں گی
دعا ہے حشر تلک جو بھی ماہ و سال آئے
خدا کرے کہ نہ تجھ پر کبھی زوال آئے

رہبرؔ جونپوری

ہُنر گاہِ علی گڑھ

اے ہنر گاہِ علی گڑھ مرکزِ علم و کمال
تیری ہستی مہرِ تاباں تیری عظمت بے مثال

ہے تری تحریک سے آباد بزمِ زندگی
تیرہ ذہنوں کو سدا بخشی ہے تو نے روشنی

بالیقیں اب قوم تیرے فیض سے سرشار ہے
تو علاجِ کشتۂ ہائے گردشِ ادوار ہے

ہو رہی ہیں دُور تجھ سے جہل کی تاریکیاں
ہر قدم پر تو نے چھوڑے ہیں فراست کے نشاں

تیری محفل سے ہوئے ہیں سُرخ رُو و سر فراز
ذاکر و جوشؔ و سُہیل و جوہرؔ و شوکت، مجازؔ

رنگ زارِ جہل میں تو چشمۂ اِکرام ہے
عالمِ فہم و ذکاوت میں ترا بھی نام ہے

گُل بداماں ہے ترے علم و تمدن کا چمن
ہے ترے لطف و رَواداری کا دریا موجزن

متحد ہے قوم کا شیرازہ تیری ذات سے
ہیں بلند اقبال نسلیں تیرے احسانات سے

ہر کلی مُدت سے ہے تیری، ہم آغوشِ بہار
ہر شجر تیرے چمن کا لا رہا ہے برگ و بار

کامیابی کا وسیلہ تیرا ہر انداز ہے
تیری ہر تحریک اپنے وقت کی آواز ہے

ملک و ملت کی حیاتِ نو کا آئینہ ہے تو
دین و دنیا کی فضیلت کا سدا زینہ ہے تو

سینچ کر سیّد نے اپنے خوں سے تیرا گلستاں
بخش دی ہے تجھ کو دُنیا میں حیاتِ جاوداں

مسلم و ہندو ترے الطاف سے ہیں شاد کام
محفلِ تہذیب و دانش تجھ کو رہبرؔ کا سلام

○

ڈاکٹر انجمن آرا انجمؔ

سر سید مرحوم کی نذر

نام اس کا سید احمد تھا
قوم کا سردار تھا
قوم کی نیا کا کھیون ہار تھا
قوم پر اپنی وہ قربان ہو گیا
مر کے اپنا نام زندہ کر گیا
ایسی ایسی مشکلیں اس نے سہیں
ذکر جن کا ہے محال
لیکن اس نے صبر کا دامن نہ چھوڑا زنہار
اک شکن لایا نہ پیشانی پہ وہ
قوم سے اس نے نہ مانگا تھا کبھی اپنی وفاؤں کا صلہ
عزم و استقلال کا پرچم لیے
ہر قدم پر جانبِ منزل بڑھا
اس نے اپنا خواب پورا کر دیا
شمعِ علم اس نے جلا کر
سارے عالم میں اجالا کر دیا
درس گاہ اس نے بنا کر
قوم کو بخشا شعورِ زندگی
اس سے بڑھ کر اور کیا احساں وہ کرتا قوم پر
اب یہی اپنی دعا ہے صبح و شام
ہر گھڑی رحمت کرے اس پر خدا

ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۸

علیگڑھ: شعبہ جات

شعبہ جات، علم و حکمت، فلسفہ، جغرافیہ
کس قدر پھیلا ہوا ہے درس گہ کا دائرہ

کوثر صدیقی

سرسیّد احمد خاں

ہے تری ذاتِ گرامی آفتابِ ضوفشاں
خاک کے ذروں کو بخشی تونے تابِ کہکشاں
قومِ افسردہ کو تونے پھر دیا جاہ وجلال
اور بخشا اہلِ ملت کو وقارِ جاوداں
مشعلِ تاباں ہے تاریکی میں تیری ذات ہی
دستِ ملت میں ہے تیرے دم سے تیغِ ضوفشاں
تو نہ ہوتا تو جلاتا کون شمعِ علمِ نو
تو نہ ہوتا تو غریقِ تیرگی ہوتا جہاں
تیری "شاخِ گل" کبھی پژمردہ ہوسکتی نہیں
تونے بخشی غنچہ وگل کو بہارِ بے خزاں
ہو نہیں سکتی وہ ملت راہ گم کردہ کبھی
سید احمد خاں ہو جس ملت کا میرِ کارواں
پاسباں "ضوئے علی گڑھ" کا خدائے پاک ہے
بجھ نہیں سکتی ہواؤں سے یہ شمعِ جاوداں
کوثرؔ اس محسن کو ملت بھول سکتی ہی نہیں
یاد رکھے گا قیامت تک اسے ہندوستاں

آل احمد سرور

نئے علی گڑھ کے نام

اے کہ کرنوں سے تری اپنے سیہ خانے میں
چاند کا نور ستاروں کی چمک باقی ہے
لالہ کاروں سے تری بادِ خزاں کے باوصف
اپنے ویرانے میں پھولوں کی مہک باقی ہے
کون سمجھے ترے پرسوز تخیل کے سوا
اب بھی برفاب میں شعلوں کی لپک باقی ہے

یہ لہو جس میں تب و تاب نفس سے تیرے
دیکھ ایوانِ حکومت میں چراغاں نہ بنے
لوگ ہر شمع کو فانوس بنا دیتے ہیں
شعلہ اپنا بھی چراغِ تہِ داماں نہ بنے
رگِ ہر سنگ میں جو لعل و گہر بنتا تھا
وہ شرارہ بھی کہیں شمعِ شبستاں نہ بنے
موج جو کرتی تھی ہر گام پہ طوفاں تخلیق
کسی گلزار کی اک جوئے خراماں نہ بنے

سہ ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر سنہ ۲۰۰۰ء

ہند کے جلوۂ صد رنگ کا ہے پاس ضرور
اس میں سوزِ عرب و حُسنِ عجم یاد رہے

کارواں منزلِ نو کے لیے ہو گرمِ سفر
اپنی تہذیب کا بھی نقشِ قدم یاد رہے

چمنِ علم و ادب میں نئی کلیوں کے حضور
میرؔ و غالبؔ کے شگوفوں کا بھرم یاد رہے

محو ہوں عظمتِ شاہی کے حسیں افسانے
گر رہے یاد تو جمہور کا غم یاد رہے

درِ مے خانہ ہر اک رند پہ اب باز رہے
پینے والوں کا مگر پھر بھی اک انداز رہے

پروفیسر محمد سالم قدوائی

ادارۂ علومِ اسلامیہ

سر سیّد نے جب ہندوستان کے مسلمانوں کی پس ماندگی، علمی بے مائگی، سماجی پستی اور خستہ حالی پر غور کیا تو ان کو اندازہ ہوا کہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنے مذہب اور اسلامی تاریخ سے بیگانہ ہیں اور جدید تحریکات اور علوم جدیدہ کو سمجھنا گناہ کی بات تصوّر کرتے ہیں۔ اسی لیے جب انھوں نے مسلمانوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کے حصول کا انتظام کیا تو انھوں نے مذہبی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا۔ وہ تعلیم کا ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتے تھے جو مسلمانوں کے دین اور ان کی دنیا کے لیے مفید ہو، ان کا دعویٰ کہ تعلیم اور اس کا رواج اسی وقت بہتر طریقے سے اور شوق کے ساتھ ہو سکتا ہے جب دنیاوی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی شامل ہو۔ جب یہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو سر سیّد کے اسی جذبے کو سامنے رکھ کر دینیات کی تعلیم کا معقول انتظام کیا گیا۔ اور اسے ایک لازمی مضمون قرار دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب یونیورسٹی کا پہلا ایکٹ بنا تو اس میں جہاں مسلم یونیورسٹی کو مختلف قسم کے اختیارات دیئے گئے کہ تحقیق و تحصیل علم کے مواقع فراہم کرے وہیں اسے یہ ذمّہ داری بھی سونپی گئی کہ یونیورسٹی علومِ شرقیہ اور اسلامک اسٹڈیز کی ترقی و ترویج کا انتظام کرے گی[1] اس کے

[1] سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

بعد یونیورسٹی ایکٹ میں جب بھی ترمیم ہوئی اس کلاز کو ہمیشہ باقی رکھا گیا بلکہ اس کی مزید توسیع و توضیح کی گئی۔

تقسیم ملک کے بعد جب جمہوری حکومت قائم ہوئی اور اس کا پہلا پنج سالہ منصوبہ مرتب ہوا تو اس وقت کے وزیرِ تعلیم اور علمی دنیا کی مشہور و معروف شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد نے اسلامی ممالک، ان کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور علمی و فکری ترقی کو دنیا سے روشناس کرانے کے لیے ایک ایسے ادارے کے قیام کی ضرورت پر زور دیا جہاں ان چیزوں پر باقاعدہ تحقیق کی جائے اور جہاں سے مرتب اور منظم طور پر ایسا ادب شائع ہو جو اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا نہ صرف تعارف کرائے بلکہ اس کی عظمت اور اہمیت کو نمایاں کر سکے۔ جہاں اسلام کا مطالعہ ایک عالمی مذہب اور تہذیبی ورثے کی حیثیت سے کیا جائے اور جہاں اسلامی ادب اور علوم کی ترقی کا جائزہ لیا جائے۔ ظاہر ہے ایسے ادارے کے قیام کے لیے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے بڑھ کر کوئی دوسری موزوں جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے بجا طور پر اس پر اس وقت کے رہنماؤں کی نظر پڑی۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں "ادارۂ علوم اسلامیہ" کے نام سے اس کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور پروفیسر عبدالعلیم شعبۂ عربی و اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ تھے۔ اسی لیے ان کو اس ادارہ کا پہلا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ Executive Council نے اس سلسلے میں ضروری قواعد و ضوابط مرتب کیے اور انھیں پاس کر کے یونیورسٹی قوانین Ordinance کا درجہ دیا۔

پروفیسر عبدالعلیم صاحب اس کے پہلے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ علیم صاحب زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے۔ ان کا شمار ملک کے صفِ اوّل کے پڑھے لکھے اور ذہین لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کو جدید علوم اور فلسفہ سے بھی خاصا لگاؤ تھا، اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے علیگڑھ کی تعلیمی تحریک کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کا انتخاب ادارۂ علوم اسلامیہ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے بہت موزوں تھا اور انھوں نے جس طرح سے کام کا آغاز کیا اس

سے ان کی اہلیت، علمیت اور کام کرنے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اس ادارے کی ترقی کے لیے بڑی محنت کی اور آج ہم اس کو جس شکل میں دیکھ رہے ہیں، یہ انھیں کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ ان کی رہنمائی میں کام کی سمت کا تعین میٹنگ کمیٹی کی سفارشات کے تحت شروع ہوا۔ بنیادی طور پر یہ ایک ریسرچ کا ادارہ تھا جس کا اصل مقصد ویسٹ ایشیا اور نارتھ افریقہ کے ممالک کی تہذیبی سیاسی، سماجی اور معاشی تاریخ کا جائزہ لینا تھا۔ ان ممالک پر کام کرنے اور وہاں کے مسائل کو سمجھنے کے لیے وہاں کی زبانوں کا جاننا ضروری تھا۔ اس لیے ماڈرن عربی، ماڈرن فارسی اور ماڈرن ترکی سکھائے جانے کا بھی انتظام کیا گیا، یہ بھی طے ہوا کہ یہ ادارہ اپنی فیلڈ سے متعلق کتابیں، رسائل اور مضامین شائع کرے گا۔ کانفرنسیں، سیمنار اور سمپوزیم منعقد کرے گا۔ عربی، فارسی اور ترکی زبان وعلوم سے متعلق تین چیرز قائم کی گئیں اور یہ طے کیا گیا کہ اس سلسلے میں ان مضامین کے اہم علمار اور دانشوروں کو ان کے ملکوں سے بلایا جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ادارہ کے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالعلیم نے بیروت، دمشق، تہران، قاہرہ، استنبول اور انقرہ کا دورہ کیا تاکہ وہاں کے لوگوں کو اس ادارہ کے بارے میں معلومات فراہم کریں اور انھیں علیگڑھ آنے اور یہاں کچھ دن قیام کر کے درس دینے کے لیے آمادہ کریں اور اس سلسلے میں ان ممالک کی یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے اندازِ تعلیم اور طریقِ کار کو سمجھیں اور ان ملکوں سے اس ادارے کے لیے کتابیں، رسائل اور دوسرے ضروری وسائل فراہم کریں۔

اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم شعبۂ عربک اور اسلامک اسٹڈیز کے ذمہ ۱۹۵۰ء سے چلی آرہی تھی۔ ۱۹۶۸ء میں شعبۂ عربی اور اسلامک اسٹڈیز کو الگ الگ دو شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یعنی عربی اور اسلامک اسٹڈیز دونوں کے شعبے علحدہ ہو گئے۔ یونیورسٹی کی اکیڈمک کاؤنسل نے ستمبر ۱۹۶۸ء میں یہ طے کر دیا کہ ادارۂ علوم اسلامیہ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کی حیثیت سے بھی کام کرے گا۔ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامک اسٹڈیز مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کی ذمہ داری

ادارۂ علومِ اسلامیہ کی ہوگئی اور یہاں کے اسٹاف ممبرز اپنے تحقیقی کاموں کے ساتھ درس و تدریس کا کام بھی انجام دینے لگے۔ ایم۔ اے اور بی۔ اے کی تعلیم کے علاوہ پی۔ ایچ ڈی میں بھی داخلے ہونے لگے۔ چونکہ ادارۂ علومِ اسلامیہ ایک تعلیمی شعبے کے طور پر کام کرنے لگا۔ اس لیے ۱۹۶۸ء ہی میں سینئر ریسرچ فیلو کا منصب Designation بدل کر لکچرر کر دیا گیا نیز ۱۹۶۹ء میں ریسرچ اسسٹنٹ کی جگہیں بھی لکچررشپ میں بدل دی گئیں۔ اسی سال پری یونیورسٹی کلاس اور گرلز کالج میں بھی اسلامک اسٹڈیز کی کلاسز شروع ہوئیں۔ اسی زمانے میں شبینہ کلاس میں اسلامک اسٹڈیز کی تدریس کا انتظام کیا گیا۔ ایک پروفیسر شپ اور ایک لیڈر شپ شعبہ کو مزید ملیں اور اس طرح سے اب یہاں ایک پروفیسر، پانچ ریڈر اور آٹھ لکچرر ہو گئے۔ تحقیقی کام پوری لگن اور توجہ سے ہو ہی رہا تھا۔ اب تدریسی کام بھی دلچسپی اور محنت سے ہونے لگا، ریسرچ کے کاموں پر زیادہ زور دیا گیا، تا کہ اس ادارے کے قیام کا جواز مستحکم ہو سکے۔

ادارۂ علومِ اسلامیہ نے اپنے قیام کے تھوڑے ہی عرصے بعد خاصی شہرت حاصل کر لی، یہ اپنے انداز کا ہندوستان میں پہلا ادارہ ہے جہاں اسلام اور اسلامی ممالک کی تاریخ اور علوم و فنون سے متعلق برابر کام ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارے کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ یہاں سے جو چیزیں شائع ہوئیں ان کی اپنی وقعت ہے اور انھیں علمی دنیا میں سراہا جاتا ہے، یہاں کے اساتذہ کو ملک اور بیرونِ ملک میں لکچر دینے، سیمینار اور کانفرنسوں میں شرکت کے لیے خصوصی طور سے بلایا جاتا ہے۔ یہاں جتنے لوگ کام کرتے ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی مخصوص فیلڈ اور اس سے متعلق کم از کم ایک اہم زبان عربی، فارسی یا ترکی پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ تقریباً ہر شخص نے مضامین، مونوگرافت اور کتابیں تیار کی ہیں جن کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ادارہ بنیادی طور پر ایک تحقیقی کام کرنے کا ادارہ ہے، جب تک تدریسی ذمہ داریاں یہاں کے اسٹاف پر نہیں تھیں وہ سب صرف ریسرچ کے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ تدریسی ذمہ داریوں کے بعد بھی علمی اور تحقیقی کام جاری ہے۔ اس ادارہ کا باقاعدہ

منظور شدہ بجٹ ہے جس سے کتابوں کی اشاعت ہوتی ہے۔ دو رسالے، ایک انگریزی میں ایک اردو میں نکلتے ہیں۔ لائبریری کے لیے کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ اور اس قسم کے دوسرے کام ہوتے ہیں۔ ادارۂ علوم اسلامیہ سے انگریزی، اردو، اور فارسی میں برابر کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

ادارۂ علوم اسلامیہ کے دو رسالے ایک اردو میں مجلّہ علوم اسلامیہ کے نام سے ششماہی اور دوسرا انگریزی میں بلیٹن آف دی انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے نام سے سالانہ برابر شائع ہوتے ہیں جو ساری علمی دنیا میں تحسین کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان رسالوں میں شعبہ کے ممبران کے علاوہ ملک اور بیرونِ ملک کے اہم محققین کے مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان دونوں رسالوں کا بنیادی مقصد یہی رکھا گیا کہ زیادہ تر مغربی ایشیا میں وقوع پذیر ہونے والے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تاریخی رجحانات کا جائزہ پیش کیا جائے اور جن لوگوں کو ان ممالک اور ان کے مسائل سے دلچسپی ہے انھیں اہم معلومات سے روشناس کرایا جائے۔ اس کے علاوہ اسلام اور اسلامی علوم سے متعلق اہم اور تحقیقی مقالات کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ ان رسالوں میں شائع ہونے والے مضامین کے معیار کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی دنیا ان رسالوں میں شامل ہونے والے مضامین کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ان رسالوں کی ادارت کی ذمہ داری انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی ہوتی ہے اور وہ ان رسالوں میں مسلمانوں اور مسلم ممالک کے تاریخی سیاسی، ادبی، معاشی، مذہبی اور تہذیبی پہلوؤں سے متعلق مضامین خصوصی طور پر شائع کرتے ہیں۔

اس ادارے کے بنیادی مقاصد میں اسلام اور اسلام سے متعلقہ علوم پر قومی اور بین الاقوامی سطح پر کانفرنسیں، سیمینار اور سمپوزیم منعقد کرنا بھی تھا۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی بین الاقوامی کانفرنس مشہور مورخ اور جغرافیہ داں المسعودی کا ہزار سالہ جشن تھا جو جنوری ۱۹۵۸ء میں انڈین سوسائٹی فار ہسٹری آف سائنس کے تعاون سے منایا گیا۔ اس میں ملک اور بیرونِ ملک سے ساٹھ مندوبین نے شرکت کی۔ اس موقع پر یہ طے کیا گیا کہ اس ادارے کی طرف سے ہر دوسرے

سال ایک اسلامک اسٹڈیز کانفرنس ہوا کرے گا جس میں اسلام اور علوم اسلامی سے متعلق کام کرنے والے مفکرین اور محققین دانشوروں اور علمار کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے گا اور ان کے خیالات سے استفادہ کیا جائے گا۔ اس کا یہ اصول بھی طے ہوا کہ یہ کانفرنس ملک کے مختلف شہروں اور اداروں میں منعقد کی جائے گی تاکہ دلچسپی رکھنے والے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت ہو سکے۔ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے نوسیشن مختلف مقامات پر ہوئے جس میں نہ صرف دانش گاہوں کے محققین نے شرکت کی بلکہ عربی مدارس کے علمار و فضلائ نے بھی شرکت کی۔ اس میں اسلامک اسٹڈیز سے متعلق اہم علمار اور مفکرین کو ان کے منتخبہ عنوانوں پر لکچر دینے کے لیے بھی بلایا جاتا ہے۔ سوئے اتفاق سے ۱۹۸۲ء میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز تغلق آباد نئی دہلی میں ہونے والی کانفرنس کے آخر میں الیکشن کے وقت چند اختلافات پیدا ہو گئے جس کی وجہ سے کانفرنس معرضِ التوا میں پڑ گئی۔

ادارہ علوم اسلامیہ کی ایک الگ لائبریری بھی ہے جس میں لگ بھگ ۴۰ ہزار کتابیں ہیں۔ یہ اپنے انداز کی ہندوستان میں واحد لائبریری ہے جس میں اسلام، علومِ اسلامی، اسلامی ممالک اور اسلامک اسٹڈیز سے متعلق ہر قسم کی کتابیں اردو، عربی، انگریزی، فرنچ، جرمن، ترکش، فارسی وغیرہ میں موجود ہیں۔ صرف اسلامک اسٹڈیز سے متعلق اتنا بڑا ذخیرہ کتب شاید ہی ہندوستان کیا ایشیا میں کہیں بھی موجود ہو۔ اس لائبریری سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے بہت سے اسکالر علیگڑھ آتے رہتے ہیں۔

حوالے

۱۔ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کلاز ۵

۲۔ پریذیڈنشل ایڈریس۔ اکمل ایوبی، بلیٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ۲۲، ص ۲

۳۔ ملاحظہ ہو ایکزیکیٹو آرڈی نینس وجیسٹر ۱۱/۱۲ ص ۵۸

(ماخوذ تہذیب الاخلاق، علیگڑھ، مارچ، اپریل ۱۹۹۸ء)

ڈاکٹر منور حسین

شعبۂ اردو — ایک تعارف

سرسید کے کارناموں میں ایک مفید کام مدرسۃ العلوم کی تاسیس (۱۸۷۵ء) ہے۔ ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو ایم۔ اے۔ او کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ کالج ۱۹۲۰ء میں جب مسلم یونیورسٹی بن گیا تو اس وقت اس دانش گاہ میں علوم و فنون کے مختلف شعبے قائم ہوئے جن میں شعبۂ اُردو بھی ہے۔ اس شعبے کے ذریعے یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں علم و ادب کا ذوق نکھرا۔ شعرا ر اردو نے صرف ذوق ہی کی آب یاری نہیں کی بلکہ مختلف ادبی تحریکوں کے لیے راستہ بھی ہموار کیا۔

شعبہ کے قیام کے ساتھ ہی سید سجاد حیدر یلدرم جو اس وقت یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی تھے ۶ر جون ۱۹۲۱ء کو شعبہ کے اعزازی ریڈر اور چیرمین مقرر کیے گئے۔ اسی تاریخ میں رشید احمد صدیقی کا تقرر بھی اردو و فارسی لکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ سجاد حیدر یلدرم ۱۹۲۸ء تک اس شعبہ کے سربراہ رہے۔ اسی سال سرکاری ملازمت پر ان کی واپسی کے بعد اس وقت کے پرو وائس چانسلر مسٹر ہورن بعد ازاں مسٹر ریمز بوتھم یکے بعد دیگرے شعبہ کے نگراں مقرر ہوئے ایسا اس لیے کیا گیا کہ از روئے ضابطہ شعبہ کی صدارت و سربراہی کے لیے کم از کم ریڈر ہونے کی شرط تھی۔ کوئی لکچرر شعبہ کا سربراہ نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ

۱۹۳۵ء تک یہ شعبہ پرو وائس چانسلر کی نگرانی میں کام کرتا رہا۔ ۱۹۳۵ء میں رشید احمد صدیقی ریڈر اور صدر شعبہ ہوئے اور مولانا احسن مارہروی اور جلیل احمد قدوائی لکچرر مقرر ہوئے۔

۱۹۲۳ء سے یونیورسٹی میں ایف۔ اے اور بی۔ اے کی سطح پر پہلی مرتبہ اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت حاصل ہوئی اور طلبا کے پہلے گروہ نے ۱۹۲۴ء میں اردو میں بی۔ اے کا امتحان دیا۔ اسی وقت سے بی۔ اے آنرز اور ایم اے کی کلاسیں بھی شروع کر دی گئیں۔ ۱۹۳۶ء میں آل احمد سرور نے اس یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور اسی سال بحیثیت لکچرر ان کی خدمات شعبۂ انگریزی سے شعبۂ اردو میں منتقل کر لی گئیں۔ ۱۹۳۸ء میں جب مولانا احسن مارہروی ملازمت سے سبکدوش ہوتے تو سرور صاحب سینئر لکچرر بنائے گئے، اس کے بعد ظہیر الدین علوی اور محمد عزیز بھی لکچرر مقرر ہوئے۔

رشید احمد صدیقی ۱۹۵۴ء میں پروفیسر کے منصب پر فائز ہوئے اور ۳۰ر اپریل ۱۹۵۸ء میں وہ اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے۔ پروفیسر آل احمد سرور اسی سال صدر شعبہ ہوئے اور ملازمت سے سبکدوشی (۱۹۷۳ء) تک اس منصب پر فائز رہے۔ بعد ازاں پروفیسر خورشید الاسلام نے مسندِ صدارت سنبھالی اور ۱۹۷۹ء تک وہ شعبہ کے سربراہ رہے۔ اب تک یہ ہوتا تھا کہ جو استاد صدر شعبہ ہوتا وہ اپنی مدت ملازمت تک شعبہ کی سربراہی کرتا تھا مگر پروفیسر ثریا حسین کے زمانے (۱۱ر جولائی ۱۹۷۹ء) سے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ اب صدارت کی مدت صرف پانچ سال ہوا کرے گی۔ پروفیسر ثریا حسین پانچ برسوں تک شعبہ کی صدر رہیں۔ اس کے بعد صدارت کی یہ مدت صرف تین سال کر دی گئی۔ چنانچہ اب تک پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر قاضی عبدالستار، پروفیسر منظر عباس نقوی، پروفیسر نعیم احمد، پروفیسر اے۔ ایم۔ کے شہریار، اس شعبہ کی سربراہی کر چکے ہیں۔

ابتدا سے آج تک جتنے اساتذہ اس شعبے سے مستقل یا عارضی طور پر

ـــــــــــ

ماہی فکر و آگہی (علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء)

منسلک رہے ان کی مجموعی تعداد، ویمنس کالج کے اساتذہ اردو کے بشمول، کم وبیش نوّے ہوتی ہے۔ موجودہ صدر شعبہؔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ۱۶ر جون سنہ ۱۹۹۶ء کو شعبہ کی صدارت سنبھالی۔ اس وقت یہ شعبہ ۳۲ اساتذہ پر مشتمل ہے۔ ان میں پانچ پروفیسر، بارہ ریڈر اور پندرہ لکچرر ہیں۔ واضح رہے کہ سنہ ۱۹۹۰ء میں پروفیسر آل احمد سرور پروفیسر ایمریٹس کے مرتبہ پر فائز ہوئے۔ سنہ ۱۹۹۲ء میں معروف فکشن نگار قرۃ العین حیدر بھی وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کر چکی ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کا یہ شعبہ برِصغیر ہندوپاک کی تمام یونیورسیٹیوں کے شعبہ ہائے اردو میں سب سے بڑا اور قدیم ہے۔ شعر وادب کی نمایاں اور بزرگ ترین ہستیاں اس شعبہ سے وابستہ رہی ہیں۔ ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور محققوں کی کئی نسلیں یہاں سے مستفید ہوتی رہی ہیں۔ اس شعبہ سے وابستہ جن ادیبوں، شاعروں نقادوں اور محققوں کو علم وادب کی دنیا میں امتیاز و اعتبار حاصل رہا ہے۔ ان میں سجاد حیدر یلدرم، رشید احمد صدیقی، مولانا حسرت موہانی، آل احمد سرور، علی سردار جعفری، مجنوں گورکھپوری، مسعود حسین خاں، خورشید الاسلام، معین احسن جذبی، اختر الایمان، مجاز لکھنوی، خلیل الرحمٰن اعظمی، محمد حسن، قمر رئیس، راہی معصوم رضا، قاضی عبدالستار، بشیر بدر، اور شہریار قابلِ ذکر ہیں۔

تدریسی خدمات: ابتدائی سطروں میں یہ ذکر آچکا ہے کہ پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۲۳ء میں اردو زبان کو ایف۔ اے اور بی۔ اے کے لیے ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں طلبار نے پہلی مرتبہ یہاں سے اردو میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ سنہ ۱۹۳۵ء سے بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کی کلاسز بھی شروع کر دی گئیں۔ اس وقت سے آج تک اس شعبہ میں زبان وادب کی تدریس وتعلیم کا کام بڑی سرگرمی وانہماک سے جاری ہے۔ یہاں کے معیارِ تعلیم کا کچھ اندازہ اس شعبہ سے طلبار کی وابستگی اور ان کی روز افزوں تعداد کو بھی دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ جاری سال سنہ ۱۹۹۷-۹۸ء میں گریجویشن کی سطح پر اختیاری مضمون کی حیثیت سے بی۔ اے کی تین کلاسوں میں طلبار کی کل تعداد دو سو اٹھانوے ہے اور پوسٹ گریجویٹ طلبار کی کو

لہ آجکل پروفیسر اصغر عباس صدر شعبہ ہیں۔ (ادارہ)

تعداد چھبتر ہے۔ اس یونیورسٹی کا یہ خاص امتیازی پہلو ہے کہ یہاں گیارہویں کلاس کی طرح بی۔ اے، بی۔ ایس۔ سی اور بی۔ کام کے پہلے سال میں تمام طلبار کو اردو زبان ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھنا ہوتا ہے۔ اس سال ایسے طلبار کی مجموعی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔

زمانے کی ضرورت کے پیش نظر بی۔ اے کی سطح پر بعض پروفیشنل کورسز اور Job Orianted Courses بھی شروع کیے گئے ہیں مثلاً اردو صحافت میں کمیونی کیشن، ٹرانسلیشن، فنکشنل اردو وغیرہ۔

زبان و ادب کی تدریس میں تمام اصناف نثر و نظم کے علاوہ تاریخ و تنقید کے پرچے بھی نصاب کا حصہ ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ادبی شخصیات کا خصوصی مطالعہ بھی اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل ہے۔ ان میں غالب، سرسید، اقبال اور پریم چند قابلِ ذکر ہیں۔ اختیاری مضامین کی دوسری قسم میں قدیم اردو متن، مشرقی شاعری اور اردو ادب کا تہذیبی و سماجی پس منظر، نیز ہم عصر اردو ادب جیسے مضامین بھی شامل ہیں۔ ایک اختیاری مضمون تقابلی ادب کا بھی ہے جس کے ذیل میں طلبار کو مختلف زبانوں کے اعلیٰ ادبی شہ پاروں سے متعارف کرایا جاتا ہے۔

انجمن اردوئے معلّٰی: طلبار کی ادبی اور تحریری صلاحیتوں کو جلا دینے اور ان میں تصنیف و تالیف کا شوق پروان چڑھانے کے لیے یہاں ابتدا ہی سے ایک فعّال انجمن "انجمن اردوئے معلّٰی" کے نام سے کام کرتی رہی ہے۔ مولانا حسرت موہانی کی قائم کردہ یہ انجمن آج تک اس شعبہ کے ذریعے یونیورسٹی کے طلبار کی ادبی و تصنیفی ذوق کی آبیاری کر رہی ہے۔ بالعموم ایم۔ اے کے کسی باصلاحیت طالب علم کو ہر سال اس کا سکریٹری بنایا جاتا ہے اور شعبہ کے کسی استاد کی نگرانی میں اس کے جلسے منعقد ہوتے رہتے ہیں جن میں شعبہ اور شعبہ سے باہر کے طلبار اپنی علمی و ادبی تخلیقات پیش کرتے ہیں۔ ان پر انھیں مشورے بھی دیئے جاتے ہیں۔ یہ انجمن وقتاً فوقتاً باہر سے آنے والی معروف ادبی و علمی شخصیتوں کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کے لیے مدعو کرتی ہے۔

علی گڑھ میگزین: یونیورسٹی سے شائع ہونے والا طلبار کا یہ علمی و ادبی ترجمان شعبۂ اُردو ہی کے زیرِ اہتمام شائع ہوتا ہے۔
پروفیسر رشید احمد صدیقی کے زیرِ ادارت ۱۹۲۰ء سے علیگڑھ منتھلی کے نام سے شائع ہونے والا یہ میگزین اب علیگڑھ میگزین کے نام سے معروف و مشہور ہے۔ یہ سالانہ مجلہ اپنی علمی، ادبی اور تحقیقی معیار کے لحاظ سے ملک کے مؤقر رسائل و جرائد میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے مضامین اپنے مواد کے اعتبار سے حوالہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے عمومی شماروں کے علاوہ اس کے خصوصی شمارے بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں غالبؔ، اکبرؔ، سرسیّد، افسانہ، طنز و مزاح، علیگڑھ ہم عصر اردو ادب اور انتخاب نمبر بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ گزشتہ ۷۷ برسوں میں اس کے کل ۱۱۲ شمارے شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد متعدد وجوہ سے کئی سال اس کے شمارے شائع نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ۳۷ برسوں میں کل پندرہ عمومی و خصوصی شمارے ہی شائع ہو سکے ہیں۔

مقابلہ جاتی امتحانات: مختلف سرکاری عہدوں پر تقرری کے لیے ہونے والے مقابلوں کے لیے یونیورسٹی میں ایک کوچنگ سینٹر قائم ہے۔ سول سروسز کے امتحانات میں اردو بھی ایک اہم مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے اساتذہ نے اس مضمون کی تیاری میں طلبار کی خصوصی مدد و رہنمائی کی۔ وہاں کلاسیں لیں جس کے نتیجے میں متعدد ہونہار طلبار نے کامیابیاں حاصل کیں۔

تعلیمی سہولتیں: اس وقت شعبۂ اُردو میں یونیورسٹی کے بیشتر شعبوں کی طرح اپنی سیمینار لائبریری ہے جس میں پوسٹ گریجویٹ طلبار کے مطالعے کے لیے وافر نشستوں اور کتابوں کی سہولت موجود ہے طلبار کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے کبھی کبھی تنگ دامانی کا بھی احساس ہوتا ہے اور پہلے تو ریسرچ کے طلبار کے لیے بھی مطالعہ و نشست کا وہیں نظم تھا مگر ۱۹۹۰ء سے ریسرچ اسکالرس کے لیے الگ سے ایک صیغۂ تحقیق Research Division قائم ہو گیا ہے، جہاں ان کے حسبِ حال مطالعہ کی سہولت فراہم ہے۔ اب تک

شعبہ کی ان دونوں لائبریریوں کے لیے جو کتب خریدی گئی ہیں ان کی مجموعی تعداد ۱۵ ہزار ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ۱۹۹۲ء میں اس شعبہ کو ڈپارٹمنٹ آف اسپیشل اسسٹنس کا درجہ دیا۔ اس کے لیے ایک علاحدہ لائبریری اور اس سے وابستہ ارکان کی نشستوں اور مطالعہ کی سہولت پیدا ہوگئی ہے جس کے پیش نظر شعبہ کی کارکردگی میں نمایاں بہتری کی توقع کی جاتی ہے۔ حال ہی میں اس شعبہ کو سابق صدر شعبہ پروفیسر نعیم احمد مرحوم کی ذاتی کتب کا گراں قدر ذخیرہ بھی حاصل ہوگیا ہے جس سے یہاں کتابوں کی تعداد دوگنی ہوگئی ہے۔ اس وقت ڈی۔ ایس اے میں کتب ورسائل کی کل تعداد سوا تین ہزار سے زائد ہے۔

شعبہ میں ریسرچ کی صورتِ حال: درس و تدریس کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر غور و تحقیق بھی شعبہ کی نصابی مصروفیات کا حصّہ ہے۔ اس عمل کی ابتداً ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، پروفیسر نور الحسن ہاشمی اور مسعود حسین خاں کے تحقیقی مقالوں سے ہوتی ہے۔ دلی کا دبستان شاعری، لکھنؤ کا دبستان شاعری اور مقدمہ تاریخ زبان اردو شعبہ کی تحقیقی سرگرمیوں کی خشت اول ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں پہلی پی۔ ایچ۔ ڈی ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کو تفویض کی گئی تھی۔ شعبہ کے تحقیقی عمل نے ہر دور میں اپنے معیار کا اعتبار قائم رکھا ہے۔ صحیح بات تو یہی ہے کہ تحقیق میں کمیت سے زیادہ کیفیت کو اہمیت حاصل ہے مگر ایک نظر اس طرف بھی ڈالی جائے کہ اس عرصے میں کتنا تحقیقی کام ہوا ہے؟ تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ ابتدائے سے اب تک ایک سو پندرہ افراد نے زبان و ادب کی متعدد جہات اور شخصیات پر تحقیق کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ درمیان کے کچھ عرصے میں یو۔ جی۔ سی نے ہندوستان کی تمام یونیورسٹیز میں پی۔ ایچ۔ ڈی سے پہلے ایم۔ فل کا کورس لازم کر دیا تھا۔ چنانچہ اس عرصے میں مختلف موضوعات پر تقریباً نوّے مقالے ایم۔ فل کے لیے لکھے گئے اور ان پر یہ ڈگریاں دی گئیں۔ اس پورے عرصے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ تین افراد نے مختلف موضوعات پر نمایاں تحقیقی کام کے نتیجے میں ڈی۔ لٹ D Litt کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ ان کے اسمائے گرامی

، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر شمیم حنفی اور ڈاکٹر نور الحسن نقوی۔

یہاں ریسرچ اسکالرس کی سہولت کے لیے ایک صیغۂ تحقیق بھی قائم ہے
ان وافر کتابوں اور شور و غل سے محفوظ نشستوں کا معقول انتظام ہے۔ یہاں
، کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ یو۔جی۔سی کے ذریعے مقابلہ جاتی امتحانات میں
ان کے طلبا نے نمایاں کارکردگی کا ثبوت دیا ہے اور ۱۹۸۵ء سے اب تک
لیس طلبا و طالبات یو۔جی۔سی ریسرچ فیلوشپ کے مستحق ہو چکے ہیں جب کہ
ت لکچرر کی اہلیت کا امتحان NET پاس کرنے والوں کی تعداد ان کے
،وہ ہے۔

شعبہ میں ہونے والی ان تحقیقی کوششوں میں سے ایک معقول تعداد طباعت
، مرحلہ سے گزر کر کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ اب تک تقریباً چالیس تحقیقی
لات اور بیس کے قریب ایم۔فل کے مقالات مختلف اداروں سے شائع
چکے ہیں۔ ابھی متعدد مقالے ایسے ہیں جو طباعتی مصارف نہ ہونے کے باعث
، عام پر نہیں آسکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ عمومی استفادے کی خاطر ان کی طباعت
ی کوئی نظم کیا جاتا ہے۔

اس وقت شعبہ میں ریسرچ کرنے والوں کی تعداد ۹۸ ہے اور ان میں سے
، IRF یا SRF ہیں اور ۵ اصرف NET پاس کرنے والے طلبا و
بات ہیں۔

شعبہ کے تحقیقی معیار کو بلند کرنے کی خاطر یہاں پر تحقیق کاروں کی ایک انجمن
یسرچ ایسوسی ایشن" بھی قائم ہے جو شعبہ کے کسی استاد کی نگرانی میں اپنے
ے منعقد کرتی ہے اور ان میں زیادہ تر زیرِ تحقیق موضوعات ہی کے کسی پہلو پر
ے پیش کیے جاتے ہیں۔ طلبا و اساتذہ بحث میں حصہ لیتے ہیں اور اس
، روشن و تاریک پہلو اجاگر کیے جاتے ہیں جس سے طالب علم اپنے
ے کے عیب و صواب سے واقف ہوتا ہے اور اس کی روشنی میں اس کی
اح کرتا ہے۔

یمنار و توسیعی خطبات : علم کے فروغ میں مذاکروں اور مباحثوں کا

رول غیر معمولی ہوتا ہے۔ شعبہ نے ساٹھ کی دہائی سے اس طرف بھی توجہ دی اور یہاں کا پہلا سیمینار ۱۹۶۴ء میں تنقید کے بنیادی مسائل پر ہوا تھا۔ اس کے بعد سے زبان و ادب، ادیبوں اور شاعروں اور مختلف اصناف ادب کے حوالے سے چونتیس مذاکروں اور مباحثوں کا انعقاد ہو چکا ہے۔ ان میں اکثر سیمنار عہد ساز ثابت ہوئے ہیں اور کافی عرصے تک اس کے اثرات محسوس کیے گئے ہیں۔ اقبال، غالب، ابوالکلام آزاد، شبلی، سید سلیمان ندوی، پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، رشید احمد صدیقی اور حسرت موہانی، وہ ادبی شخصیات ہیں جن پر اہم سیمنار ہوئے اسی طرح جدیدیت اور ادب، اردو فکشن، تنقید، غزل، علم شرح اور جدید اردو نظم پر بھی تاریخ ساز مذاکروں کا انعقاد ہوا۔ ان مذاکروں کے پہلو بہ پہلو شعبہ نے وقتاً فوقتاً توسیعی خطبات کا بھی اہتمام کیا۔ زبان و ادب کے تقابلی جہات اور مختلف تہذیبی اور سماجی موضوعات پر مقتدر ادیبوں اور دانشوروں کے خطبات کا اہتمام ہوا۔ ۱۹۸۴ء سے اب تک بیس کے قریب ایسے توسیعی خطبات و مقالات کا ریکارڈ ہمارے پاس محفوظ ہے جن سے فکر و نظر کو روشنی ملی اور تبادلۂ خیالات اور افکار کے مواقع فراہم ہوئے۔ ان سیمناروں اور کانفرنسوں اور توسیعی خطبات کے ذریعے ایک سو سے زیادہ ملکی ادیبوں، دانشوروں، اور عالموں سے شعبہ کا رابطہ ہوا۔ اسی طرح پچیس سے زیادہ دیگر ممالک سے آنے والے عالموں اور ادیبوں سے تبادلۂ افکار و خیالات کی صورت پیدا ہوئی۔

اساتذہ کی تصانیف : شعبہ سے وابستہ اساتذہ کی بنیادی ذمہ داری درس و تدریس اور تحقیق کی نگرانی ہے۔ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی دیگر متنوع مصروفیات میں علمی و ادبی مذاکروں میں شرکت، رسائل کی ادارت، توسیعی خطبات و مقالات کی پیش کش وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب کے پہلو بہ پہلو وہ اپنے تصنیفی و تحقیقی کام میں بھی مصروف و منہمک رہتے ہیں یہاں کی تصانیف کئی طرح کی ہیں۔ ایک تو کسی موضوع پر طبع زاد مواد علم و تحقیق کی فراہمی، کلاسیکی شعری و نثری متوں کی ترتیب و تدوین، نثری و شعری تخلیقات کے مجموعے دوسرے

طلبار کی درسی ضروریات کے پیش نظر نصابی کتب کی تیاری۔ چنانچہ ابتدائ سے ۱۹۹۵ء تک کی جملہ تصانیف کا اگر احاطہ کیا جائے تو ان کی مجموعی تعداد دو سو بچاس کے قریب پہنچتی ہے۔ ان میں تحقیقی مقالات بھی شامل ہیں۔ تنقیدی مضامین کے مجموعے بھی اور نثری و شعری تخلیقات بھی۔

وقتاً فوقتاً اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی رہی کہ طلبار کے لیے ان کے درجات و استعداد کے مطابق نصابی کتب کی تیاری کی جائیں، ان میں بی۔ اے کے تین درجات اور ایم۔ اے کے دو درجات کے مختلف کورسیز، نیز گیارہویں اور بارہویں درجات کے لیے بھی اختیاری اور لازمی نصابات کے لیے درسی کتب شامل ہیں۔ چنانچہ اب تک کم و بیش چالیس نصابی کتابیں مختلف اوقات میں تیار کی گئیں ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو نظر ثانی کے عمل سے گزریں یا جن میں جزوی یا کلی ترمیمات کی گئیں۔ واضح رہے کہ یہاں بی۔ اے کے ابتدائی دو سال میں اختیاری مضمون رکھنے والوں کی ضرورت کے پیش نظر نثر و نظم کی تقریباً آٹھ نصابی کتب کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ بی۔ اے سال آخر اور ایم۔ اے کی نصابی کتابیں اُن کے علاوہ ہیں۔ دوسری طرف بی۔ اے، بی۔ ایس۔ سی اور بی۔ کام کے پہلے سال میں لازمی اُردو کے لیے چار قسم کی نصابی کتابیں درکار ہوتی ہیں۔ ایک کتاب ان طلبار کے لیے جو ہندوستانی میڈیم سے اردو زبان سیکھ سکتے ہیں۔ دوسری کتاب ان طلبار کے لیے جن کی ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان ہوتی ہے۔ تیسری کتاب اردو زبان کی ابتدائی واقفیت رکھنے والوں کے لیے اور چوتھی کتاب ان طلبار کے لیے جن کی اُردو سے واقفیت قدرے بہتر ہوتی ہے۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ اساتذہ کے وہ مضامین جو ملک و بیرونِ ملک کے مؤقر ادبی و علمی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۶ء تک کے جو اعداد و شمار دستیاب ہیں اُن کی رُو سے اس عرصے میں ۶۳۸ مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے یا سیمناروں میں پیش کیے گئے۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سیمنار و کانفرنس میں شرکت : شعبہ کے اساتذہ نے جن علمی و ادبی مذاکروں اور مباحثوں میں شرکت کی ہے وہ قومی سطح کے بھی ہیں اور بین الاقوامی نوعیت کے بھی۔ اس طرح کے مذاکروں کی تعداد بے شمار ہے۔ اس کے علاوہ ملک و بیرونِ ملک متعدد ادبی و علمی اداروں میں شعبہ کی نمائندگی، توسیعی خطبات، مشاعروں اور ریڈیائی پروگراموں میں شرکت، ریفریشر کورسز میں رلیسورس پرسنز کی حیثیت سے ان کے لکچرس بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ملک کے علمی و ادبی مراکز کے علاوہ بیرونِ ملک جن ممالک اور شہروں میں اس شعبہ کی نمائندگی ہوئی ہے، ان میں پاکستان بنگلہ دیش، بحرین، قطر، دبئی، ماریشس، برطانیہ، امریکہ اور سعودی عرب لائقِ ذکر ہیں۔

رسائل کی ادارت : اساتذہ نے اپنی تدریسی و تخلیقی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ یہاں سے شائع ہونے والے دو مؤقر رسالے 'تہذیب الاخلاق' اور 'فکر و نظر' کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ پروفیسر نورالحسن نقوی، پروفیسر مسعود عالم، پروفیسر نعیم احمد تہذیب الاخلاق کے مدیر رہے ہے۔ موجودہ مدیر پروفیسر ابوالکلام قاسمی ہیں۔ فکر و نظر یونیورسٹی کا بڑا معیاری علمی مجلہ ہے۔ پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر نورالحسن نقوی، اور پروفیسر شہریار اس کے مدیر رہے ہیں۔ ان مدیروں نے رسائل کے معیار کی بہتری اور ان میں تنوع پیدا کرنے میں جو رول ادا کیا ہے وہ اہلِ علم و ادب سے مخفی نہیں ہے۔

انعامات و اعزازات : یہاں کے اساتذہ اپنی ادبی و لسانی خدمات کے اعتبار سے معتبر و ممتاز رہے ہیں۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں متعدد انعامات سے نوازا گیا ہے۔ ہندوستان کی مختلف ریاستی اردو اکیڈمیوں اور میر اکیڈمی کے انعامات کے علاوہ دیگر اہم اور وقیع انعامات و اعزازات حسبِ ذیل ہیں؛

پروفیسر رشید احمد صدیقی، (پدم شری، ساہتیہ اکادمی انعام) پروفیسر آل احمد سرور، (پدم بھوشن، ساہتیہ اکادمی انعام، صدر پاکستان کا طلائی تمغہ، غالب مودی

ایوارڈ، عالمی فروغ اردو ادب انعام) ڈاکٹر معین احسن جذبی (اقبال سمان) پروفیسر قاضی عبدالستار (پدم شری، غالب انعام) پروفیسر اے۔ کے۔ ایم شہریار (ساہتیہ اکادمی انعام)

ریفریشر کورس: اردو زبان و ادب کا ایک اہم مرکز ہونے کے ناطے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ۱۹۸۸ء میں اس شعبہ کو اساتذۂ اردو کی تربیت کے لیے ایک علاقائی مرکز کی حیثیت دی اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے تحت اردو میں بھی ریفریشر کورس کا آغاز ہوا چنانچہ ۱۹۸۹ء سے آج تک ہر سال پابندی سے زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر ایک ایک ماہ کے دو ریفریشر کورس انجام پاتے ہیں۔ شعبہ کا کوئی سینئر استاد ان کورسوں کا کوآرڈی نیٹر ہوتا ہے جو ملک کے مختلف حصوں اور مختلف یونیورسٹیز سے اس موضوع پر سند مانے جانے والے افراد کو لکچرس کے لیے مدعو کرتا ہے اس طرح یہ پروگرام اساتذہ کے فکر و نظر میں وسعت کا سبب بھی بن رہا ہے اور اس سے تدریسی معیار کی بہتری میں بھی مدد مل رہی ہے۔

ڈی۔ ایس۔ اے: شعبہ کی لسانی اور ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۹۲ء میں یو۔ جی۔ سی نے اسے ڈپارٹمنٹ آف اسپشل اسسٹنس کا درجہ دیا۔ اس کے تحت ایک پروفیسر ایک ریڈر ایک ریسرچ ایسوسی ایٹ اور ایک ریسرچ فیلو کی جگہیں شعبہ کو دی گئیں۔ مطالعے کے لیے ۱۹۲۰ء کے بعد کا ادب اور تقابلی ادب کے موضوعات کیے گئے۔ اس کے پہلے کوآرڈی نیٹر پروفیسر منظر عباس نقوی تھے۔ اس کے بعد پروفیسر نعیم احمد اور پروفیسر اے۔ ایم۔ کے شہریار کوآرڈی نیٹر بنے۔ موجودہ کوآرڈی نیٹر صدر شعبہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی ہیں۔ اس پروگرام کے تحت گزشتہ پانچ برسوں میں متعدد توسیعی خطبات اور سیمنار کا اہتمام ہوا۔ پنجابی، اردو اور مراٹھی اور اردو افسانوں کے تقابلی مطالعے کے لیے ایک سات روزہ ورکشاپ منعقد ہوئی۔ مختلف افسانہ نگاروں کا تنقیدی مطالعہ ہوا اور ان کے منتخب افسانوں کے تجزیے کیے گئے۔ ان مطالعات پر مبنی تصانیف زیر اشاعت ہیں۔ جب کہ بعض سیمناروں کے مقالات اور تنقیدی

مضامین کے مجموعے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اس پانچ سالہ کارکردگی کی تفصیلی رپورٹ یو۔سی۔جی۔ کو پیش کی جا چکی ہے۔

منصوبے: شعبے کی کارگزاریوں میں وہ منصوبے Projects بھی اہمیت رکھتے ہیں جو وقتاً فوقتاً شعبۂ اردو کو اجتماعی طور پر یا کسی استاد کو انفرادی طور پر یو۔جی۔سی یا حکومت ہند کی مختلف وزارتوں کی طرف سے ملتے رہے ہیں۔ ان منصوبوں میں تاریخ اردو ادب، اردو نصابات کی تشکیل نو سرسید کی ادبی و لسانی خدمات، TDIL اور امبیڈکر کی تصانیف کا اردو ترجمہ جیسے Projects بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

۱۹۶۶ء سے شعبۂ اردو نے اپنی سالانہ کارگزاریوں سے اردو دنیا کو واقف کرانے کے لیے ایک خبرنامہ کے اجراء کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے جو "رفتار" کے نام سے بڑی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

ہم کو خدا نے دنیا میں اس لیے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں برا کرنے والے کی برائی سے ہم کو کیا کام۔ ہم کو اپنا دل، اپنی زبان بھی رکھنی چاہیے۔ بدوں یا بدطینتوں پر افسوس کرنا چاہیئے۔ مگر اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے آپ کو بھی ویسا ہی کرنا ہے۔ جو لوگ برا کہنے والے ہیں ان کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیئے۔ اگر وہ برائی ہم میں ہے تو اس کے دور کرنے کی کوشش لازم ہے۔ اگر نہیں ہے تو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ وہ برائی ہم میں نہیں ہے۔ (سرسید احمد خاں بنام سراج الدین احمد)

پروفیسر آبھا لکشمی سنگھ

شعبۂ جغرافیہ

مشہور و معروف جغرافیہ داں مرحوم Professor Dudley Stamp نے ہندوستان کو اپنے ایک دورے میں یہ فرمایا تھا کہ علیگڑھ ہندوستانی جغرافیہ کا مکہ ہے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ جغرافیہ ان کی امیدوں پر پورا اترا۔ اس شعبہ نے جغرافیہ کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیتے ہوئے ہندوستان کے اولین شعبہ کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس شعبہ نے درس و تدریس کی اعلیٰ سہولیات فراہم کیں جس کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان کے مختلف خطوں بلکہ بیرونِ ممالک سے طلبار کی ایک بڑی تعداد یہاں آنے لگی۔

اس صدی کے ابتدائی عشرے میں شعبہ کی نشو ونما اور بتدریج ترقی سے یہ بات واضح ہے کہ پورے برِ صغیر ہند و پاک میں ایک ہی ایسا مرکز ہے جہاں جغرافیہ کی تعلیم اعلیٰ پیمانے پر ہوتی ہے اور وہ ہے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ جغرافیہ۔ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ جغرافیہ کا قیام ۱۹۲۴ء میں عمل میں آیا، جہاں صرف انڈر گریجویٹ کورسز کی تعلیم کا انتظام تھا۔ آہستہ آہستہ پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کا آغاز ہوا اور پوسٹ گریجویٹ طلبار کا پہلا بیچ ۱۹۳۱ء میں شعبہ سے فارغ ہوا۔

پروفیسر میجر ای۔ ڈبلو ڈان کو اس شعبہ کا حقیقی بانی کہا جا سکتا ہے۔

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کیونکہ انھوں نے ہی ایک علاحدہ شعبہ کی داغ بیل ڈالنے کی پیش رفت کی۔ ۰۰
اس شعبہ کے پہلے صدرِ شعبہ (۳۳-۱۹۲۴ء) رہے۔ انھوں نے شعبہ میں نہ صرف
جغرافیکل سوسائٹی کے قیام اور ایک جغرافیہ کے ریسرچ جرنل کی اشاعت کی
ضرورت کو محسوس کیا بلکہ عملی جامہ پہنایا۔ وہ اے۔ ایم۔ یو جغرافیکل سوسائٹی کے
پہلے صدر (۲۷-۱۹۲۶ء) بھی منتخب ہوئے۔ جغرافیکل ریسرچ جرنل جسے
The Geographer کے نام سے موسوم کیا گیا۔ پہلی بار ۱۹۲۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔
یہ رسالہ سال میں دو مرتبہ نکلتا تھا اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا جریدہ تھا۔ اس میں
جغرافیہ سے متعلق مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے جسے نہ صرف
ہندوستان بلکہ بیرونِ ممالک میں کافی سراہا جاتا ہے۔

۱۹۴۰ء تک درس و تدریس کو مؤثر بنانے کی طرف توجہ مرکوز رہی۔ رفتہ رفتہ
ریسرچ کی ابتدا ہوئی۔ اس کو مختلف طریقے سے حوصلہ افزائی کر کے اس کے
موضوعات کو کافی متنوع بنانے کی کوششیں ہوئیں۔ زیادہ تر ریسرچ تاریخی جغرافیہ
کے فیلڈ میں ہوئی اور اسی کے ساتھ دورِ وسطیٰ کے مسلمانوں اور عرب جغرافیہ دانوں
کے علم ہیئت اور علم کائنات کی خدمات پر خاص طور پر زور دیا گیا۔ اس دور کے
مطبوعہ اہمیت کی حامل کاموں میں پنجاب کی تاریخی جغرافیہ خاص طور سے
دریاؤں کے بدلتے سمتوں کے توضیحی اشارے اور جغرافیہ میں اہلِ عرب کی
خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ آہستہ آہستہ مستقل طور پر جغرافیہ میں ڈاکٹریٹ کا کام
شروع ہوا اور ۱۹۴۱ء میں شعبہ کی پہلی پی۔ ایچ۔ ڈی ایوارڈ ہوئی۔ ڈاکٹر محمد یونس
اس شعبہ کے سب سے پہلے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ انھوں نے اپنا مقالہ بعنوان
A Survey of Food Resource in Relation to the Population Problem of the United Provinces
پروفیسر ایس۔ ایم۔ طاہر کی زیرِ نگرانی مکمل کیا اور
اسی سال شعبۂ جغرافیہ نے ایک مشہور مقالہ Physiographic Divisions of India
شائع کیا جو اب تک بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ دو نئے پرچے اکونومک
جغرافیہ اور ایگریکلچر جغرافیہ پوسٹ گریجویشن کی سطح پر شروع کیے گئے۔

۱۹۵۰ء کے بعد ڈاکٹریٹ ریسرچ کا پروگرام مختلف شعبوں مثلاً علاقائی

شہری، انسانی، آبادی، زرعی زمین کا استعمال، انڈسٹریل جغرافیہ، ارڈزون کے
مسائل اور سیاسی جغرافیہ میں کافی زور و شور سے شروع ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں صرف
اور صرف علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو علاقائی ترقی پر ایک بین الاقوامی کانفرنس
انعقاد کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس کانفرنس نے پوری دنیا کے جغرافیہ دانوں
کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ کسی بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہندوستان
میں اپنی نوعیت کی پہلی مثال تھا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جغرافیہ کو Applied Orientation
دیا گیا۔ جغرافیہ دانوں کا آلۂ کار مثال کے طور پر سروے کے طریقے، تجزیے اور
کسی خاص علاقے کی تعبیر کا احسان ان کا بنیادی محرک بنا۔ اور یہ محسوس کیا گیا
کہ ایسا مطالعہ معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ پروفیسر محمد شفیع نے ایگریکلچرل
جغرافیہ میں ایک نئے طرز کی شروعات کی جس کی وجہ سے شعبۂ جغرافیہ کو عالمی
پیمانے پر خراجِ تحسین حاصل ہوا۔ پروفیسر محمد شفیع نے اپنا مقالہ لندن اسکول آف
اکونومکس کے استاد پروفیسر ڈوڈلے اسٹیمپ کی زیرِ نگرانی بعنوان
Land Utilisation in Eastern Uttar Pradesh 1956 مکمل کیا۔ انھوں نے
وہیں ایگریکلچرل جغرافیہ کی اہمیت بطورِ خاص ہندوستان جیسے ممالک کے
لیے بہت ہی شدت سے محسوس کیا۔ اسی دوران ریسرچ میں فیلڈ سروے اور
سیمپل سروے کی شروعات ہوئی۔ اسی دوران زمین کے استعمال سے متعلق
سروے گھگھر کے میدانی علاقے، وادیٔ کشمیر، بندیل کھنڈ کے علاقے، گنگا جمنا
کے اوپری دوآبے، مرکزی گنگا جمنا کے دوآبے، ضلع پیلی بھیت، بریلی اور
رام پور، مرکزی گنگا گھگھر دوآبے، مرکزی گجرات کے میدان، ضلع شاہ جہاں پور،
بدایوں، گھگھر راپتی دوآبے، ٹرانس راپتی میدان ہریانہ، ضلع متھرا، آگرہ، الہ آباد
فتح پور، ضلع نرسم پور اور ہوشنگ آباد اور مشرقی ہمالیہ Cropping Pattern
and Crop-Combination Regions. کا سروے گنگا جمنا دوآبہ اور گڑھوال
ہمالیہ Wasteland ضلع علیگڑھ Nutritional Level and Deficiency
Diseases کا سروے کمایوں، گڑھوال، ضلع الہ آباد، فتح پور، گنگا جمنا دوآبے
کے علاقے میں Food Crop Productivity and Agricultural Efficiency

سروے مغربی اتر پردیش، اتر پردیش اور مشرقی ہمالیہ میں Dry 1 and Farming
سروے شمالی ہندوستان میں کیے گئے ایگریکلچر جغرافیہ میں قابلِ ذکر خدمات کی
وجہ سے شعبہ ایگریکلچر جغرافیہ میں اختصاص کے مرکز کی حیثیت سے مشہور ہوا۔
اس کے نتیجے میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ۱۹۷۹ء میں اس شعبہ کو اسپیشل
اسسٹنس کا درجہ عطا کیا۔ پروفیسر محمد شفیع ڈی۔ ایس۔ اے پروگرام کے پہلے
کوآرڈی نیٹر رہے اور ۱۹۹۶ء میں پروفیسر ابھا لکشمی نے اس پروگرام کے کوآرڈی نیٹر
کی حیثیت سے چارج لیا۔

شعبۂ جغرافیہ کو وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند کے ذریعہ تشکیل شدہ نیشنل کمیٹی
برائے جغرافیہ کی نمائندگی کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس شعبہ نے کئی ورک شاپ
سیمنار اور کانفرنسز دونوں قومی اور بین الاقوامی سطح پر منعقد کرائے بین الاقوامی
جغرافیکل یونین کے دو کمیشن آن اپلائڈ جغرافیہ اور کمیشن آن ایگریکلچرل ٹائپولوجی
کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا۔ ایک واحد اعزاز اس شعبہ کو اس وقت حاصل
ہوا جب پروفیسر محمد شفیع کو بین الاقوامی جغرافیکل یونین کے انٹرنیشنل کمیشن کے
Comparative
چیئرمین کی حیثیت Research in Food Systems of the World
کے لیے منتخب کیا گیا۔ اسی سال پروفیسر محمد شفیع کو بین الاقوامی جغرافیکل یونین کے
نائب صدر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔ رائل جغرافیکل سوسائٹی نے انھیں اپنی
کونسل کی ممبرشپ عطا کر کے ایک اعلیٰ انعام سے سرفراز کیا۔

۱۹۸۴ء کے بعد درس و تدریس اور ریسرچ کو دوبارہ فوقیت ملی جب
۱۹۸۵ء میں پروفیسر مہدی رضا نے انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کورسز کو
از سر نو ترتیب دیا۔ انڈر گریجویٹ کی سطح پر زمین روزگار سے منسلک کورسیز کا
باقاعدہ طور پر آغاز کیا گیا۔ دو نئے ریجنل کورسز کی شروعات ہوئی۔ تین جنوبی
برِاعظموں اور ایشیائی جغرافیہ کی شروعات ہوئی۔ پوسٹ گریجویشن کی سطح پر
تین نئے اختیاری پیپر ایکولوجی اینڈ انوائرمنٹل مینجمنٹ ریجنل ڈیولپمنٹ اینڈ
پلاننگ اور جغرافی آف رسورسز کی شروعات ہوئی۔ اسی دوران شعبۂ جغرافیہ
میں ایک بہت ہی اہم پروگرام پندرہ روزہ ریسرچ گروپ میٹنگ کا باقاعدہ

طور پر آغاز ہوا۔ نیشنل کانفرنسز کا باقاعدگی سے انعقاد ہوا۔ اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کی ایک بہت بڑی تعداد نے ملک کے مختلف علاقوں میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ شعبہ کی ریسرچ کی سرگرمیوں کے سلسلے میں جو طریقہ کار ساٹھ کے عشرے میں وضع کیا گیا تھا۔ اس پر آج بھی عمل جاری ہے۔ ریسرچ میں اپلائڈ اورینٹیشن کی ابتدا ہوئی جس کا پورا انحصار فیلڈ سروے پر ہے۔ شعبہ میں ریسرچ کا زیادہ تر کام ایگری کلچرل جغرافیہ، شہری جغرافیہ انڈسٹریل، میڈیکل آبادی اور ماحولیات وغیرہ کے شعبہ میں ہوتا ہے۔

شعبۂ جغرافیہ کا حالیہ پس منظر: ۱۹۹۵ء کے بعد شعبہ نے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے مختلف اقدام کا آغاز کیا۔

۱۔ **نئے نصاب کا آغاز اور اس کو موثر بنانے کا طریقہ کار:** ۴ سال کے وقفے کے بعد گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کے نصاب کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا، تاکہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں علمی اور عملی ضرورت کو پورا کیا جا سکے۔ یو۔جی۔سی کے ماڈل نصاب مختلف ریاستی اور سینٹرل یونیورسیٹیز کے جغرافیہ کا نصاب، یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحانات کے نصاب، یو۔جی۔سی کے جے آر ایف نیٹ کے امتحانات کے نصاب کو مدنظر رکھ کر مرتب کیا گیا۔

پوسٹ گریجویشن کی سطح پر ایم۔اے/ایم۔ایس۔سی کے کورسز اور نصاب میں اڈوانس اور عملی دونوں طرح کے مضامین کو اختصاص حاصل ہے جس کو تین سالہ گریجویشن کورسز کی بنیاد پر بہت ہی جامع اور مستحکم بنایا گیا ہے۔ جن نئے کورسز کا آغاز ہوا ہے اس میں شامل ہیں۔ حیاتیاتی جغرافیہ، ماحولیاتی دیہی جغرافیہ، سماجی جغرافیہ، وسائل کا جغرافیہ اور کارٹوگرافی ہندوستان سے متعلق پیپر کو اب ہندوستان کا سسٹیمٹک اور ریجنل جغرافیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کورسز کے مضامین کو تازہ ترین ترقیات کی روشنی میں وضع کر کے اس کو بہتر بنایا گیا ہے اور اس کے آخری یونٹ کو ہندوستانی

علاقائیت اور مندرجہ ذیل علاقوں جیسے گنگا کا میدان، ہندوستانی ریگستان، چھوٹا ناگپور پلیٹو اور وادی کشمیر کے وسیع مطالعہ کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔

۲۔ شعبہ کی لائبریری میں ترقی: شعبۂ جغرافیہ کی سیمنار لائبریری ہندوستان میں جغرافیہ کی کتابوں اور جرائد کے بیش بہا خزانوں میں سے ایک ہے۔ اس میں قریب قریب تیس ہزار کتابیں ہیں جن میں ۵۵ جرائد (۱۷ قومی اور ۳۸ بین الاقوامی جرائد) شامل ہیں۔ یونیورسٹی لائبریرین پروفیسر نور الحسن نے لائبریری کی حالت کو بہتر بنانے میں اہم تعاون دیا ہے۔ کتابوں، جرائد اور پیریوڈیکل کو نئے سرے سے ترتیب دے کر عنوان، کتاب کے مصنف اور مضامین کی مختلف موضوعات کی بنیاد پر اس کی کیٹلاگنگ کی گئی ہے۔ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سیمنار لائبریری میں بہت سی نئی کتابیں اور پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۳۔ شعبۂ جغرافیہ کی ترقی: جان ہٹلر، اترپردیش کے پہلے گورنر جنرل نے ۱۹۲۶ء میں شعبہ جغرافیہ کی پرانی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ یہ پرانی عمارت رہائشی سرسید ہال کے شمال مغرب کی جانب دو منزلہ عمارت پر مشتمل تھی۔ شعبہ جغرافیہ کی نئی عمارت کی تعمیر ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ یہ عمارت مولانا آزاد لائبریری کی پشت پر ہے جس میں ایک آفس، ۴ لیکچر تھیٹر، ۲ تجربہ گاہ۔ ایک کارٹوگرافک تجربہ گاہ، میپ سیکشن فوٹو گرافک تجربہ گاہ اور ایک کتابوں سے آراستہ لائبریری شعبہ کے پاس موجود ہے۔ جغرافیکل میوزیم، سروے روم اور کمپیوٹر کارٹوگرافی لیب کی تعمیر کا پلان زیر غور ہے۔ اب تک کوئی بنا ریکس ٹینشن نہیں ہوا ہے۔ توسیع کی شدید ضرورت ہے۔ لڑکوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اساتذہ کی تعداد میں اضافہ اور نئے کورسز مثال کے طور پر ریموٹ سینسنگ ایپلی کیشن، کمپیوٹر کارٹوگرافی اور جی۔ آئی۔ ایس سسٹم کی ابتدا کے پیش نظر شعبہ میں ایک نئے ونگ کی توسیع کی شدید ضرورت ہے۔ وائس چانسلر مسٹر محمود الرحمن نے ایک قابل قدر گرانٹ شعبہ کی ایک ونگ کی توسیع کے لیے فراخ دلی سے منظور کر لی ہے، توسیع شدہ عمارت، ایک

کمپیوٹر کارٹوگرافک تجربہ گاہ ایک سروے انسٹرومنٹ روم اور اساتذہ کے لیے ۔ الماروں پر مشتمل ہے اور اس نئے ونگ کی تعمیر ۱۹۹۷ء میں مکمل ہو چکی ہے۔

جغرافیہ ریسرچ گروپ کا احیا:

جغرافیہ میں ریسرچ کو پرزور طریقے سے بڑھاوا دینے اور دلچسپی پیدا کرنے اور مشاہداتی مرکز کو تقویت بخشنے کے لیے ریسرچ گروپ کا دوبارہ احیا کیا گیا۔ ۹۶-۱۹۹۵ء اور ۹۷-۱۹۹۶ء کے دوران ہر پندرہ روزہ وقفہ پر ریسرچ نشستوں کا انعقاد ہوا۔ ریسرچ اسکالرس نے اپنے پیپرس پیش کرنے میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

اے۔ ایم۔ یو جغرافیکل سوسائٹی: علیگڑھ مسلم یونیورسٹی جغرافیکل سوسائٹی جسے ابتدا میں کرزن جغرافیکل سوسائٹی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کا قیام میجر ای۔ ڈبلوڈان کی صدارت میں ۲۷ مارچ ۱۹۲۵ء میں عمل میں آیا جو اس وقت شعبہ کے صدر بھی تھے، جب ہی سے اس سوسائٹی نے ملک کے ایک پوائیز ادارے کی حیثیت سے اس سبجکٹ میں درس و تدریس کو فروغ دے کر جغرافیہ میں سائنسی دلچسپی پیدا کرنے، ریسرچ کے کاموں کو پروان چڑھانے اور طلبار میں مضمون سے متعلق دلچسپی پیدا کرنے میں اپنے فرائض منصبی کو خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔

اس سال ۹۷-۱۹۹۶ء میں اے۔ ایم۔ یو جغرافیکل سوسائٹی کی صدر پروفیسر آبھا لکشمی سنگھ اور دو کنوینرز ڈاکٹر صلاح الدین قریشی اور ڈاکٹر شہاب فضل نے طلبار کے لیے مقابلہ جاتی امتحانات کا ایک کامیاب سال بنانے میں بڑی جاں فشانی سے کام لیا۔ اور یہ خیال کیا گیا کہ اے۔ ایم۔ یو جغرافیکل سوسائٹی کو ایک لاؤنچنگ پیڈ کی حیثیت سے ان طلبار کے لیے جو مختلف کیریر کے لیے خواہاں ہیں استعمال کرنا چاہیئے۔ اس وجہ سے سوسائٹی کی مختلف سرگرمیوں کو مقابلہ جاتی پہلو دیا گیا۔

مشن کے طور پر سوسائٹی کے دو عہدے دار خطابت کی بنیاد پر منتخب ہوئے۔ مسٹر غلام کبریا ایم۔ اے رایم۔ ایس۔ سی (فائنل) نائب صدر اور روح الدین

تینوں جرائد ہمارے اساتذہ کی جغرافیہ کے میدان میں خدمات اور ان کی شعبہ کی ناموری کی کاوش کی یادگار کے اعزاز میں شائع ہو رہے ہیں۔
ایم۔ اے رایم۔ ایس۔ سی (سال اول) سکریٹری کی حیثیت سے شیش ۹۷-۱۹۹۶ء کے لیے منتخب ہوئے۔ کئی سالوں کے بعد جغرافیکل سوسائٹی نے سرگرم پروگرام منعقد کیے۔

شعبۂ جغرافیہ میں ایک ریسرچ جریدہ The Geographer کی اشاعت۔
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی جغرافیکل سوسائٹی جسے پہلے کرزن جغرافیکل سوسائٹی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں پروفیسر ای۔ ڈبلیو۔ ڈان کی صدارت میں قائم ہوا۔ The Geographer کا پہلا شمارہ ۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا جو سوسائٹی کا ایک اہم عضو تھا۔ اس جریدہ کی اشاعت سال میں دو مرتبہ جنوری اور جولائی میں ہوتی ہے۔ ۱۹۴۹ء سے لے کر آج تک کے تمام شمارے محفوظ ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس جریدہ نے بین الاقوامی شہرت حاصل کرلی اور اس کے خریدار پورے کرۂ زمین پر پھیل گئے۔ اس جریدہ نے جغرافیہ کے مختلف شعبوں میں مضامین اور ریسرچ پیپر شائع کیے۔
ماضی قریب میں جریدہ کی اشاعت میں کافی تساہل سے کام لیا گیا۔
پروفیسر آبھا لکشمی سنگھ نے مدیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد مندرجہ ذیل اہم کام کیے۔

ا۔ ادارتی بورڈ کو از سر نو تشکیل دیا۔
ب۔ ملک کے اندرون اور بیرونِ ممالک بے شمار خطوط لکھ کر اعلیٰ ریسرچ مضامین منگوائے گئے۔
ج۔ خریداروں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کی گئی۔

۱۹۹۴ء کا جولائی کا شمارہ ۱۹۹۵ء کا جنوری اور جولائی کا شمارہ پریس سے آچکا ہے۔ نہ صرف ان جرائد کو جدید خیالات سے مزین کیا گیا بلکہ اس کے چار خصوصی شمارے بھی آرہے ہیں ان میں سے ایک قومی کانفرنس میں پڑھے گئے آبادی، غربت اور آلودگی سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے اور دوسرے

اساتذہ، غیر تدریسی عملہ، ٹیکنیکل عملہ کا ایک ٹیم کی حیثیت سے باہمی تعاون The Geographer کی اشاعت کی کامیابی کا باعث ہے۔

مخصوص علاقہ: شعبے کا مخصوص علاقہ زرعی جغرافیہ کے میدان میں ہے اس شعبہ میں دلچسپی پیدا ہونے کی مندرجہ ذیل اسباب ہیں:

(ا) ۱۹۵۶ء Rio-de-Janeiro میں منعقد آئی۔ جی۔ یو کی بین الاقوامی کانفرنس میں پروفیسر ڈوڈلے اسٹیمپ کا صدارتی خطبہ بعنوان "زمینی وسائل کی پیمائش" اور بعد میں جغرافیکل ریویو (نیویارک) میں اس خطبہ کی اشاعت ہوئی۔

(ب) پروفیسر محمد شفیع کا پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی کا مقالہ بعنوان "مشرقی اتر پردیش میں زمین کا استعمال" اور ان کے ریسرچ پیپر "زرعی استعداد" کی اکونومک جغرافیہ Massochusetts میں اشاعت نے نئے زرعی جغرافیہ کی طرف توجہ مبذول کرایا۔

(ج) شعبہ کے ریسرچ اسکالرس نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں زرعی زمین کے استعمال سے متعلق کئی پی۔ ایچ۔ ڈی مقالے تحریر کیے۔ قریب قریب زرعی زمین کے استعمال کے عنوان پر ۲۵ پی۔ ایچ۔ ڈی مقالے مکمل ہو چکے ہیں۔

(د) ۱۹۷۹ء میں یو۔ جی۔ سی نے اس شعبہ کو ڈی۔ ایس۔ اے کا درجہ عطا کیا۔ بعد میں زرعی جغرافیہ سے متعلق مختلف پہلوؤں مثال کے طور پر فصلی طریقۂ کار، زرعی پیداوار، زرعی استعداد، اشیائے خورد و نوش کی پیداوار پر زرعی ٹیکنالوجی کا اثر زرعی قبائلی بے زمین مزدور وغیرہ۔

(ہ) مندرجہ ذیل پروجیکٹ مختلف شعبوں میں مکمل ہوئے۔

۱۔ زرعی پیداوار اور علاقائی غیر توازن — اتر پردیش کا ایک مطالعہ۔
۲۔ اتر پردیش میں داہوں کی تقسیم کاری اور ٹائپولوجی۔
۳۔ زراعت میں انرجی کا استعمال۔

گاؤں کی سطح پر ہندوستانی زراعت میں انرجی کے استعمال سے متعلق ایک پروجیکٹ حال ہی میں مکمل ہوا ہے جہاں زراعت میں مستعمل تمام انرجی کے ذرائع کو بین الاقوامی تبدیلی سطح پر ایک مشترکہ اوزان میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ہندوستانی کاشتکاروں کی کارگزاری کو جانچنے کے لیے اسے زرعی

پیداوار سے منسلک کردیا گیا ہے۔

شعبہ میں زیادہ تر کام زرعی جغرافیہ، ماحولیاتی جغرافیہ، دیہی جغرافیہ آبادی شہری جغرافیہ، سیاسی جغرافیہ، علاقائی ترقی اور جغرافیہ بشر نگاری کے میدان میں ہو رہا ہے۔

زرعی جغرافیہ: شروع میں اس سے جڑے مختلف پہلوؤں جیسے زراعت پر مادی/طبیعیاتی عوامل کے اثرات، اشیائے خوردونوش کے وسائل آبادی کے مسئلے کے تناظر میں مخصوص علاقوں کی زرعی جغرافیہ وغیرہ سے متعلق موضوعات پر مطالعہ ہوا۔ حقیقی معنوں میں ایک روشن پہلو اپلائڈ اور زمین کی دریافت ساٹھ کے عشرے کے بعد ہوئی۔ پروفیسر محمد شفیع کی زیر نگرانی پرزور طریقے سے ریسرچ پروگرام کا آغاز مختلف تنظیموں میں ہوا جیسے زمین کے استعمال غیر زرعی زمینوں کا مسئلہ، زرعی پیداوار، غذائیت اور اس کے کمی کے باعث ہونے والی بیماریاں، آبادی اور زمین کا استعمال، غیر زرعی زمینوں کا مسئلہ، بدلتے ہوئے حالات میں زمین کا استعمال، بنجر زمین میں کاشت کاری وغیرہ۔ ان کی زیر نگرانی اتر پردیش کے زیادہ تر علاقوں میں زمین کے استعمال سے متعلق سروے ریسرچ اسکالرس نے مکمل کر لیے ہیں۔ شعبہ میں ماضی میں وضع کیے ہوئے طریقوں پر ریسرچ کا کام جاری ہے۔ استعمال زمین کے تجزیے کی ٹیکنیک میں ایک اہم تبدیلی ستر کے عشرے میں ہوئی۔ زمین کی قدر و قیمت اور زراعت کی ضرورت سے متعلق مسئلوں پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی۔ مختلف تغیرات کا مشاہدہ کرنے کے لیے استعمال زمین کے ماڈل تیار کیے گئے Von Thunen کا ماڈل مطالعہ کر کے ہندوستانی حالات کے لیے موزوں بنایا گیا۔ پروفیسر ایس۔ صدیقی کی زیر نگرانی زمین کے استعمال اور غذائیت کی سطح سے متعلق ریسرچ کی شروعات ہوئی۔ اور پھر مکمل ہوئی۔ اس دوران شعبہ میں ۸۰ کے عشرے کے بعد ریسرچ میں کافی تنوع پیدا کر کے پروفیسر آبھا لکشمی سنگھ کے زیر نگرانی مختلف شعبوں مثلاً زمین کی تیزابیت زراعت میں ٹکنالوجی، آب پاشی کے مسائل، بدلتی ہوئی قیمتوں کا فصلوں کی کارکرد پر اثر، بے زمین مزدور اور ان کا زرعی معیشت میں کردار وغیرہ میں ریسرچ مکمل

ہوچکے ہیں۔ زراعت سے متعلقہ مسائل جن پر ابھی شعبہ میں کام چل رہا ہے وہ ہیں نقدی فصلوں کا نمونہ اور رجحانات، فصلوں کی کٹائی کی ٹکنالوجی، پیداوار وغیرہ۔ پروفیسر علی محمد نے کئی مقالے زرعی جغرافیہ اور غذائیت پر قلم بند کیئے ہیں۔

ماحولیاتی جغرافیہ : ماحولیاتی خوبی اور قدرتی ماحول میں گراوٹ سے بڑھتی ہوئی تشویش نے ایک نیا مخصوص علاقہ جنم دیا۔ ماحولیات سے متعلق ایک پیپر نہ صرف انڈر گریجویٹ بلکہ پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر نہ صرف شروع کیا گیا بلکہ لازمی قرار دیا گیا۔ جغرافیہ ایک ایسا مضمون ہے جہاں ماحولیات اور انسان کے باہمی تعلقات کا مطالعہ بہت ہی موزوں ہے شہری اور دیہی علاقوں میں ماحولیات میں توازن بگڑنے کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ بھی سودمند ہے۔ شروع میں پروفیسر ایم۔ رضا کی زیر نگرانی Pleistoce ماحولیات اور جھیل کے ایکو سسٹم پر کام ہوا۔ ماحولیاتی عوامل غذائیت کی کمی کے باعث پیدا شدہ امراض اور متعدی امراض پر ماحولیاتی عوامل کے اثرات سے متعلق کام بھی مکمل ہوچکا ہے۔ پروفیسر آبھا لکشمی سنگھ کی زیر نگرانی زمین کی ملکیت کی از سر نو دعوے داری اور گھریلو ماحولیاتی مسائل پر کام بھی مکمل ہوچکا ہے۔ ایکولوجی سے متعلق کچھ مسائل شعبہ میں زیر مطالعہ ہیں۔ مثلاً استعمال زمین کے قاعدے سے متعلق ایکولوجیکل پہلو، بڑھتی ہوئی آبادی اور ایکولوجیکل خطرات، دریاؤں میں بڑھتی آلودگی، شہروں میں ترقی اور اس کے ماحولیاتی اثرات اور اس کا تحفظ اور قدرتی وسائل کا معقول طریقے سے استعمال وغیرہ۔

آبادیاتی جغرافیہ : آبادیاتی جغرافیہ میں اعلی ریسرچز کا آغاز ۶۰ کے عشرے کے بعد ہوا، اشیائے خوردونوش کا تعلق آبادی کے مسائل کے تناظر میں، بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل اور تقسیم آبادی کا زراعت پر بڑھتا انحصار، علاقائی ڈھانچہ، تجزیاتی مسائل، پیشہ ورانہ ڈھانچے میں علاقائی تبدیلیاں ہندوستان میں آبادی کے علاقے وغیرہ میں اعلی ریسرچ پروگرام شروع کیئے گئے ہیں۔ پروفیسر ایس۔ ایم۔ رفیع اللہ کی زیر نگرانی اس شعبہ کے پہلے تمام ریسرچز مکمل کیئے گئے۔ یو۔جی۔سی کا ایک پروجیکٹ بہ عنوان Regional Pattern

of Vital Processes in Uttar Pradesh مکمل کرلیا گیا ہے۔ ریسرچ کے کاموں میں مزید توسیع ہوئی ہے۔ کام کے اشتراک کا علاقائی نمونہ میں بھی مزید توسیع ہوئی ہے۔ مثلاً دیہی آبادی میں بڑھوتری، زرخیزی اور شرح اموات کا نمونہ۔ عورتوں کے حالات زرخیزی عورتوں کے روزگار میں بڑھوتری اور اس کا ڈھانچہ وغیرہ وغیرہ۔

شہری جغرافیہ : شہری آباد کاری کی وجہ سے جو مسئلہ ابھر کر سامنے آیا ہے اور جس تیز رفتاری کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اس نے شہری مراکز اور ان سے متعلق طریقۂ مطالعہ کو خاص طور سے نمایاں کیا ہے شہری جغرافیہ میں ریسرچ مائیکرو اور میکرو دونوں سطحوں پر کیا جا رہا ہے۔ خاص توجہ کے علاقے جن میں ریسرچ کے کچھ کام پروفیسر اے۔ عزیز کی نگرانی میں جاری ہیں۔ وہ ہیں شہری مارفولوجی، شہری غاصبانہ قبضہ، شہری مراکز، شہری مراکز میں زندگی کی کیفیت، شہری آباد کاری وغیرہ۔ وہ شعبے جن میں کام چل رہا ہے۔ شہری اثرات چھوٹے اور متوسط شہروں کا تجزیہ رہائشی عمارتوں کی کیفیت، پیشہ ورانہ نمونے شہروں میں اور شہری ماحولیات میں مطالعہ ہیں۔

دیہی جغرافیہ : ۶۰ کے عشرے کے بعد دیہی جغرافیہ کے میدان میں ریسرچ کا کام چل رہا ہے۔ زراعت اور دیہی جغرافیہ دونوں میں باہمی ارتباط ہے۔ ان دونوں شعبوں میں ریسرچ کا کام بیک وقت جاری ہے۔ ۶۰ کے عشرے کے بعد استعمال زمین دیہی ترقی منضم منسلکہ دیہی ترقی، دیہی نوآبادی کے اقسام، ای۔ آر۔ ڈی پروگرام کا اثر، دیہی معیشت کے میدان میں ریسرچ مکمل کیے جا چکے ہیں۔ ریسرچ کا کام مثلاً دیہی آبادی، زرعی سیکٹر میں عورتوں کی شمولیت، دیہی تبدیلی وغیرہ میں چل رہا ہے۔

علاقائی ترقی اور پلاننگ : قومی مقاصد اور ترقی کے ذرائع میں علاقائی پلاننگ کا رول حال ہی میں مطالعہ کا مرکز بنا ہے اور یہ بڑی شدت سے محسوس کیا گیا ہے کہ اس مسئلہ کا مطالعہ دیہات کی سطح پر ہونا چاہیئے۔ اس ترقی کے فوائد عوام تک اسی وقت پہنچ سکتے ہیں، جب پلاننگ کے عمل میں لوگوں کی براہِ راست شمولیت ہو۔ پلاننگ اور علاقائی ترقی

کے مختلف پہلوؤں پر ریسرچ پروگرام چل رہے ہیں۔ اس میں شامل ہیں۔ صنعتی آبادکاری زراعت میں علاقائی تفاوت، زرعی پلاننگ، مائیکرو سطح پر بنیادی ترقی وغیرہ۔

سیاسی جغرافیہ : سیاسی جغرافیہ کا موضوع، ریاست کے مابین باہمی تعلقات کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ باہمی عمل سے ہی سیاسی نمونہ کا مطالعہ وجود میں آیا۔ ہندوستان کی صوبائی سرحدوں کے ارتقا پر کام کیا جارہا ہے۔ دریاؤں کے پانی کے بٹوارے کے جھگڑے کے جغرافیائی پہلو پر مطالعہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر زیڈ۔ امانی نے لسانی جغرافیہ اور رائے دہندگی کے رویّہ، طرزِ عمل کے میدان میں کچھ کام کیا ہے۔

"جب کہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثے کو آنے مت دو کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اس کو ختم کرو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ ان کی مجلسوں میں آپس کے مباحثے اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔"

(سرسید)

پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری

زولوجی ڈپارٹمنٹ

یادوں کے دریچے سے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے برصغیر میں اپنی ایک منفرد حیثیت ہے۔ اکثر والدین اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے اس درس گاہ میں بھیجنے کی خواہش رکھتے ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں کیونکہ انھیں یقین کامل ہوتا ہے کہ ان کا بچہ نہ صرف علم حاصل کرے بلکہ زندگی کے نشیب و فراز سے بھی واقف ہوگا اور جب بڑا ہو کر عملی میدان میں آئے گا تو اس میں زمانے کے تمام حوادث سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت اور قوت موجود ہوگی۔

میری زندگی کا ابتدائی دور ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۷ء شہر اعظم گڑھ میں گزرا جہاں میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا اور مشہور زمانہ شبلی اسکول و کالج میں پڑھتا تھا۔ ان تاریخی اداروں سے میں نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ میرے دادا گو کہ علی گڑھ کے پڑھے ہوئے نہیں تھے لیکن انھوں نے علی گڑھ میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۰ء تک درس و تدریس کی خدمات انجام دی تھیں۔ والد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علم تھے اور غالباً ان کے دل میں علی گڑھ میں خود نہ پڑھنے کا ملال بھی تھا۔ شاید اسی وجہ سے ان کی یہ خواہش تھی کہ کم از کم ان کے بیٹے اس عظیم درس گاہ سے ضرور فیض یاب ہوں۔ ۱۹۵۷ء میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے فوراً بعد انھوں نے مجھے علی گڑھ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ میرے کئی رشتے دار اور پرانے دوست احباب ایسے تھے جو یا تو پہلے ہی سے علی گڑھ

میں پڑھ رہے تھے یا انھوں نے بھی میرے ساتھ وہاں داخلہ لیا تھا۔ میں ۱۳ر جولائی ۱۹۵۸ء کو پہلی بار علی گڑھ آیا تھا۔ آج ۴۲ سال گزر جانے کے بعد بھی مجھے وہ تاریخی سفر یاد ہے اعظم گڑھ سے چلنا، لکھنؤ میں ٹرین بدلنا، علی گڑھ اسٹیشن پہنچنا اور وہاں کے مشہور ہاسٹل ماریسن کورٹ (عرف عام میں "اصطبل") میں قیام کرنا، آج بھی ذہن کے گوشے میں پوری طرح محفوظ ہے۔ اعظم گڑھ ایک بہت اچھی جگہ تھی۔ وہاں سے کچھ ہی دوری پر ہمارا گاؤں جیراجپور تھا۔ رشتہ داروں کے گاؤں بھی آس پاس ہی واقع تھے۔ جہاں چھٹیوں میں آنا جانا رہتا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ والدین اور بھائی بہنوں سب کا ساتھ تھا۔ غرض کہ زندگی بہت دلچسپ گزر رہی تھی لیکن علی گڑھ آکر، ہاسٹل کی آزادی دیکھ کر اور اپنے جیسے نوجوانوں کا ساتھ پا کر ایسی خوشی ہوئی جس کا بیان مشکل ہے میں سمجھتا ہوں کہ میرے والدین کا میری زندگی کے لیے علی گڑھ بھیجنے کا فیصلہ ہی سب سے بہتر تھا۔ خوب پڑھائی، خوب کھیل کود، خوب ہنسی مذاق، ہر طرح کی سرگرمیاں، پھر ہاسٹل کا نظم وضبط، ڈائننگ ہال کے قوانین وضوابط، یونیورسٹی اور خود کلاسز میں بہترین اساتذہ۔ یہ سب علی گڑھ آکر ہی حاصل ہوا۔ میں نے ان دنوں کو اپنی زندگی کے سب سے سنہرے دن کے طور پر محسوس کیا۔ یہ احساس آج بھی اسی تابندگی کے ساتھ زندہ ہے۔ یوں بھی ہر علیگ اپنے علی گڑھ کے گزرے ہوئے زمانے کو پسند کرتا ہے۔ اسے یاد کرتا ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو انیسویں صدی کی پانچویں دہائی اور چھٹی دہائی کے ابتدائی برسوں کو علی گڑھ کے آخری سنہری دور سے تعبیر کیا جائے گا کیونکہ ۱۹۶۵ء کے واقعات کے بعد علی گڑھ میں کچھ ایسی تبدیلیاں واقع ہوئیں اور پھر رفتہ رفتہ حالات ایسے بدلتے گئے کہ وہ بات ہی نہیں رہی جو شاید ہمارے زمانے میں تھی۔ اس وقت طلبہ کی تعداد محض پانچ ہزار تھی۔ پھر زمانہ بھی بدل گیا ہے۔ قدریں بدلیں، سیاسی ماحول بدلا، حکومتیں بدلیں۔ ان سب کا اثر علی گڑھ پر پڑنا ناگزیر تھا۔

بہر حال! بی۔ ایس سی کے دو سال کھیلتے کودتے گزر گئے۔ ہمارا خوش قسمتی سے اپنی کلاس کے لائق ترین طلبا میں ہوتا تھا لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہم نے پڑھنے میں وہ سنجیدگی اور انہماک نہیں دکھایا جس کی ضرورت تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سائنس کے مضامین یعنی کیمسٹری، زوولوجی اور باٹنی میں مجھے بہت اچھے نمبر ملے یعنی فرسٹ کلاس مگر

انگریزی، ہندی، اردو اور تھیالوجی میں نمبر کچھ زیادہ نہ آسکے۔ حالانکہ ان مضامین ویسے بھی نمبر کم ہی آتے ہیں۔ مگر ہمیں صرف تھوڑے سے نمبروں کی کمی سے سکنڈ ڈویژن ہی ملی۔ اس زمانے میں سکنڈ ڈویژن بھی اچھی کامیابی سمجھی جاتی اس لیے کہ پوری کلاس میں ایک آدھ ہی فرسٹ کلاس ہوتا تھا۔ جب ہم بائیولوجیکل سائنسز کے طالب علم کی حیثیت سے زولوجی، باٹنی، کیمسٹری کے شعبوں میں کلاسز میں حاضر ہوتے تھے تو ظاہر ہے کہ ان تینوں شعبوں اور ان کے اساتذہ کا ذہنی طور پر تجزیہ بھی کیا کرتے تھے۔ یوں تو سبھی شعبہ جات اعلیٰ و یکتا تھے۔ ہمارے تمام اساتذہ بلندپایہ تھے۔ لیکن ان سب میں زولوجی شعبہ کو ایک منفرد اور بلند مقام حاصل تھا جو خدا کا شکر ہے آج بھی ہے۔ اس کی وجہ غالباً اس ڈپارٹمنٹ کے صدر جناب پروفیسر محمد بابر مرزا صاحب اور ان کے چند ایک قریبی رفقاء جیسے پروفیسر بصیر خاں، شاہ مسعود عالم صاحب وغیرہ تھے۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے اس مختصر مضمون میں زولوجی ڈپارٹمنٹ کے ابتدائی دنوں کے ذکر پر ہی اکتفا کیا ہے۔ انھیں دنوں کی یادیں ہیں، انھیں دنوں کی باتیں ہیں اور انھیں دنوں کے لوگوں کا ذکر ہے۔ وقت نے وفا کی اور عمر نے ساتھ دیا تو انشاء اللہ آنے والے دنوں میں کبھی زولوجی ڈپارٹمنٹ کے تدریجی ارتقاء اور اب تک کے حالات قلمبند کروں گا۔ مندرجہ ذیل تذکرے میں وہی نام شامل ہیں جو اب یا تو ہمارے درمیان نہیں رہے یا سبکدوش ہو چکے ہیں۔

یہ ڈپارٹمنٹ ۱۹۲۹ء میں قائم ہوا تھا اور چند سال غالباً سرسید ہال میں رہا۔ ۱۹۳۴ء سے یہ اپنی موجودہ عمارت میں ہے۔ بابر مرزا صاحب جرمنی سے ڈاکٹریٹ کر کے آئے تھے وہ نہ صرف شکل و صورت، قد و قامت، لب و لہجہ اور رکھ رکھاؤ بلکہ ہر انداز سے یورپین معلوم ہوتے تھے۔ طرۂ امتیاز یہ کہ ہم لوگوں نے ان کے بارے میں یہ سن رکھا تھا کہ یہ دنیا میں ساتویں نمبر کے زولوجسٹ ہیں یہ ایک ایسی بات تھی جس کی اصلیت تو کبھی معلوم نہ ہو سکی لیکن ان کی شخصیت کا رعب ہر اس شخص پر طاری ہو جاتا تھا جو زولوجی ڈپارٹمنٹ میں داخل ہوتا تھا اور اگر کسی نے خوش قسمتی سے ان کی ایک جھلک ڈپارٹمنٹ یا دفتر میں دیکھ لی

تو وہ اس کے لیے اس دن کا موضوع گفتگو ہو جاتا تھا۔ ان کے عزیز شاگرد اور بلند پایہ سائنسداں پروفیسر بشیر خاں اور شاہ مسعود عالم صاحب نہ صرف عظیم تھے بلکہ اپنے اندر بے پناہ علمی کشش بھی رکھتے تھے۔ ڈپارٹمنٹ کے دیگر اساتذہ بھی کم اہمیت کے حامل نہیں تھے مثلاً سید ظہور قاسم صاحب، نواب حسن خاں صاحب، اطہر صدیقی صاحب، سید عبدالعزیز صاحب، عثمان اودھی صاحب، معین فاروقی صاحب اور وسیم احمد صدیقی صاحب وغیرہ۔ بہرحال! ان دنوں علم الحیاتیات کے ہر طالب علم کی پہلی ترجیح اور دلی خواہش ہوتی تھی کہ کاش اس عظیم شعبے میں داخلہ مل جائے۔ داخلہ مل گیا تو بس سمجھ لیجیے کہ اسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔

گو کہ میرے والد مجھے میڈیکل کا ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن غالباً میرے نانا اور دادا کی مدرسی اور تحقیق کی روح میرے اندر مچل رہی تھی۔ والدہ کی بھی خاموش خواہش یہی تھی کہ میں علمی میدان میں رہوں اور تحقیق کو ہی اپنا موضوع بناؤں۔ لہٰذا باوجود اس کے کہ لائف سائنسیز کے زیادہ تر طلباء کئی بار میڈیکل کے ٹسٹ میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ لیکن میں نے کبھی بھی اس سمت پیش قدمی نہیں کی۔ میرے سامنے میرا مقصد ہمیشہ بہت واضح رہا۔ ۱۹۵۹ء میں بی۔ ایس سی پاس کرنے کے بعد جب میرا داخلہ زوولوجی میں ہو گیا تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی نہ صرف میں بلکہ اتفاقاً میرے کئی قریبی دوست بھی اسی میں آگئے۔ ہم سب اپنی قسمت پر نازاں تھے کہ ہم یونیورسٹی کے سب سے اعلیٰ شعبے سے وابستہ ہو گئے ہیں اور انشاء اللہ ہماری تعلیم و تربیت ایسی ہو گی جیسی نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا میں کسی بھی اچھی سے اچھی جگہ ممکن تھی۔

بابر مرزا صاحب یونیورسٹی روڈ پر ایک کوٹھی میں رہتے تھے۔ یہ کوٹھی آج بھی موجود ہے جو یونیورسٹی کے ایڈمنسٹریٹو بلاک کے بائیں سمت ہے اور اس میں اب رجسٹرار آفس کا کچھ عملہ بیٹھتا ہے۔ ان کے گھر صرف ایک بار عید کے موقع پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ بھی ڈرتے ڈرتے۔ انھوں نے نہایت ہی انگریزی انداز میں عید کی مبارکباد قبول کی اور صرف حیدرآبادی الائچیاں پیش

گیں۔ ان کی بیگم جرمن لیڈی تھیں۔ غالباً ان دونوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ مرزا صاحب کے ۱۹۶۱ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد دونوں جرمنی میں منتقل ہو جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ مرزا صاحب وقت کے بہت پابند تھے اور ڈپارٹمنٹ آنے جانے کے اوقات پر سختی سے کاربند رہتے تھے۔ اس زمانے میں یونیورسٹی میں صرف چند کاریں ہی تھیں۔ ان میں سے ایک مرزا صاحب کے پاس بھی تھی۔ مرزا صاحب کو آتے جاتے دیکھ کر لوگ اکثر اپنی گھڑی درست کر لیا کرتے تھے۔ ہمیں یہ فخر ہے کہ ہم مرزا صاحب کے شاگرد رہے اور ان کے شاگردوں کے بھی شاگرد رہے۔ ہمارے دور کو مرزا صاحب کے چل چلاؤ کا دور ہی کہا جائے گا۔ ان کے پڑھانے کا ایک منفرد انداز تھا۔ وہ جو کچھ بھی پڑھاتے تھے وہ عموماً امتحان میں کم ہی آتا تھا۔ وہ ہر مضمون کو ابتدا سے شروع کرتے تھے اور اس کے ارتقائی منازل سے گزرتے ہوئے اس کی انتہا تک پہنچاتے تھے امتحان میں ان کے پرچے کا اندازہ لگانا بہت مشکل نہ ہوتا تھا پچھلے سال کے سوالات چھوڑ دیجئے اور اس کے تین چار سال پہلے کے بیس پچیس سوالات تیار کر لیجئے۔ بس مطمئن ہو جائیے کہ آپ کی تیاری ان کے مضمون کی ہو گئی۔ میں نے ایم۔ ایس۔ سی کے پہلے سال ہی سے چاروں پرچوں سے متعلق الگ الگ رجسٹر بنا رکھے تھے جن کی جلدیں پیلی تھیں ان میں مختلف سوالات تیار کر رکھے تھے اور ان کو ذہن نشین کرتا رہتا تھا۔ میرے ریسرچ میں داخلہ لینے کے بعد بھی کئی سال تک ایم۔ ایس سی MSc کے طلبا ان رجسٹروں سے استفادہ کرتے رہے کچھ نے اسے پڑھ کر فائدہ اٹھایا تو کچھ نے نقل کر کے۔ ایم۔ ایس۔ سی میں میں سیمنار لائبریری کا انچارج تھا۔ ہم میں سے کئی لڑکے بارہ ایک بجے رات سے پہلے ڈپارٹمنٹ سے واپس ہاسٹل نہیں جاتے تھے۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ڈپارٹمنٹ میں تفریح بھی ہو جاتی تھی۔ اکثر ٹیسٹ یا امتحانات کے قریب کئی راتیں تو میوزیم کی اسٹڈی میں ہی سو کر گزرتی تھیں۔ آج یہ سب سوچ کر کتنا عجیب لگتا ہے۔ لیکن ایک لگن تھی، ایک جوش تھا، ایک ولولہ تھا جس کے بل بوتے پر سب کچھ کر گزرنے اور آگے بڑھنے کی خواہش رہی اور اگر آج کچھ بن پائے تو سب کچھ انھیں دنوں کی محنت کا ثمر ہے۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ڈپارٹمنٹ میں دیر تک رہنے میں کوئی زبردستی شامل نہیں تھی بلکہ لکھنے پڑھنے
اور کام کرنے میں ان دنوں دلچسپی اتنی بڑھ گئی تھی کہ وقت کیسے گزر جاتا تھا، پتہ ہی
نہیں چلتا تھا اور کام سے طبیعت بھی نہیں بھرتی تھی یہ صرف میرا ہی حال نہیں تھا
بلکہ اور بھی کئی لوگوں کا تھا۔ رات میں اکثر مرزا صاحب اور کبھی کبھی ان کے شاگرد رشید
بصیر صاحب ڈپارٹمنٹ آجایا کرتے تھے اور وہاں موجود طلبا سے ملتے بھی تھے
وہ لوگ غالباً یہ بھی غور کرتے رہتے تھے کہ کون کون کام کر رہا ہے کون غافل ہے
میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کے تاثرات کی بڑی اہمیت تھی۔ مجھے آج بھی وہ واقعہ
بہت واضح طریقے سے یاد ہے جب کہ میں نے ۱۹۵۹ء میں پہلی بار بہت ہمت کر کے
چیئرمین کے کمرے میں جانے کی جرأت کی۔ مرزا صاحب نے ایک عجیب رعب دار آواز
سے کمرے کے اندر بلایا اور مجھ سے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے انھیں ان کے ہی
پسندیدہ موضوع پر اپنا ایک مضمون Birds are glorified reptiles لکھ کر پیش
کیا۔ پہلے اوپر سے نیچے تک میری شکل دیکھی اور یہ مضمون لے کر اپنے پاس رکھ لیا
پھر گردن جھکالی جس کا واضح مطلب تھا کہ اب میں جا سکتا ہوں۔ اس مضمون کو دیکھ کر
دوسرے دن وہ خود ہی مجھے میری کلاس میں لاکر دے گئے اور اس پر یہ بھی لکھ دیا
کہ I shall be satisfied if you can write this much in the examination
میں پڑھ کر بے حد خوش ہوا کیونکہ مرزا صاحب عموماً کسی سے مطمئن نہیں ہوتے
تھے۔ پھر یہ بھی گمان گزرا کہ بڑے میاں سچ مچ اس سوال کو شاید امتحان میں بھی دیں
گے اور ایسا ہوا بھی۔ وہ پرچہ کئی دہائیوں تک میرے پاس محفوظ رہا۔ اب بھی غالباً
میری کسی الماری میں کتابوں کے درمیان رکھا ہوا ضرور ہوگا۔ اس کے کچھ دنوں بعد
ایک بار پھر ان کے پاس جانا ہوا۔ اس وقت مجھے City Arts Studio
والے بنواری لال فوٹوگرافر کے یہاں سے ان کی ایک فل سائز تصویر مل گئی تھی۔
جس پر میں ان کے دستخط حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس بار پھر ڈرتے ڈرتے ان کے
کمرے میں گیا۔ تصویر دیکھ کر مسکرائے اور بولے کہ کیوں آئے ہیں۔ میں نے کہا "سر!
آپ کی اس تصویر پر آٹوگراف چاہیئے"۔ ہنس کر بولے "تصویروں پر تو ایکٹر اور
ایکٹرسوں کی دستخط لیے جاتے ہیں میرے کیوں لینا چاہ رہے ہیں"۔ میں خاموش رہا

اس اثنا میں وہ دستخط کر چکے اور تصویر مجھے آگے بڑھا دی۔ یہ تصویر برسوں میرے پاس رہی۔ اس کے بعد میرے استاد محترم اور مرزا صاحب کے شاگرد رشید پروفیسر اطہر صدیقی صاحب نے مجھ سے مانگ لی اور ان کے ڈپارٹمنٹ چھوڑنے تک یعنی ۱۹۹۵-۹۶ء تک ان کے کمرے میں لگی رہی۔

مرزا صاحب کے کمرے میں ڈرنے ڈرنے جانے کا تذکرہ اس لیے بھی کر رہا ہوں کہ قدرت نے مجھے ان واقعات کے قریب تین دہائی بعد خود اس کمرے میں چیرمین کی حیثیت سے دو بار فائز کیا۔ میں پہلی بار ۱۹۸۸ء میں جب چیرمین بنا اور مرزا صاحب کی اسی کرسی پر بیٹھا اور اسی میز کا استعمال کیا جس کا انھوں نے کیا تھا تو عجیب سا احساس ہوا۔ قریب نو سال بعد دوبارہ ۱۹۹۷ء میں ایک بار پھر مجھے چیرمین بنایا گیا تو مجھے بار بار وہ واقعات یاد آتے رہے اور میں یہ سوچتا رہا کہ ہمارا معیار کیا ویسا ہی ہے جوان کا تھا۔ کیا ہمارے شاگرد اب اسی ادب و احترام سے ہم سے پیش آتے ہیں جیسے ہم لوگ اپنے استادوں سے آتے تھے۔ مرزا صاحب کم و بیش تیس سال صدر شعبہ رہے۔ یوں تو مرزا صاحب کے سبھی شاگرد تھے لیکن ان کے بعد پروفیسر بصیر صاحب سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ زولوجی ڈپارٹمنٹ میں کچھ ایسا سلسلہ رہا ہے کہ اوپر سے نیچے تک لوگ استادی اور شاگردی کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ اوپر کے جو لوگ ہوتے ہیں، نیچے والے سب ان کے شاگرد ہوتے ہیں گو کہ عرف عام میں اسے Inbreeding کہا جائے گا لیکن ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ معیار میں کبھی کمی نہ آئی اور ہمارا ڈپارٹمنٹ یونیورسٹی کے دو بہترین ڈپارٹمنٹس (زولوجی، جغرافیہ اور ہسٹری) میں شمار ہوا کرتا تھا اور آج بھی یہی کیفیت ہے۔ پروفیسر بصیر صاحب جنھیں علی گڑھ کا کرنل ناصر کہا جاتا تھا مرزا صاحب کے سنہ ۱۹۶۱ء میں ریٹائر ہونے کے بعد اور جرمنی چلے جانے کے بعد ڈپارٹمنٹ کے چیرمین بنے وہ اوپر سے سخت مگر اندر سے بہت پیاری شخصیت کے مالک تھے اور علمی میدان میں، خاص طور پر اپنی تحقیق میں بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔ ٹیچر بھی بہت اچھے تھے۔ ان کے دوسرے ہم پلہ ڈاکٹر افضال قادری صاحب تھے لیکن وہ تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے اور وہاں وائس چانسلر بھی ہوئے۔ دونوں ہی یونیورسٹی کے

ان لیمن ہولڈرس میں سے تھے۔ انفعال قادری صاحب نے کیڑے مکوڑوں اور بصیر صاحب نے بھی دوسرے طرح کے کیڑوں یعنی Nematode Parasites پر کام کیا لیکن افسوس ہے کہ ۱۹۶۱ء سے لے کر ۱۹۹۶ء تک ہی ڈپارٹمنٹ کی قیادت کر سکے اور عمر نے ان کے ساتھ وفا نہ کی ورنہ شاید مرزا صاحب کے بعد ڈپارٹمنٹ کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتے۔ مرزا صاحب کے دوسرے شاگرد جن کا تذکرہ ضروری ہے اور ماشاءاللہ وہ اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں وہ ہیں شاہ شہود عالم صاحب۔ وہ بصیر صاحب کے انتقال کے بعد ۱۹۶۶ء میں چیرمین بنے اور ۱۶ سال تک ڈپارٹمنٹ کی قیادت کی۔ وہ ۱۹۹۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ شاہ شہود عالم صاحب کے زمانے میں بھی ڈپارٹمنٹ نے کافی ترقی کی۔ شاہ صاحب پتنگوں Isects کے حوالے سے دنیا کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ مرزا صاحب نے سب سے پہلے جو اختصاص کی سطح پر قائم کیا وہ ۱۹۲۹ء تھا اور اس کے ایک سال بعد دوسرا سیکشن جو انھوں نے قائم کیا وہ (۱۹۳۰ء) Parasitolog تھا۔ یہ دو سیکشن زوولوجی ایم۔ ایس۔ سی میں لمبے عرصے تک چلے اور آج بھی چل رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ مختلف اوقات میں حالات کے پیش نظر کچھ اور Specialization کا اضافہ بھی ہوا ہے۔ جیسے ۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر ظہور قاسم صاحب کے آنے کے بعد ایک Fisheries کا سیکشن قائم ہوا اور ۱۹۷۲ء میں دو اور سیکشن قائم ہوئے ایک Generics کا تھا جس کے روح رواں پروفیسر عثمان ادھمی صاحب تھے اور دوسرا کا تھا جس میں خود میری محنت شامل تھی۔ آج بھی یہ تمام سیکشن اسی طرح سے قائم ہیں۔ ایم۔ ایس۔ سی کے سال اول میں سب لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں لیکن سال دوم میں ان پانچ سیکشن میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اساتذہ کا تقرر بھی انھیں specializations کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔

میں کسی یونیورسٹی سے ٹیچنگ اور ریسرچ کو علاحدہ نہیں سمجھتا ہوں کیونکہ یونیورسٹی اور کالج میں یہی فرق ہے کہ یونیورسٹیوں میں نالج بھی کی جاتی ہے جو کہ کالج میں ضروری نہیں ہے۔ یونیورسٹیوں میں اگر صرف بازار سے

خرید کر کتابیں لڑکوں کو پڑھا دی جائیں اور ٹیچر جو مضمون پڑھا رہا ہے اس کا معیار اتنا بلند نہ ہو کہ وہ خود اسی مضمون میں اس پلے کے ریسرچ میں مہارت رکھتا ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم کا معیار وہ نہیں ہوگا جو ہونا چاہیے زوالوجی ڈپارٹمنٹ میں ہمیشہ سے اس بات کا خیال رکھا گیا کہ جو بھی کام ہو وہ اعلیٰ پائے کا ہو اور اس کا معیار قومی اور بین الاقوامی ہو۔ لیکچر تھیٹرس، ڈپارٹمنٹ کا میوزیم، کلاس روس یا چاہے اساتذہ ہوں یا Infrastructural facilities سب وقت کے ساتھ Upgrade کی جاتی رہی ہیں۔ ریسرچ کرنے کی روایت اس صدی کی تیسری دہائی ہی سے شروع ہو گئی اور ڈپارٹمنٹ کے فارغ التحصیل طلبا ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور آج بھی موجود ہیں۔ اس ڈپارٹمنٹ میں نہ صرف ایم۔ ایس۔ سی میں داخلہ لینے والوں کی بلکہ ریسرچ کرنے والوں کی بھی ہمیشہ بھیڑ لگی رہی کیونکہ ہر کوئی معیاری کام میں یقین رکھتا ہے۔ ریسرچ بھی انھیں پانچ اختصاصات میں کی گئی اور نہ صرف اساتذہ بلکہ ریسرچ اسکالروں نے بھی کافی نام کمایا اور اللہ کا کرم ہے کہ وہ بہت اچھے عہدوں پر فائز ہوئے۔ وہ عہدے خواہ قومی سطح کے ہوں یا بین الاقوامی سطح پر ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب تک دو سو سے ڈھائی سو لڑکے لڑکیوں نے اس ڈپارٹمنٹ سے Ph.D کی ہوگی اور کم و بیش ڈیڑھ سو لوگوں نے M Phil بھی کیا ہوگا۔ یہاں سے فارغ التحصیل طلبا وائس چانسلر بھی بنے۔ ڈائرکٹر ہوئے، پروفیسر ہوئے، پرنسپل ہوئے، قومی و عالمی سطح پر اور حکومت میں بھی سکریٹری اور دوسرے اعلیٰ عہدوں تک پہنچے اور انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری ہی رہے گا۔

میں نے ۱۹۵۹ء سے لے کر ۱۹۹۸ء تک اس ڈپارٹمنٹ میں کم و بیش ۴۰ سال گزارے ہیں۔ یہیں طالب علم رہا، ریسرچ اسکالر رہا، لیکچرر رہا، ریڈر و پروفیسر ہوا۔ پھر ہیڈ اور ڈین بھی بنایا گیا۔ غرضیکہ اس شعبہ نے مجھے سب کچھ دیا۔ مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا گیا۔ کیا میں اسے کچھ لوٹا سکا۔ اس کا فیصلہ وقت اور دوسرے لوگ کریں گے یہیں سے متعدد بار باہر یعنی بیرون ممالک بھی گیا۔ یونیورسٹی نے دوسری جگہوں پر بھی ملازمت پر بھیجا لیکن اس ڈپارٹمنٹ سے اور یونیورسٹی سے اپنی کچھ اتنی مضبوط رہی کہ ڈپارٹمنٹ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنے کا کبھی خیال

کبھی نہ آیا خواہ وہ انگلینڈ میں پرنسپل نیماٹولوجسٹ کی ملازمت رہی ہو (۱۹۸۱-۸۳ء) جیولوجیکل سروے آف انڈیا کا ڈائرکٹر بنا (۱۹۸۹-۹۱ء) اور اب اس نئی اور منفرد یونیورسٹی کا وائس چانسلر۔ میرا رشتہ اب بھی اپنی یونیورسٹی اور ڈپارٹمنٹ سے مضبوطی سے قائم ہے۔ گو کہ اب حیدر آباد میں مولانا آزاد یونیورسٹی کے خاکے بنا کر اس میں رنگ بھر رہا ہوں لیکن کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ میں اپنے ڈپارٹمنٹ، اپنے دوستوں، شاگردوں ساتھ میں کام کرنے والوں اور اپنی یونیورسٹی کو کبھی بھول سکا ہوں۔ غالباً بھولنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میں اب بھی وہیں کی ملازمت پر ہوں اور یونیورسٹی نے مجھے یہاں ڈیپوٹیشن پر بھیجا ہے تاکہ میں اپنے استادوں کی دعاؤں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کام کرنے کی برکت سے اس عملاً دشوار کام کو کروں اور جو بھی قوت بازو، ارادے میں پختگی، خود اعتمادی، کام کی لگن ہے، اس کا بھرپور استعمال کروں۔ شکر ہے کہ میں ایسا ہی کر بھی رہا ہوں۔ میں اور میرے جیسے ان گنت اور لوگ اگر کوئی Industrial Commodity ہوتے تو وہاں کے مشہور تالوں کی طرح ہمارے اوپر بھی Made in AMU کی مہر لگی ہوتی لیکن دل و دماغ پر تو ہے ہی چاہے کوئی اسے دیکھ سکے یا نہیں۔ اگر علی گڑھ کو میری زندگی سے نکال دیا جائے تو اپنے پاس بچا ہی کیا ہے۔ ایک علیگ ہونے کے ناتے میں نے دنیا میں کبھی بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کیا چاہے وہ امریکہ ہو، برطانیہ یا آسٹریلیا یا یورپ کا کوئی بھی ملک یا خود اندرون ملک کیونکہ ہمارے سینئر اور جونیئر برادر علیگ ہر جگہ موجود اور منفرد مقام بنائے ہوئے ہیں اور اپنے علیگ بھائیوں کے استقبال اور مدد کے لیے ہر طرح تیار رہتے ہیں۔ اس مدد میں کتنا خلوص کتنا پیار چھپا ہوتا ہے اس کی لذت ایک علیگ کو ہی معلوم ہو سکتی ہے کسی اور کو نہیں۔ خدا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ہمیشہ قائم رکھے اور علیگ برادری کو مضبوط سے مضبوط تر بنائے۔ آمین۔

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

شعبۂ تاریخ

سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ جو کہ ۱۹۶۸ء میں ترقی کر کے سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی Centre of Advanced study بنا۔ دراصل سرسید احمد خاں کے خواب کی تعبیر ہے۔ سرسید احمد خاں ہندوستانی مورخین کی تاریخ میں پہلے دانشور ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی تاریخ نگاری کی روش سے ہٹ کر ہندوستانی تاریخ کے ثقافتی پہلوؤں پر لکھنے کا آغاز کیا۔ ان میں تاریخی شعور کے ساتھ ساتھ اہم تاریخی واقعات کا صحیح تاریخی تناظر (Historical perspective) میں بے تعلقی کے ساتھ تجزیہ کرنے کی صلاحیت تھی۔ لہٰذا علم تاریخ پر ان کی تحقیقات عہد آفریں ثابت ہوئیں۔ ان سے پہلے مسلمانوں میں تاریخ نگاری کی روایت تھی کہ ماضی سے متعلق تاریخ کی کتابوں سے مواد اکٹھا کر کے زمانی تسلسل کی رعایت سے اس کو جوں کا توں تاریخ کی کتاب میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ یا مؤلف اس کا خلاصہ اپنی زبان میں دے دیتا تھا۔ دوسرے علم تاریخ کا تعلق سیاسی واقعات اور سیاسی نوعیت کی تبدیلیوں سے سمجھا جاتا تھا، لیکن سرسید نے تاریخ پر تحقیق کے لیے نئی جہتوں کی نشاندہی کی۔ ان کے نزدیک تاریخ کا ثقافتی پہلو بھی اتنا ہی اہم تھا جتنا سیاسی۔ یقیناً سرسید

پہلے ہندوستانی عالم تھے جنھوں نے دہلی میں انگریز افسران رابٹ آسٹین آرتھر وغیرہ کی علمی دلچسپی سے متاثر ہو کر اور ان سے بصیرت حاصل کر کے آثارِ قدیمہ کو تاریخ کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ انھوں نے دہلی کے ارد گرد قدیم تاریخی جگہوں کی کھدائی کی اور مہابھارت کے زمانے سے اپنے زمانے تک کی اینٹ بنانے کی صنعت اور اس کے سائز میں زمانۂ قدیم سے جو تبدیلیاں واقع ہوئیں ان پر ایک مقالہ میں سیر حاصل بحث کی۔ مقالہ اس قدر دلچسپ تھا کہ ان کے انگریز دوستوں نے اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ اگرچہ اردو مقالہ دستیاب نہیں ہے لیکن ترجمہ کے مطالعہ سے سرسیّد کے Approach (تحقیقی رویّہ) پر دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔[1]

اس سلسلے میں مرزا سنگین بیگ کی تالیف "سیر المنازل" کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ یہ کتاب فارسی میں دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ چارلس تھیوفلس مٹکاف (۱۸۱۱ء تا ۱۸۱۹ء) کی خواہش اور ہدایت پر لکھی گئی تھی۔ اپنی کتاب میں مرزا سنگین بیگ نے دہلی کی قدیم عمارتوں کا ذکر کیا ہے اور ان پر نصب فارسی کتبوں کی نقل بھی درج کر دی ہے۔ یہ زمین پر پائے گئے آثار قدیمہ (Surface Archaeology) پر فارسی میں پہلی کوشش تھی۔ لٹریچر پر ان کی گہری نظر تھی۔ لہٰذا جب انھوں نے ۱۸۵۴ء میں آثار الصنادید کو شائع کیا تو اس سے ان کی تاریخ دانی اور تبحر علمی پر روشنی پڑی۔ آثار الصنادید میں دہلی اور دہلی کے باہر اس کے قرب و جوار میں عمارتوں اور ان کے کھنڈرات کا بڑا دلچسپ اور مفصل بیان ملتا ہے۔ مسلم حکمراں طبقہ کی فنِ تعمیر میں دلچسپی کی وجہ سے ہندوستان میں جو فنِ تعمیر میں عہد بہ عہد ترقی ہوئی۔ اس پر پہلی مرتبہ روشنی پڑی۔ مزید برآں سرسیّد نے ابوالفضل کا تتبع کرتے ہوئے ایک الگ باب میں انیسویں صدی کے دہلی کے دانشوروں، علماء، مشائخ، مصوران اور دوسرے فنکاروں سے متعلق بھی آثار الصنادید میں ذکر کیا۔ اس حصے کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس کے مطالعہ سے ہمیں مغلوں کے آخری دور کی ثقافتی روایات کا علم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یقیناً ابوالفضل کی روایت کا احیا ہی نہیں ہوا تھا بلکہ وہ آگے بڑھائی گئی تھی۔

[1] سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

علمی تحقیقی معیار کے اعتبار سے اردو میں تاریخ نگاری پر "آثار الصنادید" پہلی اور آخری کتاب ہے۔

آثار الصنادید کے علاوہ سرسید کی تاریخ پر دوسری کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی تکمیل میں بھی انھوں نے یورپ کی نئی Methodology سے کام لیا تھا۔ مثال کے طور پر انھوں نے "سلسلۃ الملوک" میں مسلم فرمانرواؤں کے عہد کا ان کی تخت نشینی سے لے کر ان کے خاتمہ تک تعین کرنے کی کوشش کی۔ سرسید کو وقت اور اس کی تبدیلی کی اہمیت کا احساس تھا۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے۔ کہ ہر اہم تاریخی واقعہ ایک طویل سلسلۂ اسباب کے نتیجے میں پیش آتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے بڑی چھان بین کر کے ان بادشاہوں کی تاریخ پیدائش کا بھی تعین کیا جو کہ نیچے سے ابھرے تھے اور ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر بادشاہ بن گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ آنے والے مورخین کی نسلوں کی رہبری کے لیے سرسید نے اردو میں تاریخ نگاری کے سلسلے میں Chronological Framework مہیا کرنے کی کوشش کی۔ ہمارے یہاں فارسی میں ایسی روایت نہیں تھی۔

ایک اور بنیادی اہمیت کا کام جو کہ سرسید نے کیا وہ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے ماخذ کی تصحیح اور ایڈیٹنگ سے متعلق تھا۔ تاریخ پر تحقیق کی روایت کو فروغ دینے کے سلسلے میں تاریخ کے فارسی ماخذوں کو جدید طریقے پر مرتب کر کے تصحیح کے ساتھ شائع کرنا ضروری تھا۔ لہٰذا اس سلسلے میں انھوں نے ابوالفضل کی آئینِ اکبری، ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی اور جہانگیر بادشاہ کی تزکِ جہانگیری کو تصحیح کے ساتھ شائع کر کے پہل کی۔ ہمارے شعبۂ تاریخ اور بعد میں سینٹر نے بانیٔ درسگاہ کی اس روایت کو بھی آگے بڑھایا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کا سرسید کے زمانے میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے اسٹاف پر تقرر ہو گیا تھا۔ وہ یہاں کی علمی اور فکری فضا سے خاصے متاثر ہوئے۔ انھوں نے تاریخ اسلام کی اہم شخصیتوں کی سوانح لکھیں جن میں ہر شخصیت کے عہد کی ثقافت اور علمی اور مادی ترقی کا بھی عالمانہ طور پر تجزیہ

پیش کیا۔اس کے علاوہ ان کے علم تاریخ پر مقالات ان کی یورپ کے جدید تحقیق اصول سے واقفیت کی غمازی کرتے ہیں۔جب سرسید کے انتقال کے بعد کالج میں علم تاریخ کا شعبہ کھولا گیا تو اس میں صدر اور پروفیسر کی جگہ پر ہندوستان کے مشہور عالم تاریخ پروفیسر سردار کے۔ ایم۔ پانیکر کا تقرر ہوا۔سردار کے ایم پانیکر بڑے روشن خیال اور ماڈرن آدمی تھے۔جب ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کی انگریز حکومت نے اینگلو اورنٹیل کالج کو چارٹر کے ذریعے یونیورسٹی کا درجہ دیا تو اس وقت شعبۂ تاریخ کے صدر پانیکر ہی تھے۔اسی زمانے میں اُن کی کتاب ہرش وردھن آف قنوج Harsha of Qanauj شائع ہوئی تھی ۱۹۲۲ء میں پروفیسر محمد حبیب آکسفورڈ سے واپس آئے تو ان کا تقرر شعبۂ تاریخ میں بحیثیت ریڈر کے ہوا۔ایک سال بعد ۱۹۲۳ء میں ان کو پروفیسر بنایا گیا۔ دوسرے تاریخ کے پروفیسر اے۔بی۔اے حلیم صاحب تھے جو کہ یورپ کی تاریخ پڑھاتے تھے۔حبیب صاحب نے تحقیق کے لیے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا۔ان کے ابتدائی تحقیقی کاموں میں انگریزی میں سلطان محمود آف غزنین اور حضرت امیر خسرو ہندوستانی تاریخ پر اہم شاہکار تصوّر کیے گئے۔اگرچہ سلطان محمود آف غزنین پر اردو پریس نے بڑا مخالفانہ تبصرہ کیا لیکن ہندوستان اور بیرونی ممالک میں تاریخ کے ماہرین نے اس پر حبیب صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا۔کیونکہ انھوں نے پہلی مرتبہ سلطان محمود اور اس کے عہد کے معاصر مآخذ کی روشنی میں سلطان کی صحیح طور پر تصویر پیش کی تھی۔سلطان محمود اسلامی ہیرو کے بجائے ایک عظیم فوجی جنرل، فاتح اور حکمراں تھا۔اس کے عہد سے پہلے عالمِ اسلام میں آمرانہ نظام کی جڑیں گہری اور مضبوط ہوگئی تھیں، لہٰذا ہر بڑا اولوالعزم فاتح وسیع سلطنت قائم کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔سلطان محمود کی فتوحات کا جس طرح ہندو شکار ہوئے اسی طرح مسلمان بھی شکار ہوتے تھے۔اس کے دَور میں مذہب انفرادی مسئلہ بن کر رہ گیا تھا۔

حبیب صاحب کی کتاب ''حضرت امیر خسرو'' بھی تحقیق کے نقطۂ نظر سے

؎ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

عہدِ فریں تھی۔ اس میں انھوں نے نشاندہی کی کہ حکمراں طبقے کے علاوہ دانشوروں، علماء، اور صوفیاء نے بھی اہم تاریخی رول ادا کیا ہے۔ لہٰذا ہندوستانی کلچر کی تاریخ مکمل نہیں ہوگی، اگر ان لوگوں کے کارناموں کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ اس میں سب سے پہلے شیخ نظام الدین (اولیاء) کی روحانی سوانح عمری بھی پیش کی گئی کیونکہ ان کی شخصیت کا امیر خسرو پر گہرا اثر پڑا تھا۔ تصوف اور صوفیا پر ان کے مقالات بھی اسی طرح بصیرت افروز تصور کیے گئے۔ آج بھی ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے ان کا مطالعہ ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ حبیب صاحب کے خیال سے ہر تاریخ داں متفق ہے کہ بغیر صوفیا اور صوفی ازم کے حوالے کے ہندوستان میں اسلام کی تاریخ مکمل تصور نہیں کی جا سکتی۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد جب یونیورسٹی میں شعبۂ علم سیاسیات (Deptt of Political Science), قائم ہوا تو پروفیسر محمد حبیب صاحب نے اس کی ترقی کے لیے اس کی صدارت قبول کرلی۔ اس وقت شعبۂ تاریخ کے صدر ان کے شاگرد رشید شیخ عبدالرشید صاحب بنے۔ کیونکہ پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم پاکستان جاکر کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے تھے۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب اپنے استاد کی طرح بڑے مخلص اور شفیق استاد تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بدلتے ہوئے حالات کی بنا پر ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ پر تحقیق کا مستقبل تاریک ہوتا محسوس کرتے ہوئے ۱۹۵۳ء میں شعبۂ تاریخ میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کے لیے مالی گرانٹ منظور کی۔ شیخ صاحب کی قیادت میں تحقیق کا کام شروع ہوا۔ انھوں نے سرسید کی پیروی کرتے ہوئے ہندوستانی تاریخ کے فارسی ماخذ کی طباعت کا کام از سرِ نو شروع کیا۔ شیخ صاحب خود پایہ کے محقق تھے۔ لہٰذا ان کے زمانے میں علیگڑھ کی شہرت بیرونِ ملک میں بڑھی۔

۱۹۵۹ء میں شیخ صاحب کے ریٹائرمنٹ کے بعد شعبۂ تاریخ کے صدر پروفیسر نورالحسن صاحب بنے۔ موصوف کے زمانے میں شعبہ برابر ترقی کرتا رہا۔ پروفیسر عرفان حبیب صاحب کی کتاب مغلوں کے عہد کے زراعتی نظام اور

مغل حکمراں کے عہد کی معاشی زندگی پر شائع ہوئی۔ اس کتاب نے تحقیق اور اسکالرشپ کا بلند معیار قائم کیا جس کی وجہ سے شعبۂ تاریخ بین الاقوامی شہرت کا حامل ہوگیا۔

پروفیسر عرفان صاحب کے علاوہ ڈاکٹر اطہر علی صاحب کی تحقیق Mugal Nobility under Aurangzeb, ڈاکٹر نعمان احمد صدیقی کی تحقیق The Revenue Administration under the Mugals during the 18th Centu شائع ہوئیں۔ پروفیسر نورالحسن نے شعبۂ تاریخ میں آثار قدیمہ Archaeology) کا یونٹ کھلا۔ پروفیسر آر۔ سی۔ گوڑ کی نگرانی میں کئی مقامات پر کھدائی ہوئی۔ اتر نجی کھیڑا رپورٹ کو شائع کیا گیا جس سے قدیم زمانے کے ہندوستانی کلچر پر نئی روشنی پڑی۔ شعبے کے دوسرے ممبران کے مقالے اور کتابیں شائع ہوئیں جن کی بنا پر ۱۹۶۸ء میں گورنمنٹ نے شعبۂ تاریخ کو بڑھا کر سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی Centre of Advanced Study in History کا Status, دے دیا۔

۱۹۷۲ء میں پروفیسر نورالحسن مرکزی کابینہ میں وزیر تعلیم مقرر ہوئے تو سینٹر کی صدارت کی ذمہ داری پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے سنبھالی۔ اس زمانے میں پروفیسر ظہیرالدین ملک کی کتاب مغل شہنشاہ محمد شاہ اور اس کے عہد پر شائع ہوئی۔ پروفیسر نظامی صاحب دہلی سلطنت اور صوفیائے کرام کی تاریخ پر تحقیق اور مطالعے کے لیے مشہور ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں پروفیسر محمد حبیب کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ انگریزی اور اردو زبانوں میں متعدد کتابیں شائع کیں جن میں صوفیا کے درخشندہ کارناموں کو اجاگر کیا۔ صوفیا سے متعلق مقبول روایتوں کو من وعن مان کر جمع کیا۔ لہٰذا مسلمانوں میں صوفیا سے عقیدت مند لوگوں میں ان کی کتابوں کو بہت مقبولیت اور شہرت ملی۔

۱۹۷۵ء میں پروفیسر نظامی ملک شام میں ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے تین سال کے لیے چلے گئے تو پروفیسر عرفان حبیب صاحب کو سینٹر کی قیادت کا بحیثیت صدر شعبہ موقع ملا۔ ان کی وسیع القلبی، اسکالرشپ اور خوش اخلاقی کی وجہ سے تحقیق اور مطالعہ کے لیے فضا سازگار ہوگئی۔ صدر بننے کے چند ماہ بعد عرفان صاحب نے آل انڈیا ہسٹری کانگریس کا سالانہ اجلاس علیگڑھ میں منعقد کرایا۔ علیگڑھ میں

یہ ہسٹری کانگریس کا سیشن تیسری مرتبہ ہوا تھا۔ پہلا سیشن شیخ عبدالرشید کے زمانے میں ہوا تھا۔ دوسرا سیشن ۱۹۶۰ء میں پروفیسر نورالحسن صاحب کے زمانۂ صدارت میں ہوا تھا) میڈیول انڈین ہسٹری سے متعلق اجلاس میں سینٹر کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس نے مقالات پیش کیے کیونکہ مقالات کی تیاری میں عرفان صاحب نے مقالہ نگاروں کی رہنمائی کی تھی۔ لہٰذا یہ مقالات ۱۹۷۵ء کے ہسٹری کانگریس کے سیشن کی روداد Proceedings کا گراں قدر حصہ تصور کیے گئے۔

۱۹۸۵ء میں پروفیسر نظامی صاحب کے ریٹائرمنٹ پر پروفیسر عرفان حبیب صاحب دوبارہ صدر بنے۔ انھوں نے چارج لینے کے بعد سینٹر کی بنیادوں کو جو کہ کمزور ہو گئی تھیں، دوبارہ مضبوط بنایا۔ ان کے ساتھیوں کے تحقیقی کاموں کو جو کہ بغیر طباعت کے پڑے ہوئے تھے، ان کو بغرض اصلاح دیکھا۔ دن رات ان کی انگریزی درست کرنے اور ان کا تحقیقی معیار بلند کرنے میں مصروف ہو گئے۔ جلد ہی کئی کتابیں پریس کو بھیج دی گئیں۔ سینٹر کا جرنل جو کہ چھپنا بند ہو گیا تھا، اسی کو نئی جلا بخشی۔ بغیر مبالغہ آرائی کے خوف کے کہا جا سکتا ہے کہ عرفان صاحب اور ان کے ساتھیوں کی سعی کی وجہ سے سینٹر ٹوٹنے سے بچ سکا، جب کہ ہندوستان میں دوسری یونیورسٹیوں میں قائم کیے ہوئے سینٹر پانچ سال سے زیادہ قائم نہیں

میرے پیش رو صدر شعبۂ تاریخ پروفیسر اقتدار عالم صاحب نے دسمبر ۱۹۹۴ء میں چوتھی مرتبہ آل انڈیا ہسٹری کانگریس کا سالانہ اجلاس علیگڑھ میں مدعو کیا۔ ان کا دعوت نامہ ہسٹری کانگریس کے ذمہ داروں نے قبول کر لیا۔ جولائی ۱۹۹۴ء میں پروفیسر اقتدار عالم صاحب کے ریٹائرمنٹ پر شعبۂ تاریخ کے صدر کی ذمہ داری میرے سپرد ہوئی۔ مجھے اس کی ذمہ داری کے قبول کرنے میں اس وجہ سے تامل نہیں ہوا کہ میری قیادت اور مدد کے لیے میرے استاد عرفان صاحب سینٹر کے Coordinator تھے۔ اگرچہ دسمبر ۱۹۹۴ء میں ہسٹری کانگریس کا دستور کے مطابق میں لوکل سکریٹری تھا، لیکن اس سیشن کی کامیابی میں عرفان صاحب کی انتھک کوششوں اور قیادت ہی کا دخل ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کروں گا کہ جناب محمود الرحمٰن صاحب کے وائس چانسلر

بننے سے پہلے ہماری یونیورسٹی نامساعد حالات سے دوچار تھی۔ کرپشن اور بدنظمی روزافزوں تھی۔ اس زمانے میں مختلف شعبوں میں اساتذہ کی خالی جگہوں پر اسٹوڈنٹس یونین کے رہنما اپنے دوستوں کا تقرر کرانے لگے۔ صلاحیت بالکل نظرانداز ہونے لگی کیونکہ ہمارے شعبے میں پروفیسر، ریڈر اور لیکچرر کی جگہیں خالی تھیں۔ لہٰذا مجھ پر بھی دباؤ ڈالا گیا کہ میں اسٹوڈنٹس یونین لیڈران کی سفارش پر ان کے دوستوں کا تقرر کروں۔ میں نے سینٹر کے مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے کسی بھی طرح کی دھمکیوں کی پرواہ نہیں کی اور حالات کا سامنا کیا۔ نئے وائس چانسلر صاحب کے آنے کے بعد حالات بہتر سے بہتر ہونے لگے اور سینٹر غلط عناصر کے شمول سے بچ گیا۔ اُمید ہے نئے حالات میں ترقی کی رفتار تیز ہوگی۔

حواشی:

۱؎ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے سی ڈبلیو ٹرول کا انگریزی مقالہ "اے نوٹ آن آثارالصنادید" جنرل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن۔ نومبر ۱۹۷۲ء

۲؎ ملاحظہ کیجیے "سیرالمنازل" تالیف مرزا سنگین بیگ تدوین و ترجمہ ڈاکٹر شریف احمد، اردو اکادمی علیگڑھ، سنہ ۱۹۸۰ء

ہندوستان سے جرمنی واپس آنے کے بعد بھی مسلم یونیورسٹی کی ترقی اور خوش حالی سے میں برابر دلچسپی لیتا رہا ہوں۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ میں خود کو علیگڑھ کا اولڈ بوائے سمجھتا ہوں کہ میں نے وہاں جو دیکھا، پڑھا اور کام کیا وہ ایک وسیع تجربہ تھا۔ (سابق پروفیسر آٹو اسپیس)

پروفیسر محمد یٰسین انصاری

فیکلٹی آف انجینئرنگ
ایک جائزہ

تاریخ ایک ورثہ: کسی ملک، ملت، قوم یا افراد کی قسمت کا فیصلہ اللہ تبارک تعالیٰ افراد ہی کے ہاتھوں کراتا ہے۔ ادارے بھی افراد کے تعاون اور اشتراک سے ہی ظہور میں آتے ہیں۔

کسی ادارے کی تاریخ قلم بند کرنے کا مقصد اس ادارے کی ان شخصیتوں سے متعارف کرانا مقصود ہوتا ہے جنھوں نے اس ادارے کے قیام کے سلسلے میں کام کیا۔ دراصل تاریخ کسی ادارے یا قوم کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ یہ اس قوم کا اجتماعی ورثہ ہے، اس ورثے کے بارے میں بانی درس گاہ سرسیدؒ نے کچھ اس طرح فرمایا تھا:

"کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ باعثِ ننگ و رسوائی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ جو قوم اپنے تاریخی ورثے اور اپنے آبا و اجداد کے کارہائے نمایاں سے غافل ہو جائے اُسے فراموش کر دے۔"

تاریخ کے مطالعے سے افراد خود کو پہچانتے ہیں۔ وہ کیا تھے؟ کس گروہ اور کس طرزِ فکر سے تعلق رکھتے تھے؟ اس گروہ کے اغراض و مقاصد اور نصب العین کیا تھے؟ ان کی جدّ و جہد کیا تھی؟

انجینئرنگ کالج کا تخیّل: سرسید کی تقاریر میں انجینئرنگ کالج کے قیام کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء

کا خطبہ جو انھوں نے ایم۔ اے۔ او کالج کے سنگِ بنیاد کی تقریب کے موقع پر لارڈ لٹن کو پیش کیا ایک جامع یونیورسٹی کا تصور پیش کرتا ہے۔ اسی یونیورسٹی کے ماتحت انجینئرنگ، اسکول، میڈیکل کالج اور دیگر ادارے اور شعبہ جات قائم ہوئے۔

۱۹۱۰ء میں واضح طور پر انجینئرنگ کالج کے قیام کے لیے سر آغا خاں، سید امیر علی، سید علی امام، محمد علی جناح، شہزادہ آفتاب احمد اور نواب وقار الملک نے انجینئرنگ کالج کے قیام کے لیے چندہ کی اپیل کی (کالج میگزین ۱۹۱۰ء) ایم اے او کالج کی چند اہم ضروریات کے تحت کالج کا قیام التوا میں پڑ گیا جس کا تصور ایم۔ اے۔ او کالج کی گولڈن جبلی کے موقع پر دوبارہ تازہ کیا اور جبلی کے چندے میں سے ایک رقم کالج کے قیام کے لیے علحدہ رکھ دی گئی۔

۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی قائم ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں سر شاہ سلیمان نے یونیورسٹی کی توسیع کے لیے ایک جامع منصوبہ حکومتِ ہند کو پیش کیا جس میں دیگر اسکیموں کے ساتھ Technological Institute کے قیام کی بھی ایک اسکیم تھی۔ ۱۹۲۹ء کے لگ بھگ صنعتی تربیت Industrial Training کے تحت صابن سازی، روشنائی سازی اور نکل پالش کی ٹریننگ شروع ہوئی۔ غالباً یہ تربیت شعبۂ سائنس کے تحت یونیورسٹی مارکیٹ میں، جس میں موجودہ انجینئرنگ کالج ہے شروع ہوئی۔ تاریخ کا یہ باب پرانے لوگوں کے حوالے سے قلم بند کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں عبید اللہ خاں درانی سر سید کے قافلے میں شامل ہوئے۔ انھوں نے صنعتی تربیت میں ایک موٹر کار سے موٹر مستری اور ایک لیتھ مشین سے لیتھ مستری کے کورس کی ابتدا کی۔ یہ تربیت بھی یونیورسٹی مارکیٹ میں شروع ہوئی مگر کالج کے تحت اس طرح درانی صاحب کالج کے بانی تصور کیے جاتے ہیں۔

۱۹۳۵ء میں سر آغا خاں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے (منعقدہ رام پور، یو۔ پی) میں کالج کے قیام کے لیے دوبارہ مالی وسائل کی فراہمی کے لیے ملک اور قوم کی یاد دہانی کرائی۔

۱۹۳۶ء میں Motor Engineering. اور Electrician. میں ڈپلوما کلاس کی شروعات ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں City & Guilds London.

سہ ماہی فکر و آگہی (علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء)

کے امتحانات جو ڈگری کے مساوی تصور کیئے جاتے تھے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہونے لگے۔

۲۶ر جنوری ۱۹۳۸ء کو کالج کی ورک شاپ کا سنگِ بنیاد سر آغا خاں کی موجودگی میں عزت مآب نواب رام پور نے نصب کیا۔

۱۹۳۸ء میں ڈپلوما کلاس کا پہلا بیچ پاس کر کے نکلا۔ اس کے طلبا کچھ باہر مختلف جگہ ملازم ہو گئے۔ رشید الدین صاحب، اللہ ان کی عمر میں برکت فرمائے، اسی بیچ کے ہیں۔[1]

۱۹۳۵ء کا سر آغا خاں نے جو تاریخی خطبہ دیا وہ تفصیل سے کالج کے اغراض و مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے۔ موجودہ دور میں ملک اور ملت کی ضروریات کے پیش نظر وہ تاریخی خطبہ یونیورسٹی کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ مزید یہ کہ یہ خطبہ ملت کے تعلیمی معیار اور ملک کی صنعتی و فنی ضروریات کو پورا کرنے میں مددگار اور معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء کا زمانہ وہ ہے کہ جب یونیورسٹی کا ایک اولڈ بوائے عبید اللہ درانی ان تمام مندرجہ بالا صنعتی اور فنی کورسوں سے خلوص کے ساتھ وابستہ رہا۔ انھیں ۳۶-۱۹۳۵ء میں ان کورسوں کا سکریٹری، ۳۸-۱۹۳۶ء میں سپرنٹنڈنٹ اور ۴۰-۱۹۳۸ء میں کالج کا پرنسپل مقرر کیا۔ اسی دور میں سر آغا خاں، نواب رام پور، سر شاہ سلیمان

---

[1] یہ رسالہ چھپنے کے وقت رشید صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ رسالہ 'فکر و آگہی' کی ایڈیٹر کے شوہر ڈاکٹر سید محمد حامد نے ۱۹۶۲ء میں اسی کالج سے میکینکل انجینیرنگ پاس کیا اور رشید صاحب کی زیرِ نگرانی الیکٹریکل لیب میں تربیت حاصل کی۔ حامد صاحب کے چچا الحاج جناب حافظ حفیظ اختر صاحب رشید صاحب کے کلاس فیلو تھے۔ علیگڑھ کے قیام کے دوران رشید صاحب کے زیرِ سرپرستی رہے۔ حامد صاحب کا بیان ہے کہ رشید صاحب اپنے کام میں ماہر، انتہائی دین دار اور تہجد گزار بزرگ تھے۔ انتہائی شفیق، خوش اخلاق، ہومیوپیتھی کے ماہر تھے۔ علاج خدمتِ خلق کے جذبے سے کرتے تھے اور علاج کی کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین بھی ان اسکیموں کی سربراہی کرتے رہے ہے۔ تخیلات ان حضرات کے اور عملی جامہ درانی کا۔

تین سالہ ڈگری کورس : ۱۹۴۰-۴۱ء میں تین سالہ ڈگری کورس اور الکٹریکل اور مکینکل شعبوں میں شروع ہوا۔ ۱۹۴۲-۴۷ء کا دور کالج کے استحکام اور ترقی کا دور ہے۔ اس دور کی مثبت خصوصیت یہ ہے کہ مادی وسائل بہت کم تھے۔ سرفراز ہاؤس میں چھوٹے چھوٹے کلاس روم، تختہ کی مرمت شدہ کرسیاں، بلیک بورڈ مختصر، لائبریری نام کی کوئی شئے نہیں اور سامان بہت معمولی، بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ ایک دو کلاس تو پیڑ کے سایے میں منعقد ہوتے جو شانتی نکیتن کی یاد دلاتے تھے۔ منجملہ اساتذہ کے کچھ استاد لکچر گیلری (جس میں آجکل یونیورسٹی کینٹین ہے) اور بلڈنگ ڈپارٹمنٹ میں بھی تعلیم دیتے۔ ۱۹۴۶ء میں کالج کی موجودہ عمارت (مسجد کے پیچھے والا بلاک) تعمیر ہوئی جہاں کچھ کلاسیں اور دفتر منتقل ہو گئے۔ ابنائے قدیم میں اس دور کے سر ضیاء الدین، عبید اللہ درانی، ایس سی بھٹاچاریہ اور سید افضل علی کے نام سرفہرست ہے۔ ان کے بعد شیر علی اسماعیلی، پروفیسر این سی ڈے، پروفیسر ٹی۔ ایچ میتھوین اور پروفیسر ایف۔ ایم۔ پی ابتھونٹ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بیشتر صوبائی حکومتوں اور ریاستوں اور مرکزی حکومت نے کالج کی ڈگری کو تسلیم کر لیا تھا اور کالج کے ڈگری اور ڈپلوما پاس شدہ طلبا کو ملازمت حاصل کرنے میں معاونت کرتے تھے۔ البتہ یوپی کی حکومت اور Institution Of Engineers (India) نے اس وقت کی یہاں کی ڈگری تسلیم نہیں کی تھی مگر کوشش جاری تھی۔ ۱۹۴۱ء میں سید احمد عباس نے الیکٹریکل انجینئرنگ میں داخلہ لیا اور پاس کرنے کے بعد اساتذہ میں شامل ہو گئے۔ اور بعد کو پرنسپل پالی ٹیکنک ہو کر رٹائر ہوئے۔ ان کے دور کی جیتی جاگتی تصویر خود دو پالی ٹیکنکس ہیں۔ ایک لڑکوں کا، دوسرا نسواں کا۔

۱۹۴۷ء کا دور تشدد کی یاد دلاتا ہے۔ مسجد کی اذاں، کلیسا کے گھنٹوں، مندر کی سنکھ اور گرجی کی صدائیں، تشدد کے شور وغل میں غرق ہو گئیں۔ انتہا یہ ہوئی کہ سنکھ بجتا رہا اور عدم تشدد کا پجاری تشدد کا شکار ہو گیا۔

رسالہ فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اسی زمانے میں یونیورسٹی میں بھی ہر طرف ایک ہُو کا عالم تھا، سڑکیں ویران، عمارتیں پر حسرت و یاس اور بازاروں کی رونق اور چہل پہل ختم، شعبہ جات اساتذہ اور طلباء سے خالی۔ وکٹوریہ گیٹ کی گھڑی وحشت سے خاموش، اسٹریچی ہال پر سکوت طاری۔ اس کے مقفل دروازوں کے باہر اندر سے بچاؤ بچاؤ کی صدا آرہی تھی۔ مسجد کے مینار و گنبد سر بہ سجود ہو کر رب العزت کی بارگاہ میں المدد المدد پکار رہے تھے۔

افواہیں گرم تھیں کہ علیگڑھ کے بنے ہوئے تالوں کے بجائے اب مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے سر بہ مہر تالے یونیورسٹی کو مقفل کرنے کے لیے دہلی اور لکھنؤ میں تیار ہو رہے ہیں۔ یہ افواہیں تھیں مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ زیادہ وقت نہ گزرا، ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور پنڈت دلبھ پنتھ یونیورسٹی کی آبادکاری میں لگ گئے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ماہر تعلیم اور حکومت کے معتمد یہاں کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ذاکر صاحب کے تقرر سے آبادکاری کے کام میں اور تیزی آئی موصوف نے اعلیٰ تعلیمی اور تحقیقی کام یونیورسٹی میں پھر سے شروع کرایا۔ یونیورسٹی میں چہل پہل ہوئی، مسجد آباد ہوئی۔ اسٹریچی ہال کے قفل کھولے گئے۔ وکٹوریہ گیٹ کی گھڑی پھر سے گھنٹہ بجانے لگی۔ ذاکر صاحب اپنی ہمت سے ڈٹ گئے۔ یونیورسٹی کو گرداب سے نکال کر کنارے پر لائے۔ گلاب کا شیدائی گل و گلاب پاشی میں لگ گیا۔ کچھ دن بعد یونیورسٹی کے گلابوں کی پنڈت نہرو نے فرمائش کی۔

انجینئرنگ کالج خاص طور پر ذاکر صاحب کی توجہ کا مرکز رہا۔ ان کی گرانقدر خدمات کے تحت سنہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں کالج کا نام ان کے نام پر رکھا گیا۔

Institute Of Engineers (India) نے سنہ ۱۹۵۰ء میں کالج کی ڈگری تسلیم کی۔ سنہ ۵۲-۱۹۵۱ء میں کالج کی عمارت میں ترمیم اور توسیع شروع ہوئی۔ نئی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ جس مارکیٹ کو سر راس مسعود نے سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء میں تعمیر کرایا تھا وہ اب انجینئرنگ کالج میں ضم ہونے لگی۔ کالج کی بالائی منزل اور شمالی جانب کا بلاک بمع لائبریری سمینٹ کے Hollow Blocks سے تعمیر ہوا۔

ماہنامہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۱۹۵۰ء میں تین سالہ ڈپلوما کورس "سن بلوغ" کو پہنچا۔ ان کی ایک الگ حیثیت ہوگئی مگر وہ ابھی تک کالج ہی کی "نوآبادیات" تھے۔ پالی ٹیکنک کے داخلوں کی تعداد نوّے تھی اور نورالہدیٰ صاحب اس کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔

۵۲-۱۹۵۱ء میں پورے ہندوستان کے انجینئرنگ کالج کے پرنسپل حضرات کا سالانہ اجلاس کالج میں منعقد ہوا۔ یہ بھی آبادکاری کی سمت میں ایک قدم تھا۔ اس اجلاس کے منتظم اور روح رواں ماہر انجینئرنگ تعلیم اور پرنسپل انجینئرنگ کالج اے۔ ایم۔ یو جناب کے۔ سی۔ چاکو (ڈی۔ ایس سی انجینئرنگ لندن) تھے۔ اسی سال راج کماری امرت کور (وزیر کابینہ مرکزی حکومت) کالج میں تشریف لائیں۔ (کالج میگزین ۵۲-۱۹۵۱ء) اسی سال کالج ورکشاپ کی لوہے کی چمنی کو نصب کیا گیا۔ یہ کام عبدالحئ خاں ورکشاپ سپرنٹنڈنٹ کی قیادت میں ہوا۔ اس چمنی کا وزن آٹھ ٹن، اونچائی اسی فٹ اور قطر ساڑھے تین فٹ ہے۔ یہ لوہے کی ۳/۸ موٹی چادر کی بنی ہوئی ہے۔ تاہم حیرت ہے کہ چمنی کو نہایت آسانی سے کھڑا کر دیا گیا۔ اس کام کو ورکشاپ سپرنٹنڈنٹ عبدالحئ خاں کی قیادت میں ورکشاپ کے ملازمین اور طلبا نے ہی انجام دیا۔ جب کہ اس کام کو صرف چیدہ چیدہ کمپنیاں ہی انجام دے سکتی تھیں۔ چمنی کو کھڑا کرنے میں ملازمین اور طلبا انجینئرنگ کالج کی مخفی صلاحیتوں کا اندازہ اور ان کی اس ادارے سے لگن کا پتہ چلتا ہے۔

۵۴-۱۹۵۳ء میں حکومت ہند کی طرف سے آل انڈیا کونسل فار ٹیکنیکل ایجوکیشن کی معرفت ایک کثیر رقم کالج کی توسیع اور آلات ساز و سامان کے لیے منظور کی گئی۔ اس کے تحت منجملہ دیگر آلات سول انجینئرنگ میں قریب دو درجن بہترین ولایتی Theodolites لڑکوں کے استعمال کے لیے فراہم ہوئیں۔ ساتھ ہی ساتھ ایک عدد Photo-Theodolite جو بہت ہی عنقا بھی جاتی تھی، منگائی گئی۔ دوسرے شعبوں میں بھی عمدہ قسم کے آلات فراہم کیے گئے۔ اس دور میں پرنسپل چاکو کی قیادت میں جن لوگوں نے اپنا تدریسی سفر جاری رکھا۔ ان میں پروفیسر این۔ سی۔ سنہا، پروفیسر این۔ سی۔ ڈے، مسٹر ایس۔ سی بھٹاچاریہ

اور سید احمد عباس قابلِ ذکر ہیں۔

اسی زمانے میں راقم الحروف کینیڈا سے سول انجینئرنگ میں اور نصیر الدین امریکہ سے الیکٹریکل انجینئرنگ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس آئے۔ مگر کچھ ناسازگار حالات کی بنا پر نصیر الدین صاحب بعد میں علیگڑھ چھوڑ کر چلے گئے۔

ڈاکٹر چاکو فرشتہ خصلت انسان تھے۔ ان کو نہ جانے کیوں آخری عمر میں علیگڑھ سے بے حد لگاؤ ہو گیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ مرتے دم تک خدمت کریں اور انتقال کے بعد بھی علیگڑھ ہی میں دفن کیے جائیں۔ موصوف نے راقم الحروف سے اپنی یہ خواہش ان الفاظ میں ظاہر کی تھی۔

"I want to serve AMU and die here"

ڈاکٹر چاکو کے یہ الفاظ قابلِ صد احترام ہیں۔ لمحۂ فکر یہ ہے کہ علیگڑھ میں اس وقت وہ کون سی مقناطیسی قوت تھی جو ایک ایسے شخص کو، جو وطن سے ہزاروں میل دور (وہ کیرالا کے عیسائی تھے) اعزا سے علٰحدہ ہو کر ایک مشینی زندگی علیگڑھ میں بسر کر رہا تھا، مندرجہ بالا الفاظ کہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

ڈاکٹر چاکو نے تعلیمی معیار بلند کرنے کے لیے منجملہ اور اقدام کے تین اہم اسکیمیں کالج میں شروع کیں۔ اول Instructional Terms جس کے تحت طلبا تمام ہندوستان کے بیشتر انجینئرنگ ورکس دیکھنے جاتے اور وہاں ہونے والے کاموں کا گہرا مطالعہ کرتے۔ یہ ہندوستان کا انجینئرنگ دور درشن تھا۔ دوم College Engineering Exhibition جس کے ذیل میں طلبا انجینئرنگ کے جیتے جاگتے اور انوکھے ماڈل بنا کر جہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے وہیں عوام کی معلومات میں اضافہ کرتے۔ سوم سول انجینئرنگ میں سروے کیمپ شروع کیا جہاں طلبا پندرہ دن کے لیے کسی دور جگہ ڈیرے اور خیمے لگا کر سروے کرتے۔

کالج کو ہندوستان کے دوسرے کالجوں سے متعارف کرانے کے لیے کالج میگزین پھر سے شروع کی۔

۱۹۵۴ء میں کالج میں داخلوں کی تعداد نوّے سے بڑھ کر ایک سو بیس ہو گئی۔ اتنا ہی اضافہ ڈپلوما کورسیز کے داخلوں میں بھی ہوا۔

ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۱۸۵۷ء میں چندر کانت گھوش کمیٹی کے تحت داخلوں کی تعداد دو سو چالیس کر دی گئی اور ایک کثیر رقم کالج اور پالی ٹیکنک کے لیے عطا ہوئی۔ پرنسپل پالی ٹیکنک کی علاحدہ پوسٹ ہو گئی اور اسی سال سیّد احمد عباس اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ پرنسپل عباس ۱۹۸۱ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

۱۹۵۵-۵۸ء کالج کی قیادت خان بہادر حمید اللہ خاں نے کی۔ موصوف ایک شریف النفس انسان تھے اور محکمہ آب پاشی (یو۔ پی) کے ماہر تصور کیے جاتے تھے۔ دُور دُور سے فیلڈ انجینئر آب پاشی کی نہروں کے نکات پر ان سے مشورہ کرنے آتے۔ محکمہ آب پاشی کے علاوہ اساتذہ اور طلبا میں بے حد مقبول تھے۔ جس کا سبب شاید ان کا مشفقانہ اور پدرانہ سلوک تھا۔

حمید اللہ خاں صاحب فیلڈ ورکس کو بھی انجینئرنگ تعلیم کا ایک اہم جزو خیال کرتے تھے۔ چنانچہ سول انجینئرنگ میں جس دوسرے کیمپ کی بنیاد ڈاکٹر چاپکو نے ڈالی تھی۔ اس کی افادیت کے پیشِ نظر اسے مزید فروغ دیا۔ کالج کے طلبا کو محکمہ آب پاشی کے کام کاج سے روشناس کرایا، جو بعد کو طلبا کے لیے بے حد مفید اور کارگر ثابت ہوا۔

۱۹۶۱-۶۲ء میں پالی ٹیکنک کو ایک خود مختار ادارے کا درجہ ملا۔ اب وہ اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار تھا اور فیکلٹی کا برابر حصہ دار تھا۔ فیکلٹی میں اس کے خود نمائندے تھے۔ اس کے داخلوں کی تعداد بھی دو سو چالیس ہو گئی۔ اس کا اسٹاف کلاس روم، ورکشاپ، لائبریری بھی الگ ہو گئی۔

یونیورسٹی پالی ٹیکنک: عبّاس صاحب اولڈ بوائے ہونے کے رشتے سے پالی ٹیکنک کے کام میں تن من سے لگ گئے۔ ان کے زمانے میں ہر شعبے میں ترقی ہوئی، ادارے کو عروج ہوا۔ اس کا شمار ہندوستان کے نمونہ (Model) پالی ٹیکنک میں ہونے لگا اور وزارتِ تعلیم میں مثالی مانا جانے لگا۔ اُن کے اس کام کو اس ناچیز (ضیاء الحسن) نے مزید فروغ دینے کی کوشش کی اور خدا کے فضل و کرم سے کافی حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔ ۱۹۸۴ء میں حکومتِ ہند نے کمیونٹی پالی ٹیکنک کی اسکیم کو منظوری عطا

کی جس کے تحت نچلے اور بغیر پڑھے لکھے طبقے کے لوگوں کو صنعتی تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ کم عرصے میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں اور اپنی روزی روٹی خود کمانے لگیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ پچھلے دس برس کے عرصے میں دو ہزار سے زیادہ لڑکے اور لڑکیوں کو اس اسکیم میں تربیت دی گئی جس میں تقریباً گیارہ سو مرد و عورتیں یا تو کہیں ملازم ہیں یا اپنا کاروبار چلا رہے ہیں۔

۱۹۸۴ء میں حکومت اتر پردیش نے یونیورسٹی پالی ٹیکنک کو ایک خطیر رقم عطا کی جس سے ان کاریگروں کے ان بچوں کی مزید تربیت ہو سکے جو آٹھویں درجے کے بعد اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکے۔

نومبر ۱۹۸۴ء ہی میں حکومت ہند نے یونیورسٹی پالی ٹیکنک کیمپس میں Food Craft Institute کے قائم کرنے کی منظوری دی۔ حالانکہ اس ادارے کا یونیورسٹی سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اس کا سارا کام یونیورسٹی پالی ٹیکنک کے تحت ہی ہوتا ہے۔ اس ادارے میں چار کورسیز کی تعلیم دی جاتی ہے جس میں Travel & Tourism کا ڈپلوما شامل ہے۔ آج کل اس ادارے سے نکلے ہوئے طالب علم ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں اکثر ہوٹلوں میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔ یونیورسٹی اس وقت اس بات پر بہت توجہ کے ساتھ غور کر رہی ہے کہ اس ادارے کو اور اداروں کی طرح اپنے کنٹرول میں لے لے۔

کافی عرصے تک یونیورسٹی پالی ٹیکنک میں انجینئرنگ کی صرف تین شاخوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ۸۶-۱۹۸۵ء سے اس میں چار مزید مضامین کا اضافہ ہوا جسے الیکٹریکل، انسٹرومنٹیشن، آرکیٹیک اور ڈرافٹنگ ڈیزائننگ اور اسی طرح طالب علموں کی تعداد بھی ۲۴۰ سے بڑھ کر ۳۳۰ ہو گئی۔ یہ یونیورسٹی کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔

۱۹۹۲ء میں Northern Region کے سب سے اچھے پالی ٹیکنک ہونے کا انعام ملا۔ ۱۹۹۳ء میں پورے ہندوستان میں بہترین کارکردگی کا انعام یونیورسٹی پالی ٹیکنک کو ملا۔ مستقبل قریب میں ایک Post Diploma Course

بھی شروع ہونے کی امید ہے۔ یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ یہاں جتنی اسکیمیں آئیں اور ان کے تحت جو بھی ترقی ہوئی اس سابق وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب کی خصوصی دلچسپی اور ذاتی کوششوں کا خاص دخل رہا۔

۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۹ء تک کالج کی قیادت پروفیسر ضیاء الدین انصاری کے سپرد ہوئی جو ایک نہایت بردبار، سنجیدہ، نرم مزاج اور صلح پسند انسان تھے۔ ان کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ موصوف انجینئرنگ کالج عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے پرنسپل رہ چکے تھے۔ عادات و اطوار پر خالص حیدرآباد کی چھاپ تھی۔ ۱۹۶۶ء میں نواب علی یاور جنگ کے زمانے میں ضیاء الدین انصاری کی قیادت میں حکومت ہند نے علیگڑھ میں نسواں پالی ٹیکنک منظور کیا۔ احمد عباس اپنے فرائض کے علاوہ نسواں پالی ٹیکنک کے بھی پرنسپل مقرر ہوئے ۱۹۶۹ء میں نسواں پالی ٹیکنک کی عمارت اور ہوسٹل بھی مکمل ہو گئے۔

نسواں پالی ٹیکنک مسٹر بدرالدین طیب جی آئی سی ایس اور نواب یاور علی جنگ کا تعلیم نسواں کو فروغ دینے میں اہم کردار رہا ہے۔ اب یہ ادارہ بھی فیکلٹی کا برابر کا شریک کار ہے اور خاتون پرنسپل کی سربراہی میں کام کر رہا ہے۔ اس وقت اس ادارے میں پانچ ڈپلوما کورسیز میں تعلیم دی جاتی ہے جس میں ہر سال ۱۲۵ طالبات کا داخلہ ہوتا ہے۔ جیسے Computer Applications, Electronics, Costume, Design, Dress Making and Office Assistantship, T.V. Technology

ضیاء الدین انصاری کی قیادت اور نواب علی یاور جنگ کے دور ہی میں رات کے انجینئرنگ کورسیز کی کلاسیز (بی۔ ای) کالج کے تینوں شعبوں میں شروع کی گئیں۔ بی۔ ای کے کورسیز کا مقصد ڈپلوما پاس شدہ جونیئر انجینئرز کو مزید اعلیٰ تعلیم کا موقع فراہم کرنا تھا۔ تاکہ وہ کچھ وقت فیلڈ میں گزارنے کے بعد اپنی علمی لیاقت میں اضافہ کر سکیں۔ یہ اسکیم حکومت ہند نے بطور تجربہ علیگڑھ اور کسی ایک دوسری جگہ نافذ کی تھی۔ محمد یٰسین انصاری کو خود نواب صاحب نے اس کورس کی قیادت کے لیے منتخب کیا اور اکثر و بیشتر بلا کر اس کورس کے متعلق تبادلہ خیال

فرماتے اور اس کی افادیت کے متعلق ان کی رائے طلب کرتے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے مفید مشوروں سے نوازتے۔ ماہر تعلیم اور انسان دوستی اور ہمدردی کے تحت وہ فروغ تعلیم بالغان کے بے حد قائل تھے۔

۱۹۶۴ء کالج کے لیے سال زریں ثابت ہوا۔ اسی سال دو سالہ ایم ایس سی (انجینئرنگ کورس پہلے الیکٹریکل اور ایک سال بعد سول اور میکینکل میں) شروع ہوئے۔ ہندوستان میں کالج کا معیار اور بلند ہوا، اساتذہ کا تعلیمی معیار بڑھا۔ پڑھنے پڑھانے میں تیزی آئی۔ عمارت میں توسیع ہوئی اور لائبریری میں کتابوں کا گراں قدر اضافہ ہوا۔ بک بینک بھی قائم ہوا۔ اس بک بینک سے طلبا کی مالی معاونت ضرور ہوئی مگر طلبا اپنی ذاتی کتابوں سے کنگال ہو گئے۔ اس دور میں سول انجینئرنگ کے شعبے کی الگ عمارت تعمیر ہوئی اور پھر یہ شعبہ اپنی نئی عمارت میں منتقل ہو گیا۔

۱۹۶۵ء میں یونیورسٹی میں ایک المیہ پیش آیا، جس نے یونیورسٹی کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ یونیورسٹی کا کردار اور امتیازی حیثیت جس کو تربیت کہتے ہیں بُری طرح مجروح ہوئی۔ شمع شاہجہانی دھیرے دھیرے گل ہوتی گئی۔ یونیورسٹی گرداب میں پھنس گئی۔ کئی ملاّح آئے مگر ہر ایک کشتی کو کنارے لانے میں ناکام ہی رہا۔ کشتی میں سوراخ بڑھتے گئے۔ اساتذہ اور طلبا سب ہی ملوث ہو گئے اور ایک دوسرے کی حدود کار میں داخل ہو گئے۔ اساتذہ کا وقار بری طرح مجروح ہوا۔ آئندہ آنے والے سال یونیورسٹی کے لیے پریشان کن، اساتذہ کے لیے علمی موت اور طلبا کے لیے بیکاری کے سال ثابت ہوئے۔ معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہو گیا جب یونیورسٹی کے پرانے طلبا جن کے نام ابھی تک بھی خواہانِ یونیورسٹی" میں ایک سرے سے درج ہی نہیں تھے سرِفہرست آ گئے۔ طلبا کو اپنے دائرہ کار میں رکھنے کے لیے اساتذہ کے بجائے ان لوگوں کو باہر سے بلایا گیا۔ یہ یونیورسٹی کے لیے عام طور پر اور اس سے منسلک اداروں (مثلاً انجینئرنگ کالج) کے لیے خاص طور پر ایک نیا موڑ تھا۔ یونیورسٹی تعلیمی ادارے کے بجائے سیاست کا اکھاڑہ بن گئی۔

۱۹۶۵ء سے ماضی قریب تک حکومت اور یونیورسٹی کا رشتہ جوڑا ودھا کرشنن، ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور پنتھ جی نے مضبوط کیا تھا وہ یونیورسٹی کی خانہ جنگی اور حکومت کی اپنی مشغولیات اور مسائل کے تحت کمزور پڑ گیا۔ اندرونِ یونیورسٹی اساتذہ پر انتظامیہ اور طلبا کی بالادستی ہوگئی۔ حصولِ علم کے بجائے حصولِ جاہ و ثروت نصب العین ہوکر رہ گیا۔ عدل و انصاف یونیورسٹی میں عنقا ہو گئے۔

اس بدلتے ہوئے حالات کی دھند میں تربیت جو یونیورسٹی کا طرۂ امتیاز تھی کم ہوگئی۔ نتیجہ کے طور پر کھیل کے میدان کھلاڑیوں سے خالی، ملازمتوں میں طلبا کا حصہ نفی کے برابر، قیادت کے بجائے ملک کی سیاست نے اساتذہ، طلبا اور انتظامیہ کا دامن پکڑ لیا۔ انتظامیہ نے یونیورسٹی کو کوزہ میں بند کر دیا، طلبا سہمے ہوئے، ان کے چہرے پژمردہ، ان کی تمام تر متعدی اور سرگرمیاں صرف درس گاہ کی چہار دیواری تک محدود ہوکر رہ گئیں۔ ان سے ان کی علمی اور عملی قوتِ پرواز سلب کر لی گئی۔ وہ مقابلے کے امتحان تو درکنار اپنے ہم عصروں کے دوش بدوش بھی چلنے سے معذور اور مجبور ہو گئے۔

یونیورسٹی کے متذکرہ بالا حالات میں ۱۹۶۸ء میں پروفیسر این۔ سی سہا نے پرنسپل اور ڈین کا عہدہ سنبھالا۔ وہ ۱۹۵۰ء سے اسی ادارے میں الیکٹریکل انجینئرنگ کے پروفیسر اور شعبہ کے صدر تھے۔ پروفیسر سہا پڑھنے پڑھانے والے منتظم، فرض شناس اور لائق استاد ہیں۔ تادم ماشاء اللہ ابھی حیات ہیں۔ علیگڑھ میں بیشتر وقت کتب بینی میں گزارتے۔ اصولوں کی خاطر حالات سے سمجھوتا کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ یونیورسٹی کا مندرجہ بالا ماحول کالج کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ لاقانونیت ہڑتال، لڑکوں کی بے جا مانگیں، روزمرّہ کا معمول بن گئی تھیں۔ علمی ماحول بحرانی کیفیت کی نذر ہو گیا اور حالات پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

پروفیسر سہا اپنی غیر معمولی علمی صلاحیتوں کے مالک اپنی عملی اور علمی کوششوں کے باوجود حالات پر قابو نہ پا سکے، ۱۹۷۴ء میں ریٹائر ہو گئے اور موصوف نے ریٹائر ہونے کے بعد بھی ایک کثیر رقم کالج کو عطا کی۔ اس رقم سے ہر سال ایک

انعام ان کے نام پر کالج کے بہترین اور اعلیٰ تحقیقی کام پر اساتذہ میں سے کسی کو دیا جاتا ہے۔ اس رقم میں سہا صاحب اضافہ بھی کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر سہا کی سبکدوشی کے بعد پرنسپل اور ڈین کے مشترکہ عہدوں کو علٰحدہ کر دیا گیا۔ پروفیسر جمشید عاقل میر اس وقت کے پروفیسروں میں اولیت کی بنا پر عارضی پرنسپل اور ڈین مقرر ہوئے۔ انھوں نے حالات سدھارنے کی کوشش کی اور بہت حد تک وہ اس میں کامیاب رہے۔

سنہ ۱۹۷۴-۸۴ء میں پروفیسر ایم۔ وائی۔ انصاری، پروفیسروں میں اولیت کی بنا پر عارضی اور بعد کو سلیکشن کمیٹی کے ذریعے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ شعبۂ سول انجینیرنگ کے پروفیسر بھی رہے۔

پرنسپل اور ڈین ہر دو عہدوں کے علٰحدہ ہو جانے سے دونوں دفتر بھی الگ ہو گئے۔ یونیورسٹی نے اس میں دوراندیشی اور دوربینی سے کام نہیں لیا۔ دونوں دفاتر کے دائرۂ کار کو بغیر واضح کیے راتوں رات علٰحدہ کر دیا۔ نتیجے کے طور پر پرنسپل اور ڈین ایک دوسرے کے دائرۂ کار میں دخل اندازی کرنے لگے۔ اس دخل اندازی سے کسی بدنیتی کا دخل نہ تھا بلکہ دائرۂ کار کی وضاحت نہ کرنے کا سبب تھا۔ اس میں دخل اندازی سے کالج میں بدنظمی اور ابتری بڑھی۔ حالات اور خراب ہوئے۔ بیشتر وقت دائرۂ کار کی وضاحت میں صرف ہوا۔ کوئی تعمیری کام نہ ہو سکا دونوں میں کاغذ اور قلم کا تصادم ہوتا رہا۔ پھر بھی اس دور کے دو اہم نمایاں کارنامے ہیں۔ پروفیسر (جو ڈین تھے) اور پرنسپل نے مل کر ۴ جنوری سنہ ۱۹۸۴ء کو متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ زید بن سلطان النہیان کو ان کے یونیورسٹی کے دورے پر خوش آمدید کہا۔ پرنسپل ایم۔ وائی۔ انصاری نے عزت مآب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ اس کے جواب میں صدر محترم نے پیٹرولیم انسٹی ٹیوٹ کے قائم کیے جانے کی پیش کش کی جن کا نام صدر محترم کے نام پر رکھا جانا طے ہوا اس ادارے کے لیے پوری رقم فراہم کرنا بھی موصوف نے منظور کر لیا۔ انھوں نے ادارے کو دنیا کے بہترین اداروں میں ایک ہونے کا بھی اعلان کیا۔ چند ماہ بعد صدرِ محترم نے اٹھارہ لاکھ روپیہ کی پہلی قسط یونیورسٹی کو ارسال کی۔ مرکزی حکومت نے اس

ـــــــــــــــــ
ـه ماہنامہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

پروجیکٹ کو اصولی طور پر مان لیا اور یونیورسٹی نے اس کی تفصیل تیار کرنی شروع کر دی۔ مگر بعد میں یہ پروجیکٹ جو کروڑوں روپے کا ہو کر ملک وملت کو فیضیاب کرتا چند اسباب کی وجہ سے داخل دفتر ہو گیا۔

دوسرا اہم کارنامہ جو تھے شعبۂ کیمیکل انجینئرنگ کا اضافہ ہے (۱۹۸۰ء) اس کے کچھ عرصے بعد پٹرولیم انسٹی ٹیوٹ شعبۂ کیمیکل کی بلڈنگ میں شروع ہوا۔ شعبہ کے اندرونی حالات نے اسے زیادہ فروغ نہ پلنے دیا۔

مئی ۱۹۸۰ء میں چار اشخاص پر مشتمل ایک وفد پروفیسر محمد شفیع (وائس چانسلر) کی قیادت میں یونیورسٹی آف پٹرولیم اینڈ منرلس ظہران، کے دعوت نامے پر سعودی عرب گیا۔ وفد کے دیگر اراکین پروفیسر جلال الدین مرحوم ڈین، پروفیسر ایم، وائی انصاری پرنسپل، ممبر سکریٹری اور پروفیسر حبیب رسول صدر شعبۂ جیالوجی تھے۔ وفد ظہران کے علاوہ مدینہ یونیورسٹی، ریاض یونیورسٹی اور جدّہ یونیورسٹی بھی گیا۔ وفد کے قائد نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے سعودی یونیورسٹی کے صدر اور دیگر حضرات کو روشناس کرایا۔ ہر جگہ وفد کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔

شیخ زید پٹرولیم انسٹی ٹیوٹ علیگڑھ میں ان حضرات نے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ دیگر شعبہ جات میں باہمی تعاون کی تجویز زیر غور آئی۔ مجموعی طور پر وفد کامیاب واپس آیا۔ وقت کے ساتھ یونیورسٹی کی گرم جوشی دھیرے دھیرے سرد مہری میں تبدیل ہو گئی۔ یہ پروجیکٹ بھی اندرونی حوادث کی نذر ہو گیا۔

۱۹۸۱ء میں محترم سیّد حامد وائس چانسلر کی ایماء پر پروفیسر ایم۔ وائی انصاری پرنسپل نے پندرہویں صدی ہجری میں یونیورسٹی کے تعمیری منصوبے تیار کیے۔ یہ دستاویز یونیورسٹی کے مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یونیورسٹی نے نہ جانے اپنی کن مجبوریوں کے تحت ان اہم پروجیکٹس کو بالائے طاق رکھ دیا خاص کر پٹرولیم پروجیکٹ کو مرکزی حکومت بھی اصولی طور پر منظور کر چکی ہے۔ فخرالدین علی احمد مرحوم صدر جمہوریۂ ہند یو۔ اے۔ ای کے دور میں صدر محترم

شیخ زید کو پھر یاد دہانی کرائی۔ مزید برآں اٹھارہ لاکھ روپیہ کی پہلی قسط جو صدرِ محترم شیخ زید نے عطا کی تھی، باوجود یاد دہانی کے، اس کا حساب اب تک صدرِ محترم کو نہیں بھیجا۔

پٹرولیم پروجیکٹ اور سعودی یونیورسٹی کے باہمی تعاون کا پروجیکٹ دونوں ہی اہم ہیں۔ ان کے عدمِ نفاذ سے ملک اور قوم دونوں ہی کو نقصان ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے تعمیری منصوبوں کو پھر سے زندہ کیا جائے۔

۱۹۸۴ء میں پروفیسر ایم۔ اے۔ جانی پرنسپل مقرر ہوئے۔ چند سال قبل ہی الیکٹرونک اور کمپیوٹر انجینئرنگ میں علٰحدہ شعبہ جات قائم ہو گئے ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں Architecture & Planning ڈگری کورس کا بھی اضافہ ہوا ہے۔

خلاصہ: انجینئرنگ فیکلٹی ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اس میں قریب قریب سب ہی جدید شعبہ جات موجود ہیں۔ اساتذہ کا علمی اور تعلیمی معیار بہت اعلیٰ ہے۔ کلاس روم کشادہ، میز کرسیاں اچھی۔ آلات اور ساز و سامان معیاری، لائبریری میں بے شمار کتابیں اور ساتھ ہی ساتھ بک بینک غرض تمام وسائل اور ذرائع موجود ہیں۔ کسی قسم کی کمی نہیں مگر حصولِ علم کے متوالوں کی کمی ہے۔ شاید اس کی وجہ ہر چیز کی فراوانی ہے۔ علم کی پیاس عیش میں نہیں بلکہ غربت میں پیدا ہوتی ہے۔

آخر میں راقم الحروف چند تجاویز پیش کرنا چاہتا ہے، تاکہ یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد اور رہبرانِ ملک وقوم توجہ فرما سکیں۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلباء کو ملازمت دلانے کے سلسلہ میں مستقل ایک شعبہ کی ضرورت ہے۔ دراصل ملازمتوں کے سلسلہ میں تو وائس چانسلر کے دفتر سے لگی ہوئی چھوٹی سی لائبریری کی ضرورت ہے جو ملازمتوں اور بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کا ذریعہ ہو سکے۔ بہت سے پرانے اساتذہ اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ سرفراز ہاؤس فیکلٹی کا ورثہ ہے اسے فیکلٹی کا میوزیم

بنا دیا جائے اور اس کی قدیم شکل و صورت کا تحفظ کیا جائے۔
فیکلٹی کو بیرونِ ممالک کی نامور یونیورسٹیوں سے الحاق کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ خاص کر سعودی یونیورسٹیوں سے جو ۱۹۸۰ء میں باہمی تعاون کے لیے تیار تھیں۔ اداروں کا قائم کرنا مشکل ہوتا ہے مگر قائم شدہ اداروں کو فروغ دینا نسبتاً آسان۔ اس میں قیادت اور ایک قائد کی ضرورت ہے۔
یو۔ اے۔ ای کے صدر محترم کو یاد دہانی کی ضرورت ہے تاکہ بڑا ولیم انسٹی ٹیوٹ عملی پیمانہ پر وجود میں آسکے۔
علمی اور تحقیقی کام کو فروغ دینے کے لیے اساتذہ اور طلبا، وہر سطح پر دوسرے معیاری اداروں سے رابطہ قائم کریں۔ اساتذہ میں ایسی لیاقت ہے کہ وہ دوسروں کے دوش بدوش کھڑے ہو سکتے ہیں۔

"اتفاق کی خوبیاں لوگوں نے بہت کچھ بیان کی ہیں اور وہ ایسی ظاہر ہیں کہ کوئی شخص اتفاق سے بھی ان کو بھول نہیں سکتا۔ بہت بڑے بڑے واقعات دنیا میں گزرے ہیں جن کو پرانی تاریخیں یاد دلاتی ہیں اور جن کی یاد سے ایک عجیب اثر ہمارے دلوں میں ہوتا ہے، وہ سب باہمی اتفاق کا نتیجہ ہے؛ ایک ناچیز ریشۂ گیاہ جو تنہا نہایت کمزور ہوتا ہے۔ باہمی اتفاق سے ایسا قوی اور زبردست ہو جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس وقت تعلیم یافتہ دنیا میں جو کچھ ترقی ہے، یا نامہذب ملکوں میں جو کچھ طاقت ہے، وہ سب اتفاق کی بدولت ہے۔"

(سر سید)

پروفیسر مودود اشرف

اجمل خاں طبیہ کالج

ہندوستان جب انگریزوں کے زیر نگیں آیا تو بہت سے قومی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک اہم مسئلہ ہندوستان میں مروج طب کی بقا کا تھا۔ انگریز اس کو مٹا کر اس کی جگہ صرف "ایلوپیتھی" طریقہ علاج کو بزور رائج کرنا چاہتے تھے لیکن حکیم اجمل خاں جیسے جیالے مفکر و دانشور آڑے آئے۔ اور انگریزوں کے اس عزم کے خلاف پوری قوت سے برسرپیکار ہوئے اور اپنے عظیم مقصد میں کامیاب ہوئے۔ بایں ہمہ انگریزوں کے لائے ہوئے فن علاج و معالجہ طبی اندازِ تحقیق نے انھیں متاثر کیا۔ ان کی دوررس نگاہوں نے صاف دیکھ لیا تھا کہ طب کا فروغ اس کی توسیع و ترقی جدید علم سے کچھ لیے اور ان کے ماہرین سے کچھ سیکھے بغیر ممکن نہیں، پھر وہ اس نظریے کے داعی و مبلغ بن گئے۔ ان کی رائے میں نئی روشنی سے چشم پوشی فن کو کمال کی طرف نہیں بلکہ زوال کی طرف لے جائے گی۔ انجام کار طب نے ایک انگڑائی لی اور پہلو بدلا۔ طب کی مروج تعلیم سے انحراف کرتے ہوئے حکیم اجمل خاں ایک ایسی طرزِ تعلیم کی تراش و خراش میں لگ گئے جو قدیم و جدید تعلیم کا ایک ایسا دلکش پیکر ہو جس میں دونوں علوم کا حسن و وصف سمٹ

آیا ہو۔ اس تحریک کے زیرِ اثر اور پس منظر میں حکیم اجمل خاں کی مساعی جمیلہ سے ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی اکیڈمک کونسل نے طبیہ کالج کے قیام کے لیے ایک سب کمیٹی تشکیل دی۔ اس کی سفارش پر ۱۹۲۷ء میں علیگڑھ طبیہ کالج کا قیام عمل میں آیا۔ حسنِ اتفاق پرنسپل اور وائس پرنسپل کے لیے جو سلیکشن کمیٹی بنی اس کے ایک ممبر حکیم اجمل خاں بھی تھے۔ جب انتخاب کی باری آئی تو ان کی نگاہِ انتخاب دو بلند و بالا شخصیتوں پر آکر ٹھہر گئی۔ ڈاکٹر عطار اللہ بٹ ایم۔ ڈی۔ برلن، بی۔ ایس۔ پنجاب) ممبر آف ماہرینِ امراضِ چشم جرمن) پرنسپل اور وائس پرنسپل یگانۂ روزگار شفاءالملک حکیم عبداللطیف فلسفی مقرر ہوئے۔ یہ انتخاب حکیم اجمل خاں کے طرزِ فکر کی آئینہ دار ہے اور اس بات کا مظہر ہے کہ وہ طبیہ کالج علیگڑھ کو کن راہوں پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ کالج پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ یہاں کے طلبار کو روزِ اوّل ہی سے دو ایسے ماہرینِ فن کو سننے، دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا جن میں سے ایک اگر علوم جدیدہ کا شیدائی و سودائی تھا تو دوسرا علوم قدیمہ کا دیوانہ و دلدادہ۔ ایک کو اگر ابھرتے فن سے عشق تھا تو دوسرے کا دل قدیم طب کو سربلند، سرسبز و شاداب دیکھنے کے جذبۂ بے پایاں سے معمور۔ نظریئے کا یہ فرق آگے چل کر دونوں کے مابین گہرے اختلاف کا سبب بنا۔ اس کے اثرات طبیہ کالج کی بساطِ سیاست پر جو کچھ اور جیسا کچھ بھی مرتب ہوا ہو، لیکن طلبار ان دونوں اکابرینِ فن کی زبان سے نکلے آبدار موتی چن چن کر اپنا دامن بھر رہے تھے۔ ان میں دو باتوں کے درمیان تمیز کا اور مختلف ماحول میں جینے کا سلیقہ پیدا ہوا اور بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ "طب یونانی" اور "ایلوپیتھی" ایک دوسرے کی حریف نہیں بلکہ رفیق۔ مخالف نہیں بلکہ معاون ہیں۔ آگے چل کر ان کی یہی سوچ اس کالج کا طرّۂ امتیاز بنی۔

۱۹۲۷ء میں یونیورسٹی کے زیرِ سایہ حکومت یوپی کی منظوری سے تعلیم و تدریس کا باقاعدہ سلسلہ صاحب باغ (موجودہ سلیمان ہال) میں شروع ہوا۔ اس وقت امتحان بورڈ آف میڈیسن کے تحت ہوتا تھا اور ڈی۔ آئی۔ ایم۔ ایس کی

سند دی جاتی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں نواب میر حمایت علی خاں اعظم جاہ بہادر حیدرآباد دکن ولی عہد سلطنت آصفیہ نے دیگر معززین کی موجودگی میں کالج کا سنگِ بنیاد رکھا۔ عمارت کی تکمیل کے بعد تعلیم کا سلسلہ موجودہ کالج میں منتقل ہوگیا۔ طلبار کی رہائش کا نظم حبیب باغ (طبیہ کالج اسپتال کے سامنے والی عمارت) میں کیا گیا۔ جب کالج کا الحاق یونیورسٹی سے مکمل ہوگیا تو ۱۹۴۵ء میں بی۔ یو۔ ٹی۔ ایس کی سند عطا کی جانے لگی۔ یونیورسٹی نے اپنے طور پر تجربہ کار معلمین کے زیرِ نگرانی نصابِ تعلیم کو از سرِ نو مرتب کرایا۔ اس نصاب کے تحت فارغین طبیہ کالج کو بی۔ یو۔ ایم۔ ایس کی سند عطا کی جانے لگی۔ اب پورے ہندوستان کے طبیہ کالجوں میں اس نام سے سند دی جاتی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں اجمل خاں کی ملکی اور فنّی خدمات کے اعتراف میں اس کالج کو ان کے نام سے موسوم کردیا گیا۔ اپنے آغاز میں یہ کالج فیکلٹی آف میڈیسن کے ماتحت تھا۔ شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب اس کے ڈین بھی رہے۔ یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد نے ضرورت محسوس کی کہ ایک نئی فیکلٹی آف یونانی میڈیسن قائم کی جائے۔ چنانچہ ۱۹۸۶ء میں یہ فیکلٹی قائم ہوگئی اور پہلے ڈین پروفیسر حکیم محمد طیب ہوئے۔ یونیورسٹی کے دوسرے کالجوں کی طرح فن کی ترقی کے لیے نئے شعبوں کے قیام کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ کالج و یونیورسٹی کی تحریک وزارتِ صحت کی ایما پر سے ۱۹۷۲ء میں شعبۂ علم الادویہ کا قیام عمل میں آیا اور پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم کا کالج میں پہلی بار آغاز ہوا اس طرح کالج دو بڑے شعبوں میں تقسیم ہوگیا۔ شعبۂ یونانی طب وسرجری اور شعبۂ علم الادویہ (پوسٹ گریجویٹ شعبہ) اول الذکر کے پہلے صدر حکیم انعام اللہ اور ثانی الذکر کے صدر پروفیسر عبدالحبیب ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں سینٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے نئے نصاب کا نفاذ یونیورسٹی اکیڈمک کونسل کی منظوری سے عمل میں آیا۔ اب اسی نصاب کو تمام طبیہ کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے اسی کونسل کی تحریک پر یونیورسٹی نے تین نئے شعبوں کے کھولنے کی اجازت دی چنانچہ ۱۹۸۵ء قدیم شعبۂ یونانی طب وسرجری کی جگہ شعبۂ معالجات، شعبۂ کلیات، شعبۂ جراحت نے لے لی اور قدیم

شعبۂ یونانی طب و سرجری اسی میں ضم کر دیا گیا۔ اول الذکر دونوں شعبوں میں پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم کا سلسلہ اسی وقت سے شروع کر دیا گیا۔ شعبہ معالجات کے پہلے صدر پروفیسر حکیم علی حیدر جعفری اور شعبۂ کلیات کے پہلے صدر پروفیسر سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی مقرر ہوئے جبکہ شعبۂ جراحت کے صدر پروفیسر ڈاکٹر تاج الدین شمسی نامزد کیے گئے۔ ۱۹۹۵ء میں شعبۂ حفظانِ صحت و طبِ سماجی کا قیام عمل میں آیا اور اس شعبے میں بھی پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس کے پہلے صدر جناب افضال احمد صاحب ہوئے۔ اسی سال سے شعبۂ جراحت میں بھی سینٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے نظام کے تحت پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔ گویا اب موجودہ تمام شعبوں میں پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم ہو رہی ہے اور کالج ترقی کی شاہراہ پر رواں دواں ہے۔

انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطح پر نیا داخلہ مقابلے کے امتحان کے ذریعے ہوتا ہے۔ انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ میں ہر سال ۱۰۰ سے زیادہ لڑکے، لڑکیوں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ کالج میں اساتذہ و طلبا کے لیے ایک مرکزی لائبریری اور ہر شعبہ کی اپنی ایک ذیلی لائبریری ہے۔ مرکزی لائبریری فنِ طب کی بہترین کتابوں سے آراستہ ہے۔ بڑے اکیڈمک پروگراموں کے لیے کالج میں کوئی بڑا ہال نہیں تھا۔ موجودہ وائس چانسلر جناب محمود الرحمٰن صاحب کی توجہ اور خصوصی عنایت سے ایک آڈی ٹوریم اپنے تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ کالج میں طلبا کی اپنی ایک طبی سوسائٹی ہے جو طلبا اور کالج کے مفاد کے لیے کام کرتی ہے۔ سوسائٹی سے "آئینۂ طب" کے نام سے ایک معیاری میگزین اردو اور انگریزی میں شائع ہوتی ہے۔ میگزین کی اشاعت کا سلسلہ یوں تو اولین پرنسپل ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ کے زمانے ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ ان کے نگراں خود ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ اور ایڈیٹر حکیم ضرغام علی خاں سلونی (فریشین طبیہ کالج اسپتال)، جوائنٹ ایڈیٹر محمد یوسف صدیقی (متعلم سال چہارم) تھے۔ یہ میگزین پہلے ماہانہ پھر سہ ماہی اب سالانہ شائع

ہوتا ہے۔طبیہ کالج کے تمام شعبے طبیہ کالج کے احاطے میں واقع ہے، صرف شعبۂ معالجات کی عمارت طبیہ کالج کے اسپتال کے حدود میں واقع ہے۔ کالج کے احاطہ میں مشہور دواخانہ "دواخانہ طبیہ کالج" بھی ہے۔ اس کی مرکزی عمارت میں کبھی سرسید کا سائنٹفک سوسائٹی ہال تھا۔ اسپتال میں مریضوں کے لیے۔۔ البستر کا نظم ہے ابھی حال ہی میں پوسٹ گریجویٹ سطح کے مطالعے کے لیے ۱۲ بستر کا پی۔جی وارڈ تعمیر ہوا ہے۔ وائس چانسلر جناب محمود الرحمٰن صاحب کے تعاون ہی سے یہ کام ممکن ہو سکا۔ اس اسپتال میں معالجات، جراحت، امراضِ نسواں وعلم القابلہ کے الگ الگ معین بستر ہیں۔ معالجات ہی کے ضمن میں ماڈرن میڈیسن سے علاج کی سہولت مریضوں کو فراہم کی جاتی ہے۔ طلبا کی بہتر تعلیم اور مریضوں کی سہولت کے لیے ۱۵ او۔پی۔ڈی بیک وقت کام کرتی ہیں۔ دو معالجات کی، ایک ماڈرن میڈیسن اور ای۔این۔ٹی کی، ایک سرجری اور ایک امراضِ نسواں کی۔ اسپتال میں ایک آپریشن تھیٹر، ایک لیبر روم، ایک ایکسرے روم ہے۔ اس کے علاوہ بعض اہم تفتیش (Investigation) کی سہولت بھی موجود ہے۔ مثلاً Echo, Ultrasonography, Endoscopy, Cordiography ۔ غرض اسپتال کو جدید تقاضوں اور بہتر تشخیصی سہولتوں سے آراستہ کرنے میں یہاں کے منتظمین غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں۔

طبیہ کالج کے اساتذہ کی علمی وفنی خدمات: اس کالج کے اساتذہ کو ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کا پاس رہا۔ طب کے فروغ، تصنیف وتالیف اور اپنے تحقیقی کاموں کی وجہ سے وہ پوری طبی دنیا میں اپنا ایک مرتبہ رکھتے ہیں۔ علمی وتحقیقی مطالعے میں ان کی نگاہ جدید و قدیم دونوں علوم پر ہوتی ہے۔ کالج کے اولین پرنسپل ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ کی امراضِ چشم پر "کتاب العین" ایک مبسوط اور گراں مایہ کتاب ہے۔ اردو زبان میں اس سے بہتر کتاب لکھی نہ جا سکی۔ نظام حیدرآباد نے جب حیدرآباد دکن میں ایک معیاری طبیہ کالج کھولنا چاہا تو اس کی ایڈوائزری کمیٹی کے ایک ممبر ڈاکٹر بٹ بھی تھے۔ وہاں دس روز رہ کر ایک منظم اسکیم مرتب کر کے پیش کی۔ شفاء الملک

حکیم عبد اللطیف صاحب اپنے زمانے میں تمام طبّی سرگرمیوں کے روح رواں تھے اور تمام کالجوں سے تازیست وابستہ رہے۔ آپ کی عربی، اردو اور انگریزی میں تقریباً ۱۵ کتابیں اور رسائل ہیں۔ پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن (شعبۂ علم الادویہ) کو فارسی زبان میں ایک نمایاں کام پر پریسیڈنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ موصوف کا سفر پاکستان بنگلہ دیش اور ایران طب کے تعلق سے اہم اور قابلِ ذکر سفر ہے۔ اس طرح ہندوستان کی سرزمین سے باہر طبّیہ کالج کا تعارف کرانے میں آپ سرِفہرست ہیں۔ آپ کی مختلف موضوع پر ۲۲ کتابیں اور رسائل زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ حکیم سمیع الرحمٰن خاں (سابق ریڈر شعبۂ سرجری) کا نام سرجری کی معرکۃ الآرا کتاب Bailey and Love's میں دو جگہ درج ہے۔ یہ اعزاز کسی طبیب کو پہلی بار حاصل ہوا ہے۔ کالج ان کے اس کام کو بنظرِ تحسین دیکھتا ہے۔ پروفیسر محمد کمال الدین ہمدانی (شعبۂ کلیات) کی کم و بیش ۱۶ کتابیں اور رسائل شائع ہو چکی ہیں۔ پروفیسر حکیم سیّد علی حیدر جعفری (شعبۂ معالجات) کی مختلف موضوع پر تقریباً ۱۵ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ نوجوان اساتذہ بھی اس روایت کو زندہ اور برقرار رکھنے میں ہمہ تن لگے ہوئے ہیں۔ ان کی تحریر کردہ کتابیں یکے بعد دیگرے بازار میں آ رہی ہیں اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ طلبا کے ذہن کو بیدار رکھنے اور ان میں علمی ذوق پیدا کرنے میں انگریزی کے استاد ڈاکٹر عبد المتین صاحب گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ اور ایک مرتب پروگرام کئی سال سے چلا رہے ہیں۔ اس کے اہم مقاصد میں طلبا کی تقریری و تحریری صلاحیتوں کو ابھارنا اور اجاگر کرنا ہے۔

پوسٹ گریجویٹ شعبے کی علمی سرگرمیاں: اس شعبے کے قیام نے طب کو ایک نیا موڑ دیا۔ اور ایک نئی جہت عطا کی۔ اساتذہ اب کتابوں سے زیادہ تحقیقی مضامین لکھنے پر اپنا وقت صرف کرتے ہیں ان شعبوں کے قیام کے بعد سیمنار اور علمی پروگراموں کا انعقاد ایک معمول کی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ نیز ہند اور بیرونِ ہند علمی اور تحقیقی پروگراموں میں شرکت کا راستہ ہموار کرنے میں اس شعبہ کا کلیدی کردار رہا ہے۔

سہ ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اس کے علاوہ طب کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے اور اس کی توسیع و ترقی، نصاب کی تدوین نو میں سنٹرل کونسل آف یونانی میڈیسن کے کام میں یہاں کے اساتذہ گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ اس شعبے کے سند یافتہ افراد دوسرے کالجوں میں بھی اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں اور طب کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کر رہے ہیں۔ اب تک مختلف شعبوں سے تحقیقی مقالے لکھ کر سند حاصل کرنے والے طلبار کی تعداد ۱۶۰ پہنچ گئی ہے۔ غرض طب کے شباب رفتہ اور اس کی کھوئی ہوئی توانائی اور رعنائی بحال کرنے میں یہاں کے اساتذہ پورے شعور اور دلجمعی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی عطا کردہ روشنی ہمارے پیش پیش ہے۔

ماخذ

۱ء تذکرہ خاندان عزیزی۔ حکیم سید ظل الرحمن ۱۹۷۸ء

۲ء تاریخ طب۔ حکیم سید محمد حسان نگرامی ۱۹۸۹ء

۳ء تجدید طب ج ۱، ش ۱، شعبۂ کلیات علیگڑھ، مارچ ۱۹۸۸ء

۴ء طبیہ کالج میگزین۔ جلد ۱، ش ۱، علیگڑھ، اپریل ۱۹۳۲ء

۵ء ایضاً جلد ۴، ش ۱۲، مارچ ۱۹۳۶ء ۶ء ایضاً اپریل ۱۹۳۵ء

۷ء معالج ؍؍ جلد ۱، ش ۱، شعبۂ معالجات، علیگڑھ، ۱۹۸۸ء

۸ء مذکورہ شعبے سے متعلق افراد۔ ۹ء سیلی ایبڈ لوز ۲ واں ایڈیشن، ص ۲۷۴

"کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لیوے اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔" (سر سید)

پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری

علیگڑھ کا زراعتی ادارہ

علیگڑھ تحریک کی ابتدا سائنٹفک سوسائٹی کے قیام ۱۸۶۴ء سے ہوتی ہے ـــــ سرسید نے اس سوسائٹی کو جدید تحقیق کا مرکز بنایا۔ اوائل میں سرسید نے سماجی علوم، جدید سائنس ٹکنالوجی کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ اور دیگر علوم میں کتابیں لکھوانا شروع کیں۔ سائنس کی علمی تحقیق و تشویق کو عام کرنے کے لیے زراعت (Agriculture), کے میدان کو چنا گیا۔ سائنٹفک سوسائٹی نے جدید زراعتی اوزاروں کا تجربہ اور اس کے متعلق تعلیمی سلسلہ کا آغاز کیا۔ اس طرح سے علیگڑھ تحریک کی ابتدا زراعتی تحقیق سے شروع ہوئی۔ اس عظیم مقصد کے لیے سرسیّد نے موجودہ تصویر محل کے سامنے کا وسیع علاقہ حکومت سے حاصل کیا۔

۱۸۶۹ء میں سرسیّد نے لندن کا سفر کیا اور وہاں سے ایک تعلیمی ادارے کا منصوبہ بھی لائے۔ اس منصوبے کو عملی جامہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو پہنایا گیا جو محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کالج نے جدید مغربی تعلیم کی افادیت کو عام کرنے کی پوری کوشش کی۔ ۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد ہمارے اسلاف نے جدید طرز کی ایک یونیورسٹی قائم کرنے

کرنے کی زوردار تحریک چلائی۔ سرسید نے اپنی حیات ہی میں ملک گیر پیمانے پر ایک تعلیمی تحریک "ایجوکیشنل کانفرنس" کی داغ بیل بھی ڈالی تھی اور اس کے اسٹیج سے جدید سائنس کی تعلیم کے جملہ پہلوؤں و حقائق پر بہت غور وخوض کیا گیا تھا۔ اس کالج کو ایک مکمل یونیورسٹی کی شکل دینے کا سہرا مولانا محمد علی جوہر اور سر محمد شفیع کو جاتا ہے۔ اس طرح سے ۱۹۲۰ء میں یہ کالج علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی صورت اختیار کر گیا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں مغربی طریقۂ تعلیم رائج ہو جائے تا کہ ان کی معاشی اصلاح ہو۔ اس کا روشن پہلو یہ بھی تھا کہ جدید تعلیم ملازمت کا ذریعہ بنے اور عام مسلمان پیشہ ورانہ Professional وٹیکنیکل تعلیم کو حاصل کر کے خود کفیل بن جائیں۔ دورِ جدید کے مختلف پیشہ ورانہ نصابات کا تصور اس وقت ذہنوں میں نہیں آیا تھا، بلکہ انجینئرنگ میڈیکل اور ایگریکلچر کی تعلیم تک ہی لوگوں کی سوچ کام کرتی تھی اور ان ہی طریقۂ تعلیم سے لوگ واقف بھی تھے۔ ہمارے اسلاف نے ابتدا میں ان نصابات کی تعلیم شروع کرنے کی کوشش کی، لیکن یونیورسٹی کے پاس نہ تو وسائل و اختیارات تھے اور نہ ہی دوسرے ذرائع۔ اس کے لیے حکومت کی تمام تر امداد کی ضرورت تھی۔ اس وقت حکومتِ برطانیہ اعلیٰ تعلیمی وتحقیقی اداروں کو بڑھاوا نہیں دیتی تھی۔ لیکن مستقل جدوجہد کے بعد انجینئرنگ کالج کا خواب ۱۹۴۴ء میں آزادی سے قبل پورا ہوا، جس کا نام اب ذاکر حسین کالج، آف انجینئرنگ وٹیکنالوجی ہے اور اسی طرح سے میڈیکل کالج کا قیام کہیں جا کر ۱۹۶۲ء میں عمل میں آیا۔ اب اس کا نام جواہر لال میڈیکل کالج ہے۔

زراعتی کالج کے قیام کے لیے برسوں سے کوششیں جاری تھیں اور یہ منصوبہ عملی شکل نہیں پا سکا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اس راہ کی تگ ودو ایسی تھی جیسے کسی سنگلاخ چٹان کو توڑنا۔ حالانکہ ۱۹۴۶ء میں انڈرگریجویٹ سطح پر زراعتی تعلیم شروع کی جا چکی تھی، لیکن زیادہ دنوں تک نہیں چل سکی۔ اس کے بعد جب بھی سربراہانِ جامعہ نے زراعتی کالج کا منصوبہ حکومت

کے سامنے رکھا تو وہاں سے یہ روکھا جواب ملتا رہا کہ دہلی میں ایک زراعتی ادارہ موجود ہے اور علیگڑھ و دہلی کا زراعتی ماحول ایک جیسا ہے۔ لہٰذا علیگڑھ میں زراعتی کالج کا قیام بے معنی ہے۔ نیز پنت نگر اور کان پور کی زراعتی یونیورسٹیوں کے قیام سے علیگڑھ زراعتی کالج کا قیام معرضِ خطر میں پڑ گیا۔ اس قدر ناامیدی کے باوجود بھی یونیورسٹی اس راہ میں مسلسل کوشش کرتی رہی۔ اس سلسلے میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے مختلف شعبے مثلاً نباتات، حیوانیات اور جغرافیہ کے سائنس داں اس بات کی برابر کوشش کرتے رہے کہ اپنے تحقیق کا کام اسی فیلڈ میں کریں اور زراعتی تعلیم کو مختلف کلاسوں کے نصابات میں شامل کیا۔ یہاں پر اس بات کو بیان کرنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اسی یونیورسٹی کے پلانٹ پیتھولوجی (Plant Pathology) نیماٹولوجی (Nematology) انٹاموبوجی (Entomology) فیشریز (Fisheries) اور لینڈ یوز اینڈ واٹر مینجمنٹ (Land Use and Water Management) وغیرہ شعبے میں جو تحقیق کا کام ہوا ہے اس کی اہمیت عالمی پیمانے پر تسلیم کی جاتی ہے۔ انھیں غیر معمولی کاموں کی وجہ سے یہاں کے سائنس دانوں کو قومی و بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا اور ملکی و عالمی سطح پر اعلیٰ عہدوں پر فائز بھی رہے۔ مندرجہ بالا شعبوں کی کارکردگی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اب تک دو ہزار تحقیقی مضامین اور تیس سے زائد مشہور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ نیز ڈھائی سو طلبا کو پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگری کے علاوہ تقریباً ایک درجن ڈی۔ ایس۔ سی کی ڈگریاں مذکورہ فیلڈ میں دی جا چکی ہیں اور ان سب کاموں کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہی وہ کارہائے نمایاں تھے جس کی وجہ سے ہمیں کامیابی حاصل ہوئی۔ حالانکہ یونیورسٹی کا خواب ابھی تک پورا نہیں ہوا تھا۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ زراعتی سائنس داں ڈاکٹر ایم ایس سوامی ناتھن نے اپنے ۱۹۶۷ء کے دورے کے درمیان یہ بات کہی تھی کہ اس یونیورسٹی کا پورا حق ہے کہ یہاں پر ایک زراعتی ادارہ قائم کیا جائے کیونکہ یہاں کے سائنس دانوں نے زراعتی تحقیق کی شاہراہ کو روشن رکھا ہے اور زراعتی ادارے کے قیام کا ایک خاص قسم کا ڈھانچہ یہاں پر موجود ہے جس کی

بنیاد مضبوط اور واضح ہے۔ اصل میں ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ان کوششوں کو ٹھیک اور سیدھے راستوں پر مزید مضبوط ذرائع کے ساتھ پہلو بہ پہلو ترقی دی جائے اور انھوں نے یہ امید بھی ظاہر کی کہ اس سلسلے میں حکومت ہند و انڈین کاؤنسل آف ایگری کلچر ریسرچ کو کسی طرح کی امداد فراہم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونا چاہیئے مگر بدقسمتی سے اس جہت میں کئی برسوں تک کوئی اہم و عملی قدم نہیں اٹھایا جا سکا۔

زراعتی مرکز

باوجودیکہ سائنٹفک فیلڈ خصوصاً زراعتی تحقیقات میں ہمارے سائنسدانوں نے جو خدمات انجام دیں اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلے میں بارہا کوشش کرنے کے بعد بھی حکومتِ ہند نے ہماری اس ضرورت کو منظور نہیں کیا، جب کہ اس دوران سارے ملک میں زراعتی یونیورسٹیوں اور اداروں کا جال بچھنے و بڑھنے لگا، جس کی وجہ سے ہماری امیدیں مایوسیوں میں تبدیل ہونے لگیں، لیکن اچانک ذمہ داران یونیورسٹی پر یہ بات منکشف ہوئی کہ یونیورسٹی قوانین کی دفعہ (الف ۹) ۵ و دفعہ (ب) ۱۹ کے تحت یونیورسٹی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ آزادانہ طور پر کوئی بھی اعلیٰ مرکز قائم کر سکتی ہے۔ ابتدا میں جب سابق وائس چانسلر کے سامنے زراعتی ادارہ قائم کرنے کا منصوبہ رکھا گیا تو وہ ہچکچائے اور اس تجویز سے مطمئن نہیں ہو سکے لیکن جب حقائق و افادیت کی روشنی میں اس ممکنہ منصوبے اور علیگڑھ کے سائنسدانوں کے اعزازات کا علم ان کو ہوا تو ناامیدی میں امید کی کرن نظر آئی۔ اب تو وائس چانسلر صاحب کو اس کی ضرورت کا احساس ہو گیا اور یہ یقین ہو گیا کہ انتظامی و علمی اعتبار سے اس مرکز کا قیام وجود میں آ سکتا ہے جو یہاں کے فارغ طلبا کو معاش و ملازمت کے ایک نئے افق سے روشناس کرائے گا تو انھوں نے اس راہ میں اپنی کوشش کو تیز کر دیا۔ ۱۹ مئی ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کی مجلس میں تجویز نمبر ۳۵ کے تحت اس منصوبے کو منظور کیا گیا اور یہیں مجلسِ انتظامیہ کو یہ صلاح دی گئی کہ زراعتی مرکز کو دفعہ (۳) ۱۹ کے تحت قائم کر دیا جائے۔ اب ایک نئی راہ

مل گئی اور تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ زراعتی مضامین میں ایم۔ایس سی کی تعلیم کی اجازت دی گئی۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل مضامین تجویز کیے گئے۔

۱۔ پلانٹ پیتھولوجی (Plant Pathology)
۲۔ انٹاموولوجی (Entomology)
۳۔ ہارٹیکلچر (Horticulture)
۴۔ نیماٹولوجی (Nematology)
۵۔ مائکروبایولوجی (Micro Biology)
۶۔ سوائل کیمسٹری (Soil Chemistry)
۷۔ فرٹیلائزر ٹیکنالوجی (Fertilizer Technology)
۸۔ واٹر مینجمنٹ (Water Management)

۱۹۸۴ء میں وائس چانسلر کے ذریعے مذکورہ فیصلہ اتنا سودمند ثابت ہوا کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا رفتہ رفتہ اس کے دوررس نتائج سامنے آتے گئے۔ شعبۂ نباتات کے صدر کو یہ بھی ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ اس مرکز کے کوآرڈی نیٹر Coordinators رہیں۔ لیکن ۲۳ فروری ۱۹۸۹ء کو اکیڈمک کونسل کی میٹنگ میں تجویز نمبر (۳۹) کے تحت وائس چانسلر کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ فیکلٹی آف لائف سائنس کے کسی بھی ایسے باہل پروفیسر کو کوآرڈی نیٹر بنا دیا جائے جس کا کام اگریکلچر فیلڈ میں ہو۔

۱۹۸۴ء میں اکیڈمک کونسل نے آٹھ پوسٹ گریجویٹ مضامین میں تعلیم کی اجازت دی تھی لیکن ان میں سے صرف ۵ مضامین میں ہی تعلیم شروع ہو سکی۔ چوں کہ یہ سنٹر یونیورسٹی کی امداد پر ہی منحصر تھا اور یہ مدد کچھ اتنی وافر بھی نہیں تھی جس سے سنٹر کا کام بہ آسانی چل سکے۔ یونیورسٹی نے کل پچاس ہزار روپیہ Rs 50,000/- کی رقم اس سنٹر کو چلانے کے لیے مختص کی۔ اس لیے کوآرڈی نیٹر کو روز بہ روز بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یونیورسٹی نے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن اور انڈین کونسل آف اگریکلچر ریسرچ کے سامنے مالی امداد کی التجا رکھی لیکن ایک مدت تک یہ کوشش بارآور نہ ہو سکی۔ نوعمر اساتذہ جن پر

تعلیم و تعلّم کا زیادہ بوجھ تھا وہ بھی نا امید ہو رہے تھے اور دوسری طرف انھیں یہ بھی امید تھی کہ اگر اس سینٹر کو حکومت ہند منظور کر لیتی ہے تو ہم پہلے اس کے حصّہ دار ہوں گے۔ ۱۹۸۸ء میں شعبۂ حیوانات میں نیماٹولوجی ٹریننگ ورکشاپ کے اختتامیہ پروگرام میں ڈاکٹر این۔ ایس۔ رندھاوا، ڈائرکٹر جنرل انڈین کونسل آف ایگریکلچر ریسرچ، مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ان کے سامنے اس منصوبے کو پیش کیا گیا اور انھوں نے اس مرکز کے نفاذ کو پسند کیا۔ کچھ دنوں بعد جب میں نے دوبارہ ان سے دہلی میں ملاقات کی تو انھوں نے دل وجان سے یونیورسٹی میں اس مرکز کے قیام کی حمایت کی اور تحریری رضامندی بھی دی۔ ڈاکٹر رندھاوا کی ہمت افزائی ہمارے مقصد کے حصول میں سب سے پہلا ٹھوس قدم تھا۔ اس کے لیے ہم ان کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔ ۱۹۸۹۔۱۹۹۱ء تک اتنی ساری کوششوں کے باوجود بھی حکومت کی طرف سے کوئی مدد نہیں مل سکی۔ ۱۹۹۱۔۱۹۹۲ء کے دوران معاشی بحران اور اساتذۂ کرام کی بے توجہی کی وجہ سے وائس چانسلر نے مذکورہ ۵ مضامین میں سے صرف ۲ یعنی انٹامولوجی و نیماٹولوجی کی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دی۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو سر سید ڈے کے موقع پر وزیر زراعت جناب بلرام جاکھڑ صاحب مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے۔ ان کے سامنے بھی یہ منصوبہ رکھا گیا تو انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم اس مرکز کے قیام میں ہر طرح مدد کریں گے اور مالی امداد بھی فراہم کریں گے۔ یہ سن کر دل امید سے پُر ہو گیا۔ انھوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ روایتی مضامین کو ترمیم کر کے کچھ مخصوص اور اہم مضامین کو شامل کیا جائے۔ اس طرح سے اب زراعتی مرکز کی از سر نو تشکیل کی گئی جس میں پوسٹ ہارویسٹ ٹیکنالوجی (Post Harvest Technology) پلانٹ پروٹیکشن (Plant Protection) وغیرہ مضامین کو شامل کیا گیا۔ اس دوران ڈاکٹر رندھاوا کی جگہ ڈاکٹر وی۔ ایل چوپڑا انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ کے نئے ڈائرکٹر جنرل بنے۔ خوش قسمتی سے انھوں نے بھی ہمارے منصوبے کے قیام کی گرم جوشی کے ساتھ تائید کی۔ ۱۹ مئی ۱۹۹۲ء میں نیماٹولوجی سے متعلق

ایک کتاب ڈوری لیمیڈا (Dorylaimida) کی رسم اجرا کے سلسلے میں ڈاکٹر چوپڑا علیگڑھ تشریف لائے تو ان کے سامنے بھی اس مرکز کے قیام کا منصوبہ رکھا گیا۔ ڈاکٹر چوپڑا ہمارے منصوبے سے جب پوری طرح مطمئن ہو گئے تو انھوں نے اس کے قیام میں ہر طرح سے مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ دہلی واپس جاکر ڈاکٹر چوپڑا نے ایک کمیٹی تشکیل کی جس میں ڈاکٹر رندھاوا کو اس کا صدر اور ڈاکٹر ایس۔ ایم الیاس و ڈاکٹر ٹی۔ پی سری ہرن جیسے ممتاز سائنسدانوں کو اس میں شامل کیا۔ ۲۵ مئی ۱۹۹۲ء کو یہ تشکیل شدہ کمیٹی کا علیگڑھ آنا ہوا۔ یونیورسٹی کے اراکین اور سائنسدانوں سے گفت و شنید ہوئی اور موجودہ مرکز کے ڈھانچے کا معائنہ بھی کیا۔ یہاں پر بیان کرنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ ڈاکٹر علاء الدین احمد، ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل (تعلیم) انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ ہمارے اس منصوبے کو عملی شکل میں لانے تک ہر ہر قدم پر برابر تعاون کرتے رہے۔

ڈاکٹر رندھاوا پر مشتمل کمیٹی نے آئی۔ سی۔ اے۔ آر (ICAR) کو رپورٹ پیش کی اور پرزور انداز میں یہ لکھا کہ علیگڑھ میں اس طرح کی پوری صلاحیت موجود ہے کہ انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر کو بخوبی چلا سکتی ہے۔ اس لیے یہ کمیٹی اس منصوبے کے قیام کو منظور کرتی ہے چوں کہ منظور شدہ منصوبے کو اور بھی مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس لیے اس کا جواب آتے آتے کئی ماہ گزر گئے۔ ۱۹۹۳ء کی جنوری کے آخری ایام میں وہ رات جب کہ سردی شباب پر تھی اس کی یاد میرے دل میں اب بھی سمائی رہتی ہے یہ ہوا کہ تقریباً ۲ بجے رات میں وائس چانسلر صاحب نے مجھے فون کیا کہ آپ فوراً میرے پاس آجائیں۔ جواباً میں نے عرض کیا کہ بس آدھے گھنٹے میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اس پر محترم نے فرمایا کیوں نہ میں آپ کے پاس ۵ منٹ میں پہنچ جاؤں۔ اس جملہ پر مجھے بہت افسوس ہوا کہ کوئی بہت ہی نازک معاملہ ہے اور چونکہ اس وقت یونیورسٹی میں بڑی افراتفری مچی ہوئی تھی یک جست میں نے اپنی کالی شیروانی بدن پر ڈالی اور گاڑی کی طرف لپکا اور تیز رفتار سے چلا کر آفس پہنچا۔ خوش قسمتی سے وائس چانسلر صاحب سامنے ہی نظر آ گئے اور مارے خوشی کے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اوّل اوّل

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

انھوں نے مبارکباد دی اور پھر خوش کن خبر سنائی کہ آئی سی۔ اے۔ آر نے انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر کے قیام کو منظور کر لیا ہے اور آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے تحت ۲ ر ۲ کروڑ روپیہ کی مالی امداد بھی فراہم کی ہے۔

کونسل کی ماہر کمیٹی نے مندرجہ ذیل چار پوسٹ گریجویٹ شعبوں کے قیام کو منظور کیا ہے۔

۱۔ پوسٹ ہارویسٹ انجنیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی
(Post Harvest Engineering & Technology)

۲۔ پلانٹ پروٹیکشن (Plant Protection)

۳۔ ایگریکلچرل اکانامکس اینڈ بزنس مینجمنٹ (Agriculture Economics & Business Management)

۴۔ ایگریکلچرل مائیکروبایولوجی (Agriculture Microbiology)

آخر میں یہ بات نہایت یقین و اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر کی نشو و نما کا ماخذ ایگریکلچر سینٹر بنا۔

ایگریکلچر سینٹر کے کوآرڈی نیٹرس:

۱۔ صدر شعبۂ نباتات ۱۹۸۴ء ۔۱۰۔۹ سے ۱۹۸۹ء ۔۳۔۱۵ تک۔

۲۔ پروفیسر خالد محمود ۱۹۸۹۔۳۔۱۶ سے ۱۹۹۱۔۳۔۷ تک (مستعفی)

۳۔ پروفیسر سید اسرار حسین ۱۹۹۱ء۔۳۔۱۸ سے ۱۹۹۱۔۹۔۱۳ تک (بسبب انتقال)

۴۔ دفع الوقتی انتظام ۱۹۹۱ء۔۹۔۱۴ سے ۱۹۹۱ء۔۱۲۔۲۵ تک۔
(Stop Gap arrangement)

۵۔ پروفیسر محمد تسنیم جیراجپوری ۱۹۹۱ء۔۱۲۔۲۶ سے ۱۹۹۳ء ۹۔۲۸ تک۔
(۲۶ ستمبر ۱۹۹۳ء کو خاکسار کو انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر کا پہلا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا)

حصولِ مقصد کی دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کرنے کے بعد جنوری ۱۹۹۳ء کو آئی سی۔ اے۔ آر نے انسٹی ٹیوٹ کے قیام کو منظور کیا۔ اب تو یہ ذمہ داری ہمارے اوپر عائد ہوتی ہے کہ اس سے متعلق ساری کارروائیوں کو مکمل کریں۔ آئی سی اے۔ آر کے ساتھ ایک سمجھوتہ بھی ہوا کہ

مالی امداد صرف ۵ برسوں کے لیے ہے۔ اس کے بعد یونیورسٹی خود اس کی کفالت کرے گی اور آئی۔ سی۔ اے۔ آر۔ اس کی ترقی و بقا کے لیے اعانت بھی کرتی رہے گی۔ اس معاہدے کے وجود میں آنے کے بعد مارچ ۱۹۹۳ء میں آئی۔ سی۔ اے۔ آر نے پہلی قسط میں چالیس لاکھ روپے عنایت کیا اور ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ یعنی مارچ ۱۹۹۶ء میں دوسری قسط کی شکل میں ستّر لاکھ کی رقم دی ہے۔

۲۹ مئی ۱۹۹۳ء کو ایگریکلچر سینٹر کی تاریخی اختتامی بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ منعقد ہوئی۔ اس میں وائس چانسلر صاحب بنفس نفیس صدر کی حیثیت سے اور یونیورسٹی کے دیگر اراکین بھی موجود تھے۔ اور یہ ریزولوشن پاس ہوا کہ "بورڈ آف اسٹڈیز اس سنہرے موقع پر دل وجان سے اس بات کی حمایت کرتی ہے کہ ایگریکلچر سینٹر ترقی کر کے انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر بن گیا ہے جس کو آئی۔ سی۔ اے۔ آر نے تسلیم کیا ہے۔ بورڈ نے وائس چانسلر و دیگر احباب اراکین سے استدعا کی کہ اس کے نفاذ کے لیے آئی۔ سی۔ اے۔ آر کی منشا کے مطابق پیش قدمی کریں"۔

مندرجہ بالا تجویز کی روشنی میں وائس چانسلر نے اپنے خصوصی اختیار (۳) ۱۹ کو استعمال کرتے ہوئے اکیڈمک کونسل اور انتظامی کونسل کی جانب سے انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر کے قیام کو منظور کیا۔ اس کے نظم وضبط کے لیے قوانین و دستورات کاربند کیے اور ایک نئی بورڈ آف اسٹڈیز کی تشکیل بھی کی۔ جیسے ہی یہ سب کارروائیاں مکمل ہوئیں۔ فوراً اس کے بعد قلعہ روڈ پر واقع شفیع ہاؤس کو منتخب کر کے اس کی قیام گاہ بنائی گئی۔ آئی۔ سی۔ اے۔ آر کی تشکیل شدہ کمیٹی نے اس کو پسند بھی کیا اور توسیع و آراستہ کرنے کے لیے۔ ۱ر لاکھ روپے کے خرچے کو منظور کیا، تاکہ تعلیمی اور تحقیقی کاموں کو یہاں سے بخوبی انجام دیا جاسکے۔

۱۱ر اکتوبر ۱۹۹۳ء کو انسٹی ٹیوٹ کی نئی تشکیل شدہ بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ منعقد ہوئی۔ ڈائرکٹر نے میٹنگ میں بہ بانگِ دہل اس بات کو کہا کہ آنے والے کل سے انسٹی ٹیوٹ میں درس وتدریس کا کام جاری ہوجائے گا۔ یہ ایک جرأتمندانہ قدم تھا جب کہ یہاں پر نہ کوئی سہولت مہیا تھی اور نہ کوئی اپنا عملہ۔ اس عظیم فیصلے کی ترقی کا راز مختلف شعبے جیسے حیوانیات، نباتات، معاشیات، تجارتی انتظام و

کامرس سے متعلق اساتذۂ کرام مخلصانہ طور پر دل وجان سے ہمارے کام میں اعانت کر رہے تھے۔ اس کے بعد اور بھی دیگر شعبے جیسے بایوکیمسٹری، کیمیکل ومکینکل انجینئرنگ وکمپیوٹر سائنس کے اساتذہ حسب ضرورت کام میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔ آئی۔ سی اے۔ آر کی تجویز تھی کہ اس پروگرام کا نفاذ بالاقساط ہو اور یونیورسٹی نے بھی اس کو پسند کیا اور یہ طے ہوا کہ پلانٹ پروٹیکشن اور ایگری کلچرل اکنامکس اینڈ بزنس منیجمنٹ کے پوسٹ گریجویٹ کورسوں کو جلد از جلد اسی تعلیمی سیشن ۹۴-۱۹۹۳ء سے شروع کر دیا جائے۔ پوسٹ ہارویسٹ انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی کو ۹۵-۱۹۹۴ء سے اور ایگری کلچرل مائیکرو بایولوجی کو ۹۶-۱۹۹۵ء سے جاری کرنے کی تجویز کو پسند کیا گیا۔ اس منصوبے کی نفاذ وکامیابی کے لیے مندرجہ ذیل تین تجاویز کو مد نظر رکھا گیا۔ تاکہ ہر ایک کورس کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں۔

۱۔ ایسی جگہ تجویز کی جائے جہاں پر درس وتدریس کی سہولتیں مہیا ہو سکیں اور وہیں پر نئی عمارت کی تعمیر بھی ہو سکے۔

۲۔ اساتذہ کا تقرر۔ ۳۔ نئے نصابات کی تشکیل۔

عمارت :

۱۹۹۱ء میں ایگری کلچر سینٹر کو وکٹوریہ گیٹ کے قریب سرسید ہال (ایس۔ ایس ویسٹ) کے ایک گوشے میں بمشکل تمام جگہ ملی۔ اس سے قبل یہ حصہ کامرس فیکلٹی کے قبضے میں تھا اور بعد میں سینٹر آف وائلڈ لائف اینڈ رنیتھالوجی کے۔ چونکہ یہ صرف ایک گوشہ تھا اور انسٹی ٹیوٹ کی ضروریات کے لیے بالکل ہی ناکافی تھا۔ اس لیے ۱۹۹۲ء میں وائس چانسلر سے درخواست کی گئی کہ کوئی دوسری جگہ متعین کریں اور کافی غور وخوض کے بعد قلعہ روڈ پر واقع شفیع ہاؤس دینے کے لیے راضی ہو گئے۔ اس دوران یہ عمارت شعبہ گارڈنس ولینڈ اور میونسپل اسکول کے قبضے میں تھی، ان لوگوں سے بڑی منت وسماجت کر کے خالی کرایا گیا اور اپنی تحویل میں لے لیا گیا۔ چونکہ عمارت خستہ حالت میں تھی، اس لیے اس کو ایک نئی شکل دے دی گئی لیکن اس کی شان وشوکت کو برقرار رکھا گیا۔ یہ بھی طے پایا گیا

کہ عمارت کے پچھلے حصے میں کچھ اور بھی کمرے تعمیر ہو جائیں تاکہ درس و تدریس کا نظام بغیر کسی رکاوٹ کے چلتا رہے۔ اس دوران تمام پریشانیوں کے باوجود اساتذہ و طلبا ہمارے اس کام میں برابر تعاون کرتے رہے۔ یونیورسٹی کا شعبۂ تعمیرات نصرت میں آگے آگے تھا۔ نیز اس عمارت کی چہار دیواری کرائی گئی تاکہ شفیع ہاؤس ہر طرف سے محفوظ ہو جائے۔

ساتھ ہی ساتھ اس بات کی بھی کوشش جاری تھی کہ انسٹی ٹیوٹ کی نئی عمارت کی تعمیر شروع ہو جائے تاکہ اس میں ایگریکلچرل سائنسز کی جدید طرز کی آسانیاں مہیا کر سکیں۔ اس عمارت کا نقشہ تیار کرنے کے لیے دہلی کے مشہور ارکیٹکٹ بالی صاحب کو مقرر کیا گیا۔ شفیع ہاؤس سے تقریباً ایک کلو میٹر کے فاصلے پر برولی روڈ پر کافی وسیع علاقہ اس مقصد کے لیے منتخب کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۹۴ء میں یونیورسٹی بلڈنگ کمیٹی نے اس پلان کو منظور کرتے ہوئے تعمیر کی اجازت دی۔ انسٹی ٹیوٹ کے اسٹاف ممبروں نے اس سنہرے موقع پر خوشیاں منائیں لیکن وہ دیرپا ثابت نہیں ہو سکیں۔ جیسے ہی اس زمین پر تعمیر کا کام جاری ہوا تو پڑوس کے گاؤں کے غنڈوں و بدمعاشوں نے ہلا بول کر بنیادی تعمیر کو نیست و نابود کر دیا اور یہ کہا کہ زمین یونیورسٹی کی نہیں ہے۔ اس معاملے میں ہم لوگوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ دوبارہ یہاں پر تعمیر کا کام جاری ہو جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ موجودہ صورت حال سے وائس چانسلر بھی واقف ہو گئے تھے اور طے کیا کہ کوئی دوسری مناسب جگہ متعین کی جائے۔ اس سلسلے میں ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر، ممبر انچارج جائداد اور یونیورسٹی انجینئر (تعمیرات) سے مشورہ کرنے کے بعد وی۔ ایم ہال اور حبیب ہال کے پیچھے کا وسیع قطعۂ آراضی اس مقصد کے لیے عطا کیا گیا۔ آخر کار دسمبر ۱۹۹۵ء میں ہم لوگوں کو اس معاملے کے حل ہونے سے راحت ملی کیونکہ یونیورسٹی بلڈنگ کمیٹی نے عمارتی نقشہ کو منظور کرتے ہوئے تعمیر شروع کرنے کی اجازت دی۔ دلکش مناظر سے بھرپور آم و آنولہ کا گنجان باغ انسٹی ٹیوٹ کی نئی عمارت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ خوش قسمتی سے شفیع ہاؤس سے بھی بہت نزدیک ہے۔ اس دوران نئی

بلڈنگ کا کام ترقی کے ساتھ رواں دواں ہے۔

تدریسی عملہ : (Teaching Staff)

یونیورسٹی نے تقریباً دس سال تک اپنے ذرائع سے ایگریکلچر سینٹر کو چلایا اور اس دوران اس کا اپنا کوئی بھی تدریسی عملہ نہیں تھا بلکہ لائف سائنس و سائنس کی فیکلٹیوں کے اساتذہ ان کورسوں کو پڑھاتے تھے اور انتظامی امور کو بھی سنبھالتے تھے۔ اس کا معاوضہ بھی دیا جاتا تھا لیکن یہ معاوضہ ان کی بیکراں خدمت کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا تھا اور بہت سارے اساتذۂ کرام نے تو اپنی خدمات کا معاوضہ بھی نہیں لیا۔ اب جبکہ انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر کا قیام ہوگیا ہے تو ضرورت پڑی کہ اس میں اپنا تدریسی عملہ بھی ہونا چاہیے۔ اس لیے یہ منصوبہ بنایا گیا کہ ہر ایک پوسٹ گریجویٹ کورس میں ایک پروفیسر، ایک ریڈر اور ۳ عدد لکچرر ہوں۔ اس نظریے کو آئی۔سی۔اے۔آر نے بھی پسند کیا۔ تدریسی تقررات بغیر وزیٹر نامینی (Visiters Nominee) کے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ یونیورسٹی دستور میں ہے۔ اس لیے اس معاملے میں منسٹری آف ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ (Ministry of Human Resource Development) کو راضی کر لیا گیا کہ فیکلٹی آف لائف سائنس کے شعبۂ نباتات کے وزیٹر نامینی کو لے کر انسٹی ٹیوٹ میں اساتذہ کا تقرر کر لیں۔ جیسے ہی ہم لوگ جنرل سلیکشن کی تیاری میں مصروف ہوئے۔ اسی درمیان شعبۂ نباتات کے وزیٹر نامینی کی میعاد ختم ہوگئی اور افسوس کے ساتھ بالفاظ دیگر آخر کو منزل گردِ سفر لے کے آگئے۔

درسی نصابات (Courses of Study)

ہر ایک کورس کا نصاب تیار کرنا ہمارے سامنے سب سے بڑا مرحلہ و اہم ترین مسئلہ تھا۔ چونکہ سارے ہی کورس بالکل نئے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے علیگڑھ و بیرون علیگڑھ کے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔

اس سلسلے میں دو پوسٹ گریجویٹ کورس پلانٹ پروٹیکشن اور ایگریکلچرل

اکانامکس و بزنس مینجمنٹ جوکہ ۹۴-۱۹۹۳ء سے شروع ہو گئے تھے۔ ایگریکلچرل اکانامکس اینڈ بزنس مینجمنٹ کے سلسلے میں یونیورسٹی کے شعبے جیسے کہ معاشیات تجارتی انتظام و تجارت نے ہماری ضروریات کو پورا کیا۔ نیز انڈین ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی اور ایگریکلچرل یونیورسٹی پنت نگر کے زراعتی معاشیات کے شعبوں نے بھی تعاون کیا۔ اس طرح سے اس کورس کی بہترین شکل اجاگر ہوئی۔ طالب علم برادری میں کورس کافی مقبول ہوا کیونکہ اس میں ملازمت کی شکلیں چھپی ہوئی تھیں۔

پلانٹ پیتھولوجی، انٹامولوجی اور نیماٹولوجی کی بنیاد پر پلانٹ پروٹیکشن کی تخلیق ہوئی۔ چونکہ یونیورسٹی میں مندرجہ بالا مضامین کے ماہرین و سائنسداں کی علمی و تحقیقی خدمات قومی و بین الاقوامی سطح پر ایک مقام رکھتی ہیں، اس لیے اس کے نصابات کی تشکیل میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف ایگریکلچر یونیورسٹیوں جیسے آئی۔ اے۔ آر۔ آئی و وشو بھارتی و ہریانہ اور مدارس کے تعلیمی نصابات کو بھی مدِ نظر رکھا گیا اور اس طرح سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے پلانٹ پروٹیکشن کو ملکی سطح پر رہبرانہ فوقیت حاصل ہوئی۔

پوسٹ ہارویسٹ انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی سے متعلق نصابات کی تشکیل میں کافی پریشانی ہوئی۔ اس معاملے میں کیمیکل و میکینکل انجینئرنگ کے شعبوں نے ہماری پوری مدد کیں۔ آئی۔ اے۔ آر۔ آئی کے تین سائنسدانوں کے ہم ممنون و مشکور ہیں جو کہ نصابات کی تشکیل کے دوران کئی مرتبہ علیگڑھ آئے۔ آئی آئی۔ ٹی۔ کھڑگ پور کے ۳۵ سالہ تجربہ کار استاذ کا اس کورس میں تقرر ہوا جو کہ ہمارے لیے بہت مددگار ثابت ہوئے۔ یہ کورس تعلیمی سیشن ۹۶-۱۹۹۵ء سے رواں دواں ہے۔ ملازمت کے اعتبار سے اس سے متعلق طلبار کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

دوران ایگریکلچر سنٹر میں ایگریکلچرل مائیکرو بایولوجی کا ایک باقاعدہ تدریسی نظام تھا۔ اس لیے فیکلٹی آف لائف سائنسز خصوصاً شعبۂ بایوکیمسٹری میں اس کے ماہرین موجود تھے۔ نیز آئی۔ اے۔ آر۔ آئی کے سابق صدر شعبہ ایگریکلچرل مائیکرو بایولوجی، نے اس کورس کے نصابات تیار کرنے میں غیر معمولی دلچسپی لی اور

دیگر اداروں کے نصابات کو بھی ذہن میں رکھا گیا۔ انسٹی ٹیوٹ میں اس کورس کی اہمیت مسلم ہے۔

تعلیمی نصابات کے انتخاب و تشکیل کے سلسلے میں ہر ایک پہلو پر باریک بینی سے غور وخوض کیا گیا اور کسوٹیوں پر جانچا بھی گیا تاکہ ہر ایک زاویئے سے سارے کورس اپنی اپنی جگہ اعلیٰ حیثیت کے حامل و ممتاز ہوں اور طلباء اس بحرِ بیکراں میں ڈوب کر ــــــ پا جائیں سراغِ زندگی۔

(بہ شکریہ: تہذیب الاخلاق، علیگڑھ مارچ، اپریل ۱۹۹۸ء)

"سر سید مرحوم اور ان کے رفقائے حسنِ عمل اور جانبازانہ کوشش سے تعلیم و تربیت کے جو سامان ایم۔ اے۔ او کالج میں ہوئے اور ان کے نتائج جو ملک نے دیکھے وہ تاریخ ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد کرے گی۔

سر سید بقول خواجہ حالیؔ "یونیورسٹی قائم کرنے سے کسی موقع پر مایوس ہو گئے ہوں لیکن ان کے دل و دماغ میں آخر دم تک یہ منصوبہ قائم رہا۔ دنیا نے دیکھا کہ ان کے وفادار جانشینوں نے اپنے پیشوا کے رویائے صادقہ کی تعبیر دنیا کو دکھا دی اور آج میں یہ تقریر جس مقام سے کر رہا ہوں وہ اسکول نہیں، کالج نہیں یونیورسٹی ہے" زندہ باد مسلم یونیورسٹی"

(حبیب الرحمٰن خاں شروانی)

پروفیسر سعید الظفر چغتائی

شعبۂ طبیعیات میں تعلیم اور تحقیق کی ترقی

جب یہ درس گاہ ایم اے او کالج تھی، تب ہی کیمسٹری اور فزکس کا مشترک تعلیمی شعبہ پروفیسر ڈنک کلف (Dunc liffe) کی سربراہی میں قائم ہوگیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں دونوں شعبے الگ ہوگئے اور جب سنہ ۱۹۲۰ء کے سرکاری ایکٹ کے مطابق مسلم یونیورسٹی وجود میں آئی تو پروفیسر ولی محمد سربراہ تھے۔

فزکس میں بی۔ ایس سی کی تعلیم یہاں سنہ ۱۹۰۸ء میں شروع ہوگئی تھی ایم ایس سی سنہ ۱۹۲۲ء میں کھلا، لیکن یہ شعبہ دراصل سنہ ۱۹۳۲ء میں معتبر ہوا جب وائس چانسلر سر راس مسعود کی کوششوں سے غیر ملکی اساتذہ مختلف مضامین میں مقرر کیے گئے۔ اس وقت کیمسٹری میں ہلٹر پروفیسر ہوئے اور فزکس میں ایک جرمن یہودی سیم ول، جن سے چند مہینے پہلے ڈاکٹر اسندی ریڈر کی حیثیت سے کام شروع کر چکے تھے۔ انگلستان سے پی۔ ایچ۔ ڈی کا بہت قابل قدر کام کرنے کے بعد ہندوستان واپسی پر اسندی کا یہ پہلا تقرر تھا، جن کی شہرت اور قابلیت کی پروفیسروں نے قدر کی اور سنہ ۱۹۳۸ء تک انھوں نے سیم ول اور ہنٹر صاحبان کے ساتھ بہت اچھی تحقیق کی بنیاد ڈالی۔ ان کا موضوع سالماتی طیف شناسی Molecular Spectroscopy تھا۔ جس کا کیمسٹری میں بھی بہت استعمال ہوتا ہے۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کام کرنے کے لیے درکار قریب قریب کوئی سامان نہ تھا۔ ان لوگوں نے یونیورسٹی سے اجازت لے کر عمارت کی تعمیر کی رقم سے تحقیقاتی آلات جرمنی سے منگائے اور ایک پرانی عمارت میں رہ کر کام چلایا۔ اس زمانے کا خریدا اچھا خاصا سامان شعبہ میں اب بھی موجود ہے۔ جیسے کہ اچھے شیشے اور کوراٹس کے طیف پیما (Spectrometers, Spectrographs) ان آلات سے بہت سا بنیادی کام ہوا طالب علموں کو کئی پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگریاں دی گئیں جن کے کئی پانے والے یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے اور بہت سے تحقیقاتی پرچے عالمی علمی رسالوں میں شائع ہوئے۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں یہ انقلاب آگیا کہ تینوں حضرات یونیورسٹی سے چلے گئے۔ فزکس ڈپارٹمنٹ میں سنہ ۱۹۴۵ء سے رفیق محمد چودھری پروفیسر مقرر ہوئے جنھوں نے اپنی انگلستانی تحقیقی روایات کو جاری رکھ کر علیگڑھ میں گیسوں کے برقائے جانے اور شیشے کی نلیوں میں بھری ان گیسوں میں بجلی کے اعمال پر اپنا کام جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ہندوستان آزاد ہوا اور دوسرے بہت سے استادوں کی طرح چودھری صاحب بھی اپنے آبائی شہر لاہور لوٹ گئے۔ ابھی چند سال پہلے تک وہ زندہ تھے اور انھوں نے پنجاب یونیورسٹی میں ٹھوس اشیاء کی طبیعیات پر تحقیق کے لیے تجربہ گاہ قائم کر لی تھی۔

آزادی کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وائس چانسلر کی کوشش اور جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند کی تائید سے پیارا سنگھ گل فزکس کے پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے انھوں نے امریکہ میں نوبل انعام یافتہ آرتھر کامٹن کے ساتھ کام کیا تھا۔ علیگڑھ آکے انھوں نے کائناتی ذرات Cosmic Rays پر تحقیقات کو فروغ دیا۔ سائنسی غبارے اڑائے اور کشمیر یونیورسٹی کے تعاون سے گلمرگ میں ایک تحقیقاتی تجربہ گاہ قائم کی جس میں کام کرنے کے لیے اوروں کے علاوہ کرٹس (L F Curtics) اور پومے رنٹس Pomerants نامی امریکی سائنس داں بھی ہندوستان آئے۔ گل صاحب سخت منتظم اور شعبے کے معمار تھے۔ وہ اپنے ریڈروں کے طور پر ونکٹ ایشور لو جیسے طیف شناس

(Spectroscopist) اے۔ این متر اجیسے نظری طبیعیات داں اور دوسرے
لائق استاد علیگڑھ لائے جنھوں نے ایک چھوٹا سا کوکیرفٹ والٹن سرعت کار
Accelerator بنایا اور دوسرے نظری یا تجرباتی کاموں سے اس شعبہ کو
نمبر ایک پر لے آئے۔ جن لوگوں نے اس زمانے میں علیگڑھ سے فزکس میں پی ایچ ڈی
کی ڈگری حاصل کی ان میں سے زیادہ تر ہندوستان یا بیرونِ ہند کی یونیورسٹیوں
اور تحقیقی اداروں میں ممتاز ہوئے۔ مترا صاحب دہلی یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے
کے بعد اب وہیں آئن سٹائن پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر ہنس پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ
میں تجرباتی نیوکلیر فزکس کے لیے مشہور ہوئے۔ آر۔ ڈی۔ ورما کینیڈا اور ممالک
متحدہ امریکہ میں طیف شناسی کے ماہر ہیں۔ ہیج ناتھ کھنہ ابھی ہمارے شعبے
میں صدر رہ کر ریٹائر ہوئے ہیں اور جو پروفیسر ونکٹ ایشور لو ساٹھ سال کی
عمر تک آئی۔ آئی۔ ٹی کانپور رہنے کے بعد اب ایک امریکی یونیورسٹی میں فعّال
استاد اور محقق ہیں۔

۱۹۶۴ء سے اس شعبہ کے صدر اور پروفیسر رئیس احمد مقرر ہوئے جو بعد
میں ملک گیر شہرت کے ماہرِ تعلیمات ہوئے۔ انھوں نے اسکول اور بی ایس سی
کی تعلیم یہیں پائی تھی، پھر ایم ایس سی کی ڈگری کلکتہ یونیورسٹی سے لے کر پرنسٹن
یونیورسٹی اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے تھے اور بعد میں انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی
ہی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ رئیس احمد پروفیسر کُل سے پہلے اس
شعبے میں استاد ہو گئے تھے اور اگرچہ اس زمانے کے دوسرے ماہر استادوں
سے مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ وہ اپنا تحقیقی کام بھی کرتے رہے اور اپنے سماجی
تصوّرات کا بھی حق ادا کرتے رہے۔ یہاں صدر شعبہ مقرر ہونے سے پہلے
چند برس ریجنل انجینئرنگ کالج سری نگر کشمیر میں شعبہ کے سربراہ رہ کر آئے تھے۔
علیگڑھ واپس آئے تو شعبے کے حالات اچھے نہیں رہ گئے تھے۔ انھوں نے
اسے دوبارہ بنانے سنوارنے اور بلند کرنے کا فیصلہ کیا۔ موجود استادوں کی
حوصلہ افزائی کی اور ان کے حق بھر انھیں ترقی دی۔ پھر کوشش کر کے امریکہ
یورپ اور سوویت یونین سے مختلف میدانوں کے ماہر بلائے اور انھیں یونیورسٹی

میں مقرر کرایا۔ راقم الحروف بھی انھیں کے زمانے میں اس شعبہ سے وابستہ ہوا۔

اس طرح شعبہ میں کئی نئے تحقیقی میدان کھل گئے باور میوس اثر جس میں ٹھوس حالت، نیوکلیائی اعمال اور طیف شناسی تینوں کو دخل ہے۔ نظری فلکیات اور ایٹمی طیف شناسی۔ آخری موضوع پر کام ابھی تک جاری ہے اور نئے بین الاقوامی تعاون کے پروگراموں کی مدد سے نئی توانائی حاصل کر رہا ہے۔ رئیس صاحب نے خود الیکٹرانکس کے اطلاق نمونہ شناسی اور تجزیۂ زبان پر شروع کیے۔ ان کی تجربہ گاہ ابھی تک باقی ہے۔ اس موضوع پر جاتے جاتے ایک بہت وسیع پیمانے پر تفصیلی مذاکرہ کرایا جس میں ملک اور بیرون ملک کے ماہر شریک ہوئے یونیورسٹی میں سمسٹر سسٹم رائج کرنا (جو ہم نے بعد میں ختم کر دیا) اور کمپیوٹر مرکز قائم کرانا ان کے بڑے کارنامے ہیں کمپیوٹر کا استعمال پچھلے برسوں میں وائس چانسلر فاروقی صاحب کی خصوصی توجہ سے اب خود مقبول ہو گیا ہے۔

۱۹۷۳ء میں پروفیسر محمد ظل الرحمٰن خاں صدر شعبہ ہوئے۔ انھوں نے منچسٹر یونیورسٹی میں اپنے وقت کے ممتاز طبیعیات دانوں سے تین چار برس پڑھا تھا اور وہیں سے نظری نیوکلیائی فزکس میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ علیگڑھ واپس آکر انھوں نے بڑی محنت سے کوانٹم میکینکس اور نیوکلیائی ریاضیات کا درس دیا۔ فزکس ڈپارٹمنٹ میں اس علم کی جڑیں مضبوط کیں اور پڑوس کے کیمسٹری اور میتھمیٹکس کے شعبوں کو اس سے خاصی حد تک متعارف کرایا۔ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر اسرار احمد اور ظفر نصیر عثمانی اپنے علم و تحقیق کے لیے مشہور ہیں۔

ڈاکٹر رضا اللہ انصاری جرمنی سے نور ریاضیاتی اور فلکی طبیعیات سیکھ کر آئے تھے لیکن علیگڑھ میں انھوں نے سائنس کی تاریخ پر کام کیا اور اس مضمون کے عالمی تنظیم کے صدر کی حد تک ترقی کی۔

ہمارا شعبہ پچھلے دس بارہ سال سے یو۔ جی۔ سی کے خصوصی امدادی پروگراموں پر ہے۔ پانچ سال تک کوسسٹ کے فوائد حاصل کر چکا ہے اور فی الحال ڈی۔ ایس۔ اے کے درجے پر ہے۔ پچھلے برسوں میں فزکس کا عالمی بازار کچھ مندا پڑ گیا اور مقامی دقتیں بھی حائل ہوتی رہیں، شخصی مسائل بھی۔ اس لیے ہم اتنی ترقی

بڑھ سکے اور شعبہ کو اتنا پروان نہ چڑھا سکے جتنا ان سہولتوں کی بنا پر ممکن تھا۔ اس کے باوجود آدھے درجن سے زیادہ تحقیقی میدانوں میں کام جاری ہے اور نتیجے معتبر فنی رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ کچھ نوجوان استاد نئے تجرباتی اور نظری طریقے بھی ہندوستان کے دوسرے اداروں اور کینیڈا وغیرہ سے سیکھ کر آئے ہیں۔ نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام نے اطالیہ کے شہر تری ایستے میں علمی فلاح کے جو بین الاقوامی مراکز قائم کیے ہیں۔ ہمارے شعبے سے کئی کئی استاد اور محقق ہر سال وہاں جاکر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ رفیق آکسفورڈ اور دوسری عالمی یونیورسٹیوں یا تحقیقی اداروں میں وقت کی قیمت ادا کر آئے ہیں اور اگرچہ ہم اپنا کوئی بڑا کارنامہ نہیں گنا سکتے کارواں سفر پر ہے اور زندگی کا کھیل جاری ہے۔

اس وقت شعبے کے میدان اختصاص یہ ہیں:

1 Spectroscopy

(a) Atomic — ایٹمی

(b) Molecular (Distomic, Polyatomic) — سالماتی
ڈوایٹمی اور کئی ایٹمی

(c) Amorphous Materials — بے زدے مادے

(d) Raman Effect — رامن اثر

(e) Laser Fabrication Applications — لیزر سازی اور استعمال

2 Nuclear Physics Experimental — نیوکلیائی طبیعیات

(a) Gamma Spectroscopy — گاما شعاعیں

(b) Reactions, etc — نیوکلیائی ردِّ عمل

Theoretical

Quarks and Glauder Models, etc — کوراک اور گلاوبر نمونے

3 Astrophysics, Theoretical — نظری فلکیات

Atoms and Molecules in stars etc — ستاروں وغیرہ میں ایٹموں اور سالموں پر تحقیق

4 High Energy Physics – through Emulsions — اعلیٰ توانائی

5 Solid State Studies — ٹھوس اشیاء

(a) High Temperature Superconductivity — اعلیٰ ایصال

(b) Surface Properties — سطح کے خواص

6 Electronics - Digitals, and speech recognition — الیکٹرونکس

7 Space and geo-studies — فضائی اور ارضی مطالعے

8 History and Philosophy of Science — پچھلے اور موجودہ سائنسوں میں مسلمانوں کا حصہ وغیرہ۔

"سر سید نے توہمات اور تنگ نظری کی مخالفت کی...
اپنے خیالات کی وجہ سے سر سید کو بہت پریشانی اٹھانا
پڑی لیکن کوئی دھمکی ان کی ہمت کو دھیما نہ کر سکی تھی۔
آخر کار ان کی سنجیدہ شخصیت مخالفتوں اور غلط فہمیوں
پر چھا گئی۔ اور زندگی کے آخری دنوں میں ان کا زبردست
اثر رہا... ان کے ایک پرانے دوست نے کہا۔
"دوسرے لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں اور تعلیمی ادارے
قائم کیے ہیں لیکن ایک پوری قوم کو تنزل سے بچا لیا۔
ایک (معجزہ) پیغمبر کا کام ہے"۔ میرے خیال میں یہ رائے
سر سید کی شخصیت اور ان کے کام کا صحیح اعتراف ہے
میرا اپنا خیال ہے کہ میں ان سے زیادہ بڑے آدمی سے
نہیں ملا۔" (سی۔ ایف اینڈریوز اور گریجا مکرجی)

ڈاکٹر سید مشرف علی

لاء ڈپارٹمنٹ

لا ڈپارٹمنٹ کا یہ امتیاز ہے کہ بانیٔ درسگاہ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج سر سید احمد خاں نے یکم جنوری ۱۸۸۳ء میں اس کی بنیاد ڈالی۔ ابتدائی منزلوں میں ڈپارٹمنٹ غیر معروف سا رہا مگر جلد ہی اس کو سر سید کے لائق بیٹے سید محمود کی توجہ حاصل ہوگئی جس کے نتیجے میں ڈپارٹمنٹ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہوگیا۔ سید محمود کے مشوروں سے لا کے لکچرس کا معیار بلند ہوا اور ڈپارٹمنٹ میں لا کے پروفیسر کا ایک کمیٹی کے تحت جس کے وہ خود ممبر تھے تقرر ہوا۔ جسٹس سید محمود نے اپنی لا کی لائبریری جس کی مالیت اس وقت دس ہزار روپیہ تھی، پوری کی پوری ڈپارٹمنٹ کو عطا کردی۔ یہ کتابیں آج بھی ڈپارٹمنٹ میں موجود ہیں۔ بیشتر رپورٹس پر جسٹس سید محمود کے ہاتھ کے حاشیے میں نوٹس تحریر ہیں۔ سید محمود نے اپنی لائبریری عطا کردینے کے ساتھ لا کے لکچرس کے معیار کو بلند کرنے کے لیے خود لکچر دینے کی بھی پیشکش کی۔

بیرسٹر سید کرامت حسین مذکورہ کمیٹی کے تحت پہلے پروفیسر منتخب ہوئے جو ۱۸۹۱ء تک ڈپارٹمنٹ کے چیرمین بھی رہے۔ سید کرامت حسین بعد میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہوگئے۔ علیگڑھ سے لکھنؤ منتقل ہوکر موصوف نے لڑکیوں کے لیے ایک اسکول کرامت حسین گرلس اسکول قائم کیا جو بحیثیت کالج آج بھی لکھنؤ کا

نامور کالج ہے۔

بیرسٹر کرامت حسین کے بعد ڈپارٹمنٹ کے چیئرمین انتہائی نامور شخصیت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (جو بعد میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے جن کے نام سے آفتاب ہال اور آفتاب ہاسٹل ہے) مقرر ہوئے۔ موصوف کا وقفہ بحیثیت چیئرمین ۱۹۰۶ء تک رہا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے بعد لار ڈپارٹمنٹ کے چیئرمین عبدالحکیم خاں ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ء تک، سید علی نقی ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۷ء تک، مولانا عبدالخالق ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۶ء تک، مسٹر ایم اسحٰق خسرو ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۲ء تک، ان ناموران کی فہرست کی اہم شخصیت جنھوں نے لا ڈپارٹمنٹ کی از سر نو تعمیر و ترقی کا کام انجام دیا وہ ہیں پروفیسر حفیظ الرحمٰن جن کا وقفہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۹ء تک رہا۔ پروفیسر حفیظ الرحمٰن مولانا عبدالخالق جو لا ڈپارٹمنٹ کے چیئرمین ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۶ء تک رہے، کے صاحبزادے تھے۔ مولانا عبدالخالق علیگڑھ کے مشہور و معروف وکلا میں سے تھے۔ علیگڑھ مجلس وکلا (Bar Association) کے صدر رہے۔ اس کے ساتھ یونیورسٹی لار ڈپارٹمنٹ کی نمایاں خدمت انجام دے کر قومی سطح پر اسے شہرت کا حامل بنایا۔

پروفیسر حفیظ الرحمٰن سے قبل ڈپارٹمنٹ کی حالت ملک کے اور لار کے شعبوں کی طرح انتہائی غیر اطمینان بخش تھی۔ لاڈپارٹمنٹ فیکلٹی آف آرٹس سے منسلک تھا۔ اس کے کلاسیز دوسرے شعبوں کے مستعار کلاسوں میں شام کو ہوا کرتے تھے۔ لار ڈپارٹمنٹ کا آفس آسماں منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ہوا کرتا تھا۔ عام طور سے دو کلاسیز ہوا کرتی تھیں۔ ایک اسٹریچی ہال میں، دوسری سر سید ہال کے روم نمبر چھ میں۔ لار کی علٰحدہ ڈگری نہ ہو کر ایم۔ اے یا ایم۔ ایس سی کی ڈگری کے ساتھ مل جایا کرتی تھی۔ عام طور سے ایم۔ اے کا امتحان ختم ہونے کے بعد لار کی پڑھائی شروع ہوتی تھی اور امتحان میں تقریباً سب ہی کامیاب ہو جایا کرتے تھے۔ لار کی تعلیم اور ڈگریوں کا اتنی آسانی سے ملنا تقریباً بیشتر یونیورسٹیوں میں مروّج تھا۔ لہٰذا سرکاری سطح پر لار کی تعلیم کا جائزہ لینے اور معیاری بنانے کے لیے

ان کے نام پر یونیورسٹی کیمپس سے قریب ایک سڑک کا نام مولانا عبدالخالق روڈ ہے۔ (ادارہ)

کی کمیشن مقرر کی گئیں جن کی متفقہ رائے یہی تھی کہ لار کی تعلیم اور اس کا معیار انتہائی پست ہے۔ یونیورسٹیاں بغیر کسی ضابطے کے ڈگریاں دے رہی ہیں۔ لائبریری کلاسیز اور حاضری کا کوئی انتظام اور نظم نہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ لار کی تعلیم کو معیاری بنانے کے لیے نصاب کی از سر نو ساخت ہو، لائبریری کی اپنی عمارت ہو جس میں کلاسیز اور دفتر ہو، حاضری اور امتحانات ضابطے کے تحت ہوں۔

حفیظ صاحب کے سامنے یہ حالات تھے خوش قسمتی سے ہماری یونیورسٹی کے وائس چانسلر اس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تھے جنھوں نے لار ڈپارٹمنٹ کی از سر نو تعمیر و ترقی کے لیے ہر ممکن مدد دی۔ اس وقت حفیظ صاحب نے اپنی ذاتی تعلیمی لیاقت میں اضافے کی ضرورت محسوس کی، لہٰذا ۱۹۵۶ء میں حفیظ صاحب امریکہ گئے اور پنسلوانیہ یونیورسٹی سے لار میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ امریکہ سے واپسی پر حفیظ صاحب کو امریکہ کے لار اسکول کے نصاب اور طریقۂ تعلیم کا تجربہ ہوا۔ ان تجربات سے فائدہ اٹھا کر حفیظ صاحب نے ایل ایل بی کا نصاب ساخت کرایا۔ ڈپارٹمنٹ کو فیکلٹی کا درجہ ۱۹۶۰ء میں حاصل کروایا۔ اور ایل۔ ایل۔ ایم جس کے امتحانات پرائیویٹ ہوا کرتے تھے ان کا نصاب تیار کرا کر ان کے کلاسیز کا نظم قائم کیا۔ وقتی لیکچرر کی جگہ پورے وقت کے ٹیچرس کا تقرر کیا۔ لائبریری جو کسی وقت ایک کمرے اور چند کتابوں پر مشتمل تھی اس کی مثالی توسیع کی۔

فیکلٹی قائم ہونے سے پہلے ڈپارٹمنٹ میں اساتذہ کی تعداد بہت کم تھی۔ اہم اساتذہ میں خواجہ محمد اسحاق (مرحوم) جو خواجہ صاحب کہلاتے تھے، اور ڈاکٹر شیو دیال تھے۔ خواجہ صاحب تین روز علیگڑھ کے ڈپارٹمنٹ میں پڑھاتے تھے اور تین روز دہلی یونیورسٹی کے لار ڈپارٹمنٹ میں اور اسی کے ساتھ سپریم کورٹ میں وکالت بھی کرتے تھے، مگر حفیظ صاحب نے ڈپارٹمنٹ کی توسیع کے ساتھ اساتذہ کی تعداد میں بھی اضافہ کیا۔ فیکلٹی کے معیارِ تعلیم کو بلند کرنے کے ساتھ اساتذہ کی تعلیمی صلاحیت کا بھی خاص خیال تھا۔ لہٰذا موصوف نے اپنے دو شاگردوں سید مصباح الحسن صاحب

اور رشید الظفر صاحب کو امریکہ کی ییل (Yale), یونیورسٹی بھیجا دونوں وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرکے آئے۔ اس کے علاوہ باہر سے انتہائی لائق اور تجربہ کار لیکچرروں کا تقرر کیا۔ جیسے ڈاکٹر ایس۔ کے۔ اگروال جو ڈپارٹمنٹ میں چند سال رہ کر پوسٹ گریجویٹ لا۔ ڈپارٹمنٹ پونا یونیورسٹی کے ہیڈ ہوئے۔ اس کے بعد آگرہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور آخر میں ایسوسی ایشن آف انڈین یونیورسٹیز کے سکریٹری ہوئے۔ دوسرے لیکچروں میں ڈاکٹر وی ایس ریکھی اور ڈاکٹر محمد غوث۔ ایسے لائق لیکچرواں کا تقرر کرکے حفیظ صاحب نے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے ساتھ ڈپارٹمنٹ کی شہرت میں اضافہ کیا۔

تعلیمی پروگرام کے ساتھ تحقیقی کام (Research) کا سلسلہ بھی ۱۹۶۱ء سے شروع ہوا۔ پہلا تحقیقی کام مسٹر این۔ آر۔ مادھوا مینن نے حفیظ صاحب کی نگرانی میں مکمل کرکے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر مینن اس وقت قومی لا اسکول بنگلور کے ڈائرکٹر ہیں۔ اساتذہ میں پروفیسر ایس۔ کے اگروال، رحمان علی خاں (مرحوم) پروفیسر رشید الظفر، پروفیسر سید مصباح الحسن، پروفیسر وی ایس ریکھی، پروفیسر محمد غوث (مرحوم)، کنور غلام احمد خاں، ارشد مسعود، شاہد صدیقی، ہری رام گپتا، خالد رشید قیصر حیات، مصطفیٰ علی خاں (مرحوم) انوار الیقین، اشتیاق عابدی (انگریزی پڑھانے کے لیے مامور تھے) اور زکریا صدیقی جیسے اعلیٰ معیار کے اساتذہ تھے۔

ڈپارٹمنٹ کے لائق طلباء جو ایل ایم شروع ہونے پر فاضل ہوئے ان میں بی پی موریہ جو کانگریس کے جنرل سکریٹری رہ چکے ہیں اور مشہور سیاسی لیڈر بھی۔ این۔ آر۔ مادھوا مینن جو قومی لا اسکول بنگلور کے ڈائرکٹر ہیں۔ ڈاکٹر طاہر محمود جو حال میں دہلی یونیورسٹی کی لا فیکلٹی کے ڈین رہے ہیں اس کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر قانون کی دنیا میں شہرت کے حامل ہیں۔* مسٹر احمد صدیقی آجکل جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لا ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر، چیرمین اور ڈین ہوئے۔ انیس انصاری آئی۔ اے۔ ایس محمد نسیم آئی۔ اے۔ ایس جو حفیظ صاحب کے دور کے بعد کے ہیں مگر ڈپارٹمنٹ کے انتہائی لائق ایل ایل ایم ہیں جو آجکل حکومت کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں

* چیرمین قومی اقلیتی کمیشن کے جلیل القدر عہدہ پر تین سال تک فائز رہنے کے بعد حال میں سبکدوش ہوئے (ادارہ)

اللہ رحم صاحب جنھوں نے یو پی جوڈیشنل امتحان میں پہلا مقام حاصل کیا آجکل جج ہیں۔

میرا تعلق ڈپارٹمنٹ سے ۱۹۶۱ء سے ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈپارٹمنٹ میں آل انڈیا لا ٹیچرس کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس وقت میں علیگڑھ سے ایم۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی کر چکا تھا اور وکالت کرنے کا ارادہ تھا۔ کانفرنس میں میری حفیظ صاحب سے ملاقات ہوئی موصوف نے میرے خیالات اور ارادے معلوم کرنے کے بعد علیگڑھ آکر ایل۔ ایل۔ ایم میں داخلہ لینے کا مشورہ اور اصرار کیا۔ میں نے تامل کا اظہار کیا کہ میں علیگڑھ سے ایم۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد ایل۔ ایل۔ بی کر چکا ہوں، لکھنؤ وطن ہے۔ یہاں وکالت کی ٹریننگ میں ہوں، میرا مستقل نظم ہو چکا ہے۔ حفیظ صاحب نے مزید اصرار کرتے ہوئے کہا کہ آپ آیئے۔ ایل۔ ایل۔ ایم کیجیے اور پھر ادارے کی خدمت کیجیے۔ یہ اہم کام ہے۔ اس جملے کے بعد میں کچھ نہ کہہ سکا اور علیگڑھ آنے پر راضی ہو گیا۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں علیگڑھ آگیا۔ اس کے بعد ڈپارٹمنٹ میں بحیثیت طالب علم اور لکچرر کے زندگی گزرتی رہی۔ ایل۔ ایل۔ ایم کرنے کے بعد حفیظ صاحب کی نگرانی میں ریسرچ کی۔ طالب علمی کے عرصے میں شبلی کالج اعظم گڑھ سے کالج کے پرنسپل شوکت سلطان صاحب ڈپارٹمنٹ آئے اور حفیظ صاحب سے فوری طور پر کسی ایل۔ ایل۔ ایم ڈگری یافتہ کے انتظام کے لیے کہا۔ شبلی کالج میں لا ڈپارٹمنٹ میں فوری ضرورت تھی۔ اگر ایل۔ ایل۔ ایم ٹیچر کا تقرر نہیں ہو سکا تو گورکھپور یونیورسٹی کالج کا لا ڈپارٹمنٹ کا یونیورسٹی سے الحاق (Affiliation) کو ختم کرنے پر آمادہ تھی۔ چند ایل۔ ایل۔ ایم ڈگری یافتہ لڑکوں سے ملاقات کے بعد شوکت صاحب نے میرا انتخاب کیا اور تقرر کا خط اعظم گڑھ پہنچتے ہی بھیج دیا۔ میں باوجود ریسرچ کا طالب علم ہونے کے اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے لا ڈپارٹمنٹ میں لکچرر کے امکان کے باوجود شوکت صاحب کے مسلسل اصرار تقرری خط اور شبلی گرام ملنے پر اعظم گڑھ ۱۶ نومبر ۱۹۶۶ء کو پہنچ گیا اس کے بعد پانچ سال شبلی کالج کی خدمت کرنے کے بعد دسمبر ۱۹۷۱ء میں پھر علیگڑھ آگیا۔ اس وقت حفیظ صاحب ریٹائر ہو چکے تھے*

---

* ریٹائرمنٹ کے کئی سال بعد علیگڑھ میں انتقال کیا۔ (ادارہ)

حفیظ صاحب کو لار ڈپارٹمنٹ کی ایک الگ عمارت کی خواہش ہمیشہ رہی فیکلٹی آف آرٹس کے سارے شعبے ایس ایس ہال میں ہوا کرتے تھے۔ لٹن لائبریری میں یونیورسٹی لائبریری تھی۔ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب وائس چانسلر کے زمانے میں یونیورسٹی میں بڑے پیمانے پر تعمیری کام ہوا۔ آرٹس فیکلٹی اور مختلف شعبوں کی نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ فیکلٹی آف آرٹس بننے کے بعد سارے شعبے ایس۔ ایس ہال سے نئی عمارت میں منتقل ہونے کے بعد لار ڈپارٹمنٹ کو یہ خالی جگہ ملی۔ مگر نئی عمارت کے لیے کوششیں جاری رہیں۔ آخر نئی عمارت حاصل ہو گئی، جہاں ڈپارٹمنٹ ۱۸ ستمبر ۱۹۹۲ء کو منتقل ہوا۔ یہ عمارت کامرس ڈپارٹمنٹ کے ساتھ ہے اور وی۔ ایم ہال کے سامنے واقع ہے۔ اب ڈپارٹمنٹ کی اپنی عمارت ہے، اپنی لائبریری ہے، کلاس روم ہیں۔ اساتذہ کے لیے کمرے اور میٹنگ روم ہے۔ آج ہماری فیکلٹی کو وہی مقام اور معیار حاصل ہے جو یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں اور فیکلٹی کو حاصل ہے۔ ملک کی دیگر یونیورسٹیوں کے لار ڈپارٹمنٹ میں بھی ہماری فیکلٹی کو ایک معیاری فیکلٹی کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔

حفیظ صاحب کے ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے لائق شاگرد سیّد مصباح الحسن ڈپارٹمنٹ کے چیرمین اور ڈین ہوئے۔ مصباح صاحب نے حفیظ صاحب کی قائم قدروں کو جاری رکھا۔ لائق اور ہونہار لڑکوں کا ڈپارٹمنٹ میں تقرر کیا۔ اور تعلیمی معیار و تحقیقی کام پر خاص توجّہ دی۔ مصباح صاحب کے ساتھیوں میں بیشتر وہی اساتذہ رہے جن کا حفیظ صاحب تقرر کر گئے تھے۔ راقم کا تقرر مصباح صاحب نے کیا۔ اس کے علاوہ اور تقرر بھی ہوئے، مشیر عالم، اخلاق احمد، شہید الدین احمد، شریف الحسن، سلیم اختر، محمد اسحاق، محمد شبیر، مصباح صاحب کے ساتھیوں میں ڈپارٹمنٹ میں اساتذہ کی تعداد خاصی اچھی تھی۔ لڑکوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔

یونیورسٹی میں باری سے چیرمین اور ڈین کی پالیسی کا سلسلہ شروع ہونے پر مصباح صاحب کے بعد پروفیسر رشید الظفر چیرمین اور پروفیسر وی۔ ایس رکھی

ڈین ہوئے۔ یونیورسٹی نے باری کے اصول کو اپنا کر ڈپارٹمنٹ کے سبھی پروفیسروں کو چیئرمین اور ڈین بننے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس کے تحت پروفیسر غلام احمد خاں، پروفیسر مصطفیٰ علی خاں، پروفیسر زکریا صدیقی چیئرمین اور ڈین رہے۔ پھر باری کے تحت پروفیسر شمیم الحسنات اعظمی چیئرمین اور پروفیسر زکریا صدیقی ڈین ہوئے۔ پروفیسر غلام احمد خاں ریٹائر ہو گئے اور پروفیسر مصطفیٰ علی خان بھی۔ ڈپارٹمنٹ کے دوسرے اساتذہ میں پروفیسر وی۔ ایس۔ رکھی، پروفیسر محمد شبیر، پروفیسر سلیم اختر، پروفیسر قیصر حیات، مرحوم مشیر عالم ریڈر، اخلاق احمد ریڈر، ڈاکٹر نذیر حسن خاں، ظہیر الدین، فیضان مصطفیٰ، جاوید طالب، زبیر احمد خاں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

لا ڈپارٹمنٹ شروع ہی سے قابلِ ستائش خدمات انجام دیتا رہا ہے اور قومی سطح پر شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہے۔ ڈپارٹمنٹ سے سالانہ ایک معیاری جریدہ (جرنل) علیگڑھ لا جرنل کے نام سے شائع ہوتا ہے جس کے پہلے ایڈیٹر حفیظ صاحب تھے۔ اس کے بعد کئی اساتذہ نے مختلف شماروں کو شائع کیا۔ راقم کو بھی اس جرنل کی دس سال خدمت کرنے کا موقع ملا اور اس عرصے میں چار شمارے شائع ہوئے جن میں دو شمارے ایک حفیظ صاحب کی یاد میں اور دوسرا صرف فضائی آلودگی پر مشتمل تھا، کافی مشہور و مقبول ہوئے۔

جرنل کی اشاعت کے علاوہ ڈپارٹمنٹ میں سمینار اور موٹ کورٹ منعقد ہوئے۔ لڑکوں کی سوسائٹی، اس کے تحت تقریری مقابلہ اور سال میں لڑکوں کا ایک ٹور کا انتظام ہے۔ اس طرح ڈپارٹمنٹ تعلیمی پروگرام کے ساتھ دیگر مشاغل میں بھی مصروف ہے۔

ڈپارٹمنٹ نے فاضل اور لائق طلبار کے کارہائے نمایاں سے قومی سطح پر شہرت حاصل کی۔ مثال کے طور پر جناب بی۔ پی موریہ ڈپارٹمنٹ کے شروع کے پاس شدہ ایل۔ ایل۔ ایم ہیں۔ ہندوستان کی سیاست میں شامل رہے۔ ان کے علاوہ عارف محمد خاں، محمد اعظم خاں صاحبان ڈپارٹمنٹ کے ہونہار طالب علموں میں رہے۔ یونیورسٹی کی سیاست میں دلچسپی لیتے رہے۔ دونوں اب ملک کی

ؒ اسی سال دہلی میں انتقال کیا۔ (ادارہ)

سیاست میں شامل ہیں اور مرکزی، صوبائی وزیر رہے۔ ڈپارٹمنٹ کے کئی طلبا آئی۔ اے۔ ایس اور آئی۔ جی۔ ایس میں کامیاب ہوکر ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے طلبار ملک کے مختلف ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ میں کامیابی سے وکالت کر رہے ہیں۔ شجاعت اللہ خاں سپریم کورٹ کے مشہور وکیلوں میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈپارٹمنٹ کے کثیر تعداد میں طلبار مختلف لا رکالجوں میں ٹیچر ہیں یا ضلع عدالتوں میں وکالت کر رہے ہیں۔

(ماخوذ: تہذیب الاخلاق، علیگڑھ۔ مارچ، اپریل ۱۹۹۸ء)

"مسلمانوں پر اس وقت ایسا ہی وقت پڑا ہے جیسا کہ ۱۸۵۷ء میں پڑا تھا۔ اس وقت "علیگڑھ تحریک" نے اس کا مقابلہ کیا۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک تعلیمی ادارے کے قیام کے بعد تحریک ختم ہوگئی، نہیں۔ علیگڑھ تحریک نام ہے شدائد زمانہ سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کا۔ یہ مصیبتیں آتی رہی ہیں اور آتی رہیں گی اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیئے علیگڑھ تحریک زندہ ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ زندہ رہے گی۔ ہمارا عزم مستحکم ہے کہ کامیابی ہمیشہ ہمارے قدم چومے گی۔ علیگڑھ یونیورسٹی ایک چشمۂ فیض ہے جس سے تشنگانِ علم قریب ایک صدی سے سیراب ہوتے آئے ہیں اور آئندہ بھی سیراب ہوتے رہیں گے۔"

(ریڈ و میر عتیق احمد صدیقی)

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

مولانا آزاد لائبریری

یہ عظیم الشان سات منزلہ عمارت، جو مسلم یونیورسٹی کے سلسلۂ عمارات کے عین وسط میں عظمت و سربلندی سے کھڑی ہے اور ایک شان دلربائی سے ہر ایک کو دعوتِ نظارہ اور ضیافتِ استفادہ دے رہی ہے جو مولانا آزاد لائبریری کے نام سے چار دانگِ عالم میں مشہور ہے۔ اس کی تاریخ قدیم ہے۔ اتنی ہی قدیم جتنی کہ اس عالمی شہرت یافتہ تعلیمی ادارے کی۔ اس نے بھی ترقی کے منازل اتنی ہی تیزی سے طے کیے جتنی کہ اس درسگاہ نے۔ اس مرکزی کتاب خانہ کا قیام ایم۔ اے۔ او کالج کے قیام کے ساتھ ہی عمل میں آگیا تھا۔ سر سید نے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم مسلمانان قائم کیا۔ اس کا افتتاح ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو عمل میں آیا۔ یہ ملکۂ معظمہ کا یومِ ولادت تھا جو اس زمانے میں بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا۔ یہ مدرسہ دو سال سے بھی کم مدت میں ترقی کر کے ۱۸۷۷ء میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج بن گیا۔ بانیٔ مدرسہ سر سید احمد خاں خود ایک عالم اور اعلیٰ پایہ کے مصنف تھے۔ وہ کتابوں اور کتاب خانوں دونوں کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ یہ بات ان سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا کہ کسی بھی تعلیمی ادارے کی کامیابی اور علم کی ترقی ایک عمدہ اور کتابوں سے بھرپور کتاب خانے کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ اس راز سے بھی آشنا تھے کہ تعلیمی ادارے کی علمی اور تدریسی سرگرمیوں

کی تکمیل کے لیے کتابخانوں کا وجود ناگزیر ہے لہٰذا مدرستہ العلوم قائم کرنے کے ساتھ ہی انھوں نے اس کے لیے کتابخانے کی داغ بیل بھی ڈال دی تھی۔ چنانچہ خشت اوّل کے طور پر انھوں نے اور ان کے نامور فرزند سید محمود نے اپنی ذاتی کتابوں کا مکمل ذخیرہ مدرستہ العلوم کو بطور عطیہ دے دیا۔ سرسید کے اس علمی ذخیرے کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہی بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ علّامہ شبلی جیسے عالم اور عظیم مصنف کے لیے علیگڑھ کے قیام کے زمانے میں سرسید کی شخصیت کے علاوہ ان کا ذاتی کتابخانہ بھی باعث کشش بنا ہوا تھا۔ اس کی بدولت ان کے علمی ذوق میں نکھار آیا اور تصنیفی سرگرمیوں کو جلا ملی۔ اس سلسلے میں علّامہ سید سلیمان ندوی حیات شبلی میں لکھتے ہیں:

مولانا میں تصنیفی ذوق پہلے سے موجود تھا۔ ان کی پہلی عربی تالیف "اسکات المتعدی" اور فقہ حنفی کے بعض دوسرے مناظرانہ رسالے چھپ چکے تھے۔ یہاں آکر ان کے تصنیفی ذوق کا محور بدل گیا۔ مولانا مجھ سے فرماتے تھے کہ ... تصانیف کا شوق ابتدًا مجھ کو ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی ہیں اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی یکجا ملی تھیں، جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یہ یکجا کتابیں سرسید کا کتب خانہ تھا۔

(حیاتِ شبلی، دار المصنفین۔ اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص ۱۳۷)

اس کے علاوہ متعدد مقامات پر علامہ شبلی نے سرسید کے علمی ذخیرے کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ ۱۹/ ستمبر ۱۸۸۲ء کو اپنے عزیز اور شاگرد مولوی محمد سمیع کے نام ایک خط میں اس ذخیرے کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا:

"سید صاحب نے اپنے کتب خانے کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیۂ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں یورپ میں طبع ہوئی ہیں۔ مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں۔"

(مکاتیب شبلی۔ حصہ اول۔ مرتبہ سید سلیمان ندوی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۲۸ء، ص ۵۶-۵۷)

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سر سید کے اس نادر روزگار علمی ذخیرے کے ساتھ جسٹس محمود کی کتابوں کا ذخیرہ بھی شامل ہو گیا ہے جس میں بیشتر کتابیں علوم جدیدہ پر انگریزی میں تھیں۔ اس طرح ان دونوں ذخیروں نے مل کر مشرق و مغرب کی بہترین اور نمائندہ کتابوں پر مشتمل ایک اعلیٰ کتاب خانہ کی شکل اختیار کر لی۔ ابتدا میں یہ کتابیں مدرسے کی عمارت میں ہی رکھی گئیں، لیکن جلد ہی ان کے لیے ایک علٰحدہ عمارت کا انتظام کیا گیا اور جب ۸ رجنوری ۱۸۷۷ء کو اس وقت کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ لٹن (Lord Lytton) نے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا تو اس موقع پر سر سید نے یہ اہم اعلان بھی کیا کہ لائبریری کے لیے جو عمارت زیرِ تعمیر ہے، وہ مکمل ہونے کے بعد ہمارے معزز مہمان کے نام نامی سے منسوب ہو گی اور لٹن لائبریری (Lytton Library) کہلائے گی۔ اس کے جواب میں لارڈ لٹن نے جو تقریر کی اس میں انھوں نے کتابوں اور کتاب خانوں کی اہمیت کو واضح کیا اور کالج کے لیے معیاری کتابخانہ کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے فرمایا:

A library is the best society, to which any one man can be admitted for it is an assemblage of the worlds greatest benefactors ----- the wise and good of all ages Here live those who are worthy to live'

یعنی کسی بھی انسان کو شامل کرنے کے لیے کتابخانہ بہترین معاشرہ ہے کیونکہ یہ دنیا کے عظیم ترین محسنوں اور مربیوں نیز ہر عہد کے دانشوروں اور بہترین انسانوں کی مجلس ہے۔ اس میں وہی لوگ رہتے ہیں جو فی الواقع زندہ رہنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

تکمیل کے بعد اس عمارت میں کالج کا کتابخانہ منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد ۴۸ سال تک پہلے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج اور بعد میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی یہ مرکزی لائبریری 'لٹن لائبریری' کے نام سے دنیا بھر میں مشہور و معروف رہی جیسا کہ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ بتاتی ہے۔ کالج نے بہت تیزی سے ترقی کی اور نئی صدی

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

میں داخل ہونے سے قبل ہی ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں ممتاز و منفرد مقام حاصل کر لیا۔ کالج کی ترقی کے ساتھ لائبریری نے بھی اتنی ہی سرعت سے ارتقائی منازل طے کیے۔ مزید یہ کہ کالج کے بہی خواہوں اور اس سے وابستہ افراد نے کالج کے ساتھ ساتھ اس کی لائبریری کی ترقی میں بھی کلیدی رول ادا کیا۔ اسی کے ساتھ اس کی اعلیٰ کارکردگی اور روز افزوں اہمیت کے پیشِ نظر اہلِ علم حضرات نے اپنے ذاتی ذخیرے لٹن لائبریری کو دینے شروع کر دیئے۔ ان میں سب سے اہم نام صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا ہے۔ آپ علیگڑھ کے نامور فرزند تھے۔ زمانۂ طالب علمی سے لے کر اپنی زندگی کے آخری مرحلے تک کسی نہ کسی حیثیت سے پہلے ایم۔اے۔او کالج اور پھر مسلم یونیورسٹی سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے۔ سر سید کی تعلیمی تحریک کے زبردست حامی اور مبلغ تھے۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۶ء تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ انھوں نے قانون سے متعلق اپنی تمام تر کتابوں کا ذخیرہ لٹن لائبریری کو عطا کر دیا۔ جو انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں جمع کیا تھا۔ ان عطیات کے علاوہ لائبریری نے اپنے وسائل سے بھی کتابیں اور رسالے حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

دسمبر ۱۹۲۰ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ترقی کر کے مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ اس کے اثر سے لائبریری خدمات میں تنوع پیدا ہوا اور ترقی کرنے کے زیادہ مواقع فراہم ہوئے۔ اب اس کی سالانہ گرانٹ میں معتد بہ اضافہ ہو گیا۔ کتابوں میں اضافے کی شرح میں بھی زیادتی ہوئی۔ کتابخانہ کی خدمات کو سراہا جانے لگا۔ اس سے اس کی شہرت اور ناموری میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ دانشور، اسکالر اور طلبا اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ علیگڑھ کے علاوہ ہندوستان کے دیگر مقامات سے بھی اسکالر اس سے استفادہ کرنے کے لیے آنے لگے۔ لائبریری خدمات میں تنوع پیدا ہونے، ان سے مستفید ہونے والے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہونے ان کے اثر سے کتابوں، رسالوں اور دیگر مطالعاتی اشیاء میں اضافے اور ان سب کے نتیجے میں کارکنانِ کتابخانہ کی تعداد میں اضافے کو لائبریری کی عمارت زیادہ عرصے تک برداشت نہ کر سکی۔ عمارت ایک جامد شئے ہے، اس میں کسی

طرح کی لچک نہیں ہوتی لہٰذا الش لائبریری میں رفتہ رفتہ گنجائش کم ہوتی گئی اور ایک کشادہ اور وسیع عمارات موثر انداز میں لائبریری خدمات انجام دینے کے قابل نہیں رہی۔ مجبوراً الش لائبریری سے ملحق متعدد کمروں کو بھی لائبریری سے متعلق کرلیا گیا۔ لیکن تنگیٔ داماں، کا یہ کوئی مستقل حل نہیں تھا۔ چنانچہ اس سے بھی زیادہ وسیع وعریض اور بلند وبالا عمارت کا خواب دیکھا جانے لگا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا۔ اس آزادی کو دائم وقائم رکھنے کی غرض سے جمہوری نظام حکومت کو اپنایا گیا اور جمہوریت کو مستحکم کرنے نیز ملک کو ہمہ گیر ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے مقصد سے ملک میں تعلیم کو عام کیا گیا۔ اس کے لیے نئے نئے تعلیمی ادارے قائم کیے گئے اور جو پہلے سے قائم تھے۔ انھیں توسیع دے کر کثیر المقاصد بنایا گیا۔ اس جدید تعلیمی نظام کے تحت درس گاہوں میں طلبا کا ہجوم بڑھنے لگا۔ ہماری یونیورسٹی بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ چنانچہ یہاں بھی ہر طبقہ اور ہر فرقے کے افراد کثیر تعداد میں بغرض تعلیم آنے لگے۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی خصوصی توجہ سے یونیورسٹی میں بہت سے ترقیاتی منصوبے اور تعلیمی پروگرام شروع کیے گئے اور مولانا آزاد ہی کی عنایات سے ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے ماہر تعلیم مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر بنائے گئے۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۴۸ء کو آپ نے وائس چانسلر شپ کا چارج لیا۔ آپ نے آتے ہی جہاں دوسرے محکموں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ وہیں یونیورسٹی لائبریری کو بھی اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس زمانے میں سید بشیر الدین صاحب لائبریری انتظامیہ کے سربراہ تھے، ویسے تو عہدہ کے لحاظ سے وہ اسسٹنٹ لائبریرین تھے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ لائبریرین بنائے گئے۔ اس وقت تک یونیورسٹی کا سینئر پروفیسر اعزازی لائبریرین ہوتا تھا لیکن جملہ انتظامی امور بشیر صاحب کے ہی ذمہ تھے۔ انھوں نے مجموعی طور پر یونیورسٹی لائبریری کی تقریباً ۴۰ سال خدمت کی اور اپنی انتظامی سوجھ بوجھ، پیشہ ورانہ صلاحیت اور بے لوث خدمت سے اس لائبریری کو نہ صرف ہندوستان کی بلکہ دنیا کی عظیم یونیورسٹی لائبریریوں کی صف میں لاکھڑا کردیا۔ اسی لیے انھیں بلاخوفِ تردید مسلم یونیورسٹی کے مرکزی کتابخانہ کا معمارِ اعظم

قرار دیا جاسکتا ہے۔ ذاکر صاحب کے وائس چانسلر بنتے ہی بشیر صاحب نے لائبریری کے مسائل ان کے گوش گزار کرنے شروع کیے اور انھیں بتایا کہ جدید تعلیمی نظام کے تحت طلبار کی تعداد جس تیز رفتاری سے یونیورسٹی میں بڑھ رہی ہے، اس کے پیش نظر موجودہ عمارت میں محدود رہتے ہوئے طلبار اور اساتذہ دونوں کے لیے بیک وقت اطمینان بخش اور موثر طریقے پر خدمات انجام دینا ممکن نہیں ہے لہٰذا ایک نئی اور کشادہ عمارت کی ضرورت ہے۔ ذاکر صاحب علیگڑھ کے لیے نئے نہیں تھے۔ وہ ۱۹۲۰ء تک یہاں کے طالب علم رہے تھے۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تحریک سے وابستہ ہو کر انھوں نے یونیورسٹی کو چھوڑ دیا تھا، لیکن ذہنی طور پر انھوں نے خود کو یونیورسٹی سے کبھی الگ نہیں کیا تھا اور کسی نہ کسی حیثیت سے اس سے تعلق کو برقرار رکھا تھا۔ چنانچہ جب وہ وائس چانسلر کی حیثیت سے پھر یونیورسٹی سے از سر نو وابستہ ہوتے تو یہاں کے ماحول میں انھیں اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ یہاں کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ اور مسائل کو بھی سمجھتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ لائبریری کی اہمیت وافادیت کے بھی قائل تھے اور جن مشکلات سے یہ دوچار ہو رہی تھی، ان کا بھی احساس رکھتے تھے۔ چنانچہ جب بشیر الدین صاحب نے لائبریری کے مسائل ان کے سامنے رکھے تو بلا تاخیر وہ ان کی اس رائے سے متفق ہو گئے کہ اب لائبریری کے لیے ایک نئی کشادہ عمارت ناگزیر ہو گئی ہے۔ خوش نصیبی سے مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت مرکزی وزیر تعلیم تھے۔ لائبریری کی اہمیت سے ان سے زیادہ کون واقف ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی ذاکر صاحب نے اس مسئلہ کو ان کے سامنے رکھا انھوں نے بلا تامل ذاکر صاحب کی تجویز کو تسلیم کیا اور لائبریری کے لیے ایک نئی عمارت کی منظوری عطا فرمائی۔ اس کے بعد مولانا آزاد کی ہدایات اور ذاکر صاحب کی مساعی سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن مالی امداد ملنے کے مراحل بھی آسان ہو گئے۔ اس طرح تقریباً ۱۲ لاکھ روپے کی خطیر رقم سے نئی عمارت تعمیر کرائی گئی۔ اس کا سنگ بنیاد ۲۲ نومبر ۱۹۵۵ء کو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے رکھا اور بعد تکمیل ۶ دسمبر ۱۹۶۰ء کو اس کا

افتتاح بھی انھوں نے ہی کیا۔ اس دوران ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا آزاد نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی کی انجمن طلبار نے جو تعزیتی جلسہ کیا تھا اس میں بالاتفاق رائے ایک تجویز منظور کر کے یونیورسٹی کے ارباب اقتدار سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ لائبریری کی جو عمارت زیر تعمیر ہے اس کا نام مولانا آزاد کے نام نامی اسم گرامی پر رکھا جائے۔ چنانچہ بعد تکمیل اس کا نام "مولانا آزاد لائبریری" رکھا گیا۔ اس کے بعد لٹن لائبریری قصۂ پارینہ بن گئی اور ۶ر دسمبر ۱۹۶۰ء سے یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری 'مولانا آزاد لائبریری' کہلانے لگی اور اب ساری دنیا میں اسی نام سے مشہور و معروف ہے۔ اسی کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عظیم دانشور، بے مثال ادیب، بے نظیر خطیب، بے مثال انشا پرداز، جنگ آزادی کے سالار کارواں اور مسلم یونیورسٹی کے سچے بہی خواہ اور محسن کی یادگار قائم ہو گئی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایک عالم، مفکر، دانشور، اور عبقری کی یادگار یونیورسٹی لائبریری سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔

مولانا آزاد لائبریری فنِ تعمیر کے لحاظ سے ہندوستان کی یونیورسٹی لائبریریوں میں سب سے زیادہ حسین، دل کش اور دل آویز ہے۔ اس کا نقشہ ملک کے نامور ماہرِ فنِ تعمیر جناب فیاض الدین حیدرآبادی نے تیار کیا تھا۔ یہ عمارت اسلامی اور ہندوستانی طرزِ تعمیر کا حسین امتزاج ہے۔ اسی لیے اس میں شان و شوکت بھی ہے، عظمت و جلال بھی ہے۔ شانِ دلربائی بھی ہے اور دلکشی بھی ہے۔ اور دل نشینی بھی۔

رقبہ: عمارت مجموعی طور پر ۱۶۳ر۲۳ مربع گز پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اطراف میں ۷۵ر۴ ایکڑ زمین افتادہ ہے جس میں خوش نما لانوں کا اہتمام کیا گیا ہے جن سے ماحولیات کا توازن برقرار رکھنے اور لائبریری کی آب و ہوا کو معتدل اور خوشگوار بنانے میں مدد ملتی ہے۔

عمارت: لائبریری کی مکمل عمارت بنیادی طور پر دو منزلہ ہے جن میں عملہ کے کام کرنے کے لیے کمرے، کتابیں جاری کرنے اور طلبار کے مطالعے کے لیے کشادہ ہال ہیں۔ ان کے علاوہ کتابیں رکھنے کے لیے

سات منزلوں میں دو رویہ کمرے ہیں، جن میں انگریزی، اردو، فارسی، ہندی، عربی، سنسکرت، فرانسیسی، جرمنی، روسی، عبرانی، چینی، پنجابی، بنگالی، تیلگو، تامل، مراٹھی وغیرہ زبانوں میں آٹھ لاکھ سے زائد کتابیں اور رسائل کی جلدیں خوش سلیقگی سے رکھی ہوئی ہیں۔ طلبار کے بیٹھ کر مطالعہ کرنے کے لیے تین وسیع و عریض ہال ہیں، جن میں مجموعی طور پر ۵۶۰ نشستوں کا انتظام ہے۔ ان کے علاوہ شعبۂ مخطوطات، شعبۂ عربی، شعبۂ اردو و فارسی نیز شعبۂ ہندی و سنسکرت وغیرہ میں بھی لائبریری سے استفادہ کرنے والوں کے لیے نشستوں کا اہتمام کیا گیا ہے، جن کی مجموعی تعداد ۲۹۰ ہے۔ اس طرح کل ۸۵۰ ریڈر بیک وقت لائبریری میں مطالعہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اب لائبریری میں مطالعہ کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہونے لگی ہے کہ نشستوں کی یہ تعداد بھی ناکافی ہوگئی ہے۔ یہ بات باعث مسرت ہے کہ موجودہ وائس چانسلر جناب محمود الرحمٰن لائبریری کی ترقی اور فلاح کے لیے مستقلاً کوشاں رہتے ہیں۔ انھوں نے دو مزید ہالوں کی تعمیر کی منظوری دے دی ہے۔ توقع ہے کہ جلد ہی یہ کمرے بن کر تیار ہو جائیں گے جن سے طلبار کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا اور لائبریری کی مشکل آسان ہو جائے گی۔

انتظامی ڈھانچہ: لائبریری کا ڈھانچہ مرکزی نوعیت کا ہے، یعنی مولانا آزاد لائبریری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے تحت یونیورسٹی سے متعلق مختلف اداروں اور شعبوں کے کتابخانہ ہیں۔ ان کی نوعیت مرکزی کتابخانہ کے تحت ذیلی کتابخانوں کی ہے۔ ان کے لیے کتابیں، رسالے وغیرہ فراہم کرنا اور ان کے لیے کارکنوں کا تقرر کرنا اور ان کے علاوہ دیگر تمام متعلقہ امور کی ذمہ داری مرکزی کتابخانہ کی ہے۔ کوئی بھی شعبہ اپنی سیمنار لائبریری کے لیے براہ راست کتابیں اور رسالے نہیں خرید سکتا۔ اس کے لیے اسے لازماً مرکزی لائبریری کی مدد لینی ہوتی ہے۔ مرکزی لائبریری میں اپنے ذخائر کتب و رسائل کی کیٹلاگ کے ساتھ شعبہ جاتی کتابخانوں میں موجود ذخائر کی بھی مکمل اور مبسوط کیٹلاگ رہتی ہے جس کو دیکھنے سے یہ بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ مرکزی کتابخانہ کے علاوہ کون سی کتاب کس شعبہ کی لائبریری میں موجود ہے۔

لائبریری میں کتابوں کی تقسیم بنیادی طور پر لسانی اعتبار سے کی گئی ہے چنانچہ لائبریری میں اردو، فارسی، عربی، ہندی و سنسکرت کے جداگانہ سیکشن قائم ہیں جن میں ان زبانوں کی مطبوعات رکھی گئی ہیں۔ الماریوں میں انھیں موضوع کے اعتبار سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ بات آسانی سے معلوم ہو جاتی ہے کہ لائبریری میں کسی بھی موضوع پر اور کسی بھی زبان میں کون کون سی اور مجموعی طور پر کتنی کتابیں اور رسالے موجود ہیں۔

کتابوں کی تعداد : ۳۱ر مارچ ۱۹۹۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق مولانا آزاد لائبریری اور اس کے ذیلی شعبہ جاتی کتابخانوں میں کتابوں اور مجلد رسالوں کی مجموعی تعداد ۸۶۷۲۸۵ اور مخطوطات کی تعداد ۱۴۵۶۰ تھی۔ اس کے بعد اب تک مزید دو ہزار کتابوں کا اضافہ ہو گیا ہے اس طرح ۱۵ر اکتوبر ۱۹۹۵ء کو یہ تعداد بڑھ کر ۸۶۹۲۸۵ ہو گئی ہے۔ ۳۱ر مارچ ۱۹۹۵ء تک مختلف زبانوں میں کتابوں کی تعداد اور ان کا گوشوارہ حسبِ ذیل ہے :

زبان	تعدادِ کتب
۱۔ انگریزی و دیگر مغربی زبانیں	۴۶۱۲۰۳
۲۔ اردو	۱۲۰۹۱۵
۳۔ ہندی	۳۴۷۳۵
۴۔ عربی	۲۶۸۸۶
۵۔ فارسی	۱۶۹۱۴
۶۔ سنسکرت	۶۸۰۲
۷۔ بنگالی، پنجابی و دیگر جدید ہندوستانی زبانیں	۸۶۲۷
۸۔ بریل کتب (برائے نابینا حضرات)	۱۰۳۳
کل تعداد	۸۶۷۲۸۵

یوں تو لائبریری کا ہر شعبہ کسی نہ کسی حیثیت سے اہم اور ناگزیر ہے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ بڑی حد تک اس کی شہرت اس کے شعبۂ مشرقیات پر مبنی ہے، اس میں اردو، فارسی، عربی ہندی اور سنسکرت کے سیکشن آتے ہیں۔ ان میں بعض ایسی نادر و نایاب کتابیں محفوظ ہیں جن کی نظیر کسی دوسرے کتابخانہ میں ملنی ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ ان میں ہند اور بیرونِ ہند کی قدیم مطبوعات بھی ہیں اور کم و بیش تمام اپنے عہد کے ممتاز ناشرین کی مطبوعات بھی۔ ان میں فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، ایشیاٹک سوسائٹی

ن بنگال، سرسید احمد خاں کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی، نول کشور پریس،
دالترجمہ حیدرآباد، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن ترقی اردو، مطبع مسلم یونیورسٹی جیسے اہم اداروں
و مطابع کی زیادہ تر مطبوعات بھی شامل ہیں۔

شعبۂ مخطوطات: ان مطبوعات کے علاوہ لائبریری میں بڑا بیش قیمت اور عدیم النظیر اور نادر و نایاب ذخیرہ قلمی نسخوں کا بھی ہے۔ ان نسخوں کی تعداد
اس وقت ۱۴۵۶۰ ہے۔ مطبوعات کی طرح ان کو بھی دو طرح سے حاصل کیا گیا ہے۔
یعنی خریداری کے ذریعے اور عطیات کی شکل میں۔ جن حضرات نے زیادہ بڑی تعداد
میں مخطوطات دیئے ہیں، انھیں کے نام سے ان کے ذخیرے کو منسوب کر دیا گیا
ہے اور جو مخطوطات لائبریری نے اپنے وسائل سے خریدے ہیں، انھیں یونیورسٹی
کلکشن، کے عنوان سے رکھا گیا ہے۔ یہ تمام ذخائر ایک ہی سیکشن میں جداگانہ حیثیت
سے رکھے گئے ہیں۔ اس طرح ان کی انفرادی نوعیت بھی برقرار ہے اور اجتماعی حیثیت
بھی۔ یہ ذخائر کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کا صحیح نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ان
ذخائر کے نام اور ان میں موجود مخطوطات کی تعداد کا گوشوارہ حسب ذیل ہے:

نام ذخیرہ	تعداد مخطوطات
سبحان اللہ کلکشن	۲۳۹۹
جواہر میوزیم (اٹاوہ کلکشن)	۱۶۴۳
حبیب گنج کلکشن	۱۶۱۶
عبدالحئی فرنگی محل کلکشن	۱۵۵۲
سلیمان کلکشن	۱۴۱۲
عبدالسلام کلکشن	۵۷۵
احسن کلکشن	۳۵۳
قطب الدین کلکشن	۲۳۵
شیفتہ کلکشن	۲۰۹
منیر عالم کلکشن	۱۱۷
آفتاب کلکشن	۱۱۵

ان مخطوطات کے علاوہ جیسا کہ عرض کیا گیا، جو مخطوطات لائبریری اپنے وسائل سے خریدتی ہے، انھیں جداگانہ حیثیت سے رکھا جاتا ہے ان کی تعداد فی الوقت ۴۳۳۴ ہے۔

ان تمام ذخائر میں بیشتر مخطوطات اپنی ندرت اور گوناگوں خصوصیات کے باعث لاثانی ہیں۔ ان تمام مخطوطات کے موضوعات میں بھی بڑا تنوع اور ہمہ گیری ہے ان میں کائنات علم کے تمام اہم خطوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان میں مذہبیات، قرآنیات، تفسیر، اصول تفسیر،

حدیث، فقہ، عقائد، کلام، علم کلام، معاد، تصوف، منطق، فلسفہ، تاریخ، ادبیات، جغرافیہ، سفر نامے، علم السنہ، علم بدیع، صرف و نحو، بیان و عروض، لغت و قاموس، طب، ریاضیات، فلکیات، تعبیر الرؤیا، موسیقی، کیمیا، فن سپہ گری، شکاریات وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے ساتھ ہندی و سنسکرت وغیرہ میں مذہبی و کلاسیکی تصانیف کے فارسی و ہندوی زبانوں میں تراجم بھی شامل ہیں۔ ان مخطوطات میں سے چند انتہائی اور اہم اور نادر نسخوں کا تعارف کرا دینا ضروری محسوس ہوتا ہے تاکہ ہمارے قارئین ان کی خصوصیات اور لائبریری کے شعبۂ مخطوطات کی اصل نوعیت اور اہمیت سے واقف ہو جائیں۔

۱۔ قرآن کریم: خط کوفی، قرآن کریم کے ابتدائی چند اوراق جن کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کے دستِ مبارک سے لکھے ہوئے ہیں۔

۲۔ قرآن کریم: (مع ترجمہ فارسی) قرائن بتاتے ہیں کہ یہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس پر آیات اور رکوع وغیرہ کی علامت نیز حاشیے کی سطور سونے کے پانی سے بنی ہوئی ہیں۔

۳۔ قرآن کریم: (مع ترجمہ فارسی) تقطیع کلاں، مطلا و مجدول۔ کتابت بعہدِ اکبر اعظم۔ ابتدائی اور آخری صفحات پر انتہائی باریک اور دیدہ زیب کام بنا ہوا ہے۔

۴۔ قرآن کریم: (مع ترجمہ فارسی و تفسیر حسینی برحاشیہ) تفسیر کے آخر میں "بید محمد مختار۔ ۲۵ رجادی الآخر ۱۲۸۲ھ تحریر ہے۔ یہ نسخہ انتہائی دیدہ زیب اور ورطۂ حیرت میں ڈالنے والا ہے۔ بہت بڑی تقطیع پر ہے جس کا طول ۲۴ انچ اور عرض ۱۴½ انچ ہے۔ کاغذ کشمیری ہے۔ شروع کے، آخر کے ہر منزل ابتدائی دو، دو صفحات طلا، زمرد، نیلم اور عقیق وغیرہ کے پانی سے کی گئی انتہائی باریک گل کاری سے مزین ہیں۔ ان کے علاوہ ہر صفحہ پر حروف مطلا، خط گوشہ لاجوردی اور سورتوں کے نام آب زر سے تحریر ہیں۔ جلد چرمی ہے جو فن جلد سازی کا اعلیٰ نمونہ ہے اس پر بھی آب زر سے نقاشی کی گئی ہے جو اس کے حسن کو دوبالا کر رہی ہے۔

۵۔ قرآن کریم : بخط ثلث۔ اسے ۹۰۱ھ میں ہرات سے اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں بطورِ عطیہ بھیجا گیا تھا۔

۶۔ القمیص الجوشن المصحف: (یہ کپڑے کی ایک صدری ہے جس پر خط خفی میں مکمل قرآن پاک لکھا گیا ہے۔ یہ پوری صدری مرصع ہے اور بڑے اہتمام سے لکھی گئی ہے۔ اس کا طول ۲ فٹ دو انچ اور عرض ایک فٹ ۹ انچ ہے، نیز آستینوں کا طول و عرض دس انچ ہے۔ اصلاً یہ مغلیہ عہد کے کسی فوجی کی ملک تھا جسے میدان جنگ میں دشمن کے حملے سے محفوظ رہنے کے عقیدے سے پہنا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی رستاخیز میں یہ انگلستان چلا گیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں سر سید کے پوتے اور اس وقت کے وائس چانسلر سر راس مسعود کے دورۂ انگلستان کے دوران ان کے انگریز دوست لارڈ لوتھین کے ذریعہ یہ نایاب تحفہ انھیں پیش کیا گیا جسے لاکر انھوں نے لائبریری میں محفوظ کر دیا۔

۷۔ عیون الاجوبہ فی فنون الاسئلہ : (عربی) مصنفہ ابو القاسم عبد الکریم القشیری (متوفی ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء) بخط مصنف روشنائی سنہر خوردہ۔ اس کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی بھی کتابخانہ میں موجود نہیں ہے۔

۸۔ نہج البلاغہ : (عربی) مکتوبہ ۵۳۸ھ / ۱۱۴۳ء بخط علی بن ابی القاسم بن علی۔ اس پر متعدد تحریریں اور مہریں ثبت ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مختلف کتابخانوں کی زینت اور اہم شخصیات کی ملکیت رہا ہے۔

۹۔ معدن الجواہر : (عربی) تفسیر القرآن از ولی اللہ فرنگی محلی (متوفی ۱۸۵۳ء) یہ دنیا کا واحد نسخہ ہے۔

۱۰۔ نفائس المآثر : (فارسی) معروف بہ تذکرۂ علاء الدولہ، از مرزا علاء الدولہ قزوینی مکتوبہ ۹۸۵ھ۔ اس نسخہ پر مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی تحریریں، حواشی اور اصلاحیں موجود ہیں اور ان کی مہر بھی ثبت ہے۔

۱۱۔ حالنامہ بایزید انصاری : (فارسی) مرتبہ علی محمد بن ابی بکر قندہاری۔ یہ کتاب روشنیہ تحریک کی تفصیلی تاریخ ہے کتابت بخط نستعلیق عمدہ۔ اس نسخہ کے علاوہ اور کوئی نسخہ کسی کتابخانے میں موجود نہیں ہے۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۱۲۔ کریما: (فارسی) از شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی۔ کتابت ۱۲۷۷ھ نستعلیق زرافشاں۔ انتہائی خوشخط و دیدہ زیب۔ کاتب بدر علی شاگرد آغا مرزا۔

۱۳۔ خمسۂ نظامی مصوّر: (فارسی) از نظامی گنجوی (متوفی ۵۹۹ھ / ۱۲۰۲ء) کاتب حسین عبداللہ۔ کتابت ۸۷۳ھ خطِ نستعلیق انتہائی اعلیٰ۔ ابتدائی دو صفحے مطلاّ۔ مع ۱۷ تصاویر۔

۱۴۔ مثنوی مولانا رومی مصوّر: (فارسی) کتابت ۱۰۱۹ھ بخط عبداللہ بن قنبر سمرقندی۔ مزین بہ تصاویر کشیدہ۔

مکتوبہ نعمت اللہ گوہر رقم در ۱۲۱۰ھ

۱۵۔ چہل حدیث با ترجمہ فارسی منظوم: بخط نستعلیق جلی۔ تمام صفحات مرصع، مطلاّ و مذہب۔ حاشیہ پر آبِ زر سے گل کاری ہے۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار قلمی نسخے قابلِ ذکر اور گوناگوں خصوصیات کے باعث قابلِ دید ہیں۔ یہاں محدود گنجائش کے پیشِ نظر صرف معدودے چندہی کے تعارف پر اکتفا کیا گیا ہے۔

ان قلمی نسخوں کے علاوہ اس ذخیرے میں دیگر نوادر بھی موجود ہیں، ان میں خطاطی کے نمونے، نقاشی کے نمونے، شہنشاہوں کے فرامین، سکّے اور دوسرے کتابخانوں میں دستیاب قلمی نسخوں کے روٹو گراف شامل ہیں۔ جن مایہ ناز خطاطوں کی خوش خطی کے نمونے اور وصلیاں یہاں محفوظ ہیں ان میں میر عماد قزوینی، آغا عبدالرشید دیلمی، حافظ نور اللہ، محمد مراد کاشمیری (شیریں رقم)، محمد عارف (یاقوت رقم)، میر بندہ علی (مرتعش رقم)، بہادر علی رامپوری، محمد ابراہیم، محمد کاظم اصفہانی اور میر علی تبریزی، جیسے ماہرینِ فن شامل ہیں۔ ان میں نسخ، نستعلیق، شکست، ثلث، بہار، سمرقندی غبار، رعشہ اور ناخون وغیرہ رسم خط کے اتنے اعلیٰ اور دیدہ زیب نمونے ہیں کہ ایک بار دیکھنے کے بعد ان پر سے نگاہ نہیں ہٹتی اور بار بار دیکھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔

شعبۂ مخطوطات میں مغل شہنشاہوں کے فرامین کا بھی خاصا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ان میں بابر، اکبر، شاہجہاں، شاہ عالم آفتاب وغیرہ کے فرامین خاص طور پر

قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ مشاہیر کے خطوط بھی بڑی تعداد میں محفوظ ہیں۔ ان میں سر سیّد احمد خاں، ان کے رفقا، جسٹس محمود، جسٹس امیر علی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سلطف اللہ، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سر رضا علی، علامہ اقبال، محمد حسین آزاد، مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، اکبر الہ آبادی، عزیز لکھنوی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، تھیوڈور مارسین، تھیوڈور بیک اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطوط خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مہاتما گاندھی اور بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو کے چند انگریزی خطوط بھی شامل ہیں۔ ان کا مطالعہ بڑا دلچسپ اور معلومات افزا ہے اور چونکہ یہ ان مشاہیر کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں، اس لیے اور بھی زیادہ پرکشش اور دلچسپ ہیں۔

لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں خاصی بڑی تعداد میں سکّے بھی موجود ہیں۔ ان میں ہندوستان میں عہدِ سلاطین اور عہدِ مغلیہ کے حکمرانوں کے سونے، چاندی اور تانبے کے سکّے خصوصیت سے لائقِ توجہ ہیں۔

سر سیّد کلکشن : سر سیّد مصلحِ قوم ہونے کے ساتھ ایک بلند پایہ ادیب اور کثیر التصانیف مصنف بھی تھے۔ انھوں نے بے شمار تصانیف اور سیکڑوں مضامین بطور یادگار چھوڑے۔ انھوں نے علوم کو فروغ دینے کے لیے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کے زیرِ اہتمام انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے ہوتے اور شائع کرائے جاتے۔ انھوں نے ۱۸۶۶ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا۔ اس کے بعد ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق نکالا۔ ان دونوں رسالوں میں زیادہ تر مضامین اور مختلف تحریریں سر سیّد ہی کی ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ ان کو کالج وغیرہ کے سلسلے میں سرکاری نوعیت کی خط و کتابت بھی کرنی پڑتی تھی، اور اپنے اعزہ، احبا اور دیگر متعلقین سے مراسلت بھی۔ یہ تمام مضامین مکاتیب اور دیگر تحریریں بعد میں مرتب ہو کر مجموعوں کی شکل میں شائع ہوئیں۔ اس طرح سر سیّد کی مستقل تصانیف کے علاوہ ان مجموعوں کی بھی خاصی بڑی تعداد وجود میں آگئی۔ مولانا آزاد لائبریری نے ان تمام تصانیف، ان کے مختلف ایڈیشنز

مقالات ومضامین اور مکاتیب نیز دیگر تحریروں کے مجموعوں کو حاصل کر کے اپنے ذخیرے میں محفوظ کرلیا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے جاری کردہ رسائل جیسے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، علیگڑھ منتھلی، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین وغیرہ کے مکمل فائل کو بھی حاصل کرلیا ہے۔ اس ذخیرے کو مزید جامع اور کثیر الابعاد بنانے کے مقصد سے سرسید کے رفقاء اور علیگڑھ تحریک سے متعلق کتب ورسائل کو بھی اس ذخیرے میں شامل کردیا ہے۔ اور اسے سرسید کے نام سے منسوب کرکے "سرسید کلکشن" کی شکل دے دی ہے۔ ان میں سے بیشتر کتابوں اور رسالوں کی نوعیت ان کی اہمیت اور قدامت کے لحاظ سے مخطوطات جیسی ہوگئی ہے۔ اس لیے حفاظت کے پیش نظر انھیں شعبۂ مخطوطات میں رکھا گیا ہے اس ذخیرے کی مقبولیت روز افزوں ہے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ ہند و بیرون ہند کے دانشور اور تحقیقی کام کرنے والے حضرات اس کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور مستقلاً اس سے مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔

اوقات کار: مولانا آزاد لائبریری دنیا کے لائبریری نظام میں اپنا مخصوص اور ممتاز مقام رکھتی ہے یہ مقام اسے اپنے ذخائر کی ندرت اور عملے کی کارکردگی کے سبب حاصل ہوا ہے۔ یہاں ہر ہر فرد محنت جاں فشانی اور لگن سے ہمہ وقت کام میں مصروف رہتا ہے۔ آج کل لائبریری کے بعض سیکشن مسلسل ۲۴ گھنٹے کھلتے ہیں۔ گویا لائبریری کا صدر دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ دنیا کی واحد یونیورسٹی لائبریری ہے جو بلا کسی رکاوٹ کے شب و روز کھلی رہتی ہے اور لائبریری سے استفادہ کرنے والوں کی تندہی اور فرض شناسی سے خدمت کرتی ہے۔ یہاں کے عملے کی کارکردگی اور حسن خدمت سے ملک و بیرون ملک کے ریڈر بے انتہا متاثر ہوتے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی وہ تحریریں ہیں جو لائبریری کی Visitor's Book پر درج ہیں یا اظہار تشکر اور ممنونیت کے وہ کلمات ہیں جو ان حضرات کی تصانیف میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لائبریری اب تک قومی ومذہبی تیوہاروں پر بند رہتی تھی لیکن موجودہ وائس چانسلر جناب محمود الرحمٰن کی ہدایت کے بموجب اب یہ لائبریری ان ایام میں بھی کھلا کرے گی۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

لائبریری کی مطبوعات: لائبریری کا عملہ دوسروں کی علمی خدمت میں ہی مصروف نہیں رہتا بلکہ خود بھی حصول علم اور تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہتا ہے۔ اسی لیے لائبریری سے متعلق بعض حضرات ملک و بیرون ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں متعارف ہیں اور ان کی تصنیفات اور تالیفات کو وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان ہی حضرات کی کاوشوں سے لائبریری اپنی مطبوعات کو علمی دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو سکی ہے۔ ان میں سے بیشتر مخطوطات کی فہرستیں ہیں جن کو بڑی ژرف نگاہی اور محنت و جانفشانی سے مرتب کیا گیا ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1 Catalogue of the Persion Manuscripts in the Maulana Azad Library 1969, P 226

2 Catalogue of Manuscripts in the Maulana Azad Library added during 1970-77(Pt I Persian MSS)1980 P 79

3 Catalogue of the Manuscripts in the Maulana Azad Library (Habibganj Collection V I Pt I Persian Poetry) 1981 XII, P 325

4 Catalogue of the Manuscripts in the Maulana Azad Library Vol I Pt II (Habibganj Collection Persian) 1985 P 386

5 Descriptive Catalogue of Arabic Manuscripts of Habibganj Collection Vol II 1993 P 372 + XXXIII

۶۔ اردو رسائل کی ڈائریکٹری، ۱۹۷۳ء۔ ص ۲۹۲ یعنی مولانا آزاد لائبریری اور مسلم یونیورسٹی کے دیگر شعبہ جاتی کتابخانوں میں ۱۹۷۰ء تک موجود اردو رسائل کی شروح فہرست۔

۷۔ فہرست مخطوطات: ذخیرۂ شیفتہ، ۱۹۸۲ء۔ ۱۲۳ص

۸۔ فہرست مخطوطات: ذخیرۂ احسن مارہروی، ۱۹۸۳ء ۱۹۹ص

۹۔ فہرست مخطوطات: ذخیرۂ آفتاب، ۱۹۸۶ء، ۱۵۹ص

۱۰۔ مرآۃ التصوف: مرتبہ محمود حسین قیصر امروہوی، ۱۹۸۵ء، ۱۵۲ص
یعنی مولانا آزاد لائبریری میں موجود تصوف سے متعلق اہم مطبوعات کی جزوی فہرست۔

۱۱۔ اشاریۂ مندرجات تہذیب الاخلاق: مرتبہ محمد ضیاء الدین انصاری ۱۹۸۶ء۔ ۴۶ص

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۹

علیگڑھ

کردار، کلچر، اسپرٹ، مزاج، ماحول، کھیل، تربیت اور یونین

علیگڑھ اک روایت، اک تمدن، ایک کلچر ہے
علیگڑھ میں برابر سب، کوئی افضل نہ کمتر ہے

شفیق انجم

علیگڑھ

حسین رخ

یہاں رندوں کو ملتے ہیں بقدرِ شوق پیالے
یہاں تصنیف ہوتے ہیں فقط مخصوص افسانے
یہاں پروردۂ جوشِ جنوں ہوتے ہیں فرزانے
یہاں وابستۂ ہوش و خرد ہوتے ہیں فرزانے

خرد مندوں کا مرکز ہے یہ دیوانوں کی بستی ہے
علیگڑھ واقعہ یہ ہے کہ بزمِ ہوش و مستی ہے

یہاں پابندِ آدابِ نظر ہوتے ہیں شیدائی
حسینِ شوق پہ ہوتی نہیں قیدِ جبیں سائی
بہت محتاط ہوتی ہے یہاں جلووں کی رعنائی
خلافِ رسم و عادت ہے بھری محفل میں انگڑائی

نگاہِ شوق جب محسوس ہوتی ہے تعاقب میں
نگاہِ یار رہ جاتی ہے حیرت میں تعجب میں

یہاں جو بات ہے شائستگی کے ساتھ ہوتی ہے
شرارت تک یہاں سنجیدگی کے ساتھ ہوتی ہے
بہت معصومیت اور سادگی کے ساتھ ہوتی ہے
محبت واقعی پاکیزگی کے ساتھ ہوتی ہے

کوئی اک دوسرے سے بے تکلف تک نہیں ہوتا
محبت کرنے والوں میں تعارف تک نہیں ہوتا

متین رخ

سبق تاروں کو دیتا ہے تجسس کے قرینے کا
مسافر خود یہاں ملاح ہوتا ہے سفینے کا
بقدرِ ظرف مستی ہے یہاں دستور پینے کا
یہاں کا رہنے والا حوصلہ رکھتا ہے جینے کا

مصائب سے نہیں ڈرتے یہاں مقصد کے متوالے
بڑھا دیتے ہیں عزم جستجو کو پاؤں کے چھالے

یہاں مضبوط کر دیتے ہیں عقل و دل کے رشتوں کو
یہاں تبدیل کر دیتے ہیں قسمت کے نوشتوں کو
تقدس میں بدل دیتے ہیں شیطانی سرشتوں کو
یہاں انسانیت کا درس دیتے ہیں فرشتوں کو

سبق دیتے ہیں ہوش و آگہی عزمِ تعقل کا
ہمیشہ سے یہ گہوارہ ہے تہذیب و تمدن کا

یہاں کھولی گئی ہیں سب سے پہلے زیست کی راہیں
نظامِ دہر کو تبدیل کر دیں جب بھی یہ چاہیں
یہاں منہ نوچ لیتے ہیں یہاں بھرتے نہیں آہیں
یہاں موڑی گئی ہیں بارہا تاریخ کی باہیں

یہاں سے بال و پر بھی قابل پرواز ہوتا ہے
یہیں سے انقلابِ دہر کا آغاز ہوتا ہے

☆☆☆☆☆

پروفیسر محمد شفیع

سرسیّد اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

اٹھارہویں صدی کے آخر میں مغلیہ حکومت کا چراغ ہندوستان میں ٹمٹما رہا تھا۔ انگریزوں کا دور دورہ اور اقتدار بڑھ رہا تھا۔ مغل باہر سے آئے تھے لیکن ہندوستان کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ ہندوستانیوں میں وہ گھل مل گئے تھے۔ انگریزوں کی نظر ہندوستان کی دولت اور یہاں کی خام پیداوار پر تھی تا کہ اپنی صنعتوں کو فروغ دیں اور یہاں کی صنعتوں کو تخریب ختم کر دیں۔ چنانچہ انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں میں نفرت اور غصہ کی آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں یہ لاوا پھوٹ پڑا انگریزوں نے اسے بغاوت کا نام دیا۔ ہندوستانیوں نے اسے پہلی جنگ آزادی کہا۔ ہندو اور مسلمان مل کر لڑے لیکن وہ بے سر وساماں تھے اور آخر جیت انگریزوں کی ہوئی۔ انگریزوں نے جنتا سے خوب بدلہ لیا لیکن مسلمانوں پر ضرب گہری پڑی۔ سرسید نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی املاک اور عزت کو لٹتے ہوئے دیکھا۔ مسلمانوں کا عزم و حوصلہ چور چور ہو گیا۔ انگریزوں کی ہر چیز سے انھیں نفرت ہو گئی۔ انگریزی زبان اور انگریزی تعلیم سے قطعی طور پر کنارہ کشی کر لی۔ ہندوؤں پر چونکہ انگریزوں کی ضرب اتنی شدید نہ تھی جتنی مسلمانو

پر۔ اس لیے وہ انگریزی زبان اور انگریزی تعلیم حاصل کرتے رہے اور مسلمان رفتہ رفتہ اس زبان سے جس میں نئے علوم وفنون، سائنس اور نئی قدریں آرہی تھیں بے بہرہ رہے۔

سر سید احمد خاں قوم پرست اور بہت ہی دور اندیش انسان تھے۔ وہ اس راز کو بخوبی سمجھ گئے تھے کہ اگر مسلمانوں میں انگریزی زبان سے جس کے ذریعہ سے نئی تعلیم، سائنس ملک میں آرہی تھی، نفرت قائم رہی تو وہ اس قدر پچھڑ جائیں گے کہ پھر سنبھلنا مشکل ہوگا۔ سر سید چاہتے تھے کہ مسلمان جاگیردارانہ ذہنیت سے ہٹ کر نئی تعلیم، نئی روش جس کی بنیاد سائنسی تحقیق اور تدقیق پر ہے، اپنائیں۔ کام بہت مشکل تھا اور اگر سر سید کا آہنی عزم نہ ہوتا تو کامیابی مشکل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سر سید نے مسلمانوں کو اس نئی تعلیم کی طرف متوجہ کرنا چاہا تو ان پر دہریہ ہونے کا الزام عائد کیا گیا قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ لیکن یہ مرد مجاہد عزم کا پکا تھا اور ۱۸۵۷ء میں ایک اسکول قائم کر دیا۔ اس کام میں سر سید کو کچھ ایسے رفقا مل گئے تھے جنھوں نے ان کی بہت مدد کی مثلاً سید مہدی علی محسن الملک، ذکاءاللہ، ڈاکٹر نذیر احمد حالی اور شبلی۔ سر سید انگلینڈ گئے اور خاص طور پر آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے تعلیمی نظام کا مطالعہ کیا۔ ۱۸۷۰ء میں واپسی پر ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالہ کا مقصد مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا۔ سر سید کا مقصد مسلمانوں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم کی طرف مائل کرنے کا صرف یہ نہ تھا کہ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو گورنمنٹ میں نوکریاں ملیں بلکہ وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ سائنسی علم جس تیزی کے ساتھ انگریزی زبان میں آرہا ہے اور مغربی تعلیم جس طور پر اس کو اپنا رہی ہے اسے حاصل کرنا مسلمانوں کے لیے اشد ضروری ہے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ایک طرف مسلمان دینی تعلیم حاصل کریں اور دوسری طرف سائنس کی تعلیم سے بہرہ ور ہوں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں نے اگر ایسا نہ کیا تو وہ ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے ان کو ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم قائم کرنے پر

مجبور کر دیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مذہب کی تعلیم اور سائنس کے مطالبہ میں کوئی تضاد نہیں۔

سر سید ایک غیر معمولی قوم پرست انسان تھے۔ جو مدرسۃ العلوم انھوں نے قائم کیا وہ چند سال کے بعد محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج بن گیا۔ کالج کے دروازے بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے واسطے کھلے رہے۔ ۴ فروری ۱۸۸۴ء کو ایک تقریر کے دوران جالندھر میں انھوں نے کہا کہ "اگر دونوں یعنی ہندو اور مسلمان نے ایک ہی بنچ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کی۔ ایک ہی بورڈنگ ہاؤس میں دونوں اکٹھا رہے اور ایک ہی استاد سے علم کا استفادہ کیا تو دونوں میں اخوت، ہمدردی اور محبت پیدا ہوگی"۔ سر سید کا خواب مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک ایسا ادارہ قائم کرنا تھا جو دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں میں ہو جہاں تعلیم کے ساتھ ان کی بہترین تربیت ہو۔

سخت مخالفت کے باوجود اسکول اور کالج قائم ہو گیا۔ مخالفت اتنی شدید تھی کہ ملک کے کونے کونے سے فتوے آنے لگے کہ جو بھی اس اسکول میں تعلیم حاصل کرے گا وہ کافر ہوگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ عرب سے سر سید پر کفر کا فتوا آ گیا اور فتوے میں یہ کہا گیا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے اسکول کو مسمار کر دیں جو مسلمانوں کو گمراہ کرتا ہو۔ لیکن وہ مردِ مومن اپنی دھن کا پکا تھا۔ سر سید اس شعر کو اکثر گنگناتے تھے۔

وہ ہو کے ترش رو مجھے گالی ہزار دے
یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

سر سید کی دلی خواہش تھی کہ علیگڑھ اسکول و کالج معیاری تعلیمی ادارے ہوں اور اپنی تعلیم، تربیت اور تہذیب کے لیے ملک میں مثال قائم کریں۔ ان پر کالج کی چھاپ ہو، ان کے طرزِ گفتار، طور طریقے، ادب و آداب، تعلیمی معیار سے لوگ فوراً سمجھ لیں کہ یہ علیگڑھ کے پڑھے ہوئے لڑکے ہیں۔ سر سید نے اپنی بقیہ زندگی اسکول اور کالج کے لیے وقف کر دی۔ ۱۹۲۰ء میں سر آغا خاں کی مدد سے کالج کو یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا اور سر سید کا وہ خواب جو ایک پودے کی

شکل میں نمودار ہوا تھا ایک تناور درخت بن گیا۔ اس یونیورسٹی سے ملک کے قابل ترین فرزند نکلے جو بعد میں ممتاز ادیب، شاعر، سائنس داں، سیاست داں، مصور، ڈرامہ نویس، کھیل کے ہر میدان میں سبقت لے جانے والے، اردو اور انگریزی کے بہترین مقرر، غرض ہر میدان میں قابل ترین انسان پیدا کیے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور پڑھے لکھے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد پاکستان چلی گئی۔ کچھ دن بعد ڈاکٹر ذاکر حسین جو بعد میں صدر جمہوریہ کے عہدہ پر فائز ہوتے اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ یونیورسٹی میں مایوسی کا دور دورہ تھا۔ ذاکر صاحب بہت ہی دور اندیش انسان تھے۔ انھوں نے وقت کے تقاضے کو سمجھا اور باہر کے قابل اور مشہور پروفیسروں کا یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں تقرر کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہاں کے اچھے اور ہونہار اساتذہ کو بیرونی ممالک میں بھیج کر اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ غرض ذاکر صاحب نے اپنی ذاتی دلچسپی سے اس یونیورسٹی کو بہت سنبھالا دیا۔ اور چند ہی سال میں گورنمنٹ کی مدد سے اس یونیورسٹی کا کھویا ہوا وقار واپس آ گیا۔

..اسو سال قبل سرسید مسلمانوں کے ذہن میں تعلیمی اعتبار سے ایک انقلاب لے آئے اور اگر سرسید ایسا نہ کرتے تو نتیجہ شاید اتنا بھیانک ہوتا کہ اس کا سوچنا بھی عقل سے بعید ہے مسلمانوں نے دینی تعلیم کے ساتھ مغربی علوم و فنون میں مہارت حاصل کی اور ترقی کے آسمان پر درخشندہ ستارے بن کر چمکے۔

سرسید چونکہ ایک قوم پرست انسان تھے اور سیکولر مزاج کے حامی تھے لہٰذا وہ اسکول اور کالج جو انھوں نے قائم کیا اس کے دروازے بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے لیے کھلے رکھے۔ کالج کا نصب العین مسلمانوں کو جو تعلیم میں پچھڑے ہوئے تھے اوپر اٹھانا تھا لیکن برادرانِ وطن سے مل کر۔ ان سے علاحدگی اختیار کر کے نہیں۔ ۲۷ر جنوری ۱۸۷۲ء میں (اسکول کے قیام سے قبل) جو بات انھوں نے کہی وہ زریں حروف میں لکھنے کے قابل ہے کہتے ہیں "اے لوگو اگر کوئی ہندو

ہے یا کوئی مسلمان ہے وہ اس کا اپنا ذاتی عقیدہ ہے لیکن اس کا کوئی تعلق دنیاوی امور اور آپس کے معاملات سے نہیں ہے ہندوستان ہم دونوں کا ہے (ہندوؤں اور مسلمانوں کا) ہم دونوں ہندوستان کی ہوا میں سانس لیتے ہیں اور دونوں گنگا اور جمنا کا پانی پیتے ہیں اور ایک دوسرے کی خوشی اور رنج کے موقع پر برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں اور چونکہ ہم دونوں اسی ملک میں رہتے ہیں اس لیے ایک قوم ہیں"۔

یہ وہ اقوالِ زرّیں ہیں جن پر ہندوستان کے مستقبل کا دارومدار ہے۔

تقسیم ہند کے بعد یونیورسٹی ایکٹ میں چند ایسی تبدیلیاں کی گئیں جس سے اس کا پرانا کردار مجروح ہو گیا۔ چنانچہ ایک نئی مہم شروع ہوئی اس مہم میں مسلمان پیش پیش تھے لیکن ان کے ہم آواز چند معقول برادرانِ وطن بھی تھے۔ جدوجہد یہ تھی کہ گورنمنٹ یہ تسلیم کرے کہ اینگلو محمڈن اورینٹل کالج جسے مسلمانوں نے قائم کیا تھا جس نے آگے چل کر یونیورسٹی کی شکل اختیار کی اور چونکہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں کی قائم کردہ ہے اس لیے اس کا اقلیتی کردار تسلیم کیا جائے۔ ایک لمبی جدوجہد کے بعد ۱۹۸۱ء میں نیا ایکٹ پارلیمنٹ سے پاس ہوا جس میں اس بات کو تسلیم کیا گیا۔ یونیورسٹی کی کورٹ بحال کی گئی اور یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ کورٹ یونیورسٹی کی سب سے اعلیٰ انتظامیہ مجلس ہو گی۔ چانسلر اور پرو چانسلر اور آنریری ٹریژرر کا انتخاب ہو گا اور پارلیمنٹ نے اپنی فراخدلی میں یہ بھی منظور کیا کہ یہ یونیورسٹی ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی و تہذیبی ترقی کے لیے بھی پوری کوشش کرے گی اور وائس چانسلر کے انتخاب کا حق یونیورسٹی کی مجلسِ انتظامیہ اور کورٹ کے سپرد کیا گیا اور صدر جمہوریہ جو یونیورسٹی کے وزیٹر ہوں گے۔ کورٹ کے بھیجے ہوئے تین ناموں میں سے ایک نام کا انتخاب بحیثیت وائس چانسلر کریں گے۔

یونیورسٹی ایکٹ کا یہ کلاز کہ ــــــ "ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی و تہذیبی ترقی کی پوری کوشش کرے گی"، بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے ۱۹۸۷ء میں کافی بحث کی اور تقریباً ۲۵ اشخاص پر مبنی

(جس میں یونیورسٹی کے ڈین، چیئرمین، دیگر پروفیسران اور ہندوستان کے چند مشہور ماہرانِ تعلیم) ایک کمیٹی کی تشکیل کی کہ اس سلسلہ میں یونیورسٹی کو کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ کونسل نے راقم الحروف کو اس کمیٹی کا کنوینر مقرر کیا اور سیّد ہاشم علی صاحب نے جو اس وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اس کمیٹی کا نام "منفیح کمیٹی" رکھا۔ اس کمیٹی نے دو دن کا ایک سمپوزیم منعقد کیا جس کی تین نشستیں ہوئیں اور یونیورسٹی نے اس کمیٹی کی سفارشات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایک کتابچہ بعنوان "مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ۷ نکاتی پروگرام" شائع کیا اور یونیورسٹی میں ان تجاویز کو عمل میں لانے کے لیے ایک ڈائرکٹریٹ قائم کیا۔ یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے ان ۷ تجاویز کو منظور کر لیا۔ یونیورسٹی کورٹ نے چھ تجاویز منظور کریں لیکن داخلوں کی تجویز کے سلسلے میں مسلمانوں کے ریزرویشن کے لیے زور دیا اور طیب جی کی صدارت میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی کہ وہ اس امر پر غور کرے طیب جی کمیٹی نے داخلوں کے سلسلے میں مسلمان طلبا کے ریزرویشن کی حمایت کی اگرچہ اس پر ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔

اس مسئلہ پر یقیناً ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ داخلوں کے سلسلہ میں یونیورسٹی کی موجودہ پالیسی ۵۰ فیصد اندرونی طلبا اور ۵۰ فیصد بیرونی طلبا کی ہے لیکن اندرونی طالب علم جو سرِ فہرست ہو اس کا مقابلہ بیرونی طلبا کی فہرست کے آخری طالب علم سے کیا جائے تو یہ مقابلہ تشویش ناک ہوتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یونیورسٹی میں خاص طور پر اسکول اور گیارہویں بارہویں جماعت کی تعلیم کو بہتر بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا لیباریٹری، سازوسامان کلاس روم، مستقل اساتذہ کی تقرری، مستقل پرنسپل کی تقرری، اور تعلیم کے شیڈول پر سختی سے عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر داخلوں میں اعداد و شمار کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ذہین، ہوشیار مسلمان لڑکے مقابلہ کے امتحانوں میں زیادہ تعداد میں بیٹھ رہے ہیں اور کامیابی حاصل کر رہے ہیں اور ان کی تعداد دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا غور طلب بات یہ ہے کہ داخلے کے سلسلے میں مسلمان طلبا کو یہ احساس ہو کہ وہ اپنی محنت اور قابلیت سے داخلہ کرتے ہیں یا یہ کہ محنت

کی ضرورت نہیں اور داخلہ ریزرویشن کی بنا پر ہو جائے گا۔ میڈیکل کے امتحان
میں فی الحال کوئی ریزرویشن نہیں ہے لیکن اس میں باہر کے مسلمان طلبا و
طالبات کی اچھی خاصی تعداد کامیاب ہو رہی ہے۔ اور یہی صورت حال انجینئرنگ
اور دوسرے مقابلے کے امتحانوں کی ہے لہٰذا مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم ملک کے قابل
اور تیز مسلمان طلبا و طالبات کے لیے فکرمند ہوں یا کمزور طلبا کے لیے۔ اس
کے علاوہ یونیورسٹی کے دوسرے کورسیز ہیں جس میں انجینئرنگ بھی شامل ہے۔
وائس چانسلر کو یونیورسٹی نے اختیار دیا ہے کہ وہ ۲۰ فیصد (جو اب بڑھ کر ۲۵
فیصد ہو گیا ہے) طلبا کو جنھوں نے مقابلہ کے امتحانوں میں کامیابی حاصل کی ہے
نامزد کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ان سہولتوں کے باوجود اور اس نظریہ کے پیش نظر کہ قوم
کو بیساکھی سے چلانے کے بجائے محنت، قابلیت و قوت و بازو سے چلایا
جائے، کیا ریزرویشن کی ضرورت داخلوں میں باقی رہتی ہے؟ کیا داخلوں میں
ریزرویشن کی پالیسی کا اثر ملک میں مسلم طلبا کی ملازمت پر کوئی ناخوشگوار اثر
نہیں ڈالے گی۔ بانی یونیورسٹی نے ادارہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے خاص طور
پر قائم کیا لیکن انھوں نے کبھی ریزرویشن کا ذکر نہیں کیا۔

بیسویں صدی ختم ہونے کے قریب ہے یونیورسٹی اکیسویں صدی
میں جلد داخل ہوگی۔ سر سید مسلمانوں میں تعلیمی انقلاب لے آئے اور
اس میں کوئی شک نہیں کہ کامیاب ہوئے۔ وہ پودا جو سر سید نے انیسویں
صدی کے آخر میں لگایا تھا وہ بیسویں صدی میں ایک قد آور درخت
بن گیا اب اس درخت کی آبیاری کے لیے نئی کھاد کی ضرورت ہے۔
ایک نئے تعلیمی انقلاب کی ضرورت ہے وہ تعلیم جو ایک طرف سر سید کے
بنیادی مقاصد کو پوری کرتی ہو اور دوسری طرف اکیسویں صدی میں
سائنس اور ٹکنالوجی کا جو تعلیمی انقلاب آنے والا ہے اس سے یونیورسٹی
پوری طرح مقابلہ کرنے کو تیار ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ چند سالوں
میں یونیورسٹی میں بہت سے نئے کورسیز کا قیام وجود میں آیا ہے۔ جو طلبا و طالبات
کو معاش حاصل کرنے میں مددگار ہوگا بہت سے ایسے کورسیز کھولے گئے ہیں جن

کو پروفیشنل کورسیز کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کمپوٹر کے نئے نئے کورسیز کھل گئے ہیں انجینئرنگ کی فیکلٹی میں روایتی کورسیز کے ساتھ تقریباً چھ نئے کورسیز کا قیام وجود میں آیا ہے۔ مثلاً پٹرولیم، ماحولیاتی انجینئرنگ اور کمپوٹر انجینئرنگ ان کورسیز کا قیام قابلِ تحسین ہے۔

لیکن یہاں پر یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے طلبار اپنے اندر کس درجہ کی اہلیت پیدا کر رہے ہیں۔ ہم کو مقابلہ کی دوڑ میں ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا ہمیں اس نظریہ کو تیاگ دینا ہوگا کہ ہم کو کون لے گا؟ ہم کو ہمت اور اولوالعزمی سے کام لینا ہوگا۔ ہم کو مقابلہ کے امتحانوں میں پوری تیاری کے ساتھ بیٹھنا ہوگا، انٹرویو کی زبردست تیاری کرنی ہوگی اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہم اہلیت اور قابلیت اور کارکردگی میں دوسروں سے بہتر ہیں۔

اس موقع پر مجھے ذاکر صاحب کا وہ جملہ یاد آتا ہے جو انھوں نے جناب سیدنا طاہر سیف الدین کو یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے ۴۰ سال قبل خوش آمدید کہتے ہوئے کہا تھا "سیدالمحترم اب تک یونیورسٹی کا جو ذکر میں نے کیا تھا وہ اس کے ساز و سامان کا ذکر تھا، لیکن اس کی اصل روح تو اس کے اساتذہ اور طلبار ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں کے اساتذہ اور طلبار ملک کے بہترین اساتذہ اور طلبار میں ہیں جن کی سرداری آپ نے قبول فرمائی ہے۔"

ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا تعلیمی اور تہذیبی معیار پر ہم ذاکر صاحب کے قول پر پورے اتر رہے ہیں۔ اور اگر نہیں، تو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہمیں کیا قدم اٹھانا چاہیے۔

(بہ شکریہ: تہذیب الاخلاق، علیگڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء)

بیگم ساجدہ زبیر

ویمنز کالج کا سماجی پس منظر

علیگڑھ میں لڑکیوں کا مدرسہ کھلتے ہی پاپا میاں (شیخ محمد عبداللہ) پر مخالفتوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ یہ مدرسہ محلہ بالائے قلعہ کے ایک مکان میں قائم کیا گیا تھا جس کے مالک علیگڑھ کے شیخ صاحبزادگان میں سے ایک صاحب تھے یہاں چھوٹی بچیاں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے آتی تھیں پھر بھی ایک عورت لڑکیوں کو ڈولی میں لاتی۔ خود ساتھ ساتھ پیدل چلتی اور بچیوں کی نگرانی کرتی۔ یہ بچیاں بھی شیخ زادگان ہی کی تھیں۔ پھر ان میں سے اکثر صاحب طرح طرح کے شبہات اور الزام تراشیاں کرتے۔ شہر کے اکثر عمائدین لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف تھے۔ کچھ لوگ محض اس بنا پر مدرسہ کی مخالفت کرتے کہ وہ پاپا کو مخلص نہیں سمجھتے تھے اور ان کے کام کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کرتے اور ذاتی مخالفت کی بنا پر پاپا کی اس قومی خدمت کو سراہنا تو درکناران پر اعتراضات کرنے سے باز نہ آتے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ جو کام خلوصِ نیت اور محنت سے کیا جاتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ ضرور کامیابی عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ابتداء کے تمام حالات پاپا نے اپنی کتاب عبداللہ بیگم کی سوانح عمری میں لکھے ہیں۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اس وقت فقط ایک استانی صاحبہ کا انتظام ہو سکا تھا جو ناظرہ قرآن شریف اور
معمولی لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں۔ باقی ضروری نصاب، حساب، خوشخطی، سینا پرونا، دینیات
وغیرہ اعلیٰ بی اور ان کی دو بہنیں سکندر جہاں بیگم اور سعید جہاں بیگم کی نگرانی میں انجام پاتے۔
کچھ عرصہ بعد جب زمین کا سودا ہوا اور ۷ نومبر ۱۹۱۱ء کو اسکول کی عمارت
کا سنگِ بنیاد لیڈی پورٹر گورنر یوپی کی میم صاحب نے رکھا تو یہ چھوٹا سا اسکول
نئی عمارت کے تعمیر ہوتے ہی یہاں منتقل ہو گیا۔ یہ نئی عمارت بعد میں پرانی
طالبات کی درخواست پر وحیدیہ ہوسٹل کہلانے لگی۔ دوری کی وجہ سے
شیخ زادیوں نے تو پڑھنا ترک کر دیا مگر یونیورسٹی کے علاقے اور دیگر شہروں سے
کافی طالبات نے اس مدرسہ میں داخلہ لیا اور یہیں رہنا شروع کر دیا۔ وحیدیہ
ہوسٹل میں بورڈنگ ہاؤس بھی تھا اور کلاسیں بھی ہوتی تھیں۔ اساتذہ کی
رہائش بھی اسی عمارت کے ایک حصہ میں تھی اور اسی عمارت کے دو کمروں کو
اعلیٰ بی اپنے استعمال میں لاتیں۔ جو ذرا بڑا کمرہ تھا اس میں چاندنیوں کا فرش
ہوتا۔ جو بیگمات اعلیٰ بی سے ملنے، اسکول کے متعلق معلومات حاصل کرنے یا اپنی
لڑکی کے داخلہ کے لیے آتیں ان کو فرش و چاندنی کے کمرے میں بٹھایا جاتا۔ گویا
یہ کمرہ اعلیٰ بی کے دفتر کا کام دیتا تھا اور Reception روم بھی تھا۔ اکثر اوقات
ہماری سلائی کی کلاس بھی یہیں ہوتی۔ اعلیٰ بی یہیں کپڑوں کی کنز یونٹ بھی سکھاتی
تھیں۔ اعلیٰ بی کی تین بھانجیاں اور اپنی دو لڑکیاں ہوسٹل میں رہتی تھیں۔ وہ
اپنے مقررہ کمروں میں رہتیں اور اعلیٰ بی کے کمرے میں ضرورتاً ہی آتیں۔ قاعدے
قانون کی پابندی ان پر بھی ایسی ہی لاگو ہوتی جیسی کہ دیگر طالبات پر ہوتی تھی۔ چونکہ
اکثر لوگ ناواقفیت یا ذاتی پرخاش کی وجہ سے پاپا کی مخالفت کرتے اور طرح
طرح کی بے سر و پا باتیں اڑاتے اور شک و شبہات کرتے تھے اس لیے پاپا نے
اعلیٰ بی کو اجازت دے دی تھی کہ لڑکیوں کی رشتہ دار یا دیگر خواتین اسکول میں آئیں
اور وہ گھوم پھر کر اسکول دیکھنا چاہیں تو انھیں ضرور دکھا دیا جائے تاکہ رہائش
اور تعلیم کے متعلق انھیں اطمینان ہو جایا کرے۔ اس کا بڑا اچھا نتیجہ نکلا اور خود دیکھ کر
انھیں مدرسے کے متعلق تمام معلومات ہو گئیں اور پھر ان کے مردوں نے اعتراض

کرنا چھوڑ دیا۔

اس زمانے میں مسلمان خواتین میں پڑھی خواتین کی تعداد بہت کم تھی بمشکل تمام ایک عیسائی ہیڈ مسٹریس مس مکلف اور تین اور عیسائی استانیاں ملیں۔ ان اساتذہ کے اخلاق اور اسکول کے نظم و ضبط کو دیکھ کر بیگمات بہت متاثر ہوئیں۔ اعتماد قائم ہوا تو طالبات کی تعداد بڑھتی گئی اور مدرسہ ترقی کرتا گیا۔

مدرسہ کی شہرت ہوئی تو علیگڑھ کے رؤسا اور اکابرین کا اعتماد بھی حاصل ہوا اور اکثر نے اخلاقی اور مالی مدد بھی کی۔ وحیدیہ ہوسٹل کے پیچھے اسکول کی زمین سے متصل حاجی موسیٰ خاں صاحب شروانی کی زمین تھی جس میں ان کی کوٹھی بھی بنی ہوئی ہے۔ آج کل اس کوٹھی میں ان کے لڑکے شیث خان صاحب شروانی کا کنبہ رہتا ہے۔ حاجی موسیٰ خاں صاحب نے از راہِ عنایت اسکول کی عمارت کی تعمیر ہوتے وقت اپنی زمین پر سے راستہ دے دیا تھا تاکہ عمارت بنانے کا سامان وغیرہ لایا جا سکے۔ پاپا بتاتے تھے کہ جب حاجی صاحب خوش ہوتے تو سامان کی گاڑیاں آنے دیتے اور جب ناراض ہو جاتے تو سامان کی نکاسی روک دیتے۔ پھر پاپا خود حاجی صاحب کے پاس جا کر ان کی غلط فہمی دور کر دیتے اور حاجی صاحب سے پھر اجازت مل جاتی اور عمارتی کام چالو ہو جاتا۔

شیروانی خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج ایک حد تک تھا چنانچہ خود موسیٰ خاں صاحب کی صاحبزادی راحلہ خاتون شروانیہ خاصی پڑھی لکھی خاتون تھیں عربی اور فارسی پڑھی تھی، حدیث اور فقہ بھی پڑھا تھا۔ کراچی منتقل ہونے کے بعد ناظم آباد سرسید گرلز کالج کے قیام میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ نواب مزمل اللہ خاں صاحب خود اپنے علم و فضل کے لیے مشہور تھے اور مسلم یونیورسٹی کے چانسلر بھی رہے۔ ان کی بیٹی زاہدہ خاتون شروانیہ نہ صرف پڑھی لکھی خاتون تھیں بلکہ بڑی اچھی شاعرہ بھی تھیں۔ ان کا کلام ز۔خ۔ش کے نام سے اکثر رسالوں میں چھپتا رہا اور ان کی جواں عمری کی موت کے بعد دیوان کی صورت میں یکجا کر کے چھاپا بھی گیا۔

علاوہ ازیں جناب حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ بڑے علم نواز، حق شناس اور عالم بزرگ تھے ان کے صاحبزادے

عبید الرحمٰن خاں صاحب شیروانی اب بھی یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور مسلم یونیورسٹی اور ویمنز کالج کی ترقی کے دل سے خواہاں ہیں۔ اس خاندان نے ہمیشہ تعلیم نسواں کی حمایت کی اور پاپا کی ہمت افزائی فرمائی۔ حبیب الرحمٰن صاحب کی بیگم جو نفیس دلہن کے خطاب سے نواز دی گئی تھیں اکثر و بیشتر مدرسے میں تشریف لاتیں اعلیٰ بی سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ جس سال میرٹھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو میں بھی اعلیٰ بی کے ہمراہ شرکت کے لیے میرٹھ گئی۔ اس وقت مجھے نفیس دلہن صاحبہ سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ نفیس دلہن صاحبہ تعلیم نسواں کی حامی اور خیر خواہ تھی۔ ان کی دھیمی آواز میں شستہ گفتگو نے میرے دل پر بہت اثر کیا اور ان سے مل کر بہت لطف آیا۔

نواب احمد سعید خاں صاحب جو عام طور پر نواب صاحب چھتاری کہلاتے تھے خود پڑھے لکھے تھے اور دور بیں نظر رکھنے کی وجہ سے انھوں نے اپنی اولاد کو بھی تعلیم کے زیور سے مالا مال کیا۔ شروع میں تو ان کے یہاں بھی لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہ تھا مگر بعد میں ان کی چھوٹی لڑکی تزئین نے مدرسے میں داخلہ لیا اور تعلیم حاصل کی علاوہ ازیں ان کی کئی نواسیوں نے بھی مدرسے تعلیم حاصل کی۔ نوابی پر بھروسہ نہ کرکے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اس لیے ان کے بچوں نے بہت ترقی کی اور پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ عزت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ نواب صاحب پاپا کے بہت مدّاح تھے اور ممتاز جہاں حیدر گو نواب صاحب کی اولادوں سے عمر میں زیادہ بڑی تھیں مگر نواب صاحب ان سے بڑی عزت سے پیش آتے اور تعلیم نسواں کی ترویج و ترقی میں مددگار رہتے۔ خواجہ فیملی کی اکثر خواتین اسکول کے جلسوں اور پارٹیوں میں شرکت کرتیں خواجہ عبدالمجید بیرسٹر جو کانگریس سے سیاسی تعلقات رکھتے تھے پاپا کے دوستوں میں سے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے اسکول کے لیے کیا کام کیے مگر وہ پاپا کے مشن سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کی بیگم مجید سلطان اور خواجہ عبدالعلی (رجج) کی دو بڑی صاحبزادیاں اکبر سلطان اور حشمت سلطان پابندی سے اسکول کی تقاریب

میں شرکت کرتیں۔ ان کے خاندان کی تقریباً سب ہی لڑکیوں نے اس مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ اکبر سلطان کی چھوٹی لڑکی انور سلطان جو جمیلہ بیگم بھی کہلاتی تھیں اور اب مسز مجیب کہلاتی ہیں۔ علیگڑھ والوں کی ہر دلعزیز ہستی ہیں انھوں نے بھی اس ادارے سے بی اے پاس کیا۔ بعدازاں ٹریننگ کالج سے بی۔ ٹی کیا۔ خواجہ خاندان سے اعلیٰ بی کی کچھ دور پار کی رشتہ داری بھی ہوتی تھی مگر دوستانہ تعلقات رشتہ داری پر بھاری تھے۔ ان سب کا تعاون پاپا کو حاصل رہا۔

شہر، یونیورسٹی اور سول لائنز کی دیگر خواتین بھی اکثر اسکول آتیں اور سالانہ جلسے میں تو بہت ذوق و شوق سے شرکت کرتیں۔ ڈاکٹر عبداللہ بٹ صاحب کی بیگم نور منزل کی بیگم نورالحسن اور بچپن بابو کی بیگم سے اعلیٰ بی کے خاص تعلقات تھے ان سب کی لڑکیوں نے اس اسکول ہی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

بیگم صاحبہ بھوپال نے ابتدا ہی سے علیگڑھ کے اس مدرسے کی سرپرستی فرمائی چنانچہ جب کبھی بیگم صاحبہ علیگڑھ تشریف لاتیں اسکول میں ان کی آمد پر ایک تقریب کا اہتمام کیا جاتا۔ ریاست بھوپال کی جانب سے مدرسے کو مالی امداد بھی ملتی تھی اور بیگم صاحبہ خود تشریف لاکر ہمت افزائی فرماتیں اور مشوروں سے نوازتیں اس وقت تک مرد حضرات اسکول کے جلسوں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی تحریک آزادی کا آغاز ہوگیا تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں انگریزوں کو ملک سے نکال کر دیسی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت لوگوں میں بڑا جوش و خروش تھا اور ادھر ایم۔ اے۔ او کالج یونیورسٹی میں تبدیل ہوگیا ۱۹۲۰ء کے بعد سے سیاسی سرگرمیاں اور تیز ہوگئیں اور ہندو اور مسلمان خواتین نے بھی سیاست کے میدان میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ جگہ جگہ جلسے ہوتے۔ دھواں دھار تقریریں کی جاتیں۔ بدیسی سامان کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اور کھدر اور چپل پہننے کا رواج عام ہوگیا۔ ہمارا مدرسہ بھی اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اب جو زنانہ جلسے منعقد کیے جاتے ان میں اکثر وحیدیہ ہوسٹل کے ہال کمرے میں (یہ اب ڈائننگ ہال ہے) ہوتے یہاں ہم نے

علیگڑھ کی خواتین مثلاً نفیس دلہن صاحبہ مجید سلطان صاحبہ وائس چانسلر کی بیگم اور یونیورسٹی کے پروفیسرز اور لیکچرار صاحبان کی بیگمات کو دیکھا۔ علاوہ ازیں امام پور سے علی برادران کی والدہ بی اماں، عطیہ فیضی، اور ان کی ہمشیرہ حیدرآباد سے مسز سروجنی نائیڈو جو بلبلِ ہند کے نام سے مشہور تھیں۔ انھیں بولتے سنا اور دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے کانوں نے سیاست Non-cooperation سائمن کمیشن ہوم رول کانگریس اور بعد میں مسلم لیگ اور پاکستان کے نام سنے اور عملی حصہ لیا۔

۱۹۲۲ء ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے کہ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے علیگڑھ کے فعال لیڈر صاحبان کی مدد سے خواتین کا ایک جلسہ منعقد کیا اس میں امیر و غریب سب ہی عورتوں کو خطاب کیا۔ میں نے بھی چند دیگر لڑکیوں کے ساتھ اعلیٰ بی کی ہمراہی میں اس جلسے میں شرکت کی۔ شہر کے ایک محلے میں شامیانے لگا کر پنڈال بنا دیا گیا تھا۔ پنڈال میں مرد صاحبان تھے اور برابر کے خیمے میں عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ کئی ایک نے تقریریں کیں۔ مگر سب سے زیادہ ہم لوگ علی برادران کی جادو بیانی سے متاثر ہوئے۔ اخیر میں انھوں نے اپنے پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے مالی امداد کی اپیل کی۔ متعدد خواتین نے چندہ دیا۔ ایک عورت نے جو ہمارے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اٹھ کھڑی ہوئی اس نے اپنے کانوں کی بالیاں اتاریں اور ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھ مولانا شوکت علی کی طرف بڑھایا اور بولی میاں پیسہ تو ہم غریبوں کے پاس کہاں ہے۔ یہ میرے کانوں کی بالیاں ہیں انھیں بیچ کر چندے میں ملا دینا۔ اندر اور باہر سناٹا چھا گیا۔ مولانا نے اس کے ہاتھ سے بالیاں لے لیں اور سب نے واہ واہ کے نعرے لگائے۔

اس کے بعد پردے کے ساتھ یعنی برقعہ اوڑھ کر اسکول کی لڑکیوں کو یونیورسٹی کے سالانہ جلسوں یعنی مباحثوں، مشاعروں اور تقاریری مقابلوں میں شرکت کی اجازت ملنے لگی۔ آٹھ دس لڑکیوں کی ٹولی ایک یا دو استانیوں کی ہمراہی میں اسٹریچی ہال جاتی اور زینے سے اوپر گیلری میں جا کر بیٹھ جاتی گیلری سے نیچے ہال کی سب کارروائی بخوبی سنائی اور دکھائی دیتی تھی۔ چند لڑکوں کی

زینے پر ڈیوٹی لگتی تھی تاکہ وہ کسی لڑکے یا غیر متعلق شخص کو اوپر جانے سے روکیں ہمارے ساتھ دو ایک ملازم بھی ہوتے تھے جو نیچے رہ کر سواریوں کی نگرانی کرتے یہ جلسے تعلیمی حیثیت سے بڑے اہم ہوتے اور ان سے لڑکیوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ایک تو مشاعرے اور مباحثے کے انعقاد کے فائدے سیکھے۔ دوسرے شعراء کی زبانی جوان کا کلام یا مباحثے سنے تو خود حصے لینے کی خواہش پیدا ہوئی اور اپنے ادارے میں اساتذہ کی مدد سے ہم نے مباحثے سنے اور تقاریر کے مقابلے منعقد کیے جو سامعین اور حاضرین محفل نے بہت پسند کیے۔

قائد اعظم محمد علی جناح، مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، علامہ اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، حسن عطا شاہ اور بہت سے یادگار زمانہ لوگوں کو ہم نے یونیورسٹی کے جلسوں میں دیکھا تھا اور ان کے جواہر پارے سنے تھے۔ احسان دانش، شکیل بدایونی، مجاز، جگر مرادآبادی، بہزاد لکھنوی، قمر جلال آبادی کی نظمیں، غزلیں اور نعتیہ کلام بھی انھیں محفلوں میں سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔

اسکول میں پردے کی وجہ سے مقامی علماء، روٗسا یا کوئی اور مردانہ شخصیت نہیں آتی تھی حتیٰ کہ گورننگ باڈی کے ممبر بھی اسکول کالج یا بورڈنگ میں پردے کی پابندی کی وجہ سے نہیں آتے تھے یہاں تک کہ پاپا کو بھی اگر کسی ضروری کام کی وجہ سے عمارت کے اندر آنے کی ضرورت پڑی تو اعلان کیا جاتا اور لڑکیاں کمروں میں چلی جاتیں۔ تقسیم ملک کے بعد پردے کا رواج بہت کم ہوتا چلا گیا۔

پاپا کے تعلقات یونیورسٹی کے پروفیسر، وائس چانسلر اور دیگر عہداروں سے تھے۔ شہر کے عمائدین میں قادری صاحب جو پاپا کے دوست ہونے کے علاوہ ان کے ہم پیشہ بھی تھے اور میرس روڈ پر کرنل حیدر خاں صاحب کی کوٹھی سے متصل رہتے تھے اکثر ان کے پاس ملنے کو آیا کرتے۔ دیگر لوگ کاروباری یا ذاتی کام سے کوٹھی (عبداللہ لاج) آتے مگر اسکول میں کبھی کوئی نہیں آیا۔ ڈاکٹر موہن لال جنھوں نے آنکھوں کا اسپتال قائم کیا بہت مفید کام کر رہے تھے اور علیگڑھ کی ہر دلعزیز ہستی تھے۔ ہم نے ایک مدت تک

پاپا سے پردہ کیا۔ اگر کبھی پاپا کو ضرورتاً ہم سے کچھ کہنا ہوتا تو دروازے کی آڑ سے بلیک بورڈ کے پیچھے سے بات کرتے۔

یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر عملے والوں کی تقریباً سب ہی بیگمات سے تعلقات رہے کچھ تو اس وجہ سے کہ ان کی بچیاں اسکول آتی تھیں۔ میں اسٹاف پر آگئی تھی بچیوں کو پڑھانے کی وجہ سے ان کے خاندان کے مردوں سے بھی غائبانہ تعارف رہا۔ عظمت الٰہی زبیری، محمود حسن صاحب پروفیسر انگریزی، پروفیسر عبدالصمد صاحب سید الطاف علی بریلوی انچارج سرسید لائبریری، شاہجہاں منزل، ڈاکٹر عبداللہ بٹ میڈیکل آفیسر یونیورسٹی مختار حامد علی پروفیسر انگریزی۔ قاضی عزیزالدین بلگرامی ظہیرالدین علوی شعبۂ اُردو، ابواللیث صدیقی شعبۂ اردو، رشید احمد صدیقی صاحب شعبۂ اردو، حکیم عبداللطیف صاحب پرنسپل طبیہ کالج کے گھرانوں سے میری بڑی واقفیت تھی اور ان صاحبان کی بیگمات سے دوستانہ تعلقات قائم تھے اور ان کی بچیوں سے تو استاد اور شاگرد کا رشتہ پہلے ہی استوار ہو چکا تھا اب بھی جب کبھی اور جہاں کہیں یہ لڑکیاں ملتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اپنے خاص عزیز مل گئے ہوں۔ یہ بھی علیگڑھ کی تہذیب و تعلیم کا ایک نادر تحفہ ہے جو ہم سب نے گزشتہ پون صدی میں ترتیب دی اور پروان چڑھائی اور جو ہمارے "علیگ" ہونے کی شناخت ہے۔

(بشکریہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، ویمنز کالج میگزین)

جس قوم میں کہ پرانی رسوم ورواج کی پابندی ہوتی ہے یعنی ان رسموں پر نہ چلنے والا ملعون اور حقیر سمجھا جاتا ہے، وہاں زندگی کا منشا معدوم ہو جاتا ہے۔ (پروفیسر عتیق احمد صدیقی)

یہ خلد بریں ارمانوں کی

بشرہ عالیہ

شیخ عبداللہ جنہیں بر صغیر ہند و پاک کی لڑکیاں پاپا میاں کے نام سے یاد کرتی ہیں۔ ایک ایسی عظیم ہستی تھے جن کا نام رہتی دنیا تک روشن رہے گا۔ جو تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔ جنہوں نے ایک کارنامہ انجام دیا جس کی بدولت آج خواتین سماج میں سربلند کرکے جی رہی ہیں اور اپنی منزل کا خود تعین کر رہی ہیں۔ دنیا کے ہر گوشے میں بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کی صلاحیت اور حوصلہ رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ عظیم کام کرنے کے لئے پاپا میاں کو بہت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تب جاکر اس کی محنت اور ان کی کاوشیں رنگ لائیں۔

پاپا میاں نے ۱۹۰۴ء میں مسلم لڑکیوں کے لئے عبداللہ ہال کی بنیاد ایک چھوٹے سے مدرسے کی شکل میں ڈالی تھی جو اب بڑھ کر ویمنس کالج اور گرلز ہائی اسکول کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں کا ذہن اتنا بیدار نہیں ہوا تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم پر زور دیتے اس وقت عورتوں کی تعلیم محدود تھی لڑکیوں کا زیادہ پڑھنا خاص طور پر انگریزی تعلیم اچھی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس مشکل وقت میں پاپا میاں نے لڑکیوں کی پڑھائی کی طرف توجہ دی۔ شروع شروع میں لوگوں نے بے حد اعتراض کئے مسلم سماج کے بہت سے عناصر نے ان کی شدید مخالفت کی بے بنیاد الزام لگائے۔ لیکن ان مشکلوں کا سامنا شیخ عبداللہ اور ان کی اہلیہ نے ڈٹ کر کیا۔ تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ لڑکیوں کی تربیت کا کام بھی نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اور لڑکیوں کے لئے اقامت گاہ کو ضروری قرار دیا۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ ۲۰۰۰ء

دھیرے دھیرے جب لوگوں کے ذہن بیدار ہنے لگے تو لڑکیوں کی تعلیم پر بھی توجہ
دی جانے لگی۔ پاپا میاں کی کاوشیں رنگ لانے لگیں۔ ہوسٹل میں طالبات کی تعداد بھی بڑھتی
گئی اور ہوسٹل کی ضرورت پیش آئی۔ ایک چھوٹا سا مدرسہ دھیرے دھیرے کالج کی شکل اختیار
کر گیا۔ جہاں ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ آکر اپنی بچیوں کا داخلہ کروانے لگے۔
عبداللہ ویمنس کالج جس کی بنیاد ایک مدرسہ کی شکل میں رکھی گئی تھی۔ آج ایک کالج بلکہ یہ کہنا
غلط نہ ہوگا کہ مینی یونیورسٹی بن گیا ہے۔ جہاں ہر شعبے کی تعلیم دی جاتی تھی آج اس وقت
عبداللہ ہال میں پانچ ہوسٹل ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ **وحید جہاں ہوسٹل یا وحیدیہ** : اسکی سنگ بنیاد یوپی کے لفٹیننٹ
گورنر مسٹر پورٹر کی بیگم لیڈی پورٹر نے ۷ر نومبر ۱۹۱۱ء کو رکھا۔ اسکول کی عمارت
سے قبل ہوسٹل بننا شروع ہوا اور ۱۹۱۴ء میں اس بورڈنگ ہاؤس کی عمارت بن کر تیار
ہو گی اور اسی عمارت کے کچھ کمروں میں کلاسیں شروع ہو گئیں۔ اسکا افتتاح بیگم
بھوپال نے کیا تھا۔ اس ہوسٹل کا نام شیخ عبداللہ کی اہلیہ محترمہ اور عبداللہ کالج کی
بچیوں کی اعلیٰ بی کے نام پر "وحید جہاں ہوسٹل" رکھا گیا۔ جس میں اس وقت
تقریباً چھ سو لڑکیاں رہتی ہیں جو گیارہویں اور بارہویں جماعت کی طالبات ہیں
اس ہوسٹل میں ۱۹۹۱ء میں چند کمرے اور تعمیر کئے گئے جو آج نیو وحیدیہ کے نام سے
جانا جاتا ہے۔ پورے وحیدیہ ہوسٹل میں تقریباً ۶۳ کمرے ہیں نئے پرانے
ملاکر۔ پرانے چھ کمروں میں Back Rooms بھی ہے۔ ہر کمرے میں تقریباً
۷ یا ۸ لڑکیاں رہتی ہیں۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

. **سلطان جہاں ہوسٹل یا سلطانیہ :** اس کی بنیاد ۱۹۱۷ء میں رکھی گئی۔ اس کا نام بیگم بھوپال کے نام پر رکھا گیا۔ وہ تعلیم نسواں کی زبردست حامی تھیں۔ انہوں نے اس ہوسٹل کے لئے مالی امداد بھی عطا کی تھی۔ ان دنوں اس ہوسٹل میں اسکول کی بچیاں کلاس نرسری سے دسویں جماعت کی رہتی ہیں۔ جب کہ پاپا میاں کے زمانے میں تمام سینئر طالبات سلطان جہاں میں رہا کرتی تھیں۔

. **بی اماں ہوسٹل یا نیو ہوسٹل :** اس کی سنگ بنیاد ۱۹۵۶ء میں رکھی گئی۔ بی اماں علی برادران کی والدہ تھیں جن کے نام پر اس ہوسٹل کا نام رکھا گیا۔ اس میں کل ۵۱ کمرے ہیں ہر کمرے میں تقریباً ۵ لڑکیاں رہتی ہیں۔ یہ دو منزلہ عمارت ہے۔ سامنے ایک خوبصورت لان ہے۔ جہاں رنگ برنگے پھول کھلے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں شام کے وقت اس پر کیف نظارے سے لطف اٹھاتی ہیں۔

ا۔ **ممتاز جہاں ہوسٹل :** اسکی سنگ بنیاد ۱۹۷۸ء میں رکھی گئی۔ اس کا نام پاپا میاں کی بڑی صاحبزادی بیگم ممتاز جہاں کے نام پر رکھا گیا۔ پاپا میاں اور اعلیٰ بی کی طرح انہوں نے بھی اپنی تن من دھن سب کچھ ادارے کو پروان چڑھانے میں لگا دیا۔ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۷۰ء تک انہوں نے ویمنس کالج میں بحیثیت پرنسپل اپنے فرائض انجام دیے۔ چند سال پرووسٹ کا عہدہ سنبھالا۔ اپنی زندگی کی آخری عمر تک عبداللہ ہال کی ترقی و ترویج کے لئے کام کرتی رہیں۔ اس ہوسٹل میں تقریباً ۱۰۰ کمرے ہیں۔ ہر کمرہ Double Seater ہے۔ جس میں پوسٹ گریجویٹ (Post Graduate) کی طالبات رہتی ہیں۔ یہ ہوسٹل بھی دو منزلہ ہے۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۵۔ **عزیز النساء ہوسٹل :** اس کی بنیاد ۱۹۸۹ء میں رکھی گئی۔ بیگم عزیز النساء سر سید احمد خاں کی والدہ محترمہ تھیں۔ انہیں کے نام پر اس ہوسٹل کا نام رکھا گیا۔ وہ ایک جہاں دیدہ خاتون تھیں۔ اس ہوسٹل میں ۱۰۰ کمرے ہیں۔ بناوٹ کے لحاظ سے یہ سب سے خوبصورت ہوسٹل ہے۔ یہ بھی دو منزلہ ہے۔ اس میں تین Wings ہے۔ Middle wing کو چھوڑ کر سبھی کمروں میں ۴ لڑکیاں رہتی ہیں۔ صرف Middle کے کمروں میں دو دو لڑکیاں رہتی ہیں۔ اس میں بی۔ اے۔ (اول۔ دوم۔ سوم سال) کی طالبات رہتی ہیں۔ اس ہوسٹل کو (T W) ٹی۔ ڈبلو۔ ہوسٹل کہا جاتا ہے۔ یہ صرف دو سو لڑکیوں کیلئے بنایا گیا تھا۔ لیکن آج اس ہوسٹل میں تقریباً ۵۵۰ (ساڑھے پانچ سو) لڑکیاں رہتی ہیں۔

عبداللہ ہال کی مخصوص روایات :

عبداللہ ہال جو بے شمار خوبیوں کا مرکز ہے وہیں اس کی سب سے بڑی خاصیت یہاں کی تہذیب اور مخصوص روایات ہیں جو کسی دوسرے کالج میں نہیں ہیں۔ اور یہی مخصوص روایات اس کو دوسرے کالجوں سے منفرد بناتی ہے۔ عبداللہ ہال میں تقریباً ۸۰۰ طالبات قیام پذیر ہیں۔ جو ہندوستان کے کونے کونے سے ہی نہیں دنیا کے مختلف ممالک سے لڑکیاں آتی ہیں۔ اور علم کے خزانے سے مالا مال ہو کر رخصت ہوتیں اور اپنے ساتھ لے جاتی ہیں عبداللہ ہال سے جڑی بے شمار یادیں۔ ایسی یادیں جنہیں شاید کبھی فراموش نہ کیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سے ان کا ناطہ ہمیشہ جڑا ہوتا ہے۔ ان روایات میں سے اہم روایت تعارف ہے یعنی

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

Introduction۔

جب نئی طالبات داخلہ لیتی ہیں تو وہ اس ماحول سے بالکل ناواقف ہوتی ہے۔ ہر ایک چیز اس کے لئے نئی ہوتی ہے۔ اس اجنبیت کو دور کرنے کے لئے سینئر طالبات اپنے جونیرز کا انٹروڈکشن لیتی ہیں۔ جس میں کچھ مزاق کا بھی پہلو ہوتا ہے۔ طرح طرح سے انہیں چھیڑا جاتا ہے۔ ان سب باتوں کا مقصد محض ان کی جھجک دور کرلی ہوتی ہے۔ تاکہ وہ اس نئے ماحول میں خود کو اجنبی نہ محسوس کریں۔ اس دوران انہیں یہاں کے قوانین و ضوابط بھی بتائے جاتے ہیں۔ بڑوں کا ادب کرنا خواہ وہ بڑا ایک ادنیٰ سا ملازم ہی کیوں نہ ہو۔ سب کو سلام کرنا۔ تمام کام کرنے والے ملازموں کو بھائی کہہ کر پکارنا اور ملازمہ کو بوا یا بھابی۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جو بڑے چھوٹے اور امیر و غریب کا فرق مٹادیتی ہیں۔ اونچ، نیچ، ذات پات بھی کچھ مٹا کر ایک صف میں کھڑا ہونا ہمیں یہاں آکر سیکھنے کو ملتا ہے۔ انٹروڈکشن کا سلسلہ کچھ دنوں تک چلتا ہے۔ اس دوران جونیئر پر کچھ پابندیاں بھی عاید کی جاتی ہیں۔ جیسے سر سے دوپٹہ اوڑھنا، بالوں میں تیل لگانا، آنکھوں میں کاجل، نظریں نیچی رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ Saturday Night (سنیچر کی رات) نئے طالبات پر بہت گراں گزرتی ہے کیونکہ سنیچر کی رات انٹروڈکشن کیلئے مخصوص رات ہے۔ اس کے بعد ان کو Fresher's Party دی جاتی ہے۔ یہ دن جونیرز کے لئے انتہائی خوشیوں کا دن ہوتا ہے۔ ہر ایک کا چہرہ خوشیوں سے تمتماتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے ہی جیسے کسی کو آزادی کا پروانہ مل جاتا ہے۔ Fresher's Party کے دن نئی لڑکیاں خوب زرق برق لباس زیب تن کرتی ہیں۔ کوئی ساڑی، کوئی لہنگا تو کوئی خوبصورت شلوار جمپر، چہرے پر خوبصورت میک اپ ان کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آسماں سے اپسرائیں زمین پر سیر کو آئی ہوں۔ چاروں طرف ایک سحر انگیز سماں جو دلوں پر نقش کر جاتا ہے۔ اس پارٹی میں جونیر اور سینئر مختلف قسم کے پروگرام اسٹیج پر کرتے ہیں۔ پروگرام

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ے اختتام پر Miss Fresher کا انتخاب ہوتا ہے۔ دستور کے مطابق پچھلے سال کی فریشر نئی کو تاج پہناتی ہیں۔ ان میں Ist Runner up اور 2nd Runner up کے بھی چنیں جاتی ہیں۔

Farewell Party -

اب سینئرز الوداع کہنے کا وقت آتا ہے اور جونیئرز نے اپنی سینئر کی شان میں ایک خوبصورت تقریب کا اہتمام کرتے ہیں۔ تاکہ وہ یہاں سے جانے کے بعد اپنے ساتھ خوبصورت یادیں لے جائیں۔ جونیئرز کے علاوہ ٹیچرز بھی ان کو الوداعی پارٹی دیتی ہیں۔ یہ ایک ایسی روایت ہے جس ڈور میں انسان ہمیشہ کیلئے بندھ جاتا ہے۔ یہاں کی یادیں یہاں کی باتیں۔ ہمیشہ کیلئے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے آپ کو اس ماحول سے کبھی جدا نہیں کرپاتی۔ یہاں سے بڑھ کر جانے والی طالبات ہندوستان کے کونے کونے میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں موجود ہیں۔

رمضان المبارک میں تراویح کا سماں :

رمضان المبارک کے مہینہ میں عبداللہ ہال میں تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جہاں پورے ہال کی لڑکیاں باجماعت نماز تراویح ادا کرتی ہیں۔ پر کیف اور نورانی سماں ہمارے دلوں کو ایمان کے نور سے منور کر دیتا ہے۔ ہر ایک لڑکی جوش و خروش کے ساتھ تراویح کی نماز ادا کرتی ہے۔ اس بابرکت مہینہ میں ہر دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرے۔

اجتماعی افطار پارٹی :

عبداللہ ہال میں اجتماعی افطار پارٹی کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ جن میں جناب وائس

چانسلر صاحب، محترمہ پرنسپل صاحبہ یونیورسٹی کے دیگر مہمان، ٹیچرز اور تمام طالبات ایک ساتھ بیٹھ کر افطار کرتے ہیں۔ ایسا خوبصورت منظر شاید کہیں اور دیکھنے کو نہ ملے جو اس وقت یہاں ہوتا ہے۔

یوم بانیان Founder's Day ۔ یہ خاص دن ۲ر فروری کو منایا جاتا ہے۔ اس دن ایک خوبصورت پروگرام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس میں کسی بڑی ہستی کو مدعو کیا جاتا ہے۔ محترمہ پرنسپل صاحبہ کالج کی سالانہ رپورٹ پیش کرتی ہیں۔ عبداللہ ہال کی ہونہار طالبات کو اعزاز سے نوازتی ہیں۔ جس میں ایک Best Girl کا Award ہوتا ہے اس کے علاوہ مختلف قسم کے Award سے لڑکیوں کو نوازا جاتا ہے۔ عبداللہ ہال میں ایک اجتماعی لنچ کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں دیگر یونیورسٹی کے مہمانوں کے ساتھ ہوسٹل کی تمام لڑکیاں کھیل کے میدان میں ایک بڑے پنڈال میں کھانا کھاتی ہیں۔ اس لنچ میں ہال کا ٹیچنگ نان ٹیچنگ اور کیمپس کا تمام اسٹاف مدعو ہوتا ہے۔

ہال ویک : اس ادارہ میں ایسی طالبات رہتی ہیں جنہیں خود پتہ نہیں کہ وہ کتنی خوبیوں کی مالک ہیں۔ یہاں ہونے والے ہال ویک میں جن میں یونیورسٹی کا تمام ہال شریک ہوتا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں مل کر اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ہوسٹل ویک : اس طرح ہوسٹل ویک ہوتا ہے۔ ہال کے تمام ہوسٹل مل کر ایک خصوصی ہفتہ منانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس میں لڑکیاں مختلف پرگراموں میں حصہ لیتی ہیں۔ پورے ہفتہ مختلف قسم کے کلچرل پروگرام ہوتے ہیں۔

ہال فنکشن : یہ ہال کا سب سے بڑا فنکشن ہے جس میں بچیوں کو ان کی پورے سال کی کارکردگی پر انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ہال کے تمام بھائیوں (ملازمین) کو انعامات دے

جاتے ہیں۔ یونیورسٹی کی اہم ہستیاں اس موقع پر مدعوں کی جاتی ہیں۔ زرق برق لباسوں میں لڑکیاں ایک وسیع، عریض روشن پنڈال میں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس دن کی سجاوٹ دیکھتے بنتی ہے۔

اسٹوڈنٹس یونین کا الیکشن : یہاں کی روایات میں ایک روایت اسٹوڈنٹس یومین کا الیکشن بھی ہے جن میں لڑکیاں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتی ہیں۔ پریسیڈنٹ ،وائس پریسیڈنٹ، سکریٹری، جوائنٹ سکریٹری، ٹریزرار اور کیبینیٹ کے ممبران کے عہدے کے لئے چناؤ ہوتا ہے۔ جگہ جگہ پوسٹر، کینوسنگ ہوتی ہے۔ دیر رات تک نعرے لگائے جاتے ہیں۔

عبداللہ ہال میں NCC کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ تائکنڈو بھی سکھایا جاتا ہے۔ ہر طرح کے کھیل کود کی مشق کرائی جاتی ہے تاکہ یہاں کی لڑکیاں ہر فن مولا ہو جائیں۔ زندگی کے کسی بھی میدان میں پیچھے نہ رہیں۔

پاپا میاں نے اس عظیم ادارے کی بنیاد رکھ کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا۔ ان کے بعد اس ادارے کی ترقی میں یہاں کی تمام پرنسپلوں اور پروفیسروں نے اپنی ذمہ داریاں بڑی حسن و خوبی سے نبھائی ہیں۔

بشکریہ ویمنس کالج میگزین - ۱۹۹۹ - ۲۰۰۰
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ۔

"... غالباً وہ (سرسید) دورِ جدید کے پہلے مسلمان ہیں جس نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کی ایک جھلک دیکھ لی.....
لیکن ان کی حقیقی عظمت اس میں ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی ہیں جس نے اسلام کی نئی تعبیر کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کے لئے سعی کی....."

علامہ اقبال

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

تدوین: طاہرہ حسین

ترانۂ علیگڑھ

ایک شاعر اور ایک کمپوزر کا بے مثال تحفہ

یہ اس زمانے کی بات ہے جب علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا کوئی ترانہ ہی نہ تھا بلکہ تقسیم سے قبل کسی ترانے کا وجود نہ تھا۔ مسلم یونیورسٹی کی ہاکی ٹیم جب انگلستان میچ کھیلنے گئی تو حسبِ روایت وہ میچ جیت گئی۔ کھیل کے اختتام پر جب ٹورنامنٹ میں حصّہ لینے والی ٹیمیں اپنے اپنے ملک کا ترانہ پڑھ رہی تھیں اور علیگڑھ کے طلبا خاموش کھڑے تھے تو ایک طالب علم مسعود نامی آگے بڑھے اور اپنے ساتھ چند طلبا کو لے کر بڑی لگن سے گانے لگے۔

میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا
یا کے پیٹ کا بچہ مر جاتا
ترے باپ کے سالے کیا جاتا

جب لڑکوں نے بہترین ادائیگی کے ساتھ یہ بول ترانے کی طرز پر جھوم جھوم کر گائے تو اردو سے نابلد افراد بھی مسحور ہو گئے اور علیگڑھ کے طلبا انعام کے حقدار قرار پائے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے دورِ وائس چانسلری میں علیگڑھ میں ایک نئی اور حسین بے مثال اور قابلِ فخر تہذیبی روایت کی داغ بیل پڑی یعنی ترانۂ علیگڑھ کی تخلیق، اس تہذیبی روایت کے داغ بیل ڈالنے کا سہرا بھی مادرِ درسگاہ کے ایک اور سپوت اشتیاق محمد خاں کے سر ہے جو اس ترانے کی مسحور کن اور ولولہ انگیز موسیقی

کے خالق ہیں۔

اشتیاق محمد خاں قائم گنج کے رہنے والے ہیں جو پٹھانوں کی بستی ہے ہائی اسکول کے بعد وہ علیگڑھ آ گئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی سرپرستی میں یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۶۱ء میں بمبئی منتقل ہو گئے۔

ترانے کی دھن کی شان نزول بتاتے ہوئے اشتیاق صاحب نے کہا کہ ترانے کی دھن میں نے سوچ نہیں بنائی بلکہ اس کے محرک اسرارالحق مجاز ہیں جنھوں نے نذر علیگڑھ اپنے دور طالب علمی یعنی ۱۹۳۶ء میں لکھی تھی۔ اس ترانہ کی دھن بنانے کے پس پردہ ایک خاص مقصد تھا۔

۱۹۵۴ء میں اشتیاق محمد خاں بی ایڈ کے طالب علم تھے اور وی ایم ہال کے نصراللہ ہاسٹل میں رہتے تھے۔ فائنل ایئر کے الوداعی جلسے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی تقریر نے انھیں بہت متاثر کیا اور دراصل ذاکر صاحب کی تقریر ہی دھن بنانے کی محرک بنی۔

اشتیاق صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ذاکر صاحب نے فرمایا تھا کہ اس درسگاہ کے آپ پر بہت احسانات ہیں۔ اگر آپ زندگی بھر ان کو چکانا چاہیں تب بھی چکا نہیں سکیں گے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ جاتے جاتے ایک چھوٹا سا پودا اپنے ہاتھ سے لگا جائیں۔ یونیورسٹی اس کی دیکھ بھال کرے گی اور جب بھی آپ دس پندرہ سال بعد یہاں آئیں گے تو اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے اس پودے کو ایک تناور درخت کی شکل میں دیکھیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔ اور یہ ایک طرح آپ کا مادر درسگاہ پر احسان ہوگا۔ ذاکر صاحب کے ان الفاظ نے ان کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا اور وہ سوچنے لگے کہ یونیورسٹی کو الوداع کہنے سے پہلے آخر میں کیا دے سکتا ہوں، کوئی ایسی چیز جو یادگار رہے۔ ایک دم خیال آیا کہ مجاز کی نظم کی ایک اچھی دھن بن جائے تو یہ یونیورسٹی کا ترانہ ضرور بن جائے گی اور بالآخر بی ایڈ کے امتحان سے پہلے ہی دھن بنا ڈالی۔ شروع میں ترانے کی دھن ہارمونیم پر ڈاکٹر مقبول احمد کے گھر پر بیٹھ کر تیار کی تھی۔

دھن بنانے کے بعد اکتوبر کے ماہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے پاس گئے کیونکہ ہر سال

اکتوبر کی ۱۷ تاریخ کو یوم سرسید منایا جاتا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مجازؔ کی یہ نظم میں سرسید ڈے پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے مشورہ دیا کہ بہتر ہوگا کہ آپ پہلے اسے کسی یونین کے جلسہ میں پیش کریں یونین کے اس وقت کے صدر احمد سعید عرف عام انڈا تھے۔

مگر اشتیاق محمد خاں کی چونکہ ذاکر صاحب کی تائید حاصل تھی اس لیے اس نظم کو سرسید ڈے کے جلسے میں پیش کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح اسرار الحق مجازؔ کی یہ معرکۃ الآرا نظم ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو اسٹریچی ہال میں پیش کی گئی آج سے ۴۴ سال پہلے جب ترانے کا آخری بند برسے گا.... برسے گا... برسے گا ہو رہا تھا تو تمام ہال پر ایک سرشاری کا عالم طاری تھا اسٹریچی ہال میں بیٹھے ہوئے اساتذہ، طلبا، طالبات اور ہزاروں افراد پر مشتمل مجمع صدائے تحسین کے لیے کھڑے ہو گیا۔ دیر تک اسٹریچی ہال ونس مور ونس مور کی صداؤں سے گونجتا رہا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین بے ساختہ اشتیاق کے پاس آئے پشت تھپتھپائی اور کہا کہ مادر درسگاہ کو تم نے آج بہترین تحفہ دیا ہے جو نا قابلِ فراموش ہے اور قابلِ فخر بھی ہے۔ اس ترانے کے صحیح معنوں میں ستائش اور تعریف کے اگر حقدار ہیں تو وہ ہیں اسرار الحق مجازؔ۔ مجازؔ نے ترانے کی عمارت تعمیر کی اور اشتیاق محمد نے اس عمارت کو بیل بوٹوں سے سجا دیا۔ اس وقت مجازؔ حیات تھے مگر المیہ یہ تھا کہ وہ اپنی زندگی میں ترانہ نہیں سن سکے۔ اگر چہ ان کو خبر مل گئی تھی۔ اور ۱۹۵۵ء کے اسٹوڈنٹس یونین لکھنؤ کے مشاعرے میں انھوں نے آل احمد سرور سے کہا تھا کہ وہ علیگڑھ آرہے ہیں اور ترانہ ضرور سنیں گے۔ مگر وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کے مصداق موت نے انھیں مشاعرے سے دو دن قبل ہی اٹھا لیا اور اس طرح وہ ترانہ نہ سن سکے اور یونین کے اس یادگار مشاعرے کا افتتاح اسی ترانے سے ہوا تھا۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان و پاکستان ہی کی نہیں ایشیا کی وہ درسگاہ ہے جس کی تہذیبی تاریخ نے ایک عالم کو متاثر کیا ہے، اس اثر کو قوت و توانائی بخشی ہے، اس کے خصوصی نشانِ امتیاز ترانہ درسگاہ نے۔ یہ ترانہ اپنی مثال آپ

ہے۔ یونیورسٹی کے طلبا و طالبات کے لیے سرمایۂ جاں اور متاعِ افتخار ہے۔ یہ ترانہ روشنی کا ایسا ہالہ ہے جس کے حصار میں زندگی سجانے اور سنوارنے کے ساتھ ملک و قوم کی تعمیر کے خواب بھی پوشیدہ ہیں۔ ترانے کی موسیقی میں بھی اتنی ہی کشش جاذبیت اور جاں نواز مہک ہے کہ اس کی دھن پر اپنے ہی نہیں بیگانے بھی سر دھننے لگے ہیں۔ ترانے کی موسیقی و الفاظ ہم آہنگ ہو کر نرم روندی کی طرح دھیمے دھیمے آگے بڑھتی ہے اور کڑکتے گرجتے بادلوں کی گھن گرج کے ساتھ کلائمکس پر پہنچ کر بجلی کی مانند دلوں پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ جسم کی حدت و حرارت اور دلوں کی دھڑکن کو تیز تر کر دیتی ہے، روح کو نیا جوش، نیا ولولہ اور نئی تازگی عطا کرتی ہے۔ موسیقی کا سحر ہو تو ایسا ہو، اس ترانے کو جاوداں بنانے کا سہرا مادرِ درسگاہ کے دو سپوتوں کے سر ہے یعنی مجازؔ اور اشتیاق۔ جب تک صفحۂ ہستی پر ایک بھی علیگ موجود رہے گا ترانہ علیگڑھ اسی طرح تر و تازہ رہے گا۔

(ماخوذ، علیگڑھ الومنی ایسوسی ایشن، نیویارک ٹرائی اسٹیٹ۔ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۹۹ء)

"آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ یہ کالج صرف طالبعلموں اور اسٹوڈنٹس کو ترقی دلاتا ہے بلکہ وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کی علمی و روحانی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اگر وہ طالبعلموں کو بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں دیتا ہے تو پروفیسروں اور ماسٹروں کو شمس العلماء کر سکتا ہے۔"

(علامہ شبلی)

(کمانڈر) ایس۔ این۔ اے فردوسی

اسٹوڈنٹس یونین

تعلیم اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس کے پہلو بہ پہلو تربیت کا نظام بھی قائم نہ ہو۔ دراصل اسی تربیت سے تعلیم کو جلا ملتی ہے مختلف اداروں میں ایک ہی نصابِ تعلیم کے باوجود وہاں سے فارغ طلبا کا نمایاں فرق صرف تربیت کے باعث ہی ممکن ہوپاتا ہے۔

اس نمایاں فرق کا تجزیہ ذاتی طور پر کرنے کے لیے سر سید نے اس زمانے میں لندن کا سفر اختیار کیا اور آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے طرزِ تعلیم اور تربیت کے طریقوں کا بغور مطالعہ کیا۔ اور پھر وہیں اپنے ذہن میں ایک ایسے مدرستہ العلوم (بلکہ روزِ اول سے ہی دارالعلوم) کا خاکہ تیار کیا جس سے طلبا نہ صرف اپنی کلاسوں میں محدود رہیں گے بلکہ ان کے چوبیسوں گھنٹوں کی زندگی ان کی اقامت گاہوں سے منسلک ہوگی جہاں کلاسوں میں پڑھانے کے لیے ماہر اور ڈسپلن کے پابند اساتذہ ہوں گے۔ ہوسٹلوں کا نظم بھی باقاعدہ ہوگا اور ان سب کے پردے میں طلبا کی شخصیت سازی کا مقصد اولین ہوگا۔ طلبا اپنی کلاسوں میں، ڈائننگ ہال میں، مسجد میں حتیٰ کہ جلسوں اور بازاروں میں بھی اپنی یونی فارم میں ہوں گے۔ کھیل کے وقت کھیل کی پوشاک ہوگی

ماہنامہ فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اور اس کے بعد ہوٹلوں میں بھی مناسب لباس پہنیں گے۔

اس طرزِ زندگی سے بیک وقت کئی چیزیں حاصل ہوتی ہیں ایک طرف تو اس کی زندگی با سلیقہ ہو جاتی ہے تو دوسری طرف سماج میں رہنے اور اٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ بھی آجاتا ہے۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور خصوصاً عمر کے اس حصے میں جس میں جولانی طبع ۶ درج پر ہوتی ہے، اگر اس کو کسی اچھے سانچے میں ڈھال دیا جائے تو پھر یہی ٹکسال سے نکلا کر سکہ بن جاتا ہے۔

سرسید نے یہ قدم اس وقت اٹھایا جب کہ حکومت اپنے ہاتھوں سے چھن چکی تھی، غیر ملکی رفتہ رفتہ ہم پر قابض ہو گیا تھا۔ قوم میں اور خصوصاً مسلمانوں میں ایک ذہنی پستی کا بحران تھا، پست ہمتی کا دور دورہ تھا۔ بے جا عادتوں اور فضول خرچیوں نے غلامی کے شکنجے میں اور بھی بری طرح کس دیا تھا۔ مگر شاید وہ بے لوث مصلح قوم اور دوربین راہنما یہ دیکھ رہا تھا کہ انگریز کی اس بالادستی اور غلامی کا یہ جال کبھی نہ کبھی ضرور ختم ہو گا۔ ضرورت صرف استقلال، ہمت اور محنت کی ہے۔ حالانکہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں یہ کسی مجنوں کی بڑ سے زیادہ سمجھ میں آنے والی بات نہ تھی کہ ہمارا ملک پھر آزاد ہو جائے گا اور ہمارے ملک کا انتظام و انصرام ہمارے اپنے ہاتھوں میں دوبارہ آجائے گا اور پھر اس وقت ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہوگی جو نہ صرف تعلیم یافتہ ہوں بلکہ دیگر انتظامی صلاحیتوں سے بھی آراستہ ہوں۔

کوئی بھی تجربے کار اور با صلاحیت شخص ایک دن میں پیدا نہیں ہو جاتا اس کے لیے برسوں محنت کرنی ہوتی ہے۔ سرسید نے اپنے انگلینڈ کے قیام کے دوران یہ دیکھا تھا کہ طلبار کی شخصیت سازی کے لیے کیمبرج اور آکسفورڈ میں جہاں اور انتظامات تھے وہیں ان کی تقریری اور تحریری صلاحیتوں کو جلا دینے کے لیے ڈیبٹنگ کلب بھی موجود تھے جن میں طلبار انتہائی سلیقہ سے بحث و مباحثہ میں پارلیمانی انداز سے حصہ لیتے اور ہر موضوع پر اپنا اظہار خیال کرتے۔

چنانچہ وہاں سے واپسی پر سرسید نے ۱۸۸۴ء میں تھیوڈور بیک کی مدد سے ایک ڈیبٹنگ کلب قائم کیا۔ ایک کلب اسکول کے طلبار کے لیے تھا اور دوسرا کالج کے طلبار کے لیے بقول حالی:

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اسکول کے لیے، اسکول یونین کلب، اور کالج کے لیے، کالج یونین کلب، تھا جہاں کالج اور اسکول کے طلبا ہفتہ میں ایک روز مختلف مضامین پر اپنے اپنے صدر انجمن کے روبرو انگریزی یا اردو میں معارضانہ بحث کرتے تھے مگر کوئی بات آداب مناظرہ اور تہذیب کے خلاف زبان پر نہیں لا سکتے تھے۔ جو لڑکے ڈیبیٹ یا اسپیکنگ میں عمدہ لیاقت ظاہر کرتے ان کو انعام دیئے جاتے۔ (حیات جاوید)

۱۸۸۴ء میں اس کا نام سڈنی یونین کلب رکھا گیا اور اس کے پہلے صدر مسٹر ہنری جارج آپسے سڈن ہوئے۔ طلبا میں منتخب نمائندے سجاد حسین (نائب صدر) سید محمد علی (اعزازی سکریٹری) اور دس ممبران کابینہ پر مشتمل یہ یونین قائم ہوئی جس کا اصل مقصد اچھے مقرر اور سمجھدار لیڈر پیدا کرنا تھا چنانچہ ہم نے دیکھا کہ اس یونین نے کیسے کیسے جادو بیان مقرر اور ذہین قائدین برصغیر ہند و پاک کے علاوہ ساری دنیا کو دیئے جن کی فہرست بہت لمبی ہے۔

۲۴ فروری ۱۹۰۵ء کو آنریبل تھیوڈور ماریسن نے جو بیک کے انتقال کے بعد یہاں پرنسپل مقرر ہوئے تھے "سڈنی یونین ڈبیٹنگ ہال" کا سنگ بنیاد رکھا (جس کا کتبہ آج بھی سنگ مرمر پر کندہ شدہ عمارت میں موجود ہے) یہ وہی خوبصورت سی عمارت ہے جس میں آج بھی اسٹوڈنٹس یونین قائم ہے۔ مسٹر ماریسن بھی ۵ سال تک اس کے صدر رہے اور اس کی ترقی کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہے۔

یونین کی کابینہ میں ۱۹۰۲ء سے اعزازی لائبریرین کے ایک اور عہدے کا اضافہ کر دیا گیا۔ چنانچہ مسٹر نواب علی اس یونین کے پہلے لائبریرین منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں جب یہ ادارہ ایک خود مختار یونیورسٹی میں تبدیل ہوا تو اس یونین کا نام سڈنی کلب سے بدل کر "مسلم یونیورسٹی یونین" کر دیا گیا۔ اس سال اس کے نائب صدر سید نور اللہ تھے (جو ذاکر صاحب کے ساتھ یہاں پی۔ وی سی ہوئے) اعزازی سکریٹری محمد اسلم احمد اور اعزازی لائبریرین شیخ احمد بخش منتخب ہوئے تھے۔

اس یونین کی تاریخ میں ۱۹۵۲ء کا سال اہم تھا جب کہ اس کا نام

"مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین" کردیا گیا۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں اس کا ایک نیا دستور مرتب کیا گیا جس کی رو سے وائس چانسلر کا عہدہ بجائے صدر یونین کے مربی یونین کردیا گیا اور منتخب نمائندہ بجائے نائب صدر کے اب 'صدر' ہوگیا اس سال صدر محمد احمد سعید، سکریٹری انور علی خاں سوز اور لائبریرین ایس سمیع الدین احمد تھے۔

۵۴-۱۹۵۳ء میں پہلی بار ایک خاتون مس زہرہ نقوی۔ جو ایم۔ ایس سی (فزکس) کے فائنل ایئر کی طالبہ تھیں۔ بحیثیت سینئر کیبنٹ کے منتخب ہوئیں۔ یہ بھی ایک دلچسپ امر ہے کہ دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ درس گاہوں یعنی کیمبرج اور آکسفورڈ میں بھی سن ۱۹۵۴ء تک خواتین یونین کے انتخابات میں کھڑا ہونا تو کجا، ووٹ تک نہیں دیتی تھیں (اس بات کی تصدیق سلطان نیازی نے جن کا انتخاب مرکزی وزارت تعلیم نے کیا تھا اور ایک ہندوستانی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے انگلینڈ، آئرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کی یونیورسٹیوں کی ڈبیٹس میں شرکت کے لیے بھیجا تھا۔ وہاں جاکر تصدیق کی اور راقم الحروف کو وہاں سے مطلع کیا) دراصل وزارت تعلیم کا ایک سرکلر ذاکر صاحب مرحوم (وائس چانسلر) کے پاس آیا جس میں یہ گزارش کی گئی تھی کہ اس ادارے سے چار نام تجویز کیے جائیں تاکہ وہ کل ہند تقریری مقابلوں میں حصہ لے سکیں جن کی بنا پر ان کا انتخاب کیا جاسکے۔ ذاکر صاحب نے وہ سرکلر یونین کو بھیج دیا کہ یونین چار ناموں کی سفارش کرسکے۔ راقم الحروف بھی اس سال یونین کا ایک ادنیٰ خادم تھا۔ ہم نے اپنا (یونین کا) ریکارڈ دیکھ کر قطعی میرٹ کی بنا پر صرف سلطان نیازی کے نام کی سفارش کی۔ حالانکہ کئی لوگ سلطان نیازی کے سیاسی عقائد سے اختلاف بھی رکھتے تھے مگر ان کے انتخاب کے وقت یہ بات بالکل آڑے نہ آئی۔ صرف ایک نام کی سفارش پر ذاکر صاحب کو قدرے تعجب بھی ہوا مگر ہم نے ذاکر صاحب کو یقین دلایا کہ انشاء اللہ ہمارا تنہا نمائندہ ہی سب پر بھاری ہوگا۔ اور وہی ہوا۔ سات ججوں میں سے چھ نے سلطان نیازی کو اول قرار دیا اور ساتویں نے بھی سلطان نیازی کو مشترکہ اول گردانا۔ اور پھر اتنا ہی نہیں جب یہ وفد انگلینڈ پہنچا تو سلطان نیازی

ـــ ماہنامہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نے ۶۳ء مقابلوں میں حصّہ لیا اور ۶۲ میں انھیں اوّل قرار دیا گیا۔

اس طرح کا انتخاب کرنا ہمارے لیے اس لیے ممکن تھا کہ اس وقت تک سرسیّد علیہ الرحمہ کی قائم کردہ روایت کے مطابق ہر ہفتہ یونین میں بحث، تقریریں ہوتیں جن میں پہلے اور تیسرے ہفتے میں انگریزی اور دوسرے اور چوتھے ہفتے میں اردو میں ہوتی۔ مہینہ میں ایک آدھ ڈیبیٹ ایکس ٹیمپور ہوتی اور تین ماہ میں ایک بار ڈبل ایکس ٹیمپور ہوتی (یعنی بحث کا موضوع صرف پانچ منٹ قبل بتایا جاتا اور پھر جب مقرر ڈائس پر جاتا تو ایک پرچہ اور نکالتا۔ اگر اس میں موضوع کے حق میں For ہوتا تو وہ حق میں بولتا اور اگر مخالفت میں Against ہوتا تو مخالفت میں بولتا) اور ظاہر ہے اس طرح کے مقابلوں میں کافی تجربہ کار مقرر ہی حصّہ لیتے، مگر ہر بار ان کی خود اعتمادی میں اور اضافہ ہوتا۔ ان ڈیبیٹس کا انعقاد یونین کابینہ کا ایک ممبر (جو اسپیکرز اینڈ رائٹرز کلب کا انچارج ہوتا) صدر یونین کے مشورے سے کرتا اور سال بھر کا رکارڈ بڑی پابندی سے رکھتا۔ یہی وجہ تھی کہ اچھے مقررین کی انتخاب میں ہمیں کوئی دشواری نہ ہوتی۔ ہر ڈیبیٹ کو جیتنے والوں کے سرٹیفکٹ تیار کر لیے جاتے جو یونین کے سالانہ جلسہ میں بذریعہ مربّی (وائس چانسلر) تقسیم کیئے جاتے۔

اس کے علاوہ یونین کے پاس کئی انعامات اور طلائی طمغے بھی تھے جو کامیاب مقررین کو دیئے جاتے مگر ان سب کے لیے باقاعدہ ضوابط تھے کہ وہ انعامات کیسے دیئے جائیں گے۔ ان سب کے لیے یہ بات ضروری تھی کہ ہر مقرر کی تقریروں میں شرکت، اندرون یونیورسٹی و بیرون یونیورسٹی مقابلوں میں شرکت اور حصولِ انعامات کا پورا ریکارڈ یونین کی کارروائی Minutes میں درج ہو۔ جس کی بنا پر امیدوار کی دیگر صلاحیتوں کی روشنی میں ہر انعام کے لیے یونین کی ایکزیکیٹو کمیٹی تین تین ناموں کی سفارش مع تفصیلات کے یونین کا اپنا ٹرم Term ختم ہونے سے پہلے مربّی (وائس چانسلر) کو بھیجتی تھی جسے مربّی کسی بھی دو ماہرین Experts کو ان کی رائے کے لیے دے دیتے تھے۔ اگر وہ ماہرین چاہتے تو ان امیدواروں کو بلا کر بھی سنتے اور اپنی خفیہ رائے

مربی کو دیتے تھے۔ ان کی رائے کی روشنی میں مربی کسی ایک کا انتخاب کر لیتے اور صدر یونین کو تحریری طور پر مطلع کر دیتے۔ ان ناموں کا اعلان کر دیا جاتا اور وہ انعام اور تمغہ جیتنے والوں کو یونیورسٹی کانووکیشن میں مہمانِ خصوصی کے دستِ مبارک سے دلوائے جاتے (آج شاید لوگوں کو ان انعامات کے نام تک یاد نہیں ہیں) قارئین کی دلچسپی کے لیے ان کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

۱۸۸۸ء سے ہی ہیرلڈ کوکس کیمبرج اسپیکنگ پرائز شروع ہوئی۔

جیتنے والے

۱۸۸۸ء آفتاب احمد خاں (جو بعد میں وائس چانسلر ہوئے)

۱۸۸۹ء مصطفیٰ خاں

۱۸۹۰ء سرفراز حسین

۱۸۹۱ء قطب الدین

۱۸۹۲ء غلام ثقلین

۱۸۹۳ء نذیر احمد

۱۸۹۴ء (مولانا) شوکت علی

۱۸۹۵ء ممتاز حسین

۱۸۹۶ء شیخ عبداللہ (کشمیر)

۱۸۹۷ء محمد اصغر

۱۸۹۸ء محمد سعید

۱۸۹۹ء اشرف علی

۱۹۰۰ء سجاد حیدر

۱۹۰۱ء محمد حیات

۱۹۰۳ء ظفر محمد

۱۹۰۴ء طرف دار حسین

۱۹۰۵ء سید ابو محمد

۱۹۰۶ء آر۔ ایم غلام حسین

۱۹۰۷ء اے رحمان سیوہاروی

۱۹۰۸ء مختار احمد

۱۹۰۹ء محمد احمد

۱۹۱۰ء محمد عبدالرحمٰن

۱۹۱۱ء سید کلب عباس نقوی

۱۹۱۲ء امیر احمد خاں

۱۹۱۳ء محمد فضل امین

۱۹۱۴ء سے اس انعام کے ساتھ مسٹن آکسفورڈ انعام کو بھی ملا دیا گیا۔

۱۹۱۴ء سید اشفاق حسین

۱۹۱۵ء محمد اورنگ زیب خاں

۱۹۱۶ء سید ظہیر الدین

۱۹۱۷ء ابن حسن

۱۹۱۸ء حبیب الرحمٰن

۱۹۱۹ء سید نوراللہ (جولائی ۱۹۲۰ء)

۱۹۲۰ء سلطان محمد خاں

۱۹۲۱ء خواجہ غلام السیدین (ایکریٹر)

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۱۹۲۲ء	ایس محی الدین احمد	۱۹۲۶ء	شوکت عمر
۱۹۲۳ء	سرفراز احمد خاں	۱۹۲۷ء	عبدالقادر۔ ایم ایم احمد (مشترکہ)
۱۹۲۴ء	محمد عادل عباسی		نوٹ:۔ اس کے بعد کا ریکارڈ نہیں ملا۔
۱۹۲۵ء	اے کے بجلی		(راقم الحروف)

نوٹ:۔ ہیرالڈ کاکس کیمبرج اسپیکنگ پرائز سال اوّل کے طلبار کے لیے مخصوص تھی۔ دوسرا انعام تھا، سرشاہ سلیمان گولڈ میڈل، یہ ان طلبار کے لیے مخصوص تھا جو انڈر گریجویٹ کلاس کے طالب علم ہوں اور یونین میں پابندی سے آتے ہوں۔ اور بحث ومباحثہ میں حصّہ بھی لیتے ہوں۔

۱۹۵۳ء میں جب سیدنا سیف الدین صاحب یونیورسٹی کے چانسلر مقرر ہوئے اور یہاں تشریف لائے تو ہماری درخواست پر طلبار کی ہمت افزائی کے لیے مرحوم نے تین طلائی تمغے عنایت فرمائے جن کے نام مرحوم نے بتادیئے۔ اور یہ بات یونین پر چھوڑی کہ وہ ان کو دینے کے لیے کیا قواعد بناتی ہے۔ پہلا سیفی امداد علی گولڈ میڈل تھا جو بہترین انگریزی مقرر کے لیے مخصوص کیا گیا۔ دوسرا سیفی فدا حسین گولڈ میڈل، سال کے بہترین اردو مقرر کے لیے مخصوص کیا گیا۔ اور تیسرا سیفی برہان الدین گولڈ میڈل بہترین اردو مضمون نگار کے لیے مخصوص کیا گیا۔ یہ مقابلہ اردو ڈپارٹمنٹ اپنی نگرانی میں کرواتا تھا اور نتیجہ صدر یونین کے پاس بھیج دیا کرتا تھا۔ ان کا جو ریکارڈ ملتا ہے وہ حسب ذیل ہے۔ شاید اس کے بعد یونین اپنے اقدار میں زوال پذیر ہونے لگی اور یہ انعامات کسی کو نہیں دیئے گئے۔ شاید یونین کا مزاج علمی، ادبی ہونے کے بجائے ٹریڈ یونین والا بننے لگا۔

سیفی امداد علی گولڈ میڈل

۱۹۵۴-۵۳ء	ایم۔ اے۔ ای بکیلیا
۱۹۵۵-۵۴ء	اے۔ اے۔ کے سوز
۱۹۵۶-۵۵ء	خالی
۱۹۵۷-۵۶ء	سید محی الدین
۱۹۵۸-۵۷ء	خالی
۱۹۵۹-۵۸ء	سید شاہد مہدی
۱۹۶۰-۵۹ء	شبیر احمد مسعودی
۱۹۶۱-۶۰ء	افسر اختر حسین

سیفی فدا حسین گولڈ میڈل

۱۹۵۴-۵۳ء	محمد احمد سعید
۱۹۵۵-۵۴ء	عابد اللہ غازی

۵۵-۵۶ ۱۹۵۶-۵۵ء خالی	۵۴-۵۵ ۱۹۵۵-۵۴ء صدیق الرحمٰن قدوائی
۵۶-۵۷ ۱۹۵۷-۵۶ء سیّد زین الحسن ہاشمی	۵۵-۵۶ ۱۹۵۶-۵۵ء خالی
۵۷-۵۸ ۱۹۵۸-۵۷ء خالی	۵۶-۵۷ ۱۹۵۷-۵۶ء نور صدیقی
۵۸-۵۹ ۱۹۵۹-۵۸ء سیّد تہذیب السبطین	۵۷-۵۸ ۱۹۵۸-۵۷ء خالی
۵۹-۶۰ ۱۹۶۰-۵۹ء محمد صغیر	۵۸-۵۹ ۱۹۵۹-۵۸ء سیّد اشتیاق حسین عابدی
۶۰-۶۱ ۱۹۶۱-۶۰ء بصیر احمد خاں	۵۹-۶۰ ۱۹۶۰-۵۹ء دلنواز احمد صدیقی
سیفی برہان الدین گولڈ میڈل	۶۰-۶۱ ۱۹۶۱-۶۰ء خالی۔
۵۳-۵۴ ۱۹۵۴-۵۳ء ظہیر الدین احمد صدیقی	(اور شاید اس کے بعد یہ بھی بند ہو گئے)

۱۹۶۰ء میں ہی کینیڈی ہال کی پیش کش سامنے آئی اور جو تصور اس وقت کیا گیا وہ یہ تھا کہ طلبا کی علمی، ادبی، ثقافتی اور فنی مہارتوں کو مزید فروغ دینے کے لیے ایک ایسا مرکز بنایا جائے جہاں ان تمام ایکٹی وٹیز کو وسعت مل سکے۔ جو عرصے سے اسٹوڈنٹس یونین کیا کرتی تھی۔ اسٹوڈنٹس یونین میں ہر منتخب طالب علم کسی نہ کسی قلم دان Post کا ذمہ دار ہوتا ہے اور اس کو کامیاب بنانے میں نہ صرف اپنی کوشش کرتا۔ اچھے مشورے اور مدد کا طلب گار ہوتا اور اس کی خود اعتمادی بھی بڑھتی۔ دراصل یہ یونین کلب ایک منی پارلیمان کا روپ رکھتی تھی۔ ہر ممبر کابینہ اپنے پورٹ فولیو کا انچارج ہوتا۔ اس کے ساتھ یونین کے صدر، سکریٹری اور لائبریرین بھی ہوتے اور ان کے علاوہ کابینہ کے کوئی دو اور ممبران اس کے اپنے انتخاب کے مطابق اس کی مدد کرتے۔ اس طرح ہر ممبر کئی کئی کمیٹیوں سے وابستہ ہوتا۔

مثلاً ۵۳-۵۴ ۱۹۵۴ء میں قلم دان یونین اس طرح تقسیم کیے گئے تھے۔ صدر کُلی اختیار کے ساتھ، سکریٹری تمام ریکارڈ کا مالک اور ذمہ دار، لائبریرین یونین کے کتب خانے کا انچارج جس میں عام درسی کتب کے علاوہ بھی کتب تھیں۔ اور جو بک بینک کا کام کرتی تھیں۔ اس کا ایک ریڈنگ روم بھی تھا جس میں روزناموں کے علاوہ متعدد رسائل و جرائد بھی آتے تھے۔ وہیں یونین اسکول کا بھی نگراں ہوتا تھا۔ کابینہ میں مس زہرہ نقوی، یونین اسکول کی ممبر انچارج تھیں۔ (۲) مسٹر اے۔ کے۔ کے نیانا، انچارج بیسک ٹریننگ (۳) حاجی انتخاب احمد

انچارج اسٹوڈنٹس ہیلپ اینڈ ریلیف ورک (۴) ظفریاب جیلانی انچارج اسپیکر اینڈ رائٹرز کلب (۵) سردار سورن سنگھ انچارج ہابیز Hobbies. کلب۔ وجے پرتاپ سنگھ انچارج ٹریولنگ اینڈ اکسکرشن (۷) حبیب الرحمن صدیقی اسپورٹس اینڈ گیمز (۸) راشد مسعود، انچارج سوشل اینڈ کلچرل ایکٹی وٹیز (مثلاً آل انڈیا شاعرہ وغیرہ) (۹) قاضی جمال الدین احمد (جو بعد میں پہلے سکریٹری اور پھر صدر بھی ہوئے) انچارج یونین کامن روم اینڈ ان ڈور گیمز (۱۰) محمد قاسم حسین انچارج پبلسٹی اینڈ پبلی کیشن۔

یہی منتخب طلبار یونیورسٹی کی تمام تر ادبی، ثقافتی، رفاہی کارگزاریوں کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ یہی سالانہ آل انڈیا ڈیبیٹ کا انعقاد کرتے، یہی اپنی ٹیموں کو باہر بھیجتے، آل انڈیا مشاعرے کرواتے، ڈرامٹک کلبوں کو دعوت دیتے۔ ریلیف کے لیے اور معاشی طور پر کمزور طلبار کے لیے پیسہ جمع کر کے وائس چانسلر کو دیتے کہ وہ انھیں مستحق طلبار میں تقسیم کر دیں ۱۹۵۲ء میں یہاں یونین نے ایک تاریخی آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد کیا تھا جس کی صدارت الحاج جگر مرادآبادی مرحوم نے کی تھی۔ اس میں فراق گورکھپوری، وامق جونپوری جگن ناتھ آزاد، راہی معصوم رضا، علی سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، ساغر نظامی عرش ملسیانی، علامہ انور صابری اور پاکستان سے پہلی دفعہ آئے قتیل شفائی کے علاوہ مجاز لکھنوی کا وہ تاریخی مشاعرہ تھا جس میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس کے بعد ان کے نذرانہ علیگڑھ کو جو انھوں نے مرحوم رشید احمد صدیقی کے کہنے پر پڑھا تھا 'علیگڑھ ترانہ' کا درجہ دے دیا گیا۔ اور اس شاندار مشاعرے کی نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی نے فرمائی تھی۔

اسی طرح حاجی آفتاب احمد نے محبوب کی روٹی، بطور گفٹ حاصل کی اور اسی تصویر محل میں اس کا چیریٹی شو کیا۔ حاصل شدہ رقم ذاکر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی گئی۔ حاجی آفتاب احمد نے پرتھوی راج سے رابطہ قائم کیا جو یہاں علیگڑھ میں اپنا مشہور ڈرامہ 'پٹھان' دکھلانے آئے تھے۔ وہ راضی ہو گئے۔ اور انھوں نے ایک شو کے کل پیسے اور آخر میں خود چندہ وصول کر کے ہمیں دیا۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

جو ہم نے ذاکر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اسی طرح کے اور سیکڑوں واقعات ہیں۔ مختلف مضامین پر توسیعی لکچر بھی یہی یونین کرواتی تھی۔ بعد میں ان خطبوں کو کتابی شکل دے دی جاتی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں ہی یونین سے پہلی بار دو لسانی مجلہ (انگریزی و اردو) 'یونین ریویو' بھی شروع کیا گیا اور وہ بھی ۱۹۶۰ء کے آس پاس بادِ سموم کا شکار ہو گیا جو جنرل ایجوکیشن کے نام پر ایک مرکز کی شکل میں سامنے آیا۔ آج افسوسناک بات یہ ہے کہ وہ تمام کام جو یونین کے منتخب کردہ طلبا کیا کرتے تھے ان کے لیے کوئی ممبر انچارج بنا دیا گیا ہے جس کا تعلق طلبا سے نہ ہو کر اساتذہ کے زمرے سے ہے وہ کلب کے ممبران کا انتخاب اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔ لہٰذا کام میں کوئی دخل طلبا کا نہیں ہوتا۔ چہ جائے کہ ان کی شخصیت میں کوئی تبدیلی یا اضافہ ہو سکے۔ ان کی خود اعتمادی یا جنوں کی توں رہتی ہے یا پھر عمر کی جولانیٔ طبع کے باعث ردِ عمل کسی اور شکل میں ابھرتا ہے۔

موجودہ شاندار اسکول جس میں اب ماشاء اللہ چوبیس سو کے قریب طلبا و طالبات پڑھتے ہیں جن کے لیے تقریباً چالیس اساتذہ مقرر ہیں، ان کی نشاۃ ثانیہ بھی ۱۹۵۳ء میں ہی ہوئی تھی جب کہ اس میں بمشکل ۳۰ یا ۳۲ بچے پڑھتے تھے۔ نیم کے درخت سے لگی ٹین کی چھت کا ایک سائبان تھا۔ تین استاد تھے جن کو ۸ روپے اور بارہ روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اس وقت کے آنریری ٹریزرار جو پراکٹر بھی تھے، محمد شفیع صاحب کی معاونت کے باعث تین پکے کمرے اس وقت ہی بن گئے تھے کلاسوں میں باقاعدہ درجہ بندی کر دی گئی تھی اور ایک صاحب مشتاق احمد جن کا تقرر بحیثیت لائبریری اسسٹنٹ اسی سال کیا گیا تھا۔ ان سے اس اسکول کی ہیڈ ماسٹری کے فرائض کی بھی درخواست کی گئی۔ موصوف نے ۱۹۸۸ء تک اسی تن من دھن سے اپنی خدمات پیش کر کے حق ادا کر دیا۔

اس یونین کے چند اہم خصوصیات یہ ہیں کہ آج تک پورے برصغیر ہند و پاک نیپال، بنگلہ دیش، برما اور سیلون سمیت کسی ادارے کی طلبا یونین کے اراکین

کا کوئی لباس نہیں جب کہ یہاں کی کابینہ اپنے خصوصی جلسوں میں خواہ کسی کا استقبال کرنا ہو یا ان کی رسم تنصیب ہو، یونین مخصوص گاؤن میں ہوتی ہے۔ اس یونین کے پاس ۵۲۔۱۹۵۳ء میں اپنا ایک رجسٹرڈ کردہ آئین تھا جو کم از کم اس وقت پورے ہندوستان کی کسی طلبا یونین کے پاس نہیں تھا۔ آج تک (۱۹۹۵ء میں) بھی خدا کا شکر ہے، یہاں کے امیدواروں پر خواہ وہ صدر کا انتخاب لڑ رہے ہیں یا کسی اور عہدہ کا، کسی سیاسی جماعت کا کوئی لیبل نہیں۔ جب کہ ہم اکثر بڑی تعلیم گاہوں میں دیکھتے ہیں کہ ان کے امیدوار کھلے عام کسی سیاسی پارٹی کے سمبل پر الیکشن لڑتے ہیں اور وہ پارٹیاں ان پر لاکھوں روپے خرچ کرتی ہیں۔

یہاں کی یونین اپنے بڑوں سے مانگتی ہے مگر اس کی حدود مقرر ہیں۔ اور ان کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ مثلاً ۱۹۵۲ء تک سر سید ڈے کی چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ بس رات کا ڈنر ہو جایا کرتا تھا اور اس میں کوئی تقریر وغیرہ ہو جایا کرتی تھی۔ ۵۳۔۱۹۵۴ء کی منسٹری نے اپنی ایگزیکیٹو میں ریزولوشن پاس کیا کہ سر سید کے یوم پیدائش پر تعطیل ہونی چاہیئے، تاکہ ہم اس دن کو مختلف پروگراموں کے تحت منا سکیں۔ ریزولوشن وائس چانسلر کو بھیج دیا گیا۔ انھوں نے اس کو یونیورسٹی ایگزیکیٹو کے سامنے پیش کیا۔ اس پر بحث ہوئی۔ بالآخر وہ منظور کر لیا گیا اور تب سے سر سید ڈے کی تعطیل ہونے لگی۔

دنیا کی بڑی سے بڑی ہستی علیگڑھ آتی تو اس کی خواہش ہوتی کہ اس کا استقبال طلبا بھی کریں۔ یونین کی ایگزیکیٹو اس پر غور کرتی۔ بعض کو صرف بلا کر ہار پھول تک ہی محدود رکھا جاتا۔ جن کو زیادہ وقعت دی جاتی، اس کو یونین کا اعزازی لائف ممبر بنایا جاتا۔ یہ ٹھیک اسی طرح کی بات ہے جس طرح دیگر ممالک میں شہر کا میئر اعزاز کے طور پر کسی کو علامتی شہر کی کنجی پیش کرتا ہے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونین بھی اپنا اعزازی لائف ممبر بناتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے یہاں کی کلر ٹائی بھی پیش کرتی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں سلطان نیازی جب وہاں گئے تو ان کی تقریر سے متاثر ہو کر کیمبرج یونیورسٹی نے ان کو اپنا اعزازی ممبر بنایا اور کلر ٹائی پیش کی۔ ان سے پہلے اس یونین نے

موسٹ بیٹن (ہندوستان کے آخری انگریز وائسرائے) کو اپنا اعزازی ممبر بنایا تھا۔
جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ یہاں کے انتخابات سیاسی بنیادوں پر نہیں ہوتے تھے (شکر ہے کہ آج تک وہ روایت باقی ہے) الیکشن کے سارے داؤں پیچ خوب خوب استعمال کیے جاتے لیکن ان میں کبھی بھی شائستگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ امیدواروں کے انتخابی منشور جب سامنے آتے تو خوب خوب دھجیاں اڑائی جاتیں۔ ایک دوسرے پر تحریری چھینٹے بازی بھی کی جاتی جس میں فریق ثانی کے کھوکھلے دعووں اور کمزوریوں کو اجاگر کیا جاتا، مگر یہاں بھی تہذیبی اقدار قائم رہتیں مثلاً اگر کوئی امیدوار فریق ثانی کی کمزوریوں کا پردہ فاش کرنا چاہتا تو سلسلہ وار ان کو لکھ کر اس پر سرخی لگاتا "آواز یہ آئی کہیں سے"، اس میں کسی کا نام نہ ہوتا مگر پڑھنے والے سب کچھ سمجھ جاتے۔ علیگڑھ والوں کی زبان میں اس کو "اینٹی" کہتے تھے۔ ظاہر ہے اس اینٹی کا جواب دینا بھی ضروری ہوتا ورنہ یہ سمجھا جاتا کہ یہ ساری باتیں سچ ہیں۔ اینٹی کے جواب سے ان باتوں کی وضاحت تو ہوتی ہی اور ساتھ ہی اپنے فریق اول کی کارگزاریوں اور اس کے کھوکھلے پن کو بھی ظاہر کرتے ہوئے پمفلٹ کی سرخی ہوتی "پسینہ پوچھئے اپنی جبیں سے"، "کیا آپ نے یہ نہیں سنا کہ..."۔ "کیا آپ نے یہ نہیں سنا کہ..."؛ اور اس میں بھی کسی کا نام نہ ہوتا لیکن پڑھنے والا سب کچھ سمجھ جاتا۔
یہ سارے ہنگامے متعدد روایتوں کے دائرے میں بھی ہوتے اور کارواں آخر تک اسی گرما گرمی سے ہو کر گزر جاتا۔ نتیجہ کا اعلان ہوتا اور سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ جیتنے والے امیدوار کے دروازے پر پہلی دستک اس کے ہارے ہوئے مخالف کی ہی ہوتی جو اسے مبارکباد دیتا، گلے لگاتا اور اگر ممکن ہوتا تو ہار لے کر جاتا اور پہناتا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اصل کام کرنے والے کی فہرست بھی اس کو دیتا جس میں چار یا پانچ ایسے ورکرس کے نام ہوتے جنھوں نے اس کا الیکشن لڑایا تھا۔ یہ سارے لوگ صرف سینئر ہی ہوتے تھے جن کا بعد میں کامیاب امیدوار کے ورکر "جنازہ پیٹتے"۔ یہ صرف علیگڑھ والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں کیا ہوتا تھا۔ دراصل یہ ہارے ہوئے

امیدوار کے ورکروں کی سرزنش ہوتی کہ میاں کیسا کچا کام کیا۔ اب یا تو پوری محنت، سچائی، ایمانداری اور حکمتِ عملی سے الیکشن لڑاؤ ورنہ میدان چھوڑ کر الگ ہو جاؤ۔

یہی وجہ تھی کہ علیگڑھ والے جہاں بھی اور جس الیکشن کے لیے مدد کو پہنچ جاتے ان کا امیدوار ضرور کامیاب ہوتا۔ آج بھی وہ رمق، گو کہ پوری آب و تاب کے ساتھ نہ سہی، اب بھی باقی ہے۔

برِّ صغیر ہند و پاک (بشمول برما، لنکا، نیپال وغیرہ) کے کسی بھی تعلیمی ادارے میں ایسی یونین آج تک بھی موجود نہیں جن کے جلسے اور نشستیں آکسفورڈ اور کیمبرج کی طلبا یونین کے طرز پر پارلیمانی انداز سے سرانجام پاتے ہوں۔ یہ واحد یونین ہے جس کے منتخب افراد یونین کے جلسوں میں گاؤن پہن کر آتے ہوں۔ عہدوں اور رتبے کے اعتبار سے ان کے گاؤن کی پٹیاں بتاتی ہوں کہ یہ کون ہیں۔ گاؤں کے علاوہ یونیورسٹی کا لباس (یونیفارم) تو لازمی ہے ہی۔ شیروانی جس کے بٹن گلے تک بند ہوں۔ سفید پاجامہ اور اب ٹوپی کی قسم کی کوئی قید نہیں رہی ہے جو پہلے ترکی ٹوپی ہوا کرتی تھی۔ تقسیم ملک کے بعد اس ترکی ٹوپی کی جگہ (شیخ) عبداللہ کیپ نے لے لی ہے۔

یونین کی ایک اہم مجلس اس کی ایگزیکیٹو ہوا کرتی تھی۔ اس میں نو منتخب تین عہدہ داران (صدر، اعزازی لائبریرین اور اعزازی سکریٹری) دس ممبران کا بینہ پچھلی یونین کے تینوں عہدہ داران (آفس بیئرر) ایگزیکیٹو کے ذریعے منتخب کردہ یونین کا اعزازی ٹریزرار (جو آج بھی اساتذہ میں سے کوئی ہوتا ہے) آئی ڈی ایس (انٹر سبجیکٹ ڈبیٹنگ سوسائٹی) کا صدر اور سکریٹری اور وائس چانسلر بحیثیت مربی (Patron

۶۱-۱۹۶۰ء سے لائبریرین کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔ یونین کی لائبریری اور ریڈنگ روم بھی بند ہو گئے اور یونین کا شاندار جریدہ، یونین ریویو، جو اردو انگریزی میں ۵۴-۱۹۵۳ء سے شروع کیا گیا تھا، بند ہو گیا۔ شاید یہی حال آئی ڈی ایس کا بھی ہوا، اس کے لیے اب انٹر کی سطح ۲ + ۱۰ اکی ہے۔ بیچ میں پری یونیورسٹی

۔۔۔ فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کا کورس کچھ عرصے تک جاری رہا تھا۔ آج ۲-۲۰۰۱ کے طلباء کا حال یہ ہے کہ
زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں
وہ نہ تو اسکول یونین کے ممبر ہیں اور نہ ہی یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے ممبر۔ گرلز کالج کی اپنی یونین ہے جس کے ممبر وہاں کی گریجویشن کی سطح کی طالبات ہیں۔ پوسٹ گریجویٹ سطح کی طالبات مدر یونین یا یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی ممبر ہوتی ہیں۔

بیچ بیچ میں کئی بار انتخابات نہیں ہو پائے یا یونین بند کر دی گئی جس کے باعث سب سے زیادہ نقصان علیگڑھ کلچر اور یہاں کی روایات کو ہوا۔ اس لیے کہ تربیت کی بہت سی چیزیں جو سینہ بہ سینہ ایک سے دوسرے تک پہنچتی ہیں، ان کا اندراج کتابوں میں نہیں بلکہ دلوں میں ہوتا ہے اور وہ صرف عملی زندگی سے زندہ رہتی ہے۔ آج ہم شاکی ہیں کہ پچھلی روایات ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کی ذمہ داری جہاں اور کئی لوگوں پر عائد ہوتی ہے وہیں پرانی روایات کے سلسلے کو منقطع کر دینا بھی ایک بڑی وجہ ہے۔ ۸۵-۱۹۸۶ء میں سید ہاشم علی صاحب (وائس چانسلر) نے جب ایک لمبے وقفے کے بعد انتخابات کروائے تو رسم تنصیب کے موقع پر کئی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لوگ الجھتے رہے۔ مثلاً نومنتخب کابینہ دائیں طرف بیٹھے گی یا بائیں طرف وغیرہ۔ یہ صرف اس لیے ہوا کہ یہ انتخابات ایک ایڈہاک کمیٹی (کابینہ) نے کروائے جو کہ قطعی نو واردوں پر مشتمل ایک جماعت تھی جس کی نامزدگی محترم شیخ الجامعہ نے الیکشن کروانے کے لیے کی تھی۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک اور عہدہ 'مشیر یونین' کا شروع کیا جائے جس کے لیے شرط یہ ہو کہ وہ شخص اسی یونین کا کوئی عہدے دار اب سے کم از کم ۱۵ سال قبل رہا ہو اور علیگڑھ میں مقیم ہو۔ یونین کی ایکزیکیٹو جس طرح آنریری ٹریژرار کا انتخاب کرتی ہے اسی طرح وہ ایڈوائزر کا انتخاب بھی کرے اور وہ بھی یونین ایکزیکیٹو کا ایک ممبر ہو تاکہ مختلف مسائل پر وہ پرانی

— ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

روایتوں اور قاعدے قانون کو بتا سکے۔

بہر حال یہ کارواں جس کی ترتیب خود سرسید علیہ الرحمہ نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی، سنہ ۱۸۸۴ء سے مسلسل رواں دواں ہے۔

مسلم یونیورسٹی یونین کے عہدیداران کی فہرست

سن	صدر
سنہ ۵۲-۱۹۵۳ء	محمد احمد سعید
سنہ ۵۳-۱۹۵۴ء	محمد امین ابراہیم بلبلیا محمد احمد سعید (نامزد)
سنہ ۵۴-۱۹۵۵ء	نیر قدر واصف علی مرزا
سنہ ۵۵-۱۹۵۶ء	مبشر محمد خاں
سنہ ۵۶-۱۹۵۷ء	سید زین الحسن ہاشمی
سنہ ۵۷-۱۹۵۸ء	سید آصف علی
سنہ ۵۸-۱۹۵۹ء	عابد اللہ غازی
سنہ ۵۹-۱۹۶۰ء	جالوس احمد حمیدی
سنہ ۶۰-۱۹۶۱ء	سید اشتیاق عابدی
سنہ ۶۱-۱۹۶۲ء	قاضی جمال الدین احمد
سنہ ۶۲-۱۹۶۳ء	انیس الرحمٰن شیروانی
سنہ ۶۳-۱۹۶۴ء	بصیر احمد خاں
سنہ ۶۴-۱۹۶۵ء	مفتی محمد محسن اختر
سنہ ۶۵-۱۹۶۶ء	خالی
سنہ ۶۶-۱۹۶۷ء	محسن رضا
سنہ ۶۷-۱۹۶۸ء	محمد ادیب
سنہ ۶۸-۱۹۶۹ء	سردار علی
سنہ ۶۹-۱۹۷۰ء	محمد عابد علوی
سنہ ۷۰-۱۹۷۱ء	خالی
سنہ ۷۱-۱۹۷۲ء	قیصر محمود
سنہ ۷۲-۱۹۷۳ء	عارف محمد خاں
سنہ ۷۳-۱۹۷۴ء	خالی
سنہ ۷۴-۱۹۷۵ء	چودھری غلام مرسل خاں
سنہ ۷۵-۱۹۷۶ء	ظفر الدین خاں فیضان
سنہ ۷۶-۱۹۷۷ء	ظفر الدین خاں فیضان
سنہ ۷۷-۱۹۷۸ء	جاوید حبیب
سنہ ۷۸-۱۹۷۹ء	مشتاق احمد خاں
سنہ ۷۹-۱۹۸۰ء	عرفان اللہ خاں
سنہ ۸۰-۱۹۸۱ء	" (نامزد)
سنہ ۸۱-۱۹۸۲ء	خالی
سنہ ۸۲-۱۹۸۳ء	علی اکبر
سنہ ۸۳-۱۹۸۴ء	ایم. قمر عالم
سنہ ۸۴-۱۹۸۵ء	خالی
سنہ ۸۵-۱۹۸۶ء	محمد فرقان (نامزد)
سنہ ۸۶-۱۹۸۷ء	خالی
سنہ ۸۷-۱۹۸۸ء	ایس. ایم. سرور حسین
سنہ ۸۸-۱۹۸۹ء	خالی
سنہ ۸۹-۱۹۹۰ء	حافظ محمد عثمان

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سنہ	نام
۹۰-۱۹۹۱ء	ایس۔ایم انور حسین
۹۱-۱۹۹۲ء	ایچ۔ایم اعظم بیگ
۹۲-۱۹۹۳ء	خالی
۹۳-۱۹۹۴ء	حافظ ارشاد احمد
۹۴-۱۹۹۵ء	محمد خالد مسعود
۹۵-۱۹۹۶ء	خالی
۹۶-۱۹۹۷ء	خالی
۹۷-۱۹۹۸ء	کنور ضمیر احمد خاں

سن	نائب صدر
۲۰-۱۹۲۱ء	سید نوراللہ
	سید مجید الدین
۲۱-۱۹۲۲ء	سلطان محمد خاں
۲۲-۱۹۲۳ء	محمد اکبر عالم (گلبرگہ)
۲۳-۱۹۲۴ء	خواجہ غلام السیدین
۲۴-۱۹۲۵ء	ابن حسن زبیری
۲۵-۱۹۲۶ء	اشرف علی خاں
۲۶-۱۹۲۷ء	عبدالرحمٰن خاں
۲۷-۱۹۲۸ء	سراج حسنین
۲۸-۱۹۲۹ء	عطاءاللہ جان
۲۹-۱۹۳۰ء	قاضی غیاث الدین
۳۰-۱۹۳۱ء	محمد عبدالقادر
۳۱-۱۹۳۲ء	سید الدین صالح
۳۲-۱۹۳۳ء	سید عبدالرحمٰن
۳۳-۱۹۳۴ء	عثمان احمد انصاری
۳۴-۱۹۳۵ء	آل احمد سرور (ناقد)
۳۵-۱۹۳۶ء	ایم۔احمد علی چودھری
۳۶-۱۹۳۷ء	ایس۔سعید جعفری
۳۷-۱۹۳۸ء	اکرام احمد خاں
۳۸-۱۹۳۹ء	واجد بخش قادری
۳۹-۱۹۴۰ء	مودود احمد صابری
۴۰-۱۹۴۱ء	واجد بخش قادری
۴۱-۱۹۴۲ء	عزیزالرحمٰن، نصرت حسین
۴۲-۱۹۴۳ء	شاکر حسین خاں
۴۳-۱۹۴۴ء	محمد مختار آزاد
۴۴-۱۹۴۵ء	مسعود الحسن قریشی
۴۵-۱۹۴۶ء	کنور عشرت علی خاں
۴۶-۱۹۴۷ء	اے۔ٹی۔ایم مصطفیٰ
۴۷-۱۹۴۸ء	عبادت یار خاں
۴۸-۱۹۴۹ء	شاہ محمد حسن عطا
۴۹-۱۹۵۰ء	فصیح احمد خاں۔
	ایم۔اے۔باری
۵۰-۱۹۵۱ء	شبیہ الحسن نونہاروی
۵۱-۱۹۵۲ء	سید شاہ عنایت حسین آفتاب
۶۰-۱۹۶۱ء	شبیر احمد مسعودی
۶۱-۱۹۶۲ء	نصور علی خاں
۶۲-۱۹۶۳ء	اعجاز النبی خاں
۶۳-۱۹۶۴ء	ایس جمال احمد رضوی
۶۴-۱۹۶۵ء	عزیز احمد
۶۵-۱۹۶۶ء	خالی
۶۶-۱۹۶۷ء	محمد ادیب

سنہ ۶۷-۱۹۶۸ء فضل الوصی قریشی
سنہ ۶۸-۱۹۶۹ء افضال احمد قریشی
سنہ ۶۹-۱۹۷۰ء آفتاب احمد
سنہ ۷۰-۱۹۷۱ء خالی
سنہ ۷۱-۱۹۷۲ء اقتدار حسین خاں
سنہ ۷۲-۱۹۷۳ء مرتضیٰ احمد خاں
سنہ ۷۳-۱۹۷۴ء خالی
سنہ ۷۴-۱۹۷۵ء وصی احمد نعمانی
سنہ ۷۵-۱۹۷۶ء جلال الدین خاں
سنہ ۷۶-۱۹۷۷ء محمد محترم
سنہ ۷۷-۱۹۷۸ء لائق علی
سنہ ۷۸-۱۹۷۹ء افسر یو۔ احمد
سنہ ۷۹-۱۹۸۰ء محمد فرقان
سنہ ۸۰-۱۹۸۱ء محمد فرقان (نامزد)
سنہ ۸۱-۱۹۸۲ء خالی
سنہ ۸۲-۱۹۸۳ء ایم۔ خلیق الزماں
سنہ ۸۳-۱۹۸۴ء اعجاز مقبول
سنہ ۸۴-۱۹۸۵ء خالی
سنہ ۸۵-۱۹۸۶ء خالی
سنہ ۸۶-۱۹۸۷ء خالی
سنہ ۸۷-۱۹۸۸ء ملک ذی شان
سنہ ۸۸-۱۹۸۹ء خالی
سنہ ۸۹-۱۹۹۰ء خالد مسعود
سنہ ۹۰-۱۹۹۱ء ایس۔ حیدر علی اسد
سنہ ۹۱-۱۹۹۲ء حسن عزیز امیر
سنہ ۹۲-۱۹۹۳ء خالی
سنہ ۹۳-۱۹۹۴ء کنور عارف علی بیگ
سنہ ۹۴-۱۹۹۵ء معراج الدین احمد
سنہ ۹۵-۱۹۹۶ء خالی
سنہ ۹۶-۱۹۹۷ء خالی
سنہ ۹۷-۱۹۹۸ء اسد اقبال خاں

سن — اعزازی سکریٹری

سنہ ۲۰-۱۹۲۱ء محمد اسلم، محمد آفتاب احمد خاں
سنہ ۲۱-۱۹۲۲ء نفیس الحسن صدیقی
سنہ ۲۲-۱۹۲۳ء نیر لئیق احمد
سنہ ۲۳-۱۹۲۴ء ملک نور محمد
سنہ ۲۴-۱۹۲۵ء سید فضل حسین
سنہ ۲۵-۱۹۲۶ء ایم۔ عطاء الرحیم
سنہ ۲۶-۱۹۲۷ء زیڈ۔ ایچ لاری
سنہ ۲۷-۱۹۲۸ء ایم۔ ایم احمد
سنہ ۲۸-۱۹۲۹ء حفیظ الرحمٰن
سنہ ۲۹-۱۹۳۰ء محمد حسین سیٹھی
سنہ ۳۰-۱۹۳۱ء امیر عنایت اللہ خاں
سنہ ۳۱-۱۹۳۲ء ثناء اللہ
سنہ ۳۲-۱۹۳۳ء قاضی حسین زیدی
سنہ ۳۳-۱۹۳۴ء ایم۔ اے شیخ
سنہ ۳۴-۱۹۳۵ء فرور مانا غلام علی
سنہ ۳۵-۱۹۳۶ء عمران حسین
سنہ ۳۶-۱۹۳۷ء احمد مسعود
سنہ ۳۷-۱۹۳۸ء صدیق احمد صدیقی

۱۹۳۹-۳۸ء منظر عالم انصاری
۱۹۴۰-۳۹ء جلیل الدین احمد خاں
۱۹۴۱-۴۰ء محمد حسین صدیقی
۱۹۴۲-۴۱ء شاکر حسین خاں
۱۹۴۳-۴۲ء مشتاق حسین خاں
۱۹۴۴-۴۳ء عبدالنصیر خاں
۱۹۴۵-۴۴ء کنور محمود علی خاں
۱۹۴۶-۴۵ء خطیب مسعود حسین
۱۹۴۷-۴۶ء غیور الاسلام
۱۹۴۸-۴۷ء شاہ محمد حسن عطا
۱۹۴۹-۴۸ء ریاض احمد خاں
۱۹۵۰-۴۹ء ایس۔ ایم حفیظ زبیدی
۱۹۵۱-۵۰ء محمد احمد سعید
۱۹۵۲-۵۱ء محمد ابن ابراہیم بلبلیا
۱۹۵۳-۵۲ء انور علی خاں سوز
۱۹۵۴-۵۳ء چودھری منور حسین خاں
قاضی جمال الدین (نامزد)
۱۹۵۵-۵۴ء عابد اللہ غازی
۱۹۵۶-۵۵ء ظفر امام
۱۹۵۷-۵۶ء سید آصف علی
۱۹۵۸-۵۷ء شاہ عبدالقیوم
۱۹۵۹-۵۸ء محمد صغیر
۱۹۶۰-۵۹ء ملک ایس۔ ایچ خاں
۱۹۶۱-۶۰ء فرحت علی خاں
۱۹۶۲-۶۱ء بصیر احمد خاں

۱۹۶۳-۶۲ء مقصود حسین
۱۹۶۴-۶۳ء ایس۔ ایچ۔ پاشا
۱۹۶۵-۶۴ء مظفر پاشا اصلاحی
۱۹۶۶-۶۵ء خالی
۱۹۶۷-۶۶ء آفتاب سمیع
۱۹۶۸-۶۷ء سردار علی
۱۹۶۹-۶۸ء آفتاب احمد
۱۹۷۰-۶۹ء فضیل وارث
۱۹۷۱-۷۰ء خالی
۱۹۷۲-۷۱ء عارف محمد خاں
۱۹۷۳-۷۲ء اختر الواسع
۱۹۷۴-۷۳ء خالی
۱۹۷۵-۷۴ء محمد اعظم خاں
۱۹۷۶-۷۵ء رضوان احمد فاروقی
۱۹۷۷-۷۶ء وسیم احمد
۱۹۷۸-۷۷ء عرفان اللہ خاں
۱۹۷۹-۷۸ء ایس۔ ایم عارف
۱۹۸۰-۷۹ء ایم۔ اے۔ اے فاطمی
۱۹۸۱-۸۰ء ایم۔ اے فاطمی (نامزد)
۱۹۸۲-۸۱ء خالی
۱۹۸۳-۸۲ء حافظ سید عرفان
۱۹۸۴-۸۳ء ایس۔ ایم انور حسین
۱۹۸۵-۸۴ء خالی
۱۹۸۶-۸۵ء شمیم احمد کامریڈ (نامزد)
۱۹۸۷-۸۶ء خالی

سنہ ۸۷-۱۹۸۸ء عرفان بشر
سنہ ۸۸-۱۹۸۹ء خالی
سنہ ۸۹-۱۹۹۰ء محمد ایوب شباب
سنہ ۹۰-۱۹۹۱ء فخر عالم غوبی
سنہ ۹۱-۱۹۹۲ء سید ابرار احمد
سنہ ۹۲-۱۹۹۳ء خالی
سنہ ۹۳-۱۹۹۴ء چودھری افضال فصاحت
سنہ ۹۴-۱۹۹۵ء محمد اسلم خاں
سنہ ۹۵-۱۹۹۶ء خالی
سنہ ۹۶-۱۹۹۷ء خالی
سنہ ۹۷-۱۹۹۸ء محمد عاصم

سن — اعزازی لائبریرین

سنہ ۲۰-۱۹۲۱ء صوفی احمد بخش
سنہ ۲۱-۱۹۲۲ء امیر احمد جیلانی
سنہ ۲۲-۱۹۲۳ء راجہ لال حسین
سنہ ۲۳-۱۹۲۴ء ایس ایم عبد اللطیف شاہ
سنہ ۲۴-۱۹۲۵ء ایم منور علی خاں
سنہ ۲۵-۱۹۲۶ء سید ہادی حسن
سنہ ۲۶-۱۹۲۷ء سید مجتبیٰ علی
سنہ ۲۷-۱۹۲۸ء این۔ ایچ خواجہ
سنہ ۲۸-۱۹۲۹ء ایس شفقت اشفاق
سنہ ۲۹-۱۹۳۰ء قاضی نعمان جلیلی
سنہ ۳۰-۱۹۳۱ء ایس۔ ذو الفقار حسنین
سنہ ۳۱-۱۹۳۲ء ایم خلیل اللہ خاں
سنہ ۳۲-۱۹۳۳ء نواب زادہ علی صغیر
سنہ ۳۳-۱۹۳۴ء سید روار علی
سنہ ۳۴-۱۹۳۵ء محمد ممتاز
سنہ ۳۵-۱۹۳۶ء سید نصیر الدین
سنہ ۳۶-۱۹۳۷ء رضا حسین زیدی
سنہ ۳۷-۱۹۳۸ء احمد وہاب خیری
سنہ ۳۸-۱۹۳۹ء تقی محمد
سنہ ۳۹-۱۹۴۰ء محمد احمد عثمانی
سنہ ۴۰-۱۹۴۱ء اسرار احمد زبیری
سنہ ۴۱-۱۹۴۲ء سید عبد القادر رضوی
سنہ ۴۲-۱۹۴۳ء محمد ہاشم آزاد کولوی
سنہ ۴۳-۱۹۴۴ء ایم۔ اے وحید
سنہ ۴۴-۱۹۴۵ء کاظم علی بیگ
سنہ ۴۵-۱۹۴۶ء اصغر عثمانی
سنہ ۴۶-۱۹۴۷ء پیرزادہ کبیر الدین
سنہ ۴۷-۱۹۴۸ء اشفاق علی خاں
سنہ ۴۸-۱۹۴۹ء محمد مرتضیٰ خاں
سنہ ۴۹-۱۹۵۰ء جمشید۔ آر۔ رحیم
سنہ ۵۰-۱۹۵۱ء افتخار عالم زبیری
سنہ ۵۱-۱۹۵۲ء کلیم اللہ خاں
سنہ ۵۲-۱۹۵۳ء ایس۔ سمیع اللہ احمد
سنہ ۵۳-۱۹۵۴ء ایس نسیم احمد (فردوسی)
سنہ ۵۴-۱۹۵۵ء شاہ عبد القیوم
سنہ ۵۵-۱۹۵۶ء اکرام علی خاں
سنہ ۵۶-۱۹۵۷ء حافظ عبد الرؤف
سنہ ۵۷-۱۹۵۸ء مرزا انوار احمد

۵۶-۱۹۵۹ء انشار اللہ خاں ۵۹-۱۹۶۰ء ایس کے ملہوترہ

یونیورسٹی ایکٹ کے تحت مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے تینوں عہدیداران (صدر، نائب صدر، اور اعزازی سکریٹری) اور سینئر ممبر کابینہ مسلم یونیورسٹی کورٹ جو کہ یونیورسٹی کی اعلیٰ ترین انتظامی مجلس ہے کے رکن بھی ہوتے ہیں۔ یہ طلبار برادری کے لیے ایک اعزاز کی بات ہے اور انھیں جہاں اور مواقع فراہم ہوتے ہیں وہیں ان کے لیے جمہوری طرز کی یہ بھی ایک بہترین تربیت کا موقع ملتا ہے۔ اس لیے کہ اراکین کورٹ میں سارے ملک سے منتخب کردہ اور تقریباً ہر سطح کے ممبران ہوتے ہیں جن میں نہ صرف یونیورسٹی کے منتخب یا اعلیٰ عہدوں پر فائز اساتذہ ہوتے ہیں بلکہ ملک کے بڑے بڑے نمائندے (ممبران پارلیمان) وزرار، گورنر، صحافی، علما، لیڈران اور تدریسی و غیر تدریسی عملے کے علاوہ طلبار کے (براہِ راست منتخب کردہ) نمائندے بھی شامل ہوتے ہیں، جہاں قطعی پارلیمانی انداز سے مختلف مسائل پر گفتگو اور بحث کا موقع ملتا ہے اور ان سب میں اسٹوڈنٹس یونین کے یہ طلبار برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

بہر حال اس بات پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ سرسید علیہ الرحمہ کے زمانے میں طلبار کی تعداد چند سو کے قریب تھی جو اب ماشار اللہ ۲۴ ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ ایسی صورت میں انتخاب کس طرح کرائے جائیں تاکہ ہر ووٹر اور ہر امیدوار کے ساتھ انصاف ہو کیونکہ خصوصاً کابینہ کے ممبران کے لیے یہ عملی طور پر ممکن نہیں ہوتا کہ وہ ۲۴ ہزار ووٹروں سے بہ نفسِ نفیس رابطہ قائم کر سکے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ طریقۂ انتخابات میں کچھ تبدیلی کی جائے، جو بہتر ہو اور سب کے لیے قابلِ قبول بھی اور جس سے بانیٔ درسگاہ کے خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکیں۔

علم دلوں کی روشنی ہے۔ (حدیث)

امان اللہ خاں شیروانی

علیگڑھ کلچر

علیگڑھ تحریک جس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور معاشی نظام میں اصلاح کرنا اور اسے وقت کے لحاظ سے جدید بنانا تھا، انیسویں صدی کے آخری ربع سے شروع ہوئی تھی۔ اس وقت لوگوں کی معاشرتی زندگی پر یورپی تہذیب کا اثر ان کے طرزِ زندگی میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر رہا تھا۔ ملک کے کچھ حصوں میں دوسری تبدیلیوں کے علاوہ مذہب سے بے تعلقی کی لہر بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ علیگڑھ تحریک نے ان حقائق کو ذہن میں رکھ کر جدید تہذیب میں شامل بہت سی برائیوں اور خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے بھی کچھ اور اقدام کیے تھے۔ تحریک کے قائدین کو احساس تھا کہ اپنے قومی مفاد کی خاطر مسلمانوں نے حکومت کی طرف دستِ تعاون بڑھایا ہے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ مغرب کے وہی نظریات و اعمال اپنائے جائیں جن کی ان کے خیال میں اسلام اجازت دیتا تھا۔ انھوں نے قدامت کو جدیدیت میں بدلنے کی حمایت کی لیکن بعض خاص پابندیوں کے ساتھ۔ البتہ مسلمانوں کے بعض طبقوں نے ان کی مخالفت کی خاص طور پر اس طبقہ نے جو کسی تبدیلی یا اصلاح کا مخالف تھا۔ علیگڑھ تحریک نے اس مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی ہمت اور عزم کا مظاہرہ کیا اور

مسلمانوں کو نئی راہ پر ڈالا اور اسی کے ساتھ ساتھ اسلام پران کے ایمان و دین کا تحفظ بھی کیا۔ تحریک کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔

علیگڑھ تحریک کی اس نئی روشنی نے اسلامی، مغربی اور ہندی نظریات کے ملے جلے اثرات پیدا کیئے اور ان ملے جلے نظریات سے ایک نیا کلچر وجود میں آیا جسے "علیگڑھ کلچر" کہا جاتا ہے۔ "علیگڑھ کلچر" کی تین اہم خصوصیات ہیں۔ اول اخوت یا بھائی چارہ، دوسرا اپنے بڑوں کی عزت واحترام اور تیسرے روزانہ کی طرزِ زندگی اور اندازِ گفتگو میں اسلامی، مغربی اور ہندی تہذیبوں کا ملاجلا اثر۔ اس سلسلہ میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی فانی بدایونی پر اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں "علیگڑھ ایک ایسی سرزمین ہے جہاں زندگی کے ہر شعبہ کی شاہراہیں آکر مل جاتی ہیں۔ سیاست، مذہب، ادب و تعلیم اور کھیل ان سب میں علیگڑھ کی انفرادیت قائم ہے۔ ان سب سے مل کر علیگڑھ نے ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا جس کی مثال فی زمانہ کم نظر آتی ہے۔"

علیگڑھ کلچر کی سب سے اہم خصوصیت اخوت اور بھائی چارہ ہے یہ بھائی چارہ علیگڑھ کے اقامتی کردار کی پیداوار ہے کیونکہ علیگڑھ کالج اور علیگڑھ یونیورسٹی کی ممتاز ترین خصوصیات میں سے ایک اس کا اقامتی نظام ہے سرسید احمد خاں نے یہ نظام کیمبرج اور آکسفورڈ جیسی برطانوی دانش گاہوں کے طرز پر قائم کیا تھا اس نظام کے عام فوائد کے علاوہ جو طلبائے کے درمیان اور طلباء اور اساتذہ کے مابین قریبی رابطہ کے باعث طلبا کو حاصل ہوتے ہیں علیگڑھ کے اس اقامتی نظام کی کچھ امتیازی خصوصیات ہیں۔ ایم اے او کالج ایک کل ہند ادارہ کے طور پر قائم کیا گیا تھا اور جہاں برِاعظم کے مختلف حصّوں سے طلبا تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ کالج میں یہ کوئی غیر معمولی نظارہ نہ تھا کہ دارالاقامہ کے ایک کمرہ میں رہنے والوں کا تعلق دور دراز صوبوں سے ہوتا تھا۔ مختلف مقامات کے طلبا علیگڑھ کے ہاسٹلوں میں مل جل کر اکھٹے رہتے تھے۔ اس سے زندگی کے متعلق ایک نقطۂ نظر اور طرزِ زندگی میں نہ صرف یکسانیت اور وسعت پیدا ہوتی تھی بلکہ ان میں علاقائی تعصب کو دور کرنا اور

ماہنامہ فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ان میں جماعتی حیثیت پیدا کرنا بھی تھا اور یہ ہی اخوت و بھائی چارہ کے جذبات کو پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ یہ ہی نہیں کہ مختلف صوبوں کے طلبا یکجا رہتے تھے بلکہ مختلف قوموں اور مذہبوں کے طلبا بھی ساتھ رہتے تھے اور اس طرح قومی یکجہتی کا احساس بھی پیدا ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ یونیورسٹی قائم ہو جانے کے بعد بھی جاری رہا اور کسی حد تک آج بھی موجود ہے یہ ضرور ہے کہ آج کل مختلف سیاسی نظریات اور علاقائی جارحیت سے ان جذبات میں کسی قدر کمی ضرور آئی ہے لیکن "علیگڑھ کلچر" کی بنیاد اب بھی اخوت اور بھائی چارہ پر قائم ہے۔ سرسید احمد خاں مرحوم نے ایک مرتبہ طلبا کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا "بورڈنگ ہاؤس لوگوں کو ایک قوم بنانے کی مشین ہے۔ اگر اس کے پرزے صحیح طریقے پر کام کریں گے تو یہ ایک خدمت ہوگی ورنہ بیکار ہو جائے گی۔ تمہارا یکجائی کھانا پینا اور آپس میں ملنا جلنا، معاشرتی سرگرمیوں اور ادبی اجتماعات میں تمہاری شرکت اور تمہارا اکھٹے کھیلنا یہ سب باتیں ایک مقصد رکھتی ہیں یعنی تم میں باہمی محبت، دوستی اور ہمدردی کے احساسات پروان چڑھیں اور قومیت کے ارتقا کی بنیاد بنیں۔"

جذبۂ اخوت اور بھائی چارہ کو پیدا کرنے میں یہاں کے لباس، زبان، روزمرہ زندگی کے آداب و روایات، ڈائننگ ہالوں میں کھانا کھانا، کھیل کے میدانوں میں مقابلہ اور کمروں، ہوٹلوں، ریسٹورینٹ میں شغل چائے نوشی اور ریلوے اسٹیشن پر ساتھیوں کی الوداعی رسمیں وغیرہ نے "علیگڑھ کلچر" بنانے میں پورا کام کیا۔ دو جگہوں پر یہ بھائی چارہ بہت نمایاں ہوتا تھا۔ علیگڑھ نمائش اور علیگڑھ ریلوے اسٹیشن نمائش میں شام کو ۶ بجے سے رات کے نو بجے تک سیاہ شیروانیوں اور کالے برقعوں میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا اور طالبات کا اپنے دوستوں اور ہجولیوں کے ساتھ چہل قدمی، تہذیب کے دائرہ میں ہنسی مذاق، شوخی و شرارت بھی علیگڑھ تہذیب کا ایک عجیب سا انداز تھا۔ بقول شکیل بدایونی ۔

بقدرِ سکوں وہ دلوں کا بہلنا　　امیروں، غریبوں کا یکجا ٹہلنا
نمایاں نمایاں وہ یارانِ کالج　　وہ عشرت بداماں جوانانِ کالج

سہ ماہی فکر و آگہی علی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سیہ شیروانی پہ وہ ترکی ٹوپی | نشانی ہماری اخوت نوازی
کوئی تیز دستی و چستی پہ نازاں | کوئی صحت و تندرستی پہ نازاں
کوئی حسن کی جلوہ ریزی پہ مائل | کوئی شوخ نظروں کی تیزی سے گھائل
ادھر چشم حیراں کی نظارہ سازی | ادھر حسن والوں کی جلوہ طرازی
خراماں خراماں وہ ہجولیوں میں | نکلتی ہوئی مختلف ٹولیوں میں

"علیگڑھ کلچر" کا مظاہرہ ایک اور جگہ بھی اپنے مخصوص انداز سے ہوتا تھا۔ علیگڑھ ریلوے اسٹیشن پر ان دنوں یہ رواج تھا جو کچھ تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی ہے کہ کسی ساتھی کو چھوڑنے علیگڑھ ریلوے اسٹیشن پر یار دوست علیگڑھ کے مقررہ لباس میں ایک ٹولی میں جاتے تھے اور اسٹیشن پر پہنچ کر جانیوالا دوست ان سب کو چائے پلاتا تھا۔ یہ روایت صرف طالب علموں کے لیے ہی مخصوص نہیں تھی بلکہ اگر معلوم ہو جائے تو معروف اساتذہ کے لیے بھی تھی۔ خاص طور پر مجھے یاد ہے کہ جب پروفیسر ہادی حسن صاحب مرحوم (صدر شعبہ فارسی) کہیں باہر جاتے تھے یا باہر سے واپس تشریف لاتے تھے اور اس کی بھنک طلبائے کے کانوں میں پڑ جاتی تھی تو مخصوص طالب علموں کی ٹولی انھیں پہنچانے یا انھیں خوش آمدید کہنے اسٹیشن پر موجود ہوتی تھی اور ہادی صاحب بڑے خوش ہو کر پوری ٹولی کو چائے پلوانے تھے اور کہتے تھے "جب میرے بیٹے ساتھ ہوتے ہیں تو میں کتنا فخر محسوس کرتا ہوں"۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہادی صاحب مرحوم کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ یہ ہی طریقہ اکثر دوسرے معروف اساتذہ کے ساتھ بھی اپنایا جاتا تھا۔

علیگڑھ کے طلبا ہمیشہ ایک دوسرے کے مسرت و غم میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ زبان، مذہب، رنگ و نسل اور امیر و غریب کی کوئی تمیز نہیں ہوتی تھی مشترکہ لباس نے یہ فرق بالکل ہی کم کر دیا تھا۔ ملک کی آزادی سے پہلے آزادی کے بعد تک بھی کسی بھی مقام پر اور کسی بھی غیر ملک میں اگر دو علیگرین مل جاتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو بھائی مل گئے ہیں۔ آج بھی انگلستان امریکا اور مشرق وسطیٰ میں علیگڑھ کے سابق طلبا ایک دوسرے کے دکھ درد میں

شریک رہتے ہیں اور مل جل کر ایک دوسرے کے تعاون کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ ہر جگہ علیگڑھ اولڈ بوائز کی ایسوسی ایشن بنائی گئی ہے اور اس طرح بین الاقوامی سطح پر بھی "علیگڑھ کلچر" کو بڑھاوا مل رہا ہے۔ اسی جذبۂ اخوت اور بھائی چارہ سے نہ صرف اب سے کچھ سال پہلے تک بلکہ اب بھی اکثر علیگڑھ کے اولڈ بوائز اپنے نام کے ساتھ (علیگ) لکھنا فخر کی بات تصوّر کرتے ہیں اس سلسلہ میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ تقریباً تیس پینتیس سال پہلے میں انگلستان سے ایک ٹور پر ہالینڈ گیا تھا۔ وہاں گھومتے ہوئے سڑک کے کنارے ایک بینچ پر بیٹھ کر وہاں کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک بہت ضعیف جوڑا میرے پاس آیا۔ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا "کیا آپ علیگیرین ہیں"؛ میں نے کہا جی میں علیگڑھ کا اولڈ بوائے ہوں"۔ وہ دونوں بڑے خوش ہوئے اور ان محترم نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا۔ میرا نام آر۔ کے گپتا ہے۔ یہ میری بیوی ہیں۔ ہم لوگ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی ہے اور ۱۹۴۱ء سے یہاں سکونت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کتنے ہی سالوں کے بعد آج ایک علیگ بھائی کے درشن ہوئے ہیں۔ ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمارے ساتھ آج ہمارے گھر پر کھانا کھائیں۔ میری یہ مجبوری تھی کہ مجھے کچھ ہی دیر میں اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ مل جانا تھا اور پروگرام کے مطابق عمل کرنا تھا۔ میں نے معذرت کر لی اور کہا مجھے افسوس ہے کہ میں ایک سینئر کا حکم ٹالنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مجبوری ہے۔ یہ سنتے ہی گپتا جی رو پڑے اور علیگڑھ تہذیب میں سینئر کے اس احترام کو یاد کرنے لگے۔ یہ بھائی چارہ اور سینئر کا احترام علیگڑھ کلچر کا ایک بہت ہی نمایاں اور اہم پہلو تھا۔ اب سے پچیس تیس سال پہلے تک جب تک شیروانی کا عام رواج تھا یہ طریقہ تھا کہ سینئرز شیروانی کے پورے بٹن لگاتے تھے اور جونیئر صرف چند بٹن۔ اس سے سینئرز اور جونیئرز کی پہچان ہو جاتی تھی اور جہاں بھی سینئرز مل جاتے جونیئر انھیں سلام کرتے تھے۔ اس طرح "علیگڑھ کلچر" میں سلام کرنا ایک لازمی عمل تھا۔ سینئرز اور

جونیئرز کے درمیان کیسے روابط ہوتے تھے اور ایک دوسرے کا کتنا خیال رکھا جاتا تھا یہاں تک کہ ملازم ہوجانے یا زندگی میں کسی دوسرے کام میں مصروف ہوجانے کے باوجود علیگڑھ کے اولڈ بوائز یہاں کے طلبا کو اپنا چھوٹا بھائی ہی تصور کرتے تھے اس کی بہت سی مثالیں ہیں اس دور کی روزانہ زندگی میں ملتی ہیں مولانا شوکت علی کے بارے میں فریدی صاحب اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں۔

"جب وہ تعلیم ختم کرکے سرکاری عہدیدار مقرر ہوگئے تب بھی مدرستہ العلوم سے ان کا رابطہ برقرار رہا۔ وہ اسے اپنا گھر سمجھتے تھے اور یہاں کے ہر طالب علم کو اپنا چھوٹا بھائی۔ علیگڑھ برادری کو بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ شوکت علی چھٹیوں میں علیگڑھ آتے تو طلبا انھیں گھیر لیتے۔ کسی کو ان کی کوئی چیز پسند آجاتی تو وہ اٹھالے جاتا۔ یکے بعد دیگرے سارا سامان صاف ہوجاتا۔ رفتہ رفتہ پیسے بھی ختم ہوجاتے۔ روانگی کی گھڑی آتی تو شوکت علی کو کرایہ کے لیے کمرے کمرے جاکر چار چار آٹھ آٹھ آنے چندہ کرنا پڑتا اور مسکرامسکرا کر کہتے جاتے تھے کہ بدمعاشوں نے ہمیں لوٹ لیا۔ ہر سال یہ کھیل اسی طرح کھیلا جاتا۔ وہ آتے رہتے سامان لٹواتے اور آخر میں چندہ کرکے رخصت ہوجاتے۔ علیگڑھ کے طلبا میں سینئر اور جونیئر کے باہمی شفقت و محبت کی ایک اور مثال خود میری زندگی میں پیش آئی ۱۹۴۵ء میں میں اور میرے ایک ساتھی ایوب خاں صاحب فوج میں کمیشن حاصل کرنے کا ٹیسٹ دینے جمشید پور جارہے تھے راستہ میں آسنسول پر گاڑی بدلنا تھی اور وہاں کئی گھنٹہ دوسری گاڑی کا انتظار کرنا تھا۔ ہم لوگ سامان کلوک روم میں رکھ کر شہر چلے گئے تاکہ ایک جوڑا اسفید کرمچ کا جوتا خرید لیں۔ باٹا کی ایک دکان پر پہنچے تو دکان کے منیجر نے دریافت کیا کہ ہم لوگ کہاں سے آرہے ہیں اور کہاں جارہے ہیں۔ یہ بتانے پر کہ ہم علیگڑھ کے طالب علم ہیں جو جمشید پور ٹیسٹ کے لیے جارہے ہیں ان صاحب نے فوراً گلے لگا لیا اور بہت سی باتیں علیگڑھ کے متعلق دریافت کیں۔ وہ بھی علیگڑھ کے ایک پرانے طالب علم تھے اور اپنی طالب علمی کے زمانے میں سینئر ہال رہے تھے۔ جب جوتے خرید کر ہم نے بل کے لیے کہا تو انھوں نے فرمایا" میاں! چھوٹے بھائیوں سے پیسے نہیں لیے

جانتے۔" ایوب صاحب نے کچھ موڈ بگاڑ کر کہا کہ "ہم لوگ اس طرح جوتے نہیں لے سکتے۔" انھوں نے ایوب صاحب کا کان پکڑ لیا اور کہا۔ "جونیئر ہو کر یہ مجال کہ سینئر کے سامنے زبان کھولتا ہے۔" کیا علیگڑھ تہذیب بدل گئی۔" یہ سن کر ہم لوگ بہت شرمندہ ہوئے۔ معافی مانگی شکریہ ادا کیا اور جوتے لے کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ علی گڑھ کلچر میں سینئرز کی شفقت اور جونیئرز کے احترام کی یہ ایک معمولی مثال تھی۔ روزانہ زندگی میں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے تھے۔

علیگڑھ محض ایک درسگاہ ہی نہیں تربیت گاہ بھی تھا۔ یہاں کے علمی ماحول، ڈسپلن اور طالب علموں کی ہمہ جہتی نشو ونما میں اساتذہ، اولڈ بوائز اور سینئر طلبا کا بڑا ہاتھ رہتا تھا۔ علیگڑھ کے روایتی ماحول میں نشست و برخاست کے آداب اور لباس کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ علیگڑھ کٹ پاجامہ اور کالی شیروانی یا سفید پتلون کے ساتھ کالا ٹرکس کوٹ یہاں کا لباس تھا۔ اس کے سینے والے بھی مخصوص درزی ہوتے تھے۔ علی گڑھ کالج اور پھر علیگڑھ یونیورسٹی میں داخلے کے دوسرے مرحلوں میں لباس کی تیاری بھی خاص مرحلہ ہوتا تھا۔ چنانچہ "حیاتِ عابد" میں ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں: "ان دنوں علیگڑھ کالج تعطیل کلاں کے بعد غالباً ستمبر یا شروع اکتوبر میں کھلتا تھا۔ بی اے کا نتیجہ جہاں تک مجھے یاد ہے شروع جون میں نکلتا تھا۔ ان چار مہینوں کے وقفہ میں مجھے علیگڑھ جانے کی تیاری کرنا تھی جس کے سبب سے اہم جزو ایسے کپڑے بنوانے تھے جنھیں پہن کر میں ایم۔ اے۔ او کالج کے خوش وضع اور طرح دار ماحول میں کھپ سکوں۔ اپنے مقامی وظیفوں سے میں نے کسی نہ کسی طرح اتنی رقم بچالی کہ سیاہ رنگ کے خاصے قیمتی کپڑے کی شیروانی اور چار نئے جوڑے کرتے پاجامے بنوا سکوں اور اور ایک اچھی ترکی ٹوپی خرید سکوں۔"

علیگڑھ کلچر کا ایک مخصوص تعلق یہاں کی روایات سے تھا۔ ڈائننگ ہال کھیل کے میدان، نمائش گاہ، علی گڑھ اسٹیشن اور مختلف ادبی اور سماجی مجلسوں میں یہاں کے طالب علموں کا مخصوص طریقہ نشست و برخاست لباس کا پورا لحاظ، بڑوں خصوصاً اساتذہ اور سینئرز سے کس طرح پیش آیا جائے اور

یونین کے الیکشن کی خصوصی روایات علیگڑھ کالج کے نہایت اہم جزو تھے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر عابد حسین "حاتِ عابد" میں یوں رقم طراز ہیں۔ "رشید صاحب (رشید احمد صدیقی) سے یہاں اپنے قیام کے پہلے یا دوسرے دن سہ پہر کو بزم بے تکلف میں ان کی زیارت ہوئی اور واقعی ایک ملاقات نے میرے دل وحشی کو موہ لیا۔ ان صحبتوں میں طرزِ کلام عام طور پر گپ شپ، نوک جھونک، قہقہوں، چہچہوں کا ہوتا تھا مگر موضوع کلام اکثر سنجیدہ مسائل ہوتے تھے"۔

اس دور میں علیگڑھ کی یہ مجلس، علیگڑھ کلچر کا سب سے اچھا مظاہرہ ہوتی تھیں ڈائننگ ہال کی روایات پر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند نے ۱۹۵۸ء میں علیگڑھ میں ایک سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

"میرا دھیان اس وقت چالیس برس پہلے کی اس گرم دوپہر کی طرف رہ رہ کر جاتا ہے جب میں پہلی بار اس دانشگاہ میں پہنچا تھا۔ اپنے دوسرے ساتھیوں سے ذرا کم اجنبی کہ میرے دو بڑے بھائی پہلے ہی سے یہاں موجود تھے۔ یہ دونوں یہاں رہ بس کر یہاں کے ہو چکے تھے۔ میں نو وارد تھا۔ سہ پہر میں شہر سے ایک جوڑا جوتا، کچھ کتابیں اور ایک لالٹین بھائی صاحب نے مجھے خریدی تھی۔ سب گئے تھے ہم پیدل، ادھر سے آئے تھے یکہ میں اس لیے کہ ہاتھ میں سامان اٹھا کر چلنا اس زمانہ میں کسرِ شان سمجھا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بھائی صاحب مجھے کچی بارگ کے اپنے کمرہ میں چھوڑ کر اپنے دوستوں سے ملنے چلے گئے تھے اور مجھے بتا گئے تھے کہ مغرب کے بعد جب گھنٹی بجے تو ڈائننگ روم میں کھانا کھانے چلے جانا گھنٹی بجی میرے اندازے سے ذرا پہلے۔ میں نے ترکی ٹوپی۔ ترکش کوٹ جراب اور انگریزی جوتے بغیر کھانا کھانے کی مشق ۱۶ برس تک بہم پہنچا چکا تھا یہ نئی وردی پہننے میں دیر کی اور دیر کیسے نہ کرتا جوتے کا فیتہ ایک سوراخ سے کھینچا تو دوسرے سے نکل گیا۔ اس میں سلیقہ سے گرہ دینے کا فن سہ پہر میں بھائی صاحب نے سکھایا تھا اور جس کی مشق بھی اس نے جوتے پر کرا دی تھی وہ گھبراہٹ میں ذہن سے اتر گیا اور کئی بار کی بست وکشاد سے ایک نئے انکشاف کی طرح ہاتھ آیا لیکن جب کس بندھ کر کمرہ سے نکلا تو دیر ہو چکی تھی اور دوسرے زیادہ چوکس ساتھی ڈائننگ ہال

جا چکے تھے۔

یک لحظہ غافل گشتم، صد سالہ راہم دور شد

نہ جانے کتنی دیر اِدھر اُدھر گھومتا پھرا اور اپنے خیال میں گھنٹوں تلاش منزل کی ناکام کوشش کے بعد پھر اپنے ہی کمرہ کے سامنے آن پہنچا تھا۔ گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کھانا کھانے کی گھنٹی کا جو وقت بتایا گیا تھا اسے گزرے صرف آٹھ منٹ ہوئے تھے اور اس جانِ ناتواں نے ان آٹھ منٹ میں خود فراموشی، بازیافت تلاشِ منزل گم کردہ اور ناکامی سفر کے جملہ مقامات طے کر لیے تھے۔"

ذاکر صاحب کے الفاظ میں وقت کی پابندی، مکمل لباس میں ڈائننگ ہال جانا اور لباس کو سلیقہ سے پہننا "علیگڑھ کلچر" کی خصوصی روایات تھیں۔ اس دور میں علیگڑھ آنے والے نوجوانوں کو پہلے ہی سے ان کی تربیت دے دی جاتی تھی۔ اسی طرح کھیل کے میدانوں میں کھلاڑیوں کا ایک دوسرے سے برتاؤ کھیلوں کے ڈسپلن کا لحاظ اسپورٹس مین اسپرٹ اور ایک مخصوص طریقہ سے اچھے کھلاڑیوں کی ہمت افزائی کے نعرے لگانا بھی اس کلچر کی نمایاں خصوصیات سمجھی جاتی تھیں۔

اس کلچر کی ایک اور نمایاں خصوصیت اساتذہ اور طالب علموں کا باہمی تعلق بھی تھا۔ اس تعلق کی ایک مثال پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے ایک مقالہ سے دی جاسکتی ہے جو انھوں نے اپنے استاد پروفیسر خواجہ منظور حسین مرحوم سابق صدر شعبۂ انگریزی کے متعلق ایک مضمون میں اس طرح بیان فرمایا ہے "خاندان کے ایک بزرگ نے جن کے غالباً خواجہ صاحب شاگرد رہ چکے تھے جو اس وقت یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتے تھے، میرے ادبی میلان اور دلچسپیوں کے پیش نظر ایک دن کہا کہ میں خواجہ منظور سے تمہارا ذکر کروں گا تم کبھی کبھی ان کے پاس چلے جایا کرو تاکہ تمہارے ذوق کی ان کی نگرانی اور رہنمائی میں نشوونما ہو سکے۔ میں نے یہ ہدایت گرہ باندھ لی۔ چنانچہ ایک دن ہمت کر کے ان سے ملاقات کی نیت سے ہاسٹل سے نکلا نہ جانے دل میں یہ بات کیسے سما گئی تھی کہ خواجہ منظور حسین کوئی بھاری بھرکم، قوی الجثہ، رعب اور

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

و بدبے والے خوفناک قسم کے انسان ہوں گے ان کے گھر پہنچ کر برآمدے میں لگی برقی گھنٹی بجائی۔ پلک جھپکتے میں ایک حسین وجمیل نوجوان نظروں کے سامنے تھا۔ کرتے اور چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس، میانہ قد گٹھا ہوا جسم، کشادہ پیشانی سرخ وسپید رنگت، تابناک غلافی آنکھیں جن سے ذہانت وشرافت ٹپکتی تھی۔ نظروں میں حیا اور پاکیزگی کی رمق اور طور طریق نفاست، تہذیب اور شائستگی کے خمار میں ششدر، مبہوت اور ہکا بکا ہو کر اس شاداب اور نودیدہ گلاب کو دیکھنا کا دیکھتا رہ گیا۔ میں نے جی کڑا کر کے کہا کہ میں خواجہ منظور صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ انتہائی نرمی اور دلاسائی کے ساتھ جواب دیا۔ اسی خاکسار کو کہتے ہیں فوراً اندر ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ تھوڑی دیر تک دونوں طرف خاموشی طاری رہی۔ تھوڑی دیر میں بہرکیف خدا خدا کر کے یہ مہر سکوت ٹوٹی اور انھوں نے میرے ادبی مشاغل اور ترجیحات کے بارے میں استفسار فرمایا اتنا عرصہ گزر جانے پر بھی اب تک یاد ہے کہ میری کم سنی کے باوصف لیکن میری ذہنی تربیت کے خیال سے جس کا آغاز اسی زمانے میں ہوا اپنے قیمتی کتب خانہ میں سے تین کتابیں پڑھنے کے لیے دیں... چلتے وقت فرمایا کہ جب دوبارہ آؤ تو یہ تینوں کتابیں پڑھ کر آؤ تاکہ ان پر گفتگو ہو سکے۔ چنانچہ انٹرمیڈیٹ کے سال اوّل سے لے کر ایم اے فائنل تک تعلیم کے دوران برابر یہ وطیرہ رہا۔"

علیگڑھ میں طلباری یونین کا الیکشن بھی اپنی صالح روایات اور بہت سی مخصوص باتوں کے لیے "علیگڑھ کلچر" کی ایک نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ الیکشن کے اعلان کے بعد امیدواروں کے اعلان کے لیے ان کے ساتھیوں اور حمایتوں کی مخصوص پارٹی سے لے کر الیکشن کے نتیجہ کے بعد "جنازہ" کی رسم تک علیگڑھ یونیورسٹی کے یونین الیکشن کا ایک خاص انداز تھا۔ اس پورے طریقہ کار میں کسی بھی بھدی تہذیب وشائستگی سے گری اور ضابطہ کے خلاف کوئی بات نہیں ہوئی تھی، الیکشن کی ایک مخصوص رسم یہ بھی تھی کہ امیدوار کی نامزدگی کے بعد اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اسے ایک کمرہ میں مقید رہنا پڑتا تھا اور صرف اس کے خاص ورکروں کے علاوہ کسی کو بھی اس سے ملاقات

کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ یہ غالباً اس لیے تھا کہ کسی بھی امیدوار کے لیے اپنے واسطے ووٹ مانگنا معیوب سمجھا جاتا تھا اس لیے اسے عام ووٹ دہندگان کی نظروں سے اوجھل رہنا پڑتا تھا کہ مبادا کوئی یہ الزام نہ لگادے کہ وہ خود ووٹرز سے اپنے لیے ووٹ مانگ رہا تھا۔ اسی طرح الیکشن جیتنے والے اور ان کے کارندے اس بات کا بھی لحاظ رکھتے تھے کہ ہارنے والے امیدوار کی دل شکنی نہ ہو اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے جس سے ہارنے والے امیدوار کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ البتہ ہارنے والے امیدوار کے خاص کام کرنے والوں (چیف ورکرز) کا جنازہ نکالا جاتا تھا اور ہائے کے نعرے لگائے جاتے تھے اور ان کے کمروں پر جاکر مرثیہ خوانی کی جاتی تھی غرضیکہ علیگڑھ یونین کے الیکشن کا عمل اور طریقہ کار یہاں کے مخصوص کلچر کا نمایاں پہلو تھا۔

علیگڑھ اپنے ماضی میں اور آج بھی محض ایک درسگاہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک تہذیبی ادارہ، ملک کی تعلیمی تاریخ کا ایک سنگِ میل اور ہندوستانی مسلمانوں کی امیدوں، آرزوؤں کی آماجگاہ بھی ہے۔ پہلے یہاں برصغیر کے ہر گوشہ سے نونہالانِ قوم جمع ہوتے تھے اور ملک و ملت کی خدمت کے لیے تیاری کرتے تھے۔ آج بھی ملک کے کئی حصوں سے کچھ بیرونِ ملک سے طلباء یہاں جمع ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ رہ کر قومی یک جہتی اور بین الاقوامی یگانگت کا ثبوت دیتے ہیں اور "علیگڑھ کلچر" کو ایک نئی سمت عطا کرتے ہیں۔

(قومی آواز۔ ۹؍۱۰؍ اکتوبر ۱۹۹۹ء)

علم آنکھوں کا نور ہے۔ (حدیث)

ڈاکٹر بصیر احمد

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
کا
اقامتی کردار

علیگڑھ کے ایک اولڈ بوائے اور ہندوستان کے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سابق پریذیڈنٹ تھے۔ ان کے زمانۂ طالب علمی میں یونیورسٹی کا وائس چانسلر یونین کا صدر ہوتا تھا۔ اور طلبار اپنا نائب صدر اور معتمد اعزازی منتخب کرتے تھے۔ بعد میں یونین کے دستور میں ترمیم کرکے وائس چانسلر کو سرپرست بنا دیا گیا اور ایک طالب علم طلبار یونین کا صدر منتخب ہونے لگا۔ علیگڑھ میں اسٹوڈنٹس یونین کو اسٹوڈنٹ لائف میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ سرسید علیہ الرحمہ نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ایم۔ اے۔ او کالج) قائم کرنے سے پہلے انگلستان کا سفر کرکے آکسفورڈ یونیورسٹی کے طرزِ تعلیم، وہاں کی عمارات اور وہاں کی ہوسٹل لائف کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اور اسی طرز پر ایم۔ اے۔ او کالج کو بھی بنانا چاہا تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کو اس یونیورسٹی میں بہت امتیازی مقام حاصل ہے۔ چنانچہ علیگڑھ میں بھی اسٹوڈنٹس یونین کی شان ہی نرالی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے یونین کی اعزازی لائف ممبرشپ کے رجسٹر پر اپنے دستخطوں کے ساتھ یہ جملہ تحریر فرمایا تھا کہ ”اس یونین میں بولنے کا سلیقہ سیکھا اور سننے کا بھی“۔ اس

سے بہتر خراج عقیدت یونین کو ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس یونین نے بہت سے نامور مقرر اور قائدین پیدا کیے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم قائد رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر بھی اسی علیگڑھ کے اولڈ بوائے تھے۔ آزادی کے بعد بھی علیگڑھ کے فرزندان وزیر اور سفیر بنے ہیں۔ طلبار کی ذہنی تربیت اور ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں اسٹوڈنٹس یونین کا بڑا حصہ ہے۔

میں نے ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیاں دیکھی ہیں لیکن جتنی پُر شکوہ اور اور شاندار علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی عمارت ہے ایسی کہیں اور نہیں ہے۔ یونین کے صدر اور سکریٹری کی جو عزت و توقیر علیگڑھ میں ہوتی ہے۔ وہ بھی کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یونین کے صدر، نائب صدر اور سکریٹری کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ شیروانی اور ٹوپی پہنیں۔ جب اسٹوڈنٹس یونین کا جلسہ ہوتا ہے یا کسی معزز مہمان ذی وقار کو استقبالیہ دیا جاتا ہے تو صدارت یونین کا صدر ہی کرتا ہے اور وائس چانسلر اور دیگر معززین ڈائس پر رکھی دیگر کرسیوں پر بیٹھتے ہیں۔ چاہے کسی ملک کا صدر ہو یا وزیر اعظم یا کوئی بادشاہ یونین جب اسے استقبالیہ دیتی ہے تو اسے بھی طلبار یونین کے صدر کو جناب صدر یا مسٹر پریذیڈنٹ کہہ کر مخاطب کرنا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر یونین کے عہدیدار اور اراکین کابینہ ہرے رنگ کے خصوصی گاؤن زیب تن کرتے ہیں جن پر یونیورسٹی کا مونوگرام بنا ہوا ہوتا ہے۔ یونین ایک خود مختار ادارہ ہے اور اس کا اسٹاف بھی یونین کے عہدیداران کے ماتحت ہوتا ہے۔ اور وہی ان کا تقرر بھی کرتے ہیں۔ ہماری یونین ایک اسکول بھی چلاتی ہے جس میں یونیورسٹی کے ان ملازمین کے بچے پڑھتے ہیں جن کی تنخواہ کا گریڈ کم ہے۔ اس کے علاوہ یونین یونیورسٹی کے مستحق طلبار کی مالی امداد بھی کرتی ہے۔ ویسے علیگڑھ یونین کا طرۂ امتیاز یہی تھا کہ یہاں بہترین مقرر اور خطیب تیار کیے جاتے تھے۔ اب یہ روایت کمزور پڑ گئی ہے لیکن برقرار ضرور ہے۔ پندرہ، بیس سال پہلے تک یونین نے اچھے مقرر پیدا کرنے کی روایت کو قائم رکھا تھا اور علیگڑھ کے اقلیتی کردار کی بحالی کی تحریک نے بھی اچھے مقرر پیدا

کیے۔ ان میں عارف محمد خان، جاوید حبیب، اختر الواسع اور اعظم خان وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں عارف اور جاوید حبیب یونین کے صدر اور اختر الواسع اور اعظم خان سکریٹری رہے ہیں۔ مجھے بھی اس عظیم الشان یونین کا صدر اور سکریٹری رہنے کا فخر حاصل ہے۔ ہمارے زمانے تک اسٹوڈنٹس یونین کی تقریر و تحریر کی شاندار روایات قائم تھیں۔ یونین کا ذکر چل رہا ہے تو مجھے وقار الملک ہال اسٹوڈنٹس یونین بھی یاد آرہی ہے جو ہمارے زمانے میں تھی لیکن بعد میں ختم کردی گئی۔ میں ۱۹۵۹ء میں اس کا سکریٹری اور ۱۹۶۰ء میں اس کا صدر منتخب ہوا تھا۔ اور اس وقت میری عمر اتنی کم تھی کہ میری داڑھی کے بال بھی نہیں آئے تھے۔ صرف اس وجہ سے کم عمری میں اس کا صدر بنا دیا گیا تھا کیونکہ میں تقریر اچھی کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ کہ جب میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری کا الیکشن لڑا تو میری مخالفت میں جو "اینٹی" لکھی گئی اور چھپوا کر الیکشن سے عین پہلے طلبار کے کمرے کمرے تقسیم کی گئی تھی۔ اس کا عنوان تھا "بچہ درویش"۔ یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ جب میرے ہلکی ہلکی داڑھی آنے لگی تھی۔ اس پمفلٹ کو اردو کے مشہور شاعر اور ادیب معصوم رضا راہی نے تحریر کیا تھا جو اس زمانے میں یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ اس وقت فلم مغلِ اعظم، کے ڈائیلاگ بہت مشہور تھے۔ چنانچہ میرے بارے میں لکھا گیا "بخدا ہم کسی بچے کو یونین کے سکریٹری ہونے کے خلاف نہیں ہیں لیکن اپنی روایات کے پابند ہیں۔ داروغہ زنداں اس بچے کو گمنامی کے اندھیروں میں غرق کردو۔ یعنی مخالفت بھی اتنی شائستہ اور ادبی ہوتی تھی کہ "اینٹی" لکھنا بھی ایک فن بن گیا تھا۔ کاش کوئی ان "اینٹی" پمفلٹوں کو محفوظ کرلیتا جو یونین کے الیکشن میں اپنے حریف کے خلاف لکھوا کر بٹوائی جاتی تھیں۔ اس سے اکثر الیکشن پلٹ بھی جاتا تھا۔ اگر ان کا ذخیرہ موجود ہوتا تو اردو ادب کی ایک نئی صنف بن جاتی۔

علیگڑھ میں لوگوں کو ٹائٹل یعنی کوئی مخصوص نام دینے کا بھی رواج تھا۔ ہمارے ایک دوست تھے اقبال حسن خاں جن کے نام کے آگے لفظ بروالا جوڑ دیا گیا تھا اور انھیں اقبال بروالا کہا جانے لگا۔ یونیورسٹی کے سینئر پراکٹوریل مانیٹر تھے اور بروالا کہنے سے چڑتے تھے۔ لیکن آخرکار انھوں نے بھی اس خطاب کو اپنا لیا۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

چنانچہ دودھ پور علیگڑھ میں جو مارکیٹ انھوں نے بنوائی اس کا نام انھوں نے خود 'برولا مارکیٹ' رکھ دیا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ لیکن برولا مارکیٹ علی گیریز . Aligarians کی خوش طبعی کی یادگار موجود ہے۔ ایسے جانے کتنے نام علیگڑھ میں ہر ایک کی زبان پر ہوا کرتے تھے۔ مختار صاحب جنھیں سبھی مختار گھوڑا کہتے تھے۔ جب میں نے شروع شروع میں یونین میں تقریری مقابلے میں حصّہ لیا تو یونین کے ایک بہت مشہور سابق صدر سعید انڈا نام کے تھے۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم ایک دن یونیورسٹی میں چھوٹے انڈے بنو گے اور پھر میں یونین کا سکریٹری اور صدر بنا۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹس یونین یعنی این۔سی۔یو۔ایس۔آئی (نیشنل کونسل آف یونیورسٹی اسٹوڈنٹس آف انڈیا) کا نائب صدر اور بعد میں اس کا صدر بنا اور طلبار کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، اور یورپ گیا۔

علیگڑھ جو سکھاتا ہے اس میں جرأت اور بے باکی نمایاں ہے۔ ۱۷ اکتوبر کو یوم سرسیّد کے موقع پر وائس چانسلر بدرالدین طیّب جی نے وزیر اعظم جواہرلال نہرو کو سرسیّد ڈنر پر مدعو کیا۔ مجھے بحیثیت صدر یونین استقبالیہ تقریر کرنی تھی۔ فنکشن سے پہلے اسٹیج پر ہمارے استاد اور یونیورسٹی کے پراکٹر ناصر صاحب نے کہا کہ بصیر اپنی ٹوپی تبدیل کر لو یہ جناح کیپ ہے پنڈت جی کو پسند نہیں آئے گی۔ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں کونسی ٹوپی پہنوں۔ اس میں پنڈت جواہرلال نہرو کی پسند کا سوال ہی نہیں بلکہ میری پسند کا ہے۔ میں نے اسی ٹوپی کو پہن کر تقریر کی اور میری یونیورسٹی کی تقریروں میں وہ ایک یادگار تقریر مانی گئی اور پنڈت جواہرلال نہرو بھی محظوظ ہوئے۔ تقریر کی بات آئی تو مجھے ہادی حسن صاحب کی تقریر یاد آ گئی جو انھوں نے میڈیکل کالج کی افتتاحی تقریب میں کی تھی چونکہ میڈیکل کالج کے لیے چندہ اکٹھا کرنے میں انھوں نے ماضی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ میرا بھی میڈیکل کالج سے یہ تاریخی تعلق ہے کہ اس کے اختتامی جلسے میں میں نے بھی یونین کے سکریٹری کی حیثیت سے تقریر کی تھی۔ ہادی حسن صاحب اردو، فارسی، انگریزی میں بہت عمدہ تقریر کرتے تھے۔

ـ فکر و آگہی (علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء)

انھوں نے بتایا کہ میں ایک بار میڈیکل کالج کے لیے چندہ اکٹھا کرنے ریل میں سفر کر رہا تھا۔ ایک سیٹھ جی بھی اس کیبن میں تھے۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ بھی اسی شہر کو جارہے تھے جہاں پروفیسر ہادی حسن جارہے تھے۔ اس سیٹھ نے بڑی رقم میڈیکل کالج کے قیام کے لیے چندے میں دی اور اگلا اسٹیشن آنے پر اپنا ڈبہ یہ کہہ کر تبدیل کر لیا کہ میں تمہارے ساتھ پورا سفر نہیں کروں گا ورنہ تمہاری باتوں میں آکر تو میں اپنی تمام دولت چندے میں دے ڈالوں گا اور فقیر ہو جاؤں گا۔

توصاحب یہ تھی علیگڑھ کی جادو بیانی، نئے لڑکوں کے انٹروڈکشن میں جو جملے بازی ہوتی تھی اس کا جواب نہیں تھا اب تو ڈانٹ ڈپٹ اور بدتمیزی ہونے لگی ہے۔ ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک صاحب تھے بڑے خوبرو، اسمارٹ اور داڑھی والے۔ ان کی سائیکل ایک لڑکی کی سائیکل سے ٹکرا گئی۔ وہ ناراض ہوکر بولی ظفر صاحب آپ کو رک جانا چاہیئے تھا آپ کے داڑھی ہے۔ ظفر بڑی معصومیت سے بولے محترمہ داڑھی ہے کوئی بریک تھوڑی ہے جو رک جاتا۔ علیگڑھ اب بہت بڑھ گیا ہے۔ ۲۷ ہزار طلبا ہیں۔ لہٰذا کوانٹٹی بڑھنے سے کوالٹی گر گئی ہے لیکن اب بھی اوروں سے بدرجہا بہتر ہے کہ اس کی بنیاد خلوص پر ہے۔

زہے خلوص و محبت کہ حادثاتِ جہاں
مجھے تو کیا مرے نقشِ قدم مٹا نہ سکے

علم ہی سے حلال وحرام کی پہچان ہوتی ہے۔
(حدیث)

ذاکر علی خاں

علیگڑھ اسپرٹ

علی گڑھ سے کما حقہٗ واقفیت اور اس سے استفادہ کے لیے شرط لازم ہے کہ 'علی گڑھ اسپرٹ' کو بخوبی سمجھا جائے تاکہ اسے اپنایا جا سکے۔

علی گڑھ کے حوالے سے اکثر بولا جانے والا یہ مختصر سا لفظ اپنی ساخت و تاثر سے تو 'اینگلو انڈین' یا 'اینگلو پاکستان' معلوم ہوتا ہے، لیکن دراصل یہ بڑا ہی وسیع المعنیٰ لفظ ہے جس کا ہر مطلب پُر اثر افادیت ہے، بادی النظر میں علی گڑھ اسپرٹ کا مطلب بنی نوع انسان کی خدمت، دُکھ درد میں شرکت، آڑے وقت کام آنا، دردمندی و دستگیری وغیرہ لیے جاتے ہیں، اور بڑی حد تک یہ مفہوم مواخاتِ اسلامی کی تعریف پر پورا اترتا ہے، لیکن بسا اوقات یہ اسپورٹس مین اسپرٹ کے نعم البدل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اس لیے کھیل کا میدان ہو یا الیکشن کا اکھاڑا، ہار جیت کے مواقع پر خوش دلی کا مظاہرہ، فتح مند ہو کر چھچھورپن کا انداز نہ اپنانا، اور شکست کو مسکرا کر سہنا بھی 'علی گڑھ اسپرٹ' ہی کی نمایاں اقسام ہیں، تاہم اس لفظ کے موثر اور سودمند ہونے کا اس روز پتہ چلا جب ہمارے عظیم استاد علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مرحوم نے دَورانِ کلاس اس کی بالکل ایک نئی تفسیر بیان فرمائی جس کے مطابق 'علی گڑھ اسپرٹ' کے صحیح معنی Rising to the occasion ہیں یعنی انسان کو جو کام بھی سونپا جائے وہ قطع نظر اس کے کہ اس کو اس کا کوئی سابقہ

تجربہ ہے یا نہیں اس پر پورا اترنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگادے، اس لحاظ سے اگر دیکھا جاتے تو 'علی گڑھ اسپرٹ' ایک ایسا ضروری اسلحہ ہے جس کو بروقت استعمال کرنے کی صلاحیت ہر علیگ میں پیدا کر دی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اتنا ہی بڑا چیلنج بھی ہے جس کو قبول کرنے کی توقع بھی کی جاتی ہے، کیونکہ علی گڑھ میں نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ 'علی گڑھ اسپرٹ' کا درس بھی زور شور سے جاری رہتا ہے جس کو عملی جامہ پہنانے کے مواقع اکثر مہیا کیے جاتے ہیں، چنانچہ جس طالب علم نے بھی 'علی گڑھ اسپرٹ' کا یہ مفہوم اپنایا وہ ہر جگہ سرخ رو و کامران نظر آیا، اس ضمن میں خود ہمیں اپنی زندگی میں بارہا ایسی آزمائشوں سے گزرنا پڑا کہ جب ہمارے پاس ان مراحل کو سر کرنے کے لیے مطلوبہ علمیت تھی نہ وسیع تجربہ، لیکن الہامی طور سے ہمارے کانوں میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے الفاظ گونجے جس نے ہماری بروقت ہمت بندھائی اور 'علی گڑھ اسپرٹ' کی بدولت کامیابی نصیب ہوئی، مگر یہ تو ایک ادنیٰ سی جھلک تھی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بزرگ علیگ بھائیوں کے بے شمار قابلِ ستائش کارنامے ہمارے سامنے ہیں جو انھوں نے 'علی گڑھ اسپرٹ' اپنا کر سرانجام دیے، لیکن ہماری ناچیز رائے میں جس سے غالباً آپ متفق ہوں۔ 'علی گڑھ اسپرٹ' کے صحیح معنی سے واقفیت اور اس کا مکمل ادراک بانی علی گڑھ سرسید رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی کی آگاہی سے حاصل ہوتا ہے، ویسے تو اس ہمہ جہت، رہبر ملت نے مسلمانِ ہند کی اصلاحِ احوال کے لیے کوئی شعبۂ حیات باقی نہیں چھوڑا، وہ معیشت کی بحالی ہو یا معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنا یا حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ہمہ وقت پاس رکھنا، سرسید نے جن حالات میں قوم کی فلاح کا بیڑا اٹھایا وہ انتہائی صبر آزما تھے قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا، کفر کے فتوے اور دشنام طرازیاں اس پر مستزاد، لیکن سرسید نے کبھی ایسے دشمنوں کو درخورِ اعتنا نہیں گردانا اور ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا۔ تا آنکہ مخالفین کو ہر محاذ پر پسپائی ہوئی اور سرسید کو سرخ روئی و کامیابی ملی، جس سے یہ درس ملتا ہے کہ شدید ترین مخالفتوں کے علی الرغم کام پر پورے انہماک سے ڈٹے رہنے کا نام بھی 'علی گڑھ اسپرٹ' ہے۔

بانیٔ علی گڑھ کی زندگی سے ایک اور لطیف نکتہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ انسان ریٹائرمنٹ کے بعد بھی صلاحیت کار رکھتا ہے بلکہ زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے کیونکہ

سرسید نے جن بڑے منصوبوں کا بیڑا اٹھایا اور اپنی حیات میں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچایا وہ بیشتر اس کے ریٹائرمنٹ کے بعد ہی شروع کیے گئے تھے، لہٰذا ریٹائرمنٹ کے بعد پہلے سے زیادہ دلچسپی سے تعلیمی، معاشرتی اور فلاحی منصوبوں میں حصّہ لنا بھی عین سنتِ سیّد اور علی گڑھ اسپرٹ ہے۔

لیکن اس مصلحِ قوم نے حصولِ علم کو سب سے زیادہ فضیلت واہمیت دی جس کی ترویج و فروغ کے لیے اس نے اپنی زندگی تج دی بلاشبہ ان کا یہ عظیم کارنامہ مسلمانِ برِّصغیر پر دائمی احسان ہے، سرسیّد کے اس ارفع واعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جدید علوم سے آراستہ درسگاہوں کا قیام لازم تھا، پھر اس سے بھی دُشوار تر مسئلہ اس دور کے مسلمانوں کو حصولِ علم پر آمادہ کرنا تھا، جس کے لیے وہ ایک طویل جدّوجہد کرتے رہے اور بالآخر حالات کی نامساعدت کے باوجود ان کے عزم واستقلال نے فتح پائی اور قوم نے جہالت کی مایوس کن تاریکیوں سے نکل کر علم کا سورج دیکھا جس کی تابانی سے آج بحمد اللہ ملک کا قریہ قریہ جگمگا رہا ہے، چنانچہ سرسیّد کے اس مطمحِ نظر اور جہاد کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ علی گڑھ اسپرٹ کے بنیادی معنی تعلیمی اداروں کا قیام اور علم کی شمعیں روشن کرنا ہے، چونکہ جب اور جہاں یہ شمعِ فروزاں ہو جاتی ہے وہاں ہر طرف علم کے نور سے دن کا اُجالا پھیل جاتا ہے اور یہ آفتابِ علم پھر کبھی غروب ہوتا ہے نہ اسے گہن لگتا ہے بلکہ اس سے آئے دن تاریک ترین گوشے روشن ہو جاتے ہیں چنانچہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی کہ 'علی گڑھ اسپرٹ' کی جامع اور مکمل تفسیر دراصل 'سرسیّد اسپرٹ' ہی ہے، جس اسپرٹ کو آج بھی اپنا کر سرسیّد کا نصب العین حاصل کیا جاسکتا ہے جو ہر علیگ بلکہ مسلمان نوجوان کے لیے ترقی کا زینہ ہے جس کو جدید اصطلاح میں Escalator لکھنا زیادہ موزوں ہوگا اور جس پر گامزن ہو کر ہم آج بھی دہشت گردی، ظلم وتعدّی جیسی ہلاکت خیزیوں سے نجات پاکر حقیقی بھائی بھائی بن کر ملک وقوم کی خدمت کر سکتے ہیں جو ہم سب کا انفرادی واجتماعی ملّی فریضہ ہے، اس لیے ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وطنِ عزیز یا کسی بھی ملک میں جس دن 'سرسیّد اسپرٹ' کو اپنانے اور نظریۂ حیات بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا وہاں عدل وانصاف مساوات اور یک جہتی کا دَور دورہ ہوگا۔

سہ ماہی فکر وآگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

فیضانِ سرسید جس کو کرامت لکھا بجا ہوگا، کے طفیل برصغیر کیا بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک امریکہ، انگلینڈ، کینیڈا، سعودی عرب، کویت، عرب امارات وغیرہ کے اہم شہروں میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشنز قائم ہیں، جن کا دائرہ کار محض سماجی یا مذہبی تقریبات تک محدود نہیں کیونکہ ان کا مطمحِ نظر ترویج تعلیم اور معیاری درسگاہوں کا قیام ہے۔

"حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مستحق ہو سکتا ہے تو یقیناً سرسید احمد خاں اس کے مستحق تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن ان میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز لیاقتیں اور اوصاف مجتمع ہوں۔ وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، علم کا حامی، قوم کا ہمدرد، ریفارمر، پولیٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا۔ اس کا اثر اس عالم کا نہ تھا جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل لبھائے بلکہ وہ علانیہ دنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بن کر اس لیے آیا کہ جس بات کو سچ اور صحیح سمجھے اگر اس کی دنیا مخالف ہو تو ساری دنیا سے لڑنے کے لیے ہر وقت تیار اور آمادہ رہے، ہندوستان میں ہم کو ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں مل سکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا، نہ دولت تھی باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہوا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار کے زور کے حاصل نہیں ہوا۔" (مجلہ سرسید ۱۹۴۴ء ——— پروفیسر آرنلڈ)

نسیم انصاری

علی گڑھ

ادب سے نام لیتا ہوں میں ان کا باوضو ہو کر
وہ جن کا سلسلہ ملتا ہے سرکارِ رسالت سے
مگر جب ذکر سر سید کا ہوتا ہے سرِ محفل
تو اپنا سر جھکا لیتا ہوں احساسِ عقیدت نے

ادھر غالب ہوئے جاتے تھے جب افکار مغرب کے
وہیں دیں محمد کو بھی خطرہ تھا حکومت سے

بڑا مشکل پنپنا ہے پھر اس ملت کا دنیا میں
کہ جس کی فکر رُک جائے غلام افکار ہو جائیں
جبیں جھک جائے جس کی غیر کے ایوانِ دولت پر
حمیت، روحِ ایمانی، یقیں، مُردار ہو جائیں

زوالِ علمِ عرفاں سے، زوال آئے گا ایماں پر
مئے مغرب نشہ بن بن کے چھائے گی مسلماں پر

کیا بیتاب اس نکتے نے اس مردِ قلندر کو
فقط تعلیم سے ہوں گے یہاں صاحب نظر پیدا
علوم و فکر سے بیدار ہوگی قوتِ ایماں
یہ دریا ہے جو کر دیتا ہے قطروں سے گہر پیدا

"غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ تقدیریں"
فقط یہ نور ہے جس سے پگھل جاتی ہیں زنجیریں

یہ مرکز علم و دانش کا اسی کا کارنامہ ہے
زمانہ آج اس مرکز سے کسبِ نور کرتا ہے
محافظ ہے یہی مرکز بلند اقدار مشرق کا
یہ اک روشن منارہ ہے اندھیرا دور کرتا ہے

حصولِ علم لازم ہے یہ ہے پیغام سید کا
رہے گا تا ابد زندہ جہاں میں نام سید کا

قطعہ

اقبال بیدار

فیض اُٹھائیں اہلِ وطن سب، ایسے تھے خدمات کہاں
ہند میں سر سیّد سے پہلے علم کی تھی برسات کہاں
گلشن علم کے پھولوں کی خوشبو جو اتنی مہکی ہے
لاکھوں ہوئے انساں مگر وہ سر سیّد سی بات کہاں

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ڈاکٹر راحت بدر

انجمن الفرض (ڈیوٹی سوسائٹی)

سر سید آہنی ارادہ اور قوتِ عمل کے مردِ میدان تھے انھوں نے جس صبر و تحمل سے بے شمار رکاوٹوں، مخالفتوں کا مقابلہ کیا وہ آسان کام نہ تھا۔ قوم کے درد سے بے چین مسلمانوں کی درس گاہ قائم کرنے اور ان کے نونہالوں کو زیورِ تعلیم کے ساتھ تہذیب سے آراستہ کرنے کے لیے زرِ کثیر کی ضرورت نے سر سید سے وہ سب کام کر والئے جس سے کالج کے لیے رقم حاصل ہو سکے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوے۔ ان کے رفقا بھی انھیں کی طرح قوم کا درد اپنے دل میں رکھتے تھے اور ان کے کام میں ان کی حوصلہ افزائی کے ساتھ برابر شریک رہے۔ وہ چاہے بینی ریڈنگ تھیئٹر ہو یا وفد کی شکل میں کسی والیٔ ریاست سے ملاقات۔

کالج کے قائم ہونے کے زمانہ میں عموماً خوشحال خاندان اپنے بچّوں کو علیگڑھ بھیجنے کے لیے تیار نہ تھے۔ عموماً کالج میں داخل ہونے والوں کی زیادہ تعداد غریب طلبا کی تھی۔ اس وقت سر سید اور ان کے رفقا نے غریب طالب علموں کی بڑی مدد کی۔ اس کارِ خیر میں عوام کو شریک کرنے کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے نومبر ۱۸۸۹ء میں انجمن الفرض قائم کی جو عرف عام میں ڈیوٹی سوسائٹی کے نام سے مشہور ہے۔ پروفیسر

ٹی۔ ڈبلو۔ آرنلڈ اس کے پہلے کیپر مقرر ہوئے وہ اس عہدہ پر ۱۹۰۴ء تک رہے پھر اپنے وطن انگلستان واپس چلے گئے۔ مسز آرنلڈ نے بھی ڈیوٹی سوسائٹی کے کاموں میں بھرپور حصہ لیا۔ ۱۸۸۹ء اور ۱۹۰۴ء کے درمیان سوسائٹی نے بہترین کام سرانجام دیئے۔ ڈیوٹی سوسائٹی کے کارناموں کے لیے ملاحظہ فرمائیے ماریسن کی ہسٹری آف ایم۔ اے۔ او کالج۔ پروفیسر آرنلڈ کے بعد علیگڑھ کے متعدد نامور فرزندوں نے ڈیوٹی سوسائٹی کی کامیابی کے لیے کی گئی کوشش میں بھرپور حصہ لیا۔ ان میں سر ضیاء الدین پروفیسر مجید قریشی، پروفیسر خواجہ غلام السیدین۔ سر شاہ سلیمان، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر اے۔ بی۔ اے حلیم۔ پروفیسر محمد عمر فاروق اور پروفیسر یوسف حسین خاں کے نام بطور خاص لیے جا سکتے ہیں۔

انجمن الفرض (ڈیوٹی سوسائٹی) کے مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ سرسید کے خیالات پر مبنی تعلیم کا فروغ بالخصوص سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں۔
۲۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی توسیع اور ترقی۔
۳۔ علیگڑھ یونیورسٹی کی رفتار اور کاموں کی نشر و اشاعت کے ذریعہ علیگڑھ موومنٹ کا فروغ اور ترقی۔
۴۔ یونیورسٹی اور اس سے متعلق اداروں کے مستحق طلبا کے لیے مالی امداد کی فراہمی۔

انجمن الفرض چار کمیٹیوں میں منقسم تھی۔

۱۔ اسکالرشپ کمیٹی جو غریب طلبا کی امداد کے واسطے روپیہ جمع کرتی تھی۔
۲۔ فری بورڈنگ ہاؤس کمیٹی جو کہ بے مقدور اسکول کے طالب علموں کے رہنے کے لیے فری بورڈنگ ہاؤس بنانے کو روپیہ جمع کرتی تھی۔
۳۔ تجارتی کمیٹی جس نے کہ کالج کے احاطہ میں ایک منتقل دکان قائم کی ہے اور جو مختلف موقعوں پر مندرجہ بالا مقاصد انجام دینے کے واسطے چائے وغیرہ کی دکانیں کھولتی تھی۔
۴۔ کمیٹی مسجد۔ جو کہ کالج کی مسجد کے واسطے روپیہ جمع کرتی تھی۔

ان مقاصدِ جلیلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا بہت مشکل تھا۔

انجمن الفرض نے کالج کے استحکام اور تعلیم کے فروغ دینے میں بہت اہم رول ادا کیا، اس کے سالانہ جلسے منعقد ہوتے تھے۔ ایک جلسے میں مولوی بہادر علی نے جو تقریر کی تھی اس کے مندرجہ ذیل الفاظ بہت اہم ہیں:

"صاحبو! اس سے زیادہ پست خیال کیا ہو سکتا ہے کہ ہماری مدد اہل حکومت کریں۔ ہمارے لیے خاص رعایتیں کی جاویں جس سے ہم میدانِ مقابلہ میں گو خود برابری نہ کر سکیں، برابر کر دیے جاویں۔ کیا دیہ ہے کہ ہم خود اپنی مصیبت کو دور کرنے کا خیال نہ کریں یا اپنے جسموں کا بوجھ اپنے پیروں پر سہارنے اور عارضی سہاروں پر بھروسہ کرنے کی قوت پیدا نہ کریں۔"

۸ راگست ۱۸۹۳ء کو انجمن الفرض کا دوسرا سالانہ جلسہ تھا اس میں اساتذہ اور طلباء کے علاوہ حالی بھی تھے۔ انھوں نے دو باتوں پر خاص طور سے توجہ دلائی حالی سے زیادہ موثر طریقۂ بیان کس کو نصیب ہو سکتا ہے۔ حالی نے کہا:

"ان کا (سرسید احمد خاں کا) سب سے عظیم الشان کام جو اسلام کی تاریخ میں نہایت عجیب اور حیرت انگیز ہے وہ یہی ہے کہ ایک قومی کام کے لیے انہوں نے مسلمانوں کی خالی جیبوں میں سے بیس لاکھ روپیہ نکلوایا ہے۔ انجمن الفرض نے بھی ان کے ان عظیم الشان کام کی پیروی اختیار کی ہے۔ پس اس کے ممبروں کو سوچنا چاہیئے کہ انھوں نے کس شخص کی پیروی اختیار کی ہے اور کیسے مشکل کام کا بیڑا اٹھایا ہے لیکن ان کو ہرگز مایوس نہ ہونا چاہیئے اور سرسید کی ابتدائی کوششوں پر غور کرنا چاہیئے۔"

اس سے آگے بڑھ کر حالی نے ایک قسم کا چیلنج دیا کہ:

"اے ممبرانِ انجمن الفرض اگر بالفرض محمڈن کالج مسلمانوں میں بڑے بڑے فاضل اور اسپیکر اور مصنف پیدا کر دیئے اور اس کے طالب علم بڑے بڑے بیرسٹر اور پلیڈر اور جج جمع ہو جائیں لیکن اوس میں ایسے اولوالعزم قوم کے خدمت گزار پیدا نہ ہوں جو قوم کی بھلائی میں دل و جان سے کوشش کریں تو سمجھنا چاہیئے کہ محمڈن [illegible] کوئی نمایاں کام بن کر نہ آیا اور اس کی تعلیم سے براہِ راست

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کسی کو کچھ فائدہ نہ پہنچا۔"

انجمن الفرض کے لیے وفد مختلف شہروں کے سفر پر گئے۔ پہلے وفد میں عبیداللہ خاں صاحب اور مولوی بہادر علی نے روپیہ جمع کرنے کے لیے آگرہ کا سفر کیا۔ دوسرے وفد میں مولوی مظہرالحق صاحب اور سید طفیل احمد صاحب نے سہارنپور کا سفر کیا۔ انجمن میں آنے والا پہلا عطیہ دو آنے تھا جو سہارنپور سے ملا۔ ہندوستان کے علاوہ باہر کے ممالک سے بھی مختلف اوقات میں اس سوسائٹی کو رقم موصول ہوئی۔ چین سے ہانگ کانگ رجمنٹ نے ۱۴ روپیہ بھیجے۔

ان حضرات کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں روپیہ جمع ہونا شروع ہو گیا اس سلسلہ میں دوسرے طریقے بھی اختیار کیے گئے ۱۲ر ۱۳ر دسمبر ۱۸۹۰ء میں مدرستہ العلوم کے اسپورٹس کے سالانہ اجلاس کے موقع پہ مولوی مظہرالحق صاحب نے چائے کی ایک دکان کھولی جس سے سولہ روپیہ پس انداز ہوئے اس کے بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور مولوی مظہرالحق صاحب نے الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں ایک دکان کھولی یہاں مع چندہ کے پانچ سو روپیہ وصول ہو۔ صاحبزادہ صاحب نے اس طرح کے کئی کام انجمن الفرض کے استحکام کے لیے انجام دیے۔

اس سوسائٹی نے ملک کے کونے کونے سے ایم۔ اے۔ او کالج کی ترقی اور استحکام کے لیے مالی امداد حاصل کرنے اور ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی چارٹر کے تحت تیس لاکھ روپے کا ایک مستقل فنڈ جمع کرنے کا اہم کام انجام دیا ہے۔ اس کے علاوہ بیس ہزار غریب طلبا کو مالی امداد بھی دی ہے۔ ان فائدہ اٹھانے والوں میں سے دو برِّ صغیر ہند و پاک میں سے ایک ملک کے سربراہ بنے۔ سوسائٹی نے علیگڑھ کے انجینئرنگ اور میڈیکل کالجوں کے لیے چندہ جمع کیا۔ سلیمان ہال اور پوسٹ آفس کی تعمیر کے لیے رقم فراہم کی۔ سرسیّد کے خیالات کے فروغ مثلاً ـــــ

۱۔ عقل و فہم کی برتری اور بالادستی۔ ـــــ Supremacy of Reason

ماہی فکر و آگہی علی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۲۔ آزادانہ تحقیقات کے ذریعہ سائنسی مزاج

Scientific Temper through free enquiry

۳۔ ضمیر کی آزادی — Liberty of Conscience

۴۔ آزادی تقریر — Freedom of Expression

۵۔ سخت محنت — Hard Work

۶۔ مذہبی تعصبات سے اوپر اٹھ کر انسانی تعلقات استوار کرنا

Secular Approach in all spheres of human relationships

۷۔ تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر وسیع القلبی اور رواداری سے مسائل پر غور کرنا۔

Large hearted tolerance overriding all parochial considerations

کے لیے بھی سوسائٹی نے اہم کام انجام دیئے۔

مستقبل قریب میں جو اہم شخصیتیں سوسائٹی کی پیٹرن بنی ہیں ان میں پروفیسر اے۔ ایم خسرو، احمد رشید شروانی، پروفیسر اے۔ آر قدوائی۔ ڈاکٹر اختر حسین رضوی ڈاکٹر فاروق عبداللہ، حکیم عبدالحمید، پروفیسر مونس رضا، پروفیسر مقبول احمد لاری۔ الحاج معین الحق چودھری، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ جناب سید علی زیدی، پروفیسر کیو۔ ایچ۔ فاروقی، ڈاکٹر سید ظہور قاسم، جناب مشہود احمد، پروفیسر تقی حسین کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

سوسائٹی کے دستور کے مطابق ہر وہ شخص جو دس ہزار کا عطیہ دے یا چندہ جمع کرے اس کو سوسائٹی کا پیٹرن بنایا جاسکتا ہے۔ سوسائٹی کے گرانقدر مقاصد کے لیے مزید کوشش اور مسلسل سعی بلیغ کی اب بھی ضرورت ہے تاکہ ملت کی فلاح و بہبود میں ہم بھی اس کے حصہ دار بن سکیں۔

علم کی تحقیقات میں بحث جہاد ہے۔ (حدیث)

ماہی فکر و آگہی علی علیگڑھ مسر ۲۰۰۰ء

پروفیسر رشید احمد صدیقی

آشفتہ بیانی مری

علیگڑھ اور کھیل

میری طالب علمی کے زمانہ میں علیگڑھ میں کرکٹ کے بڑے زبردست میچ ہوئے۔ ہندوستان کی تقریباً ساری مشہور ٹیمیں آئیں اور دونوں طرف کے نامور کھلاڑی اور بولر بر سر کار دیکھے گئے۔ چار سال تک مسلسل علیگڑھ کی فیلڈ پر علیگڑھ کی جیت ہوئی۔ ۱۹۱۵ء سے پہلے کا کرکٹ کا ریکارڈ اس سے بھی زیادہ شاندار رہا تھا اور اس طرح کرکٹ کے کارناموں کی ایک قابلِ قدر روایت چلی آرہی تھی اور علیگڑھ کرکٹ کے تصور نے ایک حد تک میتھالوجی کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

یہ آرزو بہت دنوں تک رہی اور اب بھی کچھ کم نہیں ہے کہ علیگڑھ کرکٹ کی پوری داستان ان لوگوں کی مدد سے مرتب کرلی جاتی تو بہت اچھا ہوتا جنھوں نے معرکے کے کھیلوں میں خود حصہ لیا تھا یا اپنے بیشتروں سے مشہور میچوں کے حال سنے تھے۔ ابھی ایسے لوگ زندہ ہیں جو اس کام میں مدد دے سکتے ہیں۔ اسی طرح کرکٹ کا ایک میوزیم ہونا چاہیے جس میں ہر سال کی ٹیموں کے نام، ان کے فوٹو گروپ، ٹرافیز مل سکیں تو مشہور کھلاڑیوں کے بلے۔ لگ گارڈ۔ دستانے۔ ٹوپی بلیزر۔ ان کی تصاویر۔ اس عہد کی اسکورنگ بک اور اس طرح کی دوسری چیزیں میوزیم کی زینت بنائی جائیں۔ کس کو معلوم اس طرح کے کتنے نوادر کن گوشوں

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سے برآمد ہوں۔ اور اس کتاب اور اس میوزیم کا ہمارے طلبا پر نسلاً بعد نسلٍ کتنا اچھا اثر پڑے گا۔

۱۹۱۵ء میں ہز ہائینس بھوپال (پرنس حمید اللہ خاں صاحب) کی کپتانی کا دور ختم ہو چکا تھا اور کالج کے کرکٹ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ ایم۔ اے۔ او کالج کے آخر زمانہ تک کرکٹ فیلڈ یا کرکٹ نٹ پر جس طرح کے آداب ملحوظ رکھے جاتے تھے وہ صرف علیگڑھ کا حصّہ تھا۔ کرکٹ میچ ہو رہا ہو یا نٹ پر پریکٹس، ناممکن تھا کہ سوا کیپٹن کے جو ضرورت کے وقت احکام یا ہدایت نافذ کرتا تھا کسی اور کو "مجال دم زدن" ہو اور یہ کچھ کھیل کے میدانوں ہی پر موقوف نہ تھا بلکہ یونین ڈائننگ ہال۔ مشاعرے وغیرہ میں بھی کم و بیش اسی طرح کا نظم ملتا تھا۔

یہاں یہ ثابت کرنا مقصود نہیں ہے کہ اس زمانہ میں لڑکے فرشتے ہوتے تھے یا غلام اور آقا کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ حریفانہ چشمک، سازش اور صف آرائی کبھی کبھی دھول دھپا یہ سب تھا ٹیموں میں پارٹی بندی بھی رہتی تھی۔ جو کبھی کبھی اپنا رنگ دکھاتی تو جہاں تہاں زک بھی اٹھانی پڑتی تھی لیکن بحیثیت مجموعی ناروا باتیں حدود سے تجاوز نہ کرتی تھیں۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ سنئے۔ ایک بار کرکٹ ٹیم ٹور پر جانے والی تھی۔ ایک کھلاڑی اور کپتان سے کسی بات پر اختلاف آرا ہوا۔ کھلاڑی نے ٹور پر جانے سے انکار کر دیا جس سے ٹیم کی طاقت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ معاملہ کسی طرح رو براہ ہوتا نظر نہ آیا تو انگریز پرنسپل سے رجوع کیا گیا۔ موصوف نے کیپٹن کو ایک حکمنامہ بھیجا کہ اس کھلاڑی کو ٹیم کے ساتھ لے جاؤ کسی میچ میں کھیلنے نہ پائے اور ہر میچ کے دوران میں اسکورر کے پاس بیٹھ کر کھیل دیکھنے سے "لطف اندوز" ہو۔ اس فیصلے کی حرف بحرف تعمیل کی گئی۔

کرکٹ میچ کا اجتماع کتنا ستھرا اور شاندار ہوتا تھا۔ ہر طالب علم تماشائی یونیفارم میں ملبوس ہوتا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کلاس میں کسی تقریب میں یا ہوسٹل سے باہر کسی طالب علم کا بغیر یونیفارم کے پایا جانا ناممکن تھا۔ یہ بات علیگڑھ میں

سہ ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اس درجہ عام تھی اور اس سختی سے اس کی پابندی کی جاتی تھی کہ اگر کسی موقع پر اپنے ہی کسی ساتھی کو کسی دوسرے لباس میں اچانک دیکھ لیتے تھے تو جھجک جاتے تھے کہ وہی تھا یا کوئی اور۔ عیدین کے موقع پر جب یونیفارم کی قید اٹھا دی جاتی تھی تو ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے آتے ہوئے طلبا اپنے اپنے مخصوص لباس میں نظر آتے تھے۔ یہ ایک عجیب دلکش نظارہ ہوتا۔ ایسا نظارہ جو علیگڑھ کے سوا شاید کہیں اور دیکھنے کو نہ ملتا ہو ایسا معلوم ہوتا جیسے کالج کی مسجد بورڈنگ ہاؤس اور سڑکیں غالب کے اس شعر کی مصوّری کر رہی ہوں۔

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

لڑکے کرکٹ لان کے تین سمت کھڑے بیٹھے یا ٹہلتے ہوئے میچ دیکھتے تھے کالج یونیفارم میں لڑکوں کا یہ اجتماع ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک نیچی اونچی آڑی ترچھی دیوار چلی گئی ہو جس کے نچلے حصّہ پر سپیدی کر دی گئی ہو وسط سیاہ تھا اور بالائی حصہ سرخ نوجوانوں کا ایسا شائستہ، شریفانہ زندگی کی صالح توانائیوں سے بھرپور اجتماع کم لوگوں نے کہیں اور دیکھا ہوگا۔ پھر اپنے کھلاڑی کرکٹ کے اعلیٰ درجے کے یونیفارم زیب تن کیے ہوئے فیلڈ میں اطمینان اور وقار سے اترتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے آج کا دن صرف ہمارے کارناموں کا دن ہے۔ کرکٹ یونیفارم[1] کے بارے میں جو بات میں نے بیان کی ہے وہی کرکٹ کے ساز و سامان پر بھی صادق آتی تھی۔ اس سے امارت کا اظہار یا تعلی مقصود نہیں۔ بتانا یہ ہے کہ کرکٹ

[1] اس سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ علیگڑھ کی ٹینس ٹیم میچ کھیلنے باہر گئی۔ میچ ایک مشہور کالج کی ٹیم سے تھا۔ اتفاق یہ کہ حسن کے ساتھ میچ ہونے والا تھا۔ وہ ٹینس کے یونیفارم میں رہتے جو اس زمانہ میں سپید فلالین یا ریٹن کا پتلون اور سپید ہی فلالین یا ٹوئیل کی قمیص پر مشتمل تھا۔ علیگڑھ کی ٹیم کے ایک کھلاڑی نے اس بنا پر کھیلنے سے انکار کر دیا کہ مقابل کے کھلاڑی مناسب یونیفارم میں نہ تھے ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ اس کو گوارہ نہیں کر سکتے کہ علیگڑھ ایسی جگہ اور ایسی ٹیم کے ساتھ ٹینس کھیلے جہاں ٹینس کا احترام ملحوظ نہ رکھا جاتا ہو۔ بڑی مشکلوں سے اس نزاکت پر قابو پایا گیا۔

کا حال چائے اور شراب کا سا ہے دونوں شروع سے آخر تک "زخاکِ تیرہ درون تا بہ شیشہ حلبی" ہر منزل پر پوری احتیاط اور احترام چاہتے ہیں۔ اگر ذرا بھی چوک ہو جائے تو "محرم رازِ درونِ میخانہ" فوراً بتا دے گا کہ کہاں بے حرمتی ہوئی۔ چائے اور شراب کی مانند کرکٹ[1] بھی بڑی سخت گیر محبوبہ ہے، دیوتا اپنے پجاریوں کی کسی لغزش کو ممکن ہے معاف کر دیتے ہوں چائے شراب اور کرکٹ کبھی نہیں معاف کرتے۔

میچوں میں ہارنے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے لیکن اس زمانہ میں کم سے کم مجھے کبھی اس کا گمان نہ ہوا کہ میچ میں علیگڑھ ہار جائے گا۔ کیسے کیسے مشاق اور منجھے کھلاڑی تھے جو بغیر کسی تذبذب کے پورے اعتماد کے ساتھ کتنا خوبصورت اور توانا کھیل کھیلتے تھے۔ ہر اسٹروک جیسے منتر سے نکلا ہوا تار یا کڑی کمان کا تیر۔ کبھی نہ چوکنے والے فیلڈرس۔ پنجاب کے ایک ممتاز اولڈ بوائے اور اپنے زمانے کے غالباً کرکٹ کیپٹن کالج آئے ہوئے تھے۔ ایک شام ڈنڈا ٹیکتے ہوئے نٹ پریکٹس دیکھنے آ گئے۔ ایک صاحب کے کھیلنے کا انداز دیکھتے ہوئے گرجے "کیا مکھی ہانکتا ہے۔ گلی ڈنڈا کھیل، کرکٹ ہے" پریکٹس ختم ہوئی تو لڑکے کو پاس بلایا بولے کیوں، ماں کا دودھ پینے کے بعد پھر دودھ میسر نہ آیا۔ دیر تک بڑی شفقت سے مختلف اسٹروک کے انداز بتاتے رہے لیکن دودھ پینے پر بھی زور دیتے رہے!

ان میچوں میں تماشائی جتنی برمحل داد دیتے تھے اتنے ہی چبھتے ہوئے فقرے بھی کستے تھے لیکن سب سے بڑی بات جو اس وقت ایک فریضہ کے طور پر ملحوظ رکھی جاتی اور فطرت ثانیہ کے طور پر وقوع میں آتی یہ تھی کہ مجمع اچھے اسٹروک، اچھی بولنگ اور اچھی فیلڈنگ کی فی الفور داد دیتا تھا بغیر کسی تخصیص کے کہ کھلاڑی اپنا ہے یا غیر۔ مقابل کا اچھا کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا تو اظہار افسوس بھی خلوص کے ساتھ کرتے یہ بات اب بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اکثر و بیشتر اپنوں کی تعریف کرتے ہیں اور مخالف پر بے محل اور بے جا آواز کستے ہیں۔ چاہتے یہ ہیں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت

---

[1] میں کرکٹ ٹینس ہاکی بلیرڈ اسکیٹنگ کے قبیل کے کھیلوں کو فنونِ لطیفہ میں جگہ دیتا ہوں اور فنونِ لطیفہ میں مالایعنی ناقابلِ عفو ہوتی ہے۔

را علیٰ سے اعلیٰ درجہ کی چیز حاصل کرلی جائے۔ اور وہ لوگ جو اعلیٰ نتائج کے لیے
علی صفات کام میں لاتے ہیں۔ ان کو زک پہنچائی جائے۔

یہ اسپرٹ اب عام ہے گو بحیثیت مجموعی دوسرے مقامات سے علیگڑھ میں
ب بھی کم ہے۔ اب تو بعض مقامات پر یہ حادثہ اکثر ہوتا رہتا ہے کہ ریفری کے فیصلے
سے اختلاف کرکے غریب کو زدوکوب کر دیتے ہیں۔ پہلے کھیل، کھلاڑی، تماشائی بھی
یفری کی حفاظت میں ہوتے تھے۔ اب ریفری پولیس کی حفاظت میں ہوتا ہے۔
اکر صاحب کا یہ کہنا مجھے بہت پسند آیا کہ اسپورٹس مین شپ کا تقاضا یہ ہے
جس ٹیم کے خلاف تماشائیوں کی طرف سے ناروا باتیں سرزد ہونے لگیں، اس
، مقابل ٹیم کو چاہیے کہ کھیلنے سے انکار کر دے اور اس وقت تک کھیلنے پر راضی
ہو جب تک مجمع اس بات پر آمادہ نہ ہو جائے کہ وہ دونوں ٹیموں کے ساتھ
نساں سلوک کرے گا۔

ایم۔ اے۔ او کالج کی ہاکی ٹیم بھی اپنے زمانہ میں ہندوستان کی سب سے
بی ٹیموں میں شمار ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کا مشہور سے مشہور کوئی ٹورنامنٹ
بارنہ تھا جسے یہاں کی ہاکی ٹیم نے مسلسل نہ جیتا ہو۔ کرکٹ اور ہاکی کی جتنی مشہور
ر اعلیٰ درجہ کی ٹرافیز کا ذخیرہ۔۔ علیگڑھ میں ہے شاید ہندوستان کی کسی دوسری
نیورسٹی میں نہ ہو۔ علیگڑھ کرکٹ کی طرح یہاں کی ہاکی بھی مدتوں ہندوستان
ں ناقابلِ تسخیر سمجھی گئی۔ مسلم یونیورسٹی کے عہد میں ٹینس کو ترقی ہوئی۔ فرداً فرداً یہاں
ے کھلاڑیوں نے اچھا خاصا نام پیدا کیا۔ جن میں غوث محمد خاں سالہا سال
نڈیا نمبر ایک" رہے۔

اور باتوں سے قطع نظر کھیل میں نام و نمود حاصل کرنے کے اعتبار سے
لم یونیورسٹی کا ریکارڈ ایم۔ اے۔ او کالج کے ریکارڈ کے مقابلہ میں تقریباً ناقابلِ
لتفات ہے گو یہ بات حیرت و مسرت سے خالی نہیں کہ ذاکر صاحب کی وائس
نسلرشپ میں جہاں اور بہت سی ترقیاں عمل میں آئیں وہاں ہاکی اور فٹ بال
بھی یہ امتیاز نصیب ہوا کہ وہ ہندستان کی تمام دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں
ل آئیں۔ مسلم یونیورسٹی کے پورے عہد میں ہاکی اور فٹ بال کا یہ ریکارڈ قابل

لحاظ ہے۔

ایم۔ اے۔ او کالج اور اس کے کچھ دنوں بعد تک عام طور سے کرکٹ، ہاکی فٹ بال اور ٹینس کو دوسرے کھیلوں کے مقابلوں میں ممتاز سمجھا گیا۔ اور ایک طور پر اسپورٹسمین شپ کا تصور انھیں کھیلوں سے وابستہ رہا۔ آج کل معلوم نہیں کتنے کھیل کل ہند ہی نہیں بلکہ عالمی حیثیت اختیار کر چکے ہیں لیکن یہ بات ضرور کھٹکتی ہے کہ کھیلوں کی تعداد اور دھوم دھام جتنی بڑھتی جا رہی ہے اتنی ہی اسپورٹسمین شپ گرتی جا رہی ہے اور ٹھیک بھی ہے "کثرت اور وسعت" سے معیار بالعموم گرتا ہے، اونچا نہیں ہوتا یہی بات شعر و ادب میں بھی دیکھی جاتی ہے جو مدتوں سے "عوامی بناؤ اور بناؤ" کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔

(ماخوذ، علیگڑھ میگزین ۱۹۵۵ء)

سرسید کا قومی تصوّر

میں اپنی قوم کو آسمان کی مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب میں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو میں اسکے اس حصّہ کی جو نیلا اسیاہ رو ڈراؤنا دکھائی دیتا ہے، کچھ بھی پروا نہیں کرتا مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور حسن کے سبب اس تمام سیاہ رو آسمان کو بھی عجب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوئی ہے۔

اے صاحبو! کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے لغیر جو تمہاری قوم میں ایسے ہی چمکتے ہوں جیسے آسمان پر تارے اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوموں کی آنکھ میں باعزّت بنا سکتے ہو۔؟

۵۱

تحریر : مولوی حبیب اللہ خاں
تلخیص : عبدالمجید قریشی

علیگڑھ اور کرکٹ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڑھ کی شہرت اور موری بہت کچھ ان ورزشی کھیلوں کی مرہونِ منت ہے جو کالج کے قیام کے تھ ساتھ شروع کر دیے گئے تھے۔ ان کھیلوں میں کرکٹ کا درجہ سب سے زیادہ ناز ہے۔ انگریزوں میں علیگڑھ کالج کی مقبولیت کا سبب یہی کرکٹ کا کھیل ہے نکہ یہ ان کا قومی کھیل ہے اور ان کے یہاں اس کھیل کی اس درجہ قدر و منزلت ہے باکمال کرکٹرس کے خطاب نک سے سرفراز کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ آسٹریلیا کا مشہور سر ڈان بریڈمین محض اپنے کھیل کی قابلیت کی وجہ سے نائٹ (سر) بنایا گیا۔ اس لسلے میں انگریزوں کی فراخدلی رنگ و مذہب اور ملک کی حدود کے اندر محدود ہیں جس کی ایک روشن مثال "رنجی" (رنجیت سنگھ) ہیں۔ "رنجی" ریاست نواں نگر کاٹھیاواڑ) کے حکمراں خاندان کے فرد تھے، لیکن انگلستان میں محض اپنے عمدہ

عہدِ سرسید کے طالب علم اور بعد ازاں خاں بہادر ڈپٹی مولوی حبیب اللہ خاں صاحب نے جو اپنے زمانے میں علیگڑھ کالج کی کرکٹ ٹیم کے ایک رکن بھی تھے۔ انھوں نے ایک کتابچہ "علیگڑھ کا کرکٹ" کے نام سے تحریر کیا تھا جس میں علیگڑھ کالج میں کرکٹ کی ابتدا اور عروج و زوال کا تفصیل سے ذکر کیا تھا یہ اس کتابچے کی نلمیص ہے۔ (عبدالمجید قریشی)

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کھیل کی وجہ سے بے حد ہر دلعزیز تھے۔ ہمارے کالج کے جو عمدہ کھلاڑی ہوئے ہیں، وہ بھی ہندوستان کے انگریزوں میں اسی نسبت سے مقبول ہوئے۔

علیگڑھ کالج میں کرکٹ کے کھیل کے بانی پنڈت راما شنکر مصر تھے ان کو سرسید علیہ الرحمہ ۱۸۷۵ء میں پروفیسر بنا کر بنارس سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کا تعلق وہاں کے ایک معزز برہمن خاندان سے تھا اور وہ انگریزی میں بڑے قابل سمجھے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے علیگڑھ چھوڑنے کے بعد انھیں فوری طور پر یو پی کی صوبائی سروس میں جگہ مل گئی اور ترقی کرکے وہ کلکٹر اور مجسٹریٹ کے عہدوں پر فائز ہوئے اس زمانے میں یہ عہدے ہندوستانیوں کے لیے جو انڈین سول سروس کے ممبر نہ ہوں۔ معراج کمال کی حیثیت رکھتے تھے۔

پنڈت راما شنکر مصر اکرکٹ اور دوسرے ورزشی کھیلوں کے بہت شائق تھے اور انھیں اس اعزاز پر بڑا ناز تھا کہ انھیں سرسید نے خود علیگڑھ کالج کرکٹ ٹیم کا کپتان مقرر کیا تھا اور ان کے ذوق وشوق کا یہ نتیجہ تھا کہ علیگڑھ کالج کی کرکٹ ٹیم کی شہرت ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔

میں علیگڑھ کالج میں ۱۸۸۷ء میں داخل ہوا۔ میرے زمانے میں کھیل ہر سال اواخر موسم سرما میں کرکٹ فیلڈ میں ہوا کرتے تھے۔ ان میں مختلف قسم کی دوڑیں، کود پھاند گولہ اندازی، رسہ کشی اور بلّم کے ذریعے اونچا کودنا وغیرہ شامل تھے۔ اس موقع پر تمام طالب علم اور بہت سے تماشائی جمع ہو جاتے تھے۔ سول اسٹیشن کے انگریز افسران ان کی لیڈیاں اور دیگر اکابر بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ سرسید علیہ الرحمہ جب علیگڑھ میں تشریف فرما ہوتے، تو وہ بھی اس موقع پر اور کرکٹ کے بڑے بڑے میچوں پر تھوڑی دیر کے لیے ضرور تشریف لاتے تھے جس سے طلبا اور تماشائی بہت متاثر ہوتے تھے۔

میرے زمانے میں عبدالرحمٰن کانپوری بلّم سے پول جمپ کے لیے مشہور تھے۔ اسی طرح صاحبزادے آفتاب احمد خاں گولہ پھینکنے میں اول رہتے تھے۔

طلبا میں محمد رفیق کرکٹ کے پہلے کپتان ہوئے۔ یہ ان تیرہ طلبا میں شامل تھے جو ۱۸۷۵ء میں کالجیٹ اسکول شروع ہونے پر داخل ہوئے تھے۔ یہ بعد کو بیرسٹر ہوئے اور صوبۂ متحدہ میں جج عدالت خفیفہ پھر جج ضلع اس کے بعد جج چیف کورٹ لکھنؤ اور آخر میں جج ہائی کورٹ الہ آباد اور یہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد سکریٹری

آف اسٹیٹ کی کونسل کے ممبر ہوئے۔

محمد رفیق کے بعد یعقوب شاہ خاں رام پوری ۸۰ – ۱۸۸۱ء میں اور ان کے بعد خواجہ سجاد حسین ۸۱ – ۱۸۸۲ء میں ایک ایک سال کپتان رہے۔ خواجہ صاحب کے بعد احمد حسین خاں ۸۲ – ۱۸۸۶ء چار سال تک رہے۔ ان کا زمانۂ کپتانی طویل تھا اور اس میں کرکٹ کو بہت ترقی ہوئی اور الیون کا مشہور دورہ پنجاب کا ہوا جس سے تمام ہندوستان میں علیگڑھ کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس دورے میں مسٹر بیک پرنسپل جو کرکٹ کلب کے پریذیڈنٹ بھی تھے ٹیم کے ساتھ گئے تھے۔

میں جب ۱۸۸۷ء میں علیگڑھ آیا تو اس سے پہلے بارہ سال کے عمدہ اور مشہور کھلاڑی محمد احمد فرزند نواب وقار الملک نذیر احمد بعدہٗ نواب نذیر جنگ ناظم افواج سرکار حیدرآباد دکن محمد وجیہہ بعدہٗ ڈپٹی کلکٹر صوبہ متحدہ اور کپتان احمد حسین خاں کالج چھوڑ کر جا چکے تھے۔ بایں ہمہ کرکٹ اپنے شباب پر تھا۔ محمد امین کپتان، محمد صدیق نائب کپتان، محمد فصیح سکریٹری اور سید محمود علی بولر تھے جبکہ محمد محمود نہایت عمدہ بیٹسمین اور مولانا طفیل احمد سب سے اچھے وکٹ کیپر تھے۔ مولوی صاحب نے جب الیون چھوڑا تو سرفراز بخش ــــ The Nelson وکٹ کیپر ہوئے۔ یہ عجیب الخصلت شخص اپنی خاص گوراشاہی انگریزی کے لیے بورڈنگ ہاؤس میں مشہور تھے خود ان کا نام ــــ The Nelson ایک دلچسپ قصّہ ہے۔ ۸۶-۱۸۸۶ء کے انٹرنس کورس میں ایک انگریزی کتاب شامل تھی اور سرفراز بخش بھی یہ کتاب پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے بار بار ٹوکنے اور منع کرنے کے باوجود Nelson کے نام کے ساتھ The کا لگانا نہ چھوڑا اس بات کا کالج میں رفتہ رفتہ اتنا چرچا ہوا کہ ان کا اصلی نام بہت کم لوگ لیتے تھے اور سب ان کو The Nelson کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ وکٹ کیپری اچھی کرتے تھے لیکن اپنے پھوہڑ پن کی وجہ سے خود ہی اتنی چوٹیں کھا لیتے تھے کہ جب میچ کے بعد فیلڈ سے بورڈنگ ہاؤس کو واپس آتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ مرغوں کی پالی سے بہت چوٹیں کھایا ہوا کوئی مرغا آرہا ہے۔

کالج میں جو عمدہ اور دلچسپ روایات اس کھیل کی قائم ہو چکی تھیں، ان کو

محمد امین نے اور ترقی دی وہ تین سال تک کپتان رہے اور ان کا زمانہ کرکٹ کا عہد زریں خیال کیا جاتا ہے۔ کپتان محمد امین جب کالج چھوڑ کر صوبہ متحدہ کے محکمہ پولیس میں سب انسپکٹر درجہ اوّل مقرر ہوئے تو ان کے اعزاز میں ایک خاص ڈنر مسٹر بیک پرنسپل کالج نے دیا اور اس میں ایک سپاس نامہ کرکٹ کلب کی طرف سے ان کو پیش کیا گیا۔ یہ اعزاز اس سے پہلے کسی کپتان کو نصیب نہیں ہوا اور جہاں تک ہماری معلومات ہیں اس کے بعد بھی کسی کپتان کو اس قسم کا ڈنر نہیں دیا گیا۔ میرے علم میں یہ اوّل اور آخری موقع تھا جب کسی کپتان کو اس عزت اور محبت کے ساتھ کالج نے الوداع کہا ہو۔ یہ شرف صرف محمد امین کو حاصل ہوا کہ وہ دس سال مسلسل فرسٹ الیون کے ممبر رہے اور تین سال نہایت کامیاب کپتان۔ ڈنر یونین کلب کے کمیٹی روم میں دیا گیا جس کے چاروں طرف تختے لگے ہوئے تھے جن پر کلب کے قائم ہونے کے بعد سے تمام الیونوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ ہر تختے پر محمد امین کا نام موجود تھا۔ یہ ایک ایسی عزت تھی جو صرف اور صرف محمد امین کے حصے میں آئی۔

محمد امین کے بعد محمد صدیق جو اب تک نائب کپتان تھے، کپتان مقرر ہوئے محمد صدیق بڑے اچھے ہٹر (Hitter) اور وکٹ کیپر تھے اور انھوں نے محمد امین کی روایات کو قائم رکھا۔

سر سید علیہ الرحمہ نے اہلِ پنجاب کو جو زندہ دلانِ پنجاب کا خطاب دیا تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پنجاب اور خصوصاً جالندھر نے علیگڑھ کرکٹ ٹیم کو نہایت عمدہ اور بہترین قسم کے کھلاڑی فراہم کیے۔ اس سلسلے میں پہلا نام تو محمد امین ہی کا ہے جن کا ذکر ابھی ہم کر چکے ہیں۔ دوسرے محمد عبید اللہ خاں ہیں، یہ بھی کپتان ہوئے، ان کے بعد خواجہ محمد عبداللہ جن کی الیون نے مسلسل دو سال بمبئی کی پارسی ٹیموں کو شکست دی تھی۔ ان کے علاوہ کے ایم اکرم، وزیر علی، وزیر احمد، اسلام الدین خاں احسان الحق، نور الدین، محمد زماں، منظور المحمود وغیرہ سب جالندھر کے رہنے والے اور علیگڑھ کے آسمانِ کرکٹ کے تابناک تارے تھے۔

محمد صدیق کے بعد عبداللہ خاں ایک سال تک کپتان رہے اور انھوں نے بھی اپنے پیشرو کی روایات کو قائم رکھا۔ ان کے بعد شوکت علی بعدہٗ مشہور و معروف

مولانا شوکت علی کپتان مقرر ہوئے جو خود اچھے کھلاڑی تھے اور ان کی لمبی اور بلند ہٹوں کے افسانے مشہور ہیں لیکن ساتھ ہی اس امر کا افسوس ہے کہ انھیں کے زمانہ میں کرکٹ کا انحطاط شروع ہوگیا۔

کرکٹ کلب کی خوش قسمتی سے ۱۸۸۷ء میں پروفیسر والس کلب کے آنریری ٹریژرر مقرر ہوگئے یہ خود عمدہ کھلاڑی تو تھے نہیں لیکن ان کی طبیعت میں ہر اس کام کے ساتھ شغف تھا جو ان کے سپرد کیا جائے اور اس کا ظہور اس کھیل میں بھی ہوتا رہا۔
والس صاحب میچ میں اپنے کھلاڑیوں کی اس قدر دلداری کرتے تھے کہ ان کے ہم قوم انگریز ان سے ناراض ہو جاتے تھے۔ ان کے شغف کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ۸۹-۱۸۸۸ء کے موسم میں جب کالج الیون نہایت کامیابی کے ساتھ آگرہ، کان پور الہ آباد وغیرہ کے انگریزی کلبوں سے جیت کر علیگڑھ واپس آئی تو اسٹیشن سے کالج تک مسٹر والس فتح مند الیون کے ساتھ اپنی ٹم ٹم پر برابر کھڑے ہو کر آئے اور یہاں جس کسی سے ملتے تھے تو میچوں کا حال بیان کر کر کے اچھل اچھل جاتے تھے۔ انھوں نے کلبوں کی مالی حالت جو دیر سے خراب چلی آرہی تھی مضبوط اور مستحکم کی۔

دوسرے ٹریژرر مصطفیٰ خاں تھے جو یوپی کے مشہور اسپیکر ہوئے ہیں گو خود کھلاڑی نہ تھے اور مسٹر والس کی طرح ان کا شغف بھی اس نوعیت کا نہ تھا لیکن ٹیم کا انتظام سفر نہایت کفایت اور سلیقے سے کرتے تھے ان کا ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش خدمت ہے جس سے ان کی افتادِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔

آگرہ کرکٹ کلب اس زمانے میں ایک نہایت مضبوط اور مشہور انگریزی کلب تھا۔ جب علیگڑھ الیون اس کلب سے میچ کھیلنے کے لیے آگرہ فورٹ اسٹیشن پر پہنچا تو وہاں مصطفیٰ خاں نے ٹیم کے واسطے پانچ گاڑیاں جو اس زمانے میں رائج تھیں کرایہ پر لیں اور کرایہ فی گھنٹہ کے حساب سے ٹھہرایا گیا لیکن مصطفیٰ خاں کو اندازہ نہ تھا کہ مقام میچ کچھ زیادہ دور نہیں ہے، چنانچہ چند منٹوں کے بعد گاڑیاں فیلڈ پر پہنچ گئیں۔ وہاں پہنچ کر مصطفیٰ خاں نے ایک واجبی رقم گاڑی والوں کو دینا چاہی، لیکن انھوں نے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ نے کرایہ فی گھنٹہ کے حساب سے طے کیا ہے، اس لیے ہم اس سے کم نہ لیں گے مصطفیٰ خاں "صاحب" قسم کے آدمی تھے انھوں نے جواب دیا بہت اچھا ہم

تم کو گھنٹے کے حساب سے کرایہ دیں گے۔ تم اس چکر پر جو فیلڈ کے قریب ہے، اپنی گاڑیاں گھنٹہ بھر تک چلاؤ، گھنٹہ پورا ہونے کے بعد ہم تم کو پورا کرایہ دے دیں گے، اب یہ مضحکہ خیز اور دلچسپ سماں تھا کہ تمام لوگ جو میچ دیکھنے کے لیے جمع تھے دیکھ رہے تھے کہ خالی گاڑیاں برابر تیزی سے چکر لگا رہی ہیں۔ دو تین چکروں کے بعد گاڑی والوں نے کہا کہ صاحب اب معاف کیجیے۔ مصطفےٰ خاں نے کہا نہیں تم پورا گھنٹہ چکر لگاؤ ہم پورا کرایہ دیں گے، آخر کار گاڑی والوں کی منت سماجت پر مصطفےٰ خاں نے واجبی کرایہ دے کر ان کو رخصت کیا۔

پروفیسر والس کے آنریری ٹریژرر مقرر ہونے سے پہلے کالج فرسٹ الیون کے یونیفارم صرف سفید فلالین کی پتلون اور قمیص تھی اور پتلون پر سرخ ڈول کا پٹکا کمر میں باندھا جاتا تھا اور سر پر ترکی ٹوپی ہوتی تھی۔ والس صاحب نے اس یونیفارم پر ایک سیاہ سرج کے کوٹ کا اضافہ کیا۔ اس کوٹ پر ایک انچ چوڑی سرخ ساٹن کی گوٹ ہوتی تھی اور بائیں جانب اوپر کی جیب پر کالج کا مونوگرام (کھجور، ہلال اور تاج) ریشم سے نمایاں طور پر کڑھا ہوتا تھا۔ یہ یونیفارم فرسٹ الیون والے فیلڈ کے علاوہ کالج کے جلسوں اور خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتے تھے، اس سے وہ بیک نظر ممیز اور ممتاز نظر آتے تھے۔

پروفیسر والس نے ایک دل پسند کام یہ کیا کہ ہر سال کے فرسٹ الیون کے ممبروں کے نام ایک بورڈ پر خوش خط لکھوا کر یہ بورڈ یونین ہال میں کہ وہی اس زمانے میں ہر قسم کی دلچسپی کا مرکز ہوتا تھا آویزاں کرائے۔ اس سے یونین ہال کی رونق بڑھ گئی اور ہر شخص کو ایک نظر میں معلوم ہو جاتا تھا کہ کون کون سے سال میں کون کون لوگ فرسٹ الیون کے ممبر رہے ہیں۔ پہلا بورڈ ۸۰-۱۸۷۹ء میں آویزاں ہوا جب کرکٹ ٹیم کے کپتان محمد رفیق تھے۔

مجھ کو اپنے وطن شاہجہانپور ہی سے کرکٹ سے دلچسپی تھی اگرچہ میں اچھا کھلاڑی نہ تھا تاہم کھیل میں اور کھیل دیکھنے میں ہمیشہ اپنا پورا وقت صرف کرتا تھا۔ میرے آنے کے کچھ مہینے بعد علیگڑھ میں ایک الیون کالج پارٹی کے نام سے قائم ہو گئی تھی۔ اس ٹیم میں صرف کالج کلاسوں کے طالب علم شریک ہو سکتے تھے اور اس کی خصوصیت

یہ تھی کہ اس کے ممبر سال بھر تک بھی کرکٹ کھیلنے کی مشق نہ کرتے تھے صرف میچ کے دن فیلڈ میں بڑی آن بان کے ساتھ جمع ہوجایا کرتے تھے میرے دوستوں نے مجھے اس پارٹی کا کپتان بنا دیا تھا۔ اس کا میچ ہر سال الیون سے ہوتا تھا مگر اسکول کے الیون میں چھ سات طالب علم وہ ہوتے تھے جو فرسٹ الیون کے ممبر بھی تھے اور وہ حقیقت میں بہت عمدہ قسم کے کھلاڑی تھے، مگر کالج پارٹی ان پر ہمیشہ غالب رہتی تھی، اپنی عمدگیٔ کھیل کی بدولت نہیں بلکہ اسکول کے لڑکوں کو گھبرا دینے کی وجہ سے ہماری پارٹی کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس میں ایک بینڈ ماسٹر بھی تھا اور یہ بینڈ مٹی کے تیل کے چند خالی پیپوں اور اسی قسم کی چیزوں پر مشتمل تھا۔ یہ بینڈ ماسٹر حامد علی خاں فتح گڑھی جو کالج میں "مشفق ستائیں" کے نام سے مشہور تھے، بڑے دلچسپ آدمی تھے، وہ بینڈ ماسٹری کام اور شور مچوانے کا اہتمام اس قدر عمدگی سے کرتے تھے کہ اس سے اسکول کے لڑکے بے حد گھبرا جاتے تھے اور آخر جب کالج پارٹی جیت جاتی تھی تو مسٹر بیک کو اطلاع دی جاتی تھی اور وہ بہت خوشی اور تعجب سے کہا کرتے تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ تم لوگ سال بھر تک کھیلنے کی مشق بھی نہیں کرتے ہو اور پھر جیت جاتے ہو۔ میچ جیتنے کے بعد اسی دن شام کو ڈائننگ ہال میں پُر لطف نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔

دسمبر ۱۸۹۰ء میں صوبہ متحدہ کے سررشتۂ تعلیم نے کرکٹ اور اسپورٹس کا ٹورنامنٹ جاری کیا۔ کمشنری میرٹھ اور آگرہ کے لیے علیگڑھ سینٹر مقرر ہوا اور وہاں ۲۳ دسمبر ۱۸۹۰ء سے یہ ٹورنامنٹ شروع ہوا۔ ہمارا اسکول کرکٹ میں بہ آسانی تمام اسکولوں میں نمبر اوّل رہا اور اسپورٹس کے جو انعامات مبلغ دو سو چوبیس روپے کے تھے ان میں سے مبلغ ایک سو ساٹھ روپے ہمارے اسکول کے حصے میں آئے۔

دوسرے سال ۱۸۹۱ء میں بھی علیگڑھ اس ٹورنامنٹ کا سینٹر رہا، اس سال تنہا کسی ایک اسکول کو ہمارے ساتھ میچ کھیلنے کی ہمت نہ ہوئی، لیکن کُل اسکولوں کے منتخب شدہ الیون اور ہمارے اسکول کے درمیان میچ ہوا جس میں ہمارے اسکول کو نمایاں کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ دونوں سال علیگڑھ میں بڑی رونق اور چہل پہل کے تھے اور ہماری پے در پے کامیابیوں سے یہ شہرت عام ہوگئی تھی کہ علیگڑھ کا فرسٹ الیون تو درکنار چھوٹے لڑکوں سے بھی کرکٹ اور اسپورٹس میں کوئی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

لیکن جلد ہی ہمیں اپنے اس غرور و تکبر کی سزا بھی مل گئی۔

دسمبر ۱۸۹۲ء میں جس سال مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس دہلی میں منعقد ہو رہا تھا۔ ہم نے اپنی پچھلی کامیابیوں کے زعم میں دہلی کے سینٹ اسٹیفنز کالج کی الیون کو جو ہمارے کالج کی زبردست حریف تھی چیلنج دے دیا۔

ہماری ٹیم ۲۲ر دسمبر کی شام کو دہلی پہنچی۔ سینٹ اسٹیفنز کالج کی ٹیم نے اسٹیشن پر ہمارا استقبال کیا اور ہم کو اپنے اسکول کی عمارت میں جو اس زمانے میں چاندنی چوک میں تھی لے جا کر ٹھہرایا۔ ہمارے کالج کی فرسٹ الیون کے ممبر محمد محمود نے جو کالج چھوڑ کر اپنے وطن دہلی میں پڑھا کرتے تھے اور استقبال کرنے والوں میں شامل تھے۔ ہم سے کہا کہ گو اب میں سینٹ اسٹیفنز کالج میں پڑھتا ہوں لیکن میں علیگڑھ کے خلاف کل تمہارے مقابلہ میں شامل نہ ہوں گا۔ یہ تھی وہ اسپرٹ جو اس زمانہ میں علیگڑھ کے طلبا میں پیدا ہو گئی تھی۔

۲۳ر دسمبر کو کوئنز گارڈن ٹاؤن ہال کے پیچھے میچ شروع ہوا۔ سینٹ اسٹیفنز کالج نے ایک سو چودہ رن کیے۔ بعد ازاں جمعہ کی نماز کے لیے وقفہ ہوا۔ ہم لوگوں نے جامع مسجد میں نماز پڑھی اور کالج کی جانب سے دیے گئے لنچ میں شرکت کی۔ لنچ کے بعد دوبارہ میچ شروع ہوا اور ہم ہار گئے۔ ہماری اس شکست کی خاص وجہ حسن محمد کا جو ہماری ٹیم کے عمدہ باؤلر تھے، نہ شریک ہونا تھا انھوں نے علیگڑھ سے مصمم وعدہ کیا تھا کہ میچ کے وقت سے پہلے وہ ضرور دہلی پہنچ جائیں گے لیکن وہ نہ آئے اور صرف ایک زین الدین باؤلر رہ گئے۔ دوسری وجہ شکست کی یہ بھی تھی کہ ہمارا بینڈ اور بینڈ ماسٹر مشتی ستائیں ہمارے ساتھ دہلی نہ گئے تھے اور اصل بات تو یہ ہے کہ خدا کو ہمارا غرور توڑنا تھا اور ہم جو علیگڑھ میں اپنے اسکول کے لڑکوں کو دق کر کے ہرایا کرتے تھے یہ اس کا انتقام تھا۔

اس میچ میں دہلی کی خلقت علیگڑھ کا نام سن کر بڑی تعداد میں جمع ہو گئی تھی۔ یہاں ہمارے اوپر وہ حالت طاری ہوئی جو ہم علیگڑھ میں اسکول الیون پر کر دیتے تھے۔ بینڈ ماسٹر اور بینڈ تو بے شک ہماری طرح کا نہ تھا لیکن شور و غل اور فصیح الفاظ کی وہ بھرمار تھی کہ سب پریشان ہو گئے اور بری طرح سے ہار گئے۔ میچ کے

ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ہمارے قیام کا بندوبست کانفرنس کیمپ میں جو اینگلو عربک کالج کی عمارت میں تھا۔ کیا گیا تھا۔ جب ہم کمپنی باغ سے چاندنی چوک میں آئے اور اپنی جائے قیام کا رُخ کیا تو ایک جم غفیر کچھ قدم پیچھے ہماری مشایعت کرنے لگا اور ہر دس پانچ قدم پر "علیگڑھ کی بھربھری گزک" (علیگڑھ میں جو گزک بنتی ہے وہ بہت خستہ ہوتی ہے اور گرد و نواح میں بہت مشہور ہے) کے نعرے بلند ہونے لگے فتحپوری تک یہ مجمع ہمارے ساتھ رہا۔ وہاں پہنچ کر ہم نے یہی چارۂ کار دیکھا کہ ہم سب دو تین اطراف میں منتشر ہو جائیں چنانچہ اسی طریقے سے ہماری جان بچی۔ جائے قیام پر پہنچے تو ایک دوسری ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔ سر سید علیہ الرحمہ کانفرنس میں شرکت کی غرض سے دہلی تشریف لاچکے تھے اور اینگلو عربک کالج کے ایک حصے میں ان کا قیام تھا۔ وہاں پہنچ کر ہماری پیشی ممدوح کے سامنے ہوئی اور چونکہ میچ کی ناکامی کا حال پہلے ہی ان کے گوش گزار ہو چکا تھا، اس لیئے ہمارے پہنچتے ہی سید صاحب نے کانفرنس کے منتظم صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تیرہ نتھ بنوالاؤ اور ان سب لڑکوں کی ناکوں میں ڈال دو کہ یہ سب لڑکے نہیں ہیں لڑکیاں ہیں کہ اس بری طرح کالج کو بدنام کیا۔ سید صاحب کے فرمان کا ہم کیا جواب دے سکتے تھے نظر جھکائے کھڑے رہے اور جلد نظر بچا کر اپنی قیام گاہ پر چلے آئے۔

یہ پہلا میچ تھا جس میں علیگڑھ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور جیسا کہ میں نے قبل ازیں ذکر کیا علیگڑھ میں کرکٹ کا یہ دورِ انحطاط کچھ ہی عرصہ پہلے مسٹر شوکت علی کی کپتانی کے زمانہ میں شروع ہو چکا تھا۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ آگرہ کی ایک معمولی ہندوستانی ٹیم نے ہماری فرسٹ الیون کو چیلنج دیا جس کا نتیجہ گو بعض وجوہ سے Draw تھا، لیکن درحقیقت یہ ہمارے حق میں شکست تھی۔ فرسٹ الیون والے روزانہ مشق میں بہت سست ہو گئے تھے اور بعض ممبر تو سال میں ایک دن بھی مشق کے لیئے فیلڈ میں نہ گئے تھے۔

اس صورتِ حال کا آخر کار احساس ہوا اور مسٹر بیک پرنسپل نے ۱۷ر جنوری ۱۸۹۲ء کی شام کو راقم الحروف، مسٹر شوکت علی اور میر ولایت حسین صاحب ٹریژرر کو اپنے یہاں بلا کر بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کی اور اس کے بعد یہ قرار پایا

کہ ایک جنرل میٹنگ یونین ہال میں کی جائے جس میں طلبا اور اسٹاف اور دیگر بھی خواہاں کرکٹ بلائے جائیں۔ ۲۵ جنوری کی شام کو یونین ہال میں یہ جلسہ ہوا جس میں محمد امین سابق کپتان بھی بلائے گئے تھے۔ انھوں نے بہت سی عمدہ تجویزیں پیش کیں اور بعض لوگوں نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا آخر میں مسٹر بیک نے ایک نہایت پرجوش تقریر کی جس سے یہ امید بندھی کہ آیندہ کرکٹ کی حالت شاید درست ہو جائے اور واقعی یہ اندازہ درست نکلا کہ کے ایم عبداللہ جالندھری کے کپتان مقرر ہونے کے پہلے ہی سال یہ دورِ انحطاط رُک گیا اور ان کی تین سال کی کپتانی میں پھر علیگڑھ کرکٹ ٹیم کا ستارہ اوجِ کمال پر پہنچ گیا، بعدازاں سید علی حسن نے اپنی سہ سالہ کپتانی میں چار چاند لگا دیے یہ دونوں کپتان خود عمدہ کھلاڑی ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ منتظم اور دیگر صفاتِ ضروری سے متصف تھے۔ سید علی حسن کا نام بحیثیت ایک غیر معمولی عمدہ باؤلر کے اس وقت سے مشہور ہو چکا تھا جبکہ وہ کے ایم عبداللہ کی الیون کے ایک ممبر تھے۔

اسی زمانے میں بمبئی کی مشہور پارسی ٹیم علیگڑھ میں آ کر دو سال مسلسل شکست کھا کر واپس جاتی رہی تھی ان دونوں میچوں میں جو کے ایم عبداللہ کی کپتانی میں ہوئے قرب و جوار سے کرکٹ کے بہت سے معزز شوقین کھیل دیکھنے آئے تھے اور علیگڑھ کی خلقت تو کالج فیلڈ کے چاروں طرف ٹوٹ پڑی تھی۔ سرسید علیہ الرحمہ بھی بہ نفسِ نفیس اس میچ کو ملاحظہ کرنے تشریف لائے تھے۔[۱]

پارسیوں کی شکست کے بعد پٹیالہ کے وہ دو مشہور میچ ہوئے جس سے علیگڑھ اور سید علی حسن کا نام ہندوستان سے باہر پہنچ گیا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے اپنے یہاں نہ صرف ہندوستان بلکہ انگلستان وغیرہ سے بھی مشہور کھلاڑی بلا کر جمع کر لیے تھے اور یہ عام خیال ہو گیا تھا کہ پٹیالہ کے کرکٹ کے قلعے کا فتح کرنا اب کسی کے بس کی بات نہیں، لیکن خدا نے یہ عزت علی حسن کی قسمت میں لکھی تھی کہ انھوں نے اپنی کپتانی کے زمانے میں دو بار اس قلعے کو نہایت خوبی اور کامیابی کے ساتھ فتح کیا۔
ایک میچ کا حال پروفیسر ٹیننگ نے اپنی انگریزی نظم Day Of Patiala میں بڑے دلچسپ انداز میں تحریر کیا تھا جو انہی ایام میں علیگڑھ میگزین میں شائع

[۱] ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ہوئی تھی۔ اُدھر مشہور انگریزی اخبار پانیئر نے لکھا کہ اس میچ کا نتیجہ ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت علیگڑھ کی کرکٹ ٹیم ہندوستان کی سب سے زیادہ مضبوط اور طاقت ور ٹیم ہے اور فتح کا سہرا سید علی حسن کپتان کے سر ہے۔ جو ہندوستان میں اس وقت کرکٹ کی ہمہ گیر صفات کے حامل ہیں۔

اس زمانے کے پانیئر میں کسی واقعہ کا ذکر آجانا ایک بہت اہم بات تھی بقول اکبر الہ آبادی ۔

پانیئر کے صفحہ اول پہ جس کا ذکر ہو
ہم ولی سمجھیں جو اس کو عاقبت کی فکر ہو

لیکن سید علی حسن نے اکبر الہ آبادی کے اس قول کو بھی غلط ثابت کر دیا تھا یعنی بجائے اس کے کہ عاقبت کی فکر نہ ہو ان کے فرنگی لباس کے نیچے ایک مسلمان کا دل متحرک رہتا تھا، وہ پابندِ صوم وصلوٰۃ اور تلاوتِ قرآن پاک کرنے والے تھے اور سچے مسلمان تھے ——— ایسے ہوتے تھے اس زمانے کے کرکٹر!

"جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے، وہ اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے۔ زمانہ حال پر نظر کرنے کے لیے اس کو قوتِ تحقیق درکار ہوتی ہے اور انجام کار پر غور کرنے کے لیے قوتِ تجویز اور اس کا تصفیہ کرنے کو قوتِ استقرار اور بھلا ٹھہرانے کو قوتِ امتیاز کا اور سب باتوں کو تصفیہ کے بعد اس پر قائم رہنے کے لیے قوتِ استقلال۔ اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں۔"

(پروفیسر عتیق احمد صدیقی)

پروفیسر سعید اختر

علیگڑھ اور بھوپال وانڈررس

بھوپال ہاکی کی تاریخ صحیح نہیں کہی جاسکے گی۔ اگر اس کی پرورش اور ترقی کے تعلق سے نواب زادہ رشید الظفر خانصاحب (جنھیں بھوپال کے عوام پیار سے رشید میاں کہتے ہیں) اور علیگڑھ کا نام شامل نہ ہو۔ دراصل یہ تینوں لازم وملزوم ہیں۔

یوں تو بھوپال میں ہاکی تقریباً بیسویں صدی کے آغاز سے ہی کھیلی جاتی رہی تاہم باضابطہ اور باقاعدہ طور سے اس کا آغاز ۱۹۱۶ء سمجھا جاتا ہے۔ جب بھوپال میں کل ہند اقتدار سلور کپ ٹورنامنٹ منعقد کرنا طے ہوا۔ جو ۱۹۳۰ء تک منعقد ہوتا رہا۔ دراصل بھوپال میں ہاکی کی داغ بیل اسی زمانے میں پروان چڑھی کیونکہ اس پندرہ سال میں اسے فرمانروائے ریاست نواب حمید اللہ خاں صاحب کی سرپرستی حاصل رہی جن کی دلچسپی اور ہر طرح کی معاونت نے بھوپال کے بچے بچے میں ہاکی کھیل کے لیے ایک والہانہ جذبہ پیدا کر دیا۔

مگر دراصل بھوپال کی باقاعدہ اور باضابطہ ہاکی کا آغاز ۱۹۳۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اسے بھوپال ہاکی کی جوانی کا دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ رشید میاں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ اسی زمانے میں اسمٰعیل عباسی صاحب، اشرف محمد خاں صاحب اور راقم الحروف کے

والدمحترم سید الحسن صاحب بھی علیگڑھ میں پڑھتے تھے اور رشید میاں کے کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ ہاکی فیلو بھی تھے۔ ۱۹۳۱ء میں اسمٰعیل عباسی صاحب یونیورسٹی کے ہاکی کپتان تھے۔ یہی وہ سال ہے جب بھوپال کی شہرۂ آفاق ٹیم بھوپال وانڈررس نے علیگڑھ یونیورسٹی میں جنم لیا۔ وہ اس طرح کہ متھرا گولڈ کپ ٹورنامنٹ میں شرکت کرنے کی دعوت لے کر کچھ ذمہ داران علیگڑھ آئے مگر اسمٰعیل عباسی صاحب نے معذرت کی کیوں کہ مارچ کا مہینہ تھا اور امتحان سر پر تھے اس کے باوجود ان حضرات کا اصرار قائم رہا۔ بالآخر اسمٰعیل صاحب اور رشید میاں میں باہمی گفتگو کے بعد طے پایا کہ یونیورسٹی کے نام سے ٹورنامنٹ میں شمولیت ناممکن ہے اس لیے علیگڑھ ہی کے لڑکوں پر مشتمل ٹیم ٹورنامنٹ میں حصہ لے مگر اس کا نام "بھوپال وانڈررس ہو" کیونکہ تقریباً آٹھ نو کھلاڑی بھوپال ہی کے تھے اشرف محمد خاں صاحب کی کپتانی میں ٹیم شریک ٹورنامنٹ ہوئی اور فائنل جیت کر گولڈ کپ پر قبضہ کیا۔ یہ تھا وہ دلچسپ واقعہ جس کے تحت "بھوپال وانڈررس" ہندوستان میں روشناس ہوئی۔ اسی دوران رشید میاں اور اسمٰعیل عباسی صاحب کے درمیان بھوپال ہاکی کے سلسلہ میں مزید غور و خوض ہوا اور کچھ منصوبے بھی تیار ہوئے جو صرف ذہنوں تک ہی محدود رہے۔ مگر ۱۹۳۱ء میں متھرا ٹورنامنٹ میں جیت جو بھوپال ہاکی کے لیے ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس نے رشید میاں اسمٰعیل عباسی صاحب اور دوسرے عاشقان ہاکی ایسوسی ایشن کا انڈین ہاکی فیڈریشن سے الحاق کی کارروائی اور آل انڈیا عبیداللہ خاں گولڈ کپ ہاکی ٹورنامنٹ کے انعقاد کا ہونا طے کیا گیا۔ یہ سب بھوپال وانڈررس کے جنم لینے کا نتیجہ تھا۔ گویا تین بڑے کام ایک ہی سال عمل میں آئے۔ اقتدار سلور کپ ٹورنامنٹ کی جگہ عبیداللہ خاں گولڈ کپ ٹورنامنٹ نے لے لی اور ۱۹۳۰ء کے بعد سلور کپ ٹورنامنٹ بند ہوگیا۔ ۱۹۳۲ء میں ایسوسی ایشن کا الحاق بھی انڈین ہاکی فیڈریشن سے ہوگیا۔

نواب حمیداللہ خاں صاحب ۱۹۳۰ء تک بھوپال ہاکی ایسوسی ایشن کے سرپرست رہے اور ۱۹۳۱ء میں نواب زادہ رشید الظفر خاں صاحب (رشید میاں) نے اس کی سرپرستی قبول کی جو ۱۹۶۲ء تک قائم رہی۔ رشید میاں جو خود بھی اسمٰعیل عباسی

صاحب کے بعد مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے ہاکی کپتان ہوئے۔ انھوں نے بھوپال کے کھلاڑیوں میں ایک نئی روح پھونکی۔ خاص طور سے بھوپال وانڈررس ٹیم کی براہ راست نگرانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس ٹیم کو رشید میاں کی ہر طرح کی سرپرستی حاصل تھی۔ شملہ کوٹھی سے ملحق ہاکی گراونڈ پر ٹیم کی پریکٹس ہوتی تھی اور کھلاڑیوں کو شہر سے لانے لے جانے کے لیے سواری کا معقول انتظام تھا۔ ساتھ ہی کھلاڑیوں کی معقول غذا اور مالی امداد بھی سرپرستی کا اہم حصہ تھی۔ یہ سب دراصل رشید میاں کی ذاتی دلچسپی اور محنت تھی کہ بھوپال کو ہاکی کی نرسری کہا جانے لگا۔ اور شوق اس درجہ بڑھا کہ بھوپال کی گلیوں، کوچوں، سڑکوں اور گھر کے آنگنوں میں ہاکی زور شور سے کھیلی جانے لگی۔ بھوپال وانڈررس نے پورے ملک میں اپنا مقام بنالیا تھا اور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۵۰ء تک اس نے کم دبیش تیس ٹورنامنٹوں کے فائنل جیتے جن میں آغا خاں، بمبئی بائیٹن۔ کلکتہ۔ ایم۔ سی۔ سی مدراس اور عبیداللہ خاں گولڈ کپ بھوپال ہندوستان کے صف اول کے ٹورنامنٹ بھی شامل ہیں۔

بھوپال وانڈررس کے کئی کھلاڑیوں نے ہندوستان سے باہر بھی بھوپال کا نام روشن کیا۔ جن میں احسن محمد خاں، احمد شبیر خاں، شکور صاحب، لطیف الرحمن اختر حسین، حبیب الرحمن (جبو) اور انوار احمد خاں (اتو) اولمپک کھلاڑی قرار پائے جبکہ اسمٰعیل عباسی۔ مولانا بنے۔ قوی اور فاروق علی خاں نے فلسطین، نیوزی لینڈ اور افغانستان میں ہندوستانی ٹیم کی نمائندگی کی۔ ان میں سے بیشتر کھلاڑی علیگڑھ کے اولڈ بوائے ہیں۔

بدقسمتی سے ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۴ء میں دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے اولمپک گیمس کا انعقاد نہیں ہو سکا ورنہ بھوپال وانڈررس کے مزید کھلاڑی اولمپک میں یقینی طور پر منتخب ہوتے جو ایک المیہ ہے۔

ہاکی کے جادوگر میجر دھیان چند نے بھوپال وانڈررس کی تعریف اس طرح کی ہے: "بھوپال کا ہندوستانی ہاکی میں حصہ انتہائی قابل تعریف و ستائش ہے جب تک ہاکی زندہ ہے بھوپال وانڈررس کا نام ذہنوں میں ہمیشہ تازہ رہے گا بھوپال نے ہمیشہ ہاکی کا اعلیٰ معیار پیش کیا ہے اور ایسے نامور کھلاڑی پیدا کیے

ہیں۔ جنھوں نے اندرون ملک اور بیرون دونوں میں ملک کا نام روشن کیا ہے کئی موقعوں پر میں بھوپال ٹیم کے مخالف کھیلا ہوں اور میں نے ہمیشہ بھوپال کھلاڑیوں کو بہترین مقابل و حریف محسوس کیا ہے۔"

اسطات علی (دائن صاحب) جو خود واندررس کے کھلاڑی تھے، کے بقول:

دھیان چند نے مجید استاد کو ہندوستان کا بہترین فارورڈ بتایا اور کہا کہ مجید کسی طرح ان سے کم نہیں ہے۔ اسی طرح راقم الحروف کو ایک بار جھانسی میں میجر دھیان چند سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ دوران گفتگو میں نے ان سے ایک سوال کیا تھا کہ آپ اور کپتان اے شکور (بھوپال واندررس) دونوں ہی سینٹر فارورڈ کھلاڑی تھے۔ شکور صاحب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ میجر دھیان چند نے بڑکپن کا ثبوت دیتے ہوئے مجھ سے کہا تھا صرف وقت نے انھیں پہلا مقام دے دیا کیونکہ وہ شکور سے بہت پہلے پیدا ہوئے۔ اگر شکور پہلے پیدا ہوئے ہوتے تو نقشہ کچھ اور بھی ہوسکتا تھا۔"

علیگڑھ یونیورسٹی رشید میاں، اسمٰعیل عباسی صاحب، اور بھوپال واندررس کا تعلق صرف اس کی علیگڑھ میں پیدائش ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی آبیاری کا کام اس کے بعد بھی علیگڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل شخصیات کے سپرد رہا۔ خود اسماعیل عباسی صاحب ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۵ء تک بھوپال واندررس کے کپتان اور اسی دوران ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۹ء تک ایسوسی ایشن کے سکریٹری رہے۔ علیگڑھ ہی کے بہترین کھلاڑی اور نامور اولڈ بوائے جسٹس سلام الدین خاں صاحب ۱۹۳۱ء سے ۱۹۷۷ء تک ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ اس طرح علیگڑھ یونیورسٹی کے اولڈ بوائے اور اپنے زمانے کے بہترین سینٹر فارورڈ کپتان شکور ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک واندررس کے کپتان ہونے کے ساتھ ساتھ بھوپال ہاکی ایسوسی ایشن کے ۱۹۴۶ء، ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۰ء میں جوائنٹ سکریٹری رہے۔

پروفیسر سید نوشہ علی صاحب علیگڑھ کے نامور اولڈ بوائے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۹ء تک ایسوسی ایشن کے جوائنٹ سکریٹری رہے۔

علیگڑھ یونیورسٹی کے کرکٹ کپتان اور نامور اولڈ بوائے نسیم سلام الدین صاحب ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء میں ایسوسی ایشن کے سکریٹری رہے اور ایسوسی ایشن کے موجودہ

ــ ماہی فکر و آگہی علی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سکریٹری سبھاش چندر بھی نہ صرف علیگڑھ یونیورسٹی کے اولڈ بوائے ہیں بلکہ بہترین سینٹر فارورڈ بھی رہ چکے ہیں۔

علیگرین ہونے کی حیثیت سے نواب حمید اللہ خاں، رشید میاں صاحب سلام الدین خاں صاحب، اسمٰعیل عباسی صاحب شکور صاحب، نوشہ علی صاحب نسیم سلام الدین صاحب اور سبھاش چندر صاحب نے بھوپال ہاکی کی مختلف طریقوں سے سرپرستی کی اور اپنی خدمات دی ہیں۔ اس کا ابتدائی دور نوان حضرات کی کاوشوں سے ہاکی کے سنہری دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ بھوپال کے خام کھلاڑیوں کو علیگڑھ نے پختگی عطا کی ہے، اعتماد دیا ہے، نفاست دی ہے، اور اس طرح علیگڑھ نے اولڈ بوائز کی حیثیت سے بھوپال وانڈررس کو اشرف محمد خاں، احسن محمد خاں، محسن محمد خاں، اسمٰعیل عباسی، شکور صاحب، صغیر صاحب، محمد ممتاز (بڑے بھائی) انور احمد (انو) جیسے شہرۂ آفاق کھلاڑی دیے جس کا سہرا اگر رشید میاں صاحب اور پھر اسمٰعیل عباسی صاحب کے سر باندھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی بھوپال نے ہندوستان کو انعام الرحمٰن، اسلم شیر، جلال، ممتاز ملک، عزیز الدین، شاہد نور، یوسف سلیم عباسی جیسے عظیم کھلاڑی دیے اور انھوں نے اندرون اور بیرون ملک میں بھوپال کا نام بھی روشن کیا تاہم اب بھوپال کی نرسری مرجھا رہی ہے، اس پر خزاں کا اثر غالب ہے۔ وجہ صاف ہے کہ سرپرستی ہمت افزائی انعام و اکرام سب ختم۔ ذاتی دلچسپی اور شوق سے بچے ہاکی کھیلنا بھی چاہیں تو میدان عنقا۔

بھوپال کا ہر پرانا میدان اب مکانات اور آبادیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مکانات کے کتابچی نمونوں اور فتنوں نے بچوں سے گھر کے آنگن تک چھین لیے ہیں۔ ہاکی کھیلیں بھی تو کہاں کھیلیں یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے اور سرکار کے لیے ایک مسئلہ جس کا حل کسی کے پاس نہیں ہے۔ صرف میدانوں کی فراہمی اس کا حل ہے بڑے بڑے بحث نہیں۔

تاہم اس وقت ہم اپنے ان بزرگوں خاص طور سے رشید میاں کے تئیں تشکر کے دلی جذبات پیش کرتے ہیں۔ جن کی بدولت بھوپال ہاکی کے نقشہ میں نمایاں مقام رکھتا ہے جب تک بھوپال میں ہاکی کھیلی جاتی رہے گی رشید میاں، دیگر اہم کھلاڑی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اور بھوپال وانڈررس کا نام بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔

۔ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

شکیل بدایونی

علی گڑھ نمائش

شفق نزع میں لے رہی تھی سنبھالا — اندھیرے کا غم کھارہا تھا اُجالا
ستاروں کے رخ سے لُعاب اٹھ رہی تھی — فضاؤں سے موج شباب اٹھ رہی تھی
مئے رندگی جام مئے نوش میں تھی — نمائش علی گڑھ کے آغوش میں تھی
وہ کیف مسرت وہ لمحات رنگیں — وہ احساسِ مستی وہ جذباتِ رنگیں
وہ پُر کیف عالم وہ دلکش نظارے — وہ جلوؤں کے بہتے ہوئے خشک دھارے
وہ غمگین آغازِ شب اللہ اللہ — نمائش کی وہ تاب و تب اللہ اللہ
وہ بابِ مزمل پہ حُسنِ چراغاں — فلک پر ہوں جیسے ستارے درخشاں
حصاروں میں گونجے ہوئے وہ ترانے — وہ جاں بخش نغمے وہ پر لطف گانے
وہ ہر سمت حُسنِ لطافت کی جانیں — وہ آراستہ صاف ستھری دکانیں
کہیں یہ ہے نظارہ کاریگری کا — کہیں گرم ہوٹل ہے پیشاورئی کا
نقدر سکوں وہ دلوں کا بہلنا — امیروں غریبوں کا یک جا ٹہلنا
نمایاں نمایاں وہ یارانِ کالج — وہ عشرت مداماں جواناںِ کالج
کوئی تیز دستی و چستی پہ نازاں — کوئی صحت و تندرستی پہ نازاں
کوئی حسن کی جلوہ ریزی پہ مائل — کوئی شوخ نظروں کی تیزی سے گھائل
ادھر چشمِ حیراں کی نظارہ سازی — ادھر حسن والوں کی جلوہ طرازی
خراماں خراماں وہ ہمجولیوں میں — نکلتی ہوئی مختلف ٹولیوں میں
نقابوں میں وہ بے نقابی کا عالم — جو لاتا ہے دل پر خرابی کا عالم
کسی کا وہ چہرہ سے آنچل اٹھانا — کسی کا کسی سے نگاہیں چرانا

کبھی یہ یک چلتے چلتے ٹھہرنا　　نگاہوں سے جلوؤں کی اصلاح کرنا
کبھی اک توجہ دوکانوں کی جانب　　کبھی اک نظر نوجوانوں کی جانب
تماشا غرض کامیاب آرہا تھا　　نمائش پہ گویا شباب آرہا تھا
ادھر ہم بھی بزمِ تخیل سجا کر　　کھڑے ہوگئے ایک دوکاں پہ جاکر
نظر مل گئی دفعتاً اک نظر سے　　دھڑکنے لگا دل محبت کے ڈر سے
ادھر تو نظر سے جبیں سائیاں تھیں　　ادھر سے بھی کچھ ہمت افزائیاں تھیں
خلش کوئی دونوں کو تڑپاگئی تھی　　محبت کی منزل قریب آگئی تھی
خیالات میں اس طرف اک تلاطم　　لبوں پہ ادھر ہلکا ہلکا تبسم
نگاہوں سے عہدِ وفا ہورہا تھا　　اشاروں میں مطلب ادا ہورہا تھا
ادھر عشق کے بام و در سج رہے تھے　　گھڑی میں جو دیکھا تو نو بج رہے تھے
یکایک جواں کچھ مرے پاس آئے　　جو تھے آستینوں پہ بلّے لگائے
کہا اتنی تکلیف فرمایئے گا　　نمائش سے تشریف لے جایئے گا
غرض چل دیے گھر کو مجبور ہو کر　　محبت کے جلووں سے معمور ہو کر
ہوئی جارہی تھی عجب حالتِ دل　　کوئی چھین لے جیسے پڑھتے میں ناول
ہم اس طرح بابِ منزل سے نکلے　　لہو جیسے ٹوٹے ہوئے دل سے نکلے
بہر حال اب بھی وہی ہے نمائش　　نویدِ طرب دے رہی ہے نمائش
وہی جشن ہے اور وہی زندگی ہے　　مگر جیسے ہر شے میں کوئی کمی ہے
ارے او نگاہوں پہ چھا جانے والی　　مرے دل کو رہ رہ کے یاد آنے والی
تری طرح جلوہ نما ہے نمائش　　ترے حسن کا آئینہ ہے نمائش
نمائش میں تیری ملاحت سے پنہاں　　نمائش میں تیری لطافت ہے پنہا

نگاہوں کو ناحق تیری جستجو ہے
یقیناً نمائش کے پردے میں تو ہے

ڈاکٹر فوق کریمی

علیگڑھ
نمائش کے تین دور

انسان اپنی زندگی میں اپنا ماضی زندگی کے آخری سانس تک نہیں بھولتا، جہاں تک کسی کے ماضی کا تعلق ہے تو وہ عام طور پر بچپن اور جوانی کے ارد گرد گھومتا ہے۔ اور جب تصور میں ماضی کی تصویریں آتی ہیں تو وہ ایک خوبصورت البم کی دلآویز تصویریں یکے بعد دیگرے ذہن کے دریچوں سے بولتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان تصاویر کا تعلق ماضی کی یادوں سے وابستہ ہوتا ہے، ان یادوں میں کچھ یادیں بڑی فرحت بخش ہوتی ہیں۔ اور کچھ سوہانِ روح، اس کا اندازہ اور تجربہ ان حضرات کو اچھی طرح ہوگا۔ جن کے ماضی میں انھیں فرحت بخش لمحے بھی ملے اور تکلیف دہ تجربات سے بھی انھیں گزرنا پڑا۔

علیگڑھ نمائش کا جب نام آتا ہے تو میرے ذہن کے دریچوں میں نہ جانے کتنے لوگوں کی بولتی ہوئی تصویریں ابھرتی ہیں۔ ان تصاویر کے بیشتر پیکر میرے خیالوں میں تو ہیں لیکن دنیا میں نہیں رہے۔ اور جو کچھ ہیں تو وہ سرحد پار زندگی کے گزارے ہوئے لمحے یاد کر کے عمر رفتہ کو آواز دے رہے ہیں۔

علیگڑھ نمائش کس طرح قائم ہوئی، کب ہوئی، کس نے اس کی داغ بیل ڈالی، لیکن سنا یہ گیا ہے کہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو گیا جب یہ نمائش قائم ہوئی تھی۔ میں نے علیگڑھ نمائش کو غلامی کے دور میں بھی دیکھا اور جب ہمارا ملک آزاد ہوا تو

طلوعِ آزادی کے مہرو ماہ بھی دیکھے۔ اور جب ہمارے ملک نے جمہوریت کا لبادہ اوڑھا تو وہ دور بھی میری آنکھوں میں ہے۔

نمائش کے حدود اربعہ بہت ہی سوچ سمجھ کر قائم کیے گئے تھے۔ شام ڈھلتے ہی نمائش کے ان حدود اربعہ میں زندگی مسکراتی تھی۔ بابِ مزمل، نمائش کا صدر دروازہ ہے۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے دائیں اور بائیں جو بازار تھے۔ ان کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ بائیں جانب کا بازار چھوٹے دکانداروں کا بازار ہے۔ اور اس بازار کا آخری حصہ جی ٹی روڈ سے مل جاتا ہے، اس روڈ کے دونوں طرف گھریلو سامان کی دکانیں ہوتی ہیں اور کچھ آگے بڑھنے کے بعد تیسرے درجہ کے ہوٹل لگتے ہیں۔ اور پہلوانوں کا اکھاڑا بھی اسی روڈ پر ہے۔ نمائش کے دوران پہلوانوں کے مقابلے کی کشتیوں کے لیے کئی دنگل، دو، دو، تین، تین دن کے وقفہ کے بعد کیے جاتے تھے۔ سرکس اور کھیل کود کے تماشے۔ مختلف طریقوں سے دلوں کو لبھاتے تھے۔ دائیں طرف گرم کمبل اور کپڑوں کی دکانیں ہوتی تھیں اور ان دکانوں کے عقب میں مسلم یونیورسٹی کا پراکٹوریل اسٹاف کیمپ ہوتا تھا، اور ان دونوں طرف کے بازاروں میں صبح دس بجے سے لے کر شام چار بجے تک شہر کے مواضعات کے کسان، مزدور، اپنے اپنے خاندان کی عورتوں، بچوں اور بزرگوں کے ساتھ خرید و فروخت کے لیے آتے تھے، اور جیسے ہی سورج اپنے غروب ہونے کا اعلان کرتا تو یہ لوگ اپنے اپنے گاؤں چلے جاتے تھے۔

شام ۵ بجے سے رات آٹھ بجے تک یونیورسٹی اور شہر کے اسکولوں کے بچوں کی آمد کا سلسلہ رہتا تھا، اور اسی درمیان نو بجے رات تک مقامی کالجوں اور یونیورسٹی کے طلبا نمائش گراؤنڈ سے اپنے اپنے ہالوں میں چلے جاتے لیکن طلبا آسانی سے نہیں جاتے تھے۔ کچھ طلبا سرکس کے پنڈال میں چھپتے تھے اور کہیں ہوٹلوں کے گوشے تلاش کرتے تھے۔ لیکن پراکٹوریل اشاف کے لوگ انھیں پھر بھی دیکھ لیتے تھے، اور ان پر یونیورسٹی کے قاعدہ کے مطابق جرمانہ کرتے تھے۔ پراکٹوریل اسٹاف، جیسے ہی نو بجتے، وہ بابِ مزمل کے اندر چاروں طرف اس طرح چلتے پھرتے نظر آتے تھے کہ جیسے فوجی نوجوان اچانک کسی میدان میں کود پڑے ہیں۔ پراکٹوریل اسٹاف میں،

اس زمانے میں ایک اسسٹنٹ پراکٹر مختار صاحب تھے، مختار صاحب اپنے قد و قامت کے اعتبار سے بہت ہی بلند و بالا شخصیت کے حامل تھے۔ وہ ضابطہ شکن طلبا کے لیے پولیس افسر بھی تھے اور اپنے دل میں طلبا کے لیے بے پناہ شفقت بھی رکھتے تھے، اس شان کا آدمی پراکٹوریل اسٹاف میں آج تک یونیورسٹی کو نہیں ملا طلبا کے لیے یونیورسٹی کی طرف سے ایک یونیفارم تھا۔ سیاہ شیروانی علیگڑھ کٹ پاجامہ اور ترکش ٹوپی ضرور تھی، اگر کوئی طالب علم اس یونیفارم کے علاوہ کسی اور لباس میں ملتا تھا، تو وہ بغیر جرمانہ کے نہیں بچتا تھا۔ ایک مرتبہ دو طالب علم بغیر ترکش ٹوپی کے ملے اور دونوں کے ہاتھوں میں ٹوپیاں تھیں لیکن مختار صاحب کی نظر میں وہ آ گئے اور ان سے پوچھا گیا کہ ٹوپیاں تم لوگوں نے کیوں نہیں پہنیں، تو طلبا نے جواب دیا کہ ہاتھوں میں ہیں تو مختار صاحب نے کہا کہ ہاتھوں میں کیوں ہیں؟ تو اس کا جواب طلبا کے پاس نہیں تھا۔ مختار صاحب نے جب ان سے ان کی ٹوپیاں چھین لیں اور سر پر رکھنا چاہا تو ایک ٹوپی کی دو ٹوپیاں تھیں اور اس طرح سے کاٹا گیا تھا کہ ایک میں سے دو ہو جائیں اور انہیں موڑ لیا تھا۔ طلبا کی یہ دفاعی شرارت لائق مبارکباد تھی۔ مگر پھر بھی یہ طلبا یونیورسٹی کے ضابطہ کی سزا سے نہیں بچ سکے۔

۹ ربجے شب میں سینئرز تعلیم یافتہ اور شہر کے مسلم غیر مسلم تاجر خاندانوں کی خواتین آتی تھیں۔ اور نمائش کے لیے علیگڑھ کے لوگ باقاعدہ اپنے علیگڑھ سے باہر کے عزیزوں دوستوں کو مدعو کرتے اور ہفتوں پہلے علیگڑھ آنے کے لیے تیاریاں کرتے تھے۔ باب مزمل میں آ کر تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی خاص مخلوق نمائش میں آئی ہے۔ نہ کوئی چیخ و پکار ہوتی تھی، نہ کوئی ہنگامہ تھا جن لوگوں کو دیکھنے اور ملنے آنکھیں اور دل ایک سال بیقرار رہتا انھیں نمائش میں آسانی سے دیکھا جاتا۔ تہذیب اور شرافت کا یہ حال تھا کہ ؎

نظر نے نظر سے ملاقات کر لی
رہے دونوں خاموش اور بات کر لی

فوارہ کے دائیں جانب مسلم ریسٹورینٹ ہوتے اور بائیں جانب ہندو ریسٹورینٹ ہوتے تھے۔ یہ ترتیب آج بھی ہے لیکن مسلم ریسٹورینٹ میں ایک پنجاب ہوٹل

پشاور سے آتا تھا اور اس ہوٹل کے کاؤنٹر پہ ایک پٹھان بزرگ بیٹھتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا ہوٹل نے کر ۱۹۴۶ء تک آتا رہا، یہ اپنے کاؤنٹر پر حلوہ پراٹھا ترازو سے تولتے تو دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھتے ان کی شلواریں گھی میں ڈوب جاتی تھیں اس وقت خالص گھی کا پراٹھا ایک روپیہ سیر فروخت ہوتا اور پنجاب ہوٹل کے علاوہ دوسرے ہوٹلوں میں وناسپتی گھی کا پراٹھا ۸ آنے سیر فروخت ہوتا تھا۔

مسلمان اپنے ہندو دوستوں کو خاص طور پر پشاوری ہوٹل میں مدعو کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے ہالوں کے ڈنر اسی پشاوری ہوٹل میں ہوتے تھے، ہندوؤں میں آزادی سے قبل پچیس فیصدی سے زیادہ گوشت خور نہیں تھے، آج یہ تناسب اس کے برعکس ہے تین چار دن کے وقفہ سے صرف خواتین کی نمائش ہوتی تھی ان ہی دنوں میں گرلس کالج کی طالبات کے لنچ پشاوری ہوٹل میں ہوتے جس دن خواتین کی نمائش ہوتی تھی۔ اس دن پولیس اور یونیورسٹی پراکٹوریل اسٹاف کو کچھ زیادہ ہی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی تھی۔

علیگڑھ، بلند شہر، میرٹھ کے مسلم اور ہندو نوابین اور رئیسوں کے باقاعدہ کیمپ لگتے تھے اور ان کیمپوں میں رؤسا و عمائدین کے علاوہ مہمانان بھی ہوتے۔ نمائش میں جوں جوں رات ڈھلتی شباب جاگتا تھا۔ نمائش میں گھومنے والے ہر عمر کے لوگ ہوتے تھے۔ اور وہ لوگ اپنے ہم خیالوں کے ساتھ نمائش میں ٹہلنے کا لطف لیتے تھے۔ اور نمائش میں پتہ نہیں چلتا تھا کہ وقت نصف شب سے گزر چکا ہے اور سحر کے آثار نمودار ہو چکے ہیں۔ لیکن دوستوں کی زبان پر یہ مصرعہ بار بار آتا ہے

دوستو آؤ پھر اک بار نظارہ کریں

جیسے ہی ملک آزاد ہوا تو سیاہ شیروانیاں اور کالے برقعے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ممنوع قرار دے دیئے گئے ہیں آزادی کا پیغام اس طرح نمائش میں آیا کہ آنکھوں کی بات زبان پہ آ گئی اور جب ۱۹۵۰ء میں ہمارا ملک جمہوری ملک بنا اور دستور نے ملک کے ہر فرد ہر طبقہ کو آزادی دے دی تو اس آزادی

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سے نوجوانوں نے کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھایا وہ بات جو آزادی سے پہلے آنکھوں سے کہی جاتی تھی آزادی کے بعد زبان پر آئی اور جمہوریت کے بعد ہاتھاپائی تک آ گئی۔
آزادی سے قبل علیگڑھ نمائش شائستگی، تہذیب اور قومی یکجہتی کی ایک منہ بولتی تصویر تھی۔ نمائش کی ابتداء دربار سے ہوتی تھی اور اختتام بھی دربار منعقد ہو کے ہوتا۔ دربار ہال میں بھی نشستوں کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ ہال میں کلچرل پروگرام ہوتے۔ ان میں مشاعرہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ عام طور پر مشاعرہ کا اختتام صبح ۴ بجے ہوتا تھا۔ اور اختتام میں غزلیں سنی نہیں جاتی تھیں بلکہ دیکھی اور پڑھی جاتی تھیں۔ نمائش اب بھی ہوتی ہے مگر وہ بات کہاں ــــ!

سر سید احمد خاں کے زمانۂ ملازمت میں ایک بار ایک شخص جو ان کی سخت تخریب کے درپے تھا کسی معاملہ میں پھنس گیا۔ سید احمد خاں کے پاس کچھ ایسے ثبوت تھے جن سے وہ اس کو شدید نقصان پہنچا سکتے تھے لیکن ان کی ماں نے کہا کہ اگر تم اس کو معاف کر سکتے ہو تو اس سے بہتر کچھ نہیں کہ اسے معاف کر دو لیکن اگر انتقام ہی لینا چاہتے ہو تو ان کمزور دنیاوی عدالتوں کے ذریعہ سے انتقام لینے کے بجائے معاملہ کو منتقم حقیقی کے سپرد کر دو۔ سر سید کا بیان ہے کہ اس روز کے بعد سے میں نے اپنے کسی دشمن سے انتقام لینے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بلند کردار اور یہ پاکیزہ آغوش تھی جس نے سر سید کی سیرت کی تشکیل کی۔

(شہناز ہاشمی)

اسرار الحق مجازؔ

نمائش میں

وہ کچھ دو شیزگان ناز پرور   کھڑی ہیں اک بساطی کی دکاں پر
نظر کے سامنے ہے ایک محشر   اور اک محشر ہے میرے دل کے اندر
سہرا کام رنگیں ساریوں پر   بساطِ آسماں پر ماہ و اختر
جمال و حسن کے پر رعب تیور   نمایاں چاند سی پیشانیوں پر
وہ رخساروں پہ ہلکی ہلکی سرخی   لبوں میں پر فشاں روح گل تر
سیہ زلفوں میں روحِ سنبلستاں   نظر سر چشمہ تسنیم و کوثر
ادائے ناز عرقِ کیف صہبا   سیہ مژگاں شراب آلودہ نشتر
چمک تاروں کی چشم سرمگیں میں   جھلک چاندی کی جسم مرمریں پر
وہ خوشبو آرہی ہے پیرہن سے   فضا ہے دور تک جس سے معطر
تبسم اور ہنسی کے نرم طوفاں   فضاؤں میں مسلسل بارش زر
نشاط رنگ و بو سے چور آنکھیں   شراب ناب سے لبریز ساغر
وہ گولائیں سی سینوں پر نمایاں   فضائے نور میں کیوپڈ کے شہپر
نفس کی آمد و شد سے تلاطم   شب مہتاب میں جیسے سمندر
ستاروں کی نگاہیں جھک گئی ہیں   زمیں پھر خندہ زن ہے آسماں پر
کوئی آئینہ دار حسن فارس   کسی میں حسن یونانی کے جوہر
کسی میں عکس "معصوم کلیسا"   کسی میں پرتو اصنامِ آزر

ماہنامہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء   علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

یہ شیریں ہے وہ تو شابہ ہے شاید | نہیں یاں فرق فرہاد و سکندر
یہ اپنے حُسن میں عذرائے وامق | وہ اپنے ناز میں سلمائے اختر
یہ تابانی میں خورشیدِ درخشاں | وہ رعنائی میں اس سے بھی فزوں تر
ہنسی ایسی طلوعِ صبحِ خنداں | نوا اس کی سرودِ کیف آور
یہ شعلہ آفریں وہ برق افگن | یہ آئینہ حسیں، وہ ماہ پیکر
وہ جنبش سی ہوئی کچھ آنچلوں کو | وہ لہریں سی اُٹھیں کچھ ساریوں پر
خرامِ ناز سے نغمے جگاتی | وہ چال دیں ایک جانب مسکرا کر
کسی کی حسرتیں پامال کرتی | کسی کی حسرتیں ہمراہ لے کر
کبھی آنکھیں دکانوں پہ جمی ہیں | کبھی خود اپنی ہی برنائیوں پر

ادھر ہم نے بھی آہ سرد کھینچی
ہنسی پھر آگئی اپنے کیے پر

●

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی روح بغیر تعلیم کے بے پیکر سنگ مرمر کے پہاڑ کی مانند ہے، کہ جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا، اس کا دھوبڑا اور کھردراپن دور نہیں کرتا، اس کو خراش تراش کر سڈول نہیں بناتا، اس کو پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کرتا، اس وقت تک اس کے جوہر اسی میں چھپے رہتے ہیں، اور اس کی خوشنمائیں اور دلربا رنگینی اور خوبصورت میل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ انسان کا دل کتنا ہی نیک ہو مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا، اس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوتی ہیں اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمودار نہیں ہو سکتیں، ظاہر نہیں ہوتیں۔

سرسید

رفعت سروش

نمائش علی گڑھ

پھر مچلتے ہوئے جذبات کا موسم آیا
لب و عارض کی حکایات کا موسم آیا
پھر نمائش میں چلے زہرہ جمالوں کے ہجوم
نکہت و رنگ کی برسات کا موسم آیا

صندلی جسم پہ یہ عارضِ تاباں کی پھبن
لبِ گلنار پہ بیباک تبسم کی کرن
چاند بے ساختہ نکلا کہ اٹھی کوئی نقاب
یک بہ یک بڑھ گئی دیوانوں کے دل کی دھڑکن

بے نقابی نے لیا شوخ نگاہی کا سلام
چشمِ مخمور نے چھلکائے محبت کے جام
پھر زلیخا کو ہے بازار میں یوسف کی تلاش
عشق کی سادہ مزاجی پہ نہ آئے الزام

عقل روپوش ہے، آیا ہے جنوں کا موسم
عشق کے ساز پہ دیوانوں نے چھیڑی سرگم
آج کی رات ہے رنگیں ملاقات کی رات
آج کی رات مبارک ہو دلوں کا سنگم

آج کی رات کسی زہرہ جبیں کے ہو جاؤ
آح کی رات کسی سعِ قمر کو اپناؤ
"کہکشاں بن گئی ہر راہگزر آج کی رات"
اپنی قسمت کے ستارے کو نگاہوں میں سجاؤ

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

محمد احمد

کالج کی صدائیں

کالج کی زندگی بھی آج کل ایک عجیب قسم کے ہلچل میں گزرتی ہے بہت سے پڑھنے کے شوقین اس شور و شغف سے گھبرا کر جنگل کا راستہ لیتے ہیں تا کہ وہاں اس سے محفوظ رہ کر اپنی پڑھائی میں مصروف رہیں برخلاف اس کے بہت سے ایسے ہیں جو کالج کی زندگی کا لطف اس غل غپاڑہ میں سمجھتے ہیں اور اس میں حصّہ لینا کالج لائف کے مقاصد کا ایک بہترین مقصد خیال کرتے ہیں۔ حسنِ اتفاق سے "پریسیڈنٹ صاحب خوانچہ کمیٹی" کے خطوط کا فائل میرے ہاتھ لگ گیا تھا جس کو میں ہدیۂ ناظرین کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلحاظ دلچسپی وہ اپنے طرز کا نرالا خط تھا جس کا اندازہ خود ناظرین کریں گے۔

جناب پریسیڈنٹ صاحب! وینڈرس کمیٹی تسلیم!

جناب کو معلوم ہے کہ آجکل تھرڈ ایر کے طلبا اپنے لیے کسی نہ کسی پوزیشن کی جدّوجہد میں مصروف ہیں کچھ اگر کرکٹ، ہاکی یا فٹ بال کی کپتانی کے لیے کوشش کر رہے ہیں یا اس کی خواہش میں ہیں تو دوسرے ڈائننگ ہال، نماز ہاؤس کی سینیر مانیٹری کی فکر میں ہیں۔ کچھ ان تمام کھیلوں کے سکریٹری بننے کی خواہش کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کچھ نہیں تو ٹینس کی سکریٹری شپ کا انتظار کر رہے ہیں اور زیادہ تر حصّہ ایسا ہے جو اس انتظار میں ہے کہ دیکھیے ان کی قسمت ڈائننگ ہال، مسجد یا

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

باذوں میں سے ان کو کس طرف لے جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے معزز و مقتدر عہدوں
کے لیے وہی لوگ تجویز ہوں گے جن کے حقوق بہت زیادہ ہوں۔ اس لیے کالج کے
موجودہ عہدوں سے تو مجھ کو بالکل مایوسی ہے مگر بحیثیت کالج کے ایک ممبر ہونے
کے میں ان حقوق کو بخوبی محسوس کرتا ہوں جو کالج کے مجھ پر واجب ہیں اور اس لیے
کالج کی خدمت کا ایک ایسا ذریعہ منتخب کرنا چاہتا ہوں جس سے لوگوں کے حقوق
بھی پامال نہ ہوں اور میں بھی اس بارِ گراں سے سبکدوش ہو جاؤں جو کام کہ میں نے
اپنے لیے پسند کیا ہے وہ کالج کی صداؤں کی نگرانی کرنے کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ
اس عہدہ سے میں نہ صرف اپنے لیے اقتدار و پوزیشن حاصل کروں گا بلکہ اس
سے میں کالج کے طلباء کی ان عام شکایتوں کو بھی رفع کر سکوں گا جو خوانچہ والوں یا اور
ایسے ہی شور کرنے والی جماعت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ میں جناب کے روبرو وہ
اسکیمیں پیش کرتا ہوں جو اس فرقہ ہی نوع کے بارے میں میرے دماغ میں منڈلا رہی
ہیں اور اس سے جناب پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ عہدہ مذکور کے لیے مجھ سے زیادہ
کوئی بھی موزوں نہیں ہے۔ آخری فیصلہ جناب کی رائے پر چھوڑتا ہوں۔

جنابِ والا! قریب قریب ہر جگہ جہاں بھی پھیری والوں کا دور دورہ ہے۔
اس قسم کی صدائیں دو طرح کی ہوتی ہیں ایک وہ جو کہ منہ سے نکلتی ہیں اور دوسری
وہ جو کسی باجہ سے بدقسمتی سے کالج کی چہار دیواری کے اندر صرف اول الذکر ہی
سے کام لیا جاتا ہے اور آخر الذکر کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہ چنداں معیوب نہ ہوتا اگر
منہ سے نکلی ہوئی صدائیں سریلی اور دلکش ہوتیں مگر افسوس ہے قصداً سُروں سے
اجتناب کیا جاتا ہے اور اکثر غلط سُر نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ظاہر
ہے کہ ماہرانِ فن موسیقی جن کی تعداد یہاں کثرت سے ہے اور فن مذکور کے مدّاح
جو کہ قریب قریب سب ہیں اس فن پر ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر کس قدر بگڑتے ہوں گے۔
میں ان کے محسوسات کو مدِ نظر رکھ کر ان لوگوں کی صدائیں پہلے خود سنوں گا اور جس
وینڈر کی آواز کان کے پردے پر برا اثر ڈالنے والی ہو گی اس کو احاطۂ کالج میں
گھسنے کی اجازت نہ ہو گی یا کم از کم اپنے پڑوسی کی مدد سے جو تال و سر میں ید طولیٰ
رکھتے ہیں اور جو کہ اپنے زمانہ کے تان سین ہیں۔ ایسے لوگوں کی آوازیں سنبھالنے کی

کوشش کروں گا اور اس بات کا خاص لحاظ رکھوں گا کہ ہر ایک وینڈر کا سُر اس کے مال کی مناسبت سے ہو یعنی چیزیں فروخت کرنے والوں کا سُر میٹھا اور نمکین چیزیں فروخت کرنے والوں کا سُر نمکین ہو۔ جس وینڈر کے پاس دونوں طرح کی چیزیں ہوں اس کی صدائیں دونوں طرح کے سُر میں ہوں گی مگر شرط یہ ہوگی کہ جس قسم کی زیادہ چیز ہوگی اسی طرح کا سُر لمبا اور دوسری طرح کا سُر چھوٹا ہو۔ یہ بھی خیال رکھا جائے گا کہ تازہ مال کے واسطے زوردار آوازیں اور باسی مال کے لیے ہلکی آوازیں سُر نکلے۔ ایسا کرنے سے کمرے کے اندر بیٹھے ہی بیٹھے خوانچے کے کل حالات معلوم ہو سکیں گے۔ اگر یہاں ان لوگوں کی حالت ٹھیک نہ ہو سکی تو مجبوراً لکھنؤ سے ایسے پھیری والے بلا لیے جائیں گے جو کہ اس فن کے استاد ہیں کیونکہ وہاں کی آب و ہوا نہ معلوم کتنے اور پیدا کرے گی۔ مگر اس علیگڑھ میں جہاں انگریزی کی بو حد درجہ سما گئی ہے ایسے لوگوں کا خود بخود پیدا ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ اس انگریزی کی بو ہی نے تو تمام چیزوں کے نام انگریزی میں تبدیل کر دیئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انڈے کی مٹھائی کو اسپنج اور بایل کی مٹھائی کو کوکوٹ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میں نے اردو آب و ہوا میں پرورش پائی ہے اور اس عمر کو پہنچا ہوں۔ میں نہایت شکر گزار ہوں گا اگر میں اس کے حقوق کو پوری طور پر تسلیم نہ کروں۔ اور اس کی خدمت کی انجام دہی میں کوتاہی کروں لہٰذا یہ سب سے زیادہ مقدم فرض ہوگا کہ جس قدر انگریزی چیزیں بھی کالج کے اندر فروخت ہونے کو آئیں ان کا ایک نہایت موزوں اردو نام رکھ دیا جائے۔ حامیانِ اُردو کو کس قدر گراں گزرتا ہوگا جبکہ ٹینس کے بلّے درست کرنے والا نہایت بے ترتیبی سے کہتا ہوا گزر جاتا ہے "بلّا راکٹ۔ بلّا مرمّت۔ باٹ والا، راکٹ والا، بلّا باٹ والا۔ یہ حرکت اگر صرف ایک ہی تک محدود ہوتی تو کچھ حرج نہ تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر بھی اس پیشہ والے ہیں سب نے اپنی پنچایت کر کے اس اوٹ پٹانگ بولی کا انتخاب کیا ہے۔ مجھ کو ہمیشہ خوف رہتا ہے کہ کہیں اردو کی اس بے ادبی کو دیکھ کر کوئی چلتے تن طیش میں نہ آ جائیں اور اس کو زدوکوب کر بیٹھیں جس سے کہ کالج کی شہرت کو صدمہ پہنچے۔ شکر ہے کہ ابھی تک اس کی کوئی نظیر قائم نہیں ہوئی۔ مگر ہر چیز کی احتیاط لازمی شئے ہے اور جلد سے جلد اس بولی کا سنبھالنا ضروری ہے۔ یہ سچ ہے کہ چونکہ اس کا پیشہ کھیل سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا اس کی صدا بھی کھلونا کی شکل میں نکلے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اُردو زبان ہی دنیا میں ایک زبان ہے جو اس قسم کی بے سر و بے پاؤں کی بولیوں کے لیے تختۂ مشق بنائی جاوے۔ میں اس مناسبت کو بھی ہاتھ

سے نہ جانے دوں گا اور اس کی جگہ ایک ایسی زبان دوں گا جو بذاتِ خود ایک کھلونا ہوگی۔

جناب والا! صبح کے وقت نہایت خوشنما وردی پہنے ہوئے مکھن والا مکھن چاہیے صاحب کی صدا لگاتا ہوا گزرتا ہے۔ میں نے اس قوم کے صرف اسی ایک شخص کو اچھی آواز نکالنے کے لیے کوشش کرتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ صنعتِ لہجہ سے اپنی صدا کو شعر کی صورت میں نکالتا ہے۔ میرا فرض ہوگا کہ اس کو بتلاؤں کہ شاعری میں صرف صنعتِ لہجہ ہی ایک ایسی صنعت نہیں ہے جس سے کہ اشعار بنتے ہیں بلکہ اور بھی بہت سی صنعتیں ہیں اور اگر ان کا لحاظ رکھ کر اشعار بنائے جائیں تو بہت بھلے معلوم ہوں گے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ شاعروں کی یہاں کمی نہیں اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ان تک جس قدر میری رسائی ہے کسی دوسرے کی نہیں۔ ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھا کر اس کی صدا میں وہ حلاوت پیدا کی جا سکتی ہے کہ جو سنے خوش ہو اور دل بہلے۔ برخلاف اس کے کس قدر ناگوار ہوتا ہے جب موچی جوتا سلے گا صاحب جوتا کی صدا لگاتا ہوا نکلتا ہے۔

جناب والا! اگر اس کے لہجہ پر غور کیا جاوے تو بدتہذیبی مترشح ہوتی ہے۔ اگر الفاظ کے مخارج کو دیکھا جائے تو غلط۔ اگر آواز کا خیال کیا جاوے تو کرخت۔ غرض کسی لحاظ سے بھی اس کی صدا قابلِ سماعت نہیں ہے۔ بعض افراد بدتہذیبی کی انتہا کر دیتے ہیں جبکہ لفظ جوتا پر بلاوجہ زیادہ زور دے بیٹھتے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ آج میرے برابر حروف کا ٹھیک مخرج جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ میں آسانی سے ان لوگوں کو حروف کے اصلی مخرج بتلا سکوں گا اور ساتھ ہی ادب بھی سکھلاؤں گا۔ ان کے لہجہ کی اصلاح کر دوں گا۔ مجھ کو یقین ہے کہ میری اس کارروائی سے ان کی آواز ملائم پڑ جائے گی اور بغیر ہارج ہوئے یہ لوگ گزر جایا کریں گے۔ یہ تعجب ہے کہ نان خطائی والا جو اکثر کالج کے حدود میں ـــ نان خطائی ـــ چلاتا ہوا پھرتا ہے۔ بورڈنگ میں گھسنے نہیں پاتا ورنہ کالج کے اسپتال میں ماہرِ امراضِ کان کی ضرورت پڑ جاتی۔ وہ اپنی صدا کے نکالنے میں ایڑی تک کا زور صرف کر دیتا ہے۔ میں دل میں کہا کرتا تھا کہ کاش اس کو اقتصادیات کے علم سے واقفیت ہوتی تو وہ سمجھتا کہ اس کی محنت اس کے نفع سے کہیں زائد ہوتی ہے۔ میں نے ایک دفعہ اس سے اس قدر زور سے آواز

نکالنے کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ میری آواز کو بچے دور سے سن کر اپنی اپنی ماؤں سے پیسے مانگنے لگتے ہیں اور میرے ان کے پاس پہنچنے تک وہ دروازہ پر پیسے لیے تیار رہتے ہیں اور اس طرح میں اپنا بہت سا وقت پس انداز کرسکتا ہوں۔ جواب اس قدر معقول تھا کہ مجھے اپنے خیالات کی غلطی تسلیم کرنا پڑی۔ مگر چونکہ لورڈ نگوں کے اندر کسی کی مائیں نہیں بیٹھی ہیں اس لیے کرخت آواز کے ساتھ اس کا یہاں آنا گوارہ نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ نامناسب ہے کہ آواز کی کرختگی اس کی اچھی اور خستہ نان خطائیوں کو شائقین کے منہ سے الگ رکھے۔ لہٰذا ہلکی آواز کی شرط کے ساتھ اس کو اندر آنے کی اجازت ملنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس شرط پر خود وہ تیار ہے کیونکہ اکثر یاروں کے پیچھے اپنے منہ ہی منہ میں اپنی صدا کے ساتھ گشت کرتا ہوا پایا گیا ہے۔

فیرینی کے پیالے والے کا بھی ایک خاص وقت معین ہے۔ ہمیشہ ساڑھے بارہ بجے دن کو شیر برنج کی صدا لگاتا ہوا تیزی سے گزرتا ہے مجھ کو اس کے سانس پر کس قدر شک آتا ہے جبکہ ایک ہی سانس میں اس کو دس دس کمرے طے کرتا ہوا دیکھتا ہوں تیز رفتاری بھی غضب کی ہے جب آواز دو چار پانچ کمرہ آگے سے لوٹتا ہے اس کی لمبی سانس اس کی صدا کو بھی صاف طور سے معلوم نہیں ہونے دیتی۔ اکثر ان کو کسی کمرہ پر بیع و فروخت کی گفت و شنید کے لیے بیچ بیچ میں سانس توڑنا پڑتا ہے اس کا قول ہے کہ میں "شیر برنج" کہتا ہوں مگر کوئی بھی اس صدا کو نہیں سمجھتا۔ اور اکثر نئے حضرات صرف اس کے پیچھے چلنے والے مزدور کے ٹوکرے سے اس کے مال کا پتہ معلوم کرتے ہیں۔ مزدور بہت زیادہ سمجھدار ہے اور اگرچہ اس کو تیز چلنا پڑتا ہے مگر اس بات کی احتیاط رکھتا ہے کہ مالک سے پانچ کمرہ پیچھے چلتا ہے تاکہ مالک کے ساتھ اس کو بھی اس قدر نہ لوٹنا پڑے جتنا کہ وہ لوٹتا ہے۔ یہ سب سمجھتے ہیں کہ س شخص کی آواز بہت اصلاح طلب ہے یہ اپنے گاہکوں کو غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیتا اور ان کے ارادہ کرتے کرتے چوبیں گھنٹے کے لیے اوجھل ہو جاتا ہے جناب والا! اس کی رفتار اور آواز سنبھالنے کا فرض بھی میں اپنے اوپر ہی لوں گا۔ جناب والا! اس قدر لکھنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اب موقعہ ہے کہ آپ کی توجہ

اس زبردست تخصیص کی طرف رجوع کراؤں جو آج تمام خوانچہ والوں کی ناک اور سچ تو یہ ہے کہ سب کی لاج رکھے ہوئے ہے ورنہ کالج اس صیغہ میں کبھی کا بدنام ہو چکا ہوتا۔ کھانی کسی تعارف کی ضرورت نہیں رکھتا۔ "پان بیڑا پان" کی صدا کس قدر صاف اور کس قدر بھلی معلوم ہوتی ہے کہ سننے والے دل سے تعریف کرتے ہیں۔ عام لوگوں کے لیے سوائے آواز کی خوبی کے اور کوئی دلچسپی پیدا نہیں کر سکتا مگر اپنے گاہکوں کے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ کرتا ہے اور ان کے خوش کرنے کے لیے طرح طرح کے کرتب کرتا ہے کبھی وہ کسی پیادہ پلٹن کا سپاہی بن کر قواعد کرتا ہے اس کے لیے کسی جمعدار کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا کام بھی بول بول کر خود ہی کرتا جاتا ہے۔ کبھی کسی بڑے اکھاڑے کا پہلوان بن کر طرح طرح کے ڈنڈ اور داؤں پیچ دکھلاتا ہے اور کبھی انگریزی کی اے۔ بی سی۔ ڈی شروع سے آخر تک فرفر سنا جاتا ہے۔ اتنی سمجھ بھی رکھتا ہے کہ موقع اور محل کو پہچانے اور اپنی تمام حرکات اسی وقت کرتا ہے جبکہ اس کو علم ہو جاوے کہ اس کا گاہک ان سے خوش ہوگا۔ اکثر لگاتار محنت کے بعد اس نے دماغ کو فرحت پہنچائی ہے بس بہت بڑا کام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کھانی نے چھوٹوں بڑوں سب میں ہر دلعزیزی اختیار کی ہے ہر دلعزیزی کے اعتبار سے غلام حسین کا نمبر بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں کھانی کے اوصاف میں سے ایک وصف بھی نہیں۔ تاہم ان میں ایک دل ہے جس کی وجہ سے اس نے دوسرے کے دلوں میں گھر کر رکھا ہے۔ اس کا ہر ایک شخص پر اعتبار ہے اور اگرچہ بعض اوقات اس کو نقصان اٹھانا پڑا ہے مگر زبان پر کبھی شکایت کو نہیں لاتا اور اپنے پرانے بنائے ہوئے اصولوں پر برابر کاربند ہے۔ یہ بات اس کی زندگی ہی تک ہیں کیونکہ جو بچہ اس کے ساتھ پھرا کرتا ہے اور جو آئندہ اس کا جانشین ہوگا بڑا کوتاہ دل ہے اور اگر کوئی اس کے خوانچہ میں ہاتھ ڈال دے تو رو دیتا ہے۔ غلام حسین اور کھانی دوسرے خوانچہ والوں کے لیے مثالیں ہیں کہ کس طرح ایک شخص ہر دلعزیزی اختیار کر سکتا ہے اور گاہکوں میں ہر دلعزیزی خوانچہ والوں کے لیے نہایت مفید ہے۔

ملائی والے سے مجھ کو جس قدر نفرت ہے اتنی کسی شخص سے نہیں۔ یہ بات ضرور

ہے کہ اس کا برف گرمیوں میں بہت ہی زیادہ لطف دیتا ہے مگر جاڑوں میں اس کی آواز بھی سردی کا اثر کر جاتی ہے اور بیمار ڈالنے کے لیے کافی ہوتی ہے گرمیوں کے دنوں کے علاوہ جب کبھی بھی وہ برف فروخت کرتا ہوا پایا جاوے تو ہمارا فرض ہے کہ فوراً ہی اس کے مال کو تلف کر دیں۔ مجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ ہمارے اچھے ارادوں کا لحاظ رکھ کر کوئی قانونی کارروائی ہم پر نہ ہو سکے گی۔ جناب والا قبل اس کے کہ اس مضمون کو ختم کروں، اس آدمی کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو اکثر تیل بینلا چبیلی کہتا ہوا بڑی تکلیف کے ساتھ اپنے تھکے ہوئے اعضا کو گھسیٹتا ہوا چلتا ہے۔ اگر اس کا کہنا ٹھیک ہے کہ اس کی عمر کا ایک بڑا حصہ کالج میں تیل بیچتے ہوئے گزرا تو کالج کا یہ فرض ہے کہ اپنے پرانے کاروباری کی اس کی ضرورت کے وقت مدد کرے اور اس کے رہنے کو کالج کے احاطہ ہی میں کوئی دکان بہت ہی سستے کرایہ پر دے دے تاکہ باقی حصۂ زندگی بھی وہ کالج ہی میں تیل بیچ کر کاٹے۔

جناب والا! اس قدر لکھنے کے بعد میں اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے پیش کرتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ مندرجہ بالا کام بہت آسان معلوم ہوتے ہیں مگر ان لوگوں کے لیے جو ظاہراً بہت کچھ ہیں لیکن دل لگا کر کام کرنے کا سبق ان کے استاد نے ان کو نہیں سکھایا۔ اس میں کا ہر ایک جزو ایک مہم عظیم ہے اور تمام کام اسی وقت سرانجام پا سکتے ہیں جبکہ کام کرنے والے ظاہری نام و نمود کو چھوڑ کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہو جاویں۔ آخر میں مجھ کو امید ہے کہ جناب والا! میری عرضداشت کو قبول فرماویں گے ـــــ میں ہوں جناب کا تابعدار ـــــ "بوالہوس"

(ماخوذ: از علیگڑھ منتھلی ماہ دسمبر ۱۹۱۵ء۔ جلد نمبر ۱۳۔ شمارہ نمبر ۱۲)

علم کا پڑھنا صدقہ ہے۔ (حدیث)

۷۸۴

محمد صدیق خاں بہآ

”نوخیز علیگی بھائی بتا!“

نوخیز علیگی بھائی بتا!

کیا اب بھی ہے اگلی سی رونق ؟ بیدار ہیں یا کہ سوتے ہیں؟
کیا یونین اب بھی زندہ ہے؟ کیا اب بھی الیکشن ہوتے ہیں؟
کیا اب بھی جنازہ پٹتا ہے؟ کیا جیتنے والے روتے ہیں؟

نوخیز علیگی بھائی بتا!

کیا انٹرد ڈکشن ہوتا ہے؟ کیا بھیا پارٹی ہوتی ہے؟
کیا نمر رائٹ بھی کرتے ہیں؟ جب زور کی بارش ہوتی ہے
کمپلسری میوزک ہوتا ہے؟ جب حلق میں خارش ہوتی ہے

نوخیز علیگی بھائی بتا!

کیا فاتحہ اب بھی ہوتی ہے؟ ہر سال وہاں سر سیّد کی
کیا فاختہ اب بھی اڑتی ہے کیا اب بھی دیتے ہیں دھونی
کیا سنگل سیٹڈ کے طالب ہیں بھیجے جاتے منٹو ای

نوخیز علیگی بھائی بتا!

کیا ڈائننگ ہال بھی ہوتا ہے روٹی بھی خمیری ہوتی ہے
کیا بسکٹ اب بھی کھاتے ہیں مکھن کی گولی ہوتی ہے
ہر بیرہ کو اک روٹی کے عوض بریانی اب بھی ملتی ہے؟

نوخیز علیگی بھائی بتا!

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ہر سال گلابی جاڑوں میں ! کیا اب بھی نمائش ہوتی ہے؟
کیا ماپ مزمل کی اب بھی ! دیسی آرائش ہوتی ہے !
بازاروں گلیوں کی یونہی اب بھی پیمائش ہوتی ہے؟

نوخیز علیگی بھائی بتا!

یونی ورسٹی کیمپ بھی لگتا ہے؟ ہے یونیفارم کی پابندی
جلووں کی ریزش ہوتی ہے؟ کیا بارہ دری پہ نمائش کی
ملتا ہے نمائش میں اب تک وہ خان کا حلوہ پراٹھا بھی ؟

نوخیز علیگی بھائی بتا!

کیمپ ڈی پھوس اب بھی ہے وہاں؟ کیا اب بھی برنی ملتی ہے؟
ملتے ہیں لذیذ نمک پارے؟ کیا چائے بھی دیسی ملتی ہے؟
ہے عام کونڈر کا مکھن ؟ رحمت کی لسّی ملتی ہے؟

نوخیز علیگی بھائی بتا!

کیا سینئر اب بھی ہوتے ہیں؟ کیا اب بھی مرغا کھاتے ہیں؟
کیا ڈے اسکالر گالی ہے؟ کیا اب بھی وہ شرماتے ہیں
کیا اب بھی نوازے جاتے ہیں؟ مخصوص افراد خطابوں سے

نوخیز علیگی بھائی بتا!

جنگل سے آمدہ نووارد کیا اب بھی بنائے جاتے ہیں؟
کیا اُلٹی اچکن پہنا کر آداب سکھائے جاتے ہیں؟
بلّے ،گھوڑے ،انڈے، کوّے کیا آج بھی پائے جاتے ہیں؟

نوخیز علیگی بھائی بتا!

کیا بلے والوں کا سکہ کُل شہر میں اب بھی چلتا ہے؟
ہر خورد و کلاں کا سچ کہنا سر فخر سے اب بھی اونچا ہے؟
کیا ذرہ ذرہ علی گڑھ کا اب بھی ہمدوش ثریا ہے؟
نوخیز علیگی بھائی بتا!

کیا کرکٹ اب بھی ہوتا ہے؟ کیا اب بھی کھلنڈرے آتے ہیں!
کیا اب بھی اناالمحدی کا میداں میں ورس گاتے ہیں
ہر بزم کو رونق دیتے ہیں؟ ہر محفل پہ چھاجاتے ہیں؟
نوخیز علیگی بھائی بتا!

کیا اب بھی ہے بین الاقوامی ماحول علی گڑھ کا میرے؟
کیا علم کے طالب آتے ہیں دنیا کے گوشے گوشے سے؟
سب کالے گورے اپنے کو ہیں ایک ہی رنگ میں رنگ لیتے!
نوخیز علیگی بھائی بتا!

کیا سرسید کے معمل میں تشکیلِ مسلماں ہوتی ہے؟
کیا اب بھی اساس محکم سے تعمیر جہاباں ہوتی ہے
سیرت پہ جلا کی جاتی ہے تہذیبِ انساں ہوتی ہے
نوخیز علیگی بھائی بتا!

نادار جو طلباء آتے ہیں ان کا کوئی پرساں آج بھی ہے
ہر مشکل حل ہوجاتی ہے ہر درد کا درماں آج بھی ہے
کیامیرے علی گڑھ کی ڈگری معراجِ مسلماں آج بھی ہے
نوخیز علیگی بھائی بتا!

علیگڑھ : ادبی خدماتِ ناموران

اختر شیرانی

علی گڑھ کے طلبہ کے نام

کفر ہے برسرِ پرخاش، مسلمانوں سے
اے صبا کہنا، علی گڑھ کے غزل خوانوں سے!

کہہ دو دنیائے سیاست کے صنم خانوں سے!
چھیڑ اچھی نہیں اللہ کے دیوانوں سے!

چھین لو، نور ستاروں کے شبستانوں سے!
اور گزر جاؤ مہ و مہر کے ایوانوں سے!

چشمِ سید نگراں ہے کہ پھر اُٹھے شاید
کوئی دیوانہ محبت کے بیابانوں سے!

دور ہے منزلِ سلمائے حیاتِ جاوید
اور گزرنا ہے ہمیں موت کے ویرانوں سے!

تم کو آئی نہیں گر طرزِ فغاں، ہم نفسو!
سیکھ لو، وادیِ یثرب کے حدی خوانوں سے!

وادی و دشت و جبل، ہیچ ہیں ہمت کے لیے
یہ صدا آتی ہے اسپین کے میدانوں سے!

اب تو اک قطرۂ خوں بھی نہ رہا بازو میں
کھیلتے تھے کبھی ہم خون کے طوفانوں سے!

علم و عمل سے قائم ہے نظامِ اسلام
یہ نہ ترکوں سے نہ عربوں سے نہ افغانوں سے!

ایک آزاد نفس، عمرِ قفس سے بہتر
یہ سبق ملتا ہے خیبر کے کہستانوں سے!

ہند میں کعبے کے بندے بھی "خدا" بن کے رہے
پوچھ لو سندھ کے اجڑے ہوئے بتخانوں سے!

شورِ ناقوس سے دب جائے اذاں، ناممکن
کہہ دو یہ، کاشی و متھرا کے صنم خانوں سے!

اے علی گڑھ، مرے اشعار میں کب تھی تاثیر
یہ شراب آئی ہے بطحا کے خمستانوں سے!

○

مسعود ظہیر نقوی

علیگڑھ اور اُردو ادب

علیگڑھ اور اُردو کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ علیگڑھ نے اردو ادب کی ترقی کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔

بہر حال میں یہ کوشش کروں گا کہ اردو ادب کو علیگڑھ نے جو کچھ دیا ہے اس کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کردوں۔

اُردو ادب کی قدیم روایتیں جو دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، رام پور وغیرہ نے پیش کیے تھیں ان کو علیگڑھ نے ایسی جدّت سے پیش کیا کہ اردو ایک ترقی یافتہ زبان بن گئی۔ اُردو کے قدیم ادب اور جدید سوسائٹی کو ہم آہنگ کرنے کا سہرا صرف علیگڑھ ہی کے سر جاتا ہے۔ علیگڑھ نے اُردو کے تمام اسکولوں کو یکجا کرکے ایک ہی دائرے میں محیط کردیا۔

جدید اُردو کے بانی خود سر سیّد احمد خاں تھے۔ انھوں نے اردو کی قدیم رسمیں وغیرہ ترک کرکے سیدھی سادہ اور موثر زبان میں لکھنے کا اسلوب اپنایا جو ان کے مشن میں بھی ان کے بہت کام آیا۔ انھوں نے "تہذیب الاخلاق" میں مصلحانہ اور ناصحانہ انگنت مضمون لکھے۔ جو یوں تو قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے تھے۔ لیکن دراصل اس طرح انھوں نے اُردو ادب کو ایک نیا موڑ عطا کیا۔

مولانا حالی نے اردو نظم و نثر کو ایک نئے رنگ سے آشنا کیا۔ حالی جدید نظم و نثر کے موجد تھے۔ "مدوجزرِ اسلام"، "حیاتِ جاوید"، "یادگارِ غالب"، "مقدمۂ شعر و شاعری" وغیرہ حالی کے بیش بہا کارنامے ہیں۔ اسی زمانے میں شبلی نعمانی نے اپنی قابلِ قدر کتابوں، نظموں اور مقالوں سے اردو ادب کا دامن بھر دیا۔

مولوی عبدالحق نے آسان اردو کے ساتھ کہیں کہیں ہندی کے خوبصورت الفاظ استعمال کرنے کی بنا ڈالی۔ عبدالحق کی سوانح عمریاں اردو ادب کی تاریخ میں اپنے انداز کی منفرد مثالیں پیش کرتی ہیں۔ مولوی عنایت اللہ، مولوی عزیز مرزا اور خواجہ غلام السیدین وغیرہ نے تراجم کے میدان میں بڑے بڑے میدان سر کیے۔

سر ولایت علی، نواب احمد سعید خاں چھتاری، سر رضا علی وغیرہ نے بہت ہی قابلِ قدر سوانح عمریاں لکھیں۔ سر رضا علی کی خود نوشت سوانح عمری اردو زبان کی بہترین سوانح عمری کہی جاتی ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں مولانا محمد علی جوہر، ظفر علی خاں اور حسرت موہانی وغیرہ اردو کے عاشقوں میں سرِ فہرست تھے۔ حالانکہ سیاسی وجوہات کی بنا پر جوہر کو اردو ادب میں کوئی ممتاز مقام نہیں ملا۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انھوں نے اردو صحافت کا معیار بہت بلند کیا۔ جوہر اور ظفر علی خاں کی وطنی نظمیں اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ حسرت موہانی نے اردو غزل کو ایک نئی روح بخشی۔ حالی کی مصلحانہ غزلوں سے اردو غزل کافی حد تک خشک، بے رنگ اور غیر مقبول ہو چکی تھی کہ حسرت کے رومانی غزلوں نے پژمردہ اردو غزل میں ایک جان ڈال دی۔

پہلی جنگِ عظیم سے پہلے ایک نئی ادبی تحریک چلی تھی جو "رومانی تحریک" کے نام سے مشہور تھی۔ اس تحریک کے چلانے والوں میں اکثر علیگڑھ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان اشخاص میں سجاد حیدر یلدرم سرِ فہرست تھے۔ یلدرم کو اردو کے بہترین مضمون نگاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔ وہ ترکی ادب سے کافی مرعوب تھے انھوں نے ترکی مضامین کا اردو ترجمہ کر کے اردو زبان کو ایک نئی وسعت عطا کی۔ سجاد حیدر یلدرم کے بہترین مضامین "اگر میں صحرا نشین ہوتا"

حضرتِ دل کی سوانح عمری"، "جہاں پھول کھلتے ہیں" وغیرہ ہیں۔ رومانی تحریک کی ایک اور قابلِ ذکر ہستی ہیں مہدی افادی۔ انھوں نے عورت کے حسن کو پرستش کی حدوں تک پہنچا دیا تھا ان کی تحریریں' فاصلۂ حسن و عشق"، "بنتِ عم"، "خواب طفلی" اور "آرزوئے شباب" اردو زبان میں رومانی تحریروں میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔

عبدالرحمٰن بجنوری مشرقی تہذیب اور ثقافت کے ایک سچے عاشق تھے۔ انھیں اردو کا پہلا تنقید نگار کہا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریروں میں جو حسن اور بے ساختگی ہے وہ مشکل سے کہیں اور پائی جاتی ہے۔ انھوں نے غالب کی عظمت کو ثابت کرنے کے لیے غالب کے کلام کا موازنہ مغربی شاعری کے شاہ پاروں سے کیا۔ اس کتاب کا نام "محاسنِ کلامِ غالب" ہے جو غالب کے کلام کو سمجھنے کے لیے بہت ہی مستند کتاب مانی جاتی ہے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ڈاکٹر ذاکر حسین، آغا حیدر حسن، حضرت آوارہ، رشید احمد صدیقی، وغیرہ نے اردو ادب میں بیش بہا نگارشات کا اضافہ کیا۔ حالانکہ ذاکر صاحب نے زیادہ تر بچوں کے لیے لکھا مگر اسلوب، اندازِ بیان اور الفاظ کی بندش کے لحاظ سے وہ ادب کی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں آغا حیدر حسن نے اردو ادب میں ایک منفرد انداز کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے "بیگماتی زبان" کو اردو ادب میں شامل کیا اور اردو کے الفاظ کے ذخیرے میں مزید اضافہ کیا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کو سبھی محققین اور تنقید نگاروں نے اردو کا عظیم ترین طنز نگار تسلیم کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی علیگڑھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ بقول خود ان کے جب وہ کسی معقول شخص کو دیکھتے تھے تو یہ اندازہ کر لیتے تھے کہ ضرور علیگڑھ سے متعلق ہوگا۔ ان کے پاس ایک منفرد اندازِ بیان تھا موضوعات کی وسعت اس بات کی شاہد ہے کہ ان کا مشاہدہ کتنا گہرا تھا۔ انھوں نے سماج کا بھرپور مشاہدہ کیا اور سماج کے ناسوروں پر اپنے دھاردار قلم سے عملِ جراحی کیا۔ ان کی طنزیہ تحریریں سماج اور رسموں کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ ہیں۔ ویسے انھوں نے مختلف موضوعات کو سرنامۂ بیان بنایا جیسے سیاست، شخصیات، تعلیم، ادب وغیرہ۔

فرزندانِ علیگڑھ میں ایک نام اور بھی لیا جا سکتا ہے جو اردو شاعری کا ایک دبستان تھا یعنی جوش ملیح آبادی جن کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے جوش کو الفاظ پہ جو قدرت حاصل تھی وہ اردو میں بہت کم شاعروں کے پاس ملتی ہے۔ آزادی سے پہلے جوش کی انقلابی اور شعلہ پرور نظموں نے انگریز سامراجیت کی چولیں ہلا دی تھیں۔ ان کے بے شمار مرثیے اور مسدس اردو ادب میں جواہر پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نثر پر بھی جوش کو یکساں ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے حالاتِ زندگی "یادوں کی بارات" کے نام سے قلمبند کیے تھے جو اردو سوانح عمری میں ایک سنگِ میل کہی جا سکتی ہے۔

آل احمد سرور نے اپنا کیریئر ایک شاعر کی حیثیت سے شروع کیا مگر بعد میں تنقید کی طرف مائل ہو گئے۔ انھوں نے انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس نے اردو کے ممتاز ترین تنقید نگار بننے میں ان کی بہت مدد کی۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اردو ادب کی محفل میں ایک اور جماعت "ترقی پسند تحریک" نے کر اٹھی۔ اس تحریک نے اردو لٹریچر میں کافی حد تک انقلابی ردّ و بدل کیا۔ حالانکہ یہ تحریک ایک Contovirsial مقام رکھتی ہے لیکن اس میں دو رائے نہیں کہ اس تحریک نے اردو ادب کے دائرے کو بے کراں وسعتیں عطا کیا۔ اس جماعت میں بھی اکثریت علیگرین کی تھی۔ سعادت حسن منٹو نے اردو افسانوں کو نئی منزلوں اور رہ گزاروں سے روشناس کرایا۔ ان کی بے باک اور جرأت مندانہ جذبات نگاری نے اردو افسانوں کو مغربی کہانیوں کے معیار سے ہم آہنگ کر دیا۔ ان کی کہانیاں "نیا قانون" "ٹھنڈا گوشت"، "ہتک" اور "ممی" وغیرہ دنیا کے کسی بھی زبان کی کہانیوں کے مقابلے پر رکھی جا سکتی ہیں۔

اردو ادب میں پہلی بار عصمت چغتائی نے مسلمان عورتوں کی صورتحال کو اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے طشت ازبام کیا عصمت چغتائی نے اپنی تحریروں میں مسلمان عورتوں کا بہت ہی ٹھوس نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ منٹو کے بعد عصمت ہی وہ ادیبہ ہیں جو کہی بات بہت ہی بے باکی

سے کہہ جاتی ہیں اور کسی بھی تکلف کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں ان کے افسانے "چوتھی کا جوڑا"، "دو ہاتھ"، "جڑیں"، "لہو کے پھول"، "آخری کوشش"، "ٹیڑھی لکیر" وغیرہ ناولوں کی صنف میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کربلا کے واقعات پر مبنی ان کا ناول "ایک قطرۂ خوں" اردو کی تاریخی ناولوں میں ایک اور بیش قیمت اضافہ ہے۔

اسرار الحق مجاز ان چند شعرا میں سے ہیں جو غزلوں اور نظموں میں یکساں طور سے مقبول ہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں حسن و عشق کے لطیف تذکرے ہوتے ہیں وہیں انسانی بیکسی، بے بسی، محرومی اور مایوسیوں پر بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ "آوارہ" ان کی وہ مشہور نظم ہے جس نے انھیں زندۂ جاوید بنا دیا۔ علیگڑھ کے لیے مجاز ایک اور اہمیت کے حامل ہیں وہ یہ کہ نہ صرف وہ علیگڑھ کے طالب علم رہ چکے تھے بلکہ انھوں نے علیگڑھ یونیورسٹی کو اس کا خوبصورت اور مقبول ترانہ دیا جس کو اب بھی یونیورسٹی کی ہر تقریب میں بڑے جوش و خروش اور فخر سے گایا جاتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کی ایک اور قابلِ ذکر شخصیت ہیں معین احسن جذبی۔ انھوں نے رومانیت کو ایک نیا لباس پہنایا۔ جذبی نے غزلیں اور نظمیں دونوں لکھیں اور دونوں صنف میں کامیابی و مقبولیت حاصل کی۔

جاں نثار اختر کی نظمیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے جیسے ان کی تحریروں میں خود ہماری تہذیب و تمدن سانس لے رہا ہے۔ اس سادگیٔ بیان نے انھیں اپنے دیگر ہم عصروں سے ممتاز بنا دیا۔ علی سردار جعفری نے گو کہ غزلیں بھی کہیں اور مضامین بھی لکھے، افسانے بھی لکھے مگر ان کا نام ان کی ترقی پسند شاعری سے ہی مشہور ہے۔ ترقی پسند تحریک کی ایک اہم کڑی علی سردار جعفری بھی ہیں۔ جن کی نظمیں حسنِ خیال اور اچھوتے طرزِ بیان کی عمدہ مثال ہیں۔

خواجہ احمد عباس نے اردو صحافت کو ایک نیا موڑ دیا۔ انھوں نے بہت سے ناول اور افسانے لکھے ہیں، ان کا اپنا ایک جداگانہ رنگ ہے ان کا افسانہ "سردار جی" اردو کے اچھے افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

پروفیسر خورشید الاسلام اُردو کے چند ممتاز تنقید نگاروں میں گنے جاتے ہیں۔ ان کو الفاظ چننے میں مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے پروفیسر رسل کے ساتھ مل کر ایک ریسرچ ورک کیا ہے جس نے عظیم شاعر غالب کو انگریزی بولنے والوں میں بھی مقبول کر دیا ہے۔ ان کی کتاب "تنقیدیں" ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جاتی ہے انھیں شاعری پر بھی ملکہ حاصل ہے۔ ان کی نظم "منزلیں" کافی داد حاصل کر چکی ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی بھی بیک وقت شاعر اور تنقید نگار تھے۔ انھیں غالب ایوارڈ بھی مل چکا تھا۔ ان کی شاعری اپنے اندر ایک نیا اور سادہ اسلوب رکھتی تھی۔ ان کی زبان نہایت سادہ اور آسان تھی ان کی کتاب "ترقی پسند تحریک" اس موضوع پر نہایت جامع مواد فراہم کرتی ہے۔

ناول کی دنیا میں قاضی عبدالستار کا نام ایک روشن ستارے کی طرح ہے انھوں نے جو ناول لکھے ہیں ان کی مثال اردو ناولوں میں مشکل سے ملے گی۔ ان کی ناولیں "غبارِ شب"، "پہلا اور آخری خط"، "بادل" وغیرہ اپنی مثال آپ ہیں ان کی تحریروں میں زمینداری اور جاگیرداری سسٹم پر ایک گہری ضرب نظر آتی ہے۔ کردار نگاری میں انھوں نے وہ کمال دکھایا ہے کہ ہر ہر کردار زندگی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ انھیں تاریخی واقعات پر جو عبور حاصل ہے اس کی مثال ان کے ناولوں "صلاح الدین ایوبی"، "داراشکوہ" وغیرہ میں بخوبی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر وحید اختر کو تنقید، غزل نگاری، مرثیہ نگاری اور جدید شاعری پر یکساں عبور حاصل ہے۔ دورِ حاضر کے اردو دانشوروں میں وحید اختر ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

علیگڑھ کے انگریزی دانشوروں میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور ڈاکٹر سلامت اللہ خاں وغیرہ وہ مشہور شخصیتیں ہیں جنھوں نے اُردو تنقید پر بہت ہی سنجیدگی سے کام کیا اور ادبی حلقوں سے بے پناہ تعریف حاصل کی۔ اسلوب صاحب نے غالب اور اقبال پر جو کام کیا ہے وہ بلاشبہ قابلِ قدر ہے۔ ان کی مشہور کتابیں "نقشِ غالب"، "اقبال کی تیرہ نظمیں" اور ادب اور تنقید وغیرہ ہیں۔

غزلوں میں شہریار کو خواص و عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ان کی غزل "سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے" ملک کے بچے بچے کی زبان پر آچکی ہے۔ یہ غزل انسانی زندگی کی مجبوریوں اور خواہشات کو بہت حسین انداز میں پیش کرتی ہے۔ بشیر بدر نے غزل کو نئی راہ دکھائی اور تیزی سے مقبولیت حاصل کی۔ ان کا یہ شعر ؎

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو — نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

ضرب المثل کی سند حاصل کرکے ملکی سرحدوں کو پار کر گیا ہے۔ ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی دورِ حاضر کی مانی ہوئی جدید شاعرائیں ہیں۔ زاہدہ زیدی نے جدید نظموں کے علاوہ خوبصورت غزلیں بھی کہی ہیں، افسانے بھی لکھے ہیں اور انگنت ڈرامے بھی تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے بہت سے مشہور روسی ڈراموں کو اردو زبان میں منتقل کرکے اردو ڈرامے کو نئی سرحدوں سے روشناس کرایا ہے۔

ڈاکٹر اظہار الحسن آج کے چند گنے چنے افسانہ نگاروں میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے افسانے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بہت ہی خوبصورتی سے اجاگر کرتے ہیں۔ علیگڑھ نے اردو زبان کی اتنی خدمت کی ہے جو ایک مختصر سے مضمون میں بیان سے باہر ہے جن چند لوگوں کا یہاں ذکر ہوا ہے ان کے علاوہ لاتعداد نام ایسے ہیں جنھوں نے اردو ادب کے لیے گراں قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔

آج جبکہ ہر جگہ اردو کو ختم کرنے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں صرف علیگڑھ ہی ایک ایسا مقام ہے جو اردو کی اس طرح حفاظت کر رہا ہے جیسے کوئی اپنی دولت کی حفاظت کرتا ہے۔ آج بھی یونیورسٹی اسکولوں سے ہر سال ہزاروں اردو جاننے والے طلبار اور طالبات نکلتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ڈگری کورس تک ہر طالب علم کے لیے اردو پڑھنا ضروری ہے۔ شعبۂ اردو میں آج بھی ہر طرح سے اردو کی خدمت کی جا رہی ہے مختلف تحقیقی، تنقیدی اور اشاعتی کام کیے گئے ہیں، کیے جا رہے ہیں اور کیے جاتے رہیں گے اور اردو کا کارواں آگے بڑھتا رہے گا۔ بقول مجاز ؎

جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا — خود اپنے چمن پر برسے گا غیروں کے چمن پر برسے گا

یہ ابر ہمیشہ برسا ہے یہ ابر ہمیشہ برسے گا

ڈاکٹر رخسانہ عابدی

اُردو شاعری کے فروغ میں علیگڑھ کا حصّہ

علیگڑھ تحریک کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی اہمیت ہونے کے ساتھ ادبی اہمیت بھی مسلّم ہے۔ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس تحریک کے باعث اردو ادب میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ادب کو زندگی سے قریب لانے میں اس تحریک نے اساسی کردار ادا کیا۔ اور اردو ادب کی کلاسیکی قدروں کے برخلاف نئے اصول وضوابط متعین کرنے کے باعث ہی یہ تحریک قدیم اور جدید کے مابین ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علیگڑھ تحریک سے وابستہ ادیبوں کی کاوشوں کی بدولت کس طرح اردو کی مختلف نثری اصناف میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں نئی اصناف کو رائج کرنے اور پرانی اصناف کو نئے سرے سے ترتیب دینے میں سرسید اور ان کے رفقاء کا تعاون حاصل رہا ہے۔ اس کے علاوہ شعروادب کے ارتقاء میں علیگڑھ تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کا جو حصّہ رہا وہ کسی کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں لیکن اس تحریک کو بالعموم صرف اردو نثر کی تحریک کے ایک رخ کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے۔ حالاں کہ

حقیقت حال یہ ہے کہ علیگڑھ تحریک یا علیگڑھ سے وابستہ شاعروں میں سے بعض نے اردو شاعری کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

علیگڑھ سے وابستہ شاعروں میں الطاف حسین حالی کو اولیت کا درجہ ہے۔ سرسید احمد خاں کے معاصر ادیبوں میں حالی اور شبلی کو جزو لاینفک قرار قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ حالی نہ تو یہاں استاد کی حیثیت سے رہے اور نہ شاگرد کی حیثیت سے۔ لیکن علیگڑھ تحریک کو کامیاب بنانے میں ان کا خصوصی تعاون رہا ہے۔ ان کے شعری سرمائے میں "دیوانِ حالی" اور مجموعۂ "نظم حالی" ہیں جن میں شہرت کا باعث مجموعۂ نظم حالی ہے جس کے مقدمے نے ایک الگ کتابی شکل میں (مقدمہ شعر و شاعری) غیر معمولی اہمیت حاصل کرلی۔ حالی نے اصلاحی اور مقصدی نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے روایتی شاعری سے انحراف کے طور پر نئی شاعری کی ابتدا کی۔ یوں تو وہ اس سے قبل روایتی انداز میں غزلیں قصیدے، مرثیے اور ترکیب بند وغیرہ بھی لکھ چکے تھے۔ لیکن بعد میں انھوں نے روایتی اصناف کی تنقید کرتے ہوئے مثنوی کی ہیئت کو فروغ دیا۔

شبلی نعمانی بھی سرسید کے اہم ساتھیوں میں سے تھے۔ وہ عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے علیگڑھ آئے۔ ان کا شعری مجموعہ "نظم شبلی" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی شاعری سے زیادہ اہمیت ان کے شعری تصورات کو حاصل ہے۔ جس کا اندازہ "شعر العجم" اور موازنہ انیس و دبیر کو پڑھنے سے لگایا جاسکتا ہے۔ شبلی اہم نقاد ہونے کے ساتھ اچھے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے اصلاحی اور مقصدی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے موضوعاتی شاعری کو فروغ دیا۔

وحید الدین سلیم سرسید احمد خاں کے لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے علیگڑھ آئے۔ انھوں نے سرسید اور حالی کے تصورات سے متاثر ہو کر شاعری کی ان کا شعری کارنامہ "افکارِ سلیم" کے نام سے شائع ہوا۔ انھوں نے موضوعاتی شاعری کی۔ شاعری میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے حالی کی طرح سادگی، اصلیت اور جوش پر مبنی شاعری پر زور دیا۔

سرسید تحریک سے وابستہ شاعروں میں احسن مارہروی مدرس کی حیثیت

سے علیگڑھ آئے۔ قادرالکلام اور موزوں طبع ہونے کے باعث کثرت سے شاعری کی۔ "احسن الکلام" کے عنوان سے ان کا دیوان شائع ہوا۔ تحریک سے وابستہ شاعروں میں حامد علی خاں اور ظفر علی خاں بھی ہیں۔ حامد علی خاں کی شاعری مختلف ادبی جرائد میں شائع بھی ہوئی لیکن ان کی شاعری کوئی اہم ادبی حیثیت نہ رکھنے کے باعث ہماری توجہ اپنی طرف مرکوز کرنے میں ناکام رہی۔ ظفر علی خاں کی شاعری "بہارستان" اور "نگارستان" میں شائع ہوئی۔ ان کی شاعری زبان و بیان کے اعتبار سے اہم ہونے کے باوجود بھی کوئی اہم مرتبہ نہیں رکھتی حالانکہ وہ قادرالکلام اور موزوں طبع تھے اور ہر خیال کو منظوم شکل میں پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

علیگڑھ کے طالب علموں میں خوشی محمد ناظر صاحب دیوان شاعر ہیں۔ داؤد عباسی اور ضیا احمد بدایونی کے بھی شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں اور جلیل احمد قدوائی کے بھی کئی مجموعہ کلام شائع ہوئے لیکن ان سبھی شاعروں کو کوئی اہم مرتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ ان کے علاوہ مشہور افسانہ نگار اور نثر نگار سجاد حیدر یلدرم کی شاعری ادبی جرائد میں شائع ہوئی اور مشہور نقاد اور افسانہ نگار مجنوں گورکھپوری کی غزلیں بھی شائع ہوئیں۔ اسی طرح مبکش اکبرآبادی کی شاعری کسی مجموعے کی شکل میں نہیں ملتی۔ یہ سبھی ایسے شعرا ہیں جن کی شاعری میں کوئی نمایاں امکانات نہیں ملتے۔ اسی لیے ان شعرا کو اردو کے شعری منظرنامے میں کوئی خاص مرتبہ حاصل نہ ہو سکا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں چند ایسے شعرا کے نام زیر بحث آئے جنھیں علیگڑھ کا طالب علم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وہ ادبی اہمیت رکھنے کے ساتھ ہی سیاسی اعتبار سے بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان میں سید فضل الحسن حسرت، اقبال سہیل، محمد علی جوہر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سبھی غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ حسرت موہانی کی شاعری "کلیاتِ حسرت" میں ملتی ہے۔ حسرت موہانی مجاہد آزادی، صحافی اور محقق ہونے کے ساتھ مشہور شاعر بھی تھے۔ انھوں نے عشقیہ اور سیاسی موضوعات پر شاعری کی۔ اور تغزل اور استعاراتی

اسالیب بیان کو فروغ دیا۔
محمد علی جوہر کا شعری کلام "جوہر کی شاعری" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی شاعری میں سیاسی خیالات ملتے ہیں۔ انھوں نے براہ راست انداز اختیار کرنے کے بجائے تمثیلی انداز اختیار کیا۔ جوہر ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے لفظیات پر دسترس ہونے کے باوجود اردو شاعری میں کوئی خاص اسلوب نہیں چھوڑا۔ اس دور کے اہم شاعروں میں اقبال سہیل کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ انھیں اردو کی شعری روایت کا شعور بھی تھا اور شعر کہنے کا ڈھنگ بھی۔ انھوں نے روایتی انداز میں شاعری کی اور غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ان کی غزلوں میں سیاسی خیالات کے علاوہ متصوفانہ خیالات بھی ملتے ہیں۔ انھوں نے استعاراتی اور تمثیلی انداز کو اختیار کرتے ہوئے روایتی لفظیات کو نئی معنویت عطا کی۔ ان کی شاعری کی اہم خصوصیات انفرادی اسلوب اور بلند آہنگی ہے۔ ان کا شعری کلام "کلیاتِ سہیل" کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔
ان شعرا کے ہم عصر شاعر فانی بدایونی بھی ہیں۔ فانی نے اردو غزل کی روایت کو توانائی بخشی۔ ان کا شعری کلام "عرفانیاتِ فانی"، "کلیاتِ فانی"، "وجدانیاتِ فانی" اور "باقیاتِ فانی" میں ملتا ہے۔ یہ بھی شعرا اس دور کی پیداوار ہیں جب غزل تنقید کی زد پر تھی اور غزل کے بجائے نظم کو شعوری طور پر فروغ دینے کی تحریک چل رہی تھی۔ روایتی شعرا کی فہرست میں آخری غزل گو کی حیثیت سے فانی بدایونی کو اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع حیات اور موت ہے۔ ان کے یہاں صنائع اور بدائع کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قدیم اور جدید شعریات کی ہم آہنگی بھی یہی وجہ ہے کہ فانی کو معاصر غزل گو شعرا کی فہرست میں انفرادی مقام حاصل ہے۔
نظم گو شعرا کی حیثیت سے عظمت اللہ خاں اور جوش ملیح آبادی کو اہمیت حاصل ہے۔ "سریلے بول" عظمت اللہ خاں کا واحد شعری مجموعہ ہے اور جوش کے تقریباً سترہ شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ان کی خودنوشت

"یادوں کی برات" کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔

علیگڑھ سے وابستہ شاعروں میں جن شعرا کو تدریس سے وابستہ ہونے کا موقع ملا ان میں مسعود علی ذوقی، آل احمد سرور، اختر انصاری اور جذبی کے نام شامل ہیں۔ ذوقی نے ڈرامہ نگاری کے علاوہ اچھی شاعری بھی کی ہے لیکن ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہ ہو سکا۔ ان کی شاعری مختلف ادبی جرائد میں شائع ہونے کے باوجود کسی نے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی پہلی مرتبہ میراں جی نے 'معاون' کے مدیر کی حیثیت سے جن منظومات کا تجزیہ کیا ان میں ذوقی کی نظم "جھیل کے کنارے" بھی شامل ہے جسے انھوں نے اپنی کتاب "اس نظم میں" شامل کیا۔ اس کے بعد سوغات کے ایڈیٹر محمود ایاز نے بھی ان کی ایک نظم کو سوغات کے نظم جدید نمبر ۱۹۶۹ء میں شائع کر کے قاری کی توجہ ان کی طرف مرکوز کرائی۔

پروفیسر آل احمد سرور کو اردو تنقید میں جو معتبر اور مستند مقام حاصل ہے وہ محتاجِ دلیل نہیں۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو اور انگریزی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اردو میں استاد کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ ان کی خود نوشت "خواب باقی ہیں" شائع ہو چکی ہے۔ ان کے اب تک تین شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ "سلسبیل"، "ذوقِ جنوں" اور "خواب اور خلش"۔ لیکن ان کی تنقیدی حیثیت کے مقابلے ان کی شاعرانہ حیثیت نمایاں نہیں ہو سکی۔ سرور صاحب کو اب تک مختلف انعامات کے علاوہ غالب ایوارڈ اور پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا ہے انھیں عالمی ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

اختر انصاری اردو کے نقاد اور افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ہی شاعر بھی تھے۔ ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہوئے۔ معین احسن جذبی استاد کی حیثیت سے ۱۹۴۵ء میں شعبۂ اردو سے منسلک ہوئے۔ انھیں شاعر کی حیثیت سے اہم مرتبہ حاصل ہے۔ اب تک تین مجموعے کلام منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ "سخن مختصر"، "فروزاں"، "گدازِ شب" اور اعزازات میں غالب ایوارڈ کے علاوہ اقبال سمان سے بھی انھیں نوازا گیا ہے۔

علیگڑھ کے طالب علم شعرا میں اسرار الحق مجاز، جاں نثار اختر، سردار جعفری کے نام محتاج دلیل نہیں۔ مجاز استاد کی حیثیت سے بھی رہے۔ مجاز کو علیگڑھ سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ ان کے شاعری میں علیگڑھ کے کلچر کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ "آہنگ" ان کا واحد مجموعۂ کلام ہے۔ مجاز کی قبل از وقت موت نے ہمارے بیچ سے ایک ہونہار شاعر کو اٹھا لیا۔

جاں نثار اختر کی شاعری کا آغاز علیگڑھ میں طالب علمی کے زمانے میں ہوا۔ "گرلس کالج کی لاری" کی اشاعت کے بعد وہ کافی مشہور ہوئے۔ ان کے شعری مجموعوں میں "خاک دل"، "خاموش آواز" اور "پچھلے پہر" کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ فلمی دنیا سے وابستگی نے انھیں اور بھی زیادہ مقبولیت عطا کی۔

سردار جعفری علیگڑھ کے طالب علموں میں ایک اہم اور باوقار شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ۹ شعری مجموعے ہیں۔ وہ قادر الکلام شاعر کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے عوامی مسائل کو موضوع بنایا اور مخصوص شعری جمالیات کو فروغ دیا۔ ان کی شاعری میں بیانیہ شاعری کے اچھے نمونے ملتے ہیں انھیں کئی اہم انعامات سے نوازا جا چکا تھا۔ سردار کی علیگڑھ سے وابستگی سے انکار ممکن نہیں وہ یہاں طالب علم کی حیثیت سے رہے انھیں یہاں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا گیا تھا۔ انھیں کیمپس پوئٹ کا منصب بھی عطا کیا گیا۔ وہ اردو کے واحد شاعر ہیں جنھیں گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا۔

غلام ربانی تاباں طالب علم کی حیثیت سے علیگڑھ سے وابستہ ہوئے ان کے شعری سرمائے میں چار مجموعے شامل ہیں۔ "ساز لرزاں"، "حدیث دل" "ذوق سفر" اور "غبار منزل"۔ ان کی ادبی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں ساہتیہ اکاڈمی کے ایوارڈ کے علاوہ پدم شری ۱۹۷۱ء میں نوازا گیا۔

علیگڑھ سے وابستہ شاعروں میں اختر الایمان کو اہم اور ممتاز مرتبہ حاصل ہے۔ اس یونیورسٹی میں انھوں نے ۱۹۴۳ء میں ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ اس وقت ان کا پہلا شعری مجموعہ "گرداب" شائع ہو چکا تھا جس کے باعث وہ شاعر کی حیثیت سے مقبول بھی ہو چکے تھے۔ ان کے تقریباً ۹ شعری مجموعے

شائع ہوئے جسے انھوں نے "سروساماں" کلیات کی شکل میں شائع کیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور شعری مجموعہ "زمین زمین" بھی شائع ہوا۔ ان کے انتقال سے قبل ان کی کئی نظمیں "شب خون" اور رسالہ "سوغات" میں شائع ہوئیں۔ ان کے ادبی مرتبے کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں متعدد انعامات سے نوازا گیا جن میں سے اہم انعامات میں سے "یادیں" پر ساہتیہ اکادمی کا انعام اور کلیات "سروساماں" پر اقبال سمان سے نوازا گیا۔ یوں تو انھیں گیان پیٹھ ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا لیکن افسوس انھیں مل نہ سکا۔ فلمی دنیا سے وابستگی نے بھی انھیں خاص مقبولیت عطا کی۔ علیگڑھ سے ایم۔ اے کرنے کے دوران ہی وہ فلمی دنیا سے منسلک ہو گئے تھے۔ اسی باعث ان کا ایم۔ اے مکمل نہ ہو سکا۔

خورشید الاسلام یہاں کے طالب علم ہونے کے ساتھ درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے وہ نقاد ہونے کے ساتھ ہی شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے۔ ان کے اب تک تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں "رگِ جاں" "شاخِ نہال"، "غم" اور "جستہ جستہ"۔ جستہ جستہ ان کی نثری نظموں کا مجموعہ ہے باقی دونوں مجموعوں میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔

علیگڑھ کے اہم شاعروں میں عزیز حامد مدنی کا نام بھی شامل ہے جنھوں نے یہاں سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور بعد میں پاکستان چلے گئے۔ ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں: دشتِ امکاں، نخلِ گماں، چشمِ گماں، اور آخری، گلِ آدم، جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ علیگڑھ سے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ شعراء نے نہ صرف یہ کہ انڈو پاک میں ممتاز اور معیاری مقام حاصل کیا بلکہ بیرونِ ممالک کے بھی گوشوں کو اپنی ادبی کاوشوں سے روشن و منور کیا۔ ایسے شعرا میں منیب الرحمٰن کا نام لیا جا سکتا ہے۔ وہ آج کل امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ منیب الرحمٰن نے یہاں سے فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد فارسی شعبہ میں استاد کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے "بازدید" اور "شہر گماں"۔ بازدید کی دوبارہ اشاعت سے قاری کی رسائی حاصل ہو سکی لیکن "شہر گماں"

۔۔۔ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کسی طرح بھی دستیاب نہ ہوسکا۔

مسعود حسین خاں نے بھی علمی اور تنقیدی کاوشوں میں مصروفیت کے باوجود شاعری طرف اپنی توجہ مرکوز کی۔ ان کا شعری مجموعہ "دونیم" کے نام سے شائع ہوا۔ علیگڑھ کے طالب علم اور استاد دونوں حیثیت رکھنے والے شعرا میں خلیل الرحمٰن اعظمی کو اہم شاعر کا مقام حاصل ہے۔ ان کے شعری سرمائے میں تین مجموعے شامل ہیں: "کاغذی پیرہن" "نیا عہدنامہ" اور "زندگی اے زندگی"۔

علیگڑھ سے وابستہ شاعروں میں باقر مہدی، شہریار، وحید اختر اور بشیر بدر کے نام اہم ہیں۔ باقر مہدی نے اپنے چاروں مجموعوں کو کلیات "سیاہ سیاہ" کے نام سے شائع کرایا ہے۔ وحید اختر شعبۂ فلسفہ سے منسلک رہے۔ انھیں بھی ایک اچھے نقاد اور اچھے شاعر کا مرتبہ حاصل ہے۔ علیگڑھ کے طالب علم اور استاد کی حیثیت سے پروفیسر شہریار کو اردو شاعری میں اہم اور معتبر مقام حاصل ہو چکا ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "خواب کا در بند ہے" پر ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ حاصل ہوا۔ ان کا نیا مجموعہ "نیند کی کرچیں" بھی منظر عام پر آچکا ہے۔

علیگڑھ سے وابستہ شاعروں میں بشیر بدر کو خاص امتیاز حاصل ہے یونیورسٹی میں انھوں نے ۱۹۶۱ء میں ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ اس وقت تک وہ اردو کی ادبی دنیا میں جانے پہچانے شاعر کی شناخت بنا چکے تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں یعنی پی۔ ایچ۔ ڈی کے دوران ہی ان کا پہلا مجموعہ "اکائی" طبع ہوا۔ جس نے ان کے لیے شہرت اور مقبولیت کے در وا کر دیے۔ اب تک ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں "اکائی"، "آمد"، "آس"، "آسمان"، "آمد"، "اجالے اپنی یادوں کے" خاص ہیں۔ بشیر بدر کی کتاب "آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ" میں اپنی موضوع کی پہلی کتاب ہے۔ پدم شری کے اعزاز کے علاوہ "آس" پر ان کو ساہتیہ اکادمی کے انعام سے بھی نوازا گیا ہے۔ بشیر بدر اردو غزل کو نئی جہت دینے والے قافلے کے سالار ہیں۔ اب فلمی دنیا سے بھی منسلک ہو گئے ہیں۔

دیگر شعرا میں شمیم حنفی، وارث کرمانی، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، ابن اشرف

بھی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ فرحت احساس (صحافی)، اسعد بدایونی اور مہتاب حیدر نقوی کو بھی شاعر کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

علیگڑھ سے متعلق شعراء کے مختصر تعارف سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ علیگڑھ کے پلیٹ فارم سے سامنے آنے والے ان شعراء نے اردو ادب کو وسعت بخشی اور اردو شعر و ادب کو ترقی دینے کے سرسید احمد خاں کے مشن کو کامیاب بنایا۔ ان میں سے بیشتر شعراء نے کسی نہ کسی شکل میں اردو ادب کو ترقی دی ہے۔ مختلف تحریکات کو فروغ دینے یا ہیئت اور اسلوب کو رائج کرنے میں علیگڑھ کے شعراء کا تعاون رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اردو شعر و ادب کی تاریخ میں علیگڑھ کے شعراء کی کاوشوں کو فراموش نہیں کر سکتے۔

●

> جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا تو مجھے ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔ جہاں تک ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا، سب سے اوّل یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ ایک مدرستہ العلوم قائم کیا جائے۔" (سرسید)

ڈاکٹر امتیاز احمد

علیگڑھ میں اردو فکشن کا حصّہ
(ایک جائزہ)

جدید فکشن کا آغاز نذیر احمد کے ناولوں سے ہوتا ہے۔ اسی طرح اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں جن چند اشخاص کا نام لیا جاتا ہے وہ یلدرم، پریم چند اور سلطان حیدر جوش ہیں۔ نذیر احمد کی سرسید اور علی گڑھ تحریک سے رفیقانہ اور یلدرم اور سلطان حیدر جوش کی اہم ہے۔ اور کالج سے طالب علمانہ وابستگی اس سلسلہ میں محض اتفاقات نہیں بلکہ اس دعوی کی دلیل ہے کہ:

> "جدید اردو کے بیشتر اسالیب اور صحت مند رجحانات و روایات
> علی گڑھ کے دیے ہوئے ہیں۔"
>
> (آشفتہ بیانی میری از رشید احمد صدیقی ص ۱۰)

علی گڑھ کے ابتدائی لکھنے والوں میں یلدرم، جوش، قاضی عبدالغفار، عظیم بیگ چغتائی حکیم احمد شجاع، مجنوں گورکھپوری جیسی اہم شخصیتیں شامل ہیں۔ ان مصنفین کی تخلیقات میں رومانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ماحول، فضا، موضوع اور اسلوب ہر طرح سے ان لوگوں نے رومانیت کو اپنایا۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سرسید اور ان کے رفقاء کی منطقیت، تقشف، عقلیت، استدلال، جوش اور اخلاقی نقطۂ نظر کی شدت پسندی وغیرہ سے ان لوگوں نے انحراف کیا اور اردو ادب کو ایک رومانی نقطۂ نظر اور ماورائی دنیا کی کا احساس دلایا۔ اسلوب کی دلکشی و دل آویزی پیدا کی اور عقلیت سے بلند ہو کر سوچنے اور سوچنے سے زیادہ محسوس کرنے پر اصرار کیا۔ عورت، حسن، عشق اور اس کے معاملات جن کو سرسید اور اُن کے رفقاء نے شجر ممنوعہ قرار دے کر ادب کو اخلاقی پابندیوں میں جکڑ دیا تھا، ان سے چھٹکارا حاصل کیا۔ ادب کی اپنی آزاد شناخت پر اصرار کیا اور اسے خارجی معیاروں پر انحصار سے انکار۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی۔ علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

جس طرح رومانی رجحانات کے حامل یہ مصنفین سرسید اور اُن کے رفقاء کے خشک عقلی، منطقی، استدلالی اور اخلاقی نقطۂ نظر کے ردِ عمل کے طور پہ سامنے آئے تھے، اسی طرح اس رومانی رجحان کے خلاف بھی ردِ عمل ہوا۔ رشید جہاں، اختر انصاری، احمد علی، منٹو، اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری، سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی وغیرہ نے حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی کوشش کی۔ ان مصنفین نے رومانی دھندلکوں میں زندگی گزارنے، اسلوب کی دلکشی، رعنائی اور افراد کی انفرادیت پر اصرار کرنے کے بجائے سماج اور معاشرے کا مطالعہ کر کے اسے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ کچھ نے نفسیاتی دروں بینی کو اپنایا، کچھ نے حقیقت پسندی کو، کچھ نے مارکسی نقطۂ نظر کی تبلیغ کو۔ کچھ ان لوگوں نے اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، انھوں نے فکشن کے نہایت کامیاب اور اچھے نمونے پیش کیے۔ منٹو اور عصمت نے حقیقت نگاری میں رسوائی کا درجہ حاصل کرلیا ان کی کھردری حقیقت نگاری کسی ملمع کی ضرورت محسوس نہیں کرتی لیکن نظریے کے بجائے نظر کی پابند ہے۔ یہ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھتی ہے، فرشتہ یا خدا نہیں سمجھتی۔ یہ اس کی کمزوریوں کو چھپاتی نہیں اور نہ اچھائیوں کا پروپیگنڈا کرتی ہے۔ یہ اچھائیوں میں برائیاں اور برائیوں میں اچھائیاں دیکھتی ہے۔ ان اچھائیوں میں چھپی برائیوں اور برائیوں میں چھپی اچھائیوں کو فن بناتی ہے ___ یہ عریانی کا شکار تو ہو سکتی ہے، فحاشی کا شکار نہیں ہو سکتی منٹو ان حقیقت پسند اور حقیقت شناس فکشن نگاروں کا کارواں سالار ہے۔ اس نے انسان کو طنز کی تلخی اور فن کاری کی سحر سے نکھار دیا ہے۔ اُس کی حقیقت نگاری میں جزئیات نگاری اور نفسیاتی دروں بینی کو پیش کرنے کا کمال نظر آتا ہے۔ اس کے افسانے ہتک، کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، دھواں، سڑک کے کنارے، کالی شلوار وغیرہ اردو فکشن کا ناقابلِ فراموش سرمایہ ہیں۔

مذکورہ افسانہ نگاروں کے بعد کی نسل میں علی گڑھ کا حصہ بہت زیادہ نہیں ہے ابراہیم جلیس، قرۃ العین حیدر، سلمیٰ صدیقی، قاضی عبدالستار اور محمد عمر میمن اس نسل کے علی گڑھ سے متعلق فن کار ہیں۔ ان فن کاروں نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔ ان قلم کاروں کو کسی ایک رجحان اور نقطۂ نظر کا پابند نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ان کی [illegible] پسند فن کاروں کے زیرِ سایہ ہوئی ہے۔ اس لیے اُن کے افکار اُن کے

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

یہاں نذر دریا سے ملتے ہیں۔ یہاں قرۃ العین حیدر، سلمیٰ صدیقی اور قاضی عبدالستار کے یہاں ماضی ایک بڑی طاقت بن کر سامنے آتا ہے۔ یہ فن کار اپنے ماضی کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ محمد عمر میمن کے یہاں بھی یہ رجحان ملتا ہے لیکن ان کی تخلیقات بنیادی طور پر انسان کے اندر پلے کرب، الجھنوں، پریشانیوں، سماج سے بے تعلقی اور زندگی کی مہملیت کی فکر سے آتی ہے ہمیں آخری نسل میں صلاح الدین پرویز، غضنفر علی غضنفر، طارق چھتاری، غیاث الرحمٰن، پیغام آفاقی، سید محمد اشرف اور ابن کنول کے نام آتے ہیں۔ ان سب میں اپنی انفرادیت ہے اور ایک الگ رجحان۔ یہ اس صدی کی نویں دہائی کے کامیاب فن کار ہیں لیکن ان کے بارے میں ابھی سے کچھ لکھنا قبل از وقت ہوگا۔ (بشکریہ علیگڑھ میگزین ۱۹۹۱ء)

"یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا۔ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو عزت حاصل ہوگی۔

(مدرسۃ العلوم کے طالب علموں سے خطاب)

ڈاکٹر بشیر بدر

علیگڑھ میگزین کے خصوصی شمارے

انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۵ رمئی ۱۸۹۱ء کے ضمیمہ کی حیثیت سے "محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین" کا اجرا ہوا۔ اس وقت انگریزی اور اردو کے حصے مشترک شائع ہوتے تھے۔ مدیر اعلیٰ کالج کے پرنسپل تھیوڈر بیک تھے (پروفیسر) شبلی نعمانی اردو سیکشن کے ایڈیٹر تھے۔ ہم کو ۱۸۹۶ء[1] کی جلد دستیاب ہوئی ہے۔ شمارہ نمبر ۱۔ جلد ۳، اشاعت ماہ جنوری ۱۸۹۶ء میں شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"تقریباً چار برس ہوئے اس نام کا ایک رسالہ انگریزی اور اردو ملا ہوا علیگڑھ کالج سے نکلنا شروع ہوا۔ اوّل اوّل وہ علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ (گزٹ) کا ضمیمہ بن کر نکلتا رہا لیکن (۸ رمئی ۱۸۹۴ء کی اشاعت کے بعد[2]) ۱۸۹۴ء میں اس نے مستقل رسالے کی صورت اختیار کی۔"

---

[1] اس سلسلہ میں مزید تفصیلات فراہم کی جارہی ہیں۔ جناب فرح جلالی اور ضیاء الدین انصاری (مولانا آزاد لائبریری) کا شکریہ واجب ہے جنھوں نے معلومات کی فراہمی میں ہماری بڑی مدد کی ہے۔

[2] یہ نئیں David Lely Yeld نے کیا ہے۔ ان کی ریسرچ کا موضوع یہ ہے۔

A Social history of the first generation of Aligarh College students

(خالص رسالہ کی حیثیت سے اس کی اشاعت کا یہ پچھترواں سال ہے۔ جب یہ موجودہ غالب نمبر پیش کیا جا رہا ہے۔)

سنہ ۱۸۹۸ء سے شبلی کے بعد حصہ اردو کی ادارت کا بار اس کے منیجر خواجہ محمد عین اور نائب منیجر پر رہا۔

سنہ ۱۸۹۹ء ستمبر میں ایڈیٹر تھیوڈر بیک کا انتقال ہو گیا۔ میگزین شائع تو ہوتا رہا مگر اشاعت میں کوئی پابندی نہیں رہی۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں ولایت حسین آنریری منیجر ہوئے۔ نام بدل کر "علیگڑھ منتھلی" ہو گیا۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں پروفیسر محمد شفیع آنریری منیجر ہوئے۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں ڈی آکر ڈومی منیجر ہوئے۔

سنہ ۱۹۱۲ء ہی میں اردو سیکشن کے اسسٹنٹ ایڈیٹر جلال الدین ہوئے۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں مسٹر اے۔ ایف رحمٰن (پروفیسر) علیگڑھ منتھلی کے پبلشر ہوئے۔

سنہ ۱۹۲۱ء کی اشاعت نومبر دسمبر میں رشید احمد صدیقی کا نام ایڈیٹر کی حیثیت کے بجائے پبلشر رحمٰن صاحب کے شائع ہوا۔ اس کے بعد سلسلہ یوں ہے:۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی	سنہ ۱۹۲۰ء	تا	سنہ ۱۹۲۳ء
پروفیسر خواجہ منظور حسین	سنہ ۱۹۲۳ء	تا	سنہ ۱۹۲۴ء
اشفاق حسین بیخود	سنہ ۱۹۲۵ء	تا	سنہ ۱۹۲۵ء
بشیر احمد صدیقی	سنہ ۱۹۲۵ء	تا	سنہ ۱۹۲۶ء
پروفیسر عبدالباسط	سنہ ۱۹۲۶ء	تا	سنہ ۱۹۲۷ء
محمد دالحسن صدیقی	سنہ ۱۹۲۷ء	تا	سنہ ۱۹۲۸ء
انیس الدین احمد رضوی	سنہ ۱۹۲۸ء	تا	سنہ ۱۹۲۹ء
محمد زکریا فیاضی	سنہ ۱۹۲۹ء	تا	سنہ ۱۹۳۰ء
حکیم ماجد حامدی	سنہ ۱۹۳۰ء		
ممتاز احمد بسمل	سنہ ۱۹۳۰ء	تا	سنہ ۱۹۳۱ء
عبدالاحد خاں خلیل	سنہ ۱۹۳۱ء	تا	سنہ ۱۹۳۲ء
سید وحید اکبرآبادی	سنہ ۱۹۳۲ء		

بیٹھے ہوئے: مس تہمار ہاشمی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، نسیم قریشی (ایڈیٹر) سید نوراللہ (پرووائس چانسلر) سید ظہیرالدین علوی

کھڑے ہوئے: نثار قریشی، انوارالزماں، حفیظ میاں، انعام حسن، ایس آصف علی، عابداللہ عارف

علیگڑھ میگزین کے گیارہ ایڈیٹر ۱۹۲۱ء سے ۱۹۶۹ء تک

بیٹھے ہوئے بائیں سے دائیں۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد، پروفیسر آل احمد سرور، لیتر مہ (مرحوم)، ایڈیٹر، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی
ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، ڈاکٹر قمر رئیس کھڑے ہوئے۔ ایم قریشی، سید امین اشرف، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی۔ شہریار۔

دلشاد نبی — ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء

پروفیسر آل احمد سرور — ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی — ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء

جاں نثار اختر — ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء

محمد معین الدین دُردائی — ۱۹۳۷ء

پروفیسر عبد اللیث صدیقی — ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء

آفتاب احمد جیبی ردولوی — ۱۹۳۹ء

سید محمد صادق صفوی، رشید احمد مودودی — ۱۹۴۱ء

سید بختیار حسن — ۱۹۴۱-۲ء

راز مراد آبادی — ۱۹۴۳ء

ملک حامد حسن — ۱۹۴۴ء

محمود فاروقی — ۱۹۴۷ء

پروفیسر مختار الدین احمد آرزو — ۱۹۴۸-۴۹ء

سید شبیہ الحسن نونہروی — ۱۹۵۰ء

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، اے کے آفتاب زبیری — ۱۹۵۱-۵۲ء

ظہیر احمد صدیقی — ۱۹۵۳ء

نسیم قریشی — ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۵ء

عبدالحفیظ صدیقی — ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۶ء

قمر رئیس — ۱۹۵۷ء

انور صدیقی — ۱۹۵۸ء

حسن مثنیٰ انور — ۱۹۵۹ء

سید امین اشرف — ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۱ء

شہریار — ۱۹۶۳ء

محمد اسلم رضوی — ۱۹۶۶-۶۷ء

بشیر بدر — ۱۹۶۸-۶۹ء

اس تفصیل سے یہ چند باتیں واضح ہوتی ہیں:۔

ہماری میگزین کا اجرا ۵ رمئی ۱۸۹۱ء کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ضمیمے کے طور پر ہوا۔ اس اشاعت کے پہلے صفحہ پر عکس (جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا صفحہ نمبر ۴۹۴ ہے)، شاملِ اشاعت ہٰذا ہے۔

مئی، جون ۱۸۹۴ء سے اس نے مستقل رسالے کی صورت اختیار کی مگر ہم کو یکم مئی ۱۸۹۵ء کا ایک شمارہ دستیاب ہو سکا ہے۔ اس کے اردو اور انگریزی سرورق کا عکس بھی شائع ہو رہا ہے۔ سہولت کے لیے اسے یکجا کر لیا ہے ورنہ ایک طرف اُردو اور دوسری طرف انگریزی کا سرورق ہے۔ اس طرح میگزین کی اشاعت کا یکھترواں سال ہے۔

پروفیسر شبلی نعمانی سے پروفیسر ایف۔ اے رحمٰن تک (۱۸۹۱ء سے ۱۹۲۰ء) اس کی ادارت کالج کے اساتذہ کرتے تھے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی پہلے طالب علم ہیں جو دوران طالب علمی (۱۹۲۱ء) اس کے ایڈیٹر ہوئے اور تب سے طالب علم ہی اس کے ایڈیٹر ہوتے ہیں۔ رشید صاحب سے لے کر موجودہ شمارے کے مرتب تک انتالیس ایڈیٹروں نے اس کو ایڈیٹ کیا۔

علیگڑھ میگزین کے جو خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نمبر	شمارہ	مرتب	تاریخ
۱۔	جوبلی نمبر	بشیر احمد صدیقی	۱۹۲۵ء
۲۔	سلطان جہاں نمبر	حکیم ماجد حامدی	ستمبر ۱۹۳۰ء
۳۔	تعطیلات نمبر ج ۱	سید جاں نثار اختر	۱۹۳۶ء
۴۔	تعطیلات نمبر ج ۲	محمد معین الدین دردائی	۱۹۳۷ء
۵۔	اقبال نمبر	ابو اللیث صدیقی	اپریل ۱۹۳۸ء
۶۔	تعطیلات نمبر	ابو اللیث صدیقی	اگست ۱۹۳۸ء
۷۔	علیگڑھ نمبر	ابو اللیث صدیقی	جنوری ۱۹۳۹ء
۱۔	تعطیلات نمبر	آفتاب احمد صدیقی	جولائی ۱۹۳۹ء
۹۔	احسن نمبر	محمد بختیار حسن	ستمبر ۱۹۴۱ء
۱۰۔	فانی نمبر	آزمراد آبادی	۱۹۴۲ء

۱۱۔ غالب نمبر	مختار الدین احمد آرزو	۴۹-۱۹۴۸ء
۱۲۔ اکبر نمبر	سید شبیہ الحسن نونہروی	۱۹۵۰ء
۱۳۔ طنز و ظرافت نمبر	ظہیر احمد صدیقی	۱۹۵۳ء
۱۴۔ علیگڑھ نمبر	نسیم قریشی	۱۹۵۴-۵۳ء
۱۵۔ مجاز نمبر	عبدالحفیظ صدیقی	۱۹۵۶-۵۴ء
۱۶۔ نظریاتی ادب نمبر	انور صدیقی	۱۹۵۸ء
۱۷۔ غالب نمبر (میگزین کا ڈائمنڈ جوبلی نمبر)	بشیر بدر	۱۹۶۹ء
۱۸۔ انتخاب کلام شعرائے علیگڑھ۔	عنایت حسین عیدن	۱۹۷۰ء
۱۹۔ انتخاب نمبر	مرزا خلیل احمد بیگ	۱۹۷۱ء
۲۰۔ علیگڑھ میگزین	الطاف حسین ندوی	۱۹۷۲-۷۱ء
۲۱۔ انتخاب نمبر	ابوالکلام قاسمی	۱۹۷۶-۷۵ء
۲۲۔ علیگڑھ میگزین	سید محی الدین اظہر	۱۹۷۷-۷۶ء
۲۳۔ ہم عصر اردو نمبر	جمید صدیقی	۱۹۸۲-۷۸ء
۲۴۔ علیگڑھ میگزین	محمد علی جوہر	۱۹۸۵-۸۳ء
۲۵۔ علیگڑھ میگزین	منور حسین	۱۹۸۶-۸۵ء
۲۶۔ علیگڑھ میگزین (یادرفتگاں)	اقبال حسین صدیقی	۱۹۸۹ء
۲۷۔ اردو فکشن میں علیگڑھ کا حصہ	امتیاز احمد	۱۹۹۱-۹۰ء
۲۸۔ عالمی افسانہ نمبر	محمد ظفر محفوظ نعمانی	۱۹۹۳ء
۲۹۔ علیگڑھ آئینہ ایام میں	محمد رضوان مصطفیٰ	۱۹۹۷-۹۵ء

○

مسلمان بھائی کی غیبت مت کرو۔ (حدیث)

ڈاکٹر راحت ابرار

علیگڑھ کے مشہور صحافی

علم کی دنیا میں کسی بھی دانش گاہ کی شہرت اس کی عالیشان عمارتوں اور سبزہ زاروں سے نہیں ناپی جاسکتی بلکہ تدریس و تحقیق اور علمی معیار سے پرکھی جاتی ہے تعلیمی اداروں کی ساکھ اور ان کا وقار ان طلبا سے بھی متعین ہوتا ہے جو تعلیم سے فراغت کے بعد مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں کردار انجام دیتے ہیں۔

فرزندانِ علیگڑھ نے ادب، صحافت، موسیقی، شاعری، اداکاری اور فنکاری کے میدانوں میں بھی اپنے جوہر دکھلائے ہیں اور خود بانیٔ درسگاہ سر سید احمد خاں نے ڈرامے کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے علیگڑھ نمائش میں ایک ڈرامہ اسٹیج کر کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے لیے چندہ جمع کیا تھا اور دنیا کو یہ دکھایا کہ سیر و تفریح کے پروگراموں کے ذریعہ بھی اصلاحی کاموں کو انجام دیا جاسکتا ہے۔

دنیا بھر کی تمام یونیورسٹیوں میں مسلم یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خاں غالباً تنہا ایسے شخص ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا آغاز صحافی کی حیثیت سے کیا اور ۱۸۳۶ء میں اپنے بھائی سید محمد کے اخبار "سید الاخبار" سے وابستہ ہوگئے۔ سر سید نے اپنی اصلاحی تحریک کو کامیاب بنانے اور مسلمانوں کی فکر و احساس میں تبدیلی اور نئے خیالات سے ہم آہنگ کے عمل کو تیز تر کرنے کے لیے صحافت کا سہارا لیا۔ "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" نے مسلمانوں کو

خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور مسلمانوں کو جہالت اور بے حسی کی تاریکیوں سے نکالا اور ذہنی بیداری، جدید تعلیم اور اپنے گرد و پیش سے باخبر رہنے کی صلاحیت پیدا کی۔ انھوں نے اپنی صحافت سے مسلمانوں کو ایک نئی اور روشن صبح کے طلوع ہونے کا پیغام دیا۔

ان دونوں پرچوں کی اشاعت سے قبل مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے ان کا شعور پست تھا۔ وہ باخبر رہنے کی اہمیت سے واقف نہ تھے اور نہ اس کی خواہش رکھتے تھے اور جو لوگ پڑھے لکھے تھے وہ بھی ایسی خبروں کو پڑھتے تھے جو ان کے اندر سنسنی خیزی کے جذبات پیدا کر سکتی ہوں۔ چار ٹانگوں والے بچے کی پیدائش اور بولنے والی بکری کی اطلاع ہی ان کے نزدیک اہم ترین خبر تھی۔

سرسید کے قائم کردہ ان دونوں پرچوں کے مقاصد کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کی اشاعت کا بنیادی مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستان کے حالات، معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں سیاسی شعور بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ سائنسی طرزِ فکر کو عام کرنا تھا تاکہ مسلمان عقل کی کسوٹی پر ہر چیز کو پرکھ سکیں۔ اس اخبار کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان دشمنی اور نفرت کی دیوار کو منہدم کیا اور دونوں فرقوں کے درمیان تعلقات کو استوار کیا۔

تہذیب الاخلاق کی اشاعت کا بنیادی مقصد فرد اور قوم کے اخلاق کی اصلاح، تہذیب، شائستگی اور قومی عزت کا احساس پیدا کرنا، قوم کو جدید طریقۂ علمی کی طرف راغب کرنا، علمی نقطۂ نظر کی اصلاح، زاویۂ نگاہ کی اصلاح تھا۔ ان کی صحافت کا حُسن ملی خدمت، حق پسندی اور بقائے باہم پر مشتمل تھا تاکہ مسلمان آبرومندانہ مقام حاصل کر سکیں۔ سرسید کی صحافت نے اشتعال کے بجائے اعتدال کا درس دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ عیسائی مشنریوں کے حملوں سے اسلام کا دفاع کیا جائے اور ان کو جدید علوم، سائنس اور فلسفہ سے ہم آہنگ

کیا جائے۔ انھوں نے مسلمانوں کو سیاست سے دور رہنے کا مشورہ بھی دیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سیاست شدت چاہتی ہے اور تعلیم مدت۔ اگر مسلمانوں نے تعلیم حاصل کرلی تو ان کا کھویا ہوا وقار بحال ہو جائے گا اور جس قوم کے پاس علم ہوتا ہے اس کے پاس دولت اور حکومت بھی ہوتی ہے۔

سرسید کی اس صحافتی روایت کو علیگڑھ کی پہلی نسل نے بھی اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔ مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی اور خواجہ غلام الثقلین جیسے بلند پایہ صحافیوں نے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کیا اور انگریزی سامراجیت کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کیا۔ یہ سبھی معزز طلباء ابتدا سے ہی انگریزی حکومت کے مخالف اور آزادی کے علمبردار رہے۔ مولانا حسرت موہانی نے ہی ہندوستان کی مکمل آزادی کا پہلا نعرہ لگایا اور جدوجہد آزادی میں قائدانہ رول ادا کیا۔

اسی عہد کے ایک اور ممتاز طالب علم شعیب قریشی نے مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ملک کو آزاد کرانے کے لیے خلافت تحریک میں شامل ہوگئے۔ اور بابائے قوم مہاتما گاندھی کے اخبار "ہریجن" کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے۔ اور علیگڑھ کے ان فرزندوں کی صحافت برطانوی سامراج کو دیس نکالا دینے کی تحریکات کا ہراول دستہ بنی۔

مدرستہ العلوم کے قیام سے ہی یہاں کے طالب علموں نے صحافت کے میدان میں بھی اپنی لیاقت اور صلاحیت کے پرچم بلند کیئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، عبدالمتین چودھری، عبدالرحمٰن بجنوری، حیات اللہ انصاری، اسحاق علمی اور عشرت علی صدیقی کے نام اردو صحافت میں معتبر نام تصور کیئے جاتے ہیں۔ انقلاب بمبئی کے ایڈیٹر ہارون رشید، رہنمائے دکن حیدرآباد کے چیف ایڈیٹر وقارالدین، راشٹریہ سہارا کے ایڈیٹر عزیز برنی، قومی آواز لکھنؤ کے ایڈیٹر عثمان غنی بھی اپنی صحافت سے مسلمانوں کا شعور بیدار کرنے میں اہم رول انجام دے رہے ہیں۔

دنیا کی سب سے معتبر ریڈیو سروس بی بی سی لندن سے جو علیگ وابستہ رہے

ان میں وقار احمد، راز مرادآبادی، دیپک ترپاٹھی، قربان علی، پرویز عالم، عبید صدیقی، سیما چشتی اور سلمیٰ زیدی کے ناموں سے کون واقف نہیں ہے۔

عالمی سطح پر پرنٹ میڈیا سے وابستہ صحافیوں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ عرب نیوز کے ایڈیٹر حیدر علی کاظم، سعودی گزٹ کے ایڈیٹر طارق غازی، مسلم ٹائمز کے ایڈیٹر قاضی اشفاق احمد، شارجہ سے شائع ہونے والے گلف ٹوڈے کے شاکر حسین اور اقوام متحدہ کی رپورٹنگ کرنے والے ہر پال نیر کا تعلق بھی اسی ادارے سے رہا ہے۔

امریکہ کی عظیم دانش گاہوں میں ڈاکٹر دلنواز احمد صدیقی بھی صحافت کی تعلیم دے رہے ہیں اور اپنے ادارے کی ناموری کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کی انگریزی صحافت میں جو نئے صحافی ابھر کر آئے ہیں ان میں عسکری زید، کلپنا جین اور طارق حسن (ٹائمز آف انڈیا) جاوید انصاری (انڈیا ٹوڈے) فراز احمد (پائنیر)، عابد شاہ (اسٹیٹسمین)، اسامہ منظر (ہندوستان ٹائمز)، اے۔ ایم خان (پی آئی)، احسان فاضل (ٹریبون)، صغیر بیدار (نیشنل میل بھوپال)، سہیل حلیم (یو۔این۔آئی) جیسے صحافیوں کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں الیکٹرونکس میڈیا نے دنیا کی آبادی کو سمیٹ کر ایک عالمی گاؤں Global Village بنادیا ہے اور تمام ملکوں کی جغرافیائی سرحدوں کو منہدم کر دیا ہے۔ الیکٹرونکس میڈیا کا کام اب صرف پل پل کی خبروں کی نشرواشاعت ہی نہیں ہے بلکہ ذہن سازی کرنے، رائے عامہ ہموار کرنے، دائرۂ فکر و خیال کو وسیع کرنے، رجحانات اور رویوں کو تبدیل کرنے اور نقطۂ نظر کو متعین کرنے میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میڈیا کی اہمیت بدلتے ہوئے عالمی منظر نامہ میں بڑھتی جارہی ہے۔ زی ٹی وی، اسٹار ٹی وی، ڈی ڈی، بی ٹی وی، میں بھی علیگڑھ کے طالب علموں نے اپنی موجودگی درج کرائی ہے۔ اور علیگڑھ کی معیاری تعلیم نے ہی اپنے طلبا میں غور و فکر کی صلاحیت پیدا کی۔ موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر محمود الرحمٰن کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے

ذرائع ابلاغ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس ادارے میں شعبۂ صحافت اور ماس کمیونکیشن کے قیام میں کلیدی رول ادا کیا تاکہ مستقبل کے صحافیوں کے لیے راہیں ہموار ہوسکیں۔

صحافت کے علاوہ فلمی دنیا میں علیگڑھ والوں نے خوب نام کمایا ہے اور علیگڑھ کے بغیر فلمی دنیا کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس ادارے کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ ہندوستان کی پہلی بولتی فلم "عالم آرا" کی ہیروئن کا تعلق بھی اسی ادارے سے تھا۔ شکیل بدایونی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، اختر الایمان، علی سردار جعفری جیسے شاعر اور ادیب بمبئی کی فلمی دنیا میں آباد ہو گئے۔ فلمی دنیا کے ممتاز ہیرو نصیر الدین شاہ، رحمن، دلیپ طاہل اور ہیروئن نینا، بیگم پارہ اور تبسم کا تعلق بھی علیگڑھ سے رہا ہے۔

مشہور ہدایت کار مظفر علی نے اپنی فلموں کی ہدایت کاری سے اردو تہذیب کو متاثر کیا ہے۔ ان کی فلم امراؤ جان اودھ کی مسلم تہذیب کی نمائندہ تصور کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صلاح الدین پرویز اور خان اشتیاق نے بھی فلموں اور ٹی وی سیریل کی ہدایت کاری کی ہے۔ راہی معصوم رضا کا نام فلمی اور ٹی وی کی دنیا کا سب سے معتبر نام تصور کیا جاتا ہے۔ انھوں نے لاتعداد ٹی۔ وی سیریل کے ڈائیلاگ لکھے ہیں اور مہابھارت سیریل نے شہرت کی بلندی حاصل کی ہے۔

پروفیسر شہریار اور جاوید اختر نے اپنی شاعری سے فلمی گیتوں کو نیا انداز بخشا۔ فلم امراؤ جان، گمن اور فاصلے میں شہریار کی غزلیں بہت مقبول ہوئیں بطور اسکرپٹ رائٹر کے جاوید اختر نے فلمی دنیا میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی اور اب وہ فلمی دنیا کے سب سے کامیاب گیت کار بن گئے ہیں اب جاوید اختر اپنے عہد کے شعری مزاج کے نمائندے تصور کیے جاتے ہیں۔ طلعت محمود نے اپنی آواز کا جادو جگایا اور دھرپد سنگیت میں رحیم الدین ڈاگر کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

پاکستان کی فلمی دنیا اور ٹی وی کے ڈراموں میں بھی علیگڑھ والوں نے اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔ بیگم خورشید مرزا اور منور سعید پاکستان ٹی۔ وی کے ممتاز

فنکار تسلیم کیے جاچکے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان ہی میں نہیں بلکہ یورپ میں بھی علیگڑھ کے فنکاروں کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ سعید جعفری کو ان کی فنکاری پر برٹش سرکار نے انھیں "سر" کے خطاب سے نوازا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کی پُرسکون ادبی اور ثقافتی فضا میں طلبا کے غیر درسی مشاغل کو پروان چڑھانے کے بھرپور مواقع فراہم کرائے جاتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے جنرل ایجوکیشن سینٹر کی جانب سے طلبا کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور کینیڈی ہال میں واقع لٹریری، کلچرل، میوزک، ڈرامہ، فلم اور فائن آرٹس کلب سے وابستہ یہ نوجوان تہذیبی اقدار کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہی کلب ان کی تربیت گاہ کا رول بھی ادا کرتے ہیں۔ طلبا کے کردار کو بنانے اور سنوارنے میں اقامتی اداروں کا رول بہت اہم ہوتا ہے۔ ماحول افراد کے مجموعی کردار کا اظہار ہوتا ہے اور علیگڑھ کا ماحول طلبا کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کا ایک شاندار وسیلہ ہے۔ توقع ہے کہ صحافت، فلم، ڈرامے، موسیقی اور فنونِ لطیفہ کے میدان بھی یہاں کے طلبا اپنی مادرِ علمی کی دیرینہ روایات کو مزید آگے بڑھائیں گے۔

زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ اردو خوبصورتی کے لحاظ سے فارسی سے کتنی بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس کی موسیقی اس کے زور اور اس کی صوتی قوت نے مجھے بہت متاثر کیا جب میں بولنے کھڑی ہوئی تو میرے اوپر پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ میں نہ تو اپنا منہ کھول سکتی تھی اور نہ آنکھیں.... مجھ جیسی بوڑھی عورت سے یہ پھول ضائع ہی تو ہو رہے تھے پھر بھی بڑی پیاری چیز تھی۔ (خالدہ ادیب خانم)

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر

نام	مدت
ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم۔ والیٔ بھوپال	دسمبر ۱۹۲۰ء سے ۱۴ر مئی ۱۹۳۰ء تک
ہر ہائی نس نواب حمید اللہ خاں والی، بھوپال	۲۱ر ستمبر ۱۹۳۰ء سے ۱۷ر اپریل ۱۹۳۵ء تک
ہر اکزالٹ ہائی نس میر عثمان علی خاں۔ نظام حیدر آباد	۲۶ر اگست ۱۹۳۵ء سے ۲۹ر نومبر ۱۹۴۷ء تک
ہز ہائی نس سید رضا علی خاں نواب رامپور	۳۰ر نومبر ۱۹۴۷ء سے ۳۱ر جنوری ۱۹۵۳ء تک
ہز ہولی نس مُلّا طاہر سیف الدین	۱۲ر اپریل ۱۹۵۳ء سے ۲۸ر اپریل ۱۹۶۵ء تک
حافظ احمد سعید خاں نواب چھتاری	دسمبر ۱۹۶۵ء سے ۶ر جنوری ۱۹۸۲ء تک۔
پروفیسر اے۔ آر۔ قدوائی	۱۲ر اگست ۱۹۸۴ء سے ۵ر جولائی ۱۹۹۲ء تک
پروفیسر اے۔ ایم۔ خسرو	۵ر جولائی ۱۹۹۲ء سے ۱۱ر اگست ۱۹۹۵ء تک
حکیم عبدالحمید	۱۱ر اگست ۱۹۹۶ء سے ۱۰ر اگست ۱۹۹۹ء تک
سیدنا ڈاکٹر برہان الدین	۳ر اکتوبر ۱۹۹۹ء سے تاحال

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر

(۱۹۲۰ء سے ۲۰۰۰ء تک)

نام	مدت
محمد علی محمد خاں (نواب محمود آباد)	دسمبر ۱۹۲۰ء سے فروری ۱۹۲۳ء تک
محمد مزمل اللہ خاں (ایکٹنگ)	مارچ ۱۹۲۳ء سے ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۳ء تک
آفتاب احمد خاں	یکم جنوری ۱۹۲۴ء سے ۳۱ر دسمبر ۲۶ر دسمبر ء تک
ایم مزمل اللہ خاں (ایکٹنگ)	یکم جنوری ۱۹۲۷ء سے ۸ر فروری ۱۹۲۹ء تک
سر راس مسعود	(جنھوں نے صحیح معنی میں ۲۰ر اکتوبر ۲۹ء کو چارج لیا) ۹ر فروری ۱۹۲۹ء سے یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء تک

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی۔ علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اہ محمد سلیمان	۹؍فروری ۱۹۲۹ء سے ۱۹؍اکتوبر ۱۹۲۹ء تک
	یکم جولائی ۱۹۳۰ء سے ۲۱؍اکتوبر ۱۹۳۰ء تک
سماعیل خاں	یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء سے ۱۹؍اپریل ۱۹۳۵ء تک
دا کٹر ضیاءالدین احمد	۲۰؍اپریل ۱۹۳۵ء سے ۲۹؍اپریل ۱۹۳۸ء تک
شاہ محمد سلیمان (اعزازی)	۳۰؍اپریل ۱۹۳۸ء سے ۲۳؍اپریل ۱۹۴۱ء تک
ایم سید الرحمٰن خاں (ایکٹنگ)	جون ۱۹۳۹ء سے جولائی ۱۹۳۹ء تک
	مارچ ۱۹۴۱ء سے اپریل ۱۹۴۱ء تک
ڈاکٹر ضیاءالدین احمد	۲۴؍اپریل ۱۹۴۱ء سے ۲۴؍اپریل ۱۹۴۷ء تک
راہد حسین	۲۴؍اپریل ۱۹۴۷ء سے ۷؍اگست ۱۹۴۷ء تک
اے عبیدالرحمٰن خاں (ایمرجنسی تقرری)	۸؍اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۰؍اکتوبر ۱۹۴۷ء تک
۔ر اسماعیل خاں	۱۷؍اکتوبر ۱۹۴۷ء سے ۲۹؍نومبر ۱۹۴۸ء تک
	(جو ۲۰؍اکتوبر ۱۹۴۷ء سے ۲۹؍نومبر تک اعزازی خزانچی بھی رہے)
ذاکر حسین خاں	۳۰؍اکتوبر ۱۹۴۸ء سے ۱۸؍ستمبر ۱۹۵۶ء تک
	(آپ اعزازی خزانچی کے عہدے پر بھی ۳۰؍نومبر ۱۹۴۸ء سے ۱۳؍جولائی ۱۹۴۹ء تک مامور رہے)
قاضی عزیزالدین بلگرامی (OFFG)	نومبر ۱۹۴۹ء
کرنل بی، ایچ، زیدی	۷؍اکتوبر ۱۹۵۶ء سے ۶؍نومبر ۱۹۶۲ء تک
بدرالدین طیب جی	۷؍نومبر ۱۹۶۲ء سے ۲۸؍فروری ۱۹۶۵ء تک
علی یاور جنگ	یکم مارچ ۱۹۶۵ء سے ۵؍جنوری ۱۹۶۸ء تک
پروفیسر عبدالعلیم	۶؍جنوری ۱۹۶۸ء سے ۳؍جنوری ۱۹۷۴ء تک
علی محمد خسرو	۲۰؍دسمبر ۱۹۷۴ء سے دسمبر ۱۹۷۹ء تک
سید حامد	جون ۱۹۸۰ء سے ۲۶؍مارچ ۱۹۸۵ء تک
سید ہاشم علی	۸؍اپریل ۱۹۸۵ء سے ۴؍اکتوبر ۱۹۸۹ء تک
پروفیسر محمد نسیم فاروقی	۱۵؍اکتوبر ۱۹۹۰ء سے ۱۵؍دسمبر ۱۹۹۴ء تک
محمودالرحمٰن	یکم مئی ۱۹۹۵ء سے مئی ۲۰۰۰ء تک
محمد حامد انصاری	۲۸؍مئی ۲۰۰۰ء سے تا حال

تدوین: سیّد محمد عامر

ناموران علیگڑھ

چند سربراہان حکومت

امین حلمی دیدی (صدر مالدیپ)

فضل الٰہی چودھری (صدر پاکستان)

خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان

لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان

ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان

منصور علی وزیر اعظم جمہوریہ بنگلہ دیش

محمد ایوب خاں صدر پاکستان

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صدر ہندوستان

نواب حمید اللہ خاں والیہ بھوپال چانسلر (چیمبر آف انڈیا) پرنسز

بیگم عابدہ احمد سابق خاتون اوّل اہلیہ سابق صدر جمہوریہ ہند، فخر الدین علی احمد

مجاہدین آزادی

عبد المتین چودھری

خان عبد الغفار خاں

راجہ مہندر پرتاپ

مولانا محمد علی جوہر

مولانا شوکت علی

دیگر شعبہ ہائے حیات

شعیب قریشی (سابق وزیر ریاست بھوپال)

سر سکندر حیات خاں (سابق وزیر اعلیٰ پنجاب)

شیخ عبد اللہ (بانی ویمنس کالج، علیگڑھ)

محمد عثمان عارف (سابق گورنر اترپردیش)

میر اکبر علی خاں (سابق گورنر اترپردیش اور اڑیسہ)

رفیع احمد قدوائی (سابق وزیر مرکزی کابینہ)

شیخ محمد عبد اللہ (سابق وزیر اعلیٰ، جموں کشمیر)

غفور احمد (سابق وزیر اعلیٰ بہار اور سابق وزیر مرکزی کابینہ)

حافظ محمد ابراہیم (سابق گورنر پنجاب اور سابق وزیر مرکزی کابینہ)

خواجہ غلام محمد صادق ــــ (سابق گورنر پنجاب اور سابق وزیر مرکزی کابینہ)

پروفیسر نورالحسن (سابق گورنر اڑیسہ، مغربی بنگال اور مرکزی وزیر تعلیم)

میجر جنرل ایس۔ شاہد حامد (سابق وزیر ثقافت و سیاحت، حکومت پاکستان)

کے ایم پانیکر (وزیر اعظم ریاست بیکانیر، مورخ، صحافی اور سیاست داں)

سر راس مسعود (سابق وائس چانسلر علیگڑھ)

نواب احمد سعید خاں، چھتاری (سابق گورنر اترپردیش)

پروفیسر ستیش چندرا (سابق صدر یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن)
معین الحق چودھری (سابق رکن پارلیمنٹ)
پروفیسر مونس رضا (سابق شیخ الجامعہ، دہلی یونی ورسٹی)
پروفیسر محمد حبیب (مشہور مورخ اور مجاہد آزادی)
سید میر قاسم (سابق وزیر اعلیٰ، جموں و کشمیر)
سید حامد (سابق وائس چانسلر، علیگڑھ) چانسلر جامعہ ہمدرد یونیورسٹی، دہلی
پروفیسر رشید الظفر (سابق وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد یونیورسٹی)
محمد شفیع قریشی (گورنر مدھیہ پردیش)
مفتی محمد سعید (سابق مرکزی وزیر داخلہ)
ڈاکٹر احسان رشید (سابق وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی)
ڈاکٹر سید ظہور قاسم (سائنس داں اور سابق شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)
پروفیسر طاہر محمود (سابق چیرمین نیشنل اقلیتی کمیشن، حکومت ہند)
پروفیسر شمیم جیراجپوری وائس چانسلر (اردو یونیورسٹی، حیدر آباد)
منظور احمد وائس چانسلر (آگرہ یونیورسٹی، آگرہ)
شاہد مہدی وائس چانسلر (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)

اعظم خاں (رکن راجیہ سبھا)
وسیم احمد (رکن راجیہ سبھا)
آر۔ کے۔ ڈی۔ شاہ (سابق چیرمین بھارت ہیوی الیکٹریکلس لمیٹڈ)

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

عبدالحق (بابائے اردو)
سجاد حیدر یلدرم
احسن مارہروی
عبدالستار صدیقی
رشید احمد صدیقی
عرفان حبیب
شکیل بدایونی
خورشید الاسلام
مسعود حسین خاں
محمد حسن
معین احسن جذبی
مختار الدین آرزو
سلمہ صدیقی
شیخ رشید
بابر مرزا
محمد شفیع
اسلوب احمد انصاری
ابرار مصطفے
نسیم انصاری

خواجہ احمد عباس
جاں نثار اختر
خوشی محمد ناظر
سعادت حسن منٹو
قرۃ العین حیدر
قاضی عبدالغفار
میر محفوظ علی
سید وحید الدین سلیم
ظفر علی خان
ضیاء احمد بدایونی
اختر انصاری
اختر الایمان
آل احمد سرور
اسرار الحق مجاز
عزیز مرزا
عظیم بیگ چغتائی
فانی بدایونی
ہارون خان شیروانی
عنایت اللہ دہلوی

اقبال سہیل
صباح الدین عبدالرحمن
باقر مہدی
نورالحسن ہاشمی
وحید الدین سلیم
حسرت موہانی
جوش ملیح آباد
مجنوں گورکھپوری
عبدالماجد دریاآبادی
حیات اللہ انصاری
ابراہیم جلیس
ابواللیث صدیقی
فرمان فتحپوری
عبدالقوی ضیا
قاضی عبدالستار
مشتاق احمد یوسفی
عصمت چغتائی
وامق جونپوری
اختر سعید خاں
اظہر سعید خاں
سید ظل الرحمن
عابد رضا بیدار
ظہیر احمد صدیقی

قمر رئیس
عتیق انجم
ظل الرحمن خان
شہریار
خلیل الرحمن اعظمی
زاہدہ زیدی
بشیر بدر
غلام مصطفیٰ شاہ
عبدالرحمن صدیقی
حیدر کاظمی
اسحاق علمی
ہارون رشید
ڈاکٹر عابد حسین
محمد ابوالخیر کشفی
خلیق احمد نظامی
شان الحق حقی
شمیم حنفی
مختار مسعود
جاوید حبیب
ایوب سید
محمد ایوبی
سید امین الحق
خوشونت سنگھ

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ایم۔ اے۔ علوی
افتخار عالم
پطرس بخاری
خالد سلطان
صبا زیدی
تبسم
نازش حسینی
سہیل خاں
خورشید
تسنیم انصاری

راہی معصوم رضا
حبیب الرحمن
خواجہ مسعود علی ذوقی
اطہر حسین صدیقی
اکبر رشید
سوریکھا سکری
جاوید اختر
ڈاگر برادرس
تنویر حاذق
شاہد لطیف
معراج نشاط

سید سبط حسن
انیس چشتی
صغیر بیدار
طارق غازی
عشرت علی صدیقی
احمد علی خاں
کانن دیوی
خورشید
نگار سلطانہ
طلعت محمود
محمد حسن عباسی
صلاح الدین پرویز

فیاض رفعت
کل بھوشن کھربندا
ندیم خان
رمیش پانڈے
بیگم پارا
شوکت حسن رضوی
دلیپ تاہل
ہوما دیوی
معظم علی
شہلا امجد خاں
اما پرساد سمن

گیمس اور اسپورٹ

۱۔ ایتھلیٹکس

لنور آفتاب احمد خاں (انڈین چیمپین) مشرف حسین (لول ویٹ چیمپین شپ)
احسان محمد خان (اولمپین، برلن، گولڈ میڈلسٹ) رنویر سنگھ (لول ویٹ چیمپین شپ)
بریگیڈیر گلزار احمد (انڈین چیمپین ۱۹۴۲ء)
مظہر خان (پاکستان کی نمائندگی کی انٹرنیشنل میٹس میں)
محمد عابد (صوبائی خطاب ۲۰۰ میٹر، ۴۰۰ میٹر، ۱۹۵۰ تا ۱۹۴۰ کپتان اتر پردیش ٹیم ۱۹۳۸ تا ۱۹۴۲ء)
زاہد سعید لودھی (آل انڈین ریکارڈ ۲ میل اور ۱۰ میل ریس)

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

کرکٹ ۔

اختر حسین (محافظ ایم۔سی۔سی۔۱۹۴۶ء)　علی حسین (تیز رفتار بالر)

شفقت حسین (ممبر پہلی انڈین ٹیم، جس نے یو۔کے کا ۱۹۱۱ میں دورہ کیا)

سید حسن (میمبر آف پہلی انڈین ٹیم۔ جس نے یو۔کے کا ۱۹۱۱ء میں دورہ کیا)

سلام الدین (میمبر آف پہلی انڈین ٹیم۔ جس نے یو۔کے کا ۱۹۱۱ء میں دورہ کیا)

سی۔ایس۔نائڈو (ٹیسٹ کھلاڑی)　لالہ امرناتھ (ٹیسٹ کھلاڑی)

جہانگیر خان (ٹیسٹ کھلاری)　محمد صلاح الدین (پاکستانی ٹیسٹ کھلاڑی)

نظیر علی (ٹیسٹ کھلاڑی)　سید مشتاق علی (ٹیسٹ کھلاڑی)　وزیر علی (ٹیسٹ کھلاڑی)

رنجی / زونل کھلاڑی

احمد محسن　جمیل محمد خان　غوری جمید　محمد شاہد　بلال محمد

اسلم علی　محمد اسلم　حسین احمد　رفیع اللہ خان　فرحت علی

بائز مصطفےٰ خان　رضوان شمشاد　ضمیر علوی　ظہیر الدین (بالی)

ہاکی

مسعود منہاج (اولمپئن، لوس انجیلس، ۱۹۳۲ء)　میجر شکور (اولمپئن لندن ۱۹۴۸ء)

عبدالقیوم (اولمپئن گولڈ میڈلسٹ، لندن ۱۹۴۸ء)　احسان محمد خان (گولڈ میڈلسٹ،

اختر حسین حیات (اولمپئن گولڈ میڈلسٹ، لندن ۱۹۴۸ء) اسد علی قدوائی (اولمپئن)　الو

(اولمپئن) علی سعید (اولمپئن گولڈ میڈلسٹ، ٹوکیو ۱۹۶۴ء) اسلم شیر خان (اولمپئن میونخ ۷۲ء،

مونٹریال ۷۶ء، ۱۹۷۶ء) گووندا (اولمپئن میونخ ۷۲ء، ۱۹۷۲ء، مونٹریال ۷۶ء، ۱۹۷۶ء) دورائی سوامی (اولمپئن

انعام الرحمٰن (اولمپئن میکسیکو ۱۹۶۸ء) فیروز خان (اولمپئن گولڈ میڈلسٹ ۲۸ء ایمسٹرڈام، ۱۹۸۲ء)
جوگندر سنگھ (اولمپئن، روم ۱۹۶۰ء، ٹوکیو ۱۹۶۴ء، گولڈ میڈلسٹ) ظفر اقبال (اولمپئن ماسکو ۱۹۸۰ء،
کیپٹن ہندوستانی ٹیم، لوس انجیلس ۱۹۸۴ء، ہندوستانی کپتان ایشائی کھیل ۱۹۸۲ء، نیشنل ہاکی کوچ،
۹۴ تا ۱۹۹۶ء ارجن ایوارڈ) سرجیت سنگھ (اولمپئن کینیا)

گجندر سنگھ محمد حامد مشتاق احمد سید علی
گرسیوک سنگھ محمد عثمان خان ناصر علی سید مسعود زیدی

فٹ بال

احمد سنجاری (ایران اولمپئن) افتخار احمد خاں (عالمی کھلاڑی)
علی خدائی جمشید نصیری (ایسٹ بنگال & محمڈن اسپورٹنگ کلب)
ماجد لشکر (ایران انٹر نیشنل جونیر) ایس۔اے۔ قادری (نیشنل کھلاڑی)
محمود خبازی (ایسٹ بنگال & محمڈن اسپورٹنگ کلب صمد توقیر (نیشنل کھلاڑی)
شجاع الدین درانی (کیپٹن، رائل فٹ بال الیونتھ، افغانستان) سلطان اختر (نیشنل کھلاڑی)

ٹینس

احمد حسین قدوائی (فائنلسٹ، آل انڈیا سنگلس ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۲ء، ون ہارڈ کورٹ ٹورنامنٹ، مسوری
اور نینی تال میں سنگل اور ڈبل) خواجہ سعید حئی (نیشنل جونیر چیمپئن شپ)
غوث محمد خان (پہلا ہندوستانی کھلاڑی جس نے ومبلڈن ٹورنامنٹ کے کوارٹر فائنل میں
شرکت کی) ارشاد حسین (انڈین اولمپئن)

شوٹنگ

افسر حسین خان (نیشنل چیمپئن) مراد علی خان (نیشنل چیمپئن، ایشیائی اور اولمپیائی

۸۴۲

کھیلوں میں ہندوستان کی قیادت کی)

شطرنج

پرویز اعظم خان (شطرنج چیمپئن شپ، سائبیریا، روس)

بادبانی کشتی

سید اکبر حسین (ایشیائی چیمپئن)

علم

- علم کی طلب میں نکلنے والا دراصل اللہ کے راستے میں نکلنے والا ہے۔ (حدیث)
- علم کی تحقیقات میں حث جہاد ہے۔ (حدیث)
- علم کا پڑھنا صدقہ ہے۔ (حدیث)
- علم دلوں کی روشنی ہے۔ (حدیث)
- علم آنکھوں کا نور ہے۔ (حدیث)
- علم ہی سے حلال و حرام کی پہچان ہوتی ہے۔ (حدیث)

اکبرالہ آبادی

مدح والیہ بھوپال

نواب سلطان جہاں بیگم سلمہٗ اللہ تعالیٰ

اگرچہ والیانِ ملک سب رتبے میں عالی ہیں — مگر یہ والیہ بھوپال کی اللہ والی ہیں

نہایت ہی مفید قوم ہیں فیاضیاں انکی — بہت راہیں اُنھوں نے خیر و برکت کی نکالی ہیں

فلک ہے شان ملت کی تو وہ ہیں اختر تاباں — چمن ہے بزم اسلامی تو وہ پھولوں کی ڈالی ہیں

ترقی اُن کو ہے مد نظر روشن خیالی کی — اُنھوں نے اپنی فکریں نور کے سانچے میں ڈھالی ہیں

حریم مشرقی نازاں ہے انکے علم و دانش پر — یہ روشن ہے کہ وہ اک نور شمع باکمالی ہیں

سوئے تعلیم نسواں منعطف اُن کی توجہ ہے — بنائیں جا بجا اس مقصد عظمیٰ کی ڈالی ہیں

مساجد اور مکاتب کی بھی ہیں حامی دل و جاں سے — شیوخ دین و ملت نے مرادیں اپنی پالی ہیں

عظیم القدر ہیں فرزندِ عالیشاں بھی اُنکے — روحسنِ عمل میں وہ بھی صرف خوش خیالی ہیں

زمانا گو بہت نازک ہے بے لس ہیں طریق اگلے — مگر دل جنکے اچھے ہیں وہ کب نیکی سے خالی ہیں

دعا اُن کی یہی دیتے ہیں انکے جاننے والے

ولی اللہ ہو اُن کا۔ کہ وہ اللہ والی ہیں

☆☆☆☆☆

صوفیہ شعیب احمد

ناموران علیگڑھ

کی کہانی
ٹکٹوں کی زبانی

ڈاک ٹکٹوں کی کہانی بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ دنیا میں علیگڑھ تحریک نے جو شہرت حاصل کی ہے اس کا اظہار پوری طرح برّ صغیر ہند و پاک کے ٹکٹوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔

ہندوستان میں عموماً ٹیلیگراف ڈپارٹمنٹ نے سرسید ۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء کا ٹکٹ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو جاری کیا۔ ٹکٹ ۲۰ پیسے کا ہے جس کا سائز ۲۹۱x۲ ۹۰ سینٹی میٹر ہے۔ ٹکٹ میں سرسید اور اسٹریچی ہال دکھایا ہے۔ یہ ٹکٹ دس لاکھ کی تعداد میں چھپوائے گئے ہیں۔ ٹکٹ کا رنگ زردی مائل سرخ ہے۔

پاکستان میں پندرہ روپیہ کا سرسید کا ٹکٹ ۲۳ مارچ ۱۹۷۹ء کو جاری ہوا۔ اور ایک روپیہ کا ۱۴ اگست ۱۹۹۰ء کو جاری ہوا۔

ہندوستان میں علیگڑھ سے متعلق جن لوگوں کے ڈاک ٹکٹ نکلے ہیں ان میں سرسید، راجہ مہندر پرتاپ، سرحدی گاندھی خاں عبدالغفار خاں، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، مظہر الحق، مولانا محمد علی جوہر، شیخ محمد عبداللہ، دھیان چند، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری ہیں۔ وہ مشاہیر جن کو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے اعزازی ڈگری سے نوازا اور ہندوستان نے جن کے اوپر ٹکٹ نکالے ان میں سید سلیمان ندوی، سلیم علی، سی۔ راج گوپال اچاریہ۔

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

فرسٹ لیڈی ایلز روز ویلیٹ۔ لال بہادر شاستری، ہومی بھابھا اور صدر ہندوستان ایس رادھا کرشنن ہیں۔ دو مشہور شاعر جنھوں نے سرسید احمد خاں کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا اور جن پر ٹکٹ بھی نکالے گئے۔ وہ اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال ہیں۔

پاکستان نے علیگڑھ سے متعلق جن اکابرین کے ڈاک ٹکٹ جاری کیے ہیں ان کے نام سرسید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی، نواب محسن الملک نواب وقار الملک، شبلی نعمانی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، غلام محمد بھرگری، نواب محمد اسماعیل خاں، چودھری خلیق الزماں، محمد ایوب خاں، خواجہ ناظم الدین، لیاقت علی خاں، سردار عبد الرب نشتر، راجہ صاحب محمود آباد، مولانا شوکت علی اور آغا خاں سوم کے اسماء ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان سے جاری ہونے والے ڈاک ٹکٹوں کی تفصیل درج ذیل خاکوں میں پیش ہے۔

ہندوستان کے ٹکٹ

نام	پیدائش	وفات	تاریخ اجراء	
سرسید احمد خاں	۱۸۱۷ء	۱۸۹۸ء	۱۷ر اکتوبر ۱۹۷۳ء	۲۰ پیسہ
راجہ مہندر پرتاپ	۱۸۸۶ء	۱۹۷۹ء	۱۵ر اگست ۱۹۷۹ء	
سرحدی گاندھی خان عبد الغفار خاں	۱۸۹ء	۱۹۸۶ء		ایک روپیہ
رفیع احمد قدوائی	۱۸۹۴ء	۱۹۵۴ء	۱۱ر فروری ۱۹۶۹ء	ایک روپیہ
ڈاکٹر ذاکر حسین خاں	۱۸۹۷ء	۱۹۶۹ء	۱۱ر جون ۱۹۶۹ء	۲۰ پیسہ
مظہر الحق			۲ر جنوری ۱۹۸۱ء	۳۵ پیسہ
مولانا محمد علی جوہر	۱۸۷۸ء	۱۹۳۱ء	۱۰ر دسمبر ۱۹۷۸ء	۵۰ پیسہ
شیخ محمد عبد اللہ	۱۹۰۵ء	۱۹۸۲ء	۱۹۸۸ء	۶۰ پیسہ
دھیان چند	۱۹۰۶ء	۱۹۷۹ء	۳ر دسمبر ۱۹۸۰ء	۳۵ پیسہ
ڈاکٹر سیف الدین کچلو	۱۸۸۸ء	۱۹۶۳ء	۱۹۸۹ء	۶۰ پیسہ
حکیم اجمل خاں	۱۸۶۴ء	۱۹۲۷ء	۱۳ر فروری ۱۹۸۷ء	۶۰ پیسہ
ڈاکٹر مختار الدین احمد انصاری	۱۸۸۰ء	۱۹۳۶ء	۱۲ر دسمبر ۱۹۸۰ء	

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

پاکستانی ٹکٹ

نام	پیدائش	وفات	تاریخ اجراء	ٹکٹ کی قیمت
سرسید احمد خاں	۱۸۱۷ء	۱۸۹۸ء	۱۴؍ اگست ۱۹۹۰ء	ایک روپیہ
الطاف حسین حالی	۱۸۳۷ء	۱۹۱۴ء	۲۳؍ مارچ ۱۹۷۹ء	۲۵؍ روپیہ
نواب محسن الملک	۱۸۳۷ء	۱۹۰۷ء	۱۴؍ مارچ ۱۹۹۴ء	۲۵؍ روپیہ
نواب وقار الملک	۱۹۴۱ء	۱۹۱۷ء	۱۴؍ اگست ۱۹۹۴ء	
مولانا محمد شبلی نعمانی	۱۸۵۷ء	۱۹۱۴ء	۱۴؍ اگست ۱۹۹۲ء	ایک روپیہ
ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد	۱۸۷۳ء	۱۹۴۷ء	۱۴؍ مارچ ۱۹۹۳ء	
مولانا ظفر علی خاں	۱۸۷۳ء	۱۹۵۶ء	۱۴؍ اگست ۱۹۹۱ء	
حسرت موہانی	۱۸۸۰ء	۱۹۵۱ء	۲۳؍ جنوری ۱۹۸۹ء	۳؍ روپیہ
مولانا محمد علی جوہر	۱۸۷۸ء	۱۹۳۱ء	۱۰؍ دسمبر ۱۹۷۸ء	۵۰ پیسہ
〃	〃	〃	۱۴؍ اگست ۱۹۹۱ء	ایک روپیہ
غلام محمد بھرگری	۱۸۷۸ء	۱۹۲۴ء	۱۴؍ اگست ۱۹۹۴ء	ایک روپیہ
نواب محمد اسماعیل خاں	۱۸۸۴ء	۱۹۵۸ء	۱۴؍ اگست ۱۹۹۰ء	ایک روپیہ
چودھری خلیق الزماں	۱۸۸۹ء	۱۹۷۳ء	۱۴؍ اگست ۱۹۹۱ء	ایک روپیہ
محمد ایوب خاں	۱۹۰۷ء		۲۹؍ نومبر ۱۹۶۶ء	ایک روپیہ
خواجہ ناظم الدین	۱۸۹۴ء	۱۹۶۴ء	۱۴؍ اگست ۱۹۹۰ء	ایک روپیہ
لیاقت علی خاں	۱۸۹۵ء	۱۹۵۱ء	۱۶؍ اکتوبر ۱۹۷۴ء	۲۰ پیسہ
〃	〃	〃	۱۴؍ اگست ۱۹۹۰ء	ایک روپیہ
〃	〃	〃	یکم اکتوبر ۱۹۹۵ء	ایک روپیہ ۲۵ پیسہ
سردار عبد الرب نشتر	۱۸۹۹ء	۱۹۵۸ء	۱۴؍ اگست ۱۹۹۰ء	ایک روپیہ
راجہ صاحب محمود آباد	۱۹۱۴ء	۱۹۷۳ء	۱۴؍ اگست ۱۹۹۰ء	ایک روپیہ
مولانا شوکت علی	۱۸۷۳ء	۱۹۳۸ء	۱۴؍ اگست ۱۹۹۵ء	ایک روپیہ
آغا خاں سوئم	۱۸۷۷ء	۱۹۵۷ء	۲؍ نومبر ۱۹۷۷ء	دو روپیہ
〃	〃	〃	۱۴؍ اگست ۱۹۹۰ء	ایک روپیہ

تدوین: صالحہ شفیع

کچھ ذکر مسعود ٹامی کا

مسعود حسن مرحوم (مسعود ٹامی)

زندگی میں آپ کو بارہا ایسے جیتے جاگتے کردار ملے ہوں گے جو بھلائے نہ بھولیں۔ ان کی شوخیاں، شرارتیں، خوش خرامیاں آپ کا دامن پکڑ لیں۔ آپ کو مسکراہٹیں بن مانگے مل جائیں۔ ایسے کردار ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ علیگڑھ میں ہر سال ایسے طلبا آتے رہتے ہیں جن کی یاد ان کے ساتھیوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ لیکن علیگڑھ کا ایک کردار ایسا بھی گزرا ہے جس کا ذکر پرانے علیگ اپنے بعد آنے والوں سے برابر کرتے آئے ہیں۔ یہ روایتیں ایسے علیگوں سے مروی ہیں جنھوں نے اس کو دیکھا ہے، اس سے ملے ہیں، اس کی شرارتیں دیکھی ہیں، اس کی شرارتوں کا لطف اٹھایا ہے اور اس کی خود اعتمادی کی گل افشانیاں عملی طور پہ تجربہ کی ہیں۔

ایک روز ہم حکیم احمد شجاع کی خود نوشت پڑھ رہے تھے۔ چھوٹی سی کتاب (۱۴۰) صفحے کی ہے۔ نام "خوں بہا" ہے۔ وہ ایک طالب علم کا ذکر کرتے ہیں جس کو علیگڑھ کالج میں ٹامی کہا جاتا تھا۔ ایسا زندہ دل نوجوان ایسا طباع کہ نہ اس سے پہلے کوئی گزرا نہ بعد میں کوئی ایسا گزرے۔ ہم جو ٹامی کے قصے سنتے تھے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کالج کے بعد اس پر کیا گزری۔ حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں؛

سہ ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

"علیگڑھ کالج کے پُرانے اور نئے طلبا میں کوئی ایسا بھی ہے جو مسعود ثانی کے نام سے واقف نہ ہو۔ مسعود ثانی کا نام مسعود حسین کمبوہ تھا۔ اس کی شخصیت محبوب اور دلکش تھی۔ یہ وہی مسعود ثانی تھے جن کے دماغ کی جدّت آفرینیاں جن کے تخیل کی کارفرمائیاں، جن کی حرکات و سکنات کی بوقلمونیاں اور خلوت و جلوت میں جن کی ہنگامہ آرائیاں علیگڑھ اور میرٹھ ہی میں نہیں بلکہ سارے یوپی میں الف لیلیٰ کے افسانوں سے زیادہ مشہور ہیں۔"

حکیم صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں:

ایک دفعہ کا ذکر ہے مسعود ثانی اور میرٹھ کے تحصیلدار میں کرکٹ کے کسی میچ پر تو تو میں میں ہوگئی۔ تحصیلدار صاحب نے مسعود کو کالج کا طالب علم سمجھ کر ذرا اپنی حکومت کا رعب دکھایا۔ مسعود ایسے دن پیدا ہی نہیں ہوئے تھے کہ کسی کا رعب مانیں۔ لیکن انھیں اب یہ فکر ہوگئی کہ کسی نہ کسی طرح تحصیلدار صاحب کو نیچا دکھائیں۔ آخر ان کو ایک تدبیر سوجھ ہی گئی۔ انھوں نے سر جیمس مین کو جو اس زمانے میں یوپی کے گورنر تھے اور صوبے کے دورے کے سلسلے میں میرٹھ آنے والے تھے۔ میرٹھ کالج کے مسلمان طلبا کی طرف سے ڈنر کی دعوت دے دی۔ سر جیمس مین بڑے ہر دلعزیز اور نیک انسان تھے۔ انھوں نے یہ دعوت قبول کرلی۔ دعوت کا انتظام مسعود کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ خان بہادر شیخ وحیدالدین اور خان بہادر شیخ بشیرالدین، جو میرٹھ میں بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا کے نام سے مشہور ہیں، اس نامور باپ کے بیٹے ہیں جنھوں نے دلّی کی جامع مسجد واگزار کرائی تھی[1]۔ میرٹھ میں ان کا دولت کدہ ہر غریب الدیار کا ملجا اور ہر حاجت مند کا آسرا ہے۔ شرافت ان کی کنیز اور مہمان نوازی ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ ان کی دولت صرف اس لیے ہے کہ غریبوں کو امیر بنائے۔ اور ان کی شان و شوکت اس لیے ہے کہ فقیروں کا رتبہ بڑھائے۔ ان کی چشمِ التفات ہر کس و ناکس کے لیے وقف اور ان کا دل ہر دردمند کے درد کے لیے درماں ہے۔ ہم لوگ جمعہ کی نماز انھی کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ اور نماز کے بعد انھی کے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ ان کا خوانِ نعمت دن رات

[1] بھوپال کی نواب سکندر جہاں بیگم نے ۱۸۶۲ء میں انگریزوں سے واگزار کرائی۔ (ادارہ)

مہمانوں کے انتظار میں چشم براہ رہتا تھا اس لیے میرٹھ کالج کے مسلمان طلبا، کا ناکہاں واردان کی مہمان نوازی کے لیے کبھی موجب تردّد نہ ہوتا تھا۔ اللہ اللہ یہ لوگ کس تہذیب کی یادگار ہیں۔ فراوانی دولت انھیں مائل تکبر نہیں کرسکی۔ از دیادِ جاہ و حشم کے ساتھ ساتھ ان کی گردنوں کا خم اور بڑھتا چلا جاتا ہے چھوٹوں پر اتنی شفقت کہ ادب کا دھوکہ ہونے لگے۔ بڑوں کی اتنی عزت کہ پرستش کا گمان ہو۔ گفتار میں ایسی شیرینی کہ سننے والوں کے کان حلاوت کی کان بن جائیں۔ رفتار میں ایسی نرمی کہ زمین پر پاؤں رکھیں تو پاؤں کا نقش نہ جمے۔ آنکھوں میں آنسو، آواز میں رقت، کمر میں خم، تجربات کے پکے، ارادے کے دھنی، قول و قرار میں چٹان سے زیادہ استوار۔ "بھنگی" کو "مہتر" حجام کو "خلیفہ"، سقے کو "بہشتی" اور نوکر کو "بھائی" کہہ کر پکارنا۔ گھر کی نوکرانیوں کو "ماما اور بوا" کے نام سے یاد کرنا۔ پرانی تہذیب کے ان پرستاروں کی شرافت تھی۔ آہ! آج یہ چیزیں شریفوں کے گھروں میں بھی کمیاب ہیں۔

غرض یہ دونوں جود و سخا کے پیکر اور احسان و مروت کے بندے اس آڑے وقت میں مسعود کے کام آئے۔ ڈنر کا وہ اہتمام ہوا کہ شاید و باید۔ مسلم ہاسٹل کے وسیع ہال میں بھیاجی کی کوٹھی کا سب سامان آگیا۔ شاہ بلوط کی میزیں، ساگوان کی کرسیاں، چینی کے ظروف اور چاندی کے چھری کانٹے۔ یونائیٹڈ سروس کلب میرٹھ نے کھانے کا مینو تیار کیا اور اسی کے تجربہ کار خانساموں نے کھانا پکایا۔ اب ایک چیز کی کمی رہ گئی تھی۔ مسعود کے پاس ڈنر کے کپڑے نہ تھے۔ آخر اس کی تدبیر بھی ہوگئی۔ مسعود دلی گئے اور مسٹر محمد علی کی طرف سے جو اس وقت "کامریڈ" کے ایڈیٹر تھے، فلپس کمپنی کو اپنے ایوننگ ڈریس کا آرڈر دے دیا۔

حاصلِ کلام، ڈنر کی نشستوں کی جب ترتیب ہونے لگی تو بیچارے تحصیلدار صاحب کو میز کے آخری کونے میں جگہ ملی اور مسعود میزبانوں کے نمائندے کی حیثیت سے سر جیمس میسن کے پہلو بہ پہلو بیٹھے۔ کھانا کھانے کے دوران ہم لوگ یہ دیکھ کر خوش اور پریشان ہوتے تھے کہ مسعود بار بار سب کی آنکھیں بچاکر

تحصیلدار صاحب کو ذرا جھک کر آداب کر لیتے ہیں۔ مسعود کے جذبۂ انتقام کی تسکین تو ہوگئی مگر ڈنر کا بل بھیا جی کو اور ایوننگ ڈریس کا بل مسٹر محمد علی (جوہر) کو ادا کرنا پڑا۔

جب قیصرِ ہند تاجدارِ برطانیہ شاہ جارج پنجم کی تخت نشینی کا دربار دلّی میں منعقد ہوا تو اس جشن کو کامیاب بنانے کے لیے حکومت کی لامحدود طاقت اور رعایا کی لازوال وفاداری جو کچھ کر سکتی تھی، کیا گیا۔ میرٹھ میں بیٹھے بیٹھے ان تیاریوں کی داستانیں سنتے تو دل مسوس کر رہ جاتے۔ ایسے جشن کی تقریبوں میں شریک ہونے کے لیے بڑے وسائل کی ضرورت تھی اور اس تقریب پر دلّی کے ہنگاموں کا لطف اٹھانے کے لیے بڑا پیسہ چاہیئے تھا۔ یوں تو دلّی میں ظہیر شمسی اور ممتاز حسن کے مکان موجود تھے۔ مگر یہ دونوں پرانی دلّی میں تھے۔ ایک چوڑی والان میں، دوسرا مٹیا محل میں۔

آخر دربار کے دن آگئے۔ ایک روز مسعود میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے "دلّی کا دربار نہیں دیکھتے؟" میں نے جواب دیا "اتنے پیسے کہاں ہیں؟" کہنے لگے "آخر کتنے ہیں؟" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کل بارہ آنے نکلے۔ انھیں ہتھیلی پر رکھ کر کہا "ہمارے پاس تو یہ بارہ آنے ہیں۔" ہنس کر فرمانے لگے "ذرا بکس میں تو دیکھو۔" غرض کرکرا کے کل تیئس روپے بنے۔ مسعود نے کہا "بہت ہیں۔ لو تیار ہو جاؤ۔"

مسعود کا بدن اس قدر فربہ تھا کہ وہ خواہ مخواہ معتبر معلوم ہوتے تھے۔ ان کا رنگ اس قدر سرخ اور سفید تھا کہ انگریزی لباس میں وہ انگریزوں سے بڑھ کر انگریز نظر آتے تھے۔ انگریزی لہجہ اس قدر فرنگیانہ تھا کہ ان کی گفتگو سے ان کا ہندوستانی ہونا کبھی ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ لباس دیسی ہو یا انگریزی، بہت شاندار پہنتے تھے اور کھانا نہایت پُرتکلف کھاتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کے کمرے میں اس ٹھاٹ سے رہتے تھے گویا بورڈنگ ہاؤس ان کی جاگیر ہے اور وہ اس کے انتظام کے لیے وہاں مقیم ہیں۔ انھوں نے اپنے ملازم خیر محمد کو سفر کی تیاری کا حکم دے دیا۔

ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

بورڈنگ ہاؤس سے چلتے وقت مسعود نے مجھ سے دو بتیس روپے لے لیے۔ اسٹیشن پر پہنچ کر کہنے لگے "میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور جو کچھ میں کروں وہی کرتے جاؤ۔" میں نے کہا "بہت اچھا۔" میں نہیں جانتا انھوں نے ریل کے ٹکٹ خریدے یا نہیں مگر وہ دلی کی گاڑی میں فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں جا ڈٹے۔ میں بھی ان کے ساتھ نشست پر بیٹھ گیا۔ دلی کے کنگز وے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو اترے اور خیر محمد کو انگریزی لہجے میں حکم دیا "بھوپال کیمپ جاؤ اور مہمان خانے کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو ہمارا اسلام بولو۔" خیر محمد "بہت اچھا حضور" کہہ کر چل دیا۔ پلیٹ فارم سے باہر نکل کر کہنے لگے "دیکھو بھئی! پیسے کم ہیں اور گاڑیوں کا کرایہ آج زیادہ ہے اور سچ پوچھو تو سیر کا مزہ پیدل چلنے ہی میں ہے۔ موسم بھی خوشگوار ہے اور چاروں طرف چہل پہل۔ ابھی پہنچے جاتے ہیں۔" میرے جواب کا انتظار کیے بغیر چل پڑے۔ کوئی ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اِدھر اُدھر کی رونق دیکھنے اور اس پر جرح و نقد کرنے میں ہم اتنے مصروف ہو گئے کہ ہمیں یاد بھی نہ رہا کہ ہم کہاں ہیں اور کدھر جا رہے ہیں۔ پانچ بجے کے قریب ہم "رج" کے سامنے والے بازار میں جا پہنچے۔ وہاں لپٹن کمپنی نے اشتہار کی غرض سے ایک خوبصورت شامیانہ سجا رکھا تھا۔ شامیانے کے نیچے قالین، اس پر صوفے اور کرسیاں۔ ان کے سامنے حسین و جمیل تپائیاں۔ ان پر براق پوش میز۔ مسعود خدا جانے کیسے بھانپ گئے کہ یہاں چائے مفت تقسیم ہوتی ہے۔ فرمانے لگے "کیوں بھئی چائے پیو گے؟" میں نے کہا "چائے کا وقت تو ہے۔" فرمایا "تو پھر آؤ۔" شامیانے میں جا کر ہم نے بڑے مزے سے چائے پی۔ چائے پینے کے بعد مسعود نے بڑے سرپرستانہ انداز میں منیجر سے کہا "انتظام بہت اچھا ہے۔"

اس سفر کی ساری روداد بیان کرنے کے لیے یہ جگہ کافی نہیں۔ بس یہ سن لیجیے کہ ہم نے ان تین روز میں کبھی تو لنچ اعلیٰ حضرت شہریار دکن کے مہمان خانے میں کھایا۔ کبھی تاجدار رامپور کے مہمان خانے میں۔ ڈنر کبھی بھوپال کے کیمپ میں تناول کیا۔ کبھی بہاولپور کے کیمپ میں۔ میں نہیں جانتا مسعود ان سب والیانِ ریاست کے کیمپوں کے منتظمین سے واقف تھے یا نہیں۔ مگر جہاں کہیں ہم گئے۔ ہماری ایسی

آؤ بھگت ہوئی کہ مجھ کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ ہم کہیں بھی بن بلائے مہمان نہیں۔
جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ان تیئس روپیوں میں سے مشکل سے کوئی دس روپے صرف ہوئے ہوں گے۔ ان میں سب سے بڑی رقم ڈھائی روپے کی تھی جس سے ہم نے چاکلیٹ کے دو ڈبے خریدے۔ باقی پیسے تو قلیوں کی مزدوری میں اور کچھ ٹرام کے کرائے میں صرف ہوئے۔ ہاں یہ تو میں کہنا ہی بھول گیا کہ بخش الٰہی اینڈ کمپنی کے منیجر سے مسعود کی پرانی یاد اللہ تھی۔ انھوں نے مسعود کو اپنی دکان سے سگریٹ خریدتے دیکھا تو سیزرز سگریٹ کی پچاس ڈبیوں کا ایک پیکٹ مفت نذر کر دیا۔

تیسرے روز ہم ان شاہانہ دعوتوں اور خاطر مدارات کے تکلفات سے تنگ آکر دلی چلے گئے۔ میں مسعود سے رخصت ہوکر ممتاز کے ہاں مٹیا محل چلا گیا اور مسعود اپنے ایک دوست کے ہاں فراش خانے۔

دوسرے دن حضور ملکِ معظم شہنشاہ آنجہانی ایڈورڈ ہفتم کے مجسّمے کی نقاب کشائی ہونی تھی۔ میں، ممتاز اور ظہیر زاہدی دوپہر ہی سے جامع مسجد کے سامنے امام صاحب کے بالاخانے پر جا بیٹھے۔ جب شاہی جلوس نکلا تو ہم سب یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ مسعود بے حد شاندار لباس زیب تن کیے کسی بڑے انگریز کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے جا رہے ہیں۔

بعد میں مجھے مسعود کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ روشن آرا باغ کی اس پارٹی میں بھی شریک ہوئے تھے جو والیانِ ریاست کی طرف سے حضور ملکِ معظم قیصرِ ہند کے اعزاز میں دی گئی تھی اور جس میں ملک کے چیدہ چیدہ اکابر ہی مدعو کیے گئے تھے۔

مسعود شامی کے زندگی کے کارنامے اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسے عجیب وغریب اور اپنی دلکشی کے لحاظ سے ایسے کثیر الاشکال ہیں کہ اس مضمون کا حجم اپنے اندر ان کے بیان کی گنجائش نہیں پاتا۔ یہ ایک دو واقعات محض تبرکاً لکھ دیے ہیں تاکہ مسعود کی روح جنت الفردوس کی آسودگیوں میں اس درد سے تڑپ نہ اٹھے کہ ہم اسے اتنی جلدی بھول گئے۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ، دسمبر ۲۰۰۰ء

چند روز ہوئے ہمیں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے علیگڑھ میگزین موصول ہوا۔ یہ طلبائے علیگڑھ یونیورسٹی کا علمی و ادبی مجلّہ ہے۔ جس کے مدیر محمد رضوان مصطفےٰ ہیں۔ اس شمارے میں علیگڑھ کے پرانے طالب علموں کے مضامین ہیں جن میں ان کی دلچسپ سے دلچسپ تر باتیں رقم ہیں۔

محمد یوسف صاحب کا مضمون ہے "علیگڑھ کی کچھ یادیں" بڑے مزے کی باتیں لکھتے لکھتے ایک جگہ پر مسعود شامی کا ذکر آگیا ہم نے یہ حصّہ زیادہ شوق سے پڑھا کیونکہ ان صاحب سے ہم تھوڑے بہت واقف ہو چکے ہیں۔ محمد یوسف صاحب لکھتے ہیں:

"ایک صاحب تھے جو شکل و صورت سے انگریز نما تھے۔ گورے چٹے اچھے شکیل طالب علم۔ مسعود شامی کے نام سے انھیں جانا جاتا تھا۔ بے ضرر شرارت اور ایکیٹیو ٹی کرنے میں ماہر۔ وائسرائے ہند کو علیگڑھ وزٹ کرنا تھا تو علیگڑھ کے چانسلر، وائس چانسلر اور دیگر صاحب اختیار حضرات نے انتظام کے سلسلے میں اجلاس کیا اور سب امور پر غور کیا گیا اور یہ بھی سوچا گیا کہ کوئی لڑکا کسی قسم کی شرارت نہ کرے۔ وہاں مسعود شامی کا ذکر بھی ہو گیا کہ یہ لڑکا بے ضرر انوکھی قسم کی شرارت کر دیا کرتا ہے، یہ کوئی حرکت نہ کرنے پائے۔ اس لیے اسے ہفتے بھر کی جبری چھٹی پر علیگڑھ سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ اسے ریل گاڑی پر بٹھا کر علیگڑھ سے روانہ کر دیا۔ مسعود شامی سمجھ گیا کہ اسے کیوں علیگڑھ سے نکالا جا رہا ہے۔ چنانچہ وہ انبالہ کا ٹکٹ لے کر روانہ ہو گیا لیکن وہ دہلی پر ہی اتر گیا اور سیدھا وائسرائیگل لاج جا پہنچا اور وہاں کے ذمہ دار حضرات سے کہا کہ اسے علیگڑھ یونیورسٹی نے بھیجا ہے۔ کہ ہز ایکسیلنسی وائسرائے کو علیگڑھ وزٹ کرنا ہے، اس لیے ان کے ہمراہ آؤں، گویا ابھی سے وائسرائے کا استقبال شروع کر دوں۔ وائسرائے بڑا خوش ہوا اور کہا کہ اسے سرکاری مہمان رکھا جائے اور خاص سیلون میں وہ وائسرائے کے ساتھ سفر کرے۔ چنانچہ تاریخ مقررہ پر جب وائسرائے علیگڑھ روانہ ہوئے تو یہ ان کے ہمراہ علیگڑھ پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو پہلے مسعود شامی سیلون سے اترا اور اس کے بعد وائسرائے۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مسعود شامی کو دیکھ کر سب حیران و ششدر ہو گئے۔ مسعود شامی نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب اور باقی استقبال کے لیے آنے والوں کا تعارف وائسرائے سے کرا کر کہا۔" اب میری ڈیوٹی ختم!" اور رخصت ہو گیا۔

اگلے دن وائسرائے کو ہوسٹلوں کا چکر لگانا تھا تو مسعود شامی نے ادھر اُدھر سے لڑکوں سے کتابیں لے کر اپنے کمرے کی کچی بارک کی الماری میں سجادیں اور کمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور جب وائسرائے اس کے کمرے کے پاس پہنچا تو اس نے سلام کرکے درخواست کی کہ اس کے کمرے کے اندر بھی جھانک لیں۔ چنانچہ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئے اور وہاں حکم دیا کہ جب تعلیم سے فارغ ہو تو اسے تحصیلدار بھرتی کیا جائے۔ چنانچہ اگلے سال یہ براہِ راست تحصیلدار مقرر ہو گیا۔ اس زمانے میں تحصیلدار بڑا اچھا اونچا عہدہ تصور ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں علیگڑھ یونیورسٹی جوبلی کے موقع پر میری ملاقات شامی سے ہوئی جو بڑے خوش تھے۔"

کیا زندگی میں آپ کو کبھی کوئی ایسا کردار ملا جو بھولنے سے نہ بھولے۔ بھلایا نہ جائے۔ اس کی شوخیاں، شرارتیں، خوش خرامیاں اور خوش مزاجیاں آپ کا دامن پکڑ لیں تو آپ کو مسکراہٹیں بن مانگے مل جائیں۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

عبدالرشید خاں صاحب نے جنوری ۱۹۹۰ء کے ماہنامہ "تہذیب" میں آغا بابر صاحب کا مضمون "سریلی باتیں" پڑھا۔ انھوں نے بھی اپنے سینئرز سے مسعود شامی کا ذکر سنا تھا۔ وہ کہتے ہیں:

"ان کی شرارتوں پر مشتمل ایک کتابچہ کہیں سے مجھے مل گیا تھا۔ ایک صاحب مانگ کر لے گئے اور پھر واپس نہ کیا۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

مسعود شامی کی شرارتوں میں نہ صرف اچھوتا پن ہوتا تھا بلکہ وہ ان کا ارتکاب بلا کی خود اعتمادی سے کرتے سنے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ ریل میں سفر کر رہے تھے

۱۔ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

فرسٹ کلاس میں سوار تھے اور ایک انگریز ہم سفر تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ انگریز کا اوور کوٹ سیٹ پر ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ اس دوران وہ ٹائلیٹ میں گیا اور ثامی صاحب کو شرارت کا موقع مل گیا انھوں نے اوورکوٹ اٹھا کر دیکھا۔ اندر کی جیب پر لندن کے اس سوٹ بنانے والے ٹیلر کا اسٹیکر لگا ہوا تھا۔ بس اتنا حوالہ کافی تھا۔ ثامی صاحب اطمینان اور خود اعتمادی کے ساتھ، اوور کوٹ پہن کر اخبار پڑھنے لگے۔ انگریز ٹائلیٹ سے واپس آیا تو اپنا کوٹ ثامی کو پہنے دیکھ کر پریشان ہوا مگر ثامی کی شخصیت اتنی متاثر کن تھی کہ اس کی ہمت باز پرس کی نہ ہوئی۔ اس نے کوٹ کی تعریف کرتے ہوئے ثامی سے پوچھا کہ انھوں نے یہ کوٹ کہاں سے لیا۔ وہ تو ٹیلر کا نام پہلے ہی معلوم کر چکے تھے لہٰذا اطمینان سے انھوں نے جواب دیا کہ لندن کے فلاں ٹیلر سے بنوایا تھا اور غریب انگریز کے لیے اب صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اور اس طرح ثامی صاحب اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد کوٹ سمیت ٹرین سے اتر گئے اور انگریز دیکھتا رہ گیا۔

آغا بابر صاحب نے مسعود ثامی کا تحصیلدار کی حیثیت سے تقرری کا ذکر کیا ہے۔ مذکورہ بالا کتابچہ میں یہ واقعہ کسی اور طرح تحریر تھا کہتے ہیں اس زمانہ میں علاقہ کا کمشنر تحصیلدار کا تقرر کیا کرتا تھا۔ ثامی بھی دیگر امیدواروں کے ساتھ انٹرویو کے لیے پیش ہوئے۔ امیدواروں کو ایک لائن میں کھڑا کیا گیا اور انگریز کمشنر لائن میں کھڑے ہر امیدوار کا انٹرویو لیتا تھا اور منتخب ہونے والوں کو لائن سے الگ کرتا جاتا تھا، اسی دوران کمشنر کسی ضرورت سے اندر اپنے دفتر میں گیا اور ثامی کو اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع مل گیا۔ کمشنر کے جانے کے بعد وہ بڑے اطمینان سے اپنی لائن سے نکل کر منتخب ہونے والے امیدواروں میں جا کھڑے ہوئے۔ کمشنر بھی شاید جوہر شناس تھا اس نے ثامی کو دوسری لائن میں کھڑا دیکھ کر کہا

اور اس طرح ثامی صاحب تحصیلدار منتخب کر لیے گئے۔

اس کتابچہ میں ثامی صاحب کی موت کے حادثہ کا بھی ذکر ہے۔ واقعے کی

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نوعیت سے میرے نزدیک یہ حادثہ ہی ہے۔ کتابچہ میں لکھا ہے کہ شامی صاحب کا قول تھا کہ پچاس سال کی عمر کے بعد انسان کو زندہ نہیں رہنا چاہیئے۔ ایک روز وہ اپنے گھر پر چند دوستوں کے ہمراہ تاش کھیل رہے تھے کہ اچانک اٹھ کر اندر گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد پستول چلنے کی آواز آئی، جا کر دیکھا تو شامی خون میں لت پت آخری سانس لے رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس لمحے ان کی عمر تاریخ پیدائش کے مطابق پچاس سال ہو گئی تھی اور اپنے قول کے مطابق انھوں نے خود ہی اپنے ریوالور سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

جناب ذاکر علی خاں صاحب نے اپنی مشہور کتاب "روایات علیگڑھ" میں مسعود شامی کی مشہور اکٹی وٹی کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ہمارے ایک معروف پیش رو بزرگ کو نئی سوجھی۔ انھوں نے ڈائننگ ہال کی میزوں سے سیڑھی بنا کر راتوں رات ایک اونٹ کو ہوسٹل کی چھت پر چڑھا دیا اور میزیں موقع واردات سے ہٹا دیں۔ اب صبح کو جو وارڈن صاحب اور لڑکے آئے تو شتر سر بام دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وارڈن صاحب اسی پریشانی میں مبتلا تھے کہ آخر یہ اونٹ چھت پر کیسے پہنچا، بالآخر عفو تقصیر کی یقین دہانی کے بعد ایک صاحب (مسعود شامی) نے ایکٹی وٹی کا اعتراف کیا۔ میرے والد صاحب نے جب یہ واقعہ سنایا تھا تو اونٹ کو یونین ہال پر چڑھانے کا اور ڈائننگ ہال کی میزوں کی جگہ ریلوے اسٹیشن کے لکڑی کے پل کا ذکر کیا تھا۔

جناب محمد احمد سبزواری صاحب نے "علیگڑھ اور بھوپال" پر جو بھر پور مضمون تحریر فرمایا ہے اس میں تحریر کیا ہے کہ مسعود شامی نواب حمید اللہ خاں کے زمانہ قیام میں لیجنڈ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے حیرت انگیز اور دلچسپ کارناموں کی داستان الف لیلوی کہانیوں کی طرح سنی جایا کرتی تھی۔ مسعود شامی پر تکلف کھانوں اور شاندار لباس کے شوقین تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے پس ماندگان کی نگہداشت کی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے نواب حمید اللہ خاں صاحب نے ان کے خاندان کی رہائش کے لیے بھوپال میں شاہی خاندان سے متصل ایک حویلی بھی مختص کی اور ایک معقول وظیفہ بھی مقرر کیا۔ ان کا خاندان آج بھی اسی حویلی میں مقیم ہے۔ ●●

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

زیڈ۔ اے۔ نظامی

پاکستان میں علیگڑھ کے مشاہیر

اس صدی میں علیگڑھ نے مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے اس کی پوری قوم معترف ہے۔ اس ادارہ کی کاوشوں کی وجہ سے ہی اس کو علیگڑھ تحریک کا نام دیا گیا۔ غیر منقسم ہندوستان میں یہی ایک واحد مسلم ادارہ تھا جہاں ملک کے ہر گوشہ سے لوگ آتے تھے۔ تحریک پاکستان میں اس ادارہ نے بھر پور کردار ادا کیا[1]۔ قائدِ اعظم کو علیگڑھ سے بے پناہ محبت تھی اور آزادی کی جدّوجہد میں اہم اعلانات انھوں نے یونین کے جلسوں میں ہی کیئے۔

پاکستان بننے کے بعد علیگڑھ سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں آئے اور نئے ملک کو مستحکم کرنے میں بھر پور کردار ادا کیا۔ تہذیب کے اس خاص شمارہ[2] میں ان مشاہیر کا مختصر ذکر مقصود ہے جنھوں نے علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان کو اپنا مسکن بنایا اور بے لوث خدمت کر کے اپنے شعبہ میں نامور ہوئے۔ یہاں ان لوگوں کا بھی ذکر ہے جو علیگڑھ میں درس و تدریس یا انتظامی شعبوں سے ماضی میں منسلک رہے اور پھر پاکستان میں قیام پذیر ہوئے۔

[1] ادارہ مصنف کے ان خیالات سے پوری طرح متفق نہیں ہے۔ (ادارہ)

[2] ۲۰۰۳ء یہ مضمون رسالہ تہذیب کراچی سرسید نمبر اکتوبر ۱۹۹۲ء میں طبع ہوا تھا اس آٹھ سال کے عرصہ میں بہت سے ان میں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں عمرالله لھم (ادارہ)

پاکستان میں علی گڑھ کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ وہ واحد ادارہ ہے جس سے تعلق رکھنے والے چھ افراد مملکت پاکستان کی حکومت کے سربراہ رہے (لیاقت علی خاں، خواجہ ناظم الدین، غلام محمد، فیلڈ مارشل ایوب خاں، چودھری محمد علی، فضل الہٰی چودھری) اس کے علاوہ لاتعداد لوگ سیاسی میدان میں گورنر، مرکزی وصوبائی وزیر۔ اسمبلی کے ممبر رہے۔ انتظامی تعلیمی اور فنی شعبہ میں بھی علیگڑھ کے لوگ پیش پیش رہے۔

مولانا ظفر علی خاں

مولانا پاکستانی تاریخ کے مشہور رہنما بے باک صحافی مقرر اور شاعر تھے۔ وہ ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ ضلع کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وزیر آباد اور پٹیالہ میں حاصل کی اور اس کے بعد وہ علیگڑھ چلے گئے جہاں سے انھوں نے فرسٹ ڈویژن میں ۱۸۹۵ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ مولانا ظفر علی خاں ان چند معزز طلبائیں سے تھے جنھوں نے سرسید کی حیات میں ہی ڈگری حاصل کی۔ شروع میں وہ کچھ دنوں محسن الملک کے سکریٹری رہے اور پھر حیدرآباد دکن میں سرکاری نوکری کی۔ ۱۹۰۹ء میں واپس پنجاب آکر "زمیندار" کے مالک و ایڈیٹر بنے۔ وہ شروع سے انگریزی حکومت کے مخالف اور آزادی کے علمبردار تھے۔ جس کی وجہ سے انھیں متعدد بار جیل جانا پڑا۔ انھوں نے تحریکِ خلافت میں مولانا محمد علی جوہر کے شانہ بشانہ عملی حصہ لیا۔ وہ کچھ عرصہ تک کانگریس اور مجلس احرار سے بھی منسلک رہے ۱۹۳۷ء کے بعد وہ مسلم لیگ کے سرگرم رکن رہے اور ۱۹۳۷ء ۔ ۱۹۴۵ء میں غیر منقسم ہندوستان کی اسمبلی کے ممبر رہے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ دوبارہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ممبر منتخب ہوئے تحریکِ پاکستان میں اپنی ولولہ انگیز تقریروں اور زمیندار اخبار کے کالموں سے انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم، قائد اعظم کے دست راست اور تحریک پاکستان کے عظیم رہنما ۱۸۹۵ء میں ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں علیگڑھ سے بی اے کرنے کے بعد آکسفورڈ اور لندن میں تعلیم حاصل کی، اور ۱۹۲۰ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ وطن واپس آنے کے بعد وکالت شروع کی اور عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۲۶ء میں یوپی اسمبلی کے ممبر ہوئے اور ۱۹۳۰ء کے انتخابات میں بلا مقابلہ کامیاب ہوئے ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے کامیاب ہوئے اور اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر ہوئے ۱۹۴۵ء ۔ ۱۹۴۶ء میں قائد اعظم کے معتمد خاص کی حیثیت سے شملہ مذاکرات میں شریک ہوئے ۱۹۴۶ء میں غیر منقسم ہندوستان میں وزیر مالیات ہوئے اور اس سال ملک کا معرکۃ الآرا بجٹ پیش کیا۔

لیاقت علی خاں مسلمانوں کے بے لوث لیڈر تھے اور ۱۹۳۶ء سے پاکستان بننے تک مسلم لیگ کے سکریٹری رہے۔ پاکستان کے وہ پہلے وزیر اعظم بنے اور ۴ سال تک مشکل حالات میں ملک کو مستحکم کرنے میں شاندار کردار ادا کیا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی میں گولی لگنے سے شہید ہوئے اور قائدِ اعظم کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مولانا سید سلیمان ندوی

برِ صغیر کے مشہور عالم دین، ان چند بزرگوں میں سے ہیں جن کو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے علمی خدمات کے صلہ میں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا۔ مولانا ۱۸۸۴ء میں پٹنہ کے ایک مشہور علمی گھرانہ میں پیدا ہوئے اور ندوہ کے دار العلوم سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی وہ مولانا شبلی نعمانی کے معتمد شاگردوں میں سے تھے۔

شروع میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ مل کر رسالہ "الہلال" نکالا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ پونا کے ایک کالج میں استاد ہو گئے۔ لیکن جلد ہی استعفیٰ دے کر دارالمصنفین اعظم گڑھ سے جو ان کے استاد شبلی نعمانی نے قائم کیا تھا منسلک ہو گئے۔

انھوں نے تحریکِ خلافت میں بھی حصّہ لیا اور اس کے بعد اپنی تمام تر توجّہ دینی اور علمی کاموں میں مرکوز کر دی۔ پاکستان آنے کے بعد تعلیمات اسلامی بورڈ کے ممبر رہے۔ ۱۹۵۳ء میں ان کا کراچی میں انتقال ہوا۔ ۱۹۴۶ء میں بھوپال ریاست کی قاضی اور مدرسہ احمدیہ کے مہتمم مقرر ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں انضمام ریاست کی بدولت پاکستان چلے آئے۔

خواجہ ناظم الدین

خواجہ ناظم الدین پاکستان کے گورنر جنرل اور وزیر اعظم کے عہدہ پر رہے وہ ۱۹ جولائی ۱۸۹۴ء میں ڈھاکہ کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ علیگڑھ میں بنیادی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد انگلستان گئے جہاں سے انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے ایم اے اور اس کے بعد بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ وکالت کے ساتھ ساتھ انھوں نے عملی سیاست میں حصّہ لینا شروع کیا اور ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء میں ڈھاکہ میونسپلٹی کے چیرمین رہے۔ ۱۹۲۳ء میں بنگال اسمبلی کے ممبر ہوئے اور ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک صوبائی وزیر رہے ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر دوبارہ اسمبلی کے ممبر ہوئے اور فضل الحق کی کابینہ میں کچھ دنوں تک وزیر رہے۔ ۱۹۴۳ء ۔ ۱۹۴۵ء میں وہ بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔ وہ قائدِ اعظم کے بہت قریبی ساتھیوں میں سے تھے او ۱۹۳۷ء سے پاکستان بننے تک مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے او تحریکِ پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔

پاکستان بننے کے بعد مشرقی پاکستان کے پہلے وزیر اعلیٰ اور دستور ساز

کے ممبر ہوئے۔ قائدِ اعظم کے انتقال کے بعد ستمبر ۱۹۴۸ء میں گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ لیاقت علی خاں کے انتقال کے بعد اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وزیرِ اعظم بنے اور اپریل ۱۹۵۳ء تک اس عہدہ پر رہے۔ اس کے بعد انھوں نے عملی سیاست سے کافی حد تک کنارہ کشی اختیار کرلی تھی ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۴ء کو ان کا انتقال ہوا۔

سر آغا سلطان محمد خاں (آغا خاں سوئم)

سر سید کے انتقال کے بعد جن مشاہیر نے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ان میں سر آغا خان (سوئم) کا نام سنہری حرفوں سے لکھا جاسکتا ہے۔ وہ ۱۹۲۰ء میں علیگڑھ یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد دس سال تک پرو چانسلر اور کچھ دنوں کے لیے وائس چانسلر رہے۔ ۱۹۰۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے ایک کروڑ روپے چندہ کی اپیل کی اور ۱۹۱۱ء میں چندہ کی ایک مہم شروع کی جس میں ۳۰ لاکھ روپے جمع ہوئے۔ انھوں نے کئی موقعوں پر ایک خطیر رقم اپنی جیب خاص سے بھی دی۔

سر آغا خان (سوئم) ۲ر نومبر ۱۸۷۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے اور ۱۸ر اگست ۱۸۸۵ء میں اسماعیلی فرقہ کے راہنما ہوگئے انھوں نے ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے قیام کے سلسلہ میں ۱۹۰۶ء میں اہم کردار ادا کیا اور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۳ء تک مسلم لیگ کے صدر رہے۔ انھوں نے ۳۱-۱۹۳۲ء میں گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ ۱۹۳۶ء کے بعد انھوں نے برصغیر کی عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی مگر وہ قائداعظم کے بڑے مداحوں میں رہے۔ آزادی کے بعد وہ یورپ اور مصر میں قیام پذیر رہے مگر اکثر پاکستان آتے رہتے تھے اور ۱۹۴۹ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں کونوکیشن سے خطاب کیا۔ انھوں نے مغربی ممالک میں اپنا اثر و رسوخ ہمیشہ مسلمانوں کی بھلائی کے لیے استعمال کیا اور ہندوستان اور پاکستان میں بہت سے

سماجی منصوبوں میں حصہ لیا اور ۸۰ سال کی عمر میں ۱۹۵۷ء میں انتقال کیا۔

سردار عبدالرب نشتر

آل انڈیا مسلم لیگ کے بے لوث لیڈر تھے اور ہمیشہ قائد اعظم کے معتمد خاص رہے وہ ۱۳ جون ۱۸۹۹ء کو پشاور میں پیدا ہوئے اور ایڈورڈ مسن کالج پشاور سے بی اے اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لی۔ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں پشاور میں وکالت شروع کی اور شروع میں کانگریس میں شامل ہوئے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سے مسلم لیگ کے سرگرم کارکن رہے۔ ۱۹۴۳ء۔ ۱۹۴۵ء میں سرحد کے وزیر مالیات رہے۔ وہ شروع سے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن اور گاہے بگاہے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے۔ متحدہ ہندوستان میں وہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔ وہ سرحد کے ان مایہ ناز لیڈروں میں سے تھے جنھوں نے وکالت کو سیاست پر قربان کیا اور ہمہ تن مسلم لیگ کی تحریک میں پورے ہندوستان میں کام کرتے رہے وہ ۱۹۴۶ء میں شملہ کانفرنس میں مسلم لیگ کی طرف سے نمائندہ تھے۔ جب مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں شرکت کی تو سردار نشتر مواصلات کے وزیر ہوگئے۔ اور تھوڑے عرصہ میں انھوں نے اس شعبہ میں دور رس اصلاحات کیں۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء سے پاکستان بننے تک وہ کونسل آف اسٹیٹ کے لیڈر بھی رہے۔ قائد اعظم نے ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے تقسیم کے معاملات طے کرنے والی کمیٹی کا مسلم لیگ کی طرف سے نمائندہ بنایا اور اس کام کو بھی انھوں نے بہت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک حکومت میں وزیر مواصلات رہے۔ ۱۹۴۹ء ــــ ۱۹۵۱ء میں گورنر پنجاب اور ۱۹۵۱ء۔ ۱۹۵۳ء میں خواجہ ناظم الدین کی وزارت میں وزیر صنعت کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد محلاتی سیاست سے بدظن ہو کر کچھ دن کے لیے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور پھر ۱۹۵۶ء میں پاکستان مسلم لیگ کے صدر بنے۔ ملکی سیاست سے نالاں ہونے کی وجہ سے ان کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی اور انھوں نے فروری ۱۹۵۸ء میں کراچی میں انتقال کیا اور عوام کے اصرار پر ان کو قائد اعظم اور لیاقت علی خاں کے

بارود میں سپردِ خاک کیا گیا۔

سردار عبدالرب نشتر پاکستان کے ان مایہ ناز سیاست دانوں میں تھے جن سے عوام بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ علیگڑھ اسپرٹ کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ اسی لیے انھوں نے کبھی علاقائی سیاست کو پسند نہیں کیا۔ مہاجرین کے لیے اپنی خدمات سیاست میں اصولوں کی پابندی اور حکومت میں ایمانداری کے اصول اپنانے کی وجہ سے آج تک وہ یاد کیے جاتے ہیں۔

چوہدری خلیق الزماں

تحریک پاکستان کے مشہور رہنما ۲۵ دسمبر ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ لکھنو کے جوبلی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد علیگڑھ میں داخلہ لیا اور ۱۹۱۶ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانہ سے ہی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور ۱۹۱۲-۱۹۱۳ء میں ڈاکٹر انصاری کے میڈیکل مشن کے ساتھ ترکی گئے ۱۹۱۷ء میں انھوں نے لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ اس کے کچھ دنوں بعد وہ کانگریس میں شامل ہو گئے اور تحریکِ خلافت میں حصہ لیا۔ وہ کئی مرتبہ جیل بھی گئے۔ وہ کافی عرصہ تک لکھنؤ میونسپل بورڈ کے چیرمین رہے اور ۱۹۳۰ء میں سینٹرل اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور قائدِ اعظم کے شانہ بشانہ تحریک پاکستان میں سرگرم رہے۔ اور اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں دستور ساز اسمبلی کے ممبر رہے۔ کچھ دنوں بعد وہ ہندوستان میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر رہے مگر اکتوبر میں پاکستان آگئے اور فروری ۱۹۴۸ء میں مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر مقرر ہوئے۔ وہ کچھ عرصہ مشرقی پاکستان کے گورنر اور پھر سفیر بھی رہے۔ کچھ دنوں سیاست سے کنارہ کشی کرنے کے بعد وہ صدر ایوب کے ساتھ ہو گئے اور مسلم لیگ کے ایک دھڑے کی بنیاد رکھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت آنے کے بعد انھوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور ۱۹۷۴ء میں انتقال کیا۔

غلام محمد

پاکستان کے وزیر خزانہ رہے اور اس کے بعد ملک کے گورنر جنرل رہے

انھوں نے علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرکاری نوکری کی اور اقتصادیات اور مالیات کے ماہر کی حیثیت سے ان کا شمار ہونے لگا۔

جناب فضل الٰہی چوہدری

پاکستان کے صدر کے عہدہ تک پہنچے۔ آپ نے علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی اور پاکستان میں وکالت کی۔ اس کے بعد سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ملک کے اعلیٰ ترین عہدہ (صدارت) سے ریٹائرمنٹ کے بعد سیاست سے کنارہ کشی کرلی۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن ہاپوڑ میں حاصل کرکے علیگڑھ میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۴ء میں بی اے کیا۔ ان کو شروع ہی سے ادب میں دلچسپی تھی۔ سرسید، شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی سے انھوں نے خصوصی استفادہ کیا۔ مولوی عبدالحق علیگڑھ کالج کے ابتدائی گریجویٹوں میں سے تھے اور ان کے ساتھیوں میں ڈاکٹر ضیاء الدین، مولانا ظفر علی خاں، شیخ عبداللہ جیسے لوگ تھے جنھوں نے اپنے ادارہ کا نام روشن کیا۔

انھوں نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز حیدرآباد دکن سے کیا جب وہ محکمہ میں صدر مہتمم ہوگئے تو اں کو اُردو کی ترقی کا بھرپور موقعہ ملا۔ حیدرآباد دکن نے جو اردو کی خدمت کی اس میں مولوی صاحب کا اہم کردار رہا۔ ۱۹۳۱ء میں وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہوئے اور اپنی تمام عمر اردو کی بے لوث خدمت میں گزاری۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کا ذریعہ تعلیم ہونا اور سائنسی مضامین کا حیدرآباد دکن میں ترجمہ، مولوی عبدالحق کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔

۱۹۳۸ء میں وہ دہلی منتقل ہوگئے اور انجمن ترقی اردو کا دائرہ کار پورے ہندوستان میں محیط ہوگیا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی آگئے۔ جہاں انھوں نے اپنا مشن جاری رکھا اور اردو کالج قائم کیا۔ اردو کی خدمات کے سلسلہ میں علیگڑھ یونیورسٹی نے انھیں ۱۹۴۳ء میں آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ قوم نے ان کو

بابائے اردو کا خطاب دیا اور حکومت پاکستان نے ۱۹۵۹ء میں ' ہلال پاکستان' ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو ان کا انتقال ہوا۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

پاکستان میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۹ء تک صدر کے عہدہ پر رہے۔ انھوں نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور رائل ملٹری کالج سینڈ ہرسٹ میں تعلیم پائی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے ایوب خاں کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ان کو فوج میں شامل ہونے کی تلقین کی اور اس طرح ان کو ۱۹۲۸ء میں فوجی کمیشن مل گیا

وہ ۱۶ مئی ۱۹۰۷ء کو سرحد کے ایک نامور خاندان میں پیدا ہوئے۔ متحدہ ہندوستان میں برٹش آرمی میں مختلف عہدوں پر خدمات انجام دیں اور پاکستان بننے کے وقت وہ بریگیڈیر کے عہدہ پر تھے۔ ۱۷ جنوری ۱۹۵۱ء کو پاکستان کے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ محمد علی بوگرہ کی حکومت میں ۱۹۵۴ء ۱۹۵۵ء میں وزیر دفاع رہے اور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ملک میں مارشل لار کا نفاذ کرنے کے بعد صدر اور چیف مارشل لار ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا۔ انھوں نے ۸ جون ۱۹۶۲ء کو مارشل لار اٹھایا اور بنیادی جمہوریت کے نام پر دستور رائج کیا۔ ۱۹۶۵ء میں انتخابات کے ذریعہ صدر منتخب ہوئے۔ ان کے زمانہ میں صنعت میں کافی ترقی ہوئی مگر ان کے دور میں مشرقی پاکستان میں حالات خراب ہونے شروع ہوگئے اور ملک کے دونوں حصوں میں ان کے خلاف تحریک شروع ہوگئی۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو انھوں نے جنرل یحییٰ خاں کو صدارت سونپ دی۔ اس کے بعد انھوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور اپریل ۱۹۷۴ء میں انتقال کیا وہ علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے پیٹرن بھی تھے۔

امیر احمد خاں۔ راجہ محمود آباد

قائداعظم کے نوجوان ساتھیوں میں راجہ محمود آباد کا نام سرفہرست ہے۔ وہ ۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے اور بہت کم عمری میں سیاست میں داخل ہوئے

اور ۱۹۳۷ء کے مسلم لیگ کے لکھنؤ کے اجلاس میں استقبالیہ کمیٹی کے صدر ہوئے۔ اس اجلاس میں نوعمر ہونے کے باوجود انھوں نے انتھک کوشش کی اور زیادہ تر اخراجات خود برداشت کیے۔

ان کو علیگڑھ یونیورسٹی سے بہت محبت تھی اور کافی عرصہ تک وہ یونیورسٹی کے ٹرسٹی رہے۔ وہ اکثر قائداعظم کے ساتھ علیگڑھ تشریف لاتے تھے۔ وہ کافی عرصہ تک مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر رہے جس کا محور علیگڑھ تھا۔ انھوں نے مسلم نیشنل گارڈ قائم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

راجہ محمود آباد ان اکابرین میں سے تھے جنھوں نے تن من دھن سے مسلم لیگ کی بے لوث خدمت کی اور کبھی سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا۔ وہ پاکستان بننے کے کچھ برسوں بعد پاکستان آئے مگر پاکستان کی سیاست سے بددل ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی گزاری اور کافی عرصہ بیرونِ ملک رہے۔ ان کی بے لوث اور بے غرض سیاست کی وجہ سے آج تک ان کو تاریخ دان بڑی عزت اور احترام سے یاد کرتے ہیں۔

جناب اختر حسین

پاکستان میں مغربی پاکستان کے گورنر کے عہدہ تک پہنچے۔ آپ نے علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی اور انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ پاکستان میں اہم عہدوں پر کام کیا اور ریٹائرمنٹ کے بعد انجمن ترقی اردو کے تاحیات صدر رہے۔

لیفٹننٹ جنرل اظہر خان

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کر کے انڈین آرمی میں کمیشن لیا۔ پاکستانی فوج میں لیفٹننٹ جنرل کے عہدہ تک پہنچے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کئی سال تک سرحد کے گورنر رہے۔ آج کل وہ جمعیۃ العلماء پاکستان کے ایک لیڈر ہیں۔

چوہدری محمد علی

چوہدری محمد علی ۵۶-۱۹۵۵ء میں پاکستان کے وزیراعظم رہے۔ وہ ۱۵ جولائی

سنہ ۱۹۰۵ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۹۲۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم، ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں وہ انڈین آڈٹ سروس میں داخل ہوئے اور غیر منقسم ہندوستان میں مالیات کے شعبہ میں اعلیٰ عہدوں پر تعینات رہے۔

قائدِ اعظم کی ہدایت پر وہ علیگڑھ یونیورسٹی کی مالیاتی کمیٹی کے ممبر ہوئے اور دور رس اصلاحات کیں۔ عبوری حکومت میں لیاقت علی خاں کی بھرپور مدد کی اور ۴۸-۱۹۴۷ء کا مشہور بجٹ بہت حد تک چودھری محمد علی کی کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ سکریٹری جنرل کے عہدہ پر فائز ہوئے اور سنہ ۱۹۵۱ء سے سنہ ۱۹۵۵ء تک ملک کے وزیر خزانہ رہے۔ ۱۱ اگست سنہ ۱۹۵۵ء کو انھوں نے وزیر اعظم کا حلف اٹھایا اور ۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء کو استعفیٰ دے دیا۔ انھوں نے کچھ دنوں تک نظام اسلامی پارٹی کی سربراہی کی اور اس کے بعد عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

عبدالرحمٰن صدیقی

تحریکِ خلافت کے مشہور رہنما سنہ ۱۸۸۷ء میں بمبئی میں پیدا ہوئے ان کے آباء اجداد کا تعلق بنگال سے تھا۔ انھوں نے علیگڑھ سے ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے اور بیرسٹری پاس کرنے کے بعد ہندوستان واپس آ گئے۔ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر انصاری کے ہمراہ صحافت اور سیاست میں کام کیا اور آخر تک ان کے معتمد خاص رہے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں وہ کلکتہ کے میئر ہوئے اور پھر مورننگ نیوز کے ایڈیٹر رہے۔ انھوں نے فلسطین کے سلسلہ میں بہت سی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر وہ بنگال اسمبلی کے ممبر رہے اور سنہ ۱۹۴۶ء میں انتخاب میں پھر کامیاب ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد کچھ عرصہ کے لیے وہ مشرقی پاکستان کے گورنر رہے۔

خان عبدالغفار خاں

خدائی خدمت گار لیڈر جن کا تعلق چارسدہ کے مشہور پٹھان خاندان سے تھا بادشاہ کے نام سے جانے گئے سدہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم پشاور میں ہوئی۔ اس کے بعد ایک سال تک علیگڑھ میں تعلیم پائی۔ وہاں سے واپسی کے بعد سیاست میں داخل ہوئے اور خلافت تحریک میں حصہ لیا اور اس کے بعد آزادی تک کانگریس کے ساتھ رہے۔ ۱۹۳۰ء میں خدائی خدمت گار تنظیم شروع کی جس نے صوبہ سرحد میں کافی مقبولیت حاصل کی۔ انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزارا اور گاندھی جی کے خاص معاونوں میں سے رہے۔ مئی ۱۹۴۶ء کی شملہ کانفرنس میں کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ آزادی سے کچھ دنوں پہلے ان کے تعلقات کانگریس سے کشیدہ ہوگئے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی انھوں نے ایجی ٹیشن جاری رکھا اور کئی مرتبہ جیل گئے۔

۱۹۸۷ء میں ان کا انتقال ہوا اور افغانستان میں سپرد خاک کیے گئے۔ مسلمانوں کی اکثریت ان کے کردار سے ہمیشہ نالاں رہی مگر اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ انھوں نے بڑی سادہ زندگی گزاری اور سیاسی اختلافات کے باوجود سرحد میں بہت سماجی کام کیا۔ ان کے صاحبزادے خاں عبدالولی خان اس وقت پاکستانی سیاست میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

شعیب قریشی

۱۸۹۲ء میں رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ علیگڑھ یونیورسٹی سے ایم اے، ایل ایل بی کی امتحان پاس کیا اور اس کے بعد آکسفورڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد وطن واپس آکر خلافت تحریک میں حصہ لیا اور جیل گئے۔ ان کی شادی مولانا محمد علی جوہر کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ صحافت سے ان کا کافی دنوں تک تعلق رہا۔ اس کے بعد انڈین نیشنل کانگریس کے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک سکریٹری رہے۔ اور نہرو کمیٹی کے خلاف احتجاج کے طور پر کانگریس سے استعفیٰ دیدیا۔

رسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی ۱۹۳۴ء میں مسلم لیگ سے بھی علیحدگی ا
ختیار کرکے ریاست بھوپال میں ۱۹۴۸ء تک وزیر رہے۔ اس کے بعد پاکستان
گئے اور ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء تک روس اور ہندوستان میں پاکستان کے سفیر
رہے۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں مرکز میں وزیر اور پھر عراق میں سفیر کا عہدہ سنبھالا۔
شعیب قریشی ان پاکستانی رہنماؤں میں سے تھے جنھوں نے صحافت، سیاست
سفارت میں اعلیٰ خدمات انجام دیں۔

ان عبدالقیوم خاں

خان عبدالقیوم خاں نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے آزادی کے بیے
نقدر خدمات انجام دیں۔ ۱۶ر جولائی ۱۹۰۱ء کو صوبہ سرحد کے ایک کشمیری خاندان
پیدا ہوئے۔ انھوں نے اسلامیہ کالج پشاور، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، لندن اسکول
اکانومکس اور لنکن ان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد پشاور
وکالت شروع کی۔ وہ ۱۹۴۵ء تک کانگریس کے ساتھ رہے اور کچھ دنوں تک
اسمبلی کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر رہے۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے مسلم لیگ
شمولیت اختیار کی اور تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ صوبہ سرحد کے
ستان ریفرنڈم میں ان کا کردار بہت اہم تھا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ تقریباً
ال تک صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ رہے۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں حکومت پاکستان میں وزیر
۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے بعد ان کے سیاست میں حصہ لینے پر پابندی
ی گئی۔ ۱۹۶۹ء میں انھوں نے قائدِ اعظم مسلم لیگ کی بنیاد رکھی اور ایک سال
لم لیگ (قیوم گروپ) قائم کی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت میں پھر مرکزی وزیر
ہوئے۔ ۱۹۷۷ء کے بعد انھوں نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

یسر رضی الدین صدیقی

ریاضی کے پروفیسر جنھوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ ۲ر جنوری ۱۹۰۸ء
ہوئے اور جرمنی میں ریاضی میں ڈاکٹریٹ کی۔ وہ حیدرآباد دکن میں ریاضی کے

پروفیسر اور وائس چانسلر رہے۔ دو سال تک انھوں نے علیگڑھ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دیں۔

پاکستان آنے کے بعد وہ پشاور، اسلام آباد اور سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ انھوں نے پاکستان میں سائنس کی بہت خدمت کی ہے اور بہت سے تحقیقی اداروں کے سربراہ رہے ہیں۔ وہ امریکہ میں کولمبیا اور مڈویسٹ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ ان کی خدمات کے صلہ میں حکومت پاکستان نے انھیں 'ہلال امتیاز' کے خطاب سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر عمر حیات ملک

پاکستان کے مشہور ماہر تعلیم ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے اور لاہور میں ابتدائی تعلیم کے بعد علیگڑھ سے ایم اے اور وکالت کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے ایم ایس سی، جرمنی اور گلاسکو سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ملک واپس آنے کے بعد بھی علیگڑھ سے ان کی دلچسپی برقرار رہی اور وہ کئی کمیٹیوں کے ممبر رہے۔ وہ اسلامیہ کالج پشاور کے پروفیسر ریاضی ہوئے۔ اور ۱۹۴۳ء سے پاکستان بننے کے بعد تک اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے اس کے بعد وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں انڈونیشیا میں ملک کے سفیر بنے اور اس کے بعد ۵۲-۱۹۵۵ء میں جرمنی میں سفیر رہے۔

ڈاکٹر عمر حیات ملک کا شمار پاکستان کی ان ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے تعلیم، سیاست اور سفارت میں ملک کا نام روشن کیا۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی

پاکستان کے مایہ ناز سائنس داں جو ۹۵ سال کی عمر ہوتے ہوئے بھی اب تک لیبورٹری میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اکتوبر ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں ابتدائی تعلیم کے بعد علیگڑھ گئے جہاں سے ۱۹۱۹ء میں انھوں نے سائنس میں

ڈگری لی۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن اور جرمنی گئے جہاں سے انھوں نے ۱۹۲۷ء میں ڈاکٹریٹ کی۔ ملک واپس آنے کے بعد وہ حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج میں تحقیقی ادارے سے منسلک ہوگئے۔ ۱۹۴۰ء میں ہندوستان کے سائنسی تحقیق ادارے میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۴۷ء کے اوائل میں ہندوستان میں کیمیاوی ادارہ کی تحقیق کے ڈائرکٹر ہوئے۔

پاکستان آنے کے بعد سے انھوں نے ۱۹۵۱ء میں سائنسی تحقیق ادارہ قائم کیا۔ ۱۹۶۱ء میں وہ پاکستان نیشنل کونسل کے چیرمین بنے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ہوئے اور آج کل حسین ابراہیم جمال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں۔ اس ادارہ میں انھوں نے لاتعداد سائنس دانوں کو ریسرچ کرائی ہے۔ ان کی خدمات کے صلہ میں حکومتِ پاکستان نے انھیں ہلالِ امتیاز کا خطاب دیا ہے۔

پیر الٰہی بخش

پاکستان بننے کے بعد صوبہ سندھ کے پہلے وزیر بنے اور مہاجرین کی آبادکاری میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے علیگڑھ میں تعلیم پائی اور وطن واپس آکر وکالت شروع کی۔ وزیر اعلیٰ بننے سے پہلے وہ کئی مرتبہ اسمبلی کے ممبر اور وزیر رہے۔ وہ ہمیشہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہے۔

غلام محمد ولی محمد بھرگری

ان کا تعلق سندھ کی ایک مشہور فیملی سے تھا۔ وہ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے اور حیدرآباد اور کراچی میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علیگڑھ کے اسکول سے میٹرک پاس کیا اور بعد میں لندن سے لنکن ان سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا انھوں نے حیدرآباد میں وکالت شروع کی اور اس کے بعد سے ۱۹۰۹ء سے بمبئی اسمبلی کے ممبر رہے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ ہندوستان کی کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر ہوئے۔

مگر کچھ دنوں کے بعد احتجاج کر کے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۲۴ء میں سینٹرل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور اسی سال انتقال کیا۔

غلام محمد بھرگڑی ان ناموران سندھ میں سے تھے جنھوں نے بے لوث خدمت کی اور حکومت وقت سے ہمیشہ ٹکر لی۔ وہ شروع میں کانگریس سے منسلک تھے اور خلافت تحریک میں عملی حصہ لیا۔ اس کے بعد وہ مسلم لیگ میں شریک ہو گئے۔ وہ پونہ کے اجلاس میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے صدر رہے۔

غوث بخش بزنجو

بلوچستان کے مشہور انقلابی رہنما نے علیگڑھ اسکول میں تعلیم حاصل کی وہ ایک ہر دلعزیز طالب علم اور فٹ بال کے مشہور کھلاڑی تھے۔ پاکستانی سیاست میں انھوں نے بھرپور کردار ادا کیا اور کئی دفعہ جیل بھی گئے وہ سیاست میں اصول پر سودا کرنے کے قائل نہ تھے۔ بلوچستان میں کچھ عرصہ گورنر بھی رہے۔

میجر جنرل فضل مقیم

علیگڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور آرمی کمیشن پا کر میجر جنرل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ فوج میں انھوں نے کئی اہم عہدوں پر کام کیا اور مشرقی پاکستان کے ڈویژنل کمانڈر بھی رہے، کافی عرصہ تک وہ سعودی عربیہ میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔

اے ٹی ایم مصطفےٰ

آپ کا تعلق بنگال سے تھا۔ علیگڑھ میں ایک ہر دلعزیز طالب علم تھے اور یونین کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ بنگال واپس جا کر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور مرکزی وزیر بنے۔ ڈھاکہ میں علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو فعال بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

پیر صاحب پگارہ

سینئر پیر شاہ مردان شاہ پیر پگارہ پاکستان کے ان سیاستدانوں میں سے ہیں

جنھوں نے اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ان کے والد پیر پگارہ ان شہیدوں میں سے ہیں جنھوں نے انگریزوں سے مقابلہ کیا اور ملک اور قوم کی محبت میں جان دے دی۔
پیر صاحب پگارہ نے ابتدائی تعلیم و تربیت علیگڑھ میں ڈاکٹر ضیاءالدین کی سرپرستی میں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ لندن چلے گئے اور پاکستان آنے کے بعد اپنی گدی سنبھالی، کچھ دنوں بعد انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ان کے مریدوں نے ہر آڑے وقت میں ان کی ہدایت پر ملک و قوم کی خدمت میں اہم کردار ادا کیا۔ انھیں علیگڑھ والوں سے بہت محبت ہے اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے منصوبوں میں انھوں نے ہمیشہ تعاون کیا ہے۔

فدا محمد خاں

آپ ۲۴ رنومبر ۱۹۱۹ء کو پشاور میں پیدا ہوئے ایڈورڈس کالج پشاور سے بی اے کی ڈگری لی اس کے بعد علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ پشاور واپس آنے کے بعد انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور سرحد میں خدائی خدمت گاروں کے مقابلہ میں مسلم نیشنل گارڈ کی بنیاد ڈالی وہ ۱۹۴۵ء میں پشاور مسلم لیگ کے صدر ہوئے اور سرحد کے ریفرنڈم میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان بننے کے بعد سے اب تک وہ مسلم لیگ سے وابستہ ہیں اور انھوں نے کبھی پارٹی تبدیل نہیں کی۔ انھوں نے کئی مرتبہ اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کی۔
وہ ۱۹۶۴ء میں پاکستان اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ۱۹۷۸ء میں مرکزی وزیر رہے اور ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۴ء تک مجلس شوریٰ کے ممبر رہے۔ ۱۹۸۵ء میں وہ سرحد سینیٹ کے لیے منتخب ہوئے۔ ۲۶ راگست ۱۹۸۶ء سے ۱۵ ارجون ۱۹۸۸ء تک وہ سرحد کے گورنر رہے۔

حسن محمود

جناب حسن محمود کا تعلق بہاولپور سے تھا۔ آپ نے علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی اور ریاست بہاولپور اور مغربی پاکستان میں وزارت کے عہدہ پر رہے۔

الیف ایم خاں

علیگڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ریلوے میں سروس شروع کی پاکستان آنے کے بعد چیئرمین ریلوے بورڈ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور اس کے بعد کچھ دنوں تک مرکزی وزیر رہے۔

مولانا عبدالعزیز میمن

علیگڑھ میں شعبۂ عربی کے چیئرمین رہے۔ پاکستان آکر اپنی ادبی سرگرمیوں کو برقرار رکھا۔ وہ عربی زبان میں بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔

جسٹس انعام اللہ

علیگڑھ کے تعلیم یافتہ مشہور ماہر قانون جناب انعام اللہ مغربی پاکستان کے چیف جسٹس کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ اپنی قانونی مصروفیات کے علاوہ انھوں نے سماجی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا اور کافی زمانہ تک علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے عہدہ دار رہے۔

سردار شوکت حیات خاں

پاکستان کے ایک معمر سیاستداں ہیں۔ ان کا تعلق پنجاب کے مشہور خاندان سے ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے ان کے والد سر سکندر حیات خاں نے پنجاب کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ سردار شوکت حیات خاں ۲۴ ستمبر ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم مسلم یونیورسٹی اسکول علیگڑھ میں حاصل کرکے گورنمنٹ کالج لاہور سے بقیہ تعلیم مکمل کی اور ۱۹۳۷ء میں فوج میں کمیشن حاصل کرکے دوسری عالمی جنگ میں عملی حصہ لیا۔ اس زمانہ میں کچھ عرصہ کے لیے وہ جنگی قیدی بھی رہے۔ فوج سے میجر کے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے سیاست میں قدم رکھا اور ۴۳-۱۹۴۲ء میں پنجاب کے وزیر رہے اس زمانہ میں یونینسٹ وزیراعلیٰ

(خضر حیات خاں) کے ساتھ کام کرنے کے باوجود قائداعظم کے پیروکار رہے اور
اسی پاداش میں انھیں وزارت سے علیحدہ ہونا پڑا۔ وہ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے
ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے سرگرم
رکن رہے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر بنے مگر بہت
جلدی ان کے مسلم لیگ سے تعلقات کشیدہ ہوگئے جس کی وجہ سے ۱۹۵۰ء میں
میاں افتخار الدین کے ساتھ ان کو مسلم لیگ چھوڑنی پڑی۔ اس کے بعد انھوں نے
کونسل مسلم لیگ میں شرکت کرلی اور ۱۹۶۶ء میں ایوب خاں کی حکومت کے دوران
جیل میں رہے۔ بعد میں انھوں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی مگر بھٹو کے
آخری دنوں میں ان کو اس پارٹی سے علیحدہ کر کے ۲۹ اپریل ۱۹۷۷ء کو گرفتار کرلیا
گیا۔ اس کے بعد عملاً سیاست سے دستبردار ہوگئے اور اب پنجاب میں خاموش
زندگی گزار رہے ہیں۔

جسٹس زیڈ ایچ لاری

علیگڑھ کے ہونہار طالب علم رہے اور یونین کے عہدہ دار بھی۔ پاکستان
میں وکالت شروع کی اور پھر ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ ہائی کورٹ کے استعفیٰ کے
بعد سیاست میں حصہ لیا۔ آپ علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے بہت سرگرم
ممبر رہے ہیں۔

جسٹس غلام علی فیروز نانا

سندھ ہائی کورٹ کے جج اور ایک ہر دلعزیز سماجی شخصیت۔ آپ نے علیگڑھ
میں تعلیم حاصل کر کے کراچی میں وکالت شروع کی اور ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت
سے ریٹائر ہوئے۔

جسٹس زیڈ۔ اے چنا

آپ کا تعلق سندھ کے تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے آپ نے علیگڑھ میں تعلیم

حاصل کی اور سندھ میں وکالت شروع کی۔ سندھ ہائی کورٹ کے جج بنے اور ریٹائرمنٹ
کے بعد بھی ٹریبونل کے جج رہے۔

الطاف علی بریلوی

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہیں سکونت اختیار کی اور آل انڈیا مسلم
ایجوکیشنل کانفرنس سے منسلک ہوگئے۔ پاکستان آکر ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی
اور اخیر وقت تک اس کی خدمت کرتے رہے۔ آپ کی کاوشوں سے سرسید گرلز
کالج کراچی میں قائم ہوا۔

جسٹس مولوی مشتاق حسین

علیگڑھ سے وکالت پاس کی۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور میں پریکٹس شروع
کی۔ اس کے بعد لاہور ہائی کورٹ کے جج بنے اور چیف جسٹس کے عہدہ سے ریٹائر
ہوئے۔ لاہور میں ہی ان کا انتقال ہوا۔

ظفرالحسن لاری

علیگڑھ میں تعلیم پائی اور انڈین سول سروس میں داخل ہوئے۔ پاکستان آ
اہم عہدوں پر رہے اور چیرمین پی آئی اے کی حیثیت سے اس ادارہ کو مستحکم کیا۔

پروفیسر اے بی اے حلیم

پروفیسر حلیم ان مایہ ناز اساتذہ میں سے ہیں جو علیگڑھ اور اس کے بعد پاکستا
میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آکسفورڈ سے تعلیم مکمل کرنے کے
بعد ۱۹۲۱ء میں انھوں نے علیگڑھ یونیورسٹی میں شمولیت اختیار کی اور بہت
جلد تاریخ کے پروفیسر ہوگئے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۴ء تک وہ یونیورسٹی کے پرووائس
رہے۔ ان کا یونیورسٹی سے اتنا طویل تعلق رہا کہ ان کے عہد میں کم سے کم دو نسلوں
نے تعلیم حاصل کی اور اکثر لوگ انھیں پروفیسروں کے پروفیسر کہتے تھے۔ درس وتدریس

کے علاوہ انھوں نے یونیورسٹی کے انتظامی معاملات میں غیر معمولی دلچسپی لی۔
آزادی کے بعد وہ پاکستان منتقل ہو گئے اور سندھ اور کراچی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جہاں وہ کافی عرصہ تک وائس چانسلر رہے۔

کموڈور مقبول الرب

علیگڑھ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایئر فورس میں شمولیت اختیار کی اور پاکستان کے ہوائی بیڑہ کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ترکی میں پاکستان کے سفیر بنے۔

لیفٹیننٹ جنرل سعید قادر

آج کل آپ سینیٹ کے رکن ہیں۔ علیگڑھ میں اسکول میں تعلیم پائی۔ آرمی میں شرکت کے بعد پاکستان میں اہم عہدوں پر کام کیا۔ کئی دفعہ مرکزی وزیر رہے اور آج کل حکومت پاکستان کی پرائیویٹائزیشن کمیٹی کے سربراہ ہیں۔

میجر جنرل غلام عمر

آپ نے علیگڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آرمی میں شمولیت اختیار کی اور پاکستان میں میجر جنرل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ جنرل یحییٰ خاں کی حکومت میں مشیر کی حیثیت سے کام کیا اس کے بعد سے سماجی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور خاصی مدت تک انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے سربراہ رہے۔

جی اے مدنی

آپ کا تعلق میرٹھ کے ایک مشہور گھرانے سے تھا۔ آپ کے والد نواب اسمٰعیل خاں قائداعظم کے دست راست اور تحریک آزادی کے مخلص رہنما تھے۔ مدنی صاحب نے علیگڑھ میں تعلیم مکمل کر کے سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ آپ نے مشرقی و مغربی پاکستان میں اہم عہدوں پر کام کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سیاست میں

بھی حصّہ لیا اور اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

انور عادل

پاکستان سول سروس کے عہدہ دار جو سکریٹری کے عہدہ تک پہنچے۔ آپ نے علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد صوبائی سول سروس (یوپی) میں شمولیت اختیار کی اور پاکستان آنے کے بعد یہاں کی سول سروس کے لیے منتخب ہوئے۔

سید سعید جعفری

پاکستان کے سینیر سول سرونٹ سے سکریٹری کے عہدہ تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ آپ نے الٰہ آباد اور علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی اور انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ آپ پاکستان اور خصوصاً کراچی کے سماجی حلقوں میں بہت مقبول ہیں اور کئی فلاحی اداروں سے منسلک ہیں۔

میر غلام علی خان تالپور

سندھ کے مشہور لیڈر جن کے اجداد نے تالپور کے شاہی خاندان کی بنیاد رکھی تھی۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۰۹ء کو حیدرآباد سندھ میں پیدا ہوئے اور علیگڑھ میں میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد بمبئی سے بی اے کی ڈگری لی۔ انھوں نے سیاست کی ابتدا حیدرآباد ضلع لوکل بورڈ سے کی۔ جہاں وہ کئی سال تک صدر رہے۔ ۱۹۳۷ء میں سندھ اسمبلی کے ممبر ہوئے اور ۱۹۴۳ء تک پارلیمنٹری سکریٹری کے عہدہ پر رہے اس کے بعد سندھ میں وزیر ہوئے اور مسلم لیگ کے سرگرم کارکن کی حیثیت سے مسلم نیشنل گارڈ کو سندھ میں فعال بنایا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان دستور ساز اسمبلی کے ممبر بنے۔ وہ واحد ممبر ہیں جو متواتر چار حکومتوں میں مرکزی وزیر رہے (محمد علی بوگرہ ۱۹۵۵-۵۴ء، سہروردی ۱۹۵۷-۵۶ء اور چندریگر ۱۹۵۷ء اور فیروز خان نون ۱۹۵۷ء) اس کے بعد انھوں نے مسلم لیگ چھوڑ کر کچھ دنوں تک ری پبلکن پارٹی سے تعلق رکھا۔ ۱۹۶۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔

سیّد انور مسعود

سرسید کے خانوادہ سے ان کا تعلق ہے۔ وہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو علیگڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ کیمبرج اور لندن گئے۔ آزادی کے بعد وہ پاکستان منتقل ہو گئے اور کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ اس کے بعد وہ دوبئی منتقل ہو گئے جہاں وہ ایک بڑے کاروباری ادارہ سے منسلک ہو گئے۔ جہاں بھی وہ رہے علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے منسلک رہے اور بہت گراں قدر خدمات انجام دیں۔

مختار مسعود

علیگڑھ یونیورسٹی سے معاشیات میں فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کیا۔ آپ کے والد عطار اللہ صاحب یونیورسٹی میں استاد تھے۔ مختار مسعود صاحب نے پاکستان آ کر یہاں کی سول سروس میں شمولیت اختیار کی اور سکریٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے آپ کو ادبی ذوق شروع سے رہا اور کئی کتابیں اور مضامین لکھے جو بہت مقبول ہوتے۔ آج کل لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔

محمد وسیم

پاکستان کے پہلے ایڈوکیٹ جنرل جو قائداعظم کی درخواست پر یہاں آئے ان کا تعلق لکھنؤ کے ایک باعزت گھرانہ سے تھا جہاں وہ ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے انھوں نے علیگڑھ سے بی اے کیا اور پھر کیمبرج چلے گئے اور بیرسٹری پاس کر کے لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ یوپی کے ایڈووکیٹ جنرل ہو گئے۔ ان کا شمار یوپی کے مشہور وکیلوں میں ہوتا تھا۔

میجر جنرل شاہد حامد

آپ ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کالون تعلقدار اسکول لکھنؤ میں

حاصل کی اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علیگڑھ آ گئے دوسری جنگِ عظیم میں ان کو
کمیشن ملا اور سینڈ ھرسٹ میں ٹریننگ حاصل کی۔ انھوں نے برما کے محاذ جنگ
میں حصہ لیا اور اس کے بعد ہندوستان کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل آکن لیک
کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد انھوں نے ماسٹر جنرل
آرڈیننس اور ایڈ جوٹینٹ جنرل کے عہدہ پر کام کیا۔ انھوں نے مرکزی وزیر کی حیثیت
سے بھی کام کیا اور اطلاعات کلچر اور ٹورزم کا قلمدان ان کے پاس رہا۔ وہ کئی کتابوں
کے مصنف ہیں اور علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں غیر معمولی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔
وہ آج کل راولپنڈی میں قیام پذیر ہیں۔

بریگیڈیر گلزار احمد

علیگڑھ کے فارغ التحصیل بریگیڈیر گلزار احمد ایک ادبی شخصیت کے طور پر
پہچانے جاتے ہیں۔ فوج میں کئی اہم عہدوں پر رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی
پوری زندگی ادبی خدمت کے لیے وقف کردی۔

ڈاکٹر عشرت حسین عثمانی

آپ نے علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ لندن سے سائنس میں ڈاکٹریٹ کیا اور
انڈین سول سروس میں شمولیت کی۔ پاکستان میں آکر اعلیٰ ترین عہدوں پر کام کیا اور
(Energy Atomic Commission) کے پہلے چیئرمین بنے۔

گل جی اسماعیل

پاکستان کے مشہور آرٹسٹ گل جی نے علیگڑھ انجینئرنگ کالج سے انجینئرنگ
فرسٹ پوزیشن میں پاس کیا۔ کچھ دنوں کالج میں پڑھایا اور پھر پاکستان آکر آرٹسٹ
کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت پائی۔

خان بہادر انعام اللہ خاں

پنجاب کے مشہور چیف انجینئرنگ علیگڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ آپ نے مغربی

پاکستان میں سکریٹری پی ڈبلیو ڈی کی حیثیت سے کام کیا۔

پروفیسر شیخ امتیاز علی

پنجاب کے وائس چانسلر رہے۔ آپ نے علیگڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور پاکستان بننے کے بعد پنجاب میں پروفیسر ہوئے۔

نواب مشتاق احمد خاں

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی اور حیدر آباد دکن واپس جاکر سرکاری نوکری کی اور ریاست کے اعلیٰ ترین عہدوں پر پہنچے۔ پاکستان میں حیدر آباد دکن کے ایجنٹ جنرل رہے۔

خواجہ منظور حسین

علیگڑھ میں انگریزی کے استاد تھے۔ پاکستان آکر پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی سے منسلک ہوئے۔

پروفیسر میاں محمد شریف

آپ ۲۸ رفروری ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوئے اور الٰہ آباد اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد علیگڑھ میں ۱۹۱۷ء میں لیکچرار ہوئے۔ یونیورسٹی بننے کے بعد وہ ریڈر ہوئے اور ۱۸ سال تک ایس ایس ہال کے پرووسٹ رہے۔ وہ کافی عرصہ یونیورسٹی کورٹ اور اکاڈمک کونسل کے ممبر بھی رہے۔ ۱۹۳۷ء میں پرو وائس چانسلر کے عہدہ پر رہے۔ انھوں نے فلسفہ کی تعلیم میں ہندوستان میں منفرد انداز کی بنیاد ڈالی اور ملک کی فلاسفی کانگریس کے سرگرم رکن رہے۔ آزادی کے بعد وہ پاکستان منتقل ہوگئے جہاں وہ پرنسپل اسلامیہ کالج اور ڈائرکٹر اقبال اکاڈمی کے عہدوں پر رہے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے مسلم فلسفہ کی تاریخ پر ایک معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی۔

جناب زاہد حسین

پاکستان کے مشہور ماہر اقتصادیات آزادی سے پہلے کے پُرآشوب زمانہ میں علیگڑھ

یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ وہ کچھ دنوں ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر کے عہدہ پر رہے۔ پاکستان میں قائدِ اعظم نے ان کو اسٹیٹ بینک کا پہلا گورنر مقرر کیا جہاں انھوں نے تندہی سے کام کرکے ملک میں بینکاری کی بنیاد ڈالی۔

پروفیسر عبدالسّلام

پاکستان کے مایۂ ناز سائنس داں جن کو طبیعات میں تحقیق پر نوبل پرائز ملا۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کے شہر جھنگ میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں یونیورسٹی تعلیم کے بعد انھوں نے ۱۹۵۲ء میں کیمرج سے ڈاکٹریٹ کیا۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کی خدمات کے صلہ میں ۱۹۸۱ء میں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ ان کو ہمیشہ علیگڑھ یونیورسٹی سے دلچسپی رہی۔ آج کل وہ علیگڑھ ڈیوٹی سوسائٹی کے سرپرست ہیں۔

پروفیسر عبدالسلام کو دنیا کی بہت سی یونیورسٹیوں سے اعزازی ڈگری ملی ہے انھوں نے سائنس پر ۲۵۰ سے زیادہ مقالے لکھے ہیں اور دنیا کے متعدد اداروں سے منسلک ہیں۔ ۱۹۶۴ء سے وہ اٹلی کے مشہور تحقیقاتی ادارہ کے ڈائریکٹر ہیں۔

قاضی فضل اللہ

علیگڑھ کے فارغ التحصیل تھے اور سندھ واپس آکر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ کئی مرتبہ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور صوبائی وزیر رہے اس کے بعد وہ کچھ عرصہ سندھ کے وزیر اعلیٰ رہے۔

پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ

سندھ کے مشہور ماہرِ تعلیم جنھوں نے علیگڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں محکمۂ تعلیم میں ملازمت کی۔ پروفیسر ڈائریکٹر اور وائس چانسلر کے عہدوں پر رہے اس کے بعد سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور مرکزی وزیر بنے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

علیگڑھ میں تعلیم پائی اور وہیں شعبۂ اردو سے منسلک ہوگئے۔ پاکستان کراچی

یونیورسٹی میں چیئرمین اور پروفیسر بنے۔ یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد غیر معمولی خدمات کے صلہ میں پروفیسر ایمیرٹس ہوئے اور آج کل پاکستان میں اردو کی بے بہا خدمت میں مصروف ہیں۔ کئی دفعہ بیرون پاکستان وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے گئے۔ ان کا شمار ایک بین الاقوامی ماہر لسانیات کے طور پر ہوتا ہے۔ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے نکلنے والے ماہنامہ "تہذیب" کے اعزازی مدیر اعلیٰ ہیں۔ انھوں نے لاتعداد مقالے و مضامین لکھے ہیں اور اردو میں استادوں کے استاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔

پروفیسر عبدالمجید قریشی

پروفیسر عبدالمجید قریشی کا تعلق پنجاب کے شہر بھیرہ سے تھا۔ وہ ۱۹۰۳ء میں تعلیم کے لیے علیگڑھ گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۱۹ء میں علیگڑھ اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی میں شمولیت اختیار کی اور ریاضی میں پروفیسر ڈین سائنس فیکلٹی اور ایس ایس ہال کے پرووسٹ رہے۔ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری اور ڈیوٹی سوسائٹی کے انچارج بھی تھے اور انھیں کے زمانہ میں ڈیوٹی سوسائٹی کے فنڈ سے سرشاہ سلیمان ہال تعمیر ہوا۔

۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان منتقل ہو گئے اور اپنے آبائی شہر بھیرہ میں قیام پذیر رہے۔ جون ۱۹۸۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔

پروفیسر محمد عمرالدین

فلسفہ کے مشہور استاد اور فلسفۂ الغزالی کے مصنف ۱۹۰۲ء میں پنجاب کے ضلع فیروز پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں فلسفہ کے لیکچرر کی حیثیت سے یونیورسٹی میں شمولیت کی اور ۱۹۵۶ء میں پروفیسر ہوئے۔ وہ اپنے شاگردوں کی تعلیم میں ذاتی دلچسپی لیتے تھے۔ الغزالی کے فلسفہ پر انھوں نے بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ اس کے علاوہ ایس ایس ہال کے پرووسٹ اور علیگڑھ یونیورسٹی گیمس کمیٹی کے وائس چیئرمین بھی رہے۔ انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے ذاتی پراویڈنٹ فنڈ

سے دو منقل وظیفے دیے۔ اس کے بعد وہ پاکستان منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے ۱۴ راگست ۱۹۶۴ء کو وفات پائی۔

نواب حسن عسکری

ڈھاکہ کے نواب خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی جہاں وہ ایک ہر دلعزیز طالب علم کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے اور اسکول سے یونیورسٹی کی تعلیم تک علیگڑھ میں مقیم رہے۔ مشرقی پاکستان کے وزیر رہے اور بعد میں عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی۔

روئیداخاں

آج کل آپ حکومت پاکستان کے مشیر ہیں اور اس سے پہلے سکریٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ سول سروس میں شمولیت کے بعد انھوں نے اہم عہدوں پر کام کیا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم علیگڑھ میں حاصل کی تھی۔ آپ کا تعلق صوبہ سرحد سے ہے۔

میجر جنرل وجاہت حسین

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی اور فوج میں شمولیت اختیار کر کے میجر جنرل کے عہدہ تک پہنچے۔ فوج میں وہ اپنی انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے کافی مشہور ہوئے۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد آسٹریلیا میں پاکستان کے سفیر رہے۔

سعادت حسن منٹو

مشہور افسانہ نگار ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں پاکستان میں وفات پائی۔ انھوں نے علیگڑھ میں تعلیم پائی مگر کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ انھوں نے لاتعداد مضمون لکھے اور افسانے بھی لکھے جو لوگوں میں مقبول تو ہوئے مگر ان کے منفرد انداز کی وجہ سے ان پر تنقید بھی کی گئی۔ انھوں نے اردو ادب میں ایک نئے انداز کی بنیاد ڈالی۔

لیفٹیننٹ جنرل عبدالحمید

آپ علیگڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ انڈین آرمی میں کمیشن لیا اور پاکستان میں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ کورکمانڈر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ پاکستان میں آپ کا شمار باصلاحیت فوجی کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

چوہدری عبدالمتین

آسام کے مشہور مسلم لیگی رہنما جو قائداعظم کے معتمد خاص تھے علیگڑھ میں تعلیم پائی اور وطن واپس جاکر سیاست میں عملی حصہ لیا۔ سہلٹ کے ریفرنڈم میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ مشرقی پاکستان کے ان اہم لیڈروں میں سے تھے جنھوں نے آخر وقت تحریک پاکستان اور پاکستان کی یکجہتی کو بنگالی نیشنل ازم پر ترجیح دی۔

میجر جنرل علی نواز

ان کا تعلق فوج کے انجینئرنگ کے شعبہ سے تھا۔ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے میجر جنرل کے عہدہ پر پہنچے اور بعد میں واہ آرڈیننس فیکٹری کے چیئرمین ہوئے۔ آپ سماجی حلقوں میں بہت مقبول ہیں اور راولپنڈی اسلام آباد میں علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو فعال بنانے میں ان کا بہت اہم کردار ہے۔

کموڈور ایس بی سلیمی

سنہ ۱۹۴۰ء میں معاشیات میں علیگڑھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور سنہ ۱۹۴۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ پاکستان نیوی میں کموڈور کے عہدہ تک پہنچے اور ڈپٹی چیف نیول اسٹاف رہے اس کے بعد ڈائریکٹر جنرل Port Shiping اور سنہ ۱۹۷۶ء سے سنہ ۱۹۷۸ء تک بلغاریہ میں پاکستان کے سفیر رہے۔ آج کل وہ علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سرگرم رکن ہیں اور علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کی انتظامی کمیٹی کے کنوینر ہیں۔ آپ کو ستارہ قائداعظم کا اعزاز بھی ملا۔

بریگیڈیئر سجاد حسین

آپ آج کل علیگڑھ اولڈ بوائز کے وائس پریذیڈنٹ اور مالیاتی کمیٹی کے کنوینر ہیں۔ علیگڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آرمی میں کمیشن لیا اور پاکستان آنے کے بعد اہم عہدوں پر فائز رہے۔ آپ پاکستان کوسٹ گارڈ کے سربراہ رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کافی دن تک گورنر کی معائنہ ٹیم کے چیئرمین رہے۔

بریگیڈیئر قمر السلام خاں

علیگڑھ سے بی اے کیا اور پاکستان آکر ۱۹۵۱ء میں آرمی کمیشن لیا۔ بریگیڈیئر کے عہدہ تک پہنچے اور ریٹائرمنٹ کے بعد حکومت سندھ میں ڈائریکٹر جنرل رہے۔ ان کی فوجی خدمات کے صلہ میں انھیں ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔

آج کل وہ علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے وائس پریذیڈنٹ اور علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کی مالیاتی کمیٹی کے کنوینر ہیں۔

ڈاکٹر اے ٹی خان

۱۹۴۵ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے سول انجینئرنگ میں ڈگری لی۔ پاکستان آکر ۱۹۵۸ء میں ایم آئی ٹی سے ایم ایس اور Leeds سے ڈاکٹریٹ کی۔ آپ چھ سال کراچی میں انجینئرنگ یونیورسٹی میں وائس چانسلر رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اسی یونیورسٹی کے ایمریٹس پروفیسر رہے۔ آپ علیگڑھ بوائز ایسوسی ایشن کی قائم کردہ انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں اکاڈمک کمیٹی کے کنوینر ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر میتھومین

انگلستان کے مشہور فنی تعلیم کے ماہر اور الیکٹریکل انجینئر علیگڑھ انجینئرنگ کالج کے پرنسپل تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ حکومت کے فنی تعلیم کے مشیر ہوئے اور اپنے دور میں کئی انجینئرنگ اداروں کی بنیاد ڈالی۔ ریٹائرمنٹ ہونے کے بعد

لندن منتقل ہو گئے ۔

پروفیسر آر بتھ نوٹ

علیگڑھ انجینئرنگ کالج میں شعبہ سول انجینئرنگ کے چیئرمین اور بعد میں پرنسپل رہے ۔ پاکستان بننے کے بعد سول انجینئرنگ کے بھی شعبہ میں کئی اداروں کے سربراہ رہے ۔

مسعود زیدی

علیگڑھ کے مایہ ناز ہردلعزیز طالب علم جن کی شخصیت ہر لحاظ سے انجمن تھی ۔ علیگڑھ میں پیدا ہوئے ۔ میر ولایت علی صاحب کے فرزند تھے ۔ جن کا تعلق علیگڑھ میں درس وتدریس سے تھا ۔ علیگڑھ سے ایم اے کیا ۔ ہاکی کے کپتان رہے اس کے بعد پانی پت چلے گئے جہاں انھوں نے اپنا کاروبار شروع کیا ۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور آگئے اور اپنی باقی زندگی لاہور میں علیگڑھ کے اداروں کے لیے وقف کردی ۔ ان کی باغ وبہار شخصیت اور علیگڑھ والوں سے بے پناہ محبت کی وجہ سے علیگڑھ کا ہر پرانا طالب علم ان کا گرویدہ تھا ۔ ان کی کوششوں سے لاہور میں علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن فعال ہوئی اور اس کے تحت کئی تعلیمی ادارے قائم ہوئے ۱۹۹۰ء میں ان کا لاہور میں انتقال ہوا ۔

ڈاکٹر امیر حسن صدیقی

علیگڑھ میں اسلامک ہسٹری کے استاد رہے اور پاکستان آکر کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدہ تک پہنچے ۔ وہ ایک مشہور ماہرِ تعلیم تھے اور کراچی یونیورسٹی کے قیام میں اہم کردار ادا کیا ۔

غلام فاروق

غلام فاروق ۱۹۰۱ء میں مدنا پور میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۶ء میں علیگڑھ میں داخلہ لیا اور وہاں سے ۱۹۲۰ء میں بی اے کی ڈگری لی ۔ اس کے بعد انھوں نے ریلوے میں ملازمت کرلی اور جنرل منیجر کے عہدہ تک پہنچے ۔

پاکستان بننے کے بعد انھوں نے کئی صنعتی اور مالیاتی اداروں کی سربراہی کی۔ وہ مرکزی حکومت میں وزیر اور سینیٹ کے ممبر بھی رہے۔ غلام فاروق کا نام ان سرکاری ملازموں کی فہرست میں آتا ہے جنھوں نے پاکستان بننے کے بعد اپنی انتھک کوششوں سے اقتصادی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ آخری زمانہ میں انھوں نے نجی شعبہ میں کئی صنعتیں قائم کیں۔ ۱۹۹۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔

خواجہ عبدالوحید

علیگڑھ کے مایہ ناز طالب علم جنھوں نے کراچی میں علیگڑھ اولڈ بوائز ایسو سی ایشن کی بحیثیت صدر بے پناہ خدمت کی۔ علیگڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ پاکستان میں سرکاری ملازمت میں آئے اور کئی اداروں میں اہم عہدوں پر متمکن رہے۔ ان کا شمار پاکستان میں سنجیدہ محنتی اور فرض شناس افسروں میں ہوتا تھا۔ ان کی بیگم نے بھی علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی تھی اور دونوں کو علیگڑھ سے بے پایاں محبت تھی۔ خواجہ صاحب نے علیگڑھ اولڈ بوائز ہاؤسنگ سوسائٹی کے قیام میں فعال کردار ادا کیا۔

آغا غلام نبی پٹھان

ان کا تعلق سندھ کے مشہور خاندان سے ہے۔ آزادی سے پہلے علیگڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پائی واپس آکر سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کیا۔ کئی دفعہ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور حکومت سندھ میں وزیر رہے۔

ڈاکٹر افضال قادری

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کر کے (Zoology) کے استاد بنے اور لندن سے ڈاکٹریٹ کیا۔ پاکستان آنے کے بعد کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے اپنی نگرانی میں بہت سے طالب علموں کو ریسرچ کی طرف مائل کیا ان کے بہت سے شاگرد اس شعبہ میں گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں

اور ڈاکٹر قادری کی بے لوث خدمت کے مدّاح ہیں۔

پروفیسر شیخ محمد رشید

علیگڑھ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر اور پرووسٹ رہے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء کے پُر آشوب زمانہ میں یونیورسٹی کی بہت خدمت کی۔ ان کی لاتعداد شاگردان کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان آگئے اب کراچی میں مقیم ہیں اور اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے گوشہ نشین ہیں۔

پروفیسر عبدالرحمٰن حنفی

مشہور ریاضی داں اور علیگڑھ انجینئرنگ کالج کے ہردلعزیز استاد ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ علیگڑھ یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم ایس سی کیا اور کچھ دنوں بعد انجینئرنگ کالج کے شعبہ ریاضی سے منسلک ہوگئے۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان منتقل ہوگئے اور کراچی یونیورسٹی میں شعبہ ریاضی کے چیرمین اور پروفیسر کے عہدہ سے ۱۹۷۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۳ سال تک وہ سعودی عربیہ میں ریاض انجینئرنگ کالج میں استاد رہے۔

وہ پاکستان ریاضی ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے اور بین الاقوامی حلقوں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ آج کل وہ کراچی میں مقیم ہیں اور گاہے گاہے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کو ماہرانہ رائے دیتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر ریاض الاسلام

علیگڑھ میں تعلیم پائی اور پھر یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں استاد کی حیثیت سے شمولیت کی۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے اور پروفیسر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ ان کو تدریسی خدمات کے صلہ میں کراچی یونیورسٹی نے ایمریٹس بنایا۔ اب تک وہ تحقیقی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی برصغیر کے مشہور شاعر تھے۔ وہ ۱۴ دسمبر ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوئے۔ آگرہ اور علیگڑھ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی مگر اپنی باقاعدہ تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ ۱۹۲۶-۲۴ء میں حیدرآباد دکن میں اردو کے ادارہ ترجمہ میں کام کیا۔
وہ ایک انقلابی شاعر تھے اور اُردو کو نئے انداز سے روشناس کرایا۔ وہ ۱۹۵۶ء میں پاکستان منتقل ہوئے اور آخر وقت تک برصغیر کے بلند پایہ شاعروں میں شمار ہوتے رہے۔

ظہیر الدّین لعل میاں

بنگال کے مشہور لیڈر جو پاکستان میں مرکزی وزیر رہے علیگڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ڈھاکہ میں علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے قیام میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔

خان حبیب اللہ خاں

سرحد کے مشہور لیڈر جو کئی مرتبہ پاکستان میں مرکزی اور صوبائی وزیر رہے۔ علیگڑھ کے مایہ ناز طالب علم تھے۔ پاکستان آکر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔

خورشید حسن میر

راولپنڈی کے مشہور وکیل علیگڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ پاکستان آکر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور بھٹو حکومت میں مرکزی وزیر رہے۔

غفار پاشا

علیگڑھ میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ پاکستان آکر کچھ دن ملازمت کی اور پھر کاروبار میں داخل ہوئے۔ اسمبلی کے ممبر ہوئے اور مغربی پاکستان میں بلدیات کے وزیر رہے۔

مبین الحق صدیقی

علیگڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے اور سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ مغربی پاکستان اسمبلی میں اسپیکر رہے۔

بی اے ہاشمی

علیگڑھ کے فارغ التحصیل کراچی یونیورسٹی کے ابتدائی دور میں وائس چانسلر رہے۔

ابراہیم جلیس

ملک کے مشہور صحافی اور مزاح نگار ابراہیم جلیس نے علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی، اپنے وطن حیدرآباد دکن واپس گئے، اور اس کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے، جہاں انھوں نے اردو کے کئی اخباروں میں باقاعدہ کالم لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔

ڈاکٹر احسان رشید

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے صاحبزادے ہیں۔ انھوں نے علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں کراچی یونیورسٹی میں شمولیت کی۔ وہ کافی عرصہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اردن میں پاکستان کے سفیر رہے۔

احمد علی خاں

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی اور پاکستان منتقل ہونے کے بعد صحافت سے وابستہ ہو گئے۔ آج کل وہ پاکستان کے سب سے بڑے انگریزی اخبار ڈان کے ایڈیٹر ہیں۔

سردار خاں

بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر سردار خاں نے ابتدائی تعلیم علیگڑھ میں حاصل کی۔

عترت حسین زبیری

انگریزی زبان کے مشہور استاد اور علیگڑھ کے تعلیم یافتہ چٹا گانگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔

شیخ تیمور

سرحد کے مشہور ماہرِ تعلیم اور علیگڑھ کے تعلیم یافتہ پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔

پروفیسر طاہر حسین

پروفیسر طاہر حسین جو آزاد کشمیر میں مظفر آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے علیگڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔

پروفیسر نبی بخش بلوچ

صوبہ سندھ کے مشہور ماہرِ تعلیم اسلام آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے انھوں نے ابتدائی تعلیم علیگڑھ میں حاصل کی تھی۔

ڈاکٹر معصوم علی ترمذی

علیگڑھ میں سائنس کے مایہ ناز طالب علم رہے اور پاکستان منتقل ہونے کے بعد کئی کالجوں میں استاد رہے۔ پھر کراچی یونیورسٹی میں شمولیت اختیار کی اور وائس چانسلر کے عہدہ پر رہے۔

جسٹس نورالعارفین

پاکستان کے نامور قانون دان سندھ ہائی کورٹ کے سینئر جج تھے۔ انھوں نے علیگڑھ سے تعلیم حاصل کر کے کراچی میں وکالت شروع کی۔

علی احمد فضل

پاکستان کے ممتاز قانون داں علی احمد فضل نے علیگڑھ سے قانون کی تعلیم مکمل کی۔ پاکستان آکر کراچی میں وکالت شروع کی۔ اٹارنی جنرل پاکستان بنے اور آج کل پاکستان کے مشہور قانون دانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

ایم ایم حسن

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان پولیس سروس میں آئے اعلیٰ عہدوں پر رہ کر ریٹائر ہوئے اور آج کل کراچی میں سماجی اور ادبی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔

محمد جسیم خاں

علیگڑھ کے مایہ ناز کرکٹ کھلاڑی پاکستان آکر پولس سروس میں شمولیت کی اور آئی جی کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ کرکٹ کے انتظامی امور اور شکایات پر ان کے مضمون بہت مقبول ہیں۔

محسن علی

پاکستان کے مایہ ناز انجینئر سینٹرل انجینئرنگ اتھارٹی کے پہلے چیرمین تھے۔ علیگڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ آپ نے پاکستان میں انجینئرنگ سروس کے قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

راؤ رشید خاں

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان آکر پولیس سروس جوائن کی اور آئی جی کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے کچھ دنوں بعد حکومت پاکستان کے مشیر رہے۔

محمد (جونیر)

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی اور فٹ بال ٹیم کے کپتان رہے۔ پاکستان آکر فٹ بال کی کوچنگ کے لیے انتھک کوشش کی۔

عبدالقیوم خاں

ہاکی کے مشہور کھلاڑی جنھوں نے ہندوستان اور پاکستان کی نمائندگی کی علیگڑھ کے طالب علم تھے۔ آج کل روم میں قیام پذیر ہیں۔

انوار احمد خاں

علیگڑھ کے تعلیم یافتہ انوار احمد خاں پاکستان ہاکی ٹیم کے کپتان اور گولڈ میڈلسٹ رہے۔

احسان محمد خاں

علیگڑھ کے طالب علم رہے اور اولمپک میں آل انڈیا ہاکی ٹیم کے ممبر رہے۔ پاکستان میں ہاکی کے فروغ میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔

سعید احمد خاں

علیگڑھ میں کرکٹ کے کپتان رہے۔ پاکستان میں پولیس سروس میں شمولیت کی اور آئی جی کے عہدہ تک پہنچے۔

نواب راحت سعید چھتاری

علیگڑھ کے مشہور چھتاری خاندان سے تعلق تھا۔ علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں فارن سروس میں شمولیت کی۔ آخیر میں جورڈن اور ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی اور پاکستان کی سینیٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔

اکرام احمد خاں (آئی۔ اے خاں)

اکرام احمد خاں نواب اسماعیل خاں کے صاحبزادے ہیں۔ انھوں نے علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرکے انڈین سول سروس میں شرکت کی اور پاکستان آکر سکریٹری کے عہدہ تک پہنچے۔ یونیورسٹی میں وہ کرکٹ کے مایہ ناز کھلاڑی تھے۔

انوار مراد

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان آئے اور فارن سروس میں شمولیت اختیار کی سیلون میں پاکستان کے ہائی کمشنر رہے۔

نصرت حسین

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی اور یونین کے عہدہ دار ہوئے۔ پاکستان آکر سول سروس میں شمولیت کی اور سکریٹری کے اعلیٰ عہدہ تک پہنچے۔

صاحبزادہ رؤف علی خاں

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی اور پاکستان میں آئی جی کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔

محمد ذاکر علی خاں

الحاج محمد ذاکر علی خاں آج کل علیگڑھ میں بوائز کے جنرل سکریٹری ہیں۔ علیگڑھ میں انجینئرنگ کے طالب علم اور کرکٹ اور ہاکی کے ممتاز کھلاڑی رہے۔ پاکستان آکر کے ایم سی میں انجینئر ہوئے اور واٹر بورڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ دیوان عام، فلمرد اور متعدد مضامین اور کتابوں کے مصنف ہیں۔ جتنی خدمت انھوں نے ملازمت میں رہ کر کراچی کی بحیثیت "بابائے آب" کی ہے اتنی ہی محنت وہ آج کل کراچی میں ادبی ماحول بہتر بنانے کے لیے کر رہے ہیں۔

جسٹس عبادت یار خاں

علیگڑھ کے مایہ ناز طالب علم اور یونین کے عہدہ دار رہے۔ پاکستان میں وکالت شروع کی اور ہائی کورٹ کے جج ہوئے اس کے بعد مرکزی شریعت کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔

سیّد نصیر الدّین

علیگڑھ سے تعلیم مکمل کرکے پاکستان میں وکالت شروع کی۔ ایڈوکیٹ جنرل سندھ رہے اور آج کل ایک کامیاب وکیل ہیں۔

اے ڈی احمد

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ پاکستان آکر شپنگ کے بزنس میں ترقی کی اور پان اسلامک اسٹیم شپ کے مینجنگ ڈائریکٹر ہوئے۔

چوہدری محمد قوی

علیگڑھ انجینئرنگ کالج سے سول انجینئرنگ میں ڈگری لی۔ پاکستان آکر پی ڈبلیو ڈی میں شمولیت کی اور ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔

خالد علی

خالد علی صاحب مولانا شوکت علی محمد علی جوہر کے خاندان سے ہیں۔ علیگڑھ سے تعلیم مکمل کی اور یونین کے سکریٹری رہے۔ پاکستان میں کئی اہم عہدوں پر کام کیا اور کئی ملکوں میں محکمۂ اطلاعات میں پاکستان کے نمائندہ رہے۔ ڈائریکٹر جنرل ایکسٹرنل پبلسٹی اور ایڈیشنل سکریٹری حکومت پاکستان کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ وہ آج کل اسلام آباد میں قیام پذیر ہیں اور علی برادران پر کتاب لکھنے میں مصروف ہیں۔

میجر جنرل شفیق احمد

علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ پاکستان آرمی میں شمولیت کی اور میجر جنرل کے عہدہ پر

پہنچے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے حکومت پاکستان کے سکریٹری ورکس بھی رہے۔

میجر جنرل سعید خاں

علیگڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان آرمی میں کمیشن ملا۔ آرمی کے کئی فنی محکموں میں اہم ذمہ داریاں سنبھالیں۔ آخیر میں پاکستان مشین ٹول فیکٹری کے منیجنگ ڈائریکٹر ہوئے۔

غلام معین الدین صابری

انھوں نے ۱۹۴۳ء میں علیگڑھ سے بی اے کیا اور پاکستان آکر کسٹم ڈپارٹمنٹ میں سروس کی۔ وہ لاہور میں علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے روح رواں ہیں انھوں نے ایسوسی ایشن کے تحت کئی ادارے لاہور میں قائم کیے ہیں۔

نواب مشتاق احمد گورمانی

آپ ۲۵ راکتوبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے اور علیگڑھ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۲ء پنجاب اسمبلی کے ممبر رہے۔ ۴۷-۱۹۴۲ء میں بھاولپور کے وزیر اعلیٰ تھے اور ۱۹۴۹ء میں پاکستان میں مرکزی وزیر ہوئے۔ ۵۴-۱۹۵۰ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ ۵۷-۱۹۵۵ء تک مغربی پاکستان کے گورنر رہے مگر گورنر سے اختلافات کی وجہ سے انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

مشتاق احمد گورمانی نے گورنر اور وزیر کی حیثیت سے انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

سردار بہادر خاں

سرحد کے ممتاز رہنما فیلڈ مارشل ایوب خاں کے بھائی تھے وہ ۵ رجولائی ۱۹۰۸ء کو ہزارہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے قانون کی امتیازی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد وکالت کے ساتھ ساتھ انھوں

نے عملی سیاست میں حصّہ لینا شروع کیا اور ۱۹۳۹ء میں سرحد اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۶ء تک اسمبلی کے اسپیکر رہے۔ تحریک پاکستان میں انھوں نے حصّہ لیا اور آزادی کے بعد پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے سرحد سے واحد مسلم لیگی نمائندے تھے۔ انھوں نے اقوام متحدہ میں کئی مرتبہ پاکستان کی نمائندگی کی۔ ۱۹۵۱-۵۴ء تک وہ مرکز میں وزیر رہے۔ پھر بلوچستان میں ایجنٹ جنرل رہے۔ ۱۹۵۵-۵۶ء میں سرحد کے وزیر اعلیٰ رہے۔ ون یونٹ بننے کے بعد ۱۹۵۶ء میں اس کے وزیر رہے اور ۱۹۶۳ء میں اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد انھوں نے عملی سیاست سے بہت حد تک کنارہ کشی اختیار کرلی۔

سیّد طاہر حسین

آپ نے علیگڑھ میں تعلیم پائی۔ بی۔ ایس۔ سی اور ۱۹۳۹ء میں ایم۔ ایس۔ سی (زولوجی) بھوپال کی لیجسلیٹو کونسل کے مقابلہ میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اور اس کے چھ سال ممبر رہے۔ اپنی اس مصروفیت کے ساتھ انھوں نے اندور کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور بھوپال میں وکالت شروع کردی۔ ایک اخبار "نقاد" جاری کیا جو تھوڑے عرصہ بعد بند ہوگیا۔ سید طاہر حسین بھوپال میونسپل کونسل کے بھی ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگئے۔ کراچی کے کامیاب وکلا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے اب وکالت سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔

"I WILL ONLY ASK MY YOUNG FRIENDS WHO ASPIRE TO FAME IN THE FIELD OF SPORTS TO REMEMBER THAT

- WHEN THE LAST GREAT SCORE COMES
- TO WRITE AGAINST YOUR NAME
- HE WRITE NOT THAT YOU WON OR LOST
- BUT HOW YOU PLAYED THE GAME!

IF YOU HAVE PLAYED WELL - THEN SURELY WILL YOU BECOME GOOD MEN AND WORTHY CITIZENS"

Air Vice Marshal His Highness Sikander Saulat Iftikhar-ul-Mulk Alhaj Nawab Mohammad Hamidullah Khan Patron In Chief Bhopal Hockey Association

۱۱

علیگڑھ : یادیں

پرندوں کو پرانے آشیانے یاد آتے ہیں
جو گاتے تھے چمن وہ ترانے یاد آتے ہیں

عابداللہ غازی

یادِ علیگڑھ

بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ
وہ چائے کی پیالی پہ یاروں کے جلسے　　وہ سردی کی راتیں وہ زلفوں کے قصے
کبھی تذکرے حسن شعلہ رخاں کے　　محبت ہوئی تھی کسی کو کسی سے
ہر اک دل وہاں تھا نظر کا نشانہ
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ
کسی کو ہوئی تھی کسی سے محبت　　کوئی کر رہا تھا کسی کی شکایت
غرض روز ڈھاتی تھی تازہ قیامت　　کسی کی صباحت کسی کی ملاحت
کسی کی تسلی کسی کا ستانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ
کوئی غمزدہ تھا کوئی ہنس رہا تھا　　کوئی حسنِ ناہید پر مر مٹا تھا
کوئی چشمِ نرگس کا بیمار سا تھا　　کوئی بس یونہی تاکتا جھانکتا تھا
کبھی چوٹ کھانا کبھی مسکرانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ
وہ شہ راہِ میرس کے پُر پیچ چکر　　وہ شمشاد بلڈنگ پہ اک شورِ محشر
وہ مبہم سی باتیں وہ پوشیدہ نشتر　　وہ بے فکر دنیا وہ لفظوں کے دفتر
کہ جن کا سرا تھا نہ کوئی ٹھکانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

رہے جنوری میں نمائش کے چرچے　　وہ پُر شوق آنکھیں وہ حیران جلوے
وہ چکر پہ چکر تھے بارہ دری کے　　وہ حسرت کہ سو بار مل کر بھی ملتے

ہزاروں بہانوں کا وہ اک بہانہ
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

یہ رُخ آفتابی یہ ابرو ہلالی　　وہ تمثالِ سیمیں وہ حسنِ مثالی
شگوفوں میں کھیلی گلابوں کی پالی　　وہ خود اک ادا تھی ادا بھی نرالی

نگاہیں بچا کر نگاہیں ملانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

وہ ظالم جو مجھ کو نہیں جانتی تھی　　مگر میری نظروں کو پہچانتی تھی
اگرچہ مرے دل میں وہ بس چکی تھی　　مگر بات بس دل کی دل میں رہی تھی

مگر آج احباب سے کیا چھپانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

وہ اک شام برسات کی دن ڈھلا تھا　　ابھی رات آئی نہ تھی جھٹپٹا تھا
وہ بادِ بہاری سے اک گُل کھِلا تھا　　دھڑکتے ہوئے دل سے اک دل ملا تھا

نظر سن رہی تھی نظر کا فسانہ
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

ہمیں بیتی باتیں جو یاد آ رہی ہیں　　وہ مخمور نظریں جو شرما رہی ہیں
بہت عقلِ سادہ کو بہکا رہی ہیں　　بڑی بے نیازی سے فرما رہی ہیں

انھیں یاد رکھنا ہمیں بھول جانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

شکرِ نعمت حصولِ نعمت کا باعث ہے۔ (حضرت علیؓ)

چودھری محمد عارف

علیگڑھ کی یادیں

۲۰ر فروری ۱۹۴۸ء کو ہم علیگڑھ پہنچ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ریل کے ڈبوں میں ایک ڈبہ مخصوص طریقوں سے مسلمانوں کا ہوتا تھا اور گارڈ کا پہرہ رہتا تھا۔ جناب ابرار صاحب کے گھر ماموں بھانجے میں رات گذاری۔ صبح کو میرس روڈ پہنچے۔ فوراً ہی منٹو سرکل گئے۔ وہاں سے پتہ لگا کہ ہوسٹل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ عارضی طور پر سٹی اسکول جو کہ مسلم یونیورسٹی کا اسکول ہے اس میں جناب نواب مونس خاں داتا ولی کی دو کوٹھیاں جو نا دیوی پر ہیں ہوسٹل میں منتقل کردی گئی ہیں۔ اور وہاں وہ تمام راجستھان کے لڑکے اور ساؤتھ انڈین اور دیگر مقامات کے لڑکے عارضی طور پر رکھے گئے ہیں اور ان کا داخلہ سٹی اسکول میں کرا دیا گیا ہے۔ جناب محمد زبیر ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑی ہمدردی اور شفقت سے سٹی اسکول میں نویں درجے میں داخلہ دے کر سرپرستی فرمائی۔ اسی دور میں جناب سر ضیاء الدین وائس چانسلر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی میت علیگڑھ آئی اور سر سید مرحوم کے پہلو میں جامع مسجد یونیورسٹی میں سپردِ خاک ہوئی۔

افواہیں اڑ رہی تھیں کہ یونیورسٹی بند ہو جائے گی۔ یہ خطرہ مولانا آزاد نے محسوس کیا اور چونکہ وہ وزیر تعلیم تھے۔ اور اس وقت جناب ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر تھے۔ ان کو مولانا آزاد نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

کا وائس چانسلر بنا کر بھیجا اور اس طرح سے یونیورسٹی بند ہونے سے رک گئی۔ اس وقت لڑکوں کی تعداد یونیورسٹی میں ایک روایت کے تحت تین ہزار تھی اور دوسری روایت کے تحت پانچ ہزار تھی۔

ہائی اسکول کے بعد فسٹ ایئر سائنس میں داخلہ لیا۔ کلاس میں زیادہ تر لڑکے بہار اور مشرقی یو۔ پی کے تھے۔ ریگنگ اس وقت بھی ہوتی تھی۔ پر نزلہ ہم پر نہیں گرا جو سٹی اسکول منٹو سرکل سے آئے تھے بلکہ ان سے محفوظ رہے ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ علیگڑھ کی تہذیب دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کہ ایک نئی دنیا میں آگئے ہیں۔ اساتذہ کی بڑی عزت تھی۔ سینئر لڑکوں کی بھی بڑی عزت تھی۔ اساتذہ کو ہر طالب علم جھک کر سلام کرتا تھا اور جھک کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور اسی طرح سے اساتذہ بھی اپنے وقار کو قائم رکھتے تھے۔ اور سینئر لڑکوں کے سامنے جونیئر بڑے ادب سے پیش آتے تھے اور سلام کرتے تھے۔ کیا مجال کہ کوئی سینئر لڑکوں کے سامنے جونیئر لڑکے ہنس دے یا اونچی آواز میں بات کرے۔

جو لڑکے اسپورٹس میں دلچسپی رکھتے تھے ان کی فراخ دلی سے سرپرستی کی جاتی تھی اور جو لٹریری ذہن کے تھے ان کی اسی طرح سے ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ یونیورسٹی کی ہاکی کی ٹیم بہت مشہور تھی۔ اسی طرح سے کرکٹ میں بھی یونیورسٹی کی ٹیم اپنا مقام رکھتی تھی۔ یونیورسٹی کا ہورس رائیڈنگ کلب آج بھی ایک فخر کی نشانی ہے۔ یہ عجب خوبی ہے ہر ایک طالب علم یونیورسٹی کی پراپرٹی جس میں چاہے فرنیچر ہو یا عمارت ہو، اس کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا کہ یونیورسٹی کے باغیچوں اور لانوں سے بھی والہانہ محبت تھی۔

ممتاز ہوسٹل کے برابر "کیفے ڈی پھوس" بڑا مشہور ریستوراں تھا جس کی برفی اور نمک پارے جو علیگڑھ کی ضیافت میں بڑے مشہور تھے۔ علیگڑھ میں تفریح کا ایک مقام علیگڑھ نمائش تھی جس کا کہ ہم سب لڑکوں اور گرلس کالج

کی لڑکیوں کو انتظار رہتا تھا۔ شام کو لڑکوں کو لڑکیوں کو نمائش جانے کی اجازت تھی۔ لڑکوں کی یونیفارم کالی شیروانی اور لڑکیوں کا کالا برقعہ ہوتا تھا۔ احتراماً شہر کے لوگ جب لو کے لڑکیاں نمائش دیکھنے آتے تھے تو اس وقت نکل جاتے تھے کچھ ہی خاندان اپنے دیہاتوں کے ساتھ میں نظر آتے تھے۔ آٹھ بجے تک لڑکوں کو نمائش میں رہنے کا حکم تھا۔

شیخ عبداللہ صاحب گرلس کالج کے بانی نے اپنی زندگی اور اپنی دولت یہاں تک کہ عبداللہ لاج جو کہ شاندار کوٹھی ہے گرلس کالج سے ملحق، وہ بھی گرلس کالج کو وقف کر دی۔ علیگڑھ میں ایسی بہت سی ہستیاں ہیں جو سرسید مرحوم کے دوستوں میں رہی اور وہیں کی ہو کے رہ گئی اور اپنی جائدادوں کو یونیورسٹی کے نام وقف کر دیا۔ علیگڑھ ایک تحریک ہے لازوال تحریک ہے۔

فارم نمبر ۴ قاعدہ ۸

۱۔ مقام اشاعت — آر۔ ۲۹۳ سی۔ رمیش پارک لکشمی نگر دہلی

۲۔ وقفہ اشاعت — سہ ماہی

۳۔ پرنٹر کا نام — ڈاکٹر رحمہ حامد (ہندوستانی شہری)

پتہ — ۳۵ بی سیکٹر ۱۷۔ نوئڈا یوپی ۲۰۱۳۰۱

۴۔ پبلشر کا نام — ڈاکٹر رحمہ حامد (ہندوستانی شہری)

پتہ — ۳۵ بی سیکٹر ۱۷۔ نوئڈا یوپی ۲۰۱۳۰۱

۵۔ ایڈیٹر کا نام — ڈاکٹر رحمہ حامد (ہندوستانی شہری)

— ۳۵ بی سیکٹر ۱۷۔ نوئڈا یوپی ۲۰۱۳۰۱

۶۔ مالک — ڈاکٹر رحمہ حامد

میں ڈاکٹر رحمہ حامد اقرار کرتی ہوں کہ مندرجہ تفصیلات میرے علم یقین سے سچ ہیں۔

دستخط ڈاکٹر رحمہ حامد نومبر ۲۰۰۰ء

پروفیسر ڈاکٹر طاہر محمود

علیگڑھ

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط

وطنِ عزیز ہندوستان کے علمی تاج محل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میرا تعلق بے حد جذباتی اور خاصا قدیم ہے۔ میرے والد ماجد علیہ الرحمتہ نے ۱۹۲۸ء میں اسی عظیم دانش گاہ سے عربی میں ایم۔اے اور قانون کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ کئی پشتوں میں میرے بہت سے اور اعزا، والد محترم کے چچا، بھائی، بھتیجے اور میرے اپنے کئی بھائی اور ان کی اولادیں، سب ہی یہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ میں خود اس نگارستان علم و فن میں متعلم بھی رہا معلم بھی، اور دونوں حیثیتوں میں میرے حصہ میں شعلے بھی آئے اور شبنم بھی۔ میں "شام مصر" اور "شب شیراز" کے جمال دلفریب سے یقیناً مستفیض ہوا مگر "اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی" کی روایت نے مجھے "سرشاریِ نرگس" اور "پابستگیِ گیسوئے سنبل" کی مہلت نہ دی۔ آج میری یادوں کے ضخیم البم میں علی گڑھ کے تعلق سے جو کچھ محفوظ ہے اسے میں اردو کے ایک معروف مصرعے سے الفاظ مستعار لے کر "چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط" کا عنوان دے رہا ہوں۔ یہ سب "تصویریں" اور "خطوط" ان "بتوں" اور "حسینوں" کے ہیں جو علی گڑھ کے میرے چار برسوں میں میرے کرم فرما، محسن، معاون، بزرگ، خورد، ہم عمر، ہم عصر، ہم نوالہ و ہم پیالہ، دوست، حبیب یا رقیب بن کر میری آپ بیتی کا حصہ بنے۔ انھیں میں سے چند منتخب تصاویر اور خطوط میری ان معروضات کا ماخذ ہیں۔

مادرِ درسگاہ کی آغوش میں میری باریابی ۱۹۶۱ء میں ہوئی تھی جب کہ مجھے لکھنؤ یونیورسٹی

سے قانون کی پہلی ڈگری حاصل کیئے ایک سال گذر چکا تھا ۔ اس امتحان میں میری امتیازی کامیابی کے پیش نظر بعض احباب نے قانون کی اعلیٰ تعلیم کا مشورہ دیا تو میں نے علی گڑھ میں شعبہ قانون کے اس وقت کے سربراہ مرحوم پروفیسر حفیظ الرحمٰن سے خط و کتابت کی اور بالآخر علی گڑھ پہونچ گیا ۔ علی گڑھ میں طالب علمی کے پورے دو سال میں کلیتہً خود کفیل رہا ۔ ایک میرٹ اسکالرشپ ضرور ملا مگر اس کی پوری رقم نہ مل سکنے کے باعث ٹیوشن اور پروف ریڈنگ کو اضافی آمدنی کا ذریعہ بنایا ۔ پہلا سال بعض ناگفتہ بہ وجوہ سے خاصے کرب میں گذرا ۔ سرسید ہال' آفتاب ہاسٹل اور ممتاز ہاؤس کے مختلف کمروں میں رہائش رہی' لیکن اکثر راتیں یونیورسٹی کی مرکزی مسجد کے صحن میں شمع کی مدھم روشنی میں مطالعہ کرتے گذاریں ۔ مولانا آزاد لائبریری اور دیگر متعدد کتب خانوں میں بے شمار کتابوں کی گرد اپنی پلکوں سے صاف کی ۔ شیشے کے ادارہ ارباب حل و عقد کی خفگیاں بھی جھیلیں اور حاسدوں کی ریشہ دوانیاں بھی بھگتیں ۔ ان انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود انصافِ خداوندی نے اپنا کرشمہ دکھایا اور سال اوّل کے پورے گروپ میں تنہا مجھے کامیاب فرما کر ایک عبرت انگیز تاریخ بنا دی ۔ اس امتیازی کامیابی کے باعث آئندہ سال بے جا رقابتوں کا سلسلہ دراز ہوا ۔ عین فائنل امتحان کے دوران بعض کینہ سازوں نے لکھنؤ سے میرے والد ماجد کی شدید علالت کے قطعاً فرضی تار پر تار منگوا کر مجھے شکست دینے کی ایک آخری کوشش کی مگر حکم الٰہی سے ناکام رہے ۔ مستقل ذہنی کوفت کے باوجود بالآخر ایل ایل ایم میں اوّل آنے کی سعادت حاصل ہوئی تو " دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر است " کی جیتی جاگتی تعبیر نظر آئی ۔

نامساعد حالات میں بھی غیر معمولی کامیابی بہر حال میرے کام نہ آسکی اور روایت سے انحراف کرکے اساتذہ میں شامل کیے جانے کے بجائے مجھے علی گڑھ سے 'دیس نکالا' عطا کیا گیا ۔ تقریباً ڈیڑھ سال میں مادرِ درسگاہ سے دور حصولِ معاش میں ادھر اُدھر بھٹکتا رہا ۔ منصفِ اعلیٰ نے رحمت کے فرشتے پھر اُتارے اور میں ۱۹۶۳ء کے اواخر میں بہ حیثیت استادِ قانون علی گڑھ واپس آیا ۔ خداداد صلاحیتوں نے' جو مجھے مالکِ کل کی طرف سے بلا استحقاق عطا ہوئی تھیں'

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

طلب اور ہم عصر اساتذہ سے لوہا تو منوالیا مگر ابھی ایک سخت آزمائش باقی تھی ۔ تقریباً دو سال بعد عارضی ملازمت بالکل اچانک بلا نوٹس ختم کر دی گئی ۔ زخم خوردہ احساس خودداری نے بے سبب عاق کر دینے والے بزرگوں کے در پر دستک دینے کی اجازت نہ دی' پھر بھی بیکاری اور تلاش معاش کے چھ ماہ پوری زندہ دلی سے علی گڑھ میں ہی ممکنا یہ گنگناتے ہوئے گذاری کہ ع

ہم جی رہے تھے جن کی عنایت پہ کل تلک
اب جی رہے ہیں ان کی عنایت کے باوجود

مارچ ۱۹۶۰ء میں مسبب الاسباب نے دہلی میں نیا ذریعہ معاش عطا فرمایا تو علی گڑھ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا ۔ آئندہ ثلث صدی میں علی گڑھ میں حاضری چار چھ بار سے زیادہ نہ ہو سکی ۔ مگر "اپنے چمن" سے اس "بلبل" ناچیز کے قلبی تعلق کی کیفیت یہ ہے کہ ع

اب بھی ہے یہ عالم کہ وہ آجاتا ہے جب یاد
پہروں تو مزاج دلِ ناداں نہیں ملتا

دانش گاہ علی گڑھ کے علمی گلیاروں میں میری حصول علم کی پیاس خوب خوب بجھی تھی ۔ جسٹس سیّد محمود اور سر شاہ محمد سلیمانؔ کے علی گڑھ نے قانون کے میدان میں مجھے ملایا سنوارا' علامہ شبلیؔ اور مولانا سلیمانؔ اشرف کے علی گڑھ نے دینی علوم کے سمندر میں مجھے غوطہ زن کیا' اور مجازؔ و معصوم رضا راہیؔ کے علی گڑھ نے میرے ذوقِ سخن آزمائی کو جلا بخشی ۔ ممتاز عالم دین مولانا سعیدؔ احمد اکبر آبادی اور نامور ادیب حضرت مجنوںؔ گورکھپوری کے قدموں میں زانوئے تلمذ تہہ کیا ۔ شعبہ قانون میں جن فاضل اساتذہ سے پڑھا ان میں سے پروفیسر حفیظ الرحمٰنؔ' ڈاکٹر شفیع دیال' رحمٰنؔ علی خاں' محمد غوثؔ اور مصطفیٰ علی خاں صاحبان آج اس دنیا میں نہیں ہیں ۔ حق تعالیٰ ان سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے ۔ پروفیسر مصباح الحسن ملایا کی اسلامی یونیورسٹی

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

میں معروف تدریس اور بدھ پرکاش موریہ جی دہلی میں معروف سیاست ہیں' جب کہ رشید الظفر اور غلام احمد صاحبان بار ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ میں قیام پذیر ہیں ۔ خداوند قدوس ان سب کی عمریں دراز کرے ۔ میرے ممتاز ہم جماعتوں میں تھے سید مشرف علی' نذیر حسن خاں' انوار الیقین اور بعد میں مرحوم احمد صدیق' اور یہ سب ہی آگے چل کر قانون کے مدرس اور محقق بنے ۔ شعبہ قانون کے اسٹاف میں آکر خود میں نے جنہیں پڑھایا ان میں سے پروفیسر لوتار کرشن کول آج کل دہلی یونیورسٹی کی لا فیکلٹی کے ڈین ہیں' جب کہ متعدد اور شاگردان رشید ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں قانون کی تدریس کر رہے ہیں ۔ میرے شاگردوں میں مزید شامل تھے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ مرحوم کے برادر زادہ شیخ نذیر' کشمیر ہی کے ہردلعزیز لیڈر اور صحافی مرحوم محمد شمیم اور دہلی کے صحافی عارف محمد خاں ۔ شعبہ کے قدیم ملازم خاص کمال الدین مرحوم کا میں بڑا احترام کرتا تھا ۔ ادھر ہاسٹل کے ملازمین میں غفور میاں اور لطیف تھے جنہیں ہم سب بڑی عزت سے بالترتیب 'نانا' اور 'ماموں' کہا کرتے تھے ' اور تیسرے تھے مولوی جمال جو سب کو 'یقینی کامیابی' کے تعویذ دیا کرتے تھے ۔ جب میرے ایک ہم نصاب نے ان سے بڑی عقیدت سے یہ تعویذ لیا تو انہوں نے ساتھ ہی مجھے' پہلے بہت ڈرا کر' مگر پھر میرے مسلسل اصرار پر' یقینی ناکامی' کا تعویذ دیا ۔ نتیجہ آیا تو میرے ہم جماعت موصوف فیل تھے اور میں اوّل آیا تھا ۔ مولوی جمال نے مسکرا کر اس معجزے کی یوں وضاحت فرمائی تھی کہ " میاں بے خیالی میں تعویذ مجھ سے بدل گئے ہوں گے ۔"

اب سے چالیس برس قبل علی گڑھ پہونچتے ہی میں نے مجاز مرحوم کی تقلید میں ' نذر علی گڑھ ' کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی ۔ ان دنوں بابائے قوم مہاتما گاندھی سے متعلق ایک فلمی نغمہ بہت مقبول تھا جس کا مکھڑا ''سابرمتی کے سنت تو نے کر دیا کمال'' زبان زد عام ہو چکا تھا ۔ اسی انداز اور دھن پر میں نے یہ گیت لکھا اور بے شمار محفلوں میں سنا کر داد تحسین حاصل کی تھی ع

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ہے ارض علی گڑھ میں جو تعلیمی دبستان
اک رہبر ملت نے بسایا تھا یہ جہان

اسلام کی دنیا میں اندھیرا سا تھا چھایا
اک مومن جانباز تھا میدان میں آیا
اٹھا نور علی گڑھ میں چمن ایک لگایا
پھولوں نے جس کے ہند میں زندہ کیا ایماں
اک رہبر ملت نے بسایا تھا یہ جہان

تلوار چلائی نہ کوئی فوج بلائی
ہمت تھی جو حالات سے لڑنے نکل آئی
سیّد کی زمانے سے نرالی تھی لڑائی
پس ماندگی قوم سے تھا جنگ کا اعلان
اک رہبر ملت نے بسایا تھا یہ جہان

سن کر صدا کسی کی مسلمان چل پڑے
ملت کے لئے لیکے دل و جان چل پڑے
شبلیؔ وطن سے بے سر و ساماں چل پڑے
پنجاب سے حالیؔ بھی چلے ہونے کو قرباں
اک رہبر ملت نے بسایا تھا یہ جہاں

سیّد کے دبستان کا مقصد عظیم تھا
پیدا ہوں اس چمن سے وہ فرزند باوفا
اسلام کا ہو تاج سروں پر دھرا ہوا
اک ہاتھ میں سائنس ہو اک ہاتھ میں قرآن
اک رہبر ملت نے بسایا تھا یہ جہان

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

علی گڑھ میں میرے پہلے وائس چانسلر تھے کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم ۔ پھر یکے بعد دیگرے بدرالدین طیب جی، نواب علی یاور جنگ اور پروفیسر عبدالعلیم کا زمانہ دیکھا ۔ خدا ان سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے ۔ کرنل زیدی کی شیخ الجامعہ کے عہدے سے سبکدوشی کے موقعہ پر بھی میں نے ایک نظم لکھی تھی جس کے دو مختلف اشعار یہ تھے ع

اے علی گڑھ تیری بزمِ ناز سے جاتا ہے کون
سوگواری سی فضاؤں میں یہ بکھراتا ہے کون
دیکھ کر خدماتِ تعمیری درونِ گلستاں
مادرِ علمی تمہیں دے گی لقب شاہِ جہاں

ہر دلعزیز پروفیسر اور یونیورسٹی پراکٹر بشیر احمد مرحوم کے انتقال پر میں نے ایک ماتمی نظم کہی تھی جس کا اب صرف ایک شعر یاد ہے ع

بابِ رحمت جھک گیا کس کی سلامی کے لئے
جھلملا کر بجھ گئے کیوں طاقِ مسجد کے دیئے

یوں ہی شاعری کرتے، پڑھتے پڑھاتے، بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں سے مقابلہ کرتے، علی گڑھ میں میرے دونوں ادوار جلد گذر گئے ۔ پہلے ایک محنت کش طالب علم اور بعد میں ایک فنافی اللہ رئیس معلم کی حیثیت سے میں نے علی گڑھ سے بہت کچھ لیا ۔ افسوس کہ علی گڑھ کو کبھی کچھ دے نہ سکا اور مادرِ درسگاہ کا قرض اتارنے کی سبیل کبھی نہ نکل سکی ۔ ابھی اسی سال، جب کہ قومی اقلیتی کمیشن میں میری مدتِ صدارت قریبِ اختتام تھی، علی گڑھ میں شیخ الجامعہ کا منصبِ عالی از سر نو پُر ہونے لگا تو وہاں کے مؤقر اساتذہ کے ایک گروپ نے ازراہ عنایت دہلی میں

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مجھ سے مل کر میرا نام اس خدمت کے لئے تجویز کرنے اور حکومت سے منظور کروانے کی پیشکش کی ۔ لیکن اوّل تو میں خود ہی اپنے کو یہ عظیم بارِ امانت اٹھانے کا اہل نہیں سمجھتا تھا ' اور پھر مقامی اربابِ سیاست نے علی گڑھ کے ان بے لوث بہی خواہوں کی بھی ایک نہ چلنے دی ۔ علی گڑھ کو بہر حال معروف سفارت کار جناب حامد انصاری کی شکل میں نعم البدل مل گیا ۔

دبستان علی گڑھ میں میری باریابی اور وہاں سے اخراج دونوں ہی میرے لئے سفرِ حیات کے لئے سنگِ میل ثابت ہوئے تھے ۔ آج نصف صدی بعد بھی علی گڑھ میری روح کی گہرائیوں میں رچا بسا ہے اور تادمِ حیات رہے گا ۔ میری دلی دعا ہے کہ میرا علی گڑھ سلامت رہے اور اس عظیم علمی دبستان کی چاندنی اقصائے عالم میں ہمیشہ چھٹکتی رہے ۔

*

ڈاکٹر رضیہ حامد کی کتب

۱۲

گر تو برا نہ مانے

شبّیر علی خاں شکیب

روحِ سرسیّد سے خطاب

سیدی! تجھ کو جو غم تھا وہی غم آج بھی ہے
جس سے تو گزرا تھا وہ بحرِ الم آج بھی ہے

فرق کیا پڑتا ہے چہروں کے بدل جانے سے
تھا جو کل شیوۂ اربابِ ستم آج بھی ہے

زندگی بھر رہا تو سینہ سپر جس کے خلاف
آہ وہ کشمکشِ دیر و حرم آج بھی ہے

روز اک معرکہ کرب و بلا ہے برپا
بے گناہی ہدفِ تیر و ستم آج بھی ہے

لطف آتا ہے جنہیں طنز و دل آزادی میں
ان جفا کاروں سے امیدِ کرم آج بھی ہے

یوں تو کہنے کو بہت راہنما ہیں لیکن
قوم سے بڑھ کر خود اپنا انہیں غم آج بھی ہے

ہے ضرورت تری کل سے بھی سوا سر سیدؒ
رہنمائی کے لیے پھر سے تو آ سر سیدؒ

○

وصیّت

سرسید علیہ الرحمہ کی وصیت مسلم یونیورسٹی کے فرزندوں کے نام

"میرے عزیز فرزندو! جس وقت تم اس مادر علمی کے سایہ میں جوان ہو رہے ہوگے اور اپنی دنیا و آخرت کی ترقی کی راہ پر گامزن ہوگے تو شاید تم مجھے بھول چکے ہوگے تو اگر کچھ توفیق ہوگی بھی تو کچھ فاتحہ کی وہ بھی نخرے پن کے ساتھ نئے آنے والے معصوموں سے کچھ وصول کرکے مٹھائی کھانے کی حد تک۔ تمھیں شاید اس وقت کوئی بتلانے والا بھی نہیں ہوگا کہ میں نے اس بنجر زمین پر جہاں پرشکوہ عمارتیں کھڑی ہیں اور چاروں طرف سرسبز درخت سنتری بنے کھڑے ہیں۔ کتنی مرتبہ اپنی پیشانی کو خاک آلود کیا اور کس کس طرح گڑگڑا کر تمھارے روشن مستقبل کی دعا مانگی ہے۔ میں نے کیسی کیسی مخالفتوں کو اپنے سینے پر لیا ہے۔ میرے قدم کتنی مرتبہ لڑکھڑائے اور کتنی بار میرا عزم متزلزل ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ میرے چند رفقاء نے مجھے سہارا دیا، میری دل جوئی کی۔ اور عملی طور پر تعاون دیا لیکن میں تم سے کیا کہوں کہ میں نے کتنی راتیں تمھاری خاطر رو رو کر کاٹ دیں۔ مجھے تمھارے مستقبل کی فکر ایک لمحہ چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ مجھے اپنی صحت اپنا آرام اور اپنے بچوں کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی تمھاری، یقین جانو میں وقت سے پہلے بوڑھا ہوگیا، میری صحت اور میری آنکھیں جواب دے گئیں، لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ میں نے تمھاری خاطر بھیک مانگی۔ میں نے تمھاری خاطر گھنگھرو باندھے، میں نے تمھاری خاطر اپنے کو اسٹیج پر پیش کیا۔ میں نے بھکاری کا روپ دھارا اور لوگوں کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کیا۔ غرض کہ جو کچھ ممکن تھا وہ سب کرتا رہا۔ صرف اس امید میں کہ آئندہ آنے والے دور میں اور اس ملک میں تمھارا مستقبل تابناک ہو، تم سر اٹھا کر چلنے والے بن جاؤ۔ تم روئے زمین پر سرخ رو رہو۔ اے ملت اسلامیہ کے فرزندو، اس آرزو میں، میں سب جگہ پھرا۔

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ مئی ۲۰۰۰ء

ہر وہ چیز جو مجھے اچھی نظر آئی میں نے تمھارے اور صرف تمھارے لیے حاصل کی. میرا دل چاہتا تھا کہ میں تم کو چمکتا دمکتا دیکھوں. تمھیں آسمان کی بلندیاں چھوتا ہوا دیکھوں، تمھیں اسلام کا ماہِ کامل ہوتا ہوا دیکھوں۔ مجھے یقین تھا کہ میری یہ آرزو پوری ہوگی. میں اسی سرزمین کے ذروں کو چمکتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس میں مجھے تمھاری صورتیں نظر آرہی تھیں لیکن میں اپنے اس احساس کو چھپا نہیں سکتا کہ مجھے ان چمکتے ہوئے ذروں میں ایسی نامراد اور مکروہ صورتیں بھی نظر آئیں جنھوں نے اس مادر علمی سے بھرپور فائدہ اٹھایا لیکن اس کی جڑوں پر تیشہ چلایا۔ میں نے ایسی صورتیں بھی دیکھیں جنھوں نے اس مادر علمی کا دودھ پیا لیکن اس کی طرف سے ہمیشہ منھ موڑ لیا. میں نے دیکھا جب اس پر آنچ آئی تو انھوں نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں، اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ اگر کسی نے ان کو متوجہ کیا تو اس سے کنارہ کش ہو گئے، میں نے ایسی بے توفیق صورتیں بھی دیکھیں جنھوں نے اس مادر علمی کے مخلصین کے ساتھ بدتمیزی کی اور ان کی رسوائی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی. میں نے یہ بھی دیکھا کہ جب جب اس پر افتاد پڑی تو انھوں نے حکومت وقت کا ساتھ دیا۔

یقین جانو جب جب میں نے ایسی صورتیں دیکھیں تو میں تڑپ گیا اور میرے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ مجھے مخالفتوں سے اور سب وشتم اور دشنام طرازیوں سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی جو مادر علمی کے ان فرزندوں کے اس رویہ اور کردار کو دیکھ کر جو مجھے ان ذروں میں نظر آرہے تھے۔

میرے عزیزو! خدا کرے وہ دن نہ آئے اور وہ صورتیں وجود میں نہ آئیں لیکن اگر ایسا ہو تو میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ کبھی ان کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنا نہ کبھی ان کے دروازوں کا رُخ کرنا ورنہ کبھی ان سے کچھ طلب کرنا۔

یاد رکھو کہ ایسے بے توفیق لوگوں سے کچھ طلب کرنا میری کوششوں اور مادر علمی کی سب سے بڑی توہین اور دل آزاری ہوگی۔

میں انشاء اللہ تمہارے درمیان رہوں گا اور میری روح ان سفید روحوں کو دیکھ کر ضرور خوش ہوگی جنھوں نے یہاں سے پورا فائدہ اٹھایا۔ احسان مندی کے جذبہ کے ساتھ یہاں سے رخصت ہوئے اور تعلق برقرار رکھا اور اخوت اسلامی قائم رکھی۔
مجھے یقین ہے کہ تم میرے حق میں دعائے خیر کرتے رہوگے اور کبھی بخل سے کام نہ لوگے

(بشکریہ "ندائے ملت" مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۸۸ء)

علام محمد زائر گنگوہی

علی گڑھ

اے علی گڑھ اے مری ملت کی عظمت کے نشان
جھک رہی ہے تیرے قدموں پر جبینِ آسماں

تیری تابانی پہ حیراں ہے حریمِ کہکشاں
تو نویدِ صبحِ صادق ہے تو آوازِ اذاں

اے علی گڑھ تیری آوازِ اذاں پائندہ باد
تیری عظمت تیری شوکت کے نشاں تابندہ باد

●

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

تدوین : ڈاکٹر رابعہ سلطان

اے۔ایم۔یو کے طلبار کے نام

چند مشاہیر کا پیغام

ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم (والیۂ ریاست بھوپال (۱۸۵۹ء تا ۱۹۳۰ء)
یکم دسمبر ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد اس کی پہلی چانسلر منتخب ہوئیں اور بحیثیت چانسلر آپ نے مسلم یونیورسٹی کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد منعقدہ ۲۸رِ دسمبر ۱۹۲۲ء کی صدارت فرمائی اور خطبہ دیا خطبہ کے دوران دیگر باتوں کے علاوہ انھوں نے کہا "مجھے امید ہے کہ اکیڈمک کونسل اور تمام افسرانِ تعلیم اپنی یونیورسٹی کی عزت وشہرت کی حفاظت کے لیے اس معیارِ تعلیم کو ہمیشہ ایسا بلند رکھیں گے کہ یہاں کا گریجویٹ ہونا ملک اور قوم میں ایک خاص امتیاز اور مسلّمہ قابلیت کا تمغہ سمجھا جائے گا اور جوق در جوق طلبار کو یہاں داخل ہونے کی رغبت پیدا ہوگی اور اس قسم کا خیال تک بھی نہ آئے گا کہ دوسری قدیم وجدید یونیورسٹیوں سے طلبار کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے معیارِ تعلیم گرا دیا جائے۔

لیکن اس مقصد کی کامیابی کا انحصار صرف اسٹاف کی اعلیٰ قابلیت اس کے طریقہ ادائے فرائض، شاگردوں کے ساتھ شفقت ورافت اور کامل انہماک پر ہے اور ہم کو امید رکھنی چاہیئے کہ ہمارا اسٹاف ان امور میں مایوس

سہ ماہی فکر وآگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

نہ کرے گا۔

خطبہ کے دوران انھوں نے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

"اے عزیزانِ قوم! آپ کی جماعت وہ جماعت ہے جس کا نام اس یونیورسٹی کے آغاز کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اس کی تقویم میں سب سے اول آپ ہی کے نام نظر آئیں گے۔ ہم سب کو آپ سے یہ قوی امید ہے کہ آپ عملی دنیا میں اپنی یونیورسٹی کے مقاصد اور ڈگریوں کے وقار کو ہر طریقے سے قائم رکھیں گے۔ آپ پر اپنے مذہب کے، اپنے گھر کے اپنی قوم کے، اپنی ذات اور اپنی حکومت کے جو فرائض ہیں ان کو آپ بخوبی سمجھتے ہیں۔ آپ پر تمام قوم کی نظریں لگی رہیں گی کہ آپ ان کو کس طریقے سے ادا کرتے ہیں۔

جو طلبا ابھی زیر تعلیم ہیں ان کو میری یہ نصیحت ہے کہ اے عزیزؤ آپ یاد رکھیں کہ آپ کی کامیابی کامل شوق و محنت اور کفایت شعارانہ زندگی حسنِ اخلاق، اتنادوں کے ادب اور ان کے ساتھ محبت میں مضمر ہے۔

ہماری مشرقی اور اسلامی روایات میں یہ ادب و محبت بہت ہی ضروری اور اہم ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول لوحِ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے مَنْ علمنی حرفاً فقد صیرنی عبداً یعنی جس نے مجھے ایک لفظ سکھایا اس نے مجھے اپنا بندہ بنالیا۔

صاحبان! ہماری یونیورسٹی، ہماری قومی تمناؤں کا بہترین سرمایہ ہے ہماری بڑی بڑی امیدیں اس سے وابستہ ہیں۔ ہمارے پیش روؤں نے جب اس کی تاسیس کا خیال کیا تھا تو ان کا جو نقطۂ نظر تھا وہ علامۂ سر سید مرحوم کے ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ "ہماری تعلیم اسی وقت مکمل ہوگی جب کہ یہ خود ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونیورسٹیوں کی غلامی سے آزادی ملے گی۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں اور سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج ہمارے سر پر ہوگا۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ہم کو نہایت سرگرم کوششوں کی ضرورت ہے تاکہ ہماری یہ یونیورسٹی قوم و ملک میں ایک قابلِ قدر تعلیمی فضا پیدا کرے

سائنس اور صنعت کی تعلیم ہمارے لیے حقیقی طور پر نتیجہ خیز ہو۔ یہاں تحقیقات علمی کا سلسلہ قائم ہو۔ ہمارے دارالعلوم سے ایسے طلبا نکلیں جو اپنی زندگی کو علم کے لیے وقف کر دیں نہ کہ ملازمت کے واسطے۔

مذہبی تعلیم ہمارا طغرائے امتیاز ہو۔ جو قوم کے تشنہ کاموں کو سیراب کرے اور یہاں سے جو طالب علم نکلے وہ ایک صحیح مفہوم میں تعلیم یافتہ مسلمان ہو۔ جس کی صفات میں عقائد مذہبی کی استواری اور ارکان مذہب کی پابندی ممتاز رکھتی ہو۔ اور اخلاق محمدیؐ کے انوار سے اس کا دل و دماغ منوّر ہو۔

صاحبان! جب اس قسم کا دارالعلوم ہمارے ہاتھ میں ہوگا تو ہم اس وقت امید کر سکیں گے کہ پھر ہماری قوم میں ابن رشد، بوعلی، سعدی وغزالی، بنوموسیٰ اور ابو معشر فلکی اور دور آخر کے شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور حالی و شبلی پیدا ہوں گے اور ہندوستان میں بغداد و قرطبہ کی علمی عظمت ہم کو دوبارہ حاصل ہو جائے گی۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (مئی ۱۸۶۷ء - ۱۰ جنوری ۱۹۳۰ء) نے ۱۶ فروری ۱۹۲۴ء کو یونیورسٹی کے دوسرے کانوکیشن میں فرمایا: "واقعہ یہ ہے کہ ان ڈگریوں کی اصل قیمت اس تہذیب و اخلاق پر منحصر ہے جن کی یہ اسناد تصدیق کرتی ہیں اور جو اس تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں جو مسلم یونیورسٹی میں دی جاتی ہے۔ ان ڈگریوں کی موجودگی اس بات کی ضمانت ہونی چاہیئے کہ ان کے حاصل کرنے والوں میں وہ اخلاقی و ذہنی قابلیت موجود ہے جس کے لیے یہ درسگاہ مشہور ہے۔ اس لیے ان ڈگریوں کو جو چیز بیش قیمت بناتی ہے وہ اس یونیورسٹی سے ڈگری یافتوں کی اخلاقی اور ذہنی قابلیت ہے۔ یہ واقعہ ذیل کی مثال سے واضح ہو جاتا ہے۔

حضرات! میں خیال کرتا ہوں کہ آپ سب اس بات سے واقف ہیں کہ جنگ عظیم سے پہلے جرمن مارک کی قیمت ۲ شلنگ تھی لیکن اس کے بعد کیا قیمت رہ گئی، حالانکہ جرمن مارک کی چھپائی اس کا کاغذ وہی تھا جو جنگ عظیم سے پہلے تھا لیکن جنگ سے پہلے وہ لاکھوں کی قیمت کا تھا لیکن بعد لڑائی

کہ وہ اس کاغذ کی قیمت کا بھی نہ رہا جس پر وہ چھاپا گیا تھا۔ اس کا کیا سبب ہے۔ وجہ ظاہر ہے یعنی لڑائی سے پہلے جرمنی قوم کی طاقت، دولت نیک نامی اور ساکھ تھی جس نے کاغذ کے مارک کو ایک خاص قیمت کا بنا دیا تھا۔ لیکن شکست ہونے پر جرمن کی طاقت سختی کے ساتھ فنا کر دی گئی۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ کاغذ کے مارک کی قیمت بھی جاتی رہی۔ یہی حال ہماری ڈگریوں کا ہے۔ ان کی خوبی کاغذ یا چھپائی کی خوبی پر منحصر نہیں بلکہ اس کی خوبی ڈگری یافتوں کی اخلاقی، ذہنی اور جسمانی قابلیت سے جانچی جاتی ہے۔

"اے کامیاب طالب علمو! تمہیں جاننا چاہیئے کہ جب تم عملی زندگی میں قدم رکھو گے اس وقت تمہیں سخت نکتہ چینیوں سے واسطہ پڑے گا اور تمہاری ڈگریوں کی قیمت کی جانچ تمہارے اس اخلاقی اور ذہنی اثاثہ سے ہوگی جو تمہاری طرف سے بازارِ عالم میں پیش کیا جاوے گا۔ اس لیے ان ڈگریوں کی ساکھ اور اس یونیورسٹی کی نیک نامی کلیتاً تمہارے اخلاق اور تہذیب پر منحصر ہے۔

مرزا سمیع اللہ بیگ نواب مرزا یار جنگ نے ۳ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو کانوکیشن کے دوران فرمایا؛

آپ امتحان کے لیے جو کچھ حافظہ میں جمع کرتے ہیں واقعی زندگی کے امتحان میں اسے کوئی نہیں پوچھے گا۔ بلکہ آج تک کی تعلیم سے آپ نے اپنی سیرت کو جس طرح ڈھالا ہے لوگ اسی کو دیکھیں گے۔ بایں ہمہ زندگی کے ایسا گر ہے جس سے آپ ہر جگہ ہر وقت کامل اطمینان کے ساتھ کام لے سکتے ہیں اور جو آپ کے خاندان آپ کے مدرسہ اور آپ کی مادر علمی سب کے لیے سرمایۂ فخر و مباہات ہوگا۔ وہ گر یہ ہے کہ صداقت کو اپنا اصول و عمل بنا لیجئے۔ میں صداقت کو وسیع تر معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ اس سے میرا مطلب وہ زندہ قوت اور وہ خدائی صفت ہے جو کائنات کے جملہ قوانین میں خواہ مادّی ہوں یا روحانی کارفرما ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ خدا نے انسان کو ایک طاقت جسے کانشنس یا ضمیر

سکھتے ہیں عطا فرمائی جو ملاحوں کے قطب نما کی طرح ہمیشہ راستی کا راستہ بتاتی اور سخت طوفانی سمندر میں تاریک ترین ساعتوں میں بھی راہ راست بتانے میں غلطی نہیں کرتی۔ اس جامعہ نے جو علم و آگہی دی ہے وہ اس خدائی آواز کی مدد سے ہر وقت اور ہر موقعہ پر جب آپ کو اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرنا پڑے آپ کی رہنمائی کرے گی بہر حال زندگی میں آپ کا بحیثیت انسان عروج و عظمت کا پیمانہ ٹھیک اسی قوت کے مطابق ہوگا جس قوت کے ساتھ آپ صداقت کو تھامے رہیں اور اس سے اپنے اعمالِ زندگی میں کام لے سکیں۔

آپ کو میری دوسری نصیحت یہ ہے کہ زندگی کا مسلک خدمت کو قرار دیجئے جب کسی پیشہ یا ملازمت میں داخل ہوں تو اس کے کسی شعبہ میں اس غرض سے مہارت پیدا کریں کہ اسے چھوڑتے وقت زیادہ اعلیٰ اور قابلِ قدر عالت میں چھوڑ کر جائیں۔ یہ عالمِ انسانیت کا آپ پر قرضہ ہے دوسرے کامیابی کے لیے مہارت حاصل کرنا بڑے گر کی بات ہو گی۔

ایک جملہ اور سن لیجیے وہ یہ کہ "اپنی مادرِ علمی کے وفادار رہیئے۔ وہ آپ کے ساتھ جو کچھ بہتری کر سکتی تھی اس نے کی۔ اب آپ کی باری ہے کہ آپ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو بہتری کر سکتے ہیں وہ کریں۔ ان الفاظ کے ساتھ میں زندگی میں آپ کی پر مسرت کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ اللہ آپ کا مددگار ہو۔"

مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۵۸ء) نے بحیثیت وزیر تعلیم ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء کو کانوکیشن کا خطبہ دیا۔ انھوں نے کہا "جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے انتقالی دور کا سب سے مؤثر عمل یہیں انجام پایا۔ نئے ہندوستان کے پیدا کرنے میں ملک کے جن نئے حلقوں نے نمایاں حصہ لیا ہے ان میں ایک حلقہ یہ بھی تھا۔ ہندوستان کی نئی دماغی سرگرمیوں کے لیے انیسویں صدی نے ایک نشاۃ جدیدہ (Renaissance) کا دور بہم پہنچایا۔ اور اس نشاۃ جدیدہ کا ایک گوشہ علیگڑھ بھی تھا۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اگرچہ سرسید کے انتقال کے بعد یہاں کی یہ خصوصیت بہت حد تک کم ہو گئی۔ کالج ترقی کرتے کرتے یونیورسٹی بن گیا۔ لیکن اپنے دور کی شاندار روایتیں واپس نہ لا سکا۔ تاہم یہ روایتیں آپ ہی کی اس درسگاہ کی روایتیں ہیں آپ کی اسٹریچی ہال کی دیوار پر جو کتبے کندہ ہیں ممکن ہے کہ وہ کسی وقت مٹ جائیں۔ لیکن آپ کی درسگاہ نے زمانے کے صفحوں پر جو کتبے ثبت کر دیئے ہیں وہ کبھی نہیں مٹ سکتے وہ ہمیشہ باقی رہیں گے اور ہندوستان کے آنے والے مورّخ ان سے اپنی کہانیوں کے لیے مواد حاصل کر سکیں گے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

ایک ایسا تعلیمی ادارہ جو اپنی ماضی کی ایسی شاندار داستان رکھتا ہو قدرتی طور پر اس کا مستحق ہے کہ ایک شاندار مستقبل اپنے سامنے دیکھے۔

اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ اور اس کی تحقیقات آپ کی درسگاہ کی قدیمی روایت ہے مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سرسیّد مرحوم کے دور کے بعد اس کی سرگرمیاں بہت کچھ دھیمی پڑ گئیں۔ اور علم و فن کا عام مذاق بھی کچھ زیادہ بلند نہیں رہا۔ یونیورسٹی قائم ہوئی تھی تو اسے اپنے قیام کے بعد ایک نیا علمی دور لانا تھا۔ مگر اس توقع کو بھی ابھی تک انتظار ہی کرنا پڑا ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ اپنی درسگاہ کی پرانی روایتوں کو از سرِ نو تازہ کریں۔ اور یونیورسٹی کے اندر مطالعہ و درتحقیقات کا اعلیٰ معیار پیدا کریں۔

تم ایک غیر مذہبی جمہوری نظامِ حکومت کے باشندے ہو۔ جس نے ۔۔۔ لہ کر لیا ہے کہ ملک کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کو غیر مذہبی اور جمہوری طریقہ کے مطابق نشو و نما دے گی۔ ایک غیر مذہبی جمہوری نظام کا جوہری خاصہ یہ ہے کہ وہ ملک کے تمام افراد کے لیے یکساں طریقہ پر ہر طرح کی ترقیوں کے مواقع پیدا کر دیتا ہے۔ اس میں مذہب، نسل ذات اور فرقہ کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ ایک ایسی حکومت کے باشندے ہونے کی حیثیت سے تم بجا طور پر

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

یہ توقع کرسکتے ہو کہ تمہارے آگے ملکی زندگی کے تمام دروازے کھل جائیں۔ سیاست، انتظام حکومت، تجارت، صنعت و حرفت، مختلف قسم کے پیشے، کوئی دروازہ ایسا نہ ہو جو تم پر بند ہو۔ میں تمہیں پوری ذمّہ داری کے ساتھ یقین دلاؤں گا کہ آج کوئی دروازہ تم پر بند نہیں ہے۔ ملک کی زندگی کا ہر دروازہ تم پر کھلا ہے بشرطیکہ تم قابلیت کی پختگی، محنت کی سرگرمی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیرت کی مضبوطی کے ساتھ قدم بڑھا سکو۔ قومی آزادی کی فضا تمہارے مطمح نظر کو زیادہ بلند، تمہاری ہمتوں کو زیادہ اولوالعزم اور تمہارے ولولوں کو زیادہ وسیع کر دے۔ تمہیں اب پرانے ہندوستان کے ذہنی ماحول سے نکلنا ہے اور نئے ہندوستان میں اپنی قابلیت اور صلاحیت کا نیا مصرف ڈھونڈنا ہے۔ تمہاری بلند پروازیوں کے لیے اب پچھلی بلندیاں پست ہو گئیں۔ اور تمہاری جولانیوں کے لیے اب پرانے میدان تنگ ہو گئے۔ تم نے سعی و عمل کے جو پرانے پیمانے اپنے ہاتھوں میں رکھے تھے وہ وقت کی نئی پیمائشوں کے لیے کام نہیں دے سکتے۔ تمہیں اب نئے پیمانے ڈھالنے ہیں۔ تمہیں نئے باٹوں سے سعی و عمل کی نئی مقداریں تولنی ہیں۔ تمہیں اب زندگی کی جدّ و جہد میں نئے ارادوں اور نئی اولوالعزمیوں کے ساتھ قدم اٹھانا ہے اور اس قابلیت کو جو تم نے اس درسگاہ سے حاصل کی ہے۔ ایسے کاموں میں لگانا ہے جو تمہارے ملک کی نئی رفعتوں کا ساتھ دے سکے۔ اگر تم نے ملک کی ترقی پسند قومیت کی روح اپنے اندر پیدا کر لی جو تمہاری غیر جمہوری حکومت کا دستور العمل ہے جو تمہارے وطن کی کوئی بلندی ایسی نہیں ہو گی جہاں تک تمہارا ہاتھ نہ پہنچ سکے اور کوئی کامرانی بھی ایسی نہ ہو گی جو تمہارا استقبال نہ کرے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد (۱۸۸۴ء-۱۹۶۳ء) نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں خطبہ ۸ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو دیا جس میں فرمایا "جو ودیارتھی اس یونیورسٹی سے ڈگریاں حاصل کر کے زندگی کی دوڑ میں آج شامل ہونے کے لیے جا رہے ہیں ان سب کو مبارکباد دیتا ہوں اور میری یہ پرارتھنا ہے کہ بھگوان ان کا مستقبل سندر بنائے۔ ساتھ ہی میں یہ کہوں گا کہ ان کی کامیابی بہت کچھ ان کے اپنے خیالوں اور کاموں پر

بھی مخصر کرے گی۔

.... آدمی اپنی کوشش اور ہمت سے اپنے پرشارتھ سے اتہاس کے رُخ کو بھی بدل دیتا ہے اور اس طرح کے اُداہرن بھی بہت ملیں گے جہاں کسی ایک آدمی نے اتہاس کے رُخ کو بدلا ہے جس طرح بہتی ہوئی دھارا کے سامنے چٹان کی رکاوٹ پڑجانے سے دھارا دوسری اور رُخ کرکے بہنے لگ جاتی ہے۔ ہماری موجودہ تہذیب بہورنگی ہے اس میں انیک کاموں اور بچوں کی دین بنی ہوتی ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک نقشہ اتارنے کے لیے انیک طرح کے علمار اور کاریگروں کی ضرورت ہے۔ اس نقشہ کے بنانے میں کم از کم اسلام اور اسلام کے ماننے والوں نے بھارت کی تہذیب میں کیا پارٹ ادا کیا اور یہاں کی جنتا کی کیا خدمت کی ہے۔ اس بارے میں تو یہ یونیورسٹی ضرور نمایاں کام کر سکتی ہے۔

مجھے اس بات کی اُمید ہے کہ اس یونیورسٹی کے ودیارتھی، پروفیسر صاحبان اور منتظم اپنے تواریخی فرض کو سمجھتے ہیں اور ان کو پورا کرنے میں کوشاں ہیں اور مجھے پورا بھروسہ ہے کہ ان کی اس لگن کے نتیجہ کے طور پر اس یونیورسٹی کا مستقبل اس کے پچھلے دنوں سے بھی زیادہ شاندار ہوگا۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۸۹۷ء۔ ۱۹۶۹ء) نے ۲۷ جنوری ۱۹۵۷ء کو منعقدہ کانووکیشن میں فرمایا"....

اس دانشگاہ سے برابر دل کو تعلق رہا، گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق یہاں بہت کچھ سیکھا اور زیادہ نہ سیکھنے پر دلگیر ہونا سیکھا، ساری زندگی کو یہاں کے ناکام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا، یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا، اختلافات کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے۔ بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو برتنا اور پرکھنا سیکھا، اپنی قومی زندگی کے تمام سارے عیب برملا دیکھے، پر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں، اس کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں اپنے دل میں اُبھرتا ہوا محسوس کیا۔ اپنی خام تند مزاجیوں اور عاملانہ

سہ ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا۔ سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری سے شعلہ کی طرح بھڑک بھی اٹھے، مگر سچے کوئلہ کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا۔ صلاحیتوں کی جھجکتی کونپلوں کو نشو ونما دے سکنے کے لیے ان میں زندگی کے تند اور تیز ہواؤں سے بچانے کی حکمت مگر سیرت کی تعمیر کے لیے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار شامل ہونے کی ضرورت بھی یہیں پہچانی، خلوت وجلوت کی جدا جدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا، یہاں فرماں برداری سیکھی۔ اطاعت شعاری سیکھی، ادب سیکھا، بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب، چھوٹوں کا ادب، اور خود اپنا ادب، سعادت مندی اور وفاشعاری کے ساتھ خود اختیارانہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا۔

جس دھرے پر زندگی گردش کرتی ہے وہ سود وزیاں، آرام وتکلیف، حظ وکرب کا دھرا نہیں، وہ وعدہ ہے خواب وزشت کا، اعلیٰ وادنیٰ کا، ترقی اور انحطاط کا، بڑی کٹھن چیز ہے زندگی۔ پر بڑی دلکش چیز بھی ہے یہ، اعلیٰ کو جان کر ادنیٰ پر راضی ہونے کو معصیت جانتی ہے اور خوب سے خوب تر کی طرف بڑھے جانے کی پیہم سعی کا نام ہے۔ زندگی ایک مشن ہے، زندگی خدمت ہے، زندگی عبادت ہے۔ اس خدمت کو انجام دینے، اس مشن کو پورا کرنے، اس عبادت کا حق ادا کرنے کے لیے تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی فطری صلاحیتوں کا پتہ لگانا ہوگا اور ان میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنا ہوگا۔ بے لاگ فکر کی آنچ میں تپا تپا کر اور مخلصانہ عمل کے ہتھوڑے سے اسے کوٹ کوٹ کر اپنی زندگی کے مسالے کو استواری اور پائیداری بخشنی ہوگی، ارادہ کی قوت کو مشق سے مضبوط کرنا ہوگا۔ اور قابو میں لینا ہوگا تاکہ وہ بس کبھی کبھی ایک طغیانی عمل کی صورت میں اپنے کو نہ ظاہر کیا کرے بلکہ ایسا معتبر منبع ہو کہ اس سے ایک مدت تک توانائی حاصل کی جاتی رہے۔ اور ان کاموں میں اس کو لگایا جا سکے کہ جو واقعی کرنے کے کام ہیں اور جن کی ماہیت میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ اپنی تکمیل کے لیے ایک

زمانہ چاہتے ہیں۔ اپنی عقل اور سمجھ کی برابر تربیت کرنی ہوگی تاکہ ہمیشہ دوسروں کا ہی منہ نہ تکو خود فیصلہ کرسکو۔ خصوصاً ایسے فیصلے جو تم ہی اپنے لیئے کرسکتے ہو اور جن سے کوئی مفر نہیں ہوتا۔ تمہیں اپنی نظر کو برابر وسعت دینے کی کوشش کرنی ہوگی تاکہ دوسروں کا نقطۂ نظر بھی سمجھ سکو اور اس کے ردّ و قبول سے پہلے اسے بے تعصبی سے جانچ سکو۔ تمہیں اپنی زندگی کے تنگ شخصی دائرے کو وسیع کرکے اسے دوسری زندگیوں سے ملانا ہوگا۔ اپنی ہمدردیوں کو عام کرنا ہوگا۔ جماعتی ذمّہ داریوں کا بوجھ خوشی خوشی اٹھانا ہوگا۔ شخصی مفاد اور اپنے چھوٹے گروہ کے اغراض کو وسیع تر اور اعلیٰ تر اغراض کا تابع بنانا سیکھنا ہوگا۔ اپنے کام اور اپنے ماحول پر کبھی کبھی بیگانہ وار ناقدانہ نظر کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ جماعتی اور عمومی مسائل کو سائنٹفک تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کا اپنے کو خوگر بنانا ہوگا۔ اپنے شخصی اور جماعتی تعصبات پر کڑی نگرانی رکھنی ہوگی اور ہر طرح پروپیگنڈہ کی فریب کاریوں سے اپنے فکر و فہم کو محفوظ رکھنے کے جتن کرنے ہوں گے۔ اپنی زندگی میں یہ صفتیں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس لیئے کہ یہ کام کبھی نہ ختم ہونے والا کام ہے، اس کو ختم تک پہنچا کر جو لوگ زندگی کو کام میں لگانا چاہتے ہیں۔ انھیں پھر زندگی کی مہلت نہیں ملتی۔ ہاں تو ان کو پیدا کرنے کی کوشش کے ساتھ ہی ساتھ اپنے کو کسی قدرِ اعلیٰ کا خادم بنا لینا کہ جس سے آنی و فانی زندگی میں ثباتِ دوام کا رنگ آتا ہے اور بے معنی جیئے جانا بامعنی زندگی بن جاتا ہے۔ تمہارا راستہ تمہاری فطری انفرادیت سے شروع ہوتا ہے۔ اپنی انفرادی صلاحیتوں کی ہر جہتی نشو و نما کرکے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرکے یہ مستقل سیرت کے مقام سے گزرتا ہے۔ اور جب یہ سیرت کسی اعلیٰ قدرِ مطلق کی خدمت گزار بن جاتی ہے تو یہی راستہ شخصیت اخلاقی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ بہت دشوار گزار ہے مگر انسانی زندگی کے شایانِ شان راستہ یہی ہے اور باوجود اپنی صعوبتوں کے بڑا ہی دلکش ہے یہ راستہ۔ اس پر چلنے کے لیے کمر کس لو۔ میرے نوجوان دوستو مسافروں کا نگہبان اور راہ گیروں کا رکھوالا ہمارے سفر کو برکتوں سے بھر دے گا۔

پروفیسر محمد مجیب (۱۹۰۲ء۔ ۱۹۸۵ء) نے ۱۳ ستمبر ۱۹۵۷ء کو کانووکیشن

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

ایڈریس میں فرمایا"..... آپ نے بہت سے گڑھے دیکھے ہوں گے جو اپنے ماحول کی پستی کا اور اپنے خالی پن کا اعلان کرتے ہیں گویا یہ بھیک مانگنے کے پیالے ہیں۔ جن کو برسات کا پانی یا آس پاس کے نالے بھر دیا کرتے ہیں۔ اس میں پانی رہتا ہے مگر کس ذلت سے۔ آدمی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر کس کراہت کے ساتھ۔ پانی ان چشموں میں بھی ہوتا ہے جو پہاڑی کے سینہ سے پھوٹ نکلتے ہیں اور ان کی کیا شان اور کیا عزت ہوتی ہے۔ آدمی ان کے احساس اٹھاکر خوش ہوتے ہیں۔ ان پر ناز کرتے ہیں۔ ان کی دریا دلی کو اپنے لیے مثال مانتے ہیں۔ سوداگری کی نظر سے دیکھیے تو تالاب لینے والوں میں، چشمہ دینے والوں میں ہے۔ تالاب اپنا مال سمیٹ کر رکھتا ہے اور چشمہ اپنا مال لٹاتا ہے۔ آپ کو ان دونوں صورتوں میں جو پسند ہو اسے اختیار کیجیے۔ انجام بہرحال ایک ہے۔ چشمہ کا پانی بہتا رہتا ہے۔ تالاب کا پانی سوکھتا رہتا ہے۔

میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ دینے والا نقصان نہیں اٹھاتا۔ آپ نے پہاڑی چشموں کا انداز اختیار کیا تو شاعروں کے نغمے آپ کے سروں سے شرماتے رہیں گے۔ آپ دوسروں کی نظروں میں اپنے حسن ہی کی جھلک دیکھیں گے۔ آپ صاف شفاف پانی کو گدلا کرنے والے نہ ہوں گے۔ چشمہ کی شان و عزت اسی کو حاصل ہوسکتی ہے جو سکون کی آرزو کو دل سے نکال دے جو اس کے لیے تیار ہو کہ لوگ اس کے نغمے کو لوری سمجھیں۔ جسے دُکھ نہ ہو اگر اس کے فیض سے من مانے فائدے اٹھائے جائیں۔ اس عالم مثال میں صرف ایک مثال کافی نہیں ہے۔ نفع نقصان کی بات سمجھانے والوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ٹہنی میں لگے رہنا بہتر ہے چاہے کوئی کانٹا ہی کہلائے۔ اس میں گمنامی ہے مگر سلامتی بھی ہے۔ پھول بن کر نظروں کو للچانا۔ کسی کے حسن کی زینت بننے کے لیے شاخ سے جدائی اختیار کرنا حماقت ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کانٹا کیسے کانٹا بنتا ہے۔ پھول کس طرح کھلتے ہیں فائدہ اور نقصان دونوں طرح سے ہیں آپ کو اختیار ہے کہ جو چاہیں

نہیں۔ بس اتنا یاد رکھیئے کہ کانٹا چبھ کر بتا دے کہ وہ کیا ہے تب بھی پھول کو اپنی آبرو کا خیال رہتا ہے۔ وہ کھلتا ہے۔ اس کے زبان نہیں ہوتی۔

اگر آپ طے کریں کہ سودا نہ کریں گے ہندوستانی شہریت کی ذمہ داریوں کو بغیر کسی شرط کے قبول کریں گے۔ تو آپ کے لیئے ہندوستان سے بہتر کوئی ملک نہیں ہے۔ یہاں کی وسعت کو دیکھیئے، آبادی کو دیکھیئے اس غریبی اس جہالت اس قدامت پسندی اور تعصب کو دیکھیئے جو رفاہ کے ہر کام کو مشکل بنا دیتا ہے تو آپ کے دل پر وہ چوٹیں لگیں جو مردوں کے دلوں کو اور کہیں نصیب نہیں ہوتی ہیں۔ یہاں راستہ کی دشواریوں اور منزل کی دوریوں کو دیکھیئے تو آپ کے ایمان اور آپ کے صبر کی وہ آزمائش ہوگی جو اور کہیں نہیں ہو سکتی اور کہیں بھی حال کی ناکامیوں سے اس طرح مستقبل کی کامیابیوں کا یقین پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور کہیں بھی توفیق دل کو درد آشنا بنانے کا ایسا قطعی حکم نہیں دیتی اور کہیں بھی عشق کی بات اس طرح ویرانے میں نہیں کہی جاتی۔ آپ شہریت کا حق دل وجان سے ادا کرنا چاہتے ہیں تو دوسروں کے پاس دوڑ دوڑ کر نہ جائیے۔ رہنا تلاش نہ کیجیئے موتی سیپ کے اندر رہ کر بڑھتا ہے آپ پاتا ہے موتی بننے کی اور کوئی صورت نہیں۔ تسلی اور تسکین کی باتوں سے فریب نہ کھائیے۔ اپنا خیر خواہ اسی کو سمجھیئے جو آپ کے لیے دعا کرے کہ آپ کے کندھے بوجھ اٹھا اٹھا کر مضبوط ہوں۔ آپ کے پاؤں میں طاقت تھکنے سے پیدا ہو۔ آپ کا دل مصیبت کی آنچوں میں سونا بنے۔

لال بہادر شاستری (۱۹۰۴ء - ۱۹۶۶ء) نے ۱۹ دسمبر ۱۹۶۴ء کو کانوکیشن میں خطبہ دیا۔ خطبہ میں فرمایا "..... ہم کو اپنے کاموں کو بڑی ہوشمندی اور دیانتداری سے انجام دینا ہے۔ اس لیے ضروری کاموں کے لیے کام کرنے والے بھی بہت اچھے بہت مستعد اور ہوشیار ہونے چاہیئے۔ اس وقت ہماری نظریں طلبار پر ہیں اور ہم کو دیکھنا ہے کہ طلبار اپنے کاموں کو کہاں تک ٹھیک انجام دیتے ہیں۔ کام ہمیشہ اتحاد اور باہمی اتفاق سے کرنا چاہیئے۔ سادگی سے کام کرنے کا ڈھنگ سیکھنا چاہیئے اور عملی طور پر دیانتداری سے کرنا

سہ ماہی فکر و آگہی دلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

چاہیئے۔ اگر سب مل کر طاقت پیدا کریں تو طلبا راپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔"

عزت مآب گیانی ذیل سنگھ صدر جمہوریہ ہند نے ۲۹ر اپریل ۱۹۸۶ء کو کانوکیشن ایڈریس میں فرمایا"۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ میری نگاہ میں آپ کا تعلیمی ادارہ بڑی قدر وقیمت رکھتا ہے۔ ایسے اداروں کو مسلسل فروغ حاصل ہونا چاہیے۔ خاص طور سے جب میں علیگڑھ کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے اس اعلیٰ مقصد اور بلند نصب العین کا خیال آتا ہے جس کی بنا پر آپ کے اس ادارہ کو بلند اور ایک مخصوص اور محترم مقام حاصل ہے۔ بات یہ ہے کہ علیگڑھ بیک وقت عبارت ہے اس خدمت سے بھی جو اس نے ایک بڑے ہندوستانی فرقہ کی تعلیم کے سلسلہ میں انجام دی ہے اور سیکولرازم کے ان اصولوں سے بھی جو اس عظیم ادارہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہی ہے وہ قابلِ قدر ورثہ جو آپ کو اپنے ادارہ کے عظیم بانی سرسید نے عطا کیا۔

فرزندانِ علیگڑھ نے قومی تحریک کو فروغ دینے، ہندوستان کو غلامی سے آزاد کرنے کے لیے کامیاب بنانے کے لیے جو ہماری تھی اس میں نمایاں خدمات سرانجام دیتے ہوئے ایک بہترین حصہ لیا۔ ان کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

۔ ۔ ۔ ۔ اتنا میں ضرور کہے دیتا ہوں کہ جو ایکشن، جو دلیرانہ فیصلہ جو مصمم ارادہ انسان جوانی میں کر سکتا ہے، وہ جوانی کے جانے کے بعد نہیں کر سکتا اور مصمم ارادے سے انسان پہاڑوں کو چیر سکتا ہے لیکن کمزور ارادے والا تین فٹ کی دیوار بھی نہیں پار کر سکتا۔ اس لیے ہمیں اس جذبہ کو قائم رکھتے ہوئے ان کی ترتیب اچھے ڈھنگ سے کرنے کے لیے کوشش کرنی چاہیئے۔ اپنی تعلیم کے سدھارنے اور بہتر طریقہ سے تعلیمی زندگی گزارنے کی طرف آپ توجہ دیں۔ ۔ ۔ ۔ پولیٹکل لیڈر آپ کے لیے آئیں تو دور سے سلام کر دیں۔ ۔ ۔ ۔

میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ دو باتیں یاد رکھنا۔ ۔ ۔ ۔ علم وہی ہوتا ہے

جو کہ انسان کے دماغ میں یاد ہو اور سینہ میں رہے۔ وہ علم کام کم آتا ہے جو ہماری الماری میں پڑا رہتا ہے، ریفرنس بک کی طور پر۔ دوسری بات۔ اگر زندگی کے بوجھ کو آپ نے اٹھانا ہے تو قدم قدم پر رکاوٹیں بھی آسکتی ہیں۔ اس کے لیے یاد رکھئے۔ زندگی کے بوجھ کو ہنس کر اٹھانا چاہیئے۔ راہ کی دشواریوں پر مسکرانا چاہیئے۔۔۔۔ جب آپ دشواریوں کے سامنے جھکیں گے نہیں اور مسکراکر گزر جائیں گے تو وہ دشواریاں آپ کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکیں گی۔ لیکن آپ جہاں کہیں بھی ہوں، جس حیثیت سے بھی کام کر رہے ہوں آپ کو ملک کی عظمت اور بہبود کا خیال رکھنا ہوگا۔ آپ اس مادر درسگاہ کے قرضے کی کس طرح ادائیگی کر سکتے ہیں، میرے نوجوان دوستو! اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنی بساط بھر اس ملک کی تعمیر میں اپنا رول ادا کریں۔ غریبوں اور پسماندہ لوگوں کو، ان کی حالت کو سنوارنے کے لیے مدد کریں۔ اور ہندوستانی عوام کے اتہاس اور یک جہتی کے لیے خود کو وقف کر دیں۔۔۔۔ آپ کو بڑے بڑے عہدے ملیں گے، آپ بڑے بڑے افسر بنیں گے، لیڈر اور نیتا بنیں گے۔ لیکن یاد رکھنا کہ خدا کہاں رہتا ہے۔ غور سے دیکھ لینا۔

ظلم دیکھا تو شہنشاہوں کی بستی میں خدا دیکھا تو مفلسوں کی بستی میں

ان غریبوں کا خیال آپ اپنے دل سے کبھی نہ بھلائیں۔۔۔۔ یہ آدرش آپ کے ملک اور علیگڑھ دونوں کے لیے عظیم ترین خدمت ہوگی۔۔۔"

"علیگڑھ تحریک نے انسان اور باعمل انسان پیدا کیے۔ اس کی فضا نے انسانی اخوت اور مساوات اور بھائی چارہ کی روح پیدا کی۔"

(شیخ ممتاز حسین جونپوری)

سیّد حامد

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو درپیش مسائل

فرد ہو یا ادارہ، اس کے مسائل اس کی قامت کے مطابق ہوتے ہیں۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایک بڑی یونیورسٹی ہے، لہٰذا اس کے مسائل بھی بڑے ہیں۔ علاوہ بریں اس کی ایک تاریخ ہے۔ اس کا نقشِ اوّل، یعنی محمڈن اینگلو اورنیٹل کالج کھولا اس لیے گیا تھا کہ شکست خوردہ مسلمانوں کو پھر سے حوصلہ دے۔ انھیں نئے علوم سے روشناس کرائے، بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں سے انھیں عہدہ برآ ہونا سکھلائے، ان کو جہالت اور توہمات اور نقصان دہ رسوم اور عادات سے نجات دلائے، حکومت میں انھیں ساجھے داری بنائے یعنی سرکاری ملازمتوں میں انھیں نمائندگی دلائے۔ اس سے یہ بھی امید کی گئی تھی کہ وہ اردو زبان کو فروغ دے گی، اس کے گیسوؤں کو سنوارے گی۔ وہ اپنے فرزندوں کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور باہمی خیر اندیشی کا سبق دے گی۔ اس کے طلبا، خوش اخلاقی، خوش اطواری اور خوش گفتاری سے پہچانے جائیں گے مختصر یہ کہ علیگڑھ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا سرچشمہ کا ہو گا۔ دین اور دنیا دونوں میں سرخروئی کا ذریعہ بنے گا۔

سیّدِ والا گہر نے ایم اے او کالج کو اپنے خونِ جگر سے پروان چڑھایا۔ اسے جدید علوم اور تہذیبِ اخلاق کا مرکز بنایا۔ یہاں کے طلبا نے غیر معمولی

امتیازات حاصل کیے۔ شائستگی، خوش اطواری اور تہذیب ان کی پہچان بن گئی۔
علیگڑھ کے طالب علموں کا ایک نشانِ امتیاز یہ بھی تھا کہ حوصلہ پیش قدمی اور ذوقِ زندگی انھیں بے تاب رکھتا تھا۔ وہ کسی رکاوٹ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، انھیں نہ مرعوبیت سے سروکار تھا نہ مسکینی سے نہ خانہ نشینی سے۔ آزادی اور بٹوارے کے بعد حالات ناسازگار ہوئے اور شکوک وشبہات اور فسادات نے علیگڑھ کے طلبار کی ہمت کو توڑ دیا، ان کے اعتماد کو شکست کر دیا، دلِ زندہ انھیں داغِ مفارقت دے گیا۔ اس کے دل جوانی میں بجھ گئے جس درسگاہ کے فرزند معاش کی تلاش سے بے فکر رہا کرتے تھے بے روزگاری کے خوف سے ان کی فلک بوس صلاحیتیں کملا گئیں مولانا الطاف حسین حالی نے جو کچھ اپنے لیے کہا تھا وہ ان کے عزیز بچوں پر صادق آگیا۔

جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا۔ ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

علیگڑھ کا دائرۂ کشش اور میدانِ انتخاب پہلے پورا غیر منقسم ہندوستان تھا۔ اس زمانہ میں، یعنی بٹوارے سے پہلے، ہندوستان میں کل ۷ یونیورسٹیاں تھیں، جن کی تعداد بڑھتے بڑھتے اب ڈھائی سو کے قریب ہوگئی ہے کچھ تقسیم کے نتیجے میں، کچھ اس بنا پر کہ ہر ریاست میں کئی کئی یونیورسٹیاں کھل گئیں علیگڑھ کا میدانِ انتخاب یا دائرۂ کشش (Catchment Area) سکڑ گیا اور اس کی مرکزی حیثیت گھائل ہوگئی۔ اس کا اثر معیار پر پڑا۔ پہلے جو لڑکے (اور لڑکیاں) یہاں داخلہ لیتے تھے وہ بڑے وسیع علاقے سے آتے تھے، جب یہ علاقہ سمٹ گیا تو ان طلبار کی مجموعی صلاحیت اور امکانات میں بھی طبعی طور پر کمی آگئی۔

تقسیم کے ردِ عمل نے فضا کو ایک عرصے تک مکدر رکھا۔ ماحول جب تناؤ اور عدم سلامتی کا ہو تو پڑھائی میں دل کیسے لگے، تحقیق کی مشعل کیسے جلے۔ مغربی یوپی، خصوصاً میرٹھ، مراد آباد اور علیگڑھ میں فسادات ٹوٹ ٹوٹ کر آتے تھے اور فسادات کا خطرہ ذہنوں کا دامن گیر رہا۔ اس طرح طلبار کی بھرتی کا

میدان اور تنگ ہوگیا۔ دور دراز کے شہروں سے اپنے بچوں کو علیگڑھ بھیجتے ہوئے والدین کترانے لگے۔ اور یونیورسٹی میں علیگڑھ اور قرب وجوار کے طلبا کا غلبہ ہوگیا۔

فسادات کا سب سے زیادہ جراحت رساں اثر طلبار کی قیادت پر پڑا۔ راقم سطور کی طالب علمی پر تین اوپر ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ اس وقت طلبار کی قیادت خصوصاً طلبار یونین کی سیادت کا انحصار علمی لیاقت پر ہوتا تھا۔ یونین کے نائب صدر (اس وقت وائس چانسلر عہدۃً یونین کا صدر ہوتا تھا) کے لیے جو طلبار کھڑے ہوتے تھے ان کی اسناد کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوجاتی تھیں۔ تعلیمی امتیازات کے علاوہ وہ فنِ تقریر میں بھی طاق ہوتے تھے، اور ان میں جامع بحرین بھی مل جاتے تھے یعنی تعلیم اور کھیلوں میں بیک وقت گوئے سبقت لے جانے والے۔

تقسیم کے دوران اور تقسیم سے چند سال پہلے یونیورسٹی میں سیاست داخل ہوگئی تھی جس کا بہت برا اثر یونیورسٹی کی روایات پر پڑا۔ شیخ جامعہ، اور اس کے جلو میں اساتذہ کے لیے جو احترام ادب اور لحاظ تھا اس میں اچانک اس حد تک کمی آگئی کہ ڈاکٹر سر ضیار الدین کی شان میں طلبار رہنماؤں نے شرمناک گستاخی کی اور ان سے جبراً استعفیٰ لکھوالیا۔ آنکھوں کا پانی ایک دفعہ ڈھل جائے تو پھر واپس نہیں آتا۔ وائس چانسلر، ٹیچرس، بزرگوں اور سینئر طلبار کے دلی احترام کی روایت تقویم پارینہ بن گئی۔ روایت کے ظواہر باقی رہے، کھوکھلے پن کی دلیل بن کر۔ گویا خوش اطواری اور خوش کرداری سے، جو علیگڑھ کا طرۂ امتیاز تھی، ہماری یونیورسٹی یک گونہ محروم ہوگئی۔

سیاسی پارٹیاں تو ایسے موقعوں کی منتظر رہتی ہیں وہ احاطہ میں گو دگئیں انھوں نے کیمپس میں قدم جمانے کی کوشش وقتاً فوقتاً کیں۔ یہ پارٹیاں ان طلبا کو چن لیا کرتی تھیں جن میں ہنگامہ برپا کرنے کی صلاحیت ہوتی انھیں طمع ٹکٹ دی جاتی، خواب وزارت دکھائے جاتے۔ سارا ماحول سیاست آلود اور ہنگامہ آفریں بن گیا۔ سکہ اب تعلیمی صلاحیت کے بجائے، شورش اور سرکشی

کا چلنے لگا۔ وہ طالب علم جو تقریروں میں شعلہ فشانی کر سکتے تھے، نظم و ضبط کو آگ لگا سکتے تھے، عام طلبا کے ہیرو بن گئے۔

ایک معنی میں علیگڑھ یونیورسٹی اپنے وطنِ عزیز سے مشابہت رکھتی ہے ہندوستان آبادی کے بوجھ سے کراہ رہا ہے، یہی حال علیگڑھ کا ہے۔ آبادی کے دسپھوٹ کا تتمہ ہے۔ بے روزگاری اور بے روزگاری کا حوصلہ فرسا اندیشہ یہ کیفیت کیمپس کی ہے اور کیمپس سے باہر ملک بھر کی۔ دوسری یونیورسٹیوں میں بھی کم و بیش صورتِ حال اسی نوعیت کی ہے، لیکن علیگڑھ سے بہت کم۔ علیگڑھ کے طلبا کو بے روزگاری کے اندیشے بیشتر دوسری یونیورسٹیوں کے طلبا سے زیادہ ہوتے ہیں۔ انھیں یہ شبہ بھی رہتا ہے کہ محنت کر کے کیا ہوگا، ہمارے ساتھ انصاف تو نہیں کیا جائے گا۔ نوکری ہمیں ملنے سے رہی۔ ملازمت کے لیے انتخاب کرنے والے ترجیح اپنوں اپنوں کو دیں گے۔ ہمارا نام ہی ہمارے خلاف جائے گا۔ ان شبہات میں اصلیت کتنی ہے اور مبالغہ کتنا اس کی تنقیح اس وقت ضروری نہیں ہے۔ الغرض جب کھلے ہندوستان میں روزگار ملنے کے امکانات پیدا ہوتے دکھائی دیتے ہیں تو بہت سے طالب علموں کو گمان ہوتا ہے کہ یونیورسٹی نے تعلیم دی ہے تو ملازمت بھی وہی دے گی لہٰذا کوشش کرو صدرِ شعبہ کو خوش رکھنے کی تاکہ بالآخر لکچرر کی جگہ مل جائے۔ یا پھر دفتر میں ہی سینگ سما جائیں۔ اور اگر ایسا بھی نہیں ہوتا تو جب تک علیگڑھ میں بحیثیت طالب علم کے وقت گزارا جا سکے گزار لیا جائے۔ اپنے قیام کو طول دے دو۔ آپ ہی فیصلہ کیجئے کیا ایسا ماحول اور ایسے منصوبے معیارِ تعلیم و تحقیق کو اونچا کر سکتے ہیں؟

اس طرزِ فکر کے پھل ہمارے سامنے ہیں جس مرض کو "ان بریڈنگ" یا داخلی نسل کشی کہا جاتا ہے۔ اس کا شکار "یو۔جی۔سی" کے بقول سب سے زیادہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ بہت سے اہلِ اختیار اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ اپنے عزیزوں کو فیکلٹی یا دفتر میں کسی نہ کسی طرح بھرتی کرا دیں۔ اس قسم کا تقرر ہمیشہ نا اہلوں کی منفعت کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ کئی خاندان علیگڑھ میں ایسے ہیں جس کے افراد یونیورسٹی ملازمت کے مختلف شعبوں پر چھائے

ہوے ہیں۔ چور دروازے سے جو لوگ داخل ہوتے ہیں وہ چوری سے باز نہیں آتے۔ خود نااہل ہوتے ہیں تو اپنے ڈپارٹمنٹ میں خوف پردہ دری سے کسی اہل کو داخل نہیں ہونے دیتے۔ یہ لوگ جوان پریڈنگ" کے طفیل باہم گھتے ہوئے رہتے ہیں۔ ہر ایسی اصلاحی کارروائی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں جس سے ان کے کسی عزیز و اقارب کو جراحت پہنچ سکتی ہو۔ اسی وضعِ انتخاب نے یونیورسٹی میں انتظامی عملہ کی تعداد کو بہت بڑھا دیا ہے جو اپنے مسائل آپ لاتا ہے۔ اور شیخ جامعہ کے وقت کو ضائع کرتا ہے۔ اس کی خواہشات اگر پوری نہیں ہوتیں تو وہ ہنگامہ خیزی میں طلبا یا اساتذہ یا دونوں کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔

بندلہ سنج کہتے ہیں کہ علیگڑھ میں قفل سازی سے بڑھ کر بھی ایک صنعت ہے، اسے افواہ سازی کہتے ہیں۔ اس صنعت کو نظم شکنی میں بڑا دخل رہتا ہے۔ غلط افواہ اڑادو اور جو چاہو باور کرادو۔ اسی صنعت کے بل پر چھٹی دہائی کے بیچوں بیچ وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ پر حملہ کر دیا گیا۔ ادب اور لحاظ کے تابوت میں گویا یہ آخری کیل تھی جو ٹھونکی گئی۔

مذکورہ بالا تمام انحرافات کے باوجود علیگڑھ میں بیشتر طلبا امن وامان اور نظم و ضبط کے قائل ہیں اور اس وصف میں وہ درحقیقت بہت سی یونیورسٹیوں کے طالب علموں سے بہتر ہیں۔ یہ ستم نہیں تو کیا ہے کہ بعض اوقات مٹھی بھر شر پسند طلبا اکثریت پر چھا جاتے ہیں، اسے ڈرا دھمکا کر اپنی روش پر چلاتے ہیں، اسے بہکاتے ہیں، ڈراتے ہیں، بھڑکاتے ہیں اور اس کو ساتھ لے کر یونیورسٹی کی انتظامیہ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان کو بالعموم شہ ملتی ہے ان اساتذہ سے جنھیں وائس چانسلر سے شکایت ہوتی ہے اور جو اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے شاگردوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کی خود غرضی کا ناطہ ادارہ دشمنی سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اساتذہ کو وائس چانسلر سے اکثر اس بنا پر خصومت ہو جاتی ہے۔ کہ تقرر یا ترقی کے لیے انھیں نظر انداز کر دیا گیا ترقی کی اندھی تمنا میں وہ اپنی نااہلی کو بھول جاتے ہیں۔ ہندوستان میں

اعلیٰ تعلیم کا یہ بڑا سانحہ ہے کہ بسا اوقات اہلیت پر خارجی مصالح کو ترجیح دی جاتی ہے۔ علیگڑھ میں یہ نااہل پروری اس لیے کچھ زیادہ ہی ہے کہ یہاں اگر ملازمت نہ ملی تو کسی دوسری یونیورسٹی میں ملازمت ملنے کا امکان بہت موہوم ہو جاتا ہے۔ نااہل پروری اور اقربا پروری کے سرحدیں اکثر مل جاتی ہیں معیار کی قلمرو میں یہ فساد سر اس لیے اٹھاتا رہتا ہے کہ مسلمان کچھ عرصے سے مقابلے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔ اگر یہ صلاحیت ان میں ہوتی تو وہ یہ کہتے ہوئے علیگڑھ سے چلے جاتے:

ملک خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست

رزق کے دروازے اللہ کی وسیع کائنات میں کھلے ہوئے ہیں۔ علیگڑھ میں نہیں چُنے گئے تو کیا، ہماری لیاقت ہمیں دوسری جگہ منتخب کرا دے گی کینوس سے نکلنے کی ہم میں سکت نہیں رہی۔ اسی لیے اب کینوس میں رہ کر نجی منصوبے بنانے اور سازش کرنے سے مفر نہیں ہے۔ نااہلوں کی ناکامیابی کی ضرب وائس چانسلر پر پڑتی ہے اور معیارِ تعلیم پر۔ بعض ممالک میں اربابِ تعلیم نے یہ صحت مند روش اپنائی ہے کہ کسی طالب علم کو پہلی ملازمت اپنی یونیورسٹی میں نہیں ملے گی۔ اس لیے وہ خارجی سہاروں سے بے نیاز ہو کر دوسری یونیورسٹیوں میں قسمت آزمائی کرتا ہے، اس کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ دماغ روشن ہوتا ہے۔ پھر اس کی ضرورت بھی نہیں رہتی کہ وہ اپنی یونیورسٹی میں واپس آئے بھی۔

۱۹۶۵ء کے ہنگامے بعد مسلمانوں نے یونیورسٹی کی خود اختیاری اور اس کے اقلیتی کردار کی بازیابی کے لیے ایک ملک گیر تحریک شروع کی جس کی مدّتِ حیات پندرہ سال کو پہنچی۔ اس کا اثر بھی معیار پر پڑنا تھا، سو پڑا۔ ۱۹۸۱ء میں نیا ترمیمی ایکٹ پاس ہوا جس میں ایکشن کمیٹی کے مطالبات کو بڑی حد تک مان لیا گیا۔ اس ترمیمی ایکٹ اور "اسٹیٹوٹ" (Statute) کی دو دفعات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں؛ ایک کی دفعہ ج (۵) ۲ یونیورسٹی کو یہ اختیار دیتی ہے بلکہ یونیورسٹی پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کے لیے تدبیر کرتی رہے۔ بدقسمتی سے یونیورسٹی نے اس دفعہ کا

پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔

دوسری دفعہ "اسٹیٹوٹ" (Statute) کا جزو ہے۔ یہ وائس چانسلر کے طریق انتخاب کو متعین کرتی ہے۔ دوسری اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں تین ممتاز افراد کی ایک کمیٹی بنائی جاتی ہے۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ ایسے تین اشخاص کو تلاش کرے جنھیں وہ اس درسگاہ کی سربراہی کے لیے موزوں سمجھتی ہے۔ وزیٹر یا چانسلر ان تین میں سے نظر بہ استحقاق، ایک کو چن لیتا ہے۔

ہماری یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے طریق انتخاب کو بدل دیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں وائس چانسلری کے امیدوار پہلے مرحلے ہی سے بے نقاب ہو جاتے ہیں اور دو اور مرحلوں سے اسی طرح بے حجاب گزرتے ہیں کیمپس میں (اور اس کے باہر بھی) کچھ لوگ ان کے مؤید بن جاتے ہیں، کچھ مخالف۔ آتش بازی چھوٹتی ہے، اس میں بہتیرے جھلس جاتے ہیں اور مخالفین و موافقین کے گروہ وائس چانسلر کے انتخاب کے بعد بھی گرم عمل رہتے ہیں۔ لاریب یہ طریقہ بھونڈا ہے اور اس اعلیٰ منصب کے وقار اور ادارہ کے مصالح کے خلاف ہے۔

آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ہماری یونیورسٹی میں کون سے عناصر اور حوادث معیار شکن ثابت ہوئے ہیں۔ معیار میں بہتری لانے کے لیے اساتذہ کو زبردست کاوش کرنی پڑے گی اور ان کے ساتھ طالب علموں کو بھی۔ یہ روش اب ترک کر دیجئے کہ وائس چانسلر کے احتساب سے بچنے کے لیے جھاڑیوں میں جا بجا آگ لگا دی جائے تاکہ اس کا سارا وقت آگ بجھانے میں صرف ہو جائے اور یونیورسٹی کو فروغ دینے، توسیع دینے اور چمکانے کے جو خواب دیکھتا ہوا وہ آیا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر ہونے ہی نہ پائیں۔ یونیورسٹی ایکٹ تجربہ کی روشنی میں کئی تبدیلیوں کا طالب ہے۔ نہ صرف ایکٹ بلکہ بعض ذیلی قوانین اور رسوم بھی۔ ان تبدیلیوں کو لانے کے لیے رائے عامہ تیار کرنی ہو گی۔ بہتر داخلے اور بہتر تقرریں، یونیورسٹی کی اصلاح اور ترقی کے لیے ان دونوں کی ضرورت ہے۔ اصلاح کی کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک

کہ یونیورسٹی میں طلبار کی آبادی کو اس کی تعلیمی اور اقامتی صلاحیتوں کے مطابق کم کیا جائے۔ پندرہ ہزار سے جہاں آبادی بڑھی خلل رونما ہوگا۔ یونیورسٹی کے اسکولوں کا معیار خود یونیورسٹی کے معیار کو متاثر کر رہا ہے اس کا مداوا بھی لازمی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے مسلم اسکولوں کے معیار کی طرف بھی توجہ دیجئے کہ وہ بڑی حد تک یونیورسٹی کے "فیڈر" کا رول ادا کر رہے ہیں۔ یونیورسٹی کو ایسا کرنے کا قانونی اختیار ہے اور اسے ایسا کرنا چاہیئے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اگر اشتراک عمل پر راضی ہوجائیں تو مسلمانوں کے بہت سے مسائل ان تین کیمپوں کے اندر ہی حل ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کو انہی یونیورسٹیوں کے تیئں ہندوستان بھر میں ایک باخبر رائے عامہ بنانی چاہیئے۔ اس طرف حال ہی میں ایک قدم اٹھایا بھی گیا ہے۔

یاد رکھیئے کہ وہ دور کبھی کا ختم ہوگیا جب تعلیم کے میدان میں مقدار یا تعداد پر قناعت کی جا سکتی تھی۔ یہ دور زہرہ گداز مقابلہ کا دور ہے۔ کسب فضیلت کے بغیر اب بات نہیں بنے گی۔ گہوارہ سے لے کر یونیورسٹی کی منزل تک ایک طویل اور غیر منقطع سلسلہ ہے باخبری، روشن دماغی اور مہارت کے مراحل طے کرنے کا۔ اور اقلیت کے لیے تو صلاحیت آزمائی اور کسب فضیلت کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب بھی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ہمارا سب سے گرانقدر اثاثہ ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم ایک ہمہ جہت کوشش، اعلیٰ معیار کی بازیابی کے لیے کریں۔ منجملہ اور باتوں کے اگر ہمارے اسکولوں کا معیار فروغ پاتا ہے تو اس کا خاطر خواہ اثر خود بخود ہماری یونیورسٹیوں کے معیار پر پڑے گا۔ باخبری اور عام ارتفاعِ معیار کے لیے ہمیں اپنے اسکولوں کی خبر لینی پڑے گی۔ یہ ایک طویل زنجیر ہے جس کی کسی ایک کڑی کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اور ہمارے یہاں جو اہلِ سیاست ہیں وہ یونیورسٹی میں دخل اندازی سے توبہ کریں کہ یہ بہت جلد خلل اندازی اور معیار شکنی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہمارے اہلِ بصیرت پر یہ واجب

ہے کہ یونیورسٹی کو تحتِ نظر رکھنیں اور اس کے لیے طویل مدّتی پلان اور پالیسی بنانے میں وائس چانسلر کا ہاتھ بٹائیں۔ یہ بھی طے ہو جائے کہ وائس چانسلر کے منصب میں تبدیلی کی بنا پر یونیورسٹی کی پالیسی میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔ بظاہر یہ کام دشوار نظر آتے ہیں لیکن ترتیب اور تنظیم اور اخلاص کے ساتھ کیے جائیں تو سہل ہو جائیں گے۔

ان سطور کو ہم ختم ہی نہیں کر سکتے جب تک کہ ابلاغی انقلاب یا انفارمیشن ٹکنالوجی کی ہمہ گیر اہمیت کا اندازہ نہ کر لیا جائے۔ اس نو دریافت وضعِ اطلاعات کے دامن کو ہمیں دوڑ کر پکڑنا ہوگا۔ ورنہ ہم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹتے چلے جائیں گے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو اس انقلاب میں بھر پور حصّہ لینا چاہیے۔

ہم ابھی تک تعلیم کے محاذ پر مقدار یا تعداد میں اپنے اہلِ وطن سے پیچھے ہیں، ہماری لڑکیاں تو عبرتناک حد تک ہیں۔ بیک وقت مقدار کی کمی کو پورا کرنا ہے اور معیار کے نقص کو دور کرنا ہے۔

یہ سب کچھ خود بخود نہیں ہو جائے گا۔ اہداف بنایئے اور ان کو حاصل کرنے کے لیے پسینہ بہایئے، ورنہ اپنے وجود کو بھول جایئے۔

یہ سطور پایاں کو پہنچ نہ پائی تھی کہ یونیورسٹی پر پھر یلغار ہو گئی اور وہ بیرونی یورش اور داخلی انتشار کا شکار ہو گئی۔ بڑی جستجو اور چھان پھٹک کے بعد وائس چانسلر کا انتخاب ہوا۔ حامد انصاری صاحب نے جو کئی ملکوں میں ہمارے سفیر اور اقوامِ متحدہ میں ہندوستان کے مستقل نمائندہ رہ چکے تھے۔ زمامِ اختیار سنبھالی ہی تھی کہ داخلے کے نا اہل امیدواروں اور ان کے حمایتیوں نے یونیورسٹی کو سر پر اٹھا لیا اور وائس چانسلر کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اپنی یونیورسٹی میں ہمیں داخلہ نہیں ملے گا تو ہم کہاں جائیں گے۔ غرض میں اندھے تو کہ یہ لوگ بھول گئے کہ یونیورسٹی کب فضیلت کے لیے قائم کی گئی تھی، نا اہلوں کو داخلے ملیں گے تو اس کا معیار تحت الثریٰ کو چھوئے گا۔ انھیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یونیورسٹی کی ایک صلاحیت، ایک گنجائش، ایک مکانیت

ہوتی ہے۔ تعلیمی صلاحیت اور اقامتی صلاحیت، تعداد اگر صلاحیت سے بڑھ گئی تو معیار گھٹ کر رہے گا۔ معیار گھٹ گیا تو بچا کیا؟ پھر ہمارے طالبعلم کہاں منہ چھپائیں گے۔ مقابلہ کے دور میں انھیں کون پوچھے گا؟ وائس چانسلر پر ہر طرح سے دباؤ ڈالے گئے چنانچہ گزشتہ پندرہ سال کے اندر طلبار کی آبادی پندرہ ہزار سے بڑھ کر ۲۰ ہزار پہنچ گئی۔ یونیورسٹی کے کسی خیر خواہ ملت کے کسی راہنما نے انگلی تک نہیں اٹھائی کہ زنہار صلاحیت سے زیادہ داخلے نہ کیجیے۔ جس وائس چانسلر نے نا اہلوں کو داخلہ میں روک لگائی اس کی بادری اور دستگیری کرنے والا نہ کیمپس کے اندر کوئی اٹھا نہ اس وسیع ملک میں۔ اس نے ہر طرف مخالفتیں مول لیں۔ کوئی سر پھرا شیخ جامعہ اگر اصول پر اڑ جائے تو احاطہ میں احتجاج کو تشدد کی شکل اختیار کرتے ہوئے دیر نہیں لگتی ضلع کی انتظامیہ سے امن قائم کرنے کے لیے امداد مانگی جائے تو وہ کہتی ہے کہ ہمارے (نا اہل) امیدواروں کو داخلہ دینے سے انکار کرتے ہو تو ہم کیوں تمہاری مدد کرنے کو آنے لگے۔ ایسا حال ہی میں ہوا۔ وائس چانسلر کے لیے ایسی صورت میں اس کے سوائے چارہ نہیں رہتا کہ ہر دو قبیل کے نا اہل امیدواروں کو داخلہ دے کر امن خریدے۔

یہ مسئلہ پوری توجہ کا طالب ہے، مسلمان رہنماؤں اور کورٹ میں ملت کے نمائندوں کو چاہیئے کہ فروعی باتوں کو چھوڑ کر اور سفارش گری کو ترک کر کے داخلہ کے مسئلہ کو جو ہر سال نظم و ضبط کو شکست کرتا ہے، حل کر حل کریں اور وائس چانسلر کی اہلیت پر مبنی داخلہ کی پالیسی کی عملی تائید کریں۔ ایک ماہر تعلیم کا یہ بھی خیال ہے کہ موجودہ قوانین کے تعبیر نو میں ترمیم کر کے یونیورسٹی کی بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھتے ہوئے اس کا ایک دوسرا کیمپس کھولا جائے۔ یہ بات بہر کیف ضروری ہے کہ ہر سال داخلوں میں کمی کر کے آئندہ چھے سال میں طلبار کی آبادی کو ۱۵۰۰۰ ہزار کی سطح پر لے آئیں۔ لیکن اس کے لیے ملت کی نمائندے سے ایک سخت اور جانگداز فیصلہ درکار ہوگا۔

میں حالیہ واقعات کی طرف اب پھر لوٹتا ہوں۔ کچھ عرصے سے نوجوانوں

کے ایک غیر محتاط اور غیر معتدل جماعت نے یونیورسٹی میں شعلہ بار تقریریں شروع کر دی تھیں۔ ان نا عاقبت اندیشوں نے اس طرح یونیورسٹی دشمن عناصر اور اخباروں کو ایندھن فراہم کر دیا۔ زورِ خطابت اور جوشِ قیادت میں یہ نوجوان حدود کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ہماری حیثیت اپنے وطن میں اقلیت کی ہے اور اقلیت بھی ایسی جو مشتبہ ہو اور جسے مبعوث ہوتے دیر نہ لگتی ہو۔ یہ نادان لن ترانی اور بے سر و پا باتیں بہ بانگِ دہل کرنے لگتے ہیں۔ الزام تراشنے والوں اور گھات میں رہنے والوں کو موقع مل جاتا ہے، وہ چلّانے لگتے ہیں کہ یونیورسٹی "آئی ایس آئی" کا اڈہ ہے اور یہاں کے طالب علموں کی وطن دوستی مشکوک ہے۔ نئے وائس چانسلر داخلوں کے ریلے سے سنبھلے ہی تھے اور بعد از خرابئ بسیار یونیورسٹی کو معمول پر لائے ہی تھے کہ پولیس والوں نے کیمپس سے "بی یو ایم ایس" کے ایک انٹرن (Intern) مبین احمد کو اٹھا لیا۔ گویا فتیلے میں آگ لگا دی۔ اس سے زیادہ مؤثر کوئی طریقہ یونیورسٹی کے نظم و ضبط کو درہم برہم کرنے کا تصور میں نہیں آسکتا تھا کہ "آئی بی" ایک اہلکار ایک ہوسٹل کے کمرے میں بلا اجازت گھس آیا، لڑکوں نے اسے اپنی حراست میں لے لیا اور اپنے شعبہ اور مذکورہ طالب علم کی گرفتاری کے خلاف ایک بیان دینے پر اسے مجبور کر دیا۔ کہتے ہیں کہ پکڑے جانے کے دوران اس اہلکار کو چوٹیں بھی آئیں۔ اب کیا تھا اربابِ اختیار یہ بھول گئے کہ یہ معاملہ طالب علموں کا ہے جن کے ساتھ مصلحتاً اغماض برتا جاتا ہے۔ دونوں حکومتوں نے یونیورسٹی سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وائس چانسلر پر دباؤ ڈالا گیا کہ ۱۲ افراد کو جنھیں اس اہلکار نے نامزد کیا تھا، ضلع پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ مطالبہ کرتے وقت انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اگر وائس چانسلر نے ان کی بات مان لی تو یونیورسٹی جل کر خاکستر ہو جائے گی۔ اس کے بعد الٹی میٹم دیا گیا کہ یا تو ہمیں یونیورسٹی کے سارے ہوسٹلوں میں عام تلاشی لینے دو یا یونیورسٹی کو بند کر دو۔ علیگڑھ کے وائس چانسلر پر کون رشک کرے گا۔ ضلع والے ایک طرف، پولیس والے

وسری طرف، یو۔ پی کی سرکار تیسری طرف اس کا محاصرہ کر رہے ہیں۔ یہ آگ
بالآخر شاید مرکز کی مداخلت سے ٹھنڈی ہوئی۔ وشو ہندو پریشد کی عداوت
ور حکومت کی مخالفت اور متعصبانہ روش ہی اس تباہ کاری کے لیے
مہ دار نہیں ہے۔ اس میں کم فہم اور کوتاہ بیں اور شدت پسند اور آتش بیاں
طلبا کا بھی ہاتھ ہے۔ ایسی کوئی بات کسی مسئلہ پر ان کی زبان سے نکلنی ہی
نہیں چاہیے جس سے کسی عنوان بھی یونیورسٹی کی وطن دوستی اور طلبا کی
ئین نگہداری پر حرف آتا ہو۔ اگر وہ کسی طالب علم کو انتہا پسندی کی طرف
جاتے ہوئے دیکھیں تو انھیں چاہیئے کہ اس پر نظر رکھیں اور اسے ٹوک
یں اور بڑھ چڑھ کے باتیں کرنے سے اسے روک دیں۔ مبین احمد پر
و الزام لگایا گیا ہے اگر وہ صحیح ہے تو اس نے اپنی حرکت سے یونیورسٹی
و اتنا بڑا نقصان پہنچا دیا ہے جو یونیورسٹی کا بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں
ہنچا سکتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے آگرہ میں بم وسپوٹ کا نہ صرف
قرار کیا ہے بلکہ اس کی نشاندہی پر اس نوع کے کئی جرائم پولیس کی نگاہ
یں یا یہ ثبوت کو پہنچ گئے ہیں۔ واللہ اعلم۔ طلبا کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ
اصرہ میں ہیں، مشکوک ہیں، معتوب ہیں۔ ان میں سے ذرا سی بھی غفلت
ی زبان یا ہاتھ سے سرزد ہوئی تو ساری یونیورسٹی خطرے میں پڑ جائے
ی۔ یونیورسٹی میں ہنگامہ کا اثر براہِ راست طلبا کے مستقبل پر پڑتا ہے۔
یک طرف پڑھائی برباد ہوتی ہے دوسری طرف ملازمتوں کے دروازے
ارے طلبا پر بند ہو جاتے ہیں۔ کاش کہ طلبا کو دو اہمیتوں کا اندازہ ہو جائے۔
۱) مسلمانوں کی ترقی، وقار اور خوشحالی کے لیے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں
من وامان اور نظم و ضبط کی اہمیت یا (۲) طلبا کے مستقبل کے لیے ان پانچ
الوں کی اہمیت جو ایک طالب علم اوسطاً یہاں گزارتا ہے۔ اس کا کیریر
س کا مقدر اسی عرصے میں بنتا ہے۔ یہ دور تعمیر و تشکیل، ریاضت اور پیشرفت
ا دور ہے۔ احتجاج، غفلت، تخریب اور تشدد کا دور نہیں ہے۔
یہ بات بھی اب عام طور پر تسلیم کی جانے لگی ہے کہ یہاں کے اساتذہ

کی لیاقت کا معیار گزشتہ دس بارہ بلکہ پچیس تیس سالوں میں تیزی سے گرا ہے ان کی لیاقت کو بڑھانے کے لیے بڑے جتن کرنا پڑیں گے۔ منجملہ دوسری اقدامات کے "کوالٹی امپرو ومینٹ پروگرام" سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے، اور رواں اور سخت گیر احتساب کو رواج دیا جائے۔

اردو زبان کے فروغ کے تئیں علیگڑھ کا جو فرض تھا اسے اس نے بھلا دیا ہے۔ وہاں کے طلبا زیادہ تر اردو سے بیگانہ ہیں۔ اس ضمن میں یونیورسٹی کو اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنا چاہیئے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ یونیورسٹی راتوں رات تعلیم و تحقیق کے معیار کو مقام امتیاز پر پہنچا دے۔ دو باتیں یہ تاہم کر سکتی ہے۔ ایک تو کھیلوں میں اپنی گم گشتہ عظمت کو بازیاب کرنا، دوسرے خطابت میں وہی امتیاز حاصل کرنا جس کے لیے یونیورسٹی مشہور تھی۔ خطابت ویسی نہیں جس کی مثالیں آج جا بجا کوچہ و بازار میں آپ کو مل جائیں گی۔ اور جسے اہلِ سیاست نے اپنا شعار بنا لیا ہے بلکہ وہ خطابت جس میں بتدریج موضوع کی پرتیں اور اس کے مضمرات بہ طرزِ استدلال کھولے جاتے ہیں۔

پارلیمنٹ نے ۱۹۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو مکلف اور پابند کیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی پیش رفت کے لیے سرگرم عمل ہو۔ یہ ایک بڑا اچھا موقع تھا۔ جو حکومت کی بے مہری اور یونیورسٹی کی غفلت کی وجہ سے ہاتھوں سے جا رہا ہے۔

کیمپس کے باسیوں کے مزاج کو بدلنا چاہیئے۔ یہ لوگ ہر کام سید والا گہر کی ہدایت، روش اور منشا کے خلاف کرتے ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے آگ میں خود کو اور اپنے ادارہ کو جھونک دیتے ہیں، جلدی فیصلہ کر بیٹھتے ہیں اور مدتوں پچھتاتے رہتے ہیں۔ مقدار پر جان دیتے ہیں، معیار سے گھبراتے ہیں، کتراتے ہیں۔ مقابلہ اور محنت سے دامن بچاتے ہیں، آسائش اور بے عملی کو حاصلِ زندگی سمجھتے ہیں۔ واقعات اور حوادث اور مسائل کو

عقل کی روشنی میں نہیں پرکھتے، فکر کے ناخن سے نہیں سلجھاتے۔ بھیڑ بھڑیا لوگوں
کی طرح جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ الفاظ کو ناپتے تولتے نہیں۔ جو منہ میں
آتا ہے کہہ ڈالتے ہیں۔ یہ طریقے اہلِ ظرف، اہلِ علم و حلم اور اہلِ وقار کے نہیں
ہوتے۔ یہ طور ہمیں سید والا گہر نے ہرگز نہیں سکھلائے۔ ہم اپنے ہر عمل
سے اپنی بے راہ روی، اپنی کج نگاہی، اپنی سطح بینی اور ناعاقبت اندیشی سے
ہر آن اس بطلِ جلیل کی روح کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ہو کیا گیا ہے ہندوستانی
مسلمانوں کی قیادت کو، وہ اپنے نفع نقصان سے اتنی بے نیاز کیوں ہو گئی
ہے؟ وہ اپنے نونہالوں کو راہِ راست پر چلانے یا لانے کی کوشش کیوں
نہیں کرتی۔ وہ ان کی عادتوں کو بگڑنے کیوں دیتی ہے؟ کیا اس میں یہ بصیرت
نہیں کہ بات کی تہ تک پہنچ سکے۔ کیا اس میں اتنی جرأت نہیں کہ غلط چلنے
پر نونہالوں کو ٹوک سکے۔ کیا وہ جا و بیجا طلبا کی تائید اور یونیورسٹی انتظامیہ
کی تکذیب قبولِ عام حاصل کرنے کے لیے کرتی ہے۔ اسے اندازہ نہیں
کہ خود یونیورسٹی کو ملت اور ملک کو اس مقبولیت کی کتنی قیمت چکانا پڑتی
ہے۔ کیا وہ نہیں جانتی کہ شخصیت کا نشو و نما نظم و ضبط سے ہوتا ہے اور
تعلیم و تحقیق کو یکسوئی درکار ہوتی ہے۔ کیا اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ وائس چانسلر
کے انتخاب میں ہفتوں طے کرنا پڑتی ہے۔ یونیورسٹی کا یہی رنگ رہا
اور طالب علموں اور اساتذہ کے یہی ڈھنگ رہے تو کوئی بھلا آدمی کوئی
لائق انسان، کوئی کارپرداز دانشور کیونکر ایسا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار
ہوگا جس کے تلے نہ عزت محفوظ رہتی ہے، نہ سلامتی، نہ صحت، نہ وقار،
نہ سکون۔ کیا ہم اپنے بہترین دماغوں، اپنے برگزیدہ شہریوں کو ان کے
اواخر ایام میں جراحتیں پہنچانے اور رسوا کرنے کے لیے چنتے رہیں گے۔
وائس چانسلر کے طریقِ انتخاب کو بدل دیجئے۔ انتخاب سرچ کمیٹی
کے ذریعہ کیجیے۔ سرچ کمیٹی کے ایک ممبر کو "ای سی (ایگزیکیٹو کونسل)
نامزد کرے اور دو کو یونیورسٹی کورٹ۔ یہ کمیٹی تین ناموں کا ایک پینل "وزیر"
کو بھیج دے جن میں سے بالآخر ایک نام کو چننے کا اختیار وزیر

(صدرِ مملکت) ہوگا۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعلق بعض دردمند حلقوں میں کبھی کبھی کہا جاتا ہے کہ علیگڑھ میں حکومت مداخلت کرتی رہتی ہے۔ اس جنجال سے دامن بچا لیجئے۔ اپنی یونیورسٹی خود قائم کر لیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ حکومت کی مداخلت کی حکایت کو بہت بڑھا دیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کی پالیسی میں حکومت مداخلت نہیں کرتی اور یونیورسٹی کی ساری ضروریات کو بغیر ماتھے پر بل ڈالے پورا کرتی رہتی ہے۔ البتہ معاملہ جب نقضِ امن کا ہوتا ہے تو متعلقہ سرکاری ایجنسی کو ہاتھ ڈالنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ کام انتہائی بھونڈے اور اشتعال انگیز ڈھنگ سے کیا جاتا ہے۔

جہاں تک اپنی یونیورسٹی۔ اس پایہ اور اس قد و قامت کی یونیورسٹی کھولنے کا تعلق ہے یہ ہمارے بوتے کی بات نہیں۔ حکومت یونیورسٹی کے اخراجات کے لیے دو سو کروڑ روپے سالانہ دیتی ہے۔ ہمارے لیے بیس کروڑ سالانہ جمع کرنا بھی مشکل ہوگا۔ اس سے بڑھ کر ہمیں بڑی خجالت کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہم میں اتنے بڑے ادارہ کو چلانے کی صلاحیت فی الوقت بالکل معدوم ہے۔ وزیر کی نگرانی اور اس کا احتساب شاملِ حال نہ ہو تو ہمارے طالع آزما یونیورسٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔

راقم نے یونیورسٹی کے حالات پوست کندہ قارئین کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ ناخوشگوار باتوں کو چھپانے اور زبان پر نہ لانے سے وہ لاعلاج مرض کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اتنا بڑا اثاثہ ہے کہ اسے نہ تو حکومت، نہ کیمپس اور نہ بدلتے ہوئے وائس چانسلروں کے رحم و کرم پر چھوڑا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں میں جو صاحبانِ ہوش و گوش ہیں انھیں چاہیئے کہ مسلمانوں کی تعلیمی، ثقافتی اور روزگاری ضروریات کو دیکھتے ہوئے یونیورسٹی کی توسیعات و ترجیحات کے لیے ایک بیس سالہ منصوبہ بنائیں، یونیورسٹی کی پالیسی کو اس طرح متعین کر دیں کہ وائس چانسلروں کے آنے جانے سے اس پالیسی پر کوئی اثر نہ پڑے۔ مشورہ میں ملک کے ممتاز ترین غیر مسلم ماہرینِ تعلیم کو بھی شامل

یا جائے۔ علاوہ بریں مغربی ممالک بالخصوص امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ میں
ہندوستانی تارکینِ وطن سے بھی مشورہ کیا جائے۔ یونیورسٹی
کے ابنائے قدیم نے وطن سے نکل کر شہرت اور امتیاز حاصل کیا ہے۔ دور رس
پالیسی بناتے ہوئے ان کی رائے حاصل کرنا اور اسے اہمیت دینا یونیورسٹی
کے حق میں ہوگا۔ ایسی یونیورسٹی جسے حکومت کی فیاضانہ مالی امداد، ہندوستانی
مسلمانوں کی جذباتی وابستگی، اور اس کے دانشور اور جہاندیدہ اور ممتاز ابنائے قدیم
کی بصیرت حاصل ہے۔ جمود اور تعطل اور پسماندگی کے گرداب میں زیادہ دیر
تک نہیں رہ سکتی۔ اب تک جو کمی رہی ہے وہ حقیقت سے آنکھیں بند کرنے
اور پیش قدمی سے گریزاں رہنے کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئی ہے۔ حالات
لسان الغیب کی زبان میں چلا چلا کر تقاضہ کر رہے ہیں کہ آؤ
"فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم۔"
(آسمان کی چھت کو چیر ڈالو اور ایک نئی نیو ڈال دو)
یاد رکھئے کہ جو طلبا علیگڑھ میں داخلہ کے لیے آتے ہیں وہ اپنا کیریر
اور اپنا مقدّر بنانے کے لیے آتے ہیں۔ وہ قوم کی گرانقدر امانت ہیں۔ ہم پر
واجب ہے کہ ان کی اور ان کے والدین اور قوم کی توقعات کو پورا کریں۔ انھیں
ایسا ماحول اور ایسی تعلیم اور تربیت دیں کہ وہ اپنے خاندان، قوم اور وطن کا
نام روشن کریں۔ یہ کام دشوار نہیں ہے بشرطیکہ ہم جی میں ٹھان لیں کہ ہمیں
اپنی ساری طاقت اور اپنے سارے وسائل اپنی یونیورسٹی کے درست
کرنے میں لگانے ہیں۔

جو ذرّہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔
(سورۂ زلزال)

پروفیسر آل احمد سرور

سرسیّد کا حقیقی پیغام
اور
ذہنی انقلاب کی ضرورت

سرسید کی تحریک کا مقصد کیا تھا؟ کیا وہ محض مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی کا خوگر بنانا چاہتے تھے، کیا وہ ہندو اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے تھے کیا وہ اسلام سے بالکل بیگانہ اور مغرب کے مرید تھے، کیا وہ مشرقیت کو ختم کر کے ایک سطحی مغربیت کو رائج کرنا چاہتے تھے، کیا ان کا مقصد انگریزی کے ذریعہ سے ابدالآباد تک تعلیم دینا تھا۔ کیا علیگڑھ کو وہ صرف کلرکوں، ڈپٹی کلکٹروں، خان بہادروں اور کھلنڈروں کی تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے، کیا وہ انگریز افسروں کے ہاتھ میں مسلمانوں کی سیاست کو بیچنے کے لیے میدان میں آئے تھے۔ سرسید واقعی کیا چاہتے تھے اور وہ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے؟ اس سوال کا صحیح جواب بہت مشکل ہے۔ بشرطیکہ لوگ توجہ سے سنیں اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

درحقیقت سید ایک نہیں بلکہ دو تھے۔ یا یوں کہیے کہ ایک ہی شخصیت کے دو پہلو تھے۔ ایک سرسید تو وہ تھے جنھوں نے آثار الصنادید لکھی، آئینِ اکبری کی تصحیح کی، سائنٹفک سوسائٹی کی اس غرض سے بنیاد ڈالی کہ اردو ادب کو علومِ مشرقیہ کے خزانوں سے مالامال کیا جائے۔ گزٹ اس وجہ سے نکالا کہ اخبار کے ذریعہ سے

حاکموں تک محکوموں کے دل کی بات پہنچائی جائے۔ غدر میں اگرچہ فرضِ منصبی کو محسوس کر کے بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائیں۔ مگر صلے میں لاکھوں کا علاقہ لینے کے بجائے "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ کر ان کی بدگمانی مول لی۔ آگرہ کے دربار میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کی الگ الگ نشستوں پر اعتراض کیا۔ اپنے صوبہ کے گورنر سے معمولی پیام سلام اس وجہ سے گوارا نہ کیا کہ اس نے آنحضرتؐ کے اوپر بڑے نازیبا حملے کیے تھے۔ انگلستان جاکر "خدا کی شان" دیکھنے اور موم کی پتلیوں پر پگھلنے کے بجائے "خطباتِ احمدیہ" کی تصنیف میں وقت گزارا۔ جب دیکھا کہ برادرانِ وطن اردو کے خلاف جدّوجہد کر رہے ہیں تو خود سینہ سپر ہوئے اور تقریر و تحریر دونوں کے ذریعہ سے اُردو کی حمایت میں جان لڑا دی۔ ایک ورناکیولر یونیورسٹی کی اسکیم مرتب کی اور اردو کی ایک ڈکشنری کا ڈول ڈالا دوسرے سرسید وہ تھے جنھوں نے پنجاب میں دیسی زبان کے ذریعہ تعلیم کی مخالفت کی۔ انتخا کو برا کہا اور نامزدگی کو سراہا، مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت سے باز رکھا۔ اور انگریز پرنسپلوں کے ہاتھ میں مسلمانوں کی سیاست کی باگ دے دی۔ جنھوں نے مشرقیت کو چھوڑ کر مغربیت اختیار کی، جنھوں نے ہائی ایجوکیشن کو مسلمانوں کے لیے امرت سمجھا، جنھوں نے علیگڑھ کی خاطر بہت سے اداروں کو ویران کرنا چاہا۔ جنھوں نے سائنس کی روشنی میں مذہب کو دیکھا، ان میں سے کون سے سرسید اصلی ہیں، کون سے اس قابل ہیں کہ ان کی تقلید کی جائے۔ کون سے ابدی ہیں اور کون سے وقتی، کہاں اصول کار ہے اور کہاں طریقۂ کار، سرسید کا مذہب کیا ہے اور ان کی سیاست کیا۔ کہاں وہ اپنے دلی جذبات کو ظاہر کرتے ہیں اور کہاں وہ مصلحتِ وقت کے شکار ہیں اس کی پہچان ایسی مشکل تو نہیں ہے۔

سرسید سے پہلے مسلمانوں کی سیاست علمار کے ہاتھ میں تھی یا بادشاہوں کے۔ بادشاہوں کو اپنا تخت زیادہ عزیز تھا، علمار کو اپنی خانقاہ، اگر مسلمانوں کی سیاست کمزور اور نااہل ہاتھوں میں نہ ہوتی تو ہندوستان یوں آسانی سے انگریزوں کے ہاتھ میں نہ چلا جاتا۔ انگریزوں کے خلاف صرف علمار میں سے کچھ لوگ برسرِ پیکار رہے لیکن اس مخالفت سے کام کوئی نہ نکلا۔ غدر میں اس کی سزا

خوب بھگتنی پڑی۔ اس مقاومت مجہول Passive Resistence کے بجائے سرسید نے ایک عملی پروگرام وضع کیا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ سرسید انگریزوں کے آلۂ کار تھے یا ان کا کام مسلمانوں کو غلامی پر راضی کرنے کا تھا۔ سرسید وقت کی نبض کو پہچانتے تھے وہ دیکھتے تھے کہ مغرب ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ وہ اس سے واقف تھے کہ مغرب نے سائنس کی مدد سے علمی سرمایہ میں اضافہ کیا ہے وہ مغرب کے تہذیبی کارناموں سے آنکھیں بند کر لینے کے بجائے ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے وہ مہذب دنیا میں اپنے لیے جگہ بنانا چاہتے تھے اس کے لیے ان کے سامنے دو راستے تھے۔ یا تو وہ دنیا کو چھوڑ کر دینی خدمت میں مصروف ہو جاتے۔ درس نظامیہ کی گردان کا اور بقول اقبال "الٰہیات کے لات و منات" سے مسلمانوں کو آشنا کرتے رہتے، دوسری صورت یہ تھی کہ مغرب سے جو طوفان آیا تھا اس کے راستے سے کترا جانے کی بجائے ان کا زور آزمانے۔ دین کو صرف اپنی جنت پکّی کرنے کے بجائے دنیا کو سدھارنے اور سنوارنے کے لیے استعمال کرتے، اپنے حلقے میں ایک سوز، ایک آرزو، ایک ولولہ پیدا کرتے، محکوم مسلمان کو اس کی محکومی پر راضی رکھنے کے بجائے اس میں حاکمی کا جذبہ پیدا کرتے، سرسید کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس دوسری صورت کو اختیار کیا انھوں نے جب قدیم نظامِ تعلیم کے خلاف آواز بلند کی تھی تو وہ محض انگریز پرستی کی وجہ سے نہیں۔ قدیم طلبا اور قدیم استاد مذہبی جذبہ ضرور رکھتے تھے مگر ہندوستان نے اس مذہبی جذبے پر رسم و رواج کی کچھ تہیں ضرور چڑھا دی تھیں۔ اس نظام میں بہت سی خوبیاں تھیں یہ محنت کا زیادہ قائل تھا۔ اس میں اسلام کا درد بھی تھا مگر یہ ذہنی بیداری، وسعت قلب، عملی نقطۂ نظر اور لوچ دار شخصیت پیدا کرنے سے قاصر رہا تھا۔ حالات اچھے ہوں تو کامیاب تھا، مگر بدلتے ہوئے زمانہ میں خود کو بدلنا اسے نہ آتا تھا۔ اس میں فولاد کی صلابت تھی۔ شاخ بار دار کی لچک نہ تھی۔ یہ محض نظامِ تعلیم نہ رہا تھا، مذہب بن گیا تھا۔

سرسید مغرب کے شاگرد کہے جا سکتے ہیں۔ وہ مغرب سے مرعوب تھے انھیں عقلیت کی بازی گری میں فرزانگی اور سائنس کی تقلیدیت میں پیمبرانہ شان نظر

آتی تھی۔ لیکن یہ غلط ہے کہ انھیں مغرب کی ہر چیز اچھی اور اپنی ہر چیز بری معلوم ہوتی تھی۔ انھیں اپنا مذہب عزیز تھا۔ اس پر حملہ ہوتا تو وہ تڑپ جاتے۔ ولیم میور نے جو زہر پھیلایا تھا اس کی ہمارے علماء کو کیسے خبر ہوتی، وہ تو مغرب کی آواز آتے ہی اپنے کان بند کر لیتے تھے۔ سرسید نے اسلام کو اس کے حقیقی خط وخال میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہ خط وخال حقیقی نہ تھے، مگر اس کوشش کے خلوص میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی۔ قدیم علم کلام، فلسفے کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا۔ انیسویں صدی میں سائنس کی ترقی سے مذہب کو جو خطرے پیدا ہو رہے تھے ان سے وہ بالکل بے خبر تھا۔ اگر سرسید نہ ہوتے تو شبلی بھی نہ ہوتے۔ شبلی کو شبلی سرسید نے بنایا۔ انھوں نے الکلام لکھی اور سرسید کا نام نہ آنے دیا۔ مگر ان کے خیالات پر سرسید کا اثر بہت واضح ہے۔

مذہب سے تعویذ لینے کے بجائے سرسید نے دنیا کی ترقی کے لیے اسے استعمال کیا۔ اس کے لیے جو نیا خطرہ پیدا ہو رہا تھا اس کا سدِّ باب کرنا چاہا اور مسلمانوں کو ایک ایسا ادارہ دیا جہاں وہ اپنے مخصوص مذہبی ماحول اور تہذیبی سرمائے کے ساتھ ساتھ اپنی دنیوی ضروریات کو پرکھ بھی سکیں اور پورا بھی کر سکیں۔ یہ ضروریات ایک خاص طبقے کی ضروریات تھیں اور ایک سطحی تعلیمی نظریے پر قائم تھیں جس کی رو سے خوشحالی رفتہ رفتہ اوپر سے نیچے تک سرایت کر سکتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ان ضروریات کا احساس سرسید کو دوسروں سے زیادہ تھا۔

نئی مذہبی اور تعلیمی قدروں کے ساتھ ساتھ سرسید نے نئی ادبی قدریں بھی پیش کیں۔ وہ جدید اردو ادب کے بہت بڑے معمار ہیں اور ان کے اثر سے علیگڑھ تحریک ایک سرکاری اور سیاسی، گرداب کے بجائے ایک عظیم الشان سیلِ رواں بن گئی۔ علیگڑھ محض انگریزی پڑھنے اور سرکاری نوکریاں دلانے کا ذریعہ نہ تھا، یہ ایک خواب تھا جس کی عظمتوں کی خود سرسید تاب نہ لا سکے۔ یہ قوم کو ایک مرکز، ایک محور، ایک گہوارۂ خیال دینا چاہتا تھا۔ جہاں قوم، قوم بن سکتی تھی، لیکن حکمراں اس تاک میں تھے کہ اس کی مرکزیت اور افادیت کو محدود کر دیں۔

وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئے اور علیگڑھ ناکام رہا۔ سرسید نے انگریزوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔ سرسید کے جانشینوں سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا۔ اصلی سرسید ٹرسٹی بل والے سرسید نہیں "تہذیب الاخلاق" والے سرسید ہیں۔

سرسید کے بعد سے اب تک جو لوگ علیگڑھ کی قیادت کرتے رہے ہیں وہ دو ایک کے سوا، سرسید کی سی شخصیت کے مالک نہ تھے۔ انھوں نے چاہا کہ سرسید کی طرح مسلمانوں کی سیاست کو اپنے ہاتھ میں رکھیں مگر اس اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے جس ذہنی عظمت، جس وسعت ذہنی، جس تدرف نگاہی کی ضرورت تھی وہ نہ پیدا کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں تعلیم پھیلنے کے ساتھ علیگڑھ کی مرکزیت کمزور ہوتی گئی۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ مقرر اب تک یہ دہراتے جاتے ہیں کہ "جو آجکل علیگڑھ کہتا ہے کل سارے ہندوستان کی زبان پر ہوگا" ذہنی اعتبار سے علیگڑھ مغرب تو مغرب خود ہندوستان کا بھی ساتھ نہیں دے سکا ہے۔ جو لوگ علیگڑھ سے واقعی خلوص اور محبت رکھتے ہیں اور علیگڑھ کو علمی دنیا میں سب سے آگے دیکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ زندگی کی رفتار کچھ ایسی تیز ہوگئی ہے کہ اس دوڑ میں آہستہ آہستہ چلنے والے اور پرانے طریقوں سے سوچنے والے نیک نیت۔ مگر تنگ نظر لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہماری ساری یونیورسٹیاں اس تنگ نظری کی شکار ہیں۔ ان میں اقتدار خالص علمی اغراض کے لیے نہیں بلکہ ذاتی شہرت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ ان میں ایک غلط اور خطرناک قسم کی جمہوریت رائج ہے۔ ان میں لوگوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا، ان کے گرد ایک چار دیواری سی کھنچی ہوئی ہے جو انھیں باہر کے فتنوں سے محفوظ رکھتی ہے اور اندر کے فتنوں کو پھیلنے پھولنے کا موقع دیتی ہے۔ ان میں علم، علم یا زندگی کی خاطر نہیں مقابلہ کے امتحانوں کی خاطر سکھایا جا رہا ہے۔ ان کی ساکھ، علمی کارناموں سے نہیں "محفوظ سرمائے" سے متعین کی جاتی ہے ان میں کوئی قدر آخری قدر نہیں ہے بلکہ اس کا کسی اور قدر سے بڑی آسانی سے مبادلہ کیا جا سکتا ہے یہ حالت کسی طرح سراہی نہیں جا سکتی۔ مگر اس کا الزام ارباب حل و عقد کے سر پر رکھنا غلطی ہوگا۔ یہ اس نظام تعلیم کی پیدا کی ہوئی ہے جو فرسودہ محدود

اور تجارتی ہو کر رہ گیا۔ یہ اس نظام تعلیم کی پیدا کی ہوئی ہے
آپ کہیں گے کہ جب سارے ہندوستان کی یہی حالت ہے تو علیگڑھ پر کیوں تنقید کی جائے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ علیگڑھ کو ہم دوسرے اداروں سے زیادہ بلند اور باوقار دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ سارے ہندوستان کی ذہنی قیادت کرے۔ علیگڑھ وہ خواب ہے جو ایک بڑے اچھے اور سچے مسلمان نے دیکھا تھا، مسلمانوں کا اس سے اتنا کچھ واسطہ ہے کہ اسے بہتر بنانے کی خواہش بڑی مبارک خواہش ہے۔ اس لیے اسے بہتر بنانے کی ذرائع پر ہر وقت غور کیا جاسکتا ہے اور کرنا چاہیے۔

۱۔ آج علیگڑھ میں سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ گزشتہ بیس سال کے علمی کارناموں کا خلوص اور دیانت سے جائزہ لیا جائے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس عرصے میں اس ادارے نے بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں کے علمی سرمائے میں کیا اضافہ کیا ہے۔

۲۔ اگر یہ ہو جائے تو شاید یہ احساس بھی بیدار ہو کہ اس عرصے میں بہت سے نیک کام کرنے کے باوجود ہمارے ذہن میں اپنی منزلِ مقصود کا کوئی خاص تصور نہیں رہا ہے۔ ہم مشین کو دستور کے موافق چلاتے رہے ہیں۔ مشین کی ضرورت کیوں پیش آئی، اس پر ہم نے کبھی غور نہیں کیا۔ علیگڑھ کو حکومت کے مقاصد کے لیے چلانا ہے یا قوم وملک کے لیے۔ اس کا بھی فیصلہ اب ہو جانا چاہیے۔ کم از کم بنارس والوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے اور ہم بھی اسے دیر تک ملتوی نہیں کر سکتے۔

۳۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو لوگ اس ادارے میں انگریزی کی موجودہ حیثیت کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، وہ ایک بہت بڑی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور علیگڑھ کی عمومیت اور افادیت کے راستے میں حائل ہیں۔ ہندوستان میں ہر جگہ انگریزی کے بجائے دیسی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنایا جا رہا ہے۔ ہر جگہ بی اے میں انگریزی ادب لازمی نہیں اختیاری ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے ثابت کر دیا ہے کہ اردو اعلیٰ سے اعلیٰ علمی منزلوں کا ساتھ دے سکتی ہے مگر ہمارے یہاں اب بھی کچھ لوگ اس فکر میں رہتے ہیں کہ انگریزوں کا سا لب ولہجہ کیسے حاصل ہو، اور بامحاورہ انگریزی

لکھنے کی مشق کیسے کی جائے۔ ہم کو یہ مان لینا چاہیے کہ انگریزی کو اب وہ اہمیت دینا جو غلطی سے پہلے کبھی دی جاتی تھی غلطی ہی نہیں گناہ ہے۔

۴۔ طلبا کو شروع ہی سے مقابلے کے امتحانوں کے لیے تیار کرنے کے بجائے ان میں قوم کی ضروریات کا احساس، قوم کا درد، قوم کی پستی دور کرنے کا ولولہ پیدا کرنا چاہیے۔ جو لوگ مقابلے کے امتحانوں میں کامیاب ہوتے ہیں وہ چاہے کتنی ہی قابل ہوں لیکن وہ قوم سے کٹ کر علاحدہ ہو جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ کسی بھائی کو کلرک یا پٹواری بنا سکیں۔ لیکن حقیقی قومی خدمت کی امید ان سے بالکل فضول ہے۔ اب تک علیگڑھ اپنے بہترین ادیبوں کو باہر بھیج کر اور انھیں سرکاری نوکریاں دلا کر اپنا نقصان کرتا رہا ہے۔ اس زمانے میں یونیورسٹیوں کو مقابلے کے امتحانوں کی تیاری کی مشین بنانا بے وقت کی راگنی ہے۔

۵۔ علیگڑھ نے اب تک جن لوگوں کو اعزازی ڈگریاں دی ہیں ان میں اب تک زیادہ تر والیانِ ملک اور سرکاری افسر ہیں۔ صرف ۱۹۲۵ء میں ہم نے سر شاہ سلیمان، سر اقبال اور سر راس مسعود کو ڈگری دے کر اپنے ذوق اور اپنی نظر کا ثبوت دیا تھا۔ مسلمانوں کے کئی ایسے محسن ہیں جن کو اعزازی ڈگریاں دے کر ہم اپنی عزت افزائی کر سکتے ہیں۔ کئی سال سے مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی کو ڈگری دینے کا مسئلہ درپیش ہے۔ افسوس ہے کہ یونیورسٹی ابھی تک اس ضروری معاملہ کو طے نہیں کر سکی۔ نیز ڈاکٹر رضی الدین کو اعزازی ڈگری دے کر عثمانیہ یونیورسٹی نے جس قدردانی کا ثبوت دیا ہے، اس میں پہل اگر علیگڑھ سے ہوتی تو بہتر تھا۔ اگر علیگڑھ یہ فخر کر سکے کہ بعض اربابِ فن کا اس طرح اعتراف سب سے پہلے اس نے کیا ہے تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔ نیز تقسیم اسناد کے موقع پر خطبے اگر ماہرینِ فن کے ہوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ باتیں بظاہر معمولی ہوتی ہیں مگر ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم کس چیز کی عزت دل سے کرتے ہیں کس کی یونہی اوپری طور پر۔ علیگڑھ میں سرکاری افسران اور والیانِ ملک کی پذیرائی بھی غالباً ضروری ہے، لیکن کاش کبھی کبھی وہ توجہ، وہ انہماک، وہ استغراق، وہ جوش جوان لوگوں پر صرف کیا جاتا ہے، ڈاکٹر عبدالحق، علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر رضی الدین

وغیرہ کے لیے بھی دیکھنے میں آتا اس وقت ہم خود اپنی نگاہوں میں کتنے بلند ہو جاتے
میں نے جب اخبار میں پڑھا کہ مارشل چیانگ کائی شیک شانتی نکتن گئے تو یہ
حسرت ہوئی کہ کاش وہ علیگڑھ بھی آتے جب ٹیگور کی موت کا علم ہوا تو ساتھ
ساتھ یہ خلش بھی پیدا ہوئی کہ وہ کبھی علیگڑھ نہ آسکے۔ ہم علیگڑھ کو ادبی اور علمی
شخصیتوں سے بچا کر کیسے رکھ سکتے ہیں۔ ان سے ملنا، ان سے کچھ سیکھنا، ان کی
سننا اور اپنی کہنا بھی تو ہمارے لیے ضروری ہے۔

۶۔ طلبا کی اپنی یونین ہے۔ اس کا ماضی بہت شاندار رہا ہے مگر حال میں
اس کی جو حالت ہو گئی ہے اسے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اب یونین میں تقریر کرنے
کے لیے خاص طور پر کوئی نہیں آتا، جو لوگ یونیورسٹی کے مہمان ہوتے ہیں، تحفے
کے طور پر یونین میں بھی تقریر کر جاتے ہیں۔ یونین کے عہدہ دار پہلے طلبا کی
ذہنی قیادت کرتے تھے۔ اب ان سے ڈرتے ہیں۔ پہلے لوگ تقریریں سننے یا
معلومات حاصل کرنے یہاں آتے تھے اب ہنگامہ آرائی کرنے آتے ہیں،
پہلے انھیں حکم ماننے میں لطف آتا تھا، اب اسے توڑتے ہیں، پہلے کچھ مقرر ہوتے
تھے، کچھ سننے والے، اب سب مقرر ہیں سننے والا کوئی نہیں۔ جب تک طلبا
یونین کی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں گے ذہنی معیار قابلِ اطمینان نہ ہوگا، یہ
اصلاح کوئی دوسرا نہیں کر سکتا صرف طلبا ہی کر سکتے ہیں۔

یونیورسٹی میں سب سے اہم اس کی علمی فضا ہے۔ اسی فضا سے وہ پہچانی
جاتی ہے۔ یہ فضا آسانی سے نہیں بنتی، بنتے بنتے بنتی ہے، مگر بگڑ بڑی جلد جاتی
ہے۔ ذرا سا کھوٹ، ذرا سی مطلب پرستی، ذرا سی جماعت بندی، برسوں کے کام
غارت کرتی ہے۔ ضرورت ہے کہ علیگڑھ میں سب سے زیادہ عزت اپنے
ادیبوں، اپنے عالموں، اپنے فن کاروں کی ہو۔ یہ عزت قوانین کے ذریعہ سے نہیں
دلائی جا سکتی طلبا اور اساتذہ اس فرض کو محسوس کریں تو خود بخود اس کا ظہور ہو جائے
علیگڑھ کیا، سارا ہندوستان چاہے تو ہندوستانیوں کو انگریزوں کا سا لب و
لہجہ نہیں آسکتا، اور اگر آجائے تو وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھیں، ان کے لب و لہجہ
کی نقل فضول ہے۔ اس میں فخر نہیں ذلت محسوس کرنی چاہیے۔

سہ ماہی فکر و آگہی، علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

میرا ایمان ہے کہ علیگڑھ میں ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے۔ وہ ذہنی انقلاب جو بقول سید سلیمان ندوی "علیگڑھ کا قبلہ مغرب کی طرف سے پھیر کر مشرق کی طرف کر دے۔" یہ انقلاب اسی وقت رونما ہو سکتا ہے جب علیگڑھ والے بدمذاقی، تجارتی ذہنیت اور جاہ پرستی کو گوارا نہ کریں۔ جب وہ یونیورسٹی کے ذریعہ سے اپنا مقصد حاصل کرنے کے علاوہ اسے بھی کچھ دے سکیں، یونیورسٹی کے خزانے کو صرف فیس اور یونیورسٹی کے عہدہ داروں کو دردِسر نہ سمجھیں، جب وہ وقت کی رفتار کو پہچانیں جب وہ آسانی سے ہر خود غرض آدمی کا شکار نہ بن جائیں، جب ایسے طالب علم کے لیے صرف سچا طالب علم ہونا ہی ضروری ہو، جب استاد سے علاوہ ڈگریوں کے اپنے پیشے سے محبت اور اس کی عزت کا بھی مطالبہ کیا جا سکے۔ جب کوئی یہ ماتم نہ کر سکے کہ اس نے علیگڑھ کی خاطر ڈپٹی کلکٹری چھوڑی یا نائب تحصیلداری پر لات ماری، جب ہماری درسگاہ کی عنان ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو تعلیم کے مسائل کو سمجھتے ہوں، نوجوانوں کے جذبات کا احترام کرتے بھی ہوں، صرف ان سے ڈرتے نہ ہوں، جو بدلتے ہوئے حالات کا نہ صرف احساس رکھتے ہوں بلکہ خود بھی ان کو موزوں سانچے میں ڈھالنے کی ہمت رکھتے ہوں جو علم و فن کے خدمت گزار رہے ہوں، ملک و ملت کا درد زیادہ رکھتے ہوں اپنا کم، جو صحیح معنی میں معلم ہوں اور اس کام میں فخر محسوس کرتے ہوں، جب یہ ذہنی انقلاب ہو چکے گا اس وقت ہم سرسید کی جانشینی کا حق ادا کر سکیں گے اور اس وقت ان کی روح کو بھی خوشی حاصل ہوگی۔

کاش یہ انقلاب ہمارے آپ کے زمانے میں، ہماری آپ کی کوششوں سے رونما ہو سکے ورنہ ہم سب پر اقبال کا یہ شعر صادق آئے گا ؎

میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

شاہین نظر

سر سیّد کا مشن

اور

علیگ برادری کی ذمّہ داریاں

سر سیّد کے جذبوں، ان کی قربانیوں، ان کی بصیرتوں اور ان کی بے شمار خوبیوں
کا ذکر ہم سالہا سال سے سنتے آئے ہیں۔ یقیناً اسلاف کے کارناموں کا ذکر سعادتمندی
کی نشانی ہے مگر دیکھنا یہ ہوگا کہ اس ذکر سے ہم کوئی نتیجہ بھی اخذ کر رہے ہیں کہ
نہیں۔ یہ ذکر ہماری عملی زندگی میں کس حد تک مشعلِ راہ بن رہا ہے۔ اگر ہم ایسا
کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو سر سیّد کے پیروکار ہونے کا دعویٰ بے معنی ہے۔

سر سید کو ہم سے رخصت ہوئے سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس سال
ان کی صد سالہ برسی بھی منائی جا رہی ہے۔ آیئے آج ہم یہ مان کر چلیں کہ ان کا
انتقال اٹھارہ سو اٹھانوے میں نہیں انیس سو اٹھانوے میں ہوا اور اب ہمیں ان
کے چھوڑے ہوئے مشن کو لے کر آگے بڑھنا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان کا مشن کیا تھا؟ کیا وہ محض ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہتے
تھے جس کے ہم سب طالب علم رہ چکے ہیں اور آج اسی رشتے سے یہاں پر جمع
ہوئے ہیں اگر مقصد صرف اتنا تھا تو اب ان کے مشن کی معنویت ختم ہو چکی ہے۔
چونکہ پچھلے سو سال کے عرصے میں ہندوستان بھر میں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں
کا جال بچھ گیا ہے۔ آج ہمارے ملک کا کوئی حصّہ ایسا نہیں جہاں کے لوگ صرف
اس وجہ سے تعلیم حاصل نہ کر سکیں کہ ان کے قرب و جوار میں تعلیم کی سہولت نہیں۔

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اس کے باوجود آج بھی لوگ سیکڑوں بلکہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے علیگڑھ آتے ہیں۔ گویا اپنے علاقے کی درسگاہوں پر علیگڑھ کو ترجیح دیتے ہیں۔ غور کیجئے تو یہی ترجیح وہ حقیقت ہے جو یہاں تعلیم حاصل کرنے والوں کو کسی ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو اسے پوری قوم اور پورے ملک کی نظروں میں نمائندہ حیثیت بخشتی ہے۔

سرسید کا عہد ہمارے عہد سے بہت مختلف اس معنی میں نہیں تھا کہ اس وقت بھی مسلمانانِ ہند ناسازگار حالات کا شکار تھے اور آج بھی بے شمار مسائل کا شکار ہیں۔ اس وقت ہم غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اور غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم و جبر کا براہِ راست نشانہ بن رہے تھے اس وقت اپنے حوصلوں کو بلند رکھتے ہوئے آگے کی طرف بڑھتے جانا ہمارے لیے سب سے بڑا چیلنج تھا جس کی علامت بن کر سرسید ابھرے۔ آج ہم آزاد ہیں مگر اقلیت میں ہونے کی وجہ سے متضاد مسائل میں الجھے ہیں۔ ان میں چند ایسے ہیں جو حکمراں طبقے کی بے مروتی اور کم نظری کا نتیجہ ہیں اور چند کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جس سے ہمارے حوصلے پست ہونے لگتے ہیں اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ہم سرسید جیسی شخصیت کی طرف رجوع کرتے ہیں جو بقول مولانا الطاف حسین حالی: "ہم کو یقین دلاتی ہے کہ تھوڑی سی تعلیم اور بہت سا تجربہ اور بالکل سچائی یہ تینوں مل کر ایسے ایسے عظیم الشان کام انجام دے سکتی ہے جو بڑے بڑے حکیموں اور مدبّروں سے انجام نہیں ہو سکتے . . . . وہ ہم کو تعصبات سے متنفر کرتی ہے، غیر قوموں کے ساتھ حسنِ معاشرت سکھاتی ہے، دوستوں کے ساتھ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا یہودی خلوص اور سچائی سے ملنا بتاتی ہے۔ وہ ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جیسا دل میں سمجھو ویسا ہی زبان سے کہو۔ ڈیوٹی کا خیال رکھو، ایک لمحہ بے کار نہ ہو اور کام کرتے مر جاؤ۔"

دنیا میں آئیڈیل سچویشن کبھی بھی کہیں بھی نہیں ہوتی۔ دنیا کا کوئی بھی خطہ مسائل سے پاک نہیں۔ مسائل سے جوجھنا ہی دراصل ہمیں زندہ ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ ہم زمین کے جس خطے کے باسی ہیں وہ نہ صرف ایک ملک ہے بلکہ

ایک الگ دنیا ہے۔ اس کا رقبہ اتنا بڑا ہے کہ دنیا کے کئی ملک اس میں سما جائیں۔
یہاں وہ تمام قومیں بستی ہیں جو دوسری جگہوں پر الگ الگ ملک بنا کر رہتی
ہیں یہاں ایک نہیں سترہ زبانیں سرکاری طور پر لکھی اور بولی جاتی ہیں۔ جو ملک
اپنے اندر اتنی وسعت لیے ہوئے ہے یقیناً اس کے مسائل بھی اتنے ہی وسیع
ہوں گے۔

ہم ایک جمہوری نظام کے باشندے ہیں جہاں پر مذہبی اور لسانی اکائی کو
برابر کا قانونی درجہ حاصل ہے۔ ہر اکائی حکومت سازی میں شامل ہوتی ہے
غیر متناسب ہی سہی مسلم قوم بھی اس میں حصہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسمبلی اور
پارلیمنٹ سے لے کر عدلیہ اور بیوروکریسی تک ہر جگہ ہمارے لوگ موجود نظر آتے
ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری قوم کیا مال تیار کر کے ملک کو پیش کر رہی ہے
ہمیں تجزیہ کرنا ہوگا کہ ہندوستانی سماج کے تئیں ہمارا Contribution
کس معیار کا ہے اور کس مقدار میں ہے۔ اگر یہ معیار تشفی بخش نہیں اور مقدار مناسب
نہیں تو اس کا ذمہ دار کون ہے ہم ہیں یا حکومت ہے یا کوئی اور؟ اس صورت حال
سے نپٹنے کے لیے ہماری کیا تیاری ہے؟ کہیں ہم سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے
کہیں ہم صرف گلہ شکوہ کرنے والی قوم تو نہیں بنتے جا رہے ہیں؟ ماتم کرنا ہمارا
نصب العین تو نہیں بن گیا؟ کوئی ہمارے نوجوانوں کو غلط راہ پر تو نہیں لے جا رہا
ہے؟ کوئی ہمارے ذہنوں کو تعمیری کاموں سے تو نہیں پھیر رہا ہے؟ کوئی ہماری
قوت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال تو نہیں کر رہا ہے؟

ہمیں اگر ہندوستان میں سرخرو ہونا ہے تو ہمیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہم
کسی سے کم نہیں۔ ہمیں بہترین کارکردگی اور اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔
ہندوستان میں رہتے ہوئے ہم پر دوہری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ـــــ
ایک ذمہ داری وہ جو ایک مثالی شہری کی ہوتی ہے دوسری وہ جس کی توقع ایک
مسلمان سے کی جاتی ہے یعنی خیر امت ہونے کی ذمہ داری۔ لہٰذا ہمارا یہ فرض
بنتا ہے کہ ہم مثبت انداز میں سوچیں اور بہت محنت کریں اور دوسری قوموں
کے مقابلے میں زیادہ کارآمد ثابت ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ملک کے

حالات کو سمجھیں اور اپنی شناخت کو باقی رکھتے ہوئے اس معاملات سے اپنے آپ کو جوڑیں۔ ہمیں یہ بھی سیکھنا ہوگا کہ دینی اور ملی امور پر ہونے والے حملوں کا کس طرح دفاع کیا جائے۔ حالیہ برسوں میں ہمارے جذباتی اور غیر دانشمندانہ رویہ سے فاشسٹ طاقتوں کے ہاتھ مضبوط ہوئے اور گھاٹا صرف اور صرف ہمارا ہوا مسئلہ چاہے جیسا ہو ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ احتجاج کتنی دیر تک اور کتنی دور تک کیا جائے۔

قارئینِ وطن ان دنوں ایک نئے مسئلے سے دوچار ہیں خلیجی ممالک میں ملازمت کے مواقع دن بدن کم ہوتے جارہے ہیں۔ اکثر لوگوں کے سامنے "اِدھر جائیں یا کہ اُدھر" کا مسئلہ درپیش ہے۔ ایک طرف گھر ہے جو خستہ حال ہے دوسری طرف یورپ اور امریکہ کی پُرفریب زندگیاں ہیں۔ یہ امتحان کی گھڑی ہے۔ جو فیصلہ ہم آج کریں گے اس کے دوررس نتائج ہم پر انفرادی طور پر پڑیں گے اور پوری قوم پر پڑیں گے۔ یورپ اور امریکہ کا رُخ بچوں کی اعلیٰ تعلیم اور روزگار کے بہتر مواقع کی خاطر کیا جائے تو اتنا بُرا نہیں لیکن یہی فیصلہ اگر ہندوستان کے بدلتے ہوئے رنگ سے گھبرا کر کیا جائے تو یہ بات افسوس کی ہوگی۔ ہماری جڑیں ہندوستان میں پیوست ہیں۔ اسے مضبوط اور پائیدار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بادِ مخالف کا مقابلہ پامردی سے کریں اور اپنی کوشش سے حالات کو اپنے لیے سازگار بنائیں۔ یورپ اور امریکہ کا رخ مسئلہ کا فوری حل تو ہوسکتا ہے وہ بھی انفرادی طور پر مگر دائمی نہیں نہ ہی اجتماعی۔ اور یقیناً یہ فیصلہ سرسیّد کے افکار کی نفی بھی ہوگا۔

سرسید کی روح کو سکون پہنچانا ہے تو اس کے لیے بڑے بڑے جلسوں کے انعقاد اور بھاری بھرکم تقریروں اور عمدہ کھانوں سے بات نہیں بنے گی۔ اس ایک دن کو خود احتسابی کا دن بنائیے۔ آیئے ہم سوچیں کہ جو کچھ ہم نے اپنی مادرِ علمی میں سیکھا ہے اس کا اطلاق اپنی علمی زندگی میں کس طرح کر رہے ہیں۔ جو علم ہم نے حاصل کیا ہے کیا اسے صرف روزی کمانے اور دولت بٹورنے میں خرچ کر رہے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو غلط ہے۔ یہ کام تو چور اچکے اور اب سیاست داں بغیر علم حاصل کیے کر رہے ہیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم نے ہمیں ایک باعزت شہری بنایا ہے جو سماج ہمیں عزت بخش رہا ہے ہم یہ دیکھیں کہ ہم اسے کیا دے رہے ہیں۔ ہم

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اپنی اگلی نسل کو کیا منتقل کر رہے ہیں۔ اس کے اندر صالح جذبہ ابھار رہے ہیں کہ نہیں۔ اس کے اندر یقین اور اعتماد کی روح پھونک رہے ہیں کہ نہیں۔ اس کے اندر ڈاکٹر انجینئر بننے سے زیادہ ایک اچھا انسان بننے کی خواہش ابھار رہے ہیں کہ نہیں۔ دراصل یہی فکر سرسید کے مشن کو باقی رکھے گی، ان کی قائم کردہ یونیورسٹی کو باقی رکھے گی، ہماری قوم کے بلند حوصلوں کو باقی رکھے گی، ہمارے ملک کی سالمیت کو باقی رکھے گی اور خود ہمارے اپنے وجود کو باقی رکھے گی۔

سنتے ہیں وفا کے رستہ میں منزل نہ مسافر خانہ ہے
کیا جانے کہاں تک پہنچے ہیں کیا جانے کہاں تک جانا ہے

خیرخواہ ملک و ملت زندہ باش
باہمہ خوبی و صحبت زندہ باش
زندہ باش اے نیک طینت زندہ باش
بر سر ما تا قیامت زندہ باش
ویلکم عالی جناب ذی حشم
سیّد احمد خاں بہادر زندہ باش

(مرزا عبد الغنی ارشد گورگانی۔ خیر مقدم ۲ فروری ۱۸۸۴ء لاہور)

شہناز کنول غازی

پا جا سراغِ زندگی

۱۸۵۷ء کے غدر نے مسلمانوں میں بہت تیزی سے مایوسی اور حالات سے مغلوب ہونے کے رجحان کو بڑھایا تھا زندگی کی تعمیری فکر سے جب کسی قوم کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو وہ قوت مدافعت بھی کھو دیتی ہے اور نئے راستوں کی تلاش بھی ختم ہو جاتی ہے۔

ایسے وقت میں اگر کوئی شخص ان کو راہ دکھاتا ہے تو وہ مسیح وقت کہلاتا ہے سر سید احمد خاں بھی ایک ایسی ہی شخصیت تھے، جنھوں نے مسلمانوں کی خفتہ حالت کو بغور دیکھا اور پھر میدانِ عمل میں آگئے۔

اس وقت میں سر سیّد کے ان مضامین کا ذکر کروں گی جن کے ذریعہ انھوں نے قوم کے جوانوں کو بار بار مخاطب کیا اور نئے عہد کی ضرورتوں کے مطابق اسلامی فکر کے ساتھ ذہنی تبدیلی کے لیے آمادہ کیا۔

ان کا ایک مضمون ہے "تعلیم و تربیت" اس میں وہ لکھتے ہیں:

"تعلیم و تربیت کو ہم معنی سمجھنا بڑی غلطی ہے، بلکہ وہ جدا جدا دو چیزیں ہیں۔ جو کچھ انسان میں ہے اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے اور اس کو کسی کام کے لائق کرنا، اس کی تربیت کرنا۔ مثلاً جو قوتیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے اور اس کو کسی بات کا مخزن اور

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

مجمع بنانا اس کی تربیت ہے۔"

سرسید کا کہنا ہے کہ جس تعلیم سے عملی تحریک نہ پیدا ہو وہاں سمجھ لینا چاہیے کہ تربیت نامکمل ہے۔ صرف کتابوں کی جگالی کی جاتی رہی ہے۔ وہ تعلیم اصل ہے جو جوانوں میں قوتِ عمل پیدا کر دے احترام ذات دے اور قومی عروج کی طرف رواں کر دے۔

اپنے ایک مضمون "باہمی اتحاد اور تعلیم" میں وہ اپنی قوم کو خطاب کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تعلیم کے لیے دوسروں پر انحصار کرنے والے نہ اچھے عالم پیدا کر سکتے ہیں نہ عوامی سطح پر لوگوں میں تعلیمی شعور کو بیدار کر سکتے ہیں۔ دوسروں پر تکیہ کرنے والے علم وفن کی دوڑ میں سب سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور پھر یہ ناکامی انھیں جھنجھلاہٹ دیتی ہے شکوہ شکایت غصّہ اور الزام تراشی کو وہ قوم اپنا وطیرہ بنا لیتی ہے۔ سرسیّد اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"مگر اے دوستو! میری رائے اور میرا خیال یہ ہے کہ کوئی گورنمنٹ ہر ایک قوم کی تعلیم کا ذمّہ اپنے اوپر نہیں لے سکتی ہے بلکہ میں مضبوطی سے اس رائے پر ہوں کہ ممکن نہیں کہ گورنمنٹ اپنی تمام رعایا کی تعلیم کر سکے اس سے بھی سخت میری رائے یہ ہے کہ کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم کو اپنے ہاتھ میں نہ لے اس کی خواہش کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔ جو کچھ مجھے افسوس ہے یہی ہے کہ ہماری قوم کو ہر جگہ یہی خواہش ہے کہ گورنمنٹ اسکول قائم ہو۔"

سرسید کی اس تحریر کو پڑھ کر اندازہ لگائیے کہ اپنی تعلیم کی فرقے واری قومی اعتبار سے زیادہ تر ہم پر ہی عاید ہوتی ہے۔ جہالت کا شکوہ کرنے کے بجائے اپنے ادارے کھولنا وقت کی ضرورت ہوا کرتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ آج بھی مسلمان اپنے ادارے بنانے پر زیادہ یقین نہیں رکھتا۔ جو ادارے اور اسکول ہیں ان کے معیار کا مذاق خود بناتے ہیں اور ان میں اپنے بچوں کو بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ دوسرے اسکولوں میں جب بچوں کو غیر اسلامی باتیں سکھائی جاتی ہیں تو اس پر یا تو ناراض ہوتے ہیں یا خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ دونوں باتیں نئی نسل کے مستقبل کے لیے سودمند نہیں ہیں۔ ہر شہر ہر قصبہ ہر گاؤں میں مسلمان اچھی خاصی تعداد میں ہیں اور ان میں صاحبِ

اس کو اختیار کامل حاصل ہے۔ وہ مثل مرد کے ہر قسم کی جائداد کو ہبہ اور وصیت اور وقف کر سکتی ہے۔

وہ مثل مرد کے تمام مذہبی نیکیوں (علوم) کو جو مرد حاصل کر سکتا ہے، حاصل کر سکتی ہے۔"

یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسلام نے عورت کے لیے ہر جگہ ہر مقام ہر پہلو سے عزت اور احترام کا سلوک کیا جاتا ہے۔ مگر ہم نے اسلامی تعلیمات کو تو چھوڑ دیا اور غیروں کی تقلید کر کے ذاتی تشخص ختم کر دیا۔ پھر لاعلمی اور کم فہمی کی بدولت مغلوب ہو کر اپنی تعلیمات اور اپنے حقوق کا مذاق ہی نہیں بنایا بلکہ ان کی تشہیر بھی کی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جدید علوم کے ساتھ اپنی اسلامی فکر اور اس کے تحت احترام ذات سے دوسروں کو متاثر کرتے ان کے دل میں یہ بات پیدا کرتے کہ مساوات و برابری کسے کہتے ہیں موڈرن ہونا کن معنوں میں عورت کو عزت دیتا ہے اور وہ اصول ہمارے پاس ہیں جن کے ذریعہ عورت کی شخصیت مکمل اور محترم بن جاتی ہے اس کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہر کسی سے مرعوب ہونا چھوڑ دیں اور اسلام کو سمجھیں۔

غدر کے بعد ہندوستان کے مسلمان ہر پہلو سے متاثر ہوئے تھے اور سر سید احمد خاں کی نگاہ ان کے ہر پہلو پر تھی۔ مغلیہ عہد کے زوال نے جوانوں کو کم ہمت، مایوس اور بے وقعت کر دیا تھا وہ غلط قسم کی تفریحوں میں خود کو بھول رہے تھے۔ تعلیم سے بے رغبتی پیدا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے ان کے اخلاق بھی بگڑنے لگے تھے۔ نوجوانوں کا زوال رفتہ رفتہ قومی زوال کی طرف بڑھتا ہے۔ سر سید کے لیے یہی چیز باعثِ تشویش تھی۔ وہ بوڑھوں اور ادھیڑوں سے کہیں بھی مخاطب نہیں ہیں اس لیے کہ ان کو فکر تھی کہ نئی نسل نہ بگڑے اس کے افعال سنور جائیں وہ تعلیم کی طرف راغب ہو اور اس کے اخلاق زمانے کے اعتبار سے بہترین ہو جائیں وہ ترقی کی دوڑ میں سب سے آگے نکل جائے اور اس میں وہ قوت بیدار ہو جائے جو دونوں کو متاثر کرے۔

اپنے ایک مضمون "تربیت اطفال" میں لکھتے ہیں:

"یہ اقتدار اس ناکامل اور فانی وجود کا جیسا کہ لڑکوں کی تربیت یا ناتربیت یافتہ رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے ظاہر نہیں ہوتا جبکہ ہم لڑکوں کی

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

حیثیت بھی ہیں مگر شادی بیاہ منگنی، سالگرہ اور دیگر موقعوں پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے انواع واقسام کے مرغن کھانے ناشتہ لباس اور سجاوٹ پر بھی دل کھول کر خرچ کرتے ہیں مگر اعلیٰ معیار کے تعلیمی اداروں کے قیام پر کبھی غور نہیں کیا جاتا، تمام ذمے داری یا تو سرکار کے سر ڈال کر ہم مطمئن ہو جاتے ہیں، یا قدیم اداروں کو کافی سمجھتے ہیں۔ آبادی کے اعتبار سے بنیادی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت بڑھ جاتی ہے اور ایسے اداروں کی بیحد ضرورت ہے جو اعلیٰ معیار تعلیم کے ساتھ صحت مند اصولوں اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ ہوں جو ذہنوں میں قوت عمل پیدا کریں۔

عورت کی تعلیم اسلام کا اولین پیغام رہا ہے۔ اس کے ساتھ اسلام نے عورتوں کے سلسلے میں جس قدر بہترین اصول وضوابط بنائے ہیں ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آزادی اور مساوی حقوق کا نام لے کر آج عورت کو جس طرح اور جس قدر بے وقار کیا جارہا ہے اس کی مثال نہیں ملتی حسینۂ عالم کا انتخاب ہو یا ٹی وی اشتہارات اولمپک گیم ہوں یا تفریحی سلسلے۔ اخبار ہو یا رسائل ہر جگہ عورت کی نسوانیت اس کا پندار اور اس کی حیا کا کھلے عام تمسخر کیا جارہا ہے۔ وہ عورت جسے ماں کے روپ میں ہر معاشرے نے قابلِ احترام سمجھا تھا آج عریانیت کا سمبل بن کر رہ گئی ہے۔

سرسید بھی عورت کے احترام اور تشخص کو لے کر اپنے مضمون "عورتوں کے حقوق" میں لکھ رہے ہیں:

"تربیت یافتہ ممالک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں اور دونوں برابر حق رکھتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جاوے ... بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر ومنزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ مسلمانی قانون میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق اور اختیار تسلیم کیے گئے ہیں جس طرح مرد اسی طرح عورت اپنی شادی کرنے میں مختار ہیں۔ جس طرح مرد کی بے رضامندی نکاح نہیں ہوسکتا اسی طرح عورت کی بلا رضامندی نکاح نہیں ہوسکتا وہ اپنی تمام ذاتی جائداد کی خود مالک ومختار ہے اور ہر طرح اس میں تصرف کرنے کا

حالت پر غور کرتے ہیں اور ان کی بھولی بھالی اور سیدھی سادی طبیعتوں کو ہر ایک قسم کے گناہ سے پاک اور ہر قسم کی تربیت کی استعداد ان میں دیکھتے ہیں تو ہم کو خدا کی کامل قدرت کا نمونہ دکھائی دیتا ہے اور یقین ہوتا ہے کہ وہ اس ذات کامل کی ادنیٰ بخشش کی ہوئی چیزیں ہیں۔

ہمارے سامنے ان کی عقل وفہم کی ترقی ہوتی ہے اور ہماری تعلیم وتربیت ان پر اثر کرتی ہے اور یا تو اچھی اچھی مثالوں کے دیکھنے سے شروع ہی سے ان میں عمدہ عمدہ عادتیں اور خصلتیں پڑ جاتی ہیں۔ بہر حال لڑکپن کا موسم نکل جاتا ہے اور جو کچھ کہ ہماری صحبت اور تربیت سے نیک یا بد حاصل کیا ہو اس کا اثر دنیا میں رہ جاتا ہے۔۔۔ لڑکپن کے زمانے میں جو عمر کے سات برس سے پندرہ برس تک ہے وہی ایسا زمانہ زندگی کا ہے جس میں آیندہ کی بہبودی کے لیے زیادہ تر کوشش ہو سکتی ہے۔ اس زمانے میں لڑکوں کا دل ہر چیز کا متلاشی رہتا ہے، حافظہ تیز ہوتا ہے، قوتِ غور مضبوط ہوتی ہے، اچھی عادتوں کا دیکھنا اور عمدہ عمدہ نظیروں سے تربیت پانا جس کو عموماً لوگ نیک صحبت کہتے ہیں نہایت ہی موثر ہوتا ہے یہ زمانہ لڑکوں کے لیے ذہنی اور عقلی اور اخلاقی تخم ریزی (کسی چیز کی ابتدا ہونا) کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت تعلیم کو دل جلد قبول کرتا ہے۔۔۔۔ اگر اس زمانے میں اگر تربیت نہیں ہوتی تو پھر بہت کم فائدہ ہوتا ہے کیونکہ اس وقت دن گزرتے ہیں عادت میں مضبوطی آتی جاتی ہے۔۔۔۔ پس جو لوگ قومی ترقی یا قومی تربیت کے خواہاں ہیں ان کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ لڑکوں کی تربیت کے لیے عمدہ انتظام کریں جن سے ہم کو آیندہ کی بہبودی کی توقع ہے۔"

سرسید نے علیگڑھ کو صرف تعلیم کے لیے منتخب نہیں کیا تھا بلکہ تربیت کے اصول بھی وضع کیے تھے۔ یہاں پر ہر چھوٹا (جونیئر) ہر بڑے (سینئر) کا احترام کرتا رہا ہے اور تمام سینئرس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ تعلیمی مشاغل کے ساتھ نئی نسل کو اخلاقی، سماجی، مذہبی اصولوں سے روشناس کرائیں۔ استادوں کے ساتھ بھی اس کا رویّہ بہترین اخلاق کا مظاہر ہونا ثابت کرتا ہے اور استاد بھی بے غرض، مخلص اور شفیق رہے ہیں ان کا مقصد محض کورس کی کتابوں کو پڑھانا یا سمجھانا ہی نہیں بلکہ

اپنے تجربات اور مقصدِ زندگی کو ان میں منتقل کرنا بھی ہوتا ہے۔ سہل پسندی اور کسب زر کے تحت تعلیم کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں استاد اور شاگرد دونوں یہ اصول لے کر آتے ہیں کہ ایک علم دے گا۔ انتہائی عرق ریزی اور قومی خدمت مذہبی فریضہ جان کر اور دوسرا اسے اپنے اندر اس حد تک جذب کرے گا کہ قومی افتخار اسے حاصل ہو جائے۔ یہی سرسید کا پیغام تھا اور اسی پر عمل کر کے غدر کے مارے مسلمانوں نے فلاح کی راہ پائی تھی۔ یہی وہ اسلامی اصول ہے جسے اقرا کے لفظ نے قوم کی تقدیر سے جوڑ دیا ہے۔ ہر دور ہر زمانے میں ہر مکتب فکر کے لیے ہر استاد کے لیے ہر شاگرد کے لیے۔

سرسید کی اس بات کے ساتھ اپنی بات ختم کر رہی ہوں۔

"ہم کو تمام عمدہ چیزیں حاصل ہونے کی امید رکھنی چاہیے کیونکہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی امید نہ ہو سکے۔"

> تعلیم کا منشا یہ نہیں ہے کہ چند آدمیوں کی دولت بڑھ جائے تا آنکہ غربار کے مقابلہ باقی ماندہ اشخاص کی زیادہ رعایت کی جائے اور نہ تعلیم کا منشا یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے یہ لوگ صرف اپنی باہمی مخالفت کریں یا سوداگری اور تجارت ہی کو ترقی دیں بلکہ تعلیم کی خاص غایت اور اصل منشا یہ ہے کہ لوگ نیک محض اور عمدہ قسم کے باشندے ہو جاویں اور لوگوں کے سوشیل اور اخلاق خصائل کی تکمیل کریں اور ان بھاری اور عمدہ کاموں کا حوصلہ دیں جن سے ملک کی عزت اور زینت ہوتی ہے۔ (سرسید)

ڈاکٹر انجمن آرا انجم

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

اے نوجوانانِ علیگڑھ! سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں اور کیا نہ کہوں! جب احساسِ دردمندی شدید ہوتا ہے تو دل تڑپ اٹھتا ہے اور آنسو، الفاظ کی شکل میں نوکِ قلم سے ٹپکنے لگتے ہیں۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا شاندار ماضی اور وقار، اس کی درخشاں روایات، اس کی عظمت و شان، اس کے مایۂ ناز استاد، قابلِ فخر طلبہ، اس کا روح پرور منظر، اس کی پُرکیف فضا، پیار، محبت، یگانگت، رواداری جاں نثاری سے بھرپور، نسلی اور علاقائی امتیازات سے پاک صاف ماحول، اخلاقی قدروں کا بے مثال نمونہ، مسلمانوں کے دل کی دھڑکن، سرسیّد کے خوابوں کا مسکن، علم و فن اور ادب و تہذیب کا مرکز، کبھی یہ تھی جاں فزا اور قابلِ رشک تصویر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی۔

لیکن اب کیا ہو گیا ہے آخر؟ کس کی نظر لگی ہے اِس کو! سب کچھ بدلا بدلا نظر آتا ہے۔ ماحول میں پراگندگی ہے۔ فضا میں گھٹن ہے۔ ایک دوسرے سے بیگانگی ہے۔ وہ پہلا سا جذبۂ محبت، وہ جوشِ جنون، وہ احساسِ ایثار و کرم، اب کیوں مفقود ہو گیا ہے؟ روایات سے بغاوت کا رجحان اور تعمیر کی بجائے تخریبی عمل بڑھتا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے، کاش تم سمجھ سکتے، سوچ سکتے اور اپنی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے۔ یہ سب کچھ

تم سے اس لیے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنے ہو، اپنوں سے ہی شکایت ہوتی ہے اور اپنوں پر ہی حق ہوتا ہے۔

دانش گاہِ علیگڑھ کے سپوتو! تم ملک و قوم اور ملت کا انمول سرمایہ ہو۔ وطن کے مسلمانوں کی نگاہیں تم پر مرکوز ہیں۔ تم ہواؤں کا رُخ پھیر سکتے ہو۔ وقت کے دھارے کو بدل سکتے ہیں۔ تم ملتِ اسلامیہ کے امین ہو۔ سر سید کے اس چمن کے نگہبان ہو جس کی آبیاری میں اس مایۂ ناز ہستی نے اپنے لہو کا ایک ایک قطرہ نچوڑ دیا تھا۔ تم اس کی آبرو، اس کا مستقبل اور اس کی شان ہو، تم اپنے عظیم محسن کے خواب کی تعبیر ہو۔

ملت کے فرزندو! تم دین کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑو۔ اس میں تمہاری دینی و دنیوی فلاح ہے۔ دنیا اور آخرت میں اگر سرفرازی و سرخروئی حاصل کرنا ہے تو سچے مسلمان بن جاؤ۔ ہر حال اور ہر قیمت پر علمِ دین سیکھو تاکہ خود کی اصلاح اور دوسروں کی رہنمائی کر سکو۔ یاد رکھو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہارا اہم ترین فرض ہے۔ دنیوی علوم کے حصول میں کسی طرح کی کوتاہی نہ کرو۔ دنیا میں اگر ایک باعزت قوم کی طرح زندگی گزارنا ہے تو علم کے خزانے سے خود کو مالا مال کر لو۔ زندگی کے ہر میدان میں اپنی ذہانت، علمیت اور کارکردگی کا ایسا ثبوت دو کہ دنیا تمہارا لوہا ماننے پر مجبور ہو جائے۔

یہ تم پر منحصر ہے کہ اس عظیم ادارے کو جیسا بنانا چاہتے ہو ویسا بناؤ کیونکہ اس کے مستقبل کے تم ہی معمار ہو۔ تم ایک ہی خدا اور ایک ہی رسولؐ کے نام لیوا ہو۔ نسلی اور صوبائی فرق کو مٹا دو۔ محبت، وضعداری، ہمدردی، رواداری اور اخوت کے چراغ جلاؤ تاکہ دلوں کے اندھیرے دور ہوں اور ذہن روشن۔ اخلاقی اقدار کو فروغ دو تاکہ انسانی برادری کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہو۔

گلشنِ سیّد کے پاسبانو! مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اس کو جتنا بھی خوشگوار، شاندار اور درخشاں بنا سکو بنا ڈالو۔ اچھی اور معیاری کتابوں کو اپنا بہترین ساتھی بناؤ کیونکہ ذہنی بالیدگی اور کردار سازی میں یہ سب سے زیادہ معاون اور رہنما ثابت ہوتی ہیں۔ غیر صحت مند ادب سے پرہیز کرو کہ اس سے وقت کی

بربادی اور بگاڑ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ان غیر اسلامی اور فضول رسموں اور رواجوں کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرو جو دیمک کی طرح معاشرے کو چاٹ رہے ہیں۔ صالح اور صاف ستھرے سماج کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرو۔

تمہارے والدین اس عظیم اور عزیز درس گاہ میں تمہیں صرف کتابی علم حاصل کرنے نہیں بھیجتے بلکہ یہاں کی صحت مند روایات سیکھنے اور یہاں کے مخصوص تہذیبی و ثقافتی ماحول میں مہذب اور مؤدب بنانے کو بھیجتے ہیں۔ نہ جانے کس کس طرح وہ اپنی خواہشوں پر قابو پاکر تمہاری تعلیمی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے شب و روز محنت کرتے ہیں۔ تمہاری خاطر ہر طرح کی تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک دن ان کے خوابوں اور تمناؤں کی تکمیل کروگے۔ تم انھیں مایوس مت کرنا۔ انھوں نے تمہاری پرورش میں اپنی جوانیاں گزاری ہیں تم ان کے بڑھاپے کا سہارا بننا۔ ان کی خدمت اور اطاعت کروگے تو تمہیں دونوں جہان کی برکتیں نصیب ہوں گی۔

اپنے بزرگوں کے شاندار کارناموں کو یاد رکھو تاکہ ان کے علمی شغف اور شوق ان کی لگن اور ان کے بلند مقاصد سے آگاہی حاصل کرکے اپنے مستقبل میں رنگ بھر سکو۔ جو قوم اپنے اسلاف، ان کے کارہائے نمایاں اور خدمات کو بھلا دیتی ہے وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتی بلکہ بدنصیبی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

مادرِ درس گاہ کے فرزندو! حق بات کہنے میں کبھی نہ جھجکو اور باطل کے سامنے کبھی سرنگوں نہ ہو۔ منافقت سے باز آؤ کہ یہ بدترین فعل ہے جس قوم میں منافق ہوتے ہیں وہ جلد برباد ہوتی ہے۔

اپنے استادوں کی عزت کرو کہ وہ تمہیں علم سکھاتے ہیں۔ استاد اور شاگرد کے مقدس رشتے کا احترام کرو تاکہ کل جب تم اس منصب پر قائم ہو تو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاؤ۔

زندگی کے سفر میں کتنے ہی موڑ آئیں، کتنی ہی آزمائشوں اور مصیبتوں سے سابقہ پڑے مگر حوصلہ مت ہارنا۔ اگر ہمت سے کام نہ لیا تو کچھ نہ کرپاؤ گے۔ پریشانیاں اور تکلیفیں عقل کو تیز کرتی ہیں اور کامیابی کی راہ دکھاتی ہیں۔

ـــ ماہنامہ فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اپنے حسنِ اخلاق اور کردار سے لوگوں کے دلوں کو جیتنے کی کوشش کرو صرف گفتار کے غازی نہ بنو بلکہ کردار کے غازی بن کر دکھاؤ۔ سارے امتیازات مٹا کر متحد ہو جاؤ۔ اتحاد سب سے بڑی طاقت ہے۔ اگر بکھرے رہے تو مٹ جاؤ گے پھر کفِ افسوس ملنے سے کچھ نہ ہوگا۔

اچھی صحبت اختیار کرو گے کہ یہ زندگی کو جلا بخشتی ہے۔ بری صحبت سے پرہیز کرو کیونکہ یہ تباہی و بربادی کا سبب بنتی ہے۔ آدابِ معاشرت سیکھو۔ اپنی روزمرّہ زندگی میں ان پر عمل کرو تاکہ دوسرے اس سے سبق حاصل کریں۔

اے وارثانِ سرسیدؔ! اپنی اس وراثت کی حفاظت کرنا تمہارا فرضِ عین ہے۔ جو تم کو سونپی گئی ہے۔ اس گلشن کو اجڑنے سے بچا لو۔ اس کے پھولوں کی خوشبو اور غنچوں کی مہک پورے عالم میں پھیلنے دو۔

سرسیدؔ کے قلعۂ علم کے نگہبانو! اپنی جدّوجہد، عمل، خلوص اور دانشمندی سے اس کی سرحدوں کو اتنا مضبوط بنا دو کہ کوئی دشمن ان میں داخل ہونے کی جرأت نہ کر سکے۔

تو پھر کیوں نہ آج ہی اور ابھی یہ فیصلہ اور عزم کرو کہ تم ہر قیمت اور ہر حال میں سرسیدؔ کی امانت اور وراثت کا تحفظ کرو گے۔ یقین کرو کہ تمہارے اس عمل اور مشن میں تمہاری مائیں اور بہنیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔ اب اپنے اس قطعہ کو پیش کرتے ہوئے تم سے رخصت ہوتی ہوں:

تم جو چاہو تو بدل جائے نظامِ امروز
پلٹ آئے وہی پھر دورِ مسرت آگیں
چار سو رنگ بہاراں نظر آئے بخدا
مسکرانے لگے سیدؔ کے گلستاں کی زمیں

اچھی بات کہنا صدقہ ہے۔ (مسلم)

وصی احمد نعمانی

خوبصورت دلہن

● ہندوستان ایک خوبصورت دُلہن ہے۔ ہندو اور مسلمان اس کی دو خوبصورت آنکھیں ہیں۔

● سر سید نے ہندوستان کی عظمت اور ہندو مسلمان دونوں کی ایکتا کی ضرورت کا اظہار مذکورہ بالا لفظوں میں اپنے دل کی گہرائیوں سے بہت سال پہلے کر دیا تھا۔ جو وقت کی کسوٹی پر آج بھی پوری طرح کھرا اترتا ہے۔ یہی ہندوستان کی عظمت کا معیار اور دو چھوٹے بڑے بھائیوں کے رشتہ کا بے مثال پیمانہ بھی ہے۔ ہندو سے مراد تمام کرسچین' جین اور سکھ وغیرہ ہیں۔ اس لئے ہندو مسلمان اور ہندوستان ایک دوسرے کی بقاء کے لئے جزو لاینفک ہیں۔ تینوں کو ہر ایک کے لئے اور ہر ایک کو تینوں کو لئے جینا' مرنا ہے۔ تینوں کی ترقی و خوشحالی' ان کی زندگی میں چڑھاؤ اُتار' ایک ساتھ سانس لینا' اور آپس میں تعاون واشتراک کا نام ہی ہندوستان ہے۔ تینوں کا ایک اپنا اور متفقہ راستہ پر چلنا ہر ایک کے نصب العین کے حصول کے لیے ضروری ہے۔ یہی سر سید کے پیغام کا لب و لباب ہے۔

● سید احمد نے آزادی سے قبل اور بعد کے حالات کا اپنی دور بیں اور دور اندیش نگاہوں سے معائنہ ' محاسبہ اور تجزیہ کر لیا تھا۔ اور ایک حتمی نتیجہ تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے یہ بات بھلی بھانتی سمجھ لی تھی کہ ہندوستان کی دوسری خوبصورت آنکھ 'مسلمان سے اس کی روشنی نور اور بینائی چھین لینے کی ترکیب مکمل کی جارہی ہے۔ اس کو ہمیشہ کے لئے کس مپرسی کے عالم میں ڈھکیلنے' مایوسی کے عالم میں زندہ رہنے کے لئے مجبور کرنے کی سازش طے کر لی گئی ہے۔ اور مجموعی طور پر ان کی بربادیوں کے مشورے آسمانوں میں ہونے لگے ہیں۔ یہ

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سب ایسے حالات تھے جس نے مرد مجاہد کو بے چین کر دیا' وہ تڑپ اٹھے۔ ان کی نگاہیں نیلے گگن کے خالق کی جانب اٹھیں اور مدد و سکت کی طلب گار ہوئیں۔ خدا نے دعاء قبول کی اور جرأت و ہمت عطا کی۔ پھر سید ان جانے راستہ پر' مگر' جوش و ولولہ کے ساتھ چل پڑے۔

● مسلمانوں کو تخت و تاج سے بے دخل کیا جا چکا تھا۔ ان کی پگڑی و دستار کو عجائب خانوں کی زینت بنانے کی سازش کی جا چکی تھی اور سارا پلاٹ تیار ہو چکا تھا۔ ایسے میں تاریک ' پُر خطر راستہ پر چلنا سب کے کلیجے کی بات نہیں تھی۔ لیکن سید کی مٹی تو "ابو تراب" سے ملی تھی' اس لئے قدرت نے ان سے اپنے محبوب بندوں کے لئے بڑا کام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اسی لئے "باب العلم" سے گزر کر سر سید نے علی گڑھ میں "شہر علم" بسانے کا فیصلہ کیا۔ "ابو تراب" اور "امی" کے شیدائی ہونے کے ناطے سنگلاخ زمین پر چل پڑے۔ "چین تک" کی مسافت طے کرنے کے فلسفۂ محمدی کو سرمایۂ سفر بنا کر' کارواں بنا۔ انسان دوست خدا ترس سید کے رفیق یکجا ہو گئے۔ خدا نے سید کے من میں ایک بات بٹھا دی کہ "شہر علم" بسانے کا خواب ہندوستان کی مٹی میں دیکھنا ہے تو اسی سرزمین کو نچوڑنا ہے۔ اسی سے پانی نکالنا ہے' مسلمان کی مفلوک الحالی کا مداوا اسی دھرتی سے کرنا ہے۔ علم و فضل کا سرچشمہ یہیں دستیاب ہو گا' اور اس کی تقدیر یہیں بدلے گی۔ سر سید اس فکر سے کبھی ڈگمگائے نہیں۔

● سید احمد نے مدرستہ العلوم کی بنا ڈالی۔ اینگلو اورینٹل کالج بنا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے علم و آگہی کا تابناک سورج اپنی شعاعیں بکھیرتا جلوہ فگن ہوا۔ علم و دانش کا لگایا ہوا پودا ایک نہایت گھنا' تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ سایہ دار' ہرا بھرا' پھلوں سے لدا ہوا شجر۔ پیاسوں نے اپنی پیاس بجھائی اور دوسرے پیاسوں کی پیاس بجھانے کا سلیقہ سیکھا۔ بے خوابیدہ اور بے چین آنکھوں کی ضروری نیند کا سامان مہیا کیا۔ تھکے مسافروں کو ان کی منزل کا پتہ دیا۔ گویا کہ اندھیروں میں ہزاروں چراغ جل اٹھے۔ مسلمانوں کو جینے کا سلیقہ عنایت کرنے کے لیے سر سید نے اس شمع علم و کمالات کو اپنے خون جگر سے منور کیا۔ اس طرح پھر ہوا یہ کہ سر سید نے طاق حرم میں روشن شمع کو علی گڑھ میں جلا کر وحدانیت کی کرنیں بکھیرنے کا سرمایہ پالیا۔ علی گڑھ سے اٹھنے والا ابر سارے جہاں پر برسنے لگا۔ اپنے اور غیروں کے چمن کی تفریق کئے بغیر ابر علی گڑھ بے پایاں اور بے کنار ہو گیا۔

● پھر ایسا لگتا ہے کہ کہیں کسی کی نظر لگ گئی یونیورسٹی کو۔ اپنوں نے غیروں کی مدد اور

سہ ماہی فکر و آگہی' علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سازش سے گھن لگانے کا نامکمل منصوبہ بنالیا' جو سارے عالم میں منفرد و بے مثال تھی۔ وہ عام یونیورسٹی کی صف میں لا کھڑی کردی گئی۔ اور یونیورسٹی عام ڈگر پر چلنے جیسی لگنے لگی۔ جیالے طلباء' مشفق اساتذہ' عملہ ارباب کمال سب کے سب اور یونیورسیٹیوں کی طرح لگنے لگے۔ جس یونیورسٹی کا قیام ہی مسلمانوں کو باعزت مقام دلانے' اور اپنی زندگی میں سرفراز رہنے کا سلیقہ سکھانے کے لیے ہوا تھا' وہاں سب کچھ بدلنے لگا۔ شیروانی' ٹوپی' ترچھی دار کلاہ' سوکھے ہونٹ مگر چمکدار آنکھوں میں پاک منصوبہ کی جھلک اور اُس نیک نیتی کی آماجگاہ کی جگہ افراتفری نے لے لیا۔ زبان و قلم اور فن و کردار کی جگہ چاقو اور طمنچہ رکھنے کے الزامات و اس کی صفائی نے لے لی۔

● دھیرے دھیرے طلباء' اساتذہ' عملہ ارباب کمال کا ایک طبقہ جامعہ کے لیے جیسے بوجھ سا بن گیا۔ سرسید کے خواب کی تعبیر بالکل مجروح ہوگئی۔ جو سلسلہ ہندوستان اور غیر ممالک میں انفرادیت کے لئے چلا تھا وہ بالکل ختم سا لگنے لگا۔ جس کے سر پر کلام پاک کا تاج اور ہاتھوں میں حکمرانی کی تلوار ہونی تھی انہیں ہاتھوں میں مایوسی' کس مپرسی' بے کاری' لاچاری کی ڈگریاں ڈالنے کی راہیں پیدا کی جانے لگیں۔ اور انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ یونیورسٹی کو دہشت گردی اور جاسوسی کے مراکز اور وطن دشمنی کا اڈہ قرار دیا جانے لگا۔ کہا جاتا تھا کہ دین سنورانے کے لیے دیوبند' دنیا سنوارنے کے لیے علی گڑھ ان دونوں سے مبرا ہونے کے لیے جامعہ ملیہ جانا چاہئے۔ یہ بات آپسی محفلوں میں از راہ خوش گفتی کہی جاتی تھی مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ ہمارے عظیم تعلیمی ادارے ایسے قومی سرمایہ ہیں جس کی کوکھ سے مادر وطن کی آزادی کے جیالے سپاہی پیدا ہوئے' جن کی گرج سے غیروں کے ایوانوں میں لرزش پیدا ہوتی تھی۔ انہیں درسگاہوں کو غیروں نے اپنوں کو اکسا کر انہیں کمزور کرنے کا نامکمل خواب دیکھا ہے' جس کی تعبیر خود ان کی "مایوسی" ہوگی انشاء اللہ۔ اب تو سازش اس بات کی ہو رہی ہے کہ عقل و شعور' سمجھ بوجھ' عزت و آبرو' مستقبل کو تاریک کرنا ہو تو اپنے بچوں کو علی گڑھ بھیجو۔ یہ سازش ہو سکتی ہے مگر یہ صرف الزام بھی نہیں ہے۔ یہ ایسا کڑوا سچ ہے جہاں سوچنے کے لیے انسانی ذہن تھم کر ماتھے پر پڑی شکنوں کو گنتا ہے' اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جن کو حکومت کرنی تھی' خدا کی راہ پر چل کر زندگی گزارنا تھی' وہ گمراہ اور محکوم ہوگیا ہے' اور نتیجہ کے طور پر دردناک زندگی گزارنے کے لیے مجبور کردیا گیا ہے۔ جس کو

ملک وملت کی مسیحائی کرنی تھی' اُسے زندان میں بند رکھنے کی ترکیبیں ہو رہی ہیں' اور وہ خود تماشائی بنا ہے۔

ذمہ دار کون ہے؟

● طلباء؟ اساتذہ؟ شیخ الجامعہ؟ عملہ؟ سرپرست؟ حکومت؟ یا کوئی نہیں؟ یا ہم سب؟ یا وہ ہاتھ اور ذہن جو نظر نہیں آتے مگر چشم وابرو کے اشارے پر کام کر جاتے ہیں؟ یا وہ جان و روح جو نظر تو نہیں آتیں مگر ہماری سزا کے طور پر ایسے حالات سے دوچار کرتی رہتی ہیں جس کے ہم حقدار ہیں؟ اپنی کم فہمی' بے عملی' بد عملی' ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے یا اپنے فرائض منصبی کی وجہ سے سازشوں کے گھیرے میں آرہے ہیں؟

طلباء:

● وہ معصوم ذہن' جو تعلیم حاصل کرنے ہندوستان کے غیر ترقی یافتہ گاؤں کے پاٹھ شالاؤں' مکتبوں' مدرسوں' اسکولوں سے سفر کرتے ہوئے بورڈ کے امتحانات سے گزر کر کالج ہوتے ہوئے علی گڑھ میں داخلہ لیتے ہیں اور اپنی پرانی یادیں جو صرف درگا پوجا' لکشمی پوجا' گنیش جینتی' بھومی پوجن' شیو بارات جیسی تقریبوں کے ماحول میں تعلیم حاصل کر کے آتے ہیں' کیوں کہ صرف اسی طرح کی تقاریب کو ہندوستانی میلوں کا نام دیا جاتا ہے۔ جب علی گڑھ کے ہر ہوسٹل میں نمازی' ہر ہال میں مسجدیں' ہر تقریب کی شروعات کلام پاک کی تلاوت سے شروع ہوتے دیکھتے ہیں تو اچانک اپنی تلاش کو پالینے کی خوشی میں سب کچھ بھول کر صرف یک طرفہ سوچ کو فوقیت دیتے ہیں۔ موقع کو غنیمت جان کر صرف ایک ہی رنگ میں رنگ جانے کو اولیت دیتے ہیں۔ ایسے ہاتھوں میں پڑ جاتے ہیں جو ان کو مشترکہ تہذیب سے مل کر چلنا دشوار بنا دیتے ہیں؟ یا ان سب کے ذمہ دار ہیں وہ ذہن جو یہی چاہتے ہیں' ایسے ہی لوگوں پر الزام عاید کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنا مقصد پالینے کے لیے یونیورسٹی کو داؤ پر لگا دیتے ہیں؟ یا وہ سینئر طلباء جو علی گڑھ کی دیرینہ روایات کو ٹھیک سے نئے طلباء تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہونے کی وجہ سے اپنا فرض نہیں نبھا پاتے ہیں اور کچا ذہن بہکاوے میں آکر' نئی اور بڑی تعلیم گاہ کو دیکھ کر' صحیح فیصلہ نہیں کر پاتے ہیں؟ تمام طلباء کو معصوم نہیں کہا

جاسکتا۔ ٹھیک اسی طرح تمام کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بڑی تعداد طلباء کی ذہین، محنتی، جفاکش تابناک مستقبل کی فکر رکھنے والی ہوتی ہے۔ مٹھی بھر گمراہ لوگوں کی وجہ سے بڑی تعداد میں طلباء، اساتذہ اور سرپرستوں کا نقصان ہوتا ہے۔ ان معصوم گمراہ طلباء کو سینئر طلباء اور مشفق اساتذہ کی سرپرستی کی ہمیشہ ضرورت ہے، جو جامعہ میں ہمیشہ دستیاب رہی ہے۔ محنتی اور خوش بخت بچے اپنی تعلیم پوری کر کے خاندان، سماج، اور ملک کی خدمات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ IPS، IAS، جج، نامور ڈاکٹر، وکیل، انجینئر، صنعت کار اور سیاست کار بن جاتے ہیں۔ جو دوران تعلیم اپنا وقت، پیسہ، طاقت اور ذہن کا استعمال کچھ کرنے، کچھ پالینے میں لگاتے ہیں، وہی علی گڑھ سے کچھ لے کر نکلتے ہیں۔ علی گڑھ طلباء کی ایک ٹولی جو صرف وقت گزارنے اور چند چھوٹے موٹے عہدوں کی سیاست میں پڑ جاتی ہے وہ دوسروں کی سیاست کا شکار بھی ہو جاتی ہے۔ طلباء اور اساتذہ کی یہی ٹولی علی گڑھ کے لیے مہلک ہوتی جارہی ہے۔ ایسے گنے چنے لوگ ہاؤس مانیٹر، فوڈ مانیٹر، سینئر ہال، یونیورسٹی کیپٹن، لٹریری سکریٹری وغیرہ کے عہدوں کے حصول کو اپنا کامیابی کا زینہ جانتے ہیں اور انہیں سے اپنی تباہی کا آغاز کرتے ہیں۔ لیکن جو طلباء اپنی میرٹ اور علی گڑھ سماج کی ضرورت کے مطابق ان عہدوں کے لئے نامزد کئے جاتے ہیں وہ وہاں کے طلباء، اساتذہ اور مادرِ درسگاہ کے لئے فائدہ مند اور کارآمد ہوتے ہیں۔ انہیں کوئی ٹولی ان عہدوں کے لالچ میں ڈال کر اپنا چارہ یا آلہ کار کے طور پر استعمال نہیں کرپاتی ہے۔ ایسے ہی طلباء سید کے چہیتے ہوتے ہیں۔

● اساتذہ   راقم ان خوش نصیبوں میں سے ہے جن کو علی گڑھ کے مایہ ناز اساتذہ، پروووسٹ، وارڈن وغیرہ کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ شعبۂ انگریزی کے پروفیسر جناب مسعود الحسن صاحب، پرووائس چانسلر خلیق احمد نظامی، جناب نسیم قریشی، پروفیسر ناصر علی صاحب کی ذات گرامی نے ان گنت طلباء کو قلم اور زبان کا شعور بخشا، تقریر و تحریر میں علی گڑھ میں کچھ کرنے اور پانے کا موقع دیا۔ پروفیسر علی اختر خاں کی سخت نگاہی لیکن بے پناہ شفقت نے مضبوط ارادہ بخشا۔ پروفیسر کمال احمد صدیقی کی سادگی اور پاک طبیعت نے زمانے کو پرکھنے کی سکت دی۔ ڈاکٹر اشتیاق اعظمی، پروفیسر شمیم جے راج پوری، پروفیسر بلگرامی، پروفیسر نذیر خان، پروفیسر رحمٰن علی خاں، پروفیسر معبود حسن صاحب، پروفیسر مصباح الحسن، ڈاکٹر زکریا، ڈاکٹر مشیر عالم، ڈاکٹر زبیر احسن ان اساتذہ میں سے تھے جنہوں نے اپنی خاموش

شفقت اور بلند مرتبت کردار سے میری تعلیمی زندگی کی بھرپور آبیاری کی اور عملی زندگی کا سرمایہ عطا کیا۔ ایسے کرم فرما اساتذہ کی ایک بہت بڑی تعداد علی گڑھ میں ہمیشہ موجود رہی ہے اور ایسی شخصیتوں کا علی گڑھ میں کبھی قحط نہیں پڑنے والا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ لوگ طلباء اور یونیورسٹی پر کسی طرح کی آنچ دیکھ کر بلبلا اٹھتے تھے۔ مگر اب زیادہ تر باکردار' بلند مرتبت اساتذہ بھی حالات کے سامنے خاموشی یا گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے ہیں' یا اپنی عزت و آبرو بچا کر کنارہ کش ہونا بہتر سمجھتے ہیں۔

● مٹھی بھر تعداد ان اساتذہ کی ہے جو پرووسٹ' وارڈن' ڈین اسٹوڈینٹس ویلفیئر' چیرمین یا اور زیادہ بڑے عہدوں کی دوڑ میں معصوم اور بھولے طلباء کی نا سمجھی کا استحصال کرتے ہیں۔ ایسے اساتذہ کسی نہ کسی طرح درس و تدریس کے ساتھ برائے نام چپکے رہتے ہیں مگر انتظامی امور پر دسترس ہو اس کی بڑی جدوجہد کرتے ہیں۔ صوبائی اور مرکزی حکومت یا ان کے جاننے والوں تک رسائی ہوتی رہے اس میں کبھی چوکتے نہیں ہیں۔ لیکن ان ہی عہدوں پر جن اساتذہ کو ضرورت اور ان کے ہمدردل کی وجہ سے فائز کیا جاتا ہے وہ جامعہ 'اساتذہ' طلبا' سرپرستوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتے ہیں۔ انھیں جیسے باکردار عہدیدار اساتذہ کے دم خم پر سرسید کا بسایا "شہر علم" اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ اساتذہ یا طلباء میں سے جس نے بھی علی گڑھ کا مفاد تیاگ کر سودا کرنے کی کوشش کی' انہیں وقتی طور پر فائدہ حاصل ہوا ہو گا مگر روح سرسید' قوم' طلباء' عام مسلمان' علی گڑھ کی سرزمین نے ہمیشہ ایسوں کو کوسا اور پھر وہ کہیں کے نہیں رہے۔ جو بہ ظاہر کسی عہدہ کی دوڑ میں نہیں ملوث ہوئے' وہ صرف علم بانٹتے رہے اور طلباء کے کردار کی آبیاری کی۔ ان کی پُرشکن پیشانیاں' نونہالان سرسید کی زندگی کی "سلوٹیں" دور کرتی رہی ہیں۔ آج بھی یہ سب کچھ علی گڑھ میں ہے "جوئندہ' یابندہ" پیدل' سائیکل سے سفر کر کے کلاس روم جانے والے اساتذہ آج بھی معصوم ذہنوں میں علم کا چراغ روشن کرتے ہیں۔ ان کے ناشگفتہ ذہنوں کو واکر کے علم و کمالات کی خوشبو بکھیرنے کا سلیقہ عطا کرتے ہیں۔ حالات و حوادثات سے آنکھیں ملا کر زندگی گزارنے کا گر سکھاتے ہیں۔ اور خضر راہ بننے کی ترکیب بتاتے ہیں ناگفتہ بہ حالات' صعوبتوں' اور کٹھنائیوں' طوفان اور آندھیوں کے سینوں پر اپنے کارناموں سے دستخط ثبت کرنے کا ہنر سکھاتے ہیں۔ ایسے چند ہاتھوں کی انگلیاں پکڑنے کا موقع ملا تھا'

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

جن کے معمولی لمس سے پتھر سونا بن جاتا تھا۔ پروفیسر نظامی' پروفیسر مسعود الحسن' پروفیسر نسیم قریشی' پروفیسر شمیم جے راجپوری' پروفیسر اشتیاق اعظمی' پروفیسر رحمٰن علی خاں' پروفیسر علی اختر خاں' پروفیسر کمال احمد صدیقی' پروفیسر معبود حسن' پروفیسر جعفری' پروفیسر عثمانی' ڈاکٹر زبیر احسن۔ میرے اپنے ایسے ہی اساتذہ تھے۔ یہ سب کے سب آج بھی موجود ہیں اپنے تراشے ہوئے شاگردوں کی شکل میں جو علی گڑھ کے مختلف شعبوں میں درس و تدریس کا کام انہیں کے راہ پر گامزن رہ کر ہو رہے ہیں۔ دیدہ چاہئے دیکھنے کو۔ دل چاہئے محسوس کرنے کو

وائس چانسلرز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونا' انساں کی زندگی میں ایک عظیم کامیابی ہے۔ بے حد خوش بخت لوگ ہیں جو یہ موقع خدا کے حضور سے حاصل کرپاتے ہیں۔ لیکن وہ بے پناہ بد نصیب ہوتے ہیں جو اس سرزمین پر اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے ٹک نہیں پاتے ہیں' یا کچھ اور پانے کی چاہت میں سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔ شیخ الجامعہ کے عہدہ پر فائز ہوتے ہی دنیاوی ترقیوں کے آستانے کھل جاتے ہیں اور 5 سال کی مدت پوری ہوتے ہی زیادہ بڑے عہدے تھالیوں میں سجا کر پیش کئے جانے کے لیے لوگ منتظر رہتے ہیں۔ ایوان قانون ساز کی ممبری' وزارت' سفارت' گورنری وغیرہ تو بہت معمولی سا تحفہ ہے جو ہر کسی کو عام طور پر مل ہی جاتا ہے۔ انہیں تو صدر جمہوریہ کے عہدہ تک کا مرتبہ ملا ہے۔ ترقی کے اس زینہ پر قدم رکھتے ہی بڑے بڑوں کے پاؤں ڈگمگاتے ہیں لیکن جو سر سید کی آواز کو سنتا ہے اور طلباء کی ضرورت کو محسوس کر کے ہندوستان کی اس نئی نسل کی آبیاری کرتا رہتا ہے' وہ سب کا چہیتا بن جاتا ہے۔ قوم' ملک' حکومت' طلباء' اساتذہ' عملہ سب انہیں اپنا مشفق مانتے ہیں۔ لیکن جو "تھالیوں میں سجے سجائے عہدوں" اور سید احمد کے من کی "کسک" میں فرق پیدا نہیں کرپاتے ہیں' وہ صرف گوشہ نشین بن کر اپنی سانس گنتے ہوئے زندگی کے آخری اوقات گزار دیتے ہیں۔ اور بس۔

● چونکہ مسلم یونیورسٹی کو تاریخی' مذہبی' سماجی اور سیاسی بہت بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہ اہمیت اسے بین الاقوامی سطح پر حاصل ہے' اس لئے یہاں کے شیخ الجامعہ کی تقرری /

سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

انتخاب میں اس پیمانہ کا لحاظ ضرور رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ کی شخصیت میں بے پناہ مسائل کو جھیلنے کی صلاحیت اور ان مسائل کے حل کی "تجھ" کی ضرورت ہوتی ہے۔ VC ہونا بڑی ذات ہونے کی علامت ہے۔ لیکن بہت بڑی شخصیت کی تعمیر تو شیخ الجامعہ کی شکل میں اس عہدہ پر فائز ہونے کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔ یہ ایسے مراحل ہیں جہاں ایک بڑی کشمکش پیدا کر دی جاتی ہے یا خود بخود ہو جاتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر کھینچا تانی کا ماحول بھی پیدا ہوتا ہے۔ تھالیوں میں سجے مرتبوں کی چاہت اور شہر سید کی "دمک" کو باقی رکھنے کی جانفشانی کے درمیان ایک تصادم سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی موقع پر شیخ کے "کردار" کا امتحان ہوتا ہے۔ جو شیخ تھالیوں کو اولیت دیتا ہے وہ سونا چاندی حاصل کر کے بھی کنگال ہو جاتا ہے اور خالی ہاتھ علی گڑھ سے واپس لوٹتا ہے اور زندگی بھر خود ملامت میں زندگی گزارتا ہے۔ جس کی دور بیں نگاہیں جامعہ کی تحریک کے جذبہ کی حفاظت اور اس کی "دمک" کو بچائے رکھنے میں مرکوز ہوتی ہیں وہ سب کا "پیارے" بن کر زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے قدموں میں تھالیاں تو کیا "تھالیاں پروسنے" والے اپنا سر جھکاتے ہیں اور ان کے تیور و ابرو کا احترام کرتے ہیں۔

- اس طرح کی بے لوث ذات کو علی گڑھ میں کوئی بھی اپنے زعم میں نہیں لے پاتا۔ کیونکہ وہ کسی ایک گروپ کے جال کو اپنے قریب پڑنے ہی نہیں دیتا ہے۔ وہ علی گڑھ کے چند خاندان یا کچھ گنے چنے سابق طلباء کے گروپ کا محکوم بن کر نہیں رہنا چاہتا۔ یہ سچ ہے کہ کمزوری آدمی کی صفت ہے، مگر اپنی خامیوں پر غور کر کے انہیں دور کرنا بھی انسان ہی کی صفت ہے۔ جس سے وہ فرشتوں کا ہم پلہ ہو جاتا ہے۔ تاکہ شیخ بھی دیا دارے۔ تسبیح دربار کو بدلا جاتا ہے۔ "مسیحا" بن جانے کا فن آتا ہے۔ نگاہوں سے گرنے کی "مجبوری" کے ہاتھوں سرایب ہونے کے حادثہ سے بھی واقف ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ تو خود اس کی ترجیح اور انتخاب کی بات ہوتی ہے۔ وہ جس راستہ کو بھی چنے اس کا وہ خود مالک ہوتا ہے اور ذمہ دار بھی۔

- جامعہ میں تعمیری کام لگ بھگ سبھی شیخوں نے کرایا ہے۔ نئے مراکز کھولے۔ سیٹیں بڑھوائیں۔ نئے مضامین کے شعبے ڈلائے۔ بڑے دروازے، نئے پارک یونیورسٹی کی خوبصورتی اور طلباء کے ذہنی عروج کی علامت ہیں۔ VC ان سب کارناموں سے یاد کئے

جاتے ہیں۔ لیکن دلوں میں صرف وہ "بسائے جاتے ہیں" جو سید کی تڑپتی روح کی آواز کو سنتے ہیں، اور ہچکیاں لے کر رونے والے سید کی بھیگی داڑھی پر جن کی نگاہ ہوتی ہے۔ وہ "ہندو مسلم دو خوبصورت آنکھیں ہیں" کے فلسفہ کو اپنی روح کی گہرائی سے سمجھتے ہیں اور جو دل، من، اور ضمیر ان سے خالی ہیں وہ "نظروں" سے گر جاتے ہیں۔ یہی دو متضاد صفتیں یاد رہتی ہیں۔ دعا کے لیے اور کوسے جانے کے لیے۔ میرا اپنا تو یہ ہے

یاد ماضی ثواب ہے یارب
مجھ میں باقی رہے حافظہ میرا

● ہم میں سے جو طلباء تعلیم حاصل کر کے علی گڑھ سے جا چکے ہیں، ان میں، اکثر، وکیل، انجینئر، صحافی، سیاست کار، وزیر، پرنسپل، چیئر میں سب کچھ ہوے اور بنتے رہیں گے۔ وہ سب کے سب علی گڑھ کی گذشتہ یادوں کو اپنے سینوں سے لگائے زندگی کے اتار چڑھاؤ سے آنکھیں ملاتے ہوئے خوش وشاداں ہیں۔ عبداللہ گرلز کالج کے آڈیٹوریم میں مباحثہ کے درمیاں ہوٹ ہونا اور چنچل تر ارتوں کو جھیلنا کس مقرر کو یاد نہ ہوگا۔ ان ہی قہقہوں اور شوخیوں کے میلہ سے اپنی شریک حیات کو پالینا بھی کسی کامیابی سے کم نہیں ہے، چاہے مباحثہ میں ہوٹ کرنے کی سزا کے طور پر ان میں سے ایک کو زندگی کا ہم سفر ہی کیوں نہ بنالیا گیا ہو۔ آزاد لائبریری میں کتابوں کی چیکنگ اور چاہنے کے باوجود مطلوبہ کتابیں دستیاب نہ ہونے کی تکلیف وہ مگر میٹھی اور خوش گوار یادیں ہیں۔ کینیڈی ہال، یونین ہال کے قیامت خیز ہنگامے بھی میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ لیکن ان یادوں کو زندہ جاوید بنانے کے لیے ہم سب نے کیا کیا۔ یا آپ نے کون سی کوشش یا جتن کیے۔ کیا کبھی من میں بے چینی پیدا ہوتی ہے کچھ کرنے کی؟ اگر ہاں تو جامعہ کے انتظام کو اچھا سا نے، مبینہ طور پر گرتے ہوئے تعلیمی معیار کو بلند کرے، آپسی رشتہ اور طلباء کے درمیان بھائی چارے کو بڑھانے اور اساتذہ و طالب علموں کے درمیان مشفقانہ برتاؤ کو پھیلانے، کے لیے کیا قدم اٹھایا۔ ہمیں آپس میں مل کر، خط لکھ کر، فون کر کے، علی گڑھ جا کر، یا وہاں کے احباب کو بلا کر اور مشورہ کر کے ٹھوس قدم اٹھا کر، ملکی اور بین الاقوامی پیمانہ پر علی گڑھ کے نوجوانوں کو زمانہ کی ترقی اور خوش حالی میں حصہ دلا کر، سر سید کے خواب کو پورا کرنا ہی ہوگا۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

● ہم سب مدد کر سکتے ہیں' اور راستہ نکال سکتے ہیں۔ مثلاً اپنی کمائی کا کچھ حصہ بھیج کر' ب طالب علم کو وظیفہ دے کر' کسی ضرورت مند نوجوان کی تعلیم کی مدت تک کا تمام روری خرچہ دے کر' اگر اور آگے بڑھیں تو اقامت گاہوں کی تعمیر کی سبیل نکال کر یا کم سے کم ایک کمرہ کی تعمیر کرا کر' کتابیں بڑی تعداد میں دے کر جدید ترین سائنسی آلات و مشینیں تحقیقات کے لیے مہیا کرا کر۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ہم نے تعلیم حاصل کر لی ر اپنے بچوں کو بھی تعلیم دلا دی اور بس۔ نہیں 'علی گڑھ کی تحریک تعلیمی اور ذہنی تربیت کی تحریک ہے جو لامتناہی ہے اور خدا کرے رہتی دنیا تک یہ تحریک مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائے۔ اسی تحریک نے علی گڑھ میں اچھا استاد' پاک ذہن' مضبوط ارادہ دیا جس نے ہمیں اور آپ کو زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے اور پرکھنے کا سلیقہ سکھایا۔ زمانہ سے آنکھیں ملانے کا ڈھنگ سکھایا' ہم سب جامعہ سے تعاون کریں' سر سید کی پاک روح کی آواز کو سننے کی کوشش کریں گے تو آپ کی جاں کو بھی غور و فکر اور تڑپنے کا موقع ملے گا اور پھر آپ کی ڈبڈبائی آنکھیں ضرور کچھ دیکھ لیں گی' سیّد کی تحریک میں اور کچھ پا لیں گی "تہذیب الاخلاق" کی اشاعت کی ضرورت میں۔

● اس لئے ہمیں اور آپ کو یہ دیکھنا ہو گا کہ طلباء کے سروں پر قرآن کریم کا تاج اور ہاتھوں میں زمانہ پر حکمرانی کی تلوار آج بھی دی جا رہی ہے یا نہیں؟ دین کی دولت حاصل کرنے اور دنیا کو مسخر کرنے کا گر سکھایا جا رہا ہے یا نہیں؟ اگر ہم یہ سب کچھ کر سکیں گے تو اپنے سر کا قرضہ اتار سکیں گے۔ سید کا قرضہ' ملک کا قرضہ' اسلام کا فریضہ سر سید کے ان تمام احباب کا قرضہ جن کے ساتھ سید نے گالیاں کھائیں' پتھر کھائے اور انہیں پتھروں کو جمع کر کے علی گڑھ کی مقدس دیواروں کی بنیاد بنا ڈالا۔ خوبصورت دُلہن کی عزت و آبرو' عصمت و دولت کی حفاظت کے لئے' ان کی دونوں خوبصورت آنکھوں کی سحر انگیزی کو اور چار چاند لگانے کے لیے پتھروں کو دونوں ہاتھوں سے بٹورا' چوما' کلیجہ سے لگایا' دعائیں دیں' سنت حضور ﷺ ادا کی اور مجروح انسانیت کے لیے مداوا ڈھونڈھ نکالا۔

خدا سیّد کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۹۷۲

احسن مارہروی

صدائے جوبلی

بانی کالج کا منشائے دلی معلوم ہے — مختصر جس کا یہی مطلب، یہی مفہوم ہے
علم دنیا سے جو قوم اس عہد میں محروم ہے — آج اگر موجود بھی ہے وہ تو کل معدوم ہے
زندگی کا مقصدِ واحد ہے علم با عمل
اس سے غافل ہے تو انساں ہے ذلیل و مبتذل

اب زیادہ طول دینے کی ہمیں حاجت نہیں — کون ہے اس بزم میں جو واقفِ حالت نہیں
یہ ہے یونی ورسٹی اب اسکول کی صورت نہیں — اور کالج کی طرح محدود حیثیت نہیں
تکملہ ہر علم و فن کا اس میں ہونا چاہیئے
پاؤں پھیلا کر نہ غافل ہم کو سونا چاہیئے

تکملے کے واسطے زر کی نچھاور چاہیئے — طالبان علم کے آرام کو گھر چاہیئے
جمع یہ قطرے جہاں ہیں وہ سمندر چاہیئے — مختصر یہ ہے کہ ہم کو ایسا یاور چاہیئے
جس کے دل میں درد ہو جو قوم کا غمخوار ہو
اور جس کی ناخدائی سے یہ بیڑا پار ہو

اجتماعِ قوم سے کچھ نفع حاصل کیجیئے — اس کو تفریحات وقتی میں نہ شامل کیجیئے
نقص جتنے رہ گئے ہوں ان کو کامل کیجیئے — حق کو ثابت کیجیئے باطل کو زائل کیجیئے
اُٹھیئے لے کر جائزہ پنجاہ سالہ کام کا
ہے یہی مقصود اس آغازِ نیک انجام کا

●

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۱۳

چند نقوش و آرا،

—

۹۷۴

ڈاکٹر رفعت سلطان

فکر و آگہی ' بھوپال نمبر یادگار تقاریب

ہند و بیرون ہند اردو دنیا میں دہلی سے نکلنے والے ادبی رسالے " فکر و آگہی " کی الگ پہچان ہے ۔ اردو ادب کی جانی مانی کئی شخصیات پر اہم و ضخیم خصوصی نمبر نکالنے پر ڈاکٹر رضیہ حامد کو خراج تحسین مختلف دانش وران ادب سے حاصل ہوا ۔ رسالہ " فکر و آگہی " دہلی کی خصوصی پیش کش " بھوپال نمبر " کا ادبی دنیا میں بے شمار لوگوں کو بے چینی سے انتظار تھا ۔ فکر و آگہی کی اڈیٹر ڈاکٹر رضیہ حامد نے " بھوپال نمبر " کی تیاری کے سلسلے میں کئی ممالک کا سفر بھی کیا جس کی وجہ سے ہندوستان کے علاوہ بیرون ملک رہنے والے اہل علم و ادب اور اہل بھوپال آواز بر گوش اور آنکھیں فرش راہ کیے " بھوپال نمبر " کے منتظر تھے ۔

ادارۂ باب العلم پبلی کیشنز (رجسٹرڈ) دہلی کے زیر اہتمام نکلنے والے رسالے " فکر و آگہی " کے دس سال پورے ہوئے ۔ اس کی ایک تاریخ ہے جدوجہد کی اور ادبی خدمات کی ۔ ڈاکٹر رضیہ حامد نے زندہ لوگوں پر نمبر نکالنے کی خوب صورت اور حوصلہ افزا روایت کو مستحکم کیا ہے ۔ ڈاکٹر بشیر بدر ، رفعت سروش و ہیکل آتساہی نمبر نکال کر اپنے وقت کے اہم اصناف پر لکھنے والوں کی نئی جہات کی تلاش کے ساتھ ان کا اعزاز کیا ، یہ قابل ستائش ہے ۔ اردو میں نووارد صنف اوپیرا نگاری کی طرف قدم بڑھا کر اس صنف پر " اوپیرا نمبر " کے ذریعے دانش وروں و عام اردوداں طبقے کو غور و فکر کی دعوت دی ۔ ڈاکٹر رضیہ حامد کا میدان صحافت سے پہلے تحقیق و تنقید ہے جس کی جھلک ان کے ہر شمارہ و خصوصی نمبروں میں نظر آتی ہے ۔ ہندوستان کی خالص ادبی صحافت میں ڈاکٹر رضیہ حامد اکیلی خاتون ہیں ۔ فکر و آگہی دہلی کا موجودہ شمارہ بھوپال نمبر ان کا تازہ ترین کارنامہ ہے ۔ اس خصوصی نمبر کی تیاری میں انھوں نے جس عرق ریزی اور لگن سے کام لیا ہے ، وہ " بھوپال نمبر " دیکھنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے ۔

سہ ماہی فکر و آگہی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

۱۳ جون ، ۱۹۹۶ء کو شام ۶ بجے دہلی میں اردو گھر ، انجمن ترقی اردو (ہند) کے مولوی عبدالحق آڈیٹوریم میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا ۔ اس تقریب رسم اجرا کی صدارت جناب سید حامد ، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے فرمائی ۔ اس موقع پر بھوپال ، دہلی اور اطراف دہلی کے ممتاز اہل قلم اور صاحب ذوق خواتین و حضرات موجود تھے ۔

ابتدا میں جناب رفعت سروش نے مختصر الفاظ میں "بھوپال نمبر" کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں گزشتہ نصف صدی سے خصوصی نمبر شائع کرنے کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے ۔ اس سلسلے میں "نقوش" لاہور ، "افکار" کراچی ، "شاعر" ممبئی ، "فن و شخصیت" بمبئی اور "فکر و آگہی" دہلی کی خدمات قابل ذکر ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ شخصیات پر نمبر نکالنا نسبتہً آسان ہے ، جبکہ کسی مخصوص موضوع پر خصوصی اور ضخیم نمبر پیش کرنا بڑی محنت کا کام ہے ۔ فکر و آگہی دہلی کا ضخیم بھوپال نمبر شائع کرکے ڈاکٹر رضیہ حامد نے ادبی صحافت میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے ۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے اپنے استقبالیہ میں صاحب صدر اور تمام معززین کا استقبال کرتے ہوئے ادارۂ باب العلم پبلی کیشنز (رجسٹرڈ) اور سہ ماہی فکر و آگہی کی ادبی سرگرمیوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا ۔ انھوں نے "بھوپال نمبر" کی تیاری کے دوران تجربات کا ذکر کرتے ہوئے ان مسائل پر روشنی ڈالی جو آج اردو صحافت ، بالخصوص سنجیدہ ادبی رسائل کو درپیش ہیں ۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے "بھوپال نمبر" کے بارے میں کہا "یہ محض ایک نمبر نہیں ہے بلکہ بھوپال کا انسائکلوپیڈیا ہے ۔ زمانۂ قدیم سے دور جدید تک بھوپال کی زندگی کے نقش ہائے رنگا رنگ اس نمبر میں موجود ہیں ۔ جغرافیائی حسن ، تاریخی عظمت ، آثار قدیمہ بالخصوص ادب ، تعلیم کھیل کود ، تفریح گاہیں ، یہاں کے موسم ، تہوار اس نمبر میں کیا کچھ نہیں ۔ اور سب سے اہم حصہ تصاویر کا ہے جن میں نمائندگان بھوپال کے علاوہ قدیم دستاویزات اور قدیم سکوں کی تصویریں اور تفاصیل بہت اہمیت کی حامل ہیں" ۔

انھوں نے کہا

"اس انداز کا صرف ایک نمبر "نقوش" لاہور نے پیش کیا تھا "لاہور نمبر" لیکن "فکر و آگہی" دہلی کا یہ بھوپال نمبر اس سے سبقت لے گیا ۔ اس کے مطالعے سے مجھے بھی دہلی نمبر مرتب کرنے کی تحریک ملی" ۔

طبیہ کالج علی گڑھ کے پروفیسر ظل الرحمان ، جو بھوپال کے فرزند ہیں ، اس جلسے میں شرکت کے لیے خاص طور پر علی گڑھ سے تشریف لائے ۔ انھوں نے نہایت جامع الفاظ میں کہا کہ "بھوپال نمبر" پیش کرکے

ڈاکٹر رضیہ حامد نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے ۔ استداد زمانہ سے قدیم بھوپال کا رنگ دھندلا ہوگیا ہے اور جدید بھوپال نمایاں ہو رہا ہے ۔ اس نمبر کی خصوصیت یہ ہے کہ قدیم بھوپال کی بازیافت کی گئی ہے اور ہم اس کے مطالعے سے اس ماحول میں پہنچ جاتے ہیں جو ذاتی طور پر نظر نہیں آتا ۔ یہ قابل قدر کارنامہ ہے ۔

دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر صادق نے اہل بھوپال سے اپنے دیرینہ تعلق کا ذکر کرتے ہوئے "بھوپال نمبر" کے حوالے سے اپنی پرانی یادوں کو تازہ کیا اور ایک تصویر پیش کی اس بھوپال کے تہذیب و تمدن کی جو آج تیزی سے معدوم ہوتا جارہا ہے ۔

ڈاکٹر بشیر بدر نے رسالے فکر و آگہی کے ادبی سفر پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ اس کی اڈیٹر ڈاکٹر رضیہ حامد نے ادب کی مختلف اصناف اور جہات کو اپنے خصوصی نمبروں کے موضوعات بناکر اپنی علمی فراست کا ثبوت دیا اور اب یہ "بھوپال نمبر" ان کے نئے کارنامے کے طور پر منظر عام پر آیا ہے ۔ وہ ہر اعتبار سے مبارک باد کی مستحق ہیں

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے جنرل سکریٹری پروفیسر آفاق احمد نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر رضیہ حامد کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ "بھوپال نمبر" شہر بھوپال کی ایسی ہمہ رنگ تصویر ہے جس میں تمام جہات نمایاں ہیں ۔ انھوں نے اپنی زندگی سے وابستہ بھوپال کی بہت سی یادوں کو دہرایا ، اس تالاب کا ذکر کیا جہاں اب بستیاں آباد ہیں ، بھوپال کی ہاکی کا تذکرہ کیا جو خود اس کا پسندیدہ کھیل ہے ۔

ان تقاریر کے بعد "بھوپال نمبر" کا اجرا اردو زبان و ادب کے جانے مانے محقق ، نقاد ، دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اور کتاب نقوش بھوپال کا اجرا علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد صاحب نے فرمایا ۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس موقع پر نہایت جامع اور بلیغ تقریر کی ۔ انھوں نے اس امر پر مسرت اور طمانیت کا اظہار کیا کہ رسالے فکر و آگہی دہلی کی اڈیٹر ڈاکٹر رضیہ حامد جامعۂ اسلامیہ دہلی میں ان کی شاگرد رہی ہیں اور ان دنوں جو علمی توقعات رضیہ حامد سے وابستہ کی گئی تھیں ، انھوں نے انھیں بدرجۂ اتم پورا کیا ہے ۔ اس کا ثبوت رسالے فکر و آگہی دہلی کے کئی خصوصی نمبر اور اب یہ "بھوپال نمبر" ہے جو ڈاکٹر رضیہ حامد کے علمی اور تحقیقی مزاج پر دلالت کرتا ہے ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بہت مفصل انداز میں بھوپال نمبر کے مشمولات پر روشنی ڈالی اور اس کام کو ایک مثالی کام قرار دیا ۔ بھوپال گیس المیے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کئی ایسی کہانیوں کا ذکر کیا جو اس المیے کے رد عمل کے طور پر لکھی گئی ہیں اور اپنی حیثیت کے باعث قدر اول کی کہانیاں ہیں ۔

رسالہ فکر و آگہی علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

اس موقع پر فکر و آگہی کی معاون مدیرہ رفعت سلطان نے "بھوپال نمبر" کی تیاری میں سرگرم طور پر حصہ لینے والے حضرات کی خدمات کا اعتراف کیا۔ اس اعتراف کے طور پر انھوں نے باب العلم پبلی کیشنز (رجسٹرڈ)، دہلی کی طرف سے اعزازات دینے کا اعلان کیا۔ یہ اعزازات ایک توصیفی سرٹیفکیٹ اور یادگار تحفے پر مشتمل تھے۔ جن لوگوں کو اعزازات سے نوازا گیا، ان میں جناب عشرت قادری، جناب رہبر جون پوری، جناب محمد خالد عابدی، جناب سید خالد مسرور، جناب اقبال بیدار اور "فکر و آگہی" کے کاتب جناب محمد حامد بستوی کے نام نامی شامل ہیں۔ یہ اعزازات سید حامد صاحب کے دست مبارک سے دیے گئے۔

آخر میں صدر جلسہ جناب سید حامد نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر رضیہ حامد کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا کہ ایسی باعمل قلم کار سے ہمیں بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ انھوں نے ان گوشوں کی طرف اشارہ کیا جن پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ سید حامد صاحب نے خصوصی توجہ ہاکی پر مرکوز کی اور علی گڑھ میں اپنی طالب علمی کے دوران علی گڑھ اور بھوپال کی ہاکی ٹیموں کا ذکر بہت لطف لے کر کیا۔ انھوں نے ہاکی کے مشہور کھلاڑی شکور کے اسٹک ورک کی تعریف کرتے ہوئے اس کا نہایت خوب صورت خاکہ پیش کیا۔ "بھوپال نمبر" کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے جناب سید حامد نے بھوپال کی بہت سی شخصیات سے اپنے ذاتی تعلق کا ذکر کیا۔ اس موقع پر انھوں نے تعلیمی میدان میں اپنے موجودہ انہماک کا ذکر کرتے ہوئے عوام الناس کو زیادہ سے زیادہ اس طرف توجہ کرنے کی اپیل کی۔

علی گڑھ، بھوپال، چندی گڑھ سے تشریف لائے ہوئے اور دہلی کے مقتدر دانش ور حضرات اس جلسے کو رونق بخشے ہوئے تھے۔ اس جلسے کی خصوصیت یہ تھی کہ سامعین کرام آخر تک جلسہ گاہ میں بیٹھے رہے اور ایک خوش گوار ادبی اور علمی فضا میں یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

۱۹ جون ۱۹۹۶ء کو راشٹرپتی بھون میں منعقدہ ایک سادہ اور پروقار تقریب میں سہ ماہی فکر و آگہی دہلی کی مدیرہ ڈاکٹر رضیہ حامد نے چھ سال کی محنت، کوشش اور دردوست لگن سے شائع کیا گیا "فکر و آگہی" کا ضخیم اور خوب صورت بھوپال نمبر صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی خدمت میں پیش کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر رضیہ حامد نے صدر جمہوریۂ ہند کا استقبال کرتے ہوئے اپنی تقریر میں "بھوپال نمبر" کی اشاعت کے بارے میں کہا کہ اس خصوصی شمارے میں نئے اور پرانے بھوپال کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، علمی و ادبی اور تہذیبی روایات و رجحانات کا مختلف دانش وروں کی تحریروں کے وسیلے سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ نے کہا کہ اس نمبر کو ہر ممکن طریقے پر تاریخی اہمیت کی دستاویز بنانے کی کوشش کی ہے تاکہ آنے والی نسلیں ہمارے تمدن، معاشرے، تہذیب، ثقافت اور فرقہ وارانہ اتحاد اور باہمی روابط سے واقف ہو سکیں اور ان کی

روشنی میں اپنی سوچ اور فکر کا جائزہ لے کر مثبت اقدار کو پامال ہونے سے محفوظ رکھ سکیں۔

تقریب کے آغاز میں نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے جناب عشرت قادری نے خصوصی طور پر ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور ہندوستان کی خاتونِ اول مسز وملا شرما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ باب العلم پبلی کیشنز، دہلی کی روحِ رواں ڈاکٹر رضیہ حامد نے انتہائی محدود وسائل کے باوجود "بھوپال نمبر" شائع کرکے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس پر اہلِ بھوپال ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے اور وسیع ترین علمی و ادبی حلقوں میں اسے وقعت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا، کیونکہ "فکر و آگہی" کے بھوپال نمبر کی اشاعت سے پہلے ایسی کوئی تصنیف دستیاب نہیں تھی جس کے مطالعے سے نئے اور پرانے بھوپال کے رہن سہن، ہندو مسلم روابط انسانی اقدار کے درمیان فرق و امتیاز کو محسوس کیا جاسکے۔

اس تقریب میں ڈاکٹر خلیق انجم، معتمد انجمن ترقی اردو (ہند) نے "بھوپال نمبر" کی خصوصیات اور اس کی تاریخی اہمیت پر اجمالی طور پر اظہارِ خیال کیا۔ ڈاکٹر رضیہ حامد کی محنت اور لگن اور کام کو سراہتے ہوئے انھوں نے فرمایا "فکر و آگہی" دہلی کے بھوپال نمبر کو دیکھ کر مجھے یہ تحریک ملی کہ میں اسی انداز سے دہلی نمبر شائع کروں۔ پہلے بھی دہلی پر کام ہوچکے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بھوپال نمبر کی اشاعت ایک اہم کام ہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے "فکر و آگہی" دہلی کا دیدہ زیب ضخیم بھوپال نمبر جناب صدر ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور مسز وملا شرما کو پیش کیا۔

بھوپال و دہلی کے متعدد مقتدر حضرات اس تقریب میں موجود تھے۔ آخر میں ایک مخصوص محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر بشیر بدر، رفعت سروش، عشرت قادری، دمبر جون پوری، عشرت کرتپوری، ذکی طارق، اقبال بیدار اور ملک زادہ جاوید نے اپنا کلام سنایا۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض عشرت قادری نے انجام دیے۔ صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما اس محفلِ مشاعرہ سے انتہائی محظوظ ہوئے اور اپنے دستِ مبارک سے تمام شعرا کو پھولوں کے گل دستے عنایت فرمائے۔

١٨ جولائی، ١٩٩٦ء کو بھوپال کے خوب صورت رادھا ماتھر ٹیگور ہال میں باب العلم پبلی کیشنز (رجسٹرڈ) کی شاخ بھوپال اور بھوپال کی ادبی انجمن اردو رائٹرز گلڈ و بزم اقبال کے زیرِ اہتمام "بھوپال نمبر" کی تقریبِ رونمائی عمل میں آئی۔ اس موقع پر ہندوستان کی خاتونِ اول محترمہ وملا شرما صاحبہ نے رونمائی کی رسم ادا کی۔

جلسے کی صدارت بھوپال کے ہی ایک نام ور فرزند عزت مآب اودھ نرائن شریواستوا گورنر ناگا لینڈ و منی پور نے کی۔ اس جلسے کے مہمانِ خصوصی مدھیہ پردیش کے ہر دل عزیز وزیرِ اعلیٰ دگ وجے سنگھ جی بھی موجود تھے۔ جلسے کی نظامت بھوپال کے جانے مانے شاعر محترم عشرت قادری نے فرمائی۔ ڈاکٹر رضیہ حامد اور معاون مدیر

سہ ماہی فکر و آگہی بلی علیگڑھ نمبر ٢٠٠٠ء

رفعت سلطان نے مہمانانِ گرامی کو پھولوں کے گل دستے پیش کیے ۔ ڈاکٹر رضیہ حامد نے خاتونِ اول محترمہ ملا شربا، گورنر ناگا لینڈ و منی پور محترم اودھ نرائن شریواستوا اور وزیرِ اعلیٰ دگ وجے سنگھ کا استقبال کرتے ہوئے گزارش کی کہ سنٹرل اور اسٹیٹ گورنمنٹ اردو کتابوں کی طباعت کی حوصلہ افزائی کرے ۔ رسالے کی معاون مدیرہ رفعت سلطان نے خاتونِ اول کے لیے بہترین خطاطی سے مرصع ایک سپاس نامہ پڑھا جس کو رفعت سلطان نے خود لکھا تھا ۔ یہ سپاس نامہ محترم اودھ نرائن شریواستوا گورنر ناگالینڈ و منی پور نے اپنے دستِ مبارک سے خاتونِ اول کو پیش کیا۔ ڈاکٹر رضیہ حامد کی مساعی کو سراہتے ہوئے بھوپال کی ادبی انجمنوں کی طرف سے متاعِ لوح و قلم یادگار نشان محترمہ ملا شربا صاحبہ نے اپنے دستِ مبارک سے ان کو دیا۔

بھوپال کی عظیم ادبی شخصیت اختر سعید خاں، اس تقریب کے مقررِ خاص تھے ۔ انھوں نے " بھوپال نمبر " کی ترتیب و اشاعت کو اس تاریخی سلسلے کی ایک کڑی سے تعبیر کیا جو رانی کملا پتی، نواب قدسیہ بیگم، سکندر بیگم، شاہ جہاں بیگم، سلطان جہاں بیگم اور ساجدہ سلطان کے کارناموں سے عبارت ہے اور آج کا جلسہ بھی اسی تاریخ کا ایک ورق نظر آتا ہے، کیونکہ دخترِ بھوپال اور خاتونِ اول محترمہ ملا شربا کے ہاتھوں رضیہ سلطان ماضی کے اس خزینے کو قوم کے سپرد کرتے جارہی ہیں ۔ بڑے بڑے ادارے جو کام کرتے، وہ رضیہ سلطان نے کر دکھایا ہے۔ انھوں نے یاد دلایا کہ تہذیبیں طلوع ہوتی ہیں اور غروب بھی ہو جاتی ہیں مگر زندہ قومیں اپنی تہذیبی روایات کو فراموش نہیں کرتیں، یاد رکھتی ہیں ۔ خوشی کا مقام ہے کہ یہ کام بھوپال کی ایک خاتون کے ہاتھوں انجام پایا ۔

مدھیہ پردیش کے ہر دل عزیز وزیرِ اعلیٰ اور اس جلسے کے مہمانِ خصوصی دگ وجے سنگھ جی نے کہا کہ اردو ملک کی مقبولِ عام زبان اور ہماری قومی وراثت ہے ۔ انھوں نے مدھیہ پردیش میں اردو کے فروغ اور ترقی کے لیے ہر وقت اور ہر ممکن کوشش کرنے کا یقین دلایا ۔ ڈاکٹر رضیہ حامد کو اس خاص نمبر پر مبارک باد دیتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ نے امید ظاہر کی کہ رضیہ حامد اردو ادب کے فروغ میں تعاون کرتی رہیں گی اور پر یقین لہجے میں فرمایا کہ فکر و آگہی رسالہ اردو سے محبت کرنے والوں کی خدمت کرتا رہے گا ۔

ناگا لینڈ و منی پور کے گورنر جناب اودھ نرائن شریواستوا " فکر و آگہی " کے اس جلسے میں شرکت کرنے خاص طور سے اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ بھوپال تشریف لائے تھے ۔ انھوں نے فرمایا

" فکر و آگہی بھوپال نمبر ایک ایسی کتاب ہے جسے کسی بھی سفارش کی ضرورت نہیں ۔ بھوپال کی تہذیب نے بڑی بڑی ہستیاں پیدا کی ہیں ۔ یہاں کی تہذیب کے آسمان میں جتنے ستارے ہیں، انھیں گنا نہیں جاسکتا " ۔

رسالہ فکر و آگہی علی گڑھ ستمبر ۲۰۰۰ء

انھوں نے کہا

• فکر و آگہی بھوپال نمبر ایک ایسا حسین مرقع ہے جس میں بھوپال کی تاریخ اور تمدن کو بہترین انداز سے پیش کیا گیا ہے •۔

اجتماعی مذاقی انداز میں اپنے ان سنہری دنوں کو یاد کیا جب وہ بھوپال میں رہتے تھے ۔ بھوپال سے وابستہ لمحات کو یاد کرتے ہوئے جناب اودھ نرائن شریواستوا نے اس کے خوش رنگ پہلوؤں پر روشنی ڈالی ۔ بھوپال کی تاریخ، سیاست، معاشرت، ہاکی کے کھیل اور پٹھان کلچر سے وابستہ شخصیات کا تفصیل سے ذکر کیا ۔ انھوں نے فرمایا

• آسمان تہذیب کے ان روشن ستاروں کو وقت کی بدلی نے کسی قدر چھپا دیا ہے اور اس بدلی کو ہٹانے کا کام ڈاکٹر رضیہ حامد جیسی مستعد قلم کار کے ہاتھوں انجام پایا ہے •۔

بھوپال کی تہذیب و تمدن کے حوالے سے گفتگو میں انھوں نے کہا

• بھوپال نے صدیوں میں ایسا کلچر پیدا کیا ہے جو لوگوں کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ آپس میں پیار محبت سے رہیں اور آپس میں اگر کوئی تلخی پیدا ہو جائے تو بہت خیر و خوبی کے ساتھ اس کا ازالہ کریں ۔ بھوپال کی وراثت کو ختم نہیں ہونے دینا چاہیے اور نئی تہذیب کے سیلاب کے سامنے اس کو بچائے رکھنا چاہیے ۔ عالمی سطح پر جو روشنیں ابھر رہی ہیں، ان کے آگے اس تہذیب کو اہم مقام دینا ضروری ہے •۔

انھوں نے فرمایا

• تہذیب اور تمدن پیدا ہوتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں، لیکن جو لوگ اپنے کلچر پر فخر کرتے ہیں اور یادوں کو بھلاتے نہیں، اپنے اقدار کو مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں، وہ انسانیت کی یادداشت سے بھلائے نہیں جا سکتے •۔

محترم اودھ نرائن شریواستوا نے فرمایا • بھوپال شہر ایک ایسی جگہ ہے، ایک ایسا شہر ہے جہاں چار چارہ ہے جہاں شیر اور بکری ایک ہی تالاب میں پانی پیتے ہیں ۔ تاریخ کی اس سچائی کو سامنے رکھنا چاہیے •۔

• فکر و آگہی • بھوپال نمبر نکالنے پر مبارک باد دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا

• اس نمبر میں رضیہ حامد نے جس تہذیب کو سمو دیا ہے، وہ پڑھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔ اہل بھوپال ہی نہیں، بیرونی لوگوں کے لیے بھی ایک قیمتی تحفہ ہے ۔ بھوپال نمبر اردو سے محبت کرنے والوں کے جوش و خروش کو سامنے رکھے گا اور اردو دنیا میں اس کے ذریعے اضافہ ہوگا اور ہماری نئی نسل اس سے سبق لے کر ادب کے میدان میں نئے سے کام کرے گی •۔

سہ ماہی فکر و آگہی بک میگزین نمبر ۲۰۰۰ء

آخر میں گورنر ناگالینڈ ومی پورے فرمایا "مجھے امید ہے کہ یہ نمبر اردو داں طبقے میں مقبول ہوگا اور اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل کرے گا۔"

خاتون اول محترمہ وملا شرما نے اپنے ملیح خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ تال تلیوں کا یہ خوب صورت شہر بھوپال ایک تاریخی شہر ہے جہاں کی گنگا جمنی تہذیب و تمدن کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ دوسروں تک پہنچائیں۔ بھوپال کے پاس ہی بھیم بیٹھکا کی گپھائیں اس بات کی گواہ ہیں کہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی تاریخ میں اس کا بھی حصہ ہے۔ تہذیب کے اتار چڑھاؤ کے دوران اس شہر نے بھی اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں سمراٹ اشوک، راجا وکرما جیت اور راجا بھوج کی وجہ سے اس شہر کو خاصی شہرت ملی ہے۔ محترمہ وملا شرما نے کہا کہ وسط صدی میں اس شہر نے بھائی چارے اور مشترکہ تہذیب کا ایسا خوب صورت نمونہ پیش کیا ہے جس کو ہم گنگا جمنی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ مختلف مذاہب، فرقے اور تہذیب کے لوگ اس شہر میں رہتے ہیں بھائی چارہ یہاں کی تہذیب رہی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ بھوپال کی تاریخ کے نشیب و فراز، سیاسی اتار چڑھاؤ، گنگا جمنی تہذیب اور بھائی چارے کو "فکر و آگہی" کے بھوپال نمبر میں سمونے پر اس کی مدیرہ ڈاکٹر رضیہ حامد کو انھوں نے مبارک باد دی اور کہا کہ بھوپال کی اس سچائی کو جو یہاں کی سب سے بڑی طاقت رہی ہے، ہمیں ہر قیمت پر بچائے رکھنا ہے اور توقع ظاہر کی کہ ہمارے شہر کا پرانا روپ، جو اب تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے، یقیناً ان صفحات میں محفوظ رہے گا۔ خاتون اول نے ڈاکٹر رضیہ حامد کو تحسینی کلمات سے نوازتے ہوئے کہا کہ ان کی ادارت میں "فکر و آگہی" کے اراکین نے بہت اچھا کام کیا ہے، پانچ سال کی محنت، لگن اور عرق ریزی سے ایک ہزار صفحات پر مشتمل نمبر نکالا ہے جس میں بھوپال کی مختلف تصاویر کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ راجا بھوج سے لے کر آج تک کی تاریخ کو پیش کیا ہے۔ اس سے اس کی مٹی کے مزاج کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ تاریخ گزرا ہوا لمحہ ہوتی ہے، لیکن وہی گزرا ہوا لمحہ آنے والے کل کو ایک نئی منزل کی راہ دکھاتا ہے۔ محترمہ وملا شرما نے کہا کہ "بھوپال نمبر" ایک مکمل کتاب ہے بھوپال کا ایسا آئینہ ہے جس میں اس کے سارے روپ کی جھلک ملتی ہے۔ اس کی مدیرہ ڈاکٹر رضیہ حامد بھوپال کی سچی بیٹی ہیں۔

آخر میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس کی صدارت عزت مآب اودھ رائس شریواستوا صاحب نے فرمائی بھوپال کے پندرہ، سولہ شاعروں نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض ملک کے نامور ومایۂ ناز شاعر ڈاکٹر بشیر بدر نے انجام دیے۔ یہ تقریب گاہ بھوپال و اطراف بھوپال کے علمی، ادبی اور سماجی حلقوں کے نمائندہ اصحاب سے جلسے کے اختتام تک چھلکی پڑ رہی تھی۔ بہت خوش اسلوبی سے بھوپال والوں کے دلوں کو گرماتا اور مسرور کرتا ہوا یہ جلسہ رات ۹ بجے اختتام پذیر ہوا۔

ماہنامہ ذکر و ار علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

انجمن ترقی اردو ہند بی۔ ایچ۔ ای۔ ایل بھوپال نے ۶ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو اپنے کلچرل ہال واقع پپلانی بھوپال میں بحیثیت ایڈیٹر رسالہ فکر و آگہی اور ممتاز ادیب کے طور پر اعزاز کیا۔

اس موقع پر نعت سلطان، پروفیسر شفیقہ فرحت اور ایم۔ پی اردو اکیڈمی کے سکریٹری پروفیسر آفاق احمد نے ڈاکٹر رضیہ حامد کے کارناموں پر روشنی ڈالی اور فکر و آگہی کے بھوپال نمبر پر بھرپور تبصرہ کیا۔ یہ وہی خصوصی نمبر ہے جس کا اجرار حال ہی میں ہندوستان کے صدر ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے بنفسِ نفیس اپنے دستِ مبارک سے راشٹرپتی بھون میں فرمایا تھا۔

جناب ڈی۔ پی جوشی جنرل منیجر اور بھیک نکس کے صدر جناب کے۔ کے راندیو ریٹائرڈ جنرل منیجر اور جناب اشتیاق حسین صدیقی ایڈیشنل جنرل منیجر (جو انجمن کے وائس پریذیڈنٹ بھی ہیں) نے ڈاکٹر رضیہ حامد کو ایک شال اور قلم کا ایک سیٹ پیش کیا۔ جناب رہبر جونپوری نے اپنا منظوم سپاسنامہ پیش کیا۔

اس موقعہ پر ایک مشاعرہ کا بھی انتظام کیا گیا جس کی صدارت مشہور شاعر جناب بشیر بدر نے کی۔ مشاعرے میں جناب بشیر بدر اور رہبر جونپوری کے علاوہ نجیب رامش، وفا صدیقی، ادریس مونس، اختر وامق، نسیم انصاری، اقبال مسعود، انجم بارہ بنکوی، شاہد ساغری، ظفر صہبائی، انور محمود، فاروق انجم، خالدہ ضیا، اقتدار افسر، زاہد بھوپالی، آفتاب عدیل، راسخ ضیائی وغیرہ نے حصہ لیا۔ مشاعرہ کی نظامت رہبر جونپوری نے کی۔

انجمن کے کارکنان جناب اے۔ ایس خان، محمد حلیم، نور بیگ، شیرازی، انصار خاں نے اس محفل کے انعقاد میں بھرپور حصہ لیا۔

ایمانداری میں دو عادتیں جمع نہیں ہوسکتیں۔ کنجوسی اور برا اخلاق۔ (حدیث نبوی)

علمی وادبی کتابوں پر تبصرہ

بساطِ سخن

وَخَیْرُ جَلِیْسٍ فِی الزَّمَانِ کِتَابٌ

دنیا میں سب سے بہترین ساتھی کتاب ہے
(متنبی)

نام کتاب : علیگڑھ کی تربیت گاہِ اوّل	مصنف : محمد عشرت حسین
سنِ اشاعت : فروری ۱۹۹۹ء	صفحات : ۱۹۴
مبصر : ڈاکٹر رضیہ حامد	قیمت : ۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ : تہذیب الاخلاق ٹرسٹ ۳۸-۷/۴ سی، ۲- غالب روڈ گلبرگ III لاہور۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایک ایسا مقام ہے جس کے لیے یہاں کے سابق طالب علم جوان ہوں یا بوڑھے ہر وقت اپنے دل میں محبت اور تڑپ موجود پاتے ہیں۔ وقت اور ملکوں کے ارضی فاصلے بھی اس میں حائل نہیں ہوتے۔

کتاب 'علیگڑھ کی تربیت گاہِ اول' کے مصنف جناب عشرت حسین مکمل علیگ ہیں یعنی ۱۹۴۲ء تا ۱۹۵۴ء انھوں نے تیسرے درجے سے لے کر ایم۔ ایس سی تک تعلیم علیگڑھ ہی میں حاصل کی۔ علیگڑھ سے ان کا عشق پشتینی ہے۔ ان کے والد بھی علیگڑھ کے طالب علم تھے اور انھوں نے اپنے بچوں کو بھی علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔

'علیگڑھ تربیت گاہ اوّل' میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اسکول کا نظام تعلیم تربیت، اقامتی زندگی اور کھیل جیسے موضوعات کو بہت واضح طور پر بیان کیا گیا

ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر اسی طرز پر اسکول قائم کیئے جا سکتے ہیں۔ اور یہی خواہش اور ارادہ عشرت حسین صاحب کا بھی تھا۔ لکھتے ہیں:

"اکثر یہ خیال آیا کہ مسلم یونیورسٹی اسکول کی طرز کی پاکستان میں بھی کوئی درسگاہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا . . . اپنی خواہش کی کوئی عملی شکل بنتی نظر نہ آئی تو تحریک ہوئی کہ کیوں نہ اس کا کوئی خاکہ ہی چھوڑ چلو۔ اس کے لیے دوسرا بہتر متبادل یہ ہے کہ اپنے مشاہدات کو ضبطِ تحریر کردو۔" (ص ۲۹)

اس کتاب میں مسلم یونیورسٹی اسکول ظہور ایوارڈ۔ منٹو سرکل سے متعلق اپنے مشاہدات قلم بند کیئے ہیں۔ وہ حالات بیان کیئے ہیں جن سے گزر کر طالب علم کندن بن جاتا تھا۔ اسکول و ہوسٹل کا نظم و ضبط اور وہاں رائج پابندیاں بہت سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل ہونے کے بعد منٹو سرکل میں پارلیمانی حکومت کا تجربہ طالب علموں نے کیا۔ اس کی روداد تفصیل سے بیان کی ہے۔ غیر نصابی سرگرمیاں جیسے مباحثے، مشاعرے، بیت بازی اور لطیفہ گوئی کے ساتھ اسکول میں ہونے والی ایکٹیوٹی وغیرہ کو بہت دلچسپ پیرایہ میں تحریر کیا ہے۔

علیگڑھ اور نام۔ علیگڑھ اور 'م'۔ علیگڑھ نمائش۔ علیگڑھ کے ذکر کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ ان کے بیان کے ساتھ ہی عشرت حسین صاحب نے سرسید کے دلچسپ قصے بھی چھیڑے ہیں۔ انھوں نے اپنے اساتذہ کرام، اسکول اور یونیورسٹی کی چند معروف ہستیوں سے اپنی وابستگی کا اظہار بہت عقیدت و احترام سے کیا ہے۔

علیگڑھ تحریک، سرسید اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی پر مختلف زمانہ میں مختلف لوگوں نے کتابیں اور مضامین تحریر کیئے ہیں۔ لیکن علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اسکول پر کوئی کتاب موجود نہیں تھی اس کمی کو جناب عشرت حسین نے "علیگڑھ تربیت گاہِ اول" لکھ کر پورا کر دیا ہے۔ یقیناً یہ ان کی نسل پر قرض تھا جو انھوں نے بحسن و خوبی اتار دیا ہے۔

کتاب کی زبان سادہ اور پیرایۂ بیان دلچسپ ہے۔ کتاب شروع کرنے کے بعد ختم کیئے بغیر ہاتھ سے رکھنا مشکل امر ہے۔ بے شمار معلومات افزا باتیں اس چھوٹی سی کتاب میں جناب عشرت حسین نے تحریر کر دی ہیں۔ علیگڑھ کے علمی خزانے

میں یہ کتاب ایک بیش قیمت اضافہ ہے اور علیگرین کے لیے خوبصورت تحفہ۔
کتاب کے ٹائٹل کور پر یونیورسٹی کا دروازہ اور پشت پر ظہور وارڈ واشر بجی ہال مزین ہے۔ اتنی صاف ستھری چھپی کتاب کی قیمت صرف ایک سو پچاس روپیہ ہے۔

نام کتاب : برائے نام مصنف : محمد ذاکر علی خاں
سن اشاعت : جولائی ۱۹۹۹ء صفحات : ۲۶۷ قیمت : ۲۵۰ روپے
تقسیم کندہ : ویلکم ایکسپورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اردو بازار، کراچی۔
مبصر : ڈاکٹر رضیہ حامد

جناب محمد ذاکر علی خاں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے مایہ ناز فرزند ہیں اور سچے عاشق بھی۔ ان کی کئی تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور ع

وہ کوئی بات ہو ترا دھیان رہتا ہے

کے مصداق ان کی تحریر ہو یا تقریر ہر جگہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، سرسید، علیگ برادری روایت یا ایکٹیوٹی کا ذکر کسی نہ کسی طرح ضرور ہو جاتا ہے۔ یہی ان کے سچے عاشق ہونے کی پہچان ہے۔

'برائے نام' ذاکر صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً تحریر کیے۔ ان مضامین کی تعداد ۲۶ ہے۔ کتاب کا آغاز مصنف نے 'برائے نام کا بدلا' کے عنوان سے کیا ہے لکھتے ہیں :

"سچ تو یہ ہے کہ دنیا کا اب محض نام ہی رہ گیا ہے کیونکہ موجود ہر شئے برائے نام ہے مثلاً حقیقتِ کائنات کو دیکھتے ہوئے کرۂ ارض پر انسان کا وجود برائے نام معلوم ہوتا ہے۔"

ذاکر علی خاں کی تحریر شگفتہ شاداب اور مزاح سے پُر ہے۔ ان کے مزاج میں پھکڑپن نہیں ایک طرحداری ہے۔ جہاں کہیں مزاح میں طنز شامل ہوا ہے وہاں ان کے قلم نے وہ جوہر دکھلائے ہیں کہ قاری ششدر رہ جاتا ہے اور ایک لطیف درد اپنے ذہن و دل میں دوڑتی محسوس کرتا ہے۔

ذاکر علی خاں نے اس کتاب میں جن موضوعات پر مضامین لکھے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر معاشرے کی اصلاح سے ہے۔ مضمون 'شادی نامے اور شادی کھانے' میں ذاکر علی خاں انگریزی میں کارڈ طبع ہونے اور اُردو کو نظر انداز کرنے پر یوں

رقم طراز ہیں:

"بڑوں کی نقالی میں چھوٹے پیش پیش ہیں وہ بھی جو منہ ٹیڑھا کر کے انگلش بولنے میں برتری سمجھتے ہیں اور وہ بھی جو انگریزی کا ایک لفظ نہ سمجھ سکتے نہ بول سکتے لیکن ان دونوں کے درمیان قدرِ مشترک جھوٹی بڑائی کی تلاش ہے کیونکہ اتنی شاندار تقریب کے لیے ادنیٰ قومی زبان میں دعوت نامے بھیجنے میں سبکی کا امکان بھی ہے اور معاشرہ میں غیر مہذب ہونے کا خدشہ بھی"۔ (ص ۲۴۶)

ذاکر علی خاں نے اپنے مضامین کے عنوانات بھی ایسے رکھے ہیں کہ انسان تجسس میں مبتلا ہو جائے اگر وہ اس واقعہ یا محفل سے کس حد تک واقف ہے تو بے ساختہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہو جائے۔ کراچی میں شہنشاہ اسکواش کی تاج پوشی، سلیم یوسف کا بہترین کیچ، چوگنی کا زردہ، المکلف، مجسٹریٹی مشاعرہ وغیرہ اپنی کتاب کے بارے میں ذاکر علی خاں خود فرماتے ہیں:

"مضامین کی اس کھیپ میں جہاں مشاہدات و جذبات اکٹھے کیے ہیں وہاں کسی شخص یا ذات کو ہدف بنانے سے حتی الوسع گریز کیا ہے اور جہاں بامقصد طنز ہے وہاں کسی قدر مزاح کا بھی اہتمام ہے"۔

ذاکر علی خاں کا مطالعہ گہرا ہے۔ تجربہ وسیع اور نظر عمیق ہے۔ سماج میں اصلاح کرنے کا نیک جذبہ ان کی تحریروں میں کارفرما ہے۔ سادہ اور شگفتہ تحریر پڑھنے والوں کو باندھے رکھتی ہے۔ 'برائے نام' اپنے نام کی طرح برائے نام دلچسپ نہ ہو کر مکمل طور پر دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے، اپنے قاری کو ہر ہر مضمون پڑھنے پر اکساتی ہی نہیں ذہن و دماغ کو غور و فکر کی دعوت بھی دیتی ہے۔ اور یہی ذاکر علی خاں کا مدّعا بھی ہے۔

"اگر کسی نہ کسی طرح مندرجہ کتاب میں پیغامات کا کچھ حصّہ بھی اصلی مخاطبین تک پہنچ گیا تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری یہ سعی لاحاصل نہ ہوئی۔ ورنہ پھر برائے نام کو برائے نام ہی گردانا جائے اور بس"۔ (برائے نام گائڈ)

'برائے نام' خوبصورت طباعت و کتابت سے آراستہ ہے۔ جیسا کہ اس کے سرورق کی پشت پر درج ہے۔ اس سے ہونے والی آمدنی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے

تعلیمی و رفاہی منصوبوں میں صرف کی جائے گی جو ایک نیک قدم ہے۔ برائے نام ہر طبقۂ فکر کے لوگوں کے مطالعہ کے لیے بہترین کتاب ہے۔ اس کو تحفہ میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

نام کتاب: "نقوشِ بھوپال" مرتبہ: ڈاکٹر رضیہ حامد / رفعت سلطان
صفحات: ۹۶۲ قیمت: ۵۰۰ روپے مبصر: پی۔ پی سریواستو رند
ناشر: باب العلم پبلیکیشنز (رجسٹرڈ) ۴۵۔ بی سیکٹر ۱۷ نوئیڈا (یوپی) ۲۰۱۲۰۱

یہ حقیقت ہے کہ میں نے ابھی تک بھوپال نہیں دیکھا کئی بار مواقع سر پر منڈلائے اور منڈلا کر رہ گئے۔ کہاوت مشہور ہے تالوں میں تال بھوپال تال.... رانیوں میں رانی کملا پتی.... اور یہ بھی سنا ہے کہ جو بھوپال گیا وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ عمر بھر پردیس میں رہنے کے باوجود بھوپالی واپس بھوپال جانے کے لیے پر تولتا رہتا ہے۔ "نقوشِ بھوپال" کا مطالعہ کرنے کے بعد بھوپال دیکھنے کی تمنا پھر دل میں عود کر آئی ہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے "نقوشِ بھوپال نمبر" نکال کر سیکڑوں ہزاروں لوگوں کے لیے بھوپال سے متعلق زیادہ سے زیادہ اطلاعات فراہم کرنے کی جو کوشش کی ہے بجا طور پر قابلِ تحسین ہے۔ انھوں نے علمی، ادبی، تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی اور سنجیدہ مضامین فراہم کر کے اس نمبر کو بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔ انسانوں کی طرح ہر شہر کی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ اس کا حال اور ماضی اس کی شخصیت کو اجاگر کرتا ہے۔ بھوپال کی زبان، وہاں کے پہناوے، زیورات، تاریخ، نباتات، مساجد، منادر گلی محلّے کے علاوہ ماضی کے صفحات کو پلٹ کر رانی کملا پتی، نواب شاہجہاں بیگم نواب سلطان جہاں بیگم کے بارے میں مفصّل مضامین فراہم کر کے عام قاری کے لیے ایک طرح سے ریسرچ کا مواد اکٹھا کیا گیا ہے۔ مطالعے سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ مضامین بڑی محنت، کوششوں اور کاوشوں کے بعد جمع کیے گئے ہوں گے۔ تعریف کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر رضیہ حامد کو ان کے عنوانات قائم کرنے میں جو دقت پیش آئی ہوگی، وہ جو ان کے مشاہدے اور مطالعے کی ایک اچھوتی دلیل ہے اور بھوپال سے گہری وابستگی کی ایک واحد مثال بھی بھوپال

کے لوک گیت، ہاکی کا کھیل، ڈرامہ اور افسانہ نگاری، بیگماتی لباس کون سا ایسا پہلو ہے جو اس نمبر میں شامل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بھوپال کے گلی کوچے، در و دیوار تہذیب، مذہب اور مسالک، شہر کا جغرافیہ، شہر کا ماضی، رسم و رواج۔ تقریباً تمام عنوانات پر اس نمبر میں مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے خود لکھا ہے کہ بھوپال ان کے خوابوں کا شہر ہے۔ انھوں نے بھوپال کا تجزیہ۔ وہاں کی بیساختگی، خلوص، توازن اور تاریخی پس منظر میں کیا ہے۔ اس نمبر میں شامل تمام مضامین اعلیٰ اور تخلیقی انداز کے ہیں۔

اس نمبر کی اشاعت، ترتیب کی ساری خوبیوں کے لیے ڈاکٹر رضیہ حامد بجا طور پر داد و تحسین کی مستحق ہیں۔ ان کا علمی ذوق، ادبی جستجو۔ اور انتخاب کا سلیقہ قابلِ ستائش ہے۔ کتابت، طباعت اور جلد سازی نہایت دیدہ زیب ہے مجھے امید ہے کہ ہندوستان کی ہر لائبریری میں اس کی جلدیں محفوظ کر لی جائیں گی تاکہ آئندہ نسلیں ڈاکٹر رضیہ حامد کی کاوشوں سے استفادہ حاصل کر سکیں۔

نام کتاب : خودنوشت افکارِ سرسید　　　نام مرتب و مدون : ضیاء الدین لاہوری
نام مرتب و مدون : ضیاء الدین لاہوری　　　صفحات : ۲۷۲　　　سن اشاعت : ۱۹۹۸ء
مبصر : ڈاکٹر رضیہ حامد　　　تقسیم کار : فضل بک سپر مارکیٹ ماما پارسی بلڈنگ، اردو بازار، کراچی۔

جناب ضیاء الدین لاہوری نے سرسید کی عظمت کی تلاش میں ملک کی لائبریریوں اور بیرونِ ملک لائبریریوں میں بہت وقت صرف کیا۔ خودنوشت افکارِ سرسید نام سے کتاب تیار کی۔ یہ کتاب سرسید کی تحریروں اور مختلف جگہ دیئے گئے بیانوں پر مشتمل ہے یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ کتاب کے شروع میں 'حرفے چند' کے عنوان کے تحت ابوسلمان شاہجہانپوری لکھتے ہیں :

ان کی (سرسید) شخصیت کے ہر پہلو، ان کے افکار و عقائد اور ان کی سیرت کی ہر جہت اور ان کی خدمات کے ہر گوشے اور خوب و زشت پر ان کی اپنی گواہی ہے اور سرسید جیسی عظیم علمی و ادبی اور جامع جہات شخصیت کے بارے میں جو کچھ سوچا جا سکتا ہے وہ سب خودنوشت میں موجود ہے۔

سرسید نے اپنی پوری زندگی ملک و قوم کی خدمت کرنے گزار دی۔ ان کے کارناموں سے

ملک وقوم بہت متاثر ہوئی۔ ایسی مثالیں تاریخ کے اوراق پر دو چار ہی نظر آئیں گی۔

سرسید کے بہت سے خیالات اور مذہبی طرزِ فکر سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن جو شخص سرسید کو ان کی تحریروں کے ذریعہ سمجھنا چاہے اس کے لیے یہ کتاب 'خود نوشت افکارِ سرسید' بہترین ذریعہ ہے۔ کتاب خوبصورت، ٹائیٹل دیدہ زیب طباعت سے مزین ہے۔

نام کتاب: نواب صدیق حسن خاں — مصنف: ڈاکٹر رضیہ حامد

سن اشاعت: ۱۹۸۳ء (بار دوم) — صفحات: ۳۹۹ — قیمت: ۲۰۰ روپیہ

ناشر: باب العلم پبلیکیشنز (رجسٹرڈ) ۶۔ کنارہ اپارٹمنٹ، وی۔آئی۔پی روڈ نزد کربلا بھوپال ۴۶۲

تحریر: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، نور اللہ مرقدہٗ۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے یہ مقابلہ محض موضوع کی خانہ پری اور منتشر معلومات کے جمع کر دینے کے مترادف نہیں ہے۔ انھوں نے یہ خدمت نہ صرف محنت ولیاقت بلکہ شغف وعقیدت سے انجام دی ہے جو ایک مؤثر اور دل آویز کتاب کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے کتاب کا دائرہ ایسا وسیع اور جامع رکھا ہے جو نواب صاحب کی ذات وکمالات کی ہمہ گیری اور تنوع کے شایانِ شان ہے۔ باب اول میں انھوں نے نواب صاحب کی شخصیت اور عہد کا تاریخی پس منظر تفصیل سے پیش کیا ہے۔ باب دوم میں سلسلۂ نسب اور خاندان کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ باب سوم میں حالاتِ زندگی اور حلیہ واخلاق کو پیش کیا ہے۔ .. باب چہارم میں نواب صاحب سے پیشتر اور ان کے دورانِ قیام بھوپال کا حال لکھا ہے۔ باب پنجم میں ان علمائے بھوپال کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے جو یا تو نواب صاحب کے معاصر تھے یا ان کی دعوت وکوشش پر بھوپال آئے تھے۔ اس باب میں انھوں نے خاص محنت اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ باب ششم میں اہم تصنیفات کا تعارف اور مختصر تبصرہ ہے۔ باب ہفتم میں ان کے علمی ادبی اور سیاسی رجحانات ونظریات اور باب ہشتم میں ان کی خدمات کے اثرات ونتائج سے بحث کی ہے .... یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب مجموعی حیثیت سے کامیاب، مفید اور پُراز معلومات ہے اور فاضل مقالہ نگار نے اس کام میں اپنی محنت، لیاقت، سلیقہ اور خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے اور ایک اہم ضرورت پوری کی ہے جس کے لیے وہ اہلِ علم اور اہلِ ذوق کے شکریہ اور نواب صاحب علیہ الرحمہ کے محبین اور قدر دانوں اور ان کی علمی ودینی جذبات کے احسان مندوں کی دعاؤں کی مستحق ہیں۔

(مقدمہ سے ماخوذ)

۱۸۷۵ء میں علیگڑھ میں سرسیدؒ نے مدرسہ قائم کیا۔ اس وقت (متحدہ) ہندوستان میں ساڑھے آٹھ سو گریجویٹس تھے اور مسلمان صرف بیس۔ ۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات کے وقت ملک میں ایک سو چھبیس (۱۲۶) مسلمان گریجویٹس اور ایک سو چوہتر (۱۷۴) انڈر گریجویٹس تھے۔

معروف سائنس داں پروفیسر شمیم جیراجپوری کو سائنسی میدان میں ان کی تحقیقی اور انتظامی صلاحیتوں کے پیشِ نظر انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی کا نائب صدر منتخب کیا گیا ہے۔ اس عہد کی مدت تین سال ہے۔

ڈاکٹر محمد جہانگیر وارثی کو انڈین سوشل سائنس اکیڈمی کی ریسرچ کمیٹی برائے لسانیات کا ممبر منتخب کیا گیا۔ اس کی مدت تین سال ہے۔ انڈین سوشل اکیڈمی ملک میں تحقیقی کاموں کا ایک اہم ادارہ ہے۔

مجلس فروغ اردو ادب دوحہ (قطر) اور متحدہ عرب امارات نے ستمبر ۲۰۰۰ء میں جشنِ بشیر بدر کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر پانچواں اردو ادب ایوارڈ ہندوستان کے معروف ادیب جوگیندر پال اور پاکستان کی معروف ادیبہ محترمہ بانو طاہرہ کو عطا کیا گیا جبکہ تیسرا اسلیم جعفری اردو ادب ایوارڈ چین کے اردو شاعر چانگ شی شوانگ (انتخاب عالم) کو دیا گیا۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کے تحت نہرو ریسرچ سینٹر قائم کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ یو جی سی نے یہ تجویز نویں پانچ سالہ پلان کے تحت منظور کی ہے۔ بورڈ آف اسٹڈیز نے شعبہ سیاسیات کے پروفیسر ڈی۔ اے نظامی کو اس

سہ ماہی فکر و آگہی ملی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سینٹر کا ڈائرکٹر مقرر کیا ہے۔

تمل ناڈو اردو اکیڈیمی ۱۲ر جولائی ۲۰۰۲ء کو چنئی میں قائم ہوئی۔ چیف منسٹر تامل ناڈو مسٹر کروناندھی نے اکیڈیمی کا افتتاح کیا۔ ڈاکٹر سید شفیع اللہ کو تامل ناڈو گورنمنٹ اردو اکیڈیمی کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔

مسلم یونیورسٹی میں اس مرتبہ (۲۰۰۲ء) سرسید ڈے کے موقع پر تمام اقامتی ہالوں نے الگ الگ مہمانوں کو مدعو کیا۔ امبیڈکر یونیورسٹی آگرہ کے وائس چانسلر جناب منظور احمد کو وی۔ ایم۔ ہال آگرہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر بی۔ شیخ علی کو ندیم ترین ہال اے۔ ایم۔ یو کے سابق وائس چانسلر وصی الرحمٰن کو ایس۔ آر۔ ایس۔ سی کلب، ممتاز زرعی سائنسداں ڈاکٹر آصف حسین عابدی کو آفتاب ہال، ممتاز ہاکی کھلاڑی ظفر اقبال کو محمد حبیب ہال، حکومت دلی کے ٹرانسپورٹ منسٹر جناب پرویز ہاشمی کو سر ضیاء الدین ہال، ممتاز صنعت کار جناب ظفر عالم کو آر۔ ایم ہال، سنٹرل وقف کونسل کے سکریٹری جناب رضوان الحق اور کانپور کے ممتاز معالج ڈاکٹر نعیم حامد کو ایس۔ ایس ہال (نارتھ)، سابق طالب علم اور ای۔ ٹی۔ وی کے صلاح کار عارف ایم غوری کو سلیمان ہال، میرٹھ کے ایڈیشنل کمشنر تنویر ظفر کو علامہ اقبال ہال، شہر مفتی مولانا عبدالقیوم کو ایم۔ ایم ہال، ممتاز صحافی محترمہ منورما دیوان کو ایس۔ این ہال، پروفیسر سعیدہ قدوائی کو عبداللہ ہال اور مسلم یونیورسٹی کے چانسلر کی اہلیہ محترمہ سلمیٰ انصاری کو منٹو ہال (گرلس) کا مہمانِ خصوصی بنایا گیا۔

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ علم الادویہ کے پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن صاحب نے نجارہ ہاؤس علیگڑھ میں اپنے ذاتی خرچ سے ایک انتہائی شاندار لائبریری بنام حکیم بوعلی سینا اکادمی قائم کی ہے۔ اکادمی میں نئی تصانیف (فارسی، اردو، انگریزی) اور نایاب کتب کے ساتھ ساتھ مخطوطات سکے، اشکش، فرمان اور بہت سے نوادرات بھی موجود ہیں۔ اہلِ علم کے آنے، کام کرنے اور آرام کے لیے تمام جدید سہولتیں (مثلاً کمپیوٹر وغیرہ) کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ نادر مخطوطات کی مائکرو فلم بھی تیار کر رہے ہیں۔ عنقریب اکادمی کا افتتاح ہو جائے گا۔

الحمد للہ جریدہ فکر و آگہی (دہلی) کے سرپرست سیّد فتح علی صاحب کی ۸۵ ویں سالگرہ ۲۰ نومبر ۲۰۰۲ء میں شبستاں (بھوپال) میں انتہائی سادگی سے منائی گئی۔ موصوف عمل پیہم کے پیکر ہیں۔ کچھ نہ کچھ پڑھتے لکھتے رہنا ان کا معمول ہے (اللہ تعالیٰ ان کو صحت و تندرستی کے ساتھ خوش و خرم رکھے اور عمرِ طویل عطا فرمائے۔ آمین)

سہ ماہی فکر و آگہی (دہلی) علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

سنہ ۲۰۰۰ء ادارہ "فکروآگہی" کے لیے انتہائی مصروفیت سے بھرپور کامیابی اور گہماگہمی کا سال ثابت ہوا۔ ڈاکٹر رضیہ حامد کے چھوٹے بیٹے سید محمد عاطف کی شادی ہوئی اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے مع اپنی دلہن صائمہ امریکہ کی ایری زونا یونیورسٹی کے لیے روانہ ہوگئے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد کے بڑے بیٹے کو جرمنی کی مشہور کمپنی سی منز نے ترقی دے کر ڈائریکٹر مڈل ایسٹ منیجم دوبئی کے عہدہ پر تعینات کیا ہے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد کے منجھلے بیٹے ڈاکٹر سید محمد عاصم نے اپولو اسپتال دہلی چھوڑ کر بھوپال گمس اسپتال جوائن کر لیا ہے۔ ان کے شوہر ڈاکٹر سید محمد حامد صاحب نے "ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ ان اسلام" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اب بی۔ایچ۔ای۔ایل کے ایک معزز عہدہ سے ریٹائر ہوکر پوری توجہ سے ادارہ فکروآگہی کی ترقی و ترویج کی طرف متوجہ ہوگئے ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ حامد سے خط وکتابت کا پتہ اب مندرجہ ذیل ہوگیا ہے۔ قارئین حضرت نوٹ فرمائیں۔

۶ کنارہ اپارٹمنٹ۔ وی۔آئی روڈ۔ نزد کربلا۔ بھوپال ۴۶۲۰۰۱۔

فون : ۵۴۱۷۲۷ ــــ ۵۴۴۱۰۰ ــ ۰۷۵۵

وفیات :

نومبر ۱۹۹۹ء کو فکروآگہی کے مربی و کرم فرما سید امجد علی صاحب کا ارتحال ہوگیا۔

۲۴ مئی سنہ ۲۰۰۰ء کو اردو ادب و فلم کے نامور شاعر مجروح سلطانپوری کا انتقال ہوگیا۔

یکم اگست سنہ ۲۰۰۰ء کو ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکن و حامی اور نامور شاعر علی سردار جعفری کا بمبئی میں انتقال ہوا۔

۲۰ ستمبر سنہ ۲۰۰۰ء کو اردو کے معروف شاعر عشرت کرتپوری کا انتقال ہوگیا۔ وہ احسان دانش کے شاگرد تھے۔

پروفیسر محمد مرتضیٰ صدیقی کا ۱۴ اکتوبر سنہ ۲۰۰۰ء کو ریاض (سعودی عرب) میں انتقال ہوگیا۔ گزشتہ دو دہے سے وہ ریاض یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔

۲۰ اکتوبر سنہ ۲۰۰۰ء کو اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور صحافی انور عظیم کا دہلی میں انتقال ہوا۔

۲۴ اکتوبر سنہ ۲۰۰۰ء کو اردو کے معروف نقاد پروفیسر حامد حسین کا بھوپال میں انتقال ہوا۔

محفلِ اربابِ سخن

بھوپال نمبر ملا۔ خوشی ہوئی کہ 'فکر و آگہی' آپ کی ادارت میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرمِ سفر ہے۔ اتنا اچھا نمبر نکالنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔ امید ہے کہ خدا آپ کا حوصلہ بلند اور ہمت جواں رکھے۔ آمین۔ مشفق خواجہ۔ کراچی

آپ نے جس کام کا آغاز کیا ہے اسے علیگڑھ اسپرٹ کے ساتھ جاری رکھئے۔ اس سلسلہ میں پرامید رہیئے کیونکہ کامیابی کے امکانات روشن ہیں اور اس میں تعاون کرنے والے بھی پائے جاتے ہیں۔ جریدۂ 'فکر و آگہی' کے کارپردازان اس نیک خیال پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ محمد ذاکر علی خاں۔ (کراچی)

جریدہ 'فکر و آگہی' کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ علیگڑھ نمبر کا اجرا نئی نسل کو اس عظیم ادارہ کی تاریخ سے روشناس کرانے کی سمت ایک اہم قدم ہوگا۔ آپ مبارکباد کی مستحق ہیں کہ آپ نے اس طرف پیش قدمی کی ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نمبر کو اور آپ کی کوششوں کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔ آمین۔ ڈاکٹر ایف۔ اے نظامی آکسفورڈ۔

آپ نے بہت اچھا کیا کہ رسالہ "فکر و آگہی" کے ایک شمارہ کو علیگڑھ کے لیے وقف کردیا۔ آپ نے فرمائش کی ہے کہ اپنے دورِ طالبعلمی کی یادداشتیں قلمبند کروں۔ اس بات پہ اکثر خود کو ملامت کرتا ہوں کہ یادداشتیں میں نے لکھی ہی نہیں۔ رہیں یادیں سو اب عمر کی اس منزل میں ہوں جب یادیں فراموش کی جاتی ہیں۔ بے ارادہ، نادانستہ، حافظہ کے صفحات سے حروف اڑ رہے ہیں اور صفحات سادہ ہوتے جارہے ہیں اور یوں بھی تھوڑا بہت جو باقی رہ گیا ہے وہ نہ معنی خیز ہے نہ دلچسپ۔ تاہم اگر آپ فرمائیں اور یہ بات اَسنگت نہ ہو تو علیگڑھ کے زوال کے اسباب پہ کچھ لکھنے کی جسارت کروں۔ سید حامد، نئی دہلی۔

نقوشِ بھوپال کا تفصیلی مطالعہ کیا تو علیگڑھ نمبر کا انتظار شروع کر دیا۔ 'نقوشِ بھوپال' سے پتہ چلتا ہے کہ آپ علیگڑھ نمبر کو کس معیار تک لے جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل کرے۔ آپ کو نظرِ بد سے بچائے۔ سیّد عاشور کاظمی (لندن)

بھوپال کو آپ نے اُردو ادب میں محفوظ کر دیا۔ اہلِ بھوپال کو آپ پر ناز ہے۔
'علیگڑھ نمبر' کے فرمائش ـــ پھر وہ بھی یادیں اور علیگڑھ کی یادیں ـــ

یا نہ ماضی، عذاب ہے یارب — چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

خدا کرے مجوزہ شمارہ بھوپال والے شمارے سے زیادہ مقبول ہو۔

(اختر سعید خاں (بھوپال)

آپ کی مرتبہ کتاب "نقوشِ بھوپال" شروع سے آخر تک ایک نہیں دوبار پڑھی گئی اور آپ نے جو جانفشانی اس تحقیقی مواد کو اکٹھا کرنے اور ترتیب دینے میں کی ہوگی اس پر حیرت بھی کرتی رہی، داد بھی دیتی رہی کہ ایسی ایسی مہم جو خواتین بھی ہمارے ملک میں ہیں۔ اللہ آپ کی ہمت کو اور بلندی اور جذبہ کو زندہ جاوید رکھے۔ آمین۔

زہرہ داؤدی۔ کناڈا۔

. . . . یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ مستعدی سے ایک اچھا علمی کام کر رہی ہیں۔ ہندوستان میں ایسے ہی کام سے اُردو کے زندہ رہنے کی اُمید بندھتی ہے۔

(حامد علی شاہ (اسلام آباد)

محترمہ آپ 'فکر و آگہی' کی مدیر نہ ہوتیں تو شاید کسی طویل الجثہ جہاز پر امیر البحر ہوتیں۔ مضامین کے طوفان میں سرکش لہروں کو قابو میں لانا آپ کو خوب آتا ہے، 'تاریخ بھوپال کے اتھاہ سمندر کو رسالے کے کل ۹۶۰ صفحوں والے کوزے میں کس مہارتِ تامہ سے بند کر دیا ہے۔ بھان متی کے اس جادوئی پٹارے میں تاریخ بھی ہے جغرافیہ بھی، نباتات بھی ہے ماحولیات بھی، فنِ تعمیر بھی ہے اور ذکرِ ادبیات بھی۔ رسالے کے صفحے پلٹتے جائیے اور بھوپال کے تاریخی مقامات و کھنڈرات، مساجد و باغات، کوچہ و بازار، سیر گاہیں اور گلیارے، سب ہی کا مشاہدہ کر لیجیے۔ تاریخ گم گشتہ میں کھو جائیے اور بھوپال کی بیگمات و نوابین، صوفیائے عظام اور شہدا، سیاسی رہنما، ادبا، اطبا، اساتذہ، کھلاڑی سب ہی سے ملاقات کر لیجیے۔
'فکر و آگہی' کا بھوپال نمبر ایک زبردست تاریخی 'کیپسول' ہے جس کے بطنِ عمیق میں بھوپال شہر کا ماضی و حال محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اردو والوں کے لیے یہ ایک عظیم علمی ذخیرہ ہے۔ اس رسالے کا دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کرائیے تاکہ غیر اردو داں بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر طاہر محمود۔

سہ ماہی فکر و آگہی دہلی علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء

محمد احمد سبزواری کا فون آیا کہ بھوپال نمبر آ گیا ہے۔ دوپہر کا ایک بج رہا ہے
اسی وقت ان کے گھر گیا نمبر حاصل کیا۔ یقین جانیئے اتنی خوشی ہوئی جتنی ۸۵ء میں
بھوپال پہنچ کر ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ نمبر نہیں ملا مجھے بھوپال کا ویزا مل گیا۔
نصف سے زیادہ پڑھ ڈالا کئی مقامات پر آنسو نکل آئے کئی مقامات پر دل کیف و سرور
سے سرشار ہو گیا۔ آپ کی یہ کاوش بھوپال اور اہلِ بھوپال پر تو ایک عظیم احسان
کی حیثیت رکھتی ہی ہے لیکن علمی، ادبی تحقیق کے میدان میں ایک سنگ میل کا
درجہ بھی رکھتی ہے۔ اگر آپ ڈاکٹر نہ ہوتیں تو ڈاکٹریٹ کے لیے یہ علمی ادبی کارنامہ
ہی کافی تھا۔

میں نے شگفتہ فرحت سے بات کی ہے ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ اس نمبر کی
تقریب رونمائی کراچی میں شایانِ شان طریقے پر ہو۔ شگفتہ فرحت جلد آپ کو خط لکھیں
گی۔ بھوپال نمبر واقعی ایک اہم ادبی دستاویز ہے اور تاریخ ادب میں اسے ایک مستقل
حیثیت کا اعزاز حاصل رہے گا۔ میری طرف سے دلی مبارکباد۔ محسن بھوپالی کراچی۔

بھوپال نمبر سبحان اللہ۔ تمام مشمولات ہی قابلِ قدر اور قابلِ تعریف ہیں۔ خاص
طور سے محترم محمد احمد سبزواری کا مضمون ایک نگار خانہ کہیئے۔ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات
میں اردو کے شاعروں کو زندہ کیا تھا اور ان کے قلم نے ارضِ بھوپال کے چہرے،
راستے، شاہراہیں، گلیاں، مکانات، دوکانیں، بازار، بوڑھوں اور بچوں کو مع ان
کی سنجیدگی، ظرافت، شگفتگی، متانت، مجلس آرائی کو زندہ مجسم کر کے سامنے کھڑا
کر دیا۔ بھوپال پر یہ خصوصی شمارہ ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔ آپ مبارکباد قبول کریں۔
حامد مسعود۔ علیگڑھ۔

رضیہ بیٹی۔ اللہ تعالیٰ تم کو صحت دے اور عمر کے اضافے کے ساتھ تمہاری ہمت
کو زیادہ سے زیادہ جوان کرے۔ میں تو یہ یادگار مجلہ دیکھ کر دنگ رہ گیا تم نے اس
کے ذریعہ بھوپال کی سابقہ عظمتوں کو زندہ جاوید کر دیا۔ بظاہر اس دور میں یہ کارنامہ
انجام دینے کا حق اور ہمت اس خاندان کے ایک ایسے فرد کو ہی حاصل ہو سکتی تھی
جس کی سربراہی ایک محنتی لیکن ایک خوبصورت، خوب سیرت اور خلیق و شیریں کلام
انسان باسم سید فتح علی کو حاصل ہے، اور جس کو ایک نہیں دو نہیں تین نہیں بلکہ

چھ ڈاکٹریٹ کا باپ ہونے کا منفرد اعزاز حاصل ہے۔ تم نے بیشک بھوپال کے اس قابلِ فخر خاندان کا نام روشن کر دیا۔

تم نے 'فکر و آگہی' کے اس خصوصی شمارہ کو بھوپال نمبر لکھا ہے۔ میں تو اس کو 'انسائیکلوپیڈیا آف بھوپال' کہوں گا۔ اس کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم مختلف ادوار میں بھوپال میں ہوں۔ وہی گھاٹیاں، وہی آبشار، وہی تالاب چھوٹے بڑے۔ اور وہاں "اپنے سب کے سنگ ہیں"۔ یہ مجلہ قاری کے لیے ایک ہنستا بولتا ویڈیو کیسٹ ہے۔ دعا ہے کہ تمہارے قابل بچے ماں باپ پر سبقت حاصل کریں اور دین و دنیا میں فلاح پائیں۔ آمین۔ دعاگو سید طاہر حسین۔ کراچی

بھوپال نمبر ملتے ہی جذبۂ مسرت و شوق سے سرشار ہو گیا فوراً میں نے سلطان فاروقی ادیب و شاعر اور ڈاکٹر مختار الدین احمد بھوپالی جو شاعر بھی ہیں کو فون کر کے اس کے بارے میں بتایا۔ اتنا اچھا اور بہترین تحریروں کے ساتھ نمبر نکالنے پر مبارکباد۔

عمران الارشد (لندن)

بھوپال نمبر دیکھ کر ہی دل خوش ہو گیا۔ اس کی تمام مشمولات خوب تر ہیں۔ بھوپال کے گزشتہ چکر میں بھوپال نمبر لے آئی تھی۔ آپ نے میری کہانی بھوپوشیما اس میں شامل کی ہے۔ مجھے یہ لگا میری محنت وصول ہو گئی۔ میری طرف سے اتنا اچھا نمبر نکالنے پر مبارکباد۔ اختر جمال۔ کینیڈا۔

میں ہمیشہ ان لوگوں کی دل سے قدر کرتا ہوں جو خلوصِ دل سے ملک کی، قوم کی اور زبان و ادب کی خدمت کرتے ہیں۔ خاص طور سے وہ لوگ جو مظلوم زبان اردو کے لیے کچھ کرتے ہیں۔ آپ نے تو ضخیم اور مفید بھوپال نمبر نکال کر دہلی مرحوم کو نہیں بھوپال مرحوم کی اور مظلوم اردو کی بھی خدمت کی ہے۔ آپ کی قدر دل میں کیوں نہیں پیدا ہوگی، سو آپ کے اور آپ کے معاونین کے لیے دعائیں نکل رہی ہیں۔ خدا آپ کے دل میں اس سے زیادہ بڑے کام کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی بھوپال

بھوپال نمبر اپنی تمام مشمولات کے ساتھ بہت خوب ہے۔ بھوپال نمبر کے دوسرے حصے کے لیے میں بھوپال میں شکار کے متعلق ایک مضمون اور حضرت ضیا

حضرت شیریں رقم پر نہایت مفصل اور مکمل مضمون بھی عنقریب روانہ کروں گا۔ مسز نقوی سلام اور مبارکباد کہتی ہیں۔ قمر نقوی (امریکہ)

ڈاکٹر رضیہ حامد اور حامد نے 'فکر و آگہی' کا بھوپال نمبر نکال کر آسمانِ ادب پر بھوپال کا نام روشن کیا ہے۔ اصغر منزل کے یہ قابلِ فخر سپوت تعریف و تحسین کے مستحق ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دہلی میں بیٹھ کر اتنا اچھا معلومات پر نمبر نکالنا جوکھم کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اس کو ہاتھ میں لیتا ہے چھپنے کا نام نہیں لیتا سچ ہے ع ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
ان کے لیے دعا ہے زورِ قلم اور زیادہ۔ اور بڑے بڑے کام کریں۔ ہم تمام اہلِ اصغر منزل کی طرف سے مبارکباد۔ سیدہ خاتون۔ بھوپال

آپ بھوپال نمبر نکال کر حکومت مدھیہ پردیش پر خاص اور اردو ادب پر عام خدمت کا اثر مرتب کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ نمبر اپنی منقولات کے ساتھ احتیاط سے رکھنے اور گاہ گاہ اس سے لطف اندوز ہونے والا خصوصی شمارہ ہے۔ ادبی جریدے نکالنے سے بڑا اور کوئی خسارہ نہیں ہے۔ وہی لوگ نکالتے ہیں جن کے پاس بڑا جی اور گردے ہوتے ہیں (محاورہ کو الٹنے کے لیے معافی چاہوں گا) علیگڑھ نمبر کا بے چینی سے منتظر ہوں۔ ڈاکٹر حنیف ترین۔ (عرعر سعودی عربیہ)

آپ کا نایاب تحفہ ملا۔ شکریہ۔ رضیہ بہن اس کی تعریف تو وہی مقولہ ہے کہ سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اس کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ جو محنت آپ نے کی ہے اس کا جواب نہیں۔ کاش کہ اس کے قدرداں یعنی طیب انصاری صاحب اس کو دیکھ سکتے۔ یقیناً ان کا خون بڑھ جاتا۔ جو محبت بھوپال، وہاں کے لوگوں اور ہاکی سے تھی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ آپ نے جس خلوص اور محبت اور سلیقے سے اس کو ترتیب دیا ہے وہ تو شاید کوئی نہ کر سکے۔ آپ ہی کا حوصلہ تھا۔ کاش بھوپال والے اتنی ہی قدر کر سکیں۔ بے حد نایاب چیز ہے۔ امینہ انصاری۔ (لاہور)

بھوپال نمبر بہت اچھا لگا۔ کافی پڑھ چکا ہوں۔ بہت سے لوگوں کی محنت اور ناموں میں آپ کے صاحب کا چہرہ مجھے نمایاں لگا۔ افسوس کر رہا ہوں کہ قلم سے لکھی تحریر اس پرچہ میں شامل ہونے کے لائق نہ بھیج سکا۔ کبھی کبھی ارادہ اور اختیار سے ہٹ کر

بھی آدمی مجبور ہوتا ہے۔ آپ کے اچھے کام کی داد نہ دینا بھی ظلم ہوگا۔ جہاں قدر صِبائی۔ بھوپال۔

فکر و آگہی کا بھوپال نمبر ملا۔ بھوپال کا بہت حسین مرقع ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔ آپ کے اگلے قدم کا ابھی سے منتظر ہوں۔ مشتاق سنگھ۔ (لندن)

یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ آپ فکر و آگہی کا سرسید نمبر شائع کر رہی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نئے ہندوستان اور نئی صدی میں سرسید کی معنویت بہت بڑھ گئی ہے خدا کرے آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔ موقع ملا کچھ لکھ سکا تو ارسال کروں گا میری نیک خواہشات فکر و آگہی کے لیے۔ رشاد عثمانی۔ کرناٹک۔

ریاست بھوپال ایک عظیم الشان اسلامی ریاست رہی ہے جس کی تاریخ فکر و آگہی بھوپال نمبر اور نقوشِ بھوپال آپ نے مرتب فرما کر اعلیٰ پیمانہ پر شائع فرمائی ہے۔ آپ کی تلاش و تحقیق لائقِ صد تحسین و آفریں ہے۔ بھوپال کی تاریخ پر نقوشِ بھوپال ایک یادگار شاہکار ہے۔ پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسینی۔ علیگڑھ۔

بھوپال نمبر کی کامیاب اشاعت پر دلی مبارکباد قبول کیجیے۔ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ نے اس پر بہت محنت کی ہے۔ ہر مضمون اور موضوع لاجواب اور مکمل ہے۔ ابّو کو بھی بہت پسند آیا۔ قمر النساء قمر صاحبہ کو بھی بھوپال نمبر بہت اچھا لگا وہ علیل ہیں آپ کو خط لکھنے کا کہہ رہی تھیں۔ شگفتہ فرحت۔ صدر بھوپال انٹرنیشنل فورم۔ (کراچی)

بھوپال نمبر اور اس کی شان دار تقریب اجراء کے لیے مبارکباد۔ اس کا ایک جلسہ بھوپال میں بھی کرنا ہے۔ یہاں کے اخبار ندیم میں یو این آئی کی جانب سے دی گئی تقریب اجراء کی خبر پہلے صفحہ پر آئی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خبر رساں ایجنسی بھی آپ کی تائید میں سرگرمِ عمل ہے۔ خوشی ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر اتنا اچھا نمبر نکالنے پر مبارکباد۔

عشرت قادری۔ بھوپال۔

بھوپال نمبر دیکھ کر جی خوش ہوگیا اور اداس بھی کہ یہ کام جو آپ کی دلیری نے کر دکھایا اصل میں اردو اکادمی کا تھا جو انھیں اردو اکادمی قائم ہوتے ہی کر دینا چاہیے تھا۔ آپ نے جس عرق ریزی سے یہ نمبر نکالا وہ قابلِ فخر ہی نہیں بلکہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ دور دور تک تصور نہیں کر سکیں گی کہ میں کس قدر خوش ہوا ہوں اسے دیکھ کر جیسے یہ کام میں نے از خود سر انجام دیا ہو اور اب اپنے آپ میں پھولا نہیں

سارہا ہوں۔ پروردگار آپ کو اور بلند حوصلے عطا فرمائے کہ آپ اور بھی ایسے بڑے بڑے کام سرانجام دیں۔ میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ یوگیندر بہل تشنہ، دہلی۔

آپ کا حوصلہ اور ہمت اور محنت کے شاہکار فکر و آگہی کے خصوصی شمارے ہیں۔ علیگڑھ نمبر کی خوش کن نوید ملی۔ اس کی مقبولیت کے لیئے نیک خواہشات اور دلی مبارکباد۔ منصور عثمانی۔ مرادآباد۔

بھوپال نمبر کے لیے سوچتا ہوں آپ لوگوں کو کس طرح مبارکباد پیش کروں۔ جو شایانِ شان ہو۔ آپ نے بھوپال کا سر فخر سے اونچا کر دیا۔ جو کام آج تک کسی نے نہیں کیا وہ بنتِ بھوپال نے کر دیا۔ آپ نے ان روایتوں کو زندہ کر دیا کہ بھوپال پر اگر بیگمات حکومت کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں تو بھوپال کو ادبی وقار بخشنے میں بھی آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ویسے تو بہت ادیبہ اور شاعرہ بھوپال کی ادبی صف میں شامل ہیں۔ آپ نے جس اعتماد اور صبر و برداشت سے ہر کام کو انجام دیا خدا وہ عزم اور جذبہ ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین۔ رہبر جونپوری۔ بھوپال۔

فکر و آگہی کا بھوپال نمبر، ماشاءاللہ پچھلے تمام خصوصی شمارہ پر سبقت رکھتا ہے۔ آپ کی مساعی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ واقعی یہ نمبر قابلِ صد ستائش۔ اس کے لیے مبارکباد پیش ہے۔ قاسم رسا۔ گوالیار۔

فکر و آگہی کا بھوپال نمبر ایک مبسوط اور جامع انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے ریسرچ اسکالر کے لیے یہ مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔ بھوپال کے ہر شعبے کے بارے میں بہت جامعیت اور تفصیل سے لکھا ہے۔ آپ مبارکباد کی مستحق ہیں۔ اور اب علیگڑھ نمبر کا منتظر ہوں جو یقیناً اس سے زیادہ وقیع ہوگا۔ پروفیسر احتشام اختر۔ کوٹہ۔ راجستھان۔

اتنا اچھا بھوپال نمبر تیار کرنے کے لیے دلی مبارکباد پیش ہے۔ واقعی آجکل کی نئی نسل کے بھوپالیوں کے لیے یہ ایک قیمتی تحفہ ہے۔ کچھ باتیں گراں گزریں۔ ایک یہ کہ تنقید نہیں ہے دوسرے اس کا سائز بڑا اور جلد مضبوط ہونا چاہیئے تھی تاکہ لیٹ کر بھی آسانی سے پڑھا جا سکے۔ فوٹو کے لیے کاغذ اچھا ہوتا تو بہتر تھا۔ اس کے علاوہ اشتہارات کی تعداد اور ہونی چاہیئے تھی۔ امید ہے بُرا نہیں مانیں گی۔ ڈاکٹر وسیم اختر۔ مقیم مدینہ منورہ۔

انگوری
ہربل ٹانک

KHOON SAFA
خون صفا

دماغی کام کرنے والوں کے لئے بہترین تحفہ
دماغین

Sharbat Nazla
ہربل کف سیرپ

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

میں دستیاب

کورسز

فی الوقت یونیورسٹی کے تمام کورسز صرف فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت دستیاب ہیں

کسی بھی کورس کے لئے یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم صرف اُردو ہے

۱۔ بی اے، تین سالہ ڈگری کورس

۲۔ بی کام، تین سالہ ڈگری کورس

۳۔ بی ایس سی، تین سالہ ڈگری کورس (فی الحال صرف حیدرآباد، نظام آباد، منگلور، گلبرگہ اور ممبئی میں دستیاب)

۴۔ کمپیوٹنگ، چھ ماہی سرٹیفیکیٹ پروگرام (فی الحال صرف حیدرآباد، کرنول، منگلور، بھیونڈی اور ممبئی میں دستیاب)

۵۔ غذا و تغذیہ، چھ ماہی سرٹیفیکیٹ پروگرام

۶۔ اہلیت اُردو بذریعہ ہندی، چھ ماہی سرٹیفیکیٹ پروگرام

۷۔ اہلیت اُردو بذریعہ انگریزی، چھ ماہی سرٹیفیکیٹ پروگرام

تمام کورسز میں داخلے کی کارروائی جاری ہے آخری تاریخ ۱۵/دسمبر ۲۰۰۰ء ہے

کسی بھی طرح کی معلومات کے لئے لکھئے

رجسٹرار، رداس کالونی، ٹولی چوکی، حیدرآباد 500 008 (اے۔پی)   فون و فیکس رجسٹرار 040-3562944

ٹی۔ایم۔کانوینٹ ہائر سکنڈری اسکول

(انگریزی و ہندی میڈیم حکومت سے منظور شدہ)

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کرام،

تمام سابق طالب علم اور ہمدردانِ علیگڑھ

سے

عاجزانہ درخواست ہے

" اگر اب بھی نہیں جاگے تو کب جاگیں گے "

اسکول فون نمبر :
رہائش :

ایک سابق طالب علم
ایم۔ایس۔بیگ
(شبیر اقبال) بھوپال

سلطانیہ روڈ نزد ٹیلیفون ایکسچینج۔بھوپال ۴۶۲۰۰۱

Nine money-savings tips
For drivers of two- and three-wheelers

- Drive at speeds of 45 55 km/hr and get up to 40% extra mileage

- Unnecessary use of the clutch leads to loss of energy and damage to clutch linings

- Decide on your journey and route in advance Rush hour or stop-and-go traffic can wastes fuel excessively

- Regular engine tuning saves 6% on fuel consumption

- Switch off engine at traffic light and save up to 20% fuel

- Mix superior 2T oil conforming to international API/TC specifications in recommended dosage Take only premixed petrol and oil

- Incorrect gear shifting consumes 20% excess fuel

- Check air filters regularly Clogged airfilters increase fuel consumption

- Check air pressure in tyres at regular intervals Tests show that 25% decrease in tyre pressure can cost 5 10% more on petrol and 25% on tyre life

PETROLEUM CONSERVATION RESEARCH ASSOCIATION
603, New Delhi House 27 Barakhamba Road, New Delhi 110 001
Ph 3310686 3715228, Fax 3715244 Email PCRAD@DEL2.VSNL.NET.IN
Visit our website at http://www.pcra.org
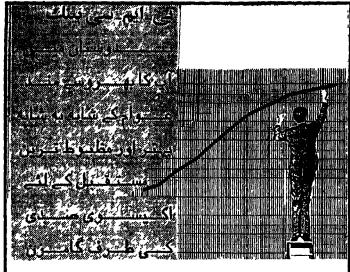
Where conservation fails, pollution starts • Oil conservation for a clean environment
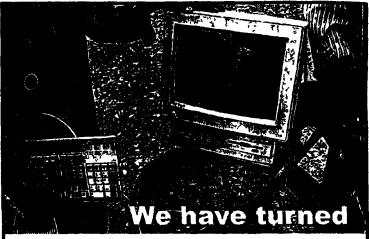
the Information Highway towards our village

Is IT meant only for industries, trade and commerce?

We have turned the information highway towards our village – where we live

Gyandoot has made a successful debut in Dhar district of Madhya Pradesh. Information about Government and official documents are now available in our villages – distant and near, in localities small and big. We can now submit applications and receive replies at these kiosks. Internet is there, of course, to access information about cabbages and kings and whether pigs have wings.

Agrasar is another such initiative to provide education through computers. 7500 centers have been chosen to install computers to educate rural children at primary and middle levels.

In the hitherto isolated areas of Bilaspur division official information is available at the click of the mouse everywhere. website www.sanchar.org and through CD ROMs.

We have taken computers and internet to the people and for the people. Very soon all our schools will have access to computers. Children will learn about and through the computers during the school hours. These will be used as cyber-cafes after dusk.

Village maps and land records are already available on computers in many districts. By 2001 this facility will be available in all the 61 districts. Now the information about fields and forests, rivers and rivulets is at the fingertips. All our tehsils now have access to Internet. Over 5000 IT kiosks are being opened in villages all over the state.

In a new joint venture we are going to have 7800 IT kiosks all over the state – a major initiative towards e-governance. Another first in the country.

Red-tape has been cut substantially in the state and quick movement of papers and files is ensured through a computerized monitoring system – decision taken is now decision implemented. A complainant is now sure of swift and fair action.

We have a virtual university now – Bhoj Open University. You need not stir out of home now to get education and a degree. And yes, you need not necessarily be acquainted with English to take advantage of computers. We are now developing Hindi software. We have a center of excellence to develop this – in order to bring the IT revolution to common man.

We have a comprehensive IT policy keeping in mind the needs of the common man – not the computer industry. Our *mantra* is community participation for development in all spheres including IT.

This is our unique selling proposition. This has brought MP national and international recognition – first Commonwealth Award for Education Guarantee Scheme and now the Stockholm Challenge Award for Gyandoot where IT has been used to benefit and uplift the marginalised.

MP is the first state in the country to take the information highway to the rural areas.

For us the computer and the Internet are the means of empowering people through their participation in all our initiatives – to take Madhya Pradesh forward.

Leading on the Highway of Progress

Our Madhya Pradesh

آقائے مدنی اور ابوتراب کے

شیدائی

ملک و قوم کے

مسیحا

سیّد احمد خاں کی قبر کو

خدا

نور سے بھر دے۔ آمین

علیگڑھ نمبر

کے لیے

نیک خواہشات کے ساتھ

فون رہائش : 91-4508336
دفتر : 4507994

وصی احمد نعمانی
ایڈوکیٹ سپریم کورٹ۔ دہلی

موبائل 9810159152
فیکس۔ ای میل :

بون انگلش میڈیم اسکول

کا پیغام

اطلبوا العلم من المھد الی اللحد

(علم حاصل کرو گہوارہ سے قبر تک)

فکر و آگہی کا خصوصی شمارہ

علیگڑھ نمبر

کے لیے نیک خواہشات

اور

مزید کامرانیوں کے تمنائی

ڈائریکٹر:
سید مسعود علی

معاون
ثمینہ مسعود

۲۵۔ جنسی روڈ جہانگیر آباد۔ بھوپال۔ ایم۔پی ۴۶۲۰۰۱

علیگڑھ نمبر

مدھیہ پردیش اردو اکادمی
وزیر اعلیٰ عزت مآب دگ وجے سنگھ کی قیادت
اور رہنمائی میں اردو زبان وادب کے لئے سرگرم

اردو ادیبوں اور شاعروں کی مالی امداد کے لئے رائیٹرس ویلفیر فنڈ کا قیام۔
جس میں چیرمین عزت مآب عزیز قریشی صاحب نے ٹیلیفون، ہاؤس رینٹ، الاؤنس اور پٹرول وغیرہ کے لئے حکومت کی جانب سے دی گئی مراعات خود قبول نہ کرکے اس رقم کو جو مبلغ دو لاکھ روپے تھی مذکورہ فنڈ میں اپنی طرف سے عطیہ دیا۔
مدھیہ پردیش میں پہلی بار ایک سالہ اردو کمپیوٹر ڈپلومہ کورس کا آغاز۔
اردو شارٹ ہینڈ، ٹائپنگ اور خطاطی کی کلاسیں شروع کرنے کا فیصلہ۔
غیر اردو داں حضرات کو اردو سکھانے کی کلاسیں جن سے اب تک ہزاروں افراد فیض یاب ہو چکے ہیں۔
اردو کے میدان میں سرگرم ادیبوں اور شاعروں کو ملا تشخیص ملک و ملت سوا لاکھ روپے کا راجہ رام موہن رائے بین الاقوامی اعزاز۔
ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور سرراس مسعود سالانہ یادگار خطبات کا قیام۔
مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے ملازمین کی فلاح و بہبود کے لئے ایک فنڈ کا قیام۔
ڈویژنل اور ضلع سطح پر اردو اساتذہ کی تربیت کے لئے ورکشاپ اور کانفرنس کا انعقاد۔
اس کے علاوہ اکادمی کے اغراض و مقاصد میں سمینار، مشاعرے، شب غزل اور ادبی محفلوں کے علاوہ کتابوں کی اشاعت اور اشاعت کے لئے صوبہ کے مصنفین اور شعرا کو مالی امداد، تین کل ہند اور آٹھ صوبائی سطح کے اعزازات (نقد و انعام) اور فنکاروں کے زیر اہتمام کسی مرحوم ادیب و شاعر اور صحافی کی یاد میں سمینار، مشاعرہ اور شب غزل کا انعقاد۔ اس کے علاوہ ادبی انجمنوں کو مشاعرہ اور ادبی جلسوں کے لئے مالی تعاون، لائبریریوں کو مالی امداد کے علاوہ صدر کا ایک امدادی فنڈ جس سے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کو وقتی مالی امداد فراہم کرنا اور اردو کے فروغ کے لئے دوسرے کام شامل ہیں۔

------- ہم ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہیں -------

جاری کردہ۔

مدھیہ پردیش اردو اکادمی، ملا رموزی سنسکرتی بھون، بان گنگا روڈ، بھوپال 462003 فون نمبر (551691)